نگار

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد (۱۵) — شمارہ (۱)

فہرست مضامین جنوری ۱۹۲۹ء

انتساب

اک نازنیں رشکِ قمر کشتی میں محوِ خواب ہے — پرتو سے جس کے سطحِ آب اک چادرِ سیماب ہے
کشتی ہے رُوئے آب پر اور اس میں حسنِ صبح زا — ہے برگِ نیلوفر پہ اک یا قطرۂ شبنم پڑا
کشتی تموج میں ہے یا مضطر ہے چشمِ نیم وا — کشتی میں ہے اک برق وش ہنگامہ جیسے ضیا
حُسنِ تمکیں اور یہ رنگینیِ کیفِ شباب — بت ساز نے بلور کے پیکر میں بھر دی ہو شراب
اک حسن کے پیکر میں یہ صرفِ راحت ہی شباب — نقشِ جوانی میں ہے یا اک حُسن کامل محوِ خواب
ابرو میں پورا خم لئے صیدِ زبوں کے واسطے — رخسار میں بجلی لئے صبر و سکوں کے واسطے
آویزہ اس کے کان کا عارض پہ ہے ٹھیرا ہوا — دُرجِ صدف سے یا کوئی موتی ڈھلک کر رہ گیا
چوٹی ہے یا دو ناگنیں باہم گرہ ملوف ہیں — یہ لب ہیں یا دو پنکھڑی اک پھول کی ملفوف ہیں
آنکھیں ہیں بند اس پر بھی ہے یہ راز اُن کا برملا — اندر ہی اندر سحر ہے سانچے میں اُن کے ڈھل رہا
اک ہاتھ نیچے سر کے ہے اور دوسرا سینہ پہ ہے — بادل میں ہے اک جُوئے شیر اور ایک آئینہ پہ ہے
گردن ہے شانہ تک کھلی سینہ کمر تک بیحجاب — کیا جانئے منظور ہے فطرت کو اب کیا انقلاب
کشتی جو ساحل سے لگی تو ہو گئی بیدار وہ — اور اس طرح دیکھا مجھے گویا کہ ہے بیزار وہ
کہنے لگی ”تو کون ہے کیا اس فضا میں تیرا کام؟“ — بولا میں ”تجھ سے رکھتا ہے اک گونہ نسبت یہ غلام“
”جلوہ ہے تو میں ہوں نگہ، تو برق ہے خرمن ہوں میں“ — ”تو پھول ہے بلبل ہوں میں گوہر ہے تو دامن ہوں میں“
”تو حسن ہے میں عشق ہوں، تو آگ ہے میں ہوں گداز“ — ”تو بادشہ میں ہوں گدا، تو ناز ہے میں ہوں نیاز“
یہ سُن کے وہ ہنسنے لگی اور پھول برسانے لگی — پھر مجھکو یہ سب دے گئی جب لوٹ کر جانے لگی
ان خندہ ہائے حُسن کی کرتا ہوں قائم یادگار — یعنی انھیں پھولوں کا ہے چھوٹا سا گلدستہ نگار

نیاز

اقتدار کر

خارجی حالات کا اثر جنین پر

اور

مخلوقاتِ عالم میں تبدیلی کا امکان

توریت میں آیا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے راحِل سے شادی کرنے کے لئے اُن کے باپ لابن کی بکریاں چرائی تھیں جس سے لابن کی بکریوں میں بہت کچھ اضافہ ہوا اور وہ بڑا دولتمند بن گیا۔ جب حضرت یعقوبؑ اپنا مقصود حاصل کرکے واپس جانے لگے، تو لابن نے اجازت نہ دی کیونکہ انھوں نے نہایت محنت اور اخلاص سے کام کیا تھا۔ جب حضرت یعقوب نے دیکھا کہ لابن رہنے پر اصرار کرتا ہے تو انھوں نے کہا کہ میں اس شرط پر رہ سکتا ہوں کہ جس قدر ابلق بکریاں پیدا ہوں وہ سب میرے حصہ کی ہونگی۔ لابن اس شرط پر راضی ہو گیا کیونکہ اس قسم کی بکریاں عموماً نادر الوجود ہوتی ہیں، خاص کر اس زمانہ میں تو یہ بہت کم پیدا ہوتی تھیں۔ یعقوب نے پھر لابن کی بکریاں چرانی شروع کیں اور انھوں نے چنار اور بادام کی لکڑیاں لے کر جابجا سے انکا پوست نکال دیا تاکہ سفیدی اور سیاہی مل کر وہ ابلق ہو جائیں پھر وہ لکڑیاں ایسے موقع پر رکھدیں جہاں صبح شام بکریاں پانی پینے آیا کرتی تھیں۔ ان لکڑیوں میں دیکھ کر بکریوں میں یہ اثر پیدا ہوا کہ وہ ابلق رنگ کے بچے زیادہ دینے لگیں۔ حضرت یعقوبؑ زیادہ تر قوی بکریوں کو ان لکڑیوں کے پاس لایا کرتے تھے۔ تاکہ موٹی بکریوں کے بچے اُن کے حصے میں آئیں۔ اس ترکیب سے حضرت یعقوب کو بڑا فائدہ ہوا اور وہ بڑے دولتمند بن گئے۔

علمائے علم الحیوان میں ہمیشہ سے یہ مسئلہ زیر بحث چلا آیا ہے کہ کیا خارجی حالات اور کیفیات سے جنین بھی متاثر ہو سکتا ہے یا نہیں؟ مذکورۂ بالا واقعہ سے حضرت یعقوب نے اس نظریہ کو صحیح ثابت کر دیا۔

اس نظریہ کو علمی اصطلاح میں TELEGON کہتے ہیں اس کی صحت میں علما نے بڑا اختلاف کیا اور آخر میں یہی رائے قرار پائی ہے کہ یہ نظریہ ٹھیک نہیں، لیکن جدید اکتشافات ثابت کر رہے ہیں کہ وہ وقت دور نہیں جب انسان زندہ مخلوقات کے رنگ اور دیگر صفات میں جس طرح چاہے تبدیلی پیدا کر دے۔ اس زمانہ میں ماہرین فن نے ایسے عجیب و غریب تجربے کئے ہیں، جس سے نظریۂ مذکورہ کی صحت میں کوئی شک باقی نہیں رہتا۔

آج کل اس مسئلہ پر بحث ہو رہی ہے کہ وہ کیا اسباب ہیں، جن کی وجہ سے چیتے کے جسم پر سیاہ داغ ہوتے ہیں، کیا انسان کے لئے ممکن ہے کہ بلا داغ چیتا پیدا کر سکے۔ اگر ان اسباب و علل کا انسان کو پوری طرح علم ہو جائے تو وہ بھی حضرت یعقوب کی طرح جنین

کی صفات وکیفیات بدل سکتا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ عجیب تر امور اس کے دست قدرت میں آسکتے ہیں۔

اگر حیوانات کی کسی نوع میں سے خاص صفات اور امتیازات کے جانور منتخب کرکے اُن کا سلسلہ تناسل عام نوع سے علیحدہ قائم کیا جائے، تو اس میں شک نہیں کہ رفتہ رفتہ وہ صفات وخصوصیات اس مخصوص نسل کی صفات لازمہ ہو جاتے ہیں اور جدید نسل عام نوع سے ممتاز ہو کر ایک مستقل نوع بن جاتی ہے۔ مثلاً ابتدا میں مسابقت (گھوڑ دوڑ) کے لئے ایک گھوڑا یا چند گھوڑے منتخب کئے گئے، جن میں وہ صفات خصوصیت کے ساتھ زیادہ پائی جاتی تھیں جو گھوڑے کی سرعت رفتار کے لئے موزوں ہیں، پھر ان ہی منتخب گھوڑوں میں سے (جب ان کی نسل کچھ زیادہ ہوئی، اور انتخاب کیا گیا) اسی طرح یہ انتخابات ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ گھوڑ دوڑ کے گھوڑوں کی نسل عام گھوڑوں سے بالکل علیحدہ ہو گئی اور وہ صفات وخصوصیات جو پہلے وجہ انتخاب تھے، اس جدید نسل کے صفات لازمہ بن گئے۔ اس قسم کا انتخاب علمائے حیوان کی اصطلاح میں "انتخاب صناعی" کہلاتا ہے۔ ایک طبعی انتخاب بھی ہوتا ہے، جس کا عمل فطری طریقہ پر نباتات اور حیوانات میں جاری رہتا ہے چونکہ طبیعت کا اقتضا یہ ہے کہ انواع حیوان ونباتات ہمیشہ ترقی کرتے رہیں اور مدارج ارتقا کو برابر طے کرتے چلے جائیں، اس لئے طبیعت ایک دائمی انتخاب واصلاح کا سلسلہ جاری رکھتی ہے، جس کی بنا پر ہر آنے والی نسل گزشتہ نسل سے زیادہ ترقی یافتہ ہوتی ہے، لیکن یہ ارتقائی رفتار اس قدر آہستہ ہوتی ہے کہ سینکڑوں نسلوں کے بعد ایک معمولی سا فرق پڑ جاتا ہے۔

بہر حال انسان جس ذریعہ سے کام لیتا ہے وہ انتخاب صناعی ہے جو حیوانات ونباتات کے بعض صفات کو بدل سکتا ہے۔ لیکن جو مسئلہ اس وقت زیر بحث ہے اگر اس میں کامیابی ہو گئی تو وہ انتخاب صناعی سے بہت زیادہ اہم اور مفید ثابت ہوگا کیونکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ ایک ہی نسل کے صفات وخصوصیات میں تبدیلی پیدا کر دی جائے، جو انتخاب صناعی کے ذریعہ سے کئی نسلوں کے بعد پیدا ہو سکتی ہے۔

یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اس قسم کے دو حیوان یا نباتات نہیں پائے جا سکتے، جن کے درمیان پوری پوری مشابہت ہو اگرچہ ہمیں بادی النظر میں فرق نہ معلوم ہو لیکن حقیقتاً دونوں کے درمیان کچھ نہ کچھ مابہ الامتیاز ضرور ہوتا ہے۔

ایک گلہ جس میں بہت سی بھیڑیں ہوں ہم اس کے بعض افراد میں فرق نہیں کر سکتے۔ لیکن گلہ بان جسے ایک طویل تجربہ کے بعد بھیڑوں کی خصوصیات اور خاص امتیازات کا علم ہو گیا ہے، آسانی سے فرق کر سکتا ہے اکثر پرندے ایسے ہیں جن کے افراد میں انسان ہرگز فرق نہیں کر سکتا، لیکن اُن کے جوڑے آپس میں ایک دوسرے کو خوب پہچانتے ہیں اور کبھی انھیں غلطی نہیں ہوتی، ظاہر ہے کہ اُن کی شناخت کسی نہ کسی خصوصیت وامتیاز کی بنا پر ہو گی جس کا ادراک انسانی تمیز سے بالاتر ہے۔

بعض اوقات یہ خصوصیات نہایت صاف اور واضح ہوتی ہیں اور ایسی صورت میں ان خصوصیات اور امتیازات کی بنا پر انتخاب کرکے ایک جدا نسل قائم کی جا سکتی ہے، جسے انتخاب صناعی کہتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت یہ مسئلہ پیش نظر ہے کہ ان خصوصیات کے اسباب دریافت کرکے اُن سے کام لیا جائے اور ایک ہی نسل میں حسب خواہش تبدیلی پیدا ہو سکے، عالم "حیوانات" اس عمل میں طبیعت کی اقتدا کرانی چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کیا وجہ ہے بعض مویشی بغیر سینگ کے پیدا ہوتے ہیں۔ حالانکہ اس کے والدین بڑے بڑے سینگ

رکھتے ہیں، ضرور اس کا کوئی پوشیدہ سبب ہوگا، کیا میں اس سبب کو دریافت کرکے اس سے کام لے سکتا ہوں جس طرح طبیعت کام لیتی ہے۔

نظریۂ تبدیل صفات کب سے انسان کے ذہن میں آیا؟

اس سوال کا جواب دینے کے لئے چاہئے کہ ہم ۱۸۵۹ء تک پیچھے ہٹ جائیں۔ جب ڈاروِن نے اپنی مشہور کتاب "اصل انواع" تالیف کی تھی۔ اس وقت عام خیال یہ تھا کہ ڈاروِن ہی پہلا شخص ہے، جس نے مسئلۂ نشو و ارتقا پر بحث کی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ نشو و ارتقا کا خیال نہایت قدیم ہے، جس کی مختلف توجیہات اور تعلیلات بیان کی گئی ہیں۔ ڈاروِن کی کتاب بھی اس مسئلہ کی ایک جدید تعلیل ہے ہاں اس میں شک نہیں کہ تمام گزشتہ توجیہات سے زیادہ دقیق اور مکمل ہے۔

ڈاروِن نے نشو و ارتقا کی بنیاد تین اصول پر رکھی ہے۔

۱- ایک جنس کے افراد میں کچھ نہ کچھ فرق و امتیاز ضرور رہتا ہے یعنی ایسے دو فرد ہرگز نہیں مل سکتے، جن کے درمیان مشابہت کلی ہو۔

۲- یہ فرق و امتیاز نسلاً منتقل ہوتا ہے۔

۳- پیدا ہونے والے افراد کی تعداد باقی رہنے والوں سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔

مذکورۂ بالا اصول سمجھنے کے لئے ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں۔

خرگوشوں کی ایک جماعت ایسی جگہ رہتی ہے جہاں لومڑیوں کا گزر بالکل نہیں ہے اور وہ نہایت اطمینان سے پُرامن زندگی بسر کرتے ہیں۔ دفعتاً بعض لومڑیاں وہاں آتی ہیں، پہلا اصول مقتضی ہے کہ خرگوشوں کے درمیان خاص خاص امتیازات وخصوصیات ہوں گے، کوئی سیاہ ہوگا کوئی سفید، کوئی تیزرو ہوگا کوئی سست۔ اب دیکھنا چاہئے کہ لومڑیوں کے آنے پر کیا صورت پیش آئے گی ظاہر ہے کہ بہت سے خرگوش، لومڑیوں کا شکار ہو جائیں گے، اور وہی بچ سکیں گے جو تیزرفتار ہوں گے یا اُن کا رنگ زمین کے رنگ کے مشابہ ہوگا اور سہولت سے لومڑیاں انھیں نہ دیکھ سکیں گی۔ یہ دونوں صفات یعنی تیزروی اور زمین کی ہم رنگی خرگوشوں کی نجات کا سبب ہو سکتا ہے۔ جن افراد میں یہ صفات پائی جائیں گی انھیں کے بچنے کی زیادہ امید ہوگی، پھر ان افراد کو لومڑیاں فنا کرتی جائیں گی، یہاں تک کہ وہی بچے باقی رہ جائیں گے جن کے اندر صفات مذکور تمام و کمال پائے جائیں اور کسی طرح بھی لومڑیوں کا قابو اُن پر نہ چل سکے گا۔

دوسرے اصول کا مفاد یہ تھا کہ یہ امتیازات بطریق وراثت منتقل ہوتے رہتے ہیں، نسلی اقتضا یہ ہے کہ تیز چلنے والے خرگوشوں سے تیز چلنے والے اور زمین کے ہمرنگ خرگوشوں سے اسی رنگ کے خرگوش پیدا ہوں اور ہر آئندہ نسل میں گزشتہ کی نسبت یہ خصوصیات اور امتیازات واضح اور صاف ہوتے جائیں۔

چند نسلوں کے بعد یہ صفات خرگوشوں میں اس قدر راسخ اور ثابت ہو جائیں گے کہ خرگوشوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیں گے۔ ایک وہ جو زمین کے ہمرنگ ہوں اور دوسرے تیزرفتار۔ اور یہیں سے ڈاروِن کا تیسرا اصول مستنبط ہوتا ہے یعنی ایک جنس افراد میں

وہی زیادہ باقی رہ سکتے ہیں جن میں بقا کی زیادہ صلاحیت ہو۔

یہی وہ چیز ہے جسے ڈارون انتخاب طبعی کہتا ہے۔ انسان نے بھی اس انتخاب کی تقلید کی ہے اور اپنی خواہش کے مطابق بعض حیوانات و نباتات میں خاص خاص صفات پیدا کی ہیں۔ جسے انتخاب صناعی کہتے ہیں۔ انتخاب طبعی اور صناعی میں یہ فرق ہے کہ انتخاب صناعی میں بجائے اس کے کہ انسان صفات مرغوبہ کو طبیعت کے سپرد کرے خود افراد میں سے وہ افراد منتخب کر لیتا ہے، جن میں وہ صفات پائی جاتی ہیں۔ اور پھر ان کی ایک علیحدہ نسل قائم کر دیتا ہے۔ اور اس طریقہ پر طبعی رفتار سے بہت جلد نتیجہ پر پہونچ جاتا ہے۔

آج کل جو طریقہ زیر بحث ہے وہ اس سے بھی زیادہ موثر اور سریع العمل ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ خصوصیات حیوانی اور نباتاتی کے اسباب و علل معلوم کر کے بغیر اس کے کہ پے در پے انتخابات کا سلسلہ جاری کیا جائے، ایک ہی نسل میں اختلاف پیدا کر دیا جائے۔

اس مسئلہ میں سب سے پہلا اکتشاف ایک مشہور عالم حیوانات "لینفجسٹان" کا ہے۔ اس نے ایک خاص قسم کی گھاس جو شیریں پانی میں پیدا ہوتی ہے، سمندر میں ڈال دی، کچھ عرصہ کے بعد اس گھاس نے ایک دوسری گھاس کی شکل اختیار کر لی۔ جو اس سے بالکل مختلف اور ایک علیحدہ جنس تھی پھر اس نے اس کے خلاف عمل کیا یعنی سمندر میں اُگنے والی ایک گھاس کو شیریں پانی میں ڈال دیا، اس نے بھی اپنی صورت بدل دی اور ایک دوسری گھاس کی صورت میں تبدیل ہو گئی۔

ولیم لارینس، پروفیسر یونیورسٹی شیکاگو (امریکہ) بھی اس موضوع سے خاص طور پر عملی دلچسپی لیتے ہیں۔ پروفیسر مذکور ایک خاص قسم کے مچھر پر جو آلو کے درخت پر نشو و نما پاتا ہے اپنے تجربے کر رہے ہیں۔ اس نے مچھر پالنے کی غرض سے ایک خاص جگہ بنائی ہے، جہاں مچھر کھاتے پیتے اور رہتے سہتے رہتے ہیں۔ پروفیسر ہر ایک مچھر کی تاریخ ولادت اور باہمی رشتوں کو خوب پہچانتا ہے کیونکہ وہ یہ تمام تفصیلات ایک رجسٹر میں لکھ لیتا ہے۔ اس نے ہر درخت کے اوپر ایک باریک جال لگا دیا ہے جس میں سے مچھر نکل نہیں سکتے۔ اور ہر درخت پر صرف ایک یا دو مچھر چھوڑے جاتے ہیں اس طریقہ سے اُن کے انساب اور آپس کے رشتے بالکل محفوظ رہتے ہیں۔ اس عمل کے لئے اس نے متعدد کمرے بنائے ہیں ہر کمرے میں چند درخت ہیں۔ ان کمروں کی حرارت برقی طاقت سے گھٹائی بڑھائی جا سکتی ہے بعض کمروں کی ہوا اس قدر گرم کی جاتی ہے کہ خط استوا کی حرارت کے برابر ہو جاتی ہے اور بعض میں قطب شمالی برابر سردی پیدا کی جاتی ہے۔

مچھروں کی اس طرح تربیت کرنے سے اُن کے درمیان بڑا اختلاف پیدا ہو جاتا ہے اور اُن کی مختلف جنسیں بن جاتی ہیں۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بعض وقت اس قسم کے مچھر پیدا ہوتے ہیں، جن کا دنیا میں کہیں بھی وجود نہیں ہے۔

نباتات کے متعلق جارج کلنز (جرمنی) نے عجیب و غریب تجربے کئے ہیں۔ وہ اپنے عمل سے نباتات کی عمر میں بڑا فرق پیدا کر سکتا ہے۔ ایک متعفن گھاس جس کی عمر دو ہفتہ سے زیادہ نہیں ہوتی، اس نے اپنے عمل سے اس کی عمر چھ سال تک بڑھا دی۔ اور اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس قسم کی گھاس جو انتہائی عمر کو پہونچ چکی تھی اُسے اپنے عمل سے از سر نو زندہ کر دیا۔

اس نے اپنے تجربوں سے نباتات کی شکل و صورت میں بھی بہت کچھ فرق پیدا کر دیا ہے، بعض نباتات میں تو اس قدر عظیم فرق پیدا ہو گیا ہے کہ وہ اپنی اصل سے بالکل مختلف ہو گئے ہیں۔

ان تمام تجربات سے ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ حیوانات اور نباتات کے لئے کوئی خاص شکل و صورت ایسی نہیں ہے کہ وہ اُسے نہ چھوڑ سکیں، بلکہ مؤثرات خارجی خواہ طبعی ہوں یا صناعی، ان میں عظیم اختلاف پیدا کر سکتے ہیں۔

یہ اکتشافات عجیبہ جو ابھی دور طفولیت میں ہیں، ہمارے سامنے ایک روشن اور امید افزا مستقبل پیش کرتے ہیں۔ جب ہم آج اس بات پر قادر ہیں کہ علمی اور عملی طریقوں سے حیوانات اور نباتات کی انواع کو بدل سکتے ہیں تو کیا یہ بعید ہے کہ جراثیم حیوانی جن سے حیوانات کی تخلیق و تکوین ہوتی ہے، ہمارے دائرہ عمل میں داخل ہو جائیں اور ہم اُن پر اثر ڈال کر مختلف قسم کے حیوانات کی تولید کر سکیں۔ اور حیوانات کیا بلکہ نوع بشری کی شکل و صورت میں بھی حسب خواہش تبدیلی پیدا کر دیں۔

نیاز

ولادت وہجرت نبوی کی صحیح تاریخ

(ہیئت کے نقطۂ نظر سے)

اس میں اختلاف ہے کہ رسول اللہ کی ولادت کس تاریخ کو ہوئی اور کس تاریخ کو آپ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی، لیکن مصر کے ایک مشہور ہیئت داں محمود پاشا فلکی نے اس موضوع پر حددرجہ تحقیق کے ساتھ ایک رسالہ لکھ کر نہایت عالمانہ طریقہ پر ولادت وہجرت کی صحیح تاریخیں متعین کر دی ہیں، جن میں اب ذرا بھی شبہ باقی نہیں رہتا۔

چونکہ ولادت نبوی کا مسئلہ نہایت اہم ہے اور خاصکر ان لوگوں کے لئے جو محفل میلاد منعقد کرتے ہیں، اس لئے ہم اس رسالہ کا اقتباس پیش کرتے ہیں جس سے معلوم ہوگا کہ ولادت نبوی کی صحیح تاریخ ۹۔ ربیع الاول ہے نہ کہ ۱۲۔ ربیع الاول۔

تاریخ ولادت

رسول اللہ کی تاریخ ولادت متعین کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام روایات نقل کر دی جائیں جو تاریخ ولادت کے متعلق مروی ہیں۔

صاحب سیرت حلبی لکھتے ہیں کہ قتادہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دوشنبہ کے متعلق سوال کیا گیا تو حضرت نے ارشاد فرمایا کہ یہ وہ دن ہے جس میں میں پیدا ہوا ہوں۔ ابن بکار اور حافظ ابن عساکر کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت طلوع فجر کے وقت ہوئی ہے چنانچہ اس پر عبد المطلب کا یہ قول بھی دلالت کرتا ہے کہ "آج صبح کے وقت میرے ہاں لڑکا پیدا ہوا" (ولد لی اللیلۃ مع الصبح مولود)

سعید بن المسیب سے روایت ہے کہ آنحضرت دوپہر کے وقت اس دنیا میں تشریف لائے، ربیع الاول کی بارھویں تاریخ تھی اور موسم بہار کا تھا۔

اس روایت پر تقریباً لوگوں کا اجماع ہے، ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضور سرور عالم، دسویں ربیع الاول کو جلوہ افروز ہوئے ہیں۔ حافظ دمیاطی اس روایت کی تصحیح کرتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ ۱۷۔ ربیع الاول کو حضور پیدا ہوئے اور بعض ۸۔ ربیع الاول کو تاریخ ولادت قرار دیتے ہیں۔ ابن دحیہ کہتے ہیں کہ آٹھویں ربیع الاول کی روایت کے سوا کوئی روایت صحیح نہیں ہو سکتی اور اسی پر اہل تاریخ کا اجماع ہے۔

روایات مذکورۂ بالا کی بنا پر آنحضرت کی ولادت فصل ربیع میں آٹھ، دس، بارہ یا سترہ ربیع الاول قرار پاتی ہے۔ اگرچہ ان اختلافات کے علاوہ اور بھی اقوال ہیں، مگر چونکہ اختلافات مذکورہ کے راوی ثقہ ہیں اور قابل اعتبار طریق سے یہ روایتیں مروی ہیں اس لئے ہم صرف انہیں پر اکتفا کرتے ہیں۔

ارباب سیر کا بیان ہے کہ آپ حضرت حلیمہ کے پاس رہتے تھے اور انہیں کا دودھ پیتے تھے، جب آپ کی عمر دو برس کی ہوئی تو حضرت حلیمہؓ آپ کو آپ کی والدہ کے پاس مکہ لائیں اور ان سے کہا کہ اب کی سال اس بچہ کو ہمارے پاس اور چھوڑ دو کیونکہ مجھے مکہ کی وبا سے خوف ہے کہ کہیں نقصان نہ پہونچ جائے حضرت حلیمہ کے اصرار سے جناب آمنہ نے اجازت دیدی اور وہ حضور کو اپنے قبیلہ میں واپس لے آئیں، اور واپسی کے دو یا تین مہینہ بعد وہ واقعہ ہوا جسکو عام طور سے شق صدر کہتے ہیں۔

سیرۃ حلبی میں اسی موقع پر لکھا ہے کہ مکہ سے واپس آنے کے بعد حضرت حلیمہ آپ کو کہیں دور جانے نہیں دیتی تھیں، ایکدن انہیں خیال نہیں تھا، آپ کہیں چلے گئے، دوپہر کا وقت تھا جب حضرت حلیمہ آپ کی تلاش میں نکلیں تو دیکھا کہ آپ کی رضاعی بہن شیما گود میں کھلا رہی ہیں، یہ دیکھ کر حضرت حلیمہ نے کہا کہ "اس گرمی میں" یعنی اس گرمی کے وقت تم یہاں کھیل رہی ہو؟

ان دونوں روائتوں کے جمع کرنے سے ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ جب حضرت حلیمہ آنحضرت کو جناب آمنہ کے پاس سے واپس لے گئیں، اس وقت حضور کی عمر دو سال کی تھی، اور واقعۂ شق صدر دو سال دو مہینہ یا تین مہینہ کی عمر میں ہوا اور جس وقت آپکی بہن آپ کو دوپہر کے وقت باہر لے کر گئی تھیں اس وقت آپکی عمر دو سال سے کم اور دو سال تین مہینہ سے زیادہ نہ تھی۔

اب اگر اس وقت حضور کی عمر دو سال کی تھی اور وہ موسم گرمی کا تو ظاہر ہے کہ آپ کی ولادت موسم گرما میں ہوئی، اور اگر دو سال تین مہینہ کی عمر تھی تو صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ موسم بہار میں پیدا ہوئے چونکہ عرب گرم ملک ہے اور اسمیں بہار ہی کی اواخر سے بلکہ بعض وقت وسط بہار کے موسم سے گرمی شروع ہو جاتی ہے اس لئے بہار کے موسم میں ولادت کا احتمال پہلی صورت میں بھی (یعنی جبکہ آپ کی عمر دو سال کی مانی جائے) زیادہ قوی ہو جاتا ہے۔

امام شمس الدین محمد بن سالم کتاب الجفر الکبیر میں لکھتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ربیع الاول کے مہینہ میں ۲۰ نیسان سنہ ۱ عام الفیل کسریٰ نوشیرواں کے عہد میں ہوئی ہے، چونکہ نیساں کا مہینہ ہمیشہ اپریل کے مطابق رہتا ہے اس لئے اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ آپ کی ولادت موسم بہار میں ہوئی۔

مسعودی، مروج الذہب میں لکھتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت واقعۂ فیل سے پچاس روز بعد ہوئی ہے اور واقعۂ فیل ۱۷ محرم سنہ ۸۸۲ سکندری بروز دوشنبہ واقع ہوا تھا اور اس وقت نوشیرواں کو حکومت کرتے ہوئے چالیس سال گذرے تھے اور آنحضرت کی ولادت اسی سال ۸۔ ربیع الاول کو مکہ میں ہوئی۔

روایت مسعودی کی بنا پر حساب لگانے اور عیسوی تاریخ سے مطابق کرنے سے آنحضرت کی ولادت ۵۷۰ء میں قرار پاتی ہے موسیو کوسان، اپنی کتاب تاریخ عرب کے حصہ دوم میں ۸۲ صفحہ پر تاریخ الخمیس کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ نوشیرواں نے ۴۷ سال ۸ مہینے حکومت کی ہے، اور مورخین روم نے بھی تقریباً یہی لکھا ہے، فرق صرف ایک مہینہ کا ہے۔ ابن اثیر کا بیان ہے کہ کسریٰ نوشیرواں، حضور کی ولادت کے بعد، سال ۸ مہینہ زندہ رہا۔ لہذا اس حساب سے نوشیرواں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے وقت پورے چالیس سال حکومت کر چکا تھا، اور چونکہ یہ بادشاہ ۵۳۱ء میں تخت پر بیٹھا،

لہذا اس سے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ۵۷۱ء میں ثابت ہوتی ہے۔

جرجیس معروف بہ ابن عمید نے مختصر التواریخ میں تصریح کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسریٰ کی وفات کے وقت ۸ سال کے تھے۔ چونکہ اس بادشاہ کی وفات ۵۷۹ء میں ہوئی ہے لہذا اس حساب سے بھی حضرت کی ولادت ۵۷۱ء میں ثابت ہوتی ہے۔

اڈیٹر رسالہ کردولوجیا الریاضیہ نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ۲۲ نیسان ۸۸۲ سکندری کو پیدا ہوئے تھے۔ چونکہ نیسان جو سریانی مہینہ کا نام ہے اپریل کے مطابق ہے، لہذا اس سے بھی آنحضرت کی ولادت ۲۲ اپریل ۵۷۱ء میں ثابت ہوتی ہے۔

موسیو سیلوستر دو ساسی لکھتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ۲۰ نیسان ۸۸۲ سکندری دوشنبہ کی رات کو ہوئی ہے اس بیان سے بھی ولادت ۲۰ اپریل ۵۷۱ء کو قرار پاتی ہے۔

مشرق کے علمائے ہیئت کا اس پر اتفاق ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اپریل ۵۷۱ء میں ہوئی اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ ولادت مشتری اور زحل کے قران کے بعد ہوئی ہے اور یہ قران برج عقرب میں ہوا تھا۔

موسیو تووارڈ کی زیچ پر حساب لگانے سے معلوم ہوتا ہے کہ اپریل ۵۷۱ء کی پہلی تاریخ کو مشتری برج عقرب میں ۲۱ درجہ ۱۵، دقیقہ پر تھا اور زحل ۱۷ درجہ، ۱۵ دقیقہ پر برج مذکور میں تھا اور اس وقت یہ دونوں سیارے حالت رجوع میں تھے، اس لئے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قران ۲۹، یا ۳۰ مارچ کو واقع ہوا تھا۔ اس قران کو مشرق کے علمائے ہیئت قران الملۃ یا قران ملت اسلام کہتے ہیں اس کے متعلق بعض مشرقی علمائے ہیئت کے اقوال ملاحظہ ہوں:۔

یحییٰ ابن ابی شکر مغربی، اپنی ایک تصنیف میں لکھتے ہیں کہ ولادت آنحضرت کی عام الفیل میں واقع ہوئی ہے اور یہ ۸۸۲ سکندری تھا اور اسی سال زحل اور مشتری کا قران برج عقرب میں ولادت سے تھوڑے ہی عرصہ پہلے واقع ہوا تھا، اس حساب سے بھی ولادت ۳۰۔ مارچ ۵۷۱ء کے بعد ثابت ہوتی ہے۔

صاحب منتہی الادراک لکھتے ہیں:۔ "اس قران کے پہلے سال میں ولادت ہوئی ہے" سابقہ بیان سے ہم کو معلوم ہو چکا ہے کہ قران ۲۹ یا ۳۰ مارچ ۵۷۱ء میں واقع ہوا تھا اس لئے اس حساب کی رو سے بھی ولادت ۵۷۱ء میں ثابت ہوتی ہے۔

صاحب کتاب الکامل اسرار نجوم میں اور شیخ احمد بن عبد الجلیل کتاب القرانات میں بھی اسی طرح لکھتے ہیں ان تمام شہادتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور سرور عالم صلعم کی ولادت باسعادت ۵۷۱ء میں ۲۹۔ مارچ کے تھوڑے عرصہ کے بعد ہوئی ہے اور ۲۹ یا ۳۰ مارچ کا دن زحل اور مشتری کے قران کا ہے گا جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔

مسعودی اور مصنف مجمل التواریخ وغیرہ لکھتے ہیں کہ آنحضرت کی ولادت نوشیرواں کے ۴۰ جلوس میں ہوئی تھی اور بعض مورخین مثل حمزہ اصفہانی وغیرہ کہتے ہیں کہ ولادت ۴۱ جلوس نوشیرواں میں ہوئی ہے لیکن یہ دونوں روائتیں اسطرح

جمع ہوسکتی ہیں کہ ان مورخین نے یوم ولادت کو چونکہ معین نہیں کیا ہے۔ اس لئے جو لوگ سنہ ۴۰ کے قائل ہیں، انہوں نے ولادت کو سنہ ۴۱ کے آخری دنوں میں خیال کیا ہے اور جو سنہ ۴۱ قرار دیتے ہیں وہ سنہ ۴۱ کے اوائل میں خیال کرتے ہیں، لہذا ان دونوں روایتوں میں اگر فرق ہوگا تو ایک دو مہینہ سے زیادہ نہ ہوگا، پس اس صورت میں بھی سنہ ۵۷۱ء سال ولادت قرار پاتا ہے۔

ان تمام مختلف بیانات سے اس متحدہ نتیجہ پر ہم پہونچ سکتے ہیں کہ آفتاب رسالت کا طلوع فصل بہار ۵۷۱ء میں ہوا ہے اور چونکہ بعض اقوال سے اسکی تصریح ہوتی ہے کہ ولادت اپریل کے مہینہ میں واقع ہوئی ہے اور بعض روایات نہایت زور سے اس پر دلالت کرتی ہیں اس لئے ہم اپریل سنہ ۵۷۱ء کو ماہ ولادت قرار دیتے ہیں اور اس سے عربی تاریخ اور دن اس طرح معلوم کرتے ہیں۔

آفتاب اور ماہتاب کا اجتماع حقیقی عرض مکہ کے اعتبار سے ۱۱ اپریل ۵۷۱ء کو ۹ بجکر ۱۴ منٹ پر ہوا ہے اور اسی روز شام کے وقت ہلال افق مشرق پر نظر آیا ہے، لہذا ربیع الاول کی پہلی تاریخ اتوار کے دن ۱۲ اپریل کو ہوئی ہے۔ اور قابل اعتبار روایتوں میں ۸، ۱۰ یا ۱۲ ربیع الاول کو یوم ولادت بتایا گیا ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ ولادت دوشنبہ کے دن ہوئی ہے۔ پھر چونکہ ۸، ۱۰ اور ۱۲ تاریخ کے درمیان دوشنبہ کا دن صرف ۹ ربیع الاول کو واقع ہوتا ہے اس لئے ہم ۹ تاریخ کو یوم ولادت قرار دیتے ہیں، اسی کو صحیح سمجھتے ہیں اور یقین سے کہتے ہیں کہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم دوشنبہ کے دن ۹ ربیع الاول مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء کو پیدا ہوئے۔

ہجرت

حافظ ناصر الدین، ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ "جس روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لے گئے تو وہاں کے یہودی روزہ سے تھے، دریافت سے معلوم ہوا کہ یہودی کہتے ہیں کہ آج کے دن خدا نے حضرت موسیٰ کو فرعون سے نجات دی تھی اور فرعون کو غرق کیا تھا، حضور نے فرمایا کہ یہودیوں کی بہ نسبت ہم اس روزہ کے زیادہ مستحق ہیں" یہ حدیث صحیح ہے اور اس کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔

اسلامی اصطلاح کے بموجب عاشورہ، دسویں محرم کا ہوتا ہے، لیکن اس صورت میں یہ حدیث اس روایت سے متناقض ہوگی، جس میں تصریح ہے کہ ہجرت، ربیع الاول کے مہینہ میں واقع ہوئی تھی اور اس مضمون کی اور روایتیں بھی آئی ہیں اور وہ سب صحیح مانی گئی ہیں، لہذا اس کے لئے ہم کو چاہیئے کہ اس مسئلہ پر غور کریں کہ عاشورہ، دسویں محرم کے علاوہ عہد نبوت میں کسی دوسرے دن کو بھی کہتے تھے یا نہیں اور اس اشکال کے حل ہو جانے کے بعد تاریخ ہجرت کی تعین آسان ہو جائے گی۔

صاحب سیرت حلبی کہتے ہیں کہ "اگر یہ کہا جائے کہ جس روز آنحضرت نے ان کو روزہ رکھے ہوئے دیکھا وہ عاشورہ کا دن تھا تو اس میں ایک زبردست اشکال پیش آتا ہے کیونکہ عاشورہ، محرم کے دسویں دن کو کہتے ہیں اس لئے وہ ربیع الاول میں کس طرح واقع ہوسکتا ہے، اس کے بعد خود صاحب سیرت اس کا جواب دیتے ہیں کہ یہودیوں کے یہاں شمسی سال کا استعمال ہوتا تھا، قمری کا نہیں ہوتا تھا اس لئے وہ عاشورہ کا دن جس سے اتفاقاً غرق فرعون کا دن بھی مطابق ہوگیا تھا، ہمیشہ دسویں محرم کے ساتھ مطابق نہیں رہ سکتا، بلکہ یہ ایک محض اتفاق تھا کہ جب آنحضرت تشریف لے گئے تھے تو دونوں دن مطابق تھے اور اگر وہ حقیقت میں عاشورے کا دن ہوتا تو آپ کو سوال کرنے کی ضرورت نہ ہوتی"

بیان مذکور کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ طبرانی، معجم کبیر میں لکھتے ہیں کہ "عاشورہ وہ دن نہیں ہے جس میں کعبہ کو غلاف پہنایا جاتا ہے اور حبشی آنحضرت کے سامنے کھیلتے تھے، بلکہ یہ دن تو سال بھر میں پھرا کرتا تھا لوگ اس کے متعلق فلاں یہودی سے پوچھ لیا کرتے تھے اور جب وہ مر گیا تو زید بن ثابت سے پوچھنے لگے۔

بیرونی، کتاب الآثار میں لکھتا ہے کہ "ایک قول یہ بھی ہے کہ لفظ عاشورہ، عبرانی ہے اور یہ یہود کے مہینہ تشری کا دسواں دن ہے اور اس کا روزہ صوم الکبور کہلاتا ہے، عربوں نے بھی اپنے مہینوں میں اس کا اعتبار کر لیا اور جس طرح عاشورہ یہودیوں کے پہلے مہینے یعنی تشری کے دسویں دن کا نام تھا، اسی طرح عرب اپنے پہلے مہینہ یعنی محرم کے دسویں دن کو عاشورہ کہنے لگے، مذکورہ بالا بیان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ۱۰ تشری کو مدینہ میں داخل ہوئے۔ توراۃ کی رو سے اس دن کا روزہ رکھنا فرض ہے اور آج تک یہودی اس دن کا روزہ رکھتے ہیں۔

ہمارے خیال میں یہ نتیجہ بالکل صحیح ہے اور جو روایات میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دوشنبہ کے دن مدینہ میں داخل ہوئے یہ بھی بالکل درست ہے۔ اب ہم کو عیسوی تاریخ کی مطابقت کے لئے یہ دیکھنا چاہئے کہ ۱۰ تشری کو جو یہودی کے سال کا دسواں دن ہے کون سا دن تھا۔

اس میں شک نہیں کہ ہجرت، ۶۲۲ء میں واقع ہوئی ہے، حساب کی رو سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دس تشری ۲۰ ستمبر ۶۲۲ء کے مطابق تھا، اور اس روز قمری مہینہ کی آٹھویں تاریخ تھی، کیونکہ شمس و قمر کا اجتماع ۱۱ ستمبر شنبہ کے دن تھا اور ہلال کی تولید نصف اللیل کے بعد ہوئی تھی اس لئے خالی آنکھ سے ہلال اتوار کی شام کو نظر آیا ہوگا اور اس حساب سے ۱۳ ستمبر کو قمری مہینے کی پہلی تاریخ ہوتی ہے اور چونکہ ہجرت ۲۰ ستمبر کو واقع ہوئی ہے اس لئے اس دن چاند کی ۸ تاریخ تھی۔

ارباب سیر اور راویان احادیث کا اس میں اختلاف ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کس تاریخ مدینہ منورہ میں داخل ہوئے۔ بعض دوسری، بعض آٹھویں اور بعض بارھویں ربیع الاول بتاتے ہیں، ہمارے نزدیک صحیح تاریخ وہی ہو سکتی ہے جو دوشنبہ کے دن واقع ہو، چونکہ حساب کی رو سے دوسری اور بارھویں کو دوشنبہ واقع نہیں ہوتا، بلکہ آٹھویں ربیع الاول کو واقع ہوتا ہے، اس لئے یہی صحیح ہے۔

اس تمام تحقیق سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہجرت یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ میں داخلہ ۸ ربیع الاول مطابق ۲۰ ستمبر ۶۲۲ء موافق ۱۰ تشری ۴۳۸۳ (پیدائش) کو واقع ہوئی ہے۔

حدیث مذکور جس میں یہ ذکر ہے کہ جب آنحضرت مدینہ میں داخل ہوئے تو یہودیوں کا روزہ تھا، بخاری اور مسلم میں مختلف طریقوں سے مروی ہے، جو اس حدیث کے صحیح ہونے کی نہایت روشن دلیل ہے، لیکن بعض روایات میں اضافہ بھی ہے جو بیان توریت کے خلاف ہے، اضافہ یہ ہے "حضور نے فرمایا کہ آج کون سا دن ہے لوگوں نے عرض کیا کہ آج کے دن خدا نے فرعون کو غرق کیا ہے اور موسیٰ کو نجات دی ہے" یہ اضافہ یہودیوں کی کتاب کے خلاف ہے، کتاب یہود میں لکھا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے بحر احمر کو ۱۷ نیسان کے دن عبور کیا تھا اور ۲۱ نیسان کا دن یہودیوں کی عید الضحیٰ کے سات دن بعد واقع ہوتا ہے، اس لئے یہ حدیث توریت کے موافق نہیں ہے،

لیکن اس سے یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہئے کہ حدیث صحیح نہیں ہے کیونکہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے وہی روایت کیا ہے جو انہوں نے یہودیوں سے سنا تھا یا انہیں کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ پس اضافہ بلحاظ روایت کے صحیح ہے اور حقیقت میں غلط ہے کیونکہ یہودیوں کی جہالت تھی کہ وہ اس روزہ کا سبب غرق فرعون اور نجات موسیٰ سمجھتے تھے۔ لہذا توریت کا بیان اور حدیث کی روایت دونوں صحیح ہیں۔ بخاری کی ایک روایت میں یہ اضافہ بالکل نہیں ہے، امام بخاری یہ روایت اس طرح کرتے ہیں۔

عن ابی موسیٰ الاشعری قال دخل النبی صلی اللہ علیہ وسلم المدینۃ واذا ناس من الیہود یعظمون عاشوراء ویصومونہ فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم نحن احق بصومہ فامر بصومہ۔	ابوموسیٰ اشعری سے روایت ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ یہودی لوگ عاشورہ کی عظمت کرتے ہیں اسکا روزہ رکھتے ہیں، پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم اس روزہ کے زیادہ مستحق ہیں پھر آپ نے اس روزہ کا حکم دیا۔

بعض لوگ چونکہ حقیقت سے واقف نہیں ہیں اور عاشورے کے معنے نہیں سمجھتے وہ خیال کرتے ہیں کہ ہجرت، دسویں محرم کو واقع ہوئی ہے اور دسویں محرم دسویں تشری کے مطابق تھا۔ بیرونی نے کتاب الآثار میں تصریح کر دی ہے کہ ۱۰ محرم اور ۱۰ تشری اس سال میں کسی طرح مطابق نہیں ہو سکتے، بیرونی کہتا ہے:۔

"یہ روایت کی گئی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو دیکھا کہ یہودی عاشورہ کا روزہ رکھے ہوئے ہیں، آپ نے اسکے متعلق دریافت کیا تو لوگوں نے کہا کہ یہ دن وہ ہے جس روز خدا نے فرعون کو غرق کر دیا تھا اور موسیٰ کو نجات دی تھی، اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم زیادہ مستحق ہیں اور آپ نے صحابہ کو عاشورہ کا روزہ رکھنے کا حکم دیا، جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو آپ نے نہ اس کے متعلق حکم دیا اور نہ منع فرمایا" یہ روایت صحیح نہیں ہے کیونکہ سال ہجرت میں پہلی محرم جمعہ کے دن واقع ہوئی تھی اور تموز (سنہ ۹۳۳ سکندری) کی ۱۶۔ تاریخ تھی، اور اس سال یہود کی سال کا پہلا دن یکشنبہ ۱۲۔ ایلول اور ۲۹ صفر کے مطابق تھا اس حساب سے عاشورہ (۱۰ تشری) کا روزہ ۹ ربیع الاول کو واقع ہوتا ہے۔ اور یہ ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت ربیع الاول کے نصف اول میں واقع ہوئی ہے اور دن دوشنبہ کا تھا کیونکہ جب آپ سے دوشنبہ کے متعلق پوچھا گیا تو آپ ارشاد فرمایا کہ یہ وہ دن ہے جس روز میں پیدا ہوا، مبعوث ہوا، اور مجھ پر وحی نازل ہوئی اور میں نے ہجرت کی۔

اس میں اختلاف ہے کہ کون سے دوشنبہ کے دن ہجرت واقع ہوئی ہے، بعض کہتے ہیں ۲۔ ربیع الاول کی دوشنبہ کو واقع ہوئی، اور بعض آٹھویں کے دوشنبہ کو اور بعض بارھویں ربیع الاول دوشنبہ کو بتاتے ہیں لیکن آٹھویں تاریخ پر زیادہ اتفاق ہے کیونکہ دوسری اور بارھویں کو دوشنبہ واقع نہیں ہوتا، اس لئے کہ پہلی ربیع الاول دوشنبہ کے دن تھی لہذا ہمارے اس بیان کی بنا پر مدینہ میں آنحضرت کا داخلہ عاشورہ یہود سے ایک روز پہلے ہوتا ہے (کیونکہ ہم لکھ چکے ہیں کہ ہجرت میں یہودیوں کی سال کا پہلا دن اتوار کے روز تھا اس لئے اتوار کو ۸، پیر کو ۹۔ اور منگل کو دس ہوتی ہے)۔

اس تاریخ کی مطابقت سال ہجرت میں محرم کی دسویں سے نہیں ہو سکتی بلکہ (سال ہجرت سے چند سال پہلے) اور بیس برس سے

زیادہ عرصہ کے بعد مطابق ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ راویوں کا یہ کہنا کہ اس روز خدا نے فرعون کو غرق کیا تھا صحیح نہیں، کیونکہ توریت اس کے بالکل خلاف ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ واقعہ مذکورہ ۱۲ نیسان کو واقع ہوا ہے اور وہ ایام فطیر کا ساتواں دن تھا اور فصح یہود کا پہلا دن آنحضرت کے مدینہ تشریف لانے کے بعد سہ شنبہ ۲۲ آذر ۹۳۳ سنہ سکندری کے مطابق تھا اور جس روز خدا نے فرعون کو غرق کیا وہ ۲۲ رمضان کا دن تھا اس لئے روایت مذکورہ کی کوئی وجہ صحت نہیں ہو سکتی"

یہ سب کچھ بیرونی کا بیان تھا، بیرونی نے اس روایت سے تین مقدمے اخذ کئے ہیں (۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں عاشورۂ یہود کے دن داخل ہوئے (۲) یہ دن مسلمانوں کے عاشورے کا دن بھی تھا (۳) اور اسی دن خدا نے فرعون کو غرق کیا۔

اس کے بعد بیرونی نے ان تینوں مقدموں کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، یعنی وہ یہ تسلیم نہیں کرتا کہ سال ہجرت میں دونوں عاشورے مطابق تھے، یعنی عاشورائے یہود سہ شنبہ کے دن تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دوشنبہ کے دن مدینہ میں داخل ہوئے اور یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ یہ دن غرق فرعون اور نجات موسیٰ کا تھا۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو بیرونی کے استدلال سے حدیث کی عدم صحت ثابت نہیں ہوتی کیونکہ دونوں عاشوروں (عاشورائے یہود اور عاشورائے عرب) کا مطابق نہ ہونا حدیث کی عدم صحت پر دلالت نہیں کرتا اس لئے کہ حدیث میں مطابقت کا دعویٰ ہی نہیں کیا گیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ عدم مطابقت سے ان لوگوں کے خیال کی تغلیط ہوتی ہے، جو سمجھتے ہیں کہ حدیث سے مطابقت مفہوم ہوتی ہے۔ اور بیرونی کا یہ قول کہ عاشورائے یہود سہ شنبہ کے دن تھا اور آنحضرت کا داخلہ دوشنبہ کے دن ہوا ہے یہ بھی غلط ہے کیونکہ صحیح حسابات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سال ہجرت میں یہودیوں کے سال کا پہلا دن ۱۱ ایلول (۱۱ ستمبر یا ۲۹ صفر) کو اتوار کے دن تھا۔ ۱۲ ایلول کو نہ تھا، جیسا کہ بیرونی کا خیال ہے۔ لہذا عاشوریٰ یا ۱۰ تشری، دوشنبہ آٹھ ربیع الاول کے مطابق ہے سہ شنبہ ۹ ربیع الاول کے مطابق نہیں ہے۔

اب رہا بیرونی کا یہ خیال کہ یوم ہجرت، یوم غرق فرعون کے مطابق نہ تھا، کیونکہ توریت میں اس کے خلاف تصریح موجود ہے، اس سے بھی روایت کی تغلیط نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ یہ روایت کی غلطی نہیں ہے بلکہ یہودیوں کا یہ خیال کہ اس دن خدا نے فرعون کو غرق کیا ہے بجنسہ روایت کر لیا گیا ہے اس لئے اگر غلط ہے تو ان کا خیال غلط ہے، نفس روایت غلط نہیں ہو سکتی۔

تحقیق مذکورۂ بالا کے علاوہ اور طریقوں سے بھی ثابت کیا جا سکتا ہے کہ مدینہ میں آنحضرت کا داخلہ ۱۰ ستمبر ۶۲۲ء مطابق ۱۰ تشری کو تھا اور یہی یہودیوں کا عاشورا تھا۔

(۱) مسعودی، مروج الذہب میں لکھتا ہے کہ تاریخ یزدجرد اور ہجرت کے درمیان ۳۶۲۴ دن کا فرق ہے اس پر اتفاق ہے کہ آنحضرت کا داخلہ مدینہ میں پہلی محرم کے ۶۷ دن بعد ہوا اس لحاظ سے تاریخ ہجرت اور تاریخ یزدجرد میں ۳۶۲۴ دن کا فرق ہے (۳۶۲۴-۶۷ = ۳۵۵۷) اور چونکہ تاریخ یزدجرد کی ابتدا ۱۶ جولائی ۶۳۲ء کو ہوتی ہے (یعنی آنحضرت کی وفات کے ۹۰ یا ۹۱ دن بعد)

اس لئے اس تاریخ سے ۶۰ دن پیچھے شمار کرنے سے یوم ہجرت نکل سکتا ہے اور وہ ۲۰ ستمبر ۶۲۲ء دوشنبہ کا دن ہے اور یوں داخلہ مدینہ کا دن ہے۔ اور یہودی تاریخ کے حساب سے ۱۰ تشری کے مطابق ہے۔

(۲) کتب خانہ پیرس کی ایک پرانی کتاب کے قلمی نسخہ میں لکھا ہے کہ آنحضرت کی ولادت سے پہلے جو مشتری اور زحل کا قران ہوا تھا اس سال کے اعتدال ربیعی اور آنحضرت کے سال ہجرت کے پہلے دن کے درمیان ۵۱ سال چار مہینہ اور سولہ گھنٹے (فارسی سال کے حساب سے) کا فرق تھا۔

حساب کی رو سے ثابت ہے کہ ولادت باسعادت سے پہلے ۲۹ یا ۳۰ مارچ کو قران مذکور واقع ہوا تھا اور آفتاب نقطۂ اعتدال پر ۱۹ مارچ ۵۷۱ء کو رات کے تین بجکر ۱۱ منٹ پر ہوا تھا لہذا سال ہجرت کے محرم کی پہلی تاریخ ۱۹۔ مارچ ۵۷۱ء کو ۳ بجکر ۱۱ منٹ پر شروع ہوئی ہوگی اور ان دونوں کے درمیان (فارسی سنہ کے حساب سے) ۵۱ سال چار مہینے آٹھ دن اور سولہ گھنٹے کا فرق ہونا چاہئے اور چونکہ فارسی سال ۳۶۵ دن کا ہوتا ہے، اس لئے اس مدت کے اگر ہم دن بنائیں گے تو ۱۸۷۴۳ دن ۱۶ گھنٹے ہوں گے اور چونکہ ہجرت، محرم سے ایک مہینہ آٹھ روز بعد ہوئی ہے اس لئے درمیان ہجرت اور درمیان اعتدال ربیعی کے (۱۸۷۴۴ + ۶۷ = ۱۸۸۱۱) دن گذرے ہوں گے اور یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ اعتدال ربیعی ۱۹۔ مارچ ۵۷۱ء کو واقع ہوا تھا اس لئے اس حساب سے بھی تاریخ ہجرت ۲۰ ستمبر ۶۲۲ء نکلتی ہے اور یہی ۱۰ تشری کے مطابق ہے جو یہودیوں کے صوم الکبور کا دن ہے۔

غزل

ایسے کہاں نصیب کہ ہوں ہمکنار دوست　　قایم رہے کہیں خلش انتظار دوست
کچھ کچھ ہمارے دل کو سکوں ہو چلا تھا پھر　　یہ تو نے کیا کیا نگہ بے قرار دوست
سب شکوے، دلکے مٹ گئے، بس اک جواب میں　　اُف رے فریب وعدۂ نا استوار دوست
غربت کے دن بھی کٹ ہی گئے، خیر شکر ہے　　اچھا مرا سلام لے، یاد و یار دوست
یاں ہر خلش، جنوں کدۂ اضطرار دل　　واں، ہر نگہ کرشمۂ بے اختیار دوست
اے وائے صد ہزار تمنائے مضطرب　　خلوت میں بھی وہی ہے فریب قرار دوست

گو تم نے لاکھ کام لیا ضبط سے نیاز
پہچان ہی گئی نگہ ہوشیار دوست

نیاز

ستی

(افسانہ)

ارجن سنگھ کا تعلق ایک نہایت قدیم راجپوت خاندان سے تھا، غدر سے پہلے اُن کی ریاست بندیلکھنڈ میں ایک خاص امتیاز رکھتی تھی، جب ۱۸۵۷ء میں بد امنی پھیلی تو ارجن سنگھ کے باپ دلاور سنگھ نے بھی اس میں کافی حصہ لیا اور ایک ہزار راجپوتوں کی جماعت سے جو دلاور سنگھ کے نام پر ہر وقت جان دینے کے لئے آمادہ رہتی تھی، انہوں نے اپنی حدود ریاست کو بہت زیادہ وسیع کر لیا۔

ایک سال کے بعد جب ہندوستان کے تمام عناصر اپنی اپنی اصلی حالت پر آگئے اور حکومت نے اپنے دوست و دشمن کی فہرست مرتب کرنی شروع کی تو دلاور سنگھ کا نام بھی مخالفین میں لکھا گیا اور اُن کی قدیم ریاست کے حدود بھی تنگ کر کے صرف ۲۰۰ گاؤں اُن کے لئے چھوڑ دیئے گئے۔ دلاور سنگھ کے لئے یہ صدمہ نہایت غیر معمولی صدمہ تھا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے اور اس کے دوسرے ہی سال ارجن سنگھ اُن کا بیٹا ریاست رام نگر کا مالک ہو گیا

ہر چند ریاست رام نگر کے حدود بہت تنگ ہو گئے تھے اور اس لحاظ سے اس کے محاصل بھی کم ہو گئے تھے، لیکن پھر بھی صدیوں کی بنی ہوئی ریاست تھی اور اس کے بگڑنے کے لئے بھی ایک زمانہ درکار تھا، جب جوان ارجن سنگھ ایک سال بعد گدی پر بیٹھا تو ساری ریاست میں گویا از سر نو جان پڑ گئی اور رام نگر کی گڈھی نے جشن و مسرت کے لئے تمام وہ طلائی اور نقرئی سامان نکال کر باہر رکھ دیا جو پشتوں سے اس حکمران خاندان کی یادگار چلا آتا تھا۔

گڈھی کے بلند دروازہ پر موسیقی، شہنائیوں کی نرم و شیریں آواز کے ذریعہ سے اپنی مبارکباد پیش کر رہی تھی، دروازہ کے سامنے کی سڑک پر دو رویہ سواروں کی صفیں جن کے گھوڑے اپنے زرین ساز و یراق کو دیکھ دیکھ کر مسرت سے لبریز اور بیقرار نظر آتے تھے، جمی ہوئی تھیں، سواروں کے بانکے صافے، چست پاجامے، کھبی ہوئی چپکن، پہلو میں لگی ہوئی آبدار کٹاریں، گلے میں حمائل کی ہوئی تلواریں، بل کھائی ہوئی مونچھیں، کانوں سے بندھی ہوئی داڑھیاں، اور پھر ان کے وہ کڑے تیور جو ایک راجپوت سے کبھی جدا نہیں ہوتے عجیب سماں پیش کر رہے تھے۔

سواروں سے ذرا پیچھے ہٹ کر ہاتھیوں کی صفیں تھیں، جن کے مرصع جھول، زرکار ہودے، صبح کی روشنی میں جگمگا رہے تھے، سنگوٹیاں چڑھے ہوئے دانت، رنگین کی ہوئی مستکیں، جن پر مہاوت سرخ وردیاں پہنے ہوئے اپنے آنکس چمکا رہے تھے، ماہی مراتب کا جلوس، اس کا طلائی و نقرئی سامان، بینڈ والوں کا دستہ، گڈھی کے اندر دروازوں کے سامنے سرداروں کا ہجوم، چوبداروں کی قطار، جوان جوان چھریوں کی آمد و رفت، بھاٹوں کی رجز خوانی، غرض اس سے عبارت تھا وہ جشن جس نے ارجن سنگھ کی تقریب تخت نشینی پر ساری ریاست کو پُر رونق بنا رکھا تھا۔

محل کے اندر سنگ مرمر کے ایک چبوترہ پر نہایت قیمتی کارچوب کی مسند بچھی ہوئی ہے، سبز مخمل کا تکیہ جو زرین کام سے بالکل لپا

ہوا ہے قرینہ سے کنارے رکھا ہوا ہے اور راجپوت خاندان کی دو نوجوان لڑکیاں ہاتھوں میں چنور لئے کھڑی ہیں، چبوترے کے دونوں طرف رنواس کی عورتیں، طلائی اور نقرئی پیالیوں میں صندل، سیندور، پسی ہوئی ہلدی، چاول وغیرہ لئے کھڑی ہیں تاکہ مہاراجہ کی پیشانی پر تلک لگا کر گدی نشینی کی رسم کو پورا کریں۔

ارجن سنگھ کی شادی ریاست رام نگر کے ایک معزز راجپوت سردار کی لڑکی سے ہو چکی تھی، اور حقیقت یہ ہے کہ ارجن سنگھ جن خوبیوں کا رئیس تھا، انہیں صفات کی رانی بھی اسے ملی تھی اور یہی سبب تھا کہ اگر گڈھی کے باہر جشن و مسرت کا ہنگامہ پیدا تھا تو گڈھی کے اندر بھی رانی سندر پتی کی داد و دہش، عالی حوصلگی، فیاضی اور خوش اخلاقی نے دھوم مچا رکھی تھی۔

ارجن سنگھ ابھی حمام ہی میں تھا کہ گڈھی کے دروازے پر ایک سوار دوڑا ہوا آیا اور اس نے اطلاع دی کہ راجہ رتن بیر سنگھ کی سواری، جسے جشن میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی، قریب آگئی ہے۔ اس کی خبر ہوتے ہی اندر سے لیکر باہر تک اک ہنگامہ برپا ہو گیا، ایک ہلچل مچ گئی، بینڈ شروع ہو گیا، نفیریاں چیخنے لگیں، شہنائیاں زور زور سے بجنے لگیں، نوبت، نقارے، دھونسے بجنے لگے، مہریاں جلدی جلدی اندر سے باہر، باہر سے اندر آنے جانے لگیں، نقیب آوازیں لگا رہے تھے، چوبدار اپنے عصا چمکا رہے تھے، بھاٹ کبت پڑھ رہے تھے کہ راجہ رتن بیر سنگھ، فوج کی سلامی لیتے ہوئے، سرداروں کے استقبال میں اپنے گھوڑے پر سوار پھاٹک پر پہونچ گئے اور ہاتھی، پالکیاں، فینسیں، دروازہ پر لگ گئیں، جن سے بسل گڈھ کی رانیاں اور لڑکیاں اتر اتر کر قلعہ میں داخل ہو گئیں۔

(۲)

دلاور سنگھ نے اپنے بعد تین اولادیں چھوڑیں تھیں۔ ان میں سب سے بڑا بیٹا ارجن سنگھ (ولی عہد) تھا، دوسرا رنجور سنگھ جس کی عمر بیس سال کی تھی اور ایک بیٹی شیام کنور جو رنجور سنگھ سے دو سال چھوٹی تھی۔

اگر ارجن سنگھ سے اس کی رعایا کو صرف محبت تھی تو وہ رنجور سنگھ کی پوجا کرتی تھی، کیونکہ ارجن سنگھ نے تمام انتظام اسی کے سپرد کر دیا تھا اور یہ اپنے بھائی کی حد درجہ عظمت کرتے ہوئے اپنا تمام وقت رعایا کی دلدہی میں صرف کیا کرتا تھا۔ اسی طرح محل کے اندر کا انتظام رانی سندر پتی نے اپنی نند شیام کنور کے سپرد کر دیا تھا، جو بے انتہا ہوشیار، منتظم اور ہنس مکھ لڑکی تھی۔

ریاست بسل گڈھ اور ریاست رام نگر میں بہت ارتباط تھا اور بارہا ایسا ہوا کہ دونوں ریاستوں نے متفقہ طور پر دشمن کا مقابلہ کیا اور بڑی سے بڑی فوج کا منہ پھیر دیا۔ راجہ رتن بیر سنگھ یوں تو بہت سی کنبہ کی لڑکیاں رکھتا لیکن اولاد کی طرف سے بدقسمت تھا، دس سات لڑکوں چار لڑکیوں میں صرف ایک لڑکی سوشیلا زندہ رہی جس کی عمر اس وقت اٹھارہ سال کی تھی اور جو اپنی فہم و تمیز، صورت شکل کے لحاظ سے بندیلکھنڈ کے تمام راجپوت خاندانوں میں وہی حکم رکھتی تھی، جیسے کسی چمن میں گلاب کا وہ پھول جو سب سے اونچی ٹہنی پر کھلا ہوا سب سے پہلے اپنی ہی طرف لوگوں کی نگاہوں کو کھینچ لیتا ہے۔ چونکہ ان دونوں خاندانوں میں اک زمانہ سے اتحاد قائم تھا اور عورتوں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی اس لئے سوشیلا اور شیام کنور میں بے انتہا ارتباط

بڑھ گیا تھا اور مہینہ میں آٹھ دس روز کے لئے ان دنوں کا یکجا ہونا ضروری تھا۔ سبل گڈھ اور رام نگر میں صرف پندرہ کوس کا فصل تھا۔

(۴)

بسنت کا موسم ابھی ختم نہیں ہوا ہے، دلوں کی امنگیں بدستور باقی ہیں، بہار کی دیوی نے ہنوز دیبا سبز لباس نہیں اتارا ہے، کھیتوں کی رونق، باغوں کی شگفتگی ابھی تک قایم ہے جشن کی دوسری رات کو گلبازی کی رسم رام نگر کے قلعہ میں ادا ہونے والی ہے، پھولوں کا انبار لگا ہوا ہے، محل کے اندر کوٹھوں پر چاندنی میں لڑکیوں اور عورتوں کا ہجوم مصروف نشاط ہے، نیچے شیام کنور اور سوشلا دونوں انتظام میں مصروف ہیں، فرش، چاندنیاں، قالین، تکیہ، مشعلیں، شمعیں، عطردان، گلاب پاش، بخوردان، تھالیاں، چنگیریں، کٹوریاں، عبیر و گلال باہر اندر بھیج رہی ہیں، مہریاں آجا رہی ہیں، بچے کھیل رہے ہیں، نوجوان لڑکیاں آپس میں ایک دوسرے کو چھیڑ رہی، ہاتھوں میں پچکاریاں لئے ایک دوسرے پر ڈال رہی ہیں۔ اور دوڑ، دھوپ سے نازک رخساروں اور پیشانیوں پر جو قطرے پسینہ کے پیدا ہو جاتے ہیں تو انہیں ایک طرف گردن جھکا کر نازک انگلی کے خم سے زمین پر گراتی جا رہی ہیں اور کوئی ان موتیوں کو چننے والا موجود نہیں ہے۔

الغرض اسی طرح اندر باہر چہل پہل مچی ہوئی تھی، اک شور و ہنگامہ برپا تھا کہ رنجور سنگھ باہر کے انتظام سے فارغ ہونے کے بعد پشت محل کا چور دروازہ کھول کر جلدی کے خیال سے اندر داخل ہوا تاکہ اپنی بہن شیام کنور سے صبح کے اہتمام کے متعلق مشورہ کرے، وہ سمجھتا تھا کہ نیچے پردہ ہوگا اور سبل گڈھ کی رانو اس اوپر ہوگی، عجلت میں اطلاع کرانا بھول گیا، سوشلا تھک کر اندر دالان میں تخت پر لیٹ گئی تھی اور ایک طرف کروٹ لیکر آنکھیں بند کئے ہوئے اپنے دکھے ہوئے اعضا اور تھکے ہوئے دماغ کو سکون پہونچا رہی تھی کہ شیام کنور نے باہر کے دالان سے آواز دی "واہ سوشلا، ابھی سے تھک گئیں، ذرا باہر تو آؤ، دیکھو یہ پوجا کی تھال ٹھیک ہو گئی یا نہیں"

سوشلا جسے شیام کنور سے بڑی محبت تھی، اٹھی اور عین اسی وقت جبکہ وہ کھڑی ہو کر باہر جانے کے لئے اک آخری انگڑائی لے رہی تھی پہلو کے دروازہ سے رنجور سنگھ نکلا اور دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے کے مقابل ہو گئیں۔

بجلی نگاہوں کے سامنے کوندتی ہے، لیکن اس طرح نہیں، برقی رو نہایت تیزی سے دوڑ جاتی ہے، لیکن اتنی سرعت کے ساتھ نہیں، دو نگاہوں کا ملنا جسموں میں سنسنی پیدا کر دیتا ہے، لیکن اس شدت کے ساتھ نہیں، رنجور سنگھ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور اک بت کی طرح وہیں دروازہ کے چوکھٹے میں جہاں سے وہ نکل رہا تھا قایم ہو گیا۔ سوشلا بدحواس ہو کر باہر نکل گئی اور فرش پر اس طرح گھبرا کر گر پڑی جیسے کوئی ہرنی شکاری کے تعاقب سے نجات پا جانے کے بعد بھی دیر تک اپنی سانس کو درست نہیں کر سکتی۔

شیام کنور یہ دیکھ کر پریشان ہو گئی اور فوراً ہی دالان میں دوڑی ہوئی گئی کہ سوشلا کے اس طرح بھاگنے کا سبب معلوم کرے، لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ شیام کنور کو اس وقت نہ زیادہ غور کرنے کی فرصت تھی نہ اصرار کی۔ اپنے کام میں لگ گئی اور سوشلا سے یہ

کہہ کر تم بہت تھک گئی ہو ذرا آرام کر لو"۔ باہر کسی اور کام سے چلی گئی۔

(۴)

رام نگر میں یہ جشن مسلسل سات دن تک قایم رہا اور ایک کو دوسرے کی خبر نہوئی کہ کس لطف میں اس کی یہ زندگی بسر ہوئی، گویا ہر شخص فردوس میں تھا اور اس لئے رنجور سنگھ کے دل میں سو شلا کے سانولے رنگ نے جسطرح آہستہ آہستہ آگ مشتعل کرنا شروع کی اس کا پتہ کسی کو نہ چلا، یہاں تک کہ شیام کنور بھی کوئی تغیر اپنے بھائی میں محسوس کر سکی۔

آٹھویں دن جب راجہ رن بیر سنگھ رخصت ہونے لگا اور رنجور سنگھ کو یقین ہو گیا کہ اب اسکے دل کی ملکہ اسکی روح کی دیوی، جس کی خاموش پرستش وہ اتنے دنوں سے کر رہا تھا زیادہ قیام نہیں کر سکتی تو اس کا دل تڑپ کر رہ گیا اور باوجود اسکے کہ وہ حد سے زیادہ ضابط و متین نوجوان تھا بے اختیار ہو کر اپنے بھائی کے پاس گیا اور پوچھا کہ "سبل گڈھ کی رنواس لیکر کون جائیگا؟"

راجہ ارجن سنگھ نے کہا "شمشیر سنگھ جوالدار"۔

رنجور سنگھ:۔ "کیا آپ نے اسپر غور کر لیا ہے کہ اس صورت میں جب کہ منگل گڈھ ٹھاکر نے سبل گڈھ کی دشمنی پر پوری طرح کمر باندھی ہے شمشیر سنگھ کی سپردگی میں سب کو روانہ کرنا کرنا مناسب ہے؟"

ارجن سنگھ:۔ "ہاں یہ صحیح ہے لیکن رن بیر سنگھ بھی تو موم کا بنا ہوا نہیں ہے اور پیر وہ سبل گڈھ سے یہاں آیا کہ نہیں"

رنجور سنگھ:۔ "ممکن ہے کہ دشمن نے اسوقت مناسب نہ سمجھا ہو۔ اور پھر یہ تو میزبان کا فرض ہے کہ وہ مہمان کو حفاظت کے ساتھ اس کے گھر تک پہونچا دے۔ اگر خدانخواستہ راستہ میں مقابلہ ہو گیا تو رن بیر سنگھ کے پچاس سپاہی اور شمشیر سنگھ جوالدار کیا کرے گا، میری رائے میں تو کوئی اور انتظام کرنا چاہئے"۔

ارجن سنگھ:۔ "رنجور، تم یہ کیسی باتیں کر رہے ہو، میں نے سارا انتظام تو تمہارے سپرد کیا ہے اور تم اس معاملہ میں مجھ سے اصرار کر رہے ہو۔ میں نے تمہارے کس انتظام میں دخل دیا ہے کہ اس معمولی سی بات میں مخالفت کرونگا، تم جو چاہو کرو، جس کو چاہو روانہ کر دو"۔

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ شیام کنور آئی، اور اس ناز کے ساتھ جو ایک چھوٹی بہن کو اپنے بڑے بھائی پر ہوتا ہے ارجن سنگھ سے بولی کہ "تم لوگوں کو مہمان داری کرنی خوب آتی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ رنواس کے ساتھ شمشیر سنگھ جا رہا ہے، رنجور، کیا تمہاری عقل بھی بالکل ماری گئی۔ یوں چاہے کوئی کچھ نہ کہے، لیکن یہ تو سمجھو کہ سو شلا کے باپ اپنے جی میں کیا کہیں گے کہ بلا کر ہماری بڑی قدر کی۔ رنجور، اٹھو اور تم خود سبل گڈھ تک سب کو پہونچا کے آؤ"۔

رنجور نے اپنے بڑے بھائی کے جھک کر پاؤں چھوئے اور باہر چلا گیا۔

(۵)

رن بیر سنگھ:۔ "کنور رنجور سنگھ کل صبح جانے کی اجازت چاہتے ہیں"۔

سوشلا :۔ "مہاراج، ابھی نہ جانے دیجئے، کم از کم تین دن اور ٹھہرائیے نہیں تو شیام کنور مجھے طعنہ دے گی کہ بھائی کو دو دن بھی نہ ٹھہرایا گیا۔"

رن بیر سنگھ :۔ "میں نے تو اس سے کہا تھا، لیکن وہ نہیں مانتا کچھ گھبرایا ہوا سا ہے، انہیں کو شاید مان جائے۔"

رن بیر سنگھ بغیر اس کے کہ وہ سوشلا کا جواب سنتا، محل سے باہر چلا گیا اور چوبدار کو حکم دیا کہ کنور رنجور سنگھ کو کہہ دے کہ سوشلا رانی (سوشلا عام طور سے اسی لقب کے ساتھ یاد کی جاتی تھی) یاد کر رہی ہیں۔

برسات کا پہلا چھینٹا سوکھے ہوئے درخت کے لئے، آب حیات کا چشمہ جاری، دن بھر کے تھکے ہوئے پیاسے ہرن کے لئے، نو بہار بلبل کے لئے، آم کا پھول کوئل کے لئے اس قدر باعث تازگی و مسرت نہیں ہو سکتا جس قدر ایک محبوب کا پیام کسی ایسے عاشق کے لئے جو غریب کوئی تمنا بھی پیدا نہیں کر سکتا، لیکن رنجور سنگھ یہ پیام سن کر سکتہ میں آ گیا، چوبدار کی صورت تکنے لگا۔ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد اس کے بدن پر ایسا رعشہ طاری ہو گیا جیسے بید کی شاخ کو کوئی ہوا کا جھونکا کپکپا کے چلا جائے۔

وہ متحیر تھا کہ اس پیغام کی صداقت کو کیونکر تسلیم کرے، وہ کس طرح یقین کرے کہ سوشلا نے اسے بلایا ہے اور اگر بلایا ہے تو کیوں؟

سبل گڈھ کی گڈھی کے سب سے بالائی حصہ میں دالان کے دروازہ پر زرلفت کے پردے پڑے ہوئے ہیں سامنے رنجور سنگھ ایک صندلی چوکی پر اس طرح بیٹھا ہوا ہے، جیسے کسی مجرم کو سزا کا حکم سنایا جانے والا ہو۔ اس کو آئے ہوئے پانچ منٹ سے زیادہ نہ ہوئے ہوں گے کہ اس نے سینکڑوں دنیائیں بنا بنا کر بگاڑ ڈالیں، اس نے خدا جانے کیسے کیسے عالیشان قصر تعمیر کر کر کے ڈھا دئے اور کسے خبر ہے کہ کتنی آرزوؤں کا حشر اس کے سینہ میں برپا ہو ہو کر رہ گیا وہ بائیں ہاتھ پر اپنے مضمحل اور سوگوار سر کو رکھے ہوئے تلوار کے قبضہ کو جو اس کے سامنے رکھی ہوئی تھی، انہماک کے ساتھ دیکھ رہا تھا کہ پردہ کو جنبش ہوئی اور پردہ کو کیا جنبش ہوئی اس کی روح کو جنبش ہوئی، یہ کپکپانے لگا، ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ آنکھوں کے سامنے تاریکی چھا گئی اور وہی منظر سامنے آ گیا، جب رام نگر میں اس نے اول اول سوشلا کو دیکھا تھا۔

سوشلا :۔ "کنور صاحب، آپ کیا ہم لوگوں سے خفا ہیں" ؟

اسوقت تک رنجور سنگھ سوچ رہا تھا کہ جب اس سے کوئی سوال کیا جائے گا تو وہ حد درجہ نرمی اور تہذیب کے ساتھ جواب دے گا لیکن جب وہ وقت آیا، جب اس کے صبر و ضبط کے امتحان کی ساعت آئی تو وہ سخت ناکامیاب ثابت ہوا اور نہایت ہی اضطراب کے ساتھ چونک کر صرف یہ جواب دے سکا کہ "نہیں تو کون کہتا ہے" ؟

رنجور سنگھ کی حالت اس وقت اس قدر عجیب و غریب تھی کہ سوشلا جو پردہ کی اوٹ سے اس کو دیکھ رہی تھی، ضبط نہ کر سکی اور بے اختیار ہنس پڑی۔ وہ اول ہی دن سمجھ گئی تھی کہ رنجور سنگھ کا دل پوری طرح مجروح ہو چکا ہے لیکن اسوقت وہ یقین کی اس حد تک پہونچ گئی تھی، جب تیر چلانے والے کو بھی اپنے شکار پر رحم آ جاتا ہے اور اس کی تڑپ سے لذت کے بجائے اسے آزار پہونچنے لگتا ہے۔

رنجور سنگھ نے بھی ہنسی کی اس آواز کو، آبشار کے اس ہلکے سے ترنم کو، بلبل کی اس لحن دلنواز کو اور موجِ کوثر و تسنیم کی اس نازک صدا کو سنا اور ایسا محسوس کرنے لگا کہ اب اسکا سینہ جذبات کی فراوانی سے پھٹا جا رہا ہے، گریۂ بے اختیار امنڈا امنڈ کر اس کی آنکھوں میں آ رہا ہے اور وہ سوشلا کے قدموں پر گر کے پھوٹ پھوٹ کر رو دینا چاہتا ہے، لیکن پھر ضبط کیا۔ وہ ضبط جو سینے سے دھواں بلند کر دیتا ہے جو آنکھوں سے خون ٹپکا دیتا ہے اور جو قلب کو شق کر کے کلیجہ کو منہ تک لے آتا ہے۔

رنجور سنگھ کا سر جھک آیا، تلوار اسکی آغوش سے نیچے گر گئی، صندلی میں جنبش پیدا ہوئی اور رزم بزم کا وہ نوجوان جسنے اسوقت تک تلوار کی چھاؤں میں پرورش پائی تھی، اک لڑکی کے سامنے اسطرح غش کھا کر گر پڑا جیسے اندر سے کھوکھلے درخت کو ہوا کا جھونکا زمین پر گرا جاتا ہے۔

چاہیے تھا کہ سوشلا اس منظر کو دیکھ کر گھبرا جاتی، چیخ مار کر بھاگ جاتی، لیکن وہ جانتی تھی کہ اس کی یہ تدبیر نہیں ہے، وہ سمجھتی تھی کہ جس نے آگ لگائی ہے اسی کو بجھانا بھی پڑے گا، اس لئے محبت کی وہ چنگاری جو اس کے دل میں بھی اس وقت تک سلگ رہی تھی دفعتہً بھڑک اٹھی، اور تمام وہ مدارج جو اک حسن کو اپنے نقاب پوش ہونے کی حالت سے لے کر بند حجاب وا کر دینے تک عشق کی پذیرائی میں طے کرنے پڑتے ہیں، سوشلا نے آنِ واحد میں طے کر لئے اور بے اختیار پردہ سے باہر آ کر بے ہوش رنجور کا سر اپنے زانو پر رکھ کر اپنے آنچل سے اس کو ہوا دینے لگی۔

سوشلا ہر چند اک ناتجربہ کار لڑکی تھی، لیکن اس کے پہلو میں ایک راجپوت دل تھا اور دماغ میں عزم و ارادہ کی قوت، اس لئے جب تک اس نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا، وہ پس و پیش کرتی تھی کہ رنجور سنگھ کے دل کے ساتھ کیا معاملہ کرے، لیکن جب اس نے ایک بار طے کر لیا کہ وہ صرف رنجور ہی کی ہو کر رہ سکتی ہے، جب اس کی روح ایک بار اس خیال کے سامنے دو زانو ہو گئی جب وہ اپنا نہ جذباتِ پرستش محسوس کرنے لگی جو صرف ایک ہندو عورت ہی کے اندر پائے جا سکتے ہیں، تو اس نے اپنی دنیا کو تنگ کرنا شروع کیا، دنیاوی مصالح کو نظر انداز کرنے لگی، ننگ و ناموس کے مفہوم کو وہ صرف روحانی نقطۂ نظر سے دیکھنے لگی اور آخر کار اس نے فیصلہ کر لیا کہ میری دنیا صرف رنجور کی محبت ہے اور میری مصلحت وہی ہونا چاہیئے جو اس کی دلدہی اور پرستش سے وابستہ ہے۔

اس وقت تک کہ رنجور سے اس نے سوال کیا تھا وہ شریر تھی، رنجور کی بے قراری و بدحواسی سے لطف اٹھانے کا عزم رکھتی تھی لیکن جب رنجور نے اپنی بیہوشی سے، جو ایک عاشق کا نہایت ہی خاموش مگر کارگر حربہ ہے، جو مقاومتِ حسن کے لئے محبت کا تنہا ذریعہ کامیابی ہے، سوشلا کے سامنے اپنی زندگی کا ایک نیا ورق الٹ کر پیش کیا اور اس نے محبت کی اس دلگداز داستان کو اپنی آنکھوں سے سن لیا، تو اس نے سمجھ لیا کہ ہم دونوں کی روحوں کو باہم فطرت نے ملا دیا ہے اور مجھے کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ اپنے جسم کو اس سے چھپاؤں جسکے سامنے میری روح عریاں ہے اور اس کا جسم چھونے سے گریز کروں، جس کی روح میرے قلب کی تمام گہرائیوں میں میرے جسم کے تمام عروق میں خون کے ساتھ ملی ہوئی دوڑ رہی ہے۔

سوشلا اب اس کے اوپر جھکی ہوئی اسی محبت سے دیکھ رہی ہے، جس طرح وہ اپنے شوہر کو دیکھ سکتی تھی اور اس کی پیشانی کا پسینہ اس طرح احتیاط سے اپنے رومال میں جمع کر رہی ہے، جیسے کوئی بکھر جانے والے موتیوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر یکجا کرتا ہے

(۶)

رنجور کو سبل گڈھ سے گئے ہوئے کئی ہفتہ گذر گئے ہیں اور اس آخری ملاقات کے بعد جسے محبت کی اولین کامیابی کہنا چاہئے باہم تبادلۂ خیالات کا موقع نہیں ملا۔ پھر چونکہ جذبات مستور حقیقتاً وہ چنگاریاں ہیں جو بغیر خصوصی طور پر سینہ کے اندر جمع ہوتی رہتی ہیں اس لئے یہ کہنا بیجا نہوگا کہ رنجور و سوشیلا دونوں اپنی اپنی جگہ آتش محبت کے شدید ترین التہاب کی پرورش کر رہے تھے اور اس سے بے خبر تھے کہ اسکا انجام کیا ہونا ہے۔

سبل گڈھ میں ہولی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ سرمائی لباس تہ کرکے رکھدیا گیا ہے نازک جسموں پر ہلکی ہلکی ساریوں سے ہوا کو پھر چھیڑ چھاڑ کا موقع مل گیا ہے خون رقیق ہوکر رگوں میں دوڑ رہا ہے اور فطرت حسین رخساروں پر عبیر و گلال ملکر اپنی ہولی کھیل چکی ہے چونکہ گذشتہ بسنت کے دربار میں رن بیر سنگھ کو ارجن سنگھ نے دعوت دی تھی اسلئے ہولی کے موقع پر رام نگر کے تمام میزبان سبل گڈھ کے مہمان بننے والے تھے اور ان کی پذیرائی کی طیاریاں ہو رہی تھیں، یوں تو تمام تقریبات میں سوشیلا ہی انتظام کرتی تھی اور اسکا سلیقہ ایسی محفلوں کو کامیاب بنایا کرتا تھا لیکن اس مرتبہ اس کا انہماک اک خاص رنگ لئے ہوئے تھا، یعنے کہنے کو تو وہ سارے رام نگر کا انتظام کر رہی تھی لیکن اس کے پیش نظر صرف ایک ہستی تھی ایک وجود تھا جو ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی تصویر کو اس کی نگاہوں سے جدا نہ کرتا تھا۔

راجہ ارجن سنگھ کے کمرہ میں وہ سارا اسباب آرائش فراہم کر رہی تھی اور سوچتی جاتی تھی کہ وہ رنجور کا بھائی ہے، شیام کنور کی قیامگاہ میں سارا سامان راحت پہونچا رہی تھی اور دل ہی دل میں کہتی جاتی تھی کہ یہ رنجور کی بہن ہے۔ رانی سندر پتی کے لئے انتظام کرتی تھی اور سمجھ رہی تھی کہ یہ رنجور کی بھاوج ہے، غرض وہ رام نگر کے ایک ایک سردار کے مہمان کا اہتمام کر رہی تھی اور خوش تھی، کیونکہ ان میں سے ہر ایک اس سرزمین سے وابستہ تھا جہاں رنجور سانس لیتا ہے۔

چونکہ مہمانوں کی آمد میں صرف ایک دن باقی رہ گیا تھا اس لئے سوشیلا حد درجہ منہمک نظر آتی تھی اور اس کے ساتھ اس کی خالہ زاد بہن تارہ بھی جو سبل گڈھ کے ایک غریب سردار کی لڑکی تھی کام میں مصروف تھی، تارا اور سوشیلا ایک ہی دن پیدا ہوئیں اور صورتاً اس قدر مشابہ تھیں کہ اگر سوشیلا اپنے ملبوس اور زیور کے سبب سے وجہ امتیاز نہ رکھتی تو تارا کو سوشیلا سمجھ لینا کچھ دشوار نہ تھا۔

تارا نہ صرف اپنی صورت کے لحاظ سے اپنے سورج بنسی خاندان کے لئے مایہ ناز تھی بلکہ اپنی سیرت کے اعتبار سے بھی وہ صحیح معنی میں شاہانہ ادائیں رکھتی تھی اور محبت کرنا تو گویا اس کا خمیر تھا۔ لطف و رافت اس کی فطرت تھی اور ہمدردی و دلجوئی اسکی طبیعت ثانیہ۔ باوجود اس کے کہ وہ غریب تھی لیکن گاؤں میں ہر آزار رسیدہ لڑکی کو اس کے ہاں پناہ ملجاتی اور باوصف اسکے کہ وہ بہت کمسن تھی لیکن محلہ کا ہر جھگڑا اسی کے مشورے سے طے ہوتا تھا، سوشیلا کو اس کے ساتھ حد درجہ محبت تھی اور چاہتی تھی کہ کسی طرح اس کو دنیاوی افکار کی طرف سے مطمئن دیکھے، لیکن سوشیلا کا خالو جو راجہ ارجن سنگھ کا ہم زلف تھا، اپنی وضع کا راجپوت تھا اور وہ کسی طرح کی امداد قبول نہ کرتا تھا۔

مختلف مقامات سے تارا کی شادی کے پیغام آئے لیکن اس کے باپ نے کسی کو منظور نہ کیا، اور کوئی نہ کوئی نقص پیدا کرکے سب کو رد کر دیا۔

سوشلا چاہتی تھی کہ کسی طرح جلد اسکی شادی ہو جائے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی نگاہ میں بھی کوئی ایسا شخص نہ تھا جسے وہ تارا کے لئے موزوں سمجھتی۔

(۷)

ہولی کا مخصوص دن اپنے تمام ہنگاموں، مستیوں، رنگینیوں، اور مسرتوں کے ساتھ آگیا ہے، بسل گڈھ کی گڑھی میں اندر باہر ہر جگہ چہل پہل نظر آرہی ہے، جابجا گانا بجانا ہو رہا ہے، سوشلا انتظام میں مصروف ہے اور موقع کی منتظر کہ کسی طرح رنجور سے تنہائی میں مل سکے۔

شام ہوگئی، فانوس روشن کئے گئے شامیانے کے نیچے سپید چاندنی پر چاروں طرف تکیے رکھے گئے اور سرداروں کی آمد شروع ہوگئی رنجور تنہا اپنے کمرہ میں کھویا ہوا سا اور مضطرب بیٹھا تھا کہ کسی طرح سوشلا کو دیکھ سکے کہ ایک خادمہ آئی اور پرچہ دیکر چلی گئی کہ سوشلا نے ٹھیک دس بجے رات کو اس سے ملنے کا وقت مقرر کیا تھا اور وعدہ گاہ تک پہونچنے کے تمام ذرائع ظاہر کر دئے تھے۔

کون کہ سکتا ہے کہ یہ دو گھنٹے رنجور نے کس حالت اضطراب میں بسر کئے ہوں گے اور کس بے رحمی سے وہ وقت کی سست رفتاری پر ملامت کر رہا ہوگا۔ آخر کار وہ ایک جگہ نہ بیٹھ سکا اور اس نے ارادہ کیا کہ یہ وقت باغ میں صرف کرے گا اور وہیں سے بالا بالا سوشلا سے ملنے چلا جائے گا، اس طرف ٹھیک دس بجے سوشلا اپنے کمرہ میں رنجور کی منتظر تھی کہ راجہ رن بیر سنگھ نے اسے کسی ضروری کام سے بلایا اب سوشلا کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ رنجور سنگھ کو آنے سے منع کر دے چنانچہ اس نے فوراً ایک دوسرا خط بھیجا اور تارا کو ہدایت کر دی کہ وہ اس کمرہ سے باہر نہ جائے کیونکہ سامان پھیلا ہوا تھا اور وہ اس قدر جلد ان کو محفوظ نہ کر سکتی تھی۔

خادمہ رنجور کے کمرے میں گئی اور وہاں اسے نہ پاکر واپس، ادھر تارا سوشلا کے جانے کے بعد دروازہ بند کرنے کے خیال سے آگے بڑھی اور عین اس وقت جب کہ اس نے چوکھٹ پہ پہلا قدم رکھا رنجور آگیا اور تارا کو سوشلا سمجھ کر بے اختیارانہ طور پر اپنی آغوش کھولکر آگے بڑھا۔

تارا جس نے اس سے قبل رنجور کو کبھی نہ دیکھا تھا متحیر ہوگئی، اور فطری حیا سے مجبور ہو کر پیچھے ہٹی لیکن چونکہ اس ایک لمحہ میں فطرت نے فسانہ کا پلاٹ حد درجہ سرعت و تکمیل کے ساتھ بدل دیا اسلئے تارا کا پیچھے ہٹنا بالکل ایسا ہی تھا جیسے پارۂ آہن کو زبردستی مقناطیس سے دور کیا جانا۔

رنجور نے جب روشنی میں تارا کا چہرہ غور سے دیکھا تو سمجھ گیا کہ کوئی غلطی ہوگئی ہے اور وہ فوراً گھبرا کر باہر چلا گیا۔ اس طرف تارا نے خدا جانے کیا سمجھا اور پریشان ہو کر دوسرے دروازہ سے باہر نکل گئی۔

(۸)

رام نگر کے مہمان تقریبِ کتخدائی سے رخصت ہو چکے ہیں اور سوشیلا تارا کے سرہانے جو نہایت شدید تپ میں مبتلا ہو گئی ہے اور اب اسوقت کچھ حالت سکون میں ہے، بیٹھی ہوئی ہے۔

سوشیلا:- "ہاں تارا، تم مجھ سے کیا پوچھنا چاہتی تھیں؟"

تارا:- "کچھ نہیں، یہی کہتی تھی کہ نہ جانے رام نگر سے کتنے آدمی آئے تھے؟"

سوشیلا:- "معقول، یہ تو ایسی بات نہ تھی کہ تم اس کے لئے تنہائی چاہتیں، دیکھو مجھ سے صاف صاف کہو جو تم کہنا چاہتی ہو، میں کبھی نہ مانوں گی۔"

تارا:- "اچھا پھر کسی وقت کہوں گی۔"

سوشیلا سمجھتی تھی کہ وہ کیا پوچھنا چاہتی ہے کیونکہ اسے دوسرے دن رنجور سے سارا حال معلوم ہو گیا تھا، لیکن وہ تارا سے اسلئے دریافت کرنا چاہتی تھی کہ اس کے خیالات معلوم کرے اور اگر وہ کچھ مشتبہ ہو گئی ہے تو اپنے اور رنجور کے افسانۂ محبت کو اس کے سامنے دھرادے۔

اسے کیا خبر تھی کہ تارا اس سے زیادہ زخمی ہو چکی ہے اور رنجور کا حسن و شباب اس کے دل میں ایک مستقل آزار ہو کر رہ گیا ہے۔

سوشیلا:- "تارا میں تم سے اسی وقت پوچھوں گی اور تمہیں بتانا پڑے گا۔ میں تم سے ضد کروں گی اور مجھے معلوم ہے کہ تم میری ضد پوری کرنے پر مجبور ہو۔"

تارا:- "اچھا تم کسی سے کہو گی تو نہیں؟"

سوشیلا:- "کسی سے نہیں۔"

تارا:- "تو اچھا یہ بتاؤ کہ ارجن سنگھ کے بھائی نے مجھے کہاں دیکھ لیا اور وہ کیونکر اس قدر جسارت کر سکے کہ ہولی کے دن شام کو میرے سامنے چلے آئے۔

میں یقیناً خطاوار ہوں کہ تم سے اسوقت تک ذکر نہیں کیا لیکن سوشیلا تم سے کہتے ہوئے ڈرتی ہوں اور جانتی ہوں کہ تم مجھے بے غیرت، بے حیا، اور خدا جانے کیا کیا کہو گی، لیکن میں مجبور ہوں اور باوجود کوشش کے میں اس یقین کو اپنے دل سے جدا نہیں کر سکتی کہ میری موت بہت قریب ہے کیونکہ میرا آزار اس غریب و مفلس شخص کا سا مسموم ہو جانا ہے جو کسی طرح تریاق کو مہیا نہیں کر سکتا۔"

سوشیلا جس کے ذہن میں بھی یہ بات نہ تھی کہ وہ تارا سے یہ بیان سنیگی تھوڑی دیر کے لئے ایسی ہو گئی ہے جیسے کوئی پاگل ہو، لیکن اسنے پھر نہایت کوشش سے اپنے آپ کو سنبھالا اور بولی "تارا! کیا ایک ہی نگاہ میں رنجور کے ساتھ تمہیں اسقدر محبت ہو گئی

اور ہاں تم نے یہ کیا کہا کہ تمہیں انہوں نے کہاں دیکھا، مگر نہیں تمہارا خیال صحیح ہے اگر دیکھا نہ ہوتا اور دیکھنے کے بعد وہ تم پر فریفتہ نہ ہو جاتے تو کبھی ایسی عبارت نہ کرتے لیکن تم نے غلطی کی اگر مجھے پہلے معلوم ہو جاتا تو میں کسی تدبیر سے اور زیادہ یقین کے ساتھ معلوم کرتی کہ انہیں تمہارے ساتھ کس قدر الفت ہے۔

سوشیلا یہ کہتی جاتی تھی اور اس کا ضمیر ملامت کر رہا تھا لیکن صورت حالات ایسی نہ کہ وہ تارا سے صحیح صحیح واقعہ بیان کر دیتی اس لئے مجبور تھی، اسکی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ وہ کیا جواب دے اور رنجور کی محبت کیونکر تارا کے دل سے محو کرے۔

(۹)

تارا کی علالت کو پورا ایک سال گذر چکا ہے، اور اسکی بیماری جو حقیقتاً آزار محبت تھی اور آزار بھی اُس محبت کا جو آغاز و انجام سے بے خبر، اولین نگاہ میں تمام مدارج طے کر جاتی ہے خطرناک ہوتی جا رہی ہے۔ تپ بظاہر مفارقت کر چکی ہے۔ درد سر بھی اتنی کم نظر آتی ہے کہ کبھی کبھی اس کی حسین پیشانی سے صندل جدا ہو جاتا ہے۔ غذا سے بھی اتنا تنفر نہیں رہا لیکن اسکی حالت کو دیکھ کر یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ اچھی ہے۔ جب اس سے کوئی حال پوچھتا ہے، تو ایک خفیف سی جنبش ابرو اور نہایت ہلکی سی چین پیشانی کے ساتھ کہہ دیتی ہے کہ "اچھی ہوں" لیکن اسکی آواز میں ایک ایسا اضمحلال، اس کے لب و لہجہ میں ایسا تاسف شامل ہوتا ہے کہ دوبارہ اس سے سوال کرنے کی ہمت کسی کو نہیں ہوتی۔

جن لڑکیوں سے وہ زیادہ بے تکلف ہے، ان کے سامنے وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی "کہ بیمار تو نہیں ہوں لیکن اچھی بھی نہیں ہوں" لیکن سوشیلا کے سامنے اسے کہہ دینا پڑتا ہے کہ "میرا برا حال ہے"۔

آغاز گرما کی شام ہے، آفتاب غروب ہو چکا ہے اور چاند افق سے بلند ہو کر نمودار ہو رہا ہے۔ سوشیلا اور تارا دونوں کوٹھی کی صحن پر چاندنی کی طرف منہ کئے ہوئے، خاموش بیٹھی ہیں۔

تارا :۔ "دیکھو سوشیلا، چاند کیسا نظر آ رہا ہے، جیسے کسی عورت کا سہاگ لٹ جائے"۔

سوشیلا:۔ "تارا، تم اسے نہ دیکھو۔ اسکی روشنی میں بڑا سوگ ہوتا ہے، لوگ چاندنی راتوں کی تمنا کرتے ہیں، اور میں اس کے خیال سے کانپ اٹھتی ہوں"

تارا :۔ "سوشیلا سچ کہتی ہو لیکن مجھے تو اس پورنماشی چاند سے ازحد محبت ہے، تمہیں یاد ہے نا، یہی تاریخ تھی، جب ......"

سوشیلا:۔ "پھر تم نے وہی ذکر کیا، تارا، رحم کرو، اپنے اوپر نہ سہی، میرے اوپر، مجھ پر نہ سہی اس پر جس سے تم محبت کرتی ہو، جس کی تم پجاری ہو"

تارا :۔ "ہاں، سچ ہے، لوگوں کو معلوم ہو گیا تو انہیں لوگ کیا کہیں گے؟ ہائے کسی سے محبت کر کے مر جانا بھی اس دنیا میں اب دشوار ہو گیا ہے"

تارا کا دل یہ کہہ کر بھر آیا، اُسنے سر جھکا لیا اور ساری کے دامن سے فوراً آنسو پونچھ کر پھر خاموش ہو گئی، گویا وہ سمجھتی تھی کہ ایک غریب کا

اسیر کی محبت میں زیادہ اشکبار ہونا بھی روا نہیں ہے، کیونکہ رونا شاید ایک قسم کا حق ثابت کرنا ہے، اپنے تئیں محبت کئے جانے کا اہل ثابت کرنا ہے اور تارا کبھی اسکی تمنا بھی نہ کر سکتی تھی، وہ جانتی تھی کہ رنجور گو راجہ نہیں مگر راجہ کا بھائی اور انتظام کے لحاظ سے پوری ریاست کا مالک ضرور ہے اور وہ خود اپنی حالت سے بھی خوب واقف تھی کہ عین اسوقت جب کہ بس گڈھ کے ادنی سرداروں کی لڑکیاں اپنی ہجولیوں کو لٹرے تقسیم کرتی تھیں، وہ گھر میں بیٹھی ہوئی اپنی ساری کو خود ہی دھویا کرتی تھی۔

اگر تارا کا باپ اس درجہ غیرت مند تھا کہ وہ راجہ سبل سنگھ کے پاس جانا اور دست سوال دراز کرنا اپنے لئے عار سمجھتا تھا تو اسی کے ساتھ تارا کا بھی یہ عالم تھا کہ باوجود حد درجہ اصرار کے وہ سوشلا کا ادنی سا احسان بھی گوارا نہ کرتی تھی اور اسکی یہی ادا تھی جس نے سوشلا کو اسکی طرف سے حد درجہ دردمند بنا رکھا تھا۔

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد تارا بولی "سوشلا، اب جاؤ، کہاں تک تم مجھ غمزدہ کا ساتھ دوگی، میں تم سے کئی مرتبہ کہہ چکی ہوں کہ میرے پاس بہت کم آیا کرو، تمہیں دیکھ کر میرا جی اور بیٹھا جاتا ہے، تمہاری ہمدردی مجھے اور تباہ کئے دیتی ہے، سوشلا، مجھ سے محبت چھوڑ دو، میرے لئے اپنا دل نہ دکھاؤ، چند دن بعد یوں بھی تم ہمیشہ کے لئے جدا ہو جانے والی ہو، اس سے چند دن قبل ہی اگر تم جدا ہو گئیں تو کیا میں تم پر کوئی الزام رکھوں گی" اتنا کہہ کر اس کی آواز پھر بند ہو گئی، اور سوشلا جو ایک سال سے تارا کی اس حالت پر دل دکھا رہی تھی، سخت بیقرار ہو گئی، اسے تارا سے محبت تھی، اور ایسی محبت کہ اس کا اندازہ وہ خود نہیں کر سکتی تھی، لیکن وہ اسوقت کوئی فیصلہ نہ کر سکتی تھی کہ اسکا علاج کیا ہو سکتا ہے۔

سوشلا سمجھتی تھی کہ حقیقت حال نہ تارا سے کہی جا سکتی ہے اور نہ رنجور سے، ممکن ہے کہ تارا یہ معلوم کرنے کے بعد کہ مجھے بھی رنجور سے اتنی ہی محبت ہے جتنی اسکو، جانبر نہ ہو سکے اور رنجور یہ سن کر کہ تارا اس پر فریفتہ ہے، کوئی نازیبا خیال اسکی طرف سے دل میں پیدا کرے۔ اس کے ساتھ جب وہ تارا کی حالت کو دیکھتی تھی تو بیتاب ہو جاتی تھی۔ وہ اسکا ہر وقت کا سوگ وہ اسکا ہر دم اندر ہی اندر سلگنا، وہ اس کا محبت کی آگ میں ہر وقت شمع کی طرح جلتے پگھلتے رہنا، ایک ایسا منظر تھا کہ سوشلا کو اکثر اوقات اپنی محبت کی طرف سے دھوکا ہو جاتا تھا اور وہ سمجھنے لگتی تھی کہ محبت تو حقیقتاً تارا کو ہے اور وہی رنجور کے قابل ہو سکتی ہے۔ لیکن یہاں پہونچکر پھر اسکا فطری نسوانی جذبہ خیال کو آگے بڑھنے سے روک لیتا تھا اور وہ دم بخود ہو جاتی تھی۔

اسے یقین تھا کہ اگر چند دن یہی حالت اور رہی تو تارا کا جان دینا یقینی ہے اور پھر میں کیونکر زندگی بسر کر سکتی ہوں، اگر رنجور میرا ہو بھی گیا (جسکی ابھی کوئی قوی امید نہیں) تو کیا میں خوش رہ سکوں گی، کیا تارا کی روح مجھے ملامت نہ کریگی کیا میری نیند اس کے خیال سے مضطرب نہ ہو گی، سوشلا دیر تک یہ سوچتی رہی، اور پھر تارا اس سے رخصت ہو کر گھر چلی گئی۔

گذشتہ واقعات پر دو مہینہ اور گذر گئے ہیں، سوشلا اس زمانہ میں کامل غور کے بعد ایک فیصلہ کر چکی ہے، تارا فرطِ ضعف سے صاحب فراش ہو گئی ہے، اور اب علاوہ سوشلا کے خاندان کے لوگوں کو بھی معلوم ہو گیا ہے کہ تارا کی بیماری کیا ہے، لیکن اسکا علم سب کو نہیں کہ یہ آزار اس نے کہاں اور کب مول لیا۔

اس ڈیڑھ سال کے عرصہ میں، سوشلا رنجور سے تین مرتبہ مختلف بہانوں سے مل چکی ہے اور ہر مرتبہ اسے پیام نکاح دینے سے روک دیتی ہے۔ تارا کی علالت کا حال رنجور کو بھی معلوم ہوگیا ہے، اور سوشلا کی معیت میں اس کے ساتھ حد درجہ اظہار ہمدردی کیا کرتا ہے۔

ایک رات جب سوشلا، تارا کے پاس سے حد درجہ ملول و مضمحل ہوکر واپس آئی تو سیدھی اپنے باپ کے پاس گئی، اور وہاں سے جس وقت کامل دو گھنٹہ کے بعد واپس آئی تو پاسے کام کے داروغہ کو بلا کر حکم دیا کہ صبح میں رام نگر جاؤں گی، اور فلاں فلاں سردار ساتھ ہونگے، سواری کا انتظام کرا لیا جائے۔

(۱۰)

رنجور:- "سوشلا، خیر تو ہے، یہ آج تم کیسی ہو رہی ہو۔ کیا بات ہے؟"

سوشلا:- "خیر نہیں ہے کیونکہ میں آج تمہاری محبت کا امتحان کرنے آئی ہوں، اور اگر خدانخواستہ تم کامیاب نہوئیں تو پھر خیر کیسی؟"

رنجور، جس نے اس سے قبل سوشلا کے یہ تیور کبھی نہیں دیکھے تھے، گھبرا گیا، اور ایک منٹ تک اسکی گفتگو کا کوئی جواب نہ دے سکا۔

سوشلا:- "کیوں خاموش کیسے ہوگئے۔ کیا میں سمجھ لوں کہ تم امتحان کے لئے آمادہ نہیں ہو"

رنجور:- "یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارا امتحان سے کیا مقصد ہے اور تمہیں اسکی کیا ضرورت پڑی۔ جب کہ تمہیں یقین ہونا چاہئے کہ رنجور، سوشلا کے لئے جان تک دینے سے احتراز نہیں کرسکتا" سوشلا بولی "رنجور، یہ تمنے کیا کہا، میری رائے میں جان دینے سے زیادہ آسان بات کوئی نہیں۔ اس لئے میں تو اس سے زیادہ کی توقع تم سے رکھتی ہوں۔"

رنجور:- "سوشلا، تم یقین کرو کہ میں تمہیں کسی توقع سے شرمندہ نہ ہونے دونگا، دنیا میں سب سے بڑا گناہ اور سخت سے سخت ریاضت ایسی نہیں جسکو میں تمہارے لئے اختیار نہ کرسکتا ہوں کہو، اور اس اطمینان کے ساتھ کہ میں نے اسے منظور کر لیا۔"

سوشلا:- "دیکھو رنجور، پھر اچھی طرح غور کر لو، کہیں ایسا نہ ہو کہ سننے کے بعد تم مکر جاؤ، یا منظور کرو بھی تو بددلی کے ساتھ۔"

رنجور:- "میں غور کر چکا ہوں، زیادہ دیر کرکے میرے ارادہ کے استحکام کو مضمحل نہ کرو۔"

سوشلا:- "اچھا تو پھر سنو کہ میں تمہارے سامنے ایک ایسی التجا کرتی ہوں جس پر میری زندگی کا انحصار ہے اور وہ یہ ہے کہ تم تارا سے شادی کرکے اسکی اور میری دونوں کی جان بچالو۔"

رنجور جس کے خیال میں بھی کبھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ سوشلا ایسی عجیب و غریب التجا اس کے سامنے پیش کرے گی، ایسا محسوس کرنے لگا کہ شاید وہ اس عالم میں نہیں ہے اور اس کی روح جسم سے جدا ہوکر سراپا تاثر بنی ہوئی ہے۔ اس کے چہرہ کا رنگ سفید ہوگیا اس کے اعضا بے جان سے ہوگئے، دماغ چکرانے لگا، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور قوت گویائی محو ہوگئی۔

سوشلا سمجھتی تھی کہ اس کی فرمائش کا اثر یہی ہونا ہے، اسے خوب معلوم تھا کہ رنجور کے لئے جان دیدینا اس سے آسان ہوگا کہ وہ محبت سے باز آجائے۔ لیکن وہ کامل غور کے بعد اک عزم کر چکی تھی، اس حق پرورش کو ادا کرنا چاہتی تھی جو تارا کی ماں، اور اسکی خالہ

کی طرف سے اس پر عاید ہوتا تھا۔ اس نے یقین کر لیا کہ تارا رنجور سے بہ نسبت اس کے زیادہ محبت کرتی ہے اور اس لئے وہی مستحق بھی ہے۔ رہا رنجور کا مائل ہونا، سو اسے یقین تھا کہ تارا ایسی معمولی حسن و جمال، ایسی معمولی تہذیب و سلیقہ کی لڑکی نہیں، جو عرصہ تک رنجور کو مفتوح کرنے میں کامیاب رہے گی اور اپنے متعلق وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اب شادی نہیں کرے گی اور اپنی ساری عمر دوشیزگی کے اس عالم بیوگی میں بسر کر دے گی جو اکثر راجپوت خاندان کی لڑکیوں کو نہایت صبر و سکوت کے ساتھ گذار دینا پڑتا ہے۔

(۱۱)

تارا کے مکان پر آج غیر معمولی ہجوم ہے، لوگ اندر باہر آ جا رہے ہیں، ہر شخص کے چہرہ پر تشویش کے آثار نمودار ہیں، شمشیر سنگھ تارا کا باپ، افسردہ و مغموم ڈیوڑھی میں بیٹھا ہوا کبھی کبھی آنے جانے والوں سے پوچھ لیتا ہے کہ "کیا حال ہے" اور پھر کوئی تسلی بخش جواب نہ پا کر زیادہ گہرے غم میں ڈوب جاتا ہے۔ آج صبح سے تارا کی حالت نہایت نازک ہے غش پر غش آ رہے ہیں پسینہ خشک نہیں ہوتا، اختلاج کا یہ عالم ہے کہ پاس کے بیٹھنے والے اس کے دل کی دھڑکن کو اچھی طرح سن سکتے ہیں، نبضیں قریب قریب ساقط ہو چکی ہیں، آنکھیں بند ہیں، زبان خشک ہو کر تالو سے لگ گئی ہے اور اگر کبھی کوئی آواز اس کے منھ سے نکلتی ہے تو وہ سوشلا کا نام ہوتا ہے جسکا انتظار سب کو نہایت شدید ہے۔

سوشلا کے باپ نے ایک سوار دوڑا دیا ہے اور راستہ میں ڈاک بٹھا دی ہے تاکہ ہر ممکن سرعت کے ساتھ وہ آخری مرتبہ اور تارا کو دیکھ لے۔

منٹ پر منٹ گھنٹوں کی رفتار سے گذرتے جا رہے تھے اور دیکھتے دیکھتے لوگ تھک چلے تھے اور تارا آخری غش میں اپنی زندگی ختم کرنا چاہتی تھی، کہ دفعتاً سوشلا کی آمد کی خبر بجلی کی طرح دوڑ گئی اور خدا جانے کیوں ہر شخص مطمئن نظر آنے لگا۔

سوشلا گھبرائی ہوئی فینس سے اتری، اور سب سے پہلے اس نے اپنی نگاہوں سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ کہیں وہ بعد از وقت تو نہیں آئی، لیکن جب اسے اطمینان ہوا تو وہ ڈیوڑھی پر اپنے خالو کو سلام کرتی ہوئی اندر داخل ہو گئی اور باوجود اس کے کہ جذبات شدید گریہ میں تبدیل ہو جانا چاہتے تھے، لیکن اس نے بہت ضبط کیا اور سب سے پہلے تمام عورتوں کو ہاتھ کے اشارہ سے باہر چلے جانے کا حکم دیا۔ جب اسکی تعمیل ہو گئی، تو وہ آہستہ آہستہ تارا کے پلنگ کے قریب بڑھی، جہاں وہ بیہوش پڑی ہوئی تھی اور پیشانی پر پسینہ کے قطرے چمک رہے تھے۔

یہ نیچے فرش پر بیٹھ گئی، اور اپنا ہاتھ تارا کے سر کے نیچے رکھ کر اس کو آواز دی، لیکن وہ بالکل بے حس و حرکت ایک مجسمہ کی طرح پڑی ہوئی تھی، اس نے نبض دیکھی تو وہ بھی غیر محسوس تھی۔ یہ اپنا منھ اس کے کان پر لے گئی اور آہستگی سے بولی "تارا تارا دیکھو میں آ گئی" لیکن وہ ہنوز غافل تھی۔ اس نے پھر کوشش کی اور کہا "تارا آنکھیں کھولو، میں تمہارے لئے رنجور کا پیام لائی ہوں" نسیم غنچۂ ناشگفتہ کے ساتھ، مینھ سوکھی ہوئی کھیتی کے ساتھ، اور تریاق ایک مسموم ہستی کے ساتھ وہ سلوک نہیں کر سکتا جو اس وقت رنجور کے لفظ نے تارا کے ساتھ کیا۔

تس نے اس پیارے نام کو سنتے ہی اور سوشلا کو سامنے دیکھ کر، اپنی آغوش کھولدی، سوشلا جو اسوقت تک ضبط کئے ہوئے تھی بے اختیار ہوگئی اور اس سے لپٹ کر رونا ہی چاہتی تھی کہ پھر اسے کچھ خیال ہوا، اور ضبط سے کام لیکر اس نے اپنے چہرہ پر تبسم پیدا کیا۔ اور بولی "تارا! کیا حال ہے"۔

تارا: "تم کب آئیں۔ میں نے اس وقت ایک عجیب خواب دیکھا، گویا میں سو رہی ہوں اور کوئی مجھے جگا رہا ہے" تارا یہ بیان کر رہی تھی اور اک محو تبسم اسکی جلد کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ لیکن سوشلا اس سے زیادہ مسرور تھی اور ایسا محسوس کر رہی تھی گویا آج وہ کائنات فتح کرکے بیٹھی ہے۔

سوشلا: "ہاں پھر کیا دیکھا"

تارا: "کچھ نہیں، آنکھ کھل گئی تو دیکھا تم ہو"

سوشلا: "تارا، تمہارا یہ خواب میں ہی لے کر آئی تھی، اور میں تمہیں رنجور کی طرف سے جگا رہی تھی، کیونکہ مجھے ان کا ایک پیام تم سے کہنا ہے"

تارا جو دو منٹ قبل کروٹ نہ لے سکتی تھی، فرط ضعف سے، ہاتھ کو جنبش نہ دے سکتی تھی، بے اختیار اپنی قوت سے پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گئی، خون رگوں میں دوڑنے لگا، چہرہ کے بلور میں ایک ہلکا سا رنگ آگیا، اور فرط حسرت سے سوشلا کی طرف ٹکٹکی باندھ کر رہ گئی۔

سوشلا اسکی حالت کو دیکھ کر ڈر گئی کہ مبادا اگر ردعمل سخت ہوا، تو پھر اس کا جانبر ہونا دشوار ہو جائے گا اور اس لئے اسکے مسرت میں ذرا تلخی پیدا کرنے کے لئے وہ مصنوعی برہمی اپنے چہرہ پر پیدا کرکے بولی "میں سمجھتی تھی کہ تم بڑی عقلمند ہو۔ لیکن میرا خیال غلط نکلا، تم اسقدر گھبرائی کیوں جاتی ہو، کیا رنجور کوئی دیوتا ہے جس کا پیام انسان کو بے اختیار بنا دے وہ بھی اک انسان ہے اور شاید تم سے اچھا انسان نہیں، پھر اس میں تعجب کی کیا بات ہے، ذرا ہوش میں آؤ، اپنے کو سنبھالو، تو میں کہوں، ورنہ میں جاتی ہوں"

تارا، یہ سن کر ذرا سنبھلی، اور اپنی بے اختیاری پر معذرت کرتی ہوئی تکیہ کے سہارے سے خاموش بیٹھ گئی۔ اب سوشلا اٹھی اور اس کے برابر بیٹھ کر اپنے رومال سے ہوا دینے لگی، اور اپنے پندار میں اس نے نہایت رفتہ رفتہ یہ جاں بخش و جاں نواز خبر اسے سنائی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اب بھی سوشلا کو اسکی محبت و حالت کا پورا اندازہ نہ تھا ورنہ وہ شاید اسکی جسارت نہ کرتی، کیونکہ جس وقت اسنے اپنا آخری جملہ ختم کیا ہے کہ "اگلے ہفتہ یہاں بارات آجائے گی" تو تارا پھر بیہوش تھی، اور سر سے پاؤں تک اک لرزش اسکے بدن پر طاری تھی۔

شام سے صبح اور صبح سے شام ہوگئی لیکن تارا، باوجود تمام کوششوں کے ہوش میں نہ آسکی، بسل گڈھ کے تمام وید موجود تھے اور اپنے تمام نسخے آزما چکے تھے، لیکن کسی طرح کوئی تدبیر کارگر نہ ہوتی تھی۔

آخرکار دن کو دس بجے آہستہ آہستہ تارا کو ہوش آیا، اور آتے ہی اسکی علالت نمایاں طور پر جدا ہوتی ہوئی نظر آنے لگی۔ دیدوں نے دیکھ کر اطمینان ظاہر کیا۔ اندر باہر ہر شخص کو اس کی اطلاع ہوئی اور شمشیر سنگھ، اس خبر کو سن کر بچوں کی طرح باتیں کرنے لگا۔

سوشلا، جو اس موقع کی منتظر تھی، ہاتھ جوڑ کر اپنے خاوند کے سامنے کھڑی ہوگئی اور بولی "میں سامنے سے نہ ہٹوں گی جب تک کہ میری ایک آرزو پوری نہ کی جائے گی"

شمشیر سنگھ نے فرطِ مسرت سے اپنی بھانجی کو گلے لگا لیا اور بولا "سوشلا! تو، تو دیوی ہے اور دیوی کی کوئی بات رد نہیں کی جا سکتی، کہہ جو کچھ کہنا چاہتی ہے"

سوشلا: "تارا کی شادی کا اختیار دیدیجئے"

شمشیر سنگھ: "میں تو اس کی موت و زندگی پر تجھ کو اختیار دیتا ہوں"

سوشلا: "تو پھر یہ بھی اجازت دیجئے، کہ میں اپنے اختیار سے تارا کو دلہن بناؤں اور کنور رنجور سنگھ کے ساتھ اسکی شادی کرکے اس فرض سے سبکدوش ہوں جو بہن ہونے کی حیثیت سے مجھ پر عائد ہوتا ہے۔

(۱۲)

رنجور اور تارا کی شادی کو دو سال کا زمانہ گزر چکا ہے اور اس عرصہ میں سبھی انقلاب ہوگئے۔ ارجن سنگھ کی اچانک موت سے رنجور سنگھ سبل گڈھ کا راجہ تسلیم کیا گیا، شمشیر سنگھ اپنی عمر طبعی کو پہونچ کر اس دنیا سے رخصت ہوگیا، تارا کی آغوش کو ایک فرشتہ صورت بچہ نے آباد کر دیا لیکن سوشلا جو ایک بار تیرتھ کے لئے بنارس گئی تو پھر وہیں کی ہو کر رہ گئی۔

لوگ مصیبتیں لے کر اس دیوی کے پاس آتے ہیں عورتیں اپنی دُکھ بھری داستانیں اس کے پاس آکر بیان کرتے ہیں، اور وہ ان سب کی خدمت میں اپنا وقت صرف کیا کرتی ہے لیکن باوجود اس ترکِ دنیا کے بھی، جب کبھی محبت کا نام اس کے سامنے لیا جاتا ہے، حتیٰ کہ کوئل کی آواز اور کسی پپیہے کی صدا بھی جب اسکے کان میں آجاتی ہے، تو وہ محسوس کرتی ہے کہ اسکا دل اب بھی پھنک رہا ہے۔ اور یہ اب تک ایک ستی ہونے والی بیوہ کی طرح آگ میں جل رہی ہے

نیاز

مشاہیر یورپ کے اقوال

(۱) حسین چہرہ ایک خاموش سفارش ہے .... لارڈ بیکن

(۲) اختصار ظرافت کی جان ہے۔ (۳) علم کے جھوٹے دعوے سے جہل کا اعتراف بہتر ہے ... شکسپیر

(۴) مستقبل کا بہترین پیشین گو ماضی ہے .... بائرن

(۵) حسین شئے دائمی مسرت ہے .... کیٹس

(۶) بدبختی انسان کو برے لوگوں سے روشناس کرا دیتی ہے .... شکسپیر

غزل

نگرم بہ ہر رگِ سنگِ رہ، ہمہ رنگِ صنعتِ آذری
کہ نہاد ایں قدرِ آگہی، بہ مذاقِ شیوۂ کافری؟

دلم امتیاز گرفت یا، نگہِ تو یافتہ برتری
بہ فروغِ رسمِ فسونگری بہ قبولِ نقشِ ستمگری

نہ بہ نبضِ آئینہ می تپد، نہ بہ ریشۂ جگرم خلد
نگہے فگن کہ ترا سزد، بہ طرازِ عشوۂ دلبری

بہ رخت نقاب فگندہ، تو خیالِ دہر تپیدہ
ہمہ جا تو کفر فشاندہ، بہ فشارِ کعبہ بت گری

تو بناز بردمِ خنجرت، من ازیں خیال بنازشے
کہ رساندہ ام بخطِ گلو، سرِ مشقِ برق شناوری

زفسردگیِ تاثرت، چہ بروئے یخ نہی داغِ دل
ہمہ التہابِ غضب بشو، بہ سکونِ خوئے سمندری

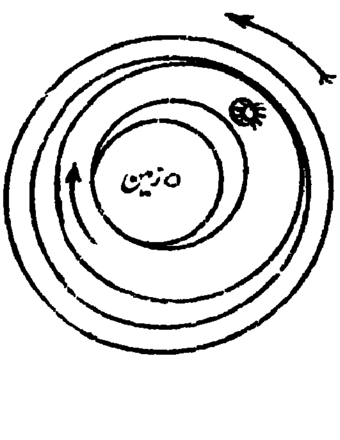
بحصولِ جلوۂ دولتے، چہ کشی نیاز مرا، کہ من
بہ جہاں نیافتم آنسے، چو غنائے دولتِ بے زری

نیاز

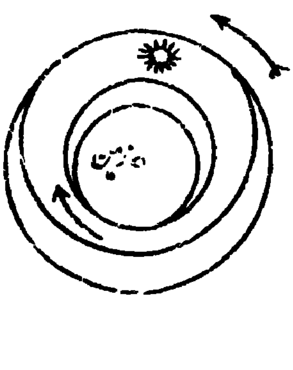
نظام شمسی میں آفتاب کی اہمیت

قدما کا نظامِ عالم قدما کا خیال تھا زمین مرکزِ عالم ہے اور تمام ستارے اور سیارے اُس کے گرد حرکت کرتے ہیں۔ قدیم یونانی علمِ ہیئت جسے مسلمانوں نے اپنے ہاں رواج دیا تھا اُس کی رو سے بھی زمین کو مرکزِ عالم تسلیم کر کے تمام اجرامِ سماوی کو اُس کے گرد متحرک مانا گیا ہے ہر سیارے کے لئے ایک ایک مجسم فلک قرار دیا گیا ہے پھر سیاروں کے قریب و بعید ہونے اور حرکت کی سرعت و آہستگی کی توجیہ کے لئے ہر سیارے کے فلک میں متعدد افلاکِ جزئیہ مانے گئے ہیں جن میں بعض مشرق اور بعض مغرب کی طرف اور بعض سریع اور بعض آہستہ حرکت کرتے ہیں۔ یہ افلاکِ کلیہ و جزئیہ اس دوری حرکت کو منضبط کرنے کے لئے فرض کئے گئے ہیں جو ہر سیارہ اُن کے خیال میں زمین کے گرد (اور حقیقت میں آفتاب کے گرد) کرتا ہے۔ آفتاب کو بھی انھوں نے زمین کے گرد حرکت کرنے والا ایک سیارہ خیال کیا ہے۔ سیاروں کے افلاکِ مجسمہ کی ترتیب اُن کے نزدیک اِن صورتوں پر ہے۔

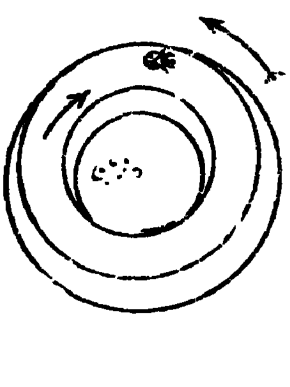
فلک قمر



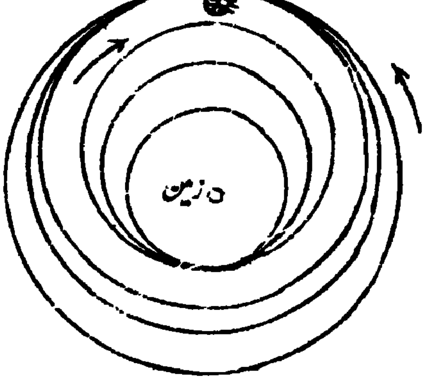
فلک شمس



فلک زہرہ، مشتری، مریخ، زحل



(مشرق) (مغرب)



سب سے پہلے قمر، پھر عطارد، زہرہ، آفتاب، مریخ، مشتری، اور زحل کے افلاک فرض کئے گئے تھے۔ ان افلاک سبعہ کے اوپر ایک فلک مانا گیا تھا جس میں تمام ثوابت جڑے ہوئے تھے اور اسی لئے اس فلک کو فلکِ ثوابت کہتے تھے۔ فلکِ ثوابت کے اوپر ایک اور ظیم الشان فلک فرض کیا گیا تھا جس میں کوئی ستارہ نہ تھا اور اسے فلک الافلاک کہتے تھے یہ فلک اپنی روزانہ حرکت سے تمام ماتحت لاک کو چوبیس گھنٹے میں ایک چکر دیدیتا ہے جس سے زمین پر دن رات پیدا ہوتے ہیں افلاک ماتحت کی یہ حرکت عرضی ہے، اور ان کی اتی حرکت اس کے خلاف مغرب سے مشرق کی طرف ہوتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس زمانہ تک جس قدر حرکاتِ فلکی انسان کو معلوم ہوئی تھیں قدیم علمائے ہیئت نے نہایت صحت کے ساتھ ن سب کا انضباط کر لیا تھا، خواہ اس کے لئے انھوں نے سیکڑوں فلک کیوں نہ فرض کئے ہوں چنانچہ قدما نے سال شمسی کی جو مدت ائی ہے۔ وہ زمانۂ حال کی تحقیق سے صرف چند منٹ کا فرق رکھتی ہے اسی طرح سیاروں کی حرکات اور کسوف و خسوف کا وقت بھی وہ نہایت عت سے بتا سکتے تھے۔ کلدانیوں، مصریوں، اور چینیوں کی جو رصدگاہیں پائی گئی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان نہایت قدیم زمانہ ے اس علم کے ساتھ دلچسپی رکھتا ہے، اور حرکات سماوی معلوم کرنے کا اُسے ابتدا سے شوق ہے، اس لئے اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ علم ہیئت یم ترین علوم سے ہے تو بھی غلط نہ ہوگا۔

قدما کے پاس خالی آنکھ اور چند معمولی اور سادے آلات کے علاوہ اجرام سماوی کے ابعاد، اختلاف حرکات، اوضاع و اشکال ر دوسرے حالات معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا لیکن پھر بھی انھوں نے اس علم کو ترقی دیکر جس حد تک پہونچا دیا تھا وہ بھی قابلِ تحسین ہے

دوربین نظام عالم بدل دیتی ہے یہ خیال بھی قدیم زمانہ سے چلا آتا تھا کہ زمین آفتاب کے گرد حرکت کرتی ہے فیثاغورس اور بعض دوسرے ونانی فلاسفہ کی طرف یہ مذہب منسوب کیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ خیال عین حقیقت اور واقعہ کے مطابق تھا لیکن اختراع دوربین سے پہلے سی نے اس کی طرف التفات نہ کیا اور حرکت زمین کو لوگ محال عقلی سمجھتے رہے۔ مگر دوربینی تحقیقات اور جدید اکتشافات سے یکایک ظامِ عالم بدل گیا۔ اب ستارے اور سیارے بجائے اس کے کہ بڑے بڑے ٹھوس آسمانوں میں میخوں کی طرح جڑے ہوئے ہوں ہایت آزادی سے آفتاب کے گرد چکر لگاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بطلیموس نے کائنات کو چند کروڑ میل میں منحصر کر دیا تھا۔ مگر اب مین اور آفتاب کا درمیانی فاصلہ ۹ کروڑ میل سے زیادہ دریافت ہوتا ہے بلکہ نظام شمسی کے باہر ایسے کروڑوں ستارے پائے جاتے ہیں جن کا فاصلہ ظاہر کرنے کے لئے سلسلہ ہندسی کافی نہیں ہو سکتا۔ اِن ابعادِ عظیمہ کا اندازہ صرف اس سے ہو سکتا ہے کہ روشنی جو ایک سیکنڈ میں ۲ لاکھ میل سے زیادہ حرکت کرتی ہے بعض ستاروں سے سیکڑوں اور بعض سے ہزاروں برس میں زمین تک پہونچتی ہے۔ اگر کوئی شخص کورانہ تقلید اور قدامت پرستی کو چھوڑ کر ایک معمولی رصدگاہ میں آسمانی دوربین اپنی آنکھ پر رکھے تو اُسے عجیب تماشہ نظر آئے گا اُسے روشن آفتاب میں سیکڑوں داغ، اس خاموش قرصِ شمسی پر عظیم الشان تلاطم ناری چاند میں بے انتہا نشیب و فراز، سیاروں کے گرد حرکت کرتے ہوئے متعدد اقمار، دمدار ستارے، یورینس، نیپچون، اور دوسرے عجیب و غریب مظاہر قدرت دکھائی دیں گے۔

زہرہ اور عطارد کا عبور، واحتجاب، اور اُن کا اقترانِ اسفل و اعلیٰ، قانونِ جاذبیت کا توازن اور اُسی کے لحاظ سے سیاروں کی سرعت اور آہستگی، مشتری اور مریخ کا اقترانِ اعلیٰ اور اُن کا اوج و حضیض یہ سب امور ایسے ہیں جن کے معلوم ہونے کے بعد یہ حقیقت بھی اظہرمن الشمس ہوجاتی ہے کہ زمین بھی ایک سیارہ اور نظامِ شمسی کا ایک رکن ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص قرونِ وسطیٰ کے پادریوں کی طرح یہ جواب دے کہ دوربین زمین پر تو صحیح اور آسمان پر غلط ہے تو اس جاہلانہ مکابرہ کا کچھ علاج نہیں۔

سب سے زیادہ قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ ہندوستان کے عربی مدارس میں اب تک قدیم ہیئت پڑھائی جاتی ہے۔ دنیا بدل گئی لیکن عربی مدارس میں ابتک بطلیموس کا نظام قائم ہے۔

نظامِ شمسی ہمارے اس مضمون کا موضوع صرف آفتاب اور اس کے عجیب و غریب حالات ہیں۔ مگر ضرورت ہے کہ اس سے پہلے نظامِ شمسی کے متعلق چند عام اور سرسری معلومات ہم پہونچا دیئے جائیں۔

نظامِ شمسی میں بڑے بڑے سیارے، نجیمات صغیرہ، اقمار، شہاب ثاقب، اور دمدار ستارے پائے جاتے ہیں اور انہی اجرام کے مجموعہ کو نظامِ شمسی کہتے ہیں۔

۱۔ بڑے سیارے عطارد، زہرہ، زمین، مریخ، مشتری، زحل، یورینس، اور نپچون ہیں اور یہ سب آفتاب کے گرد حرکت کرتے ہیں۔

۲۔ چھوٹے سیارے یا نجیمات:۔ مدارِ مشتری اور مریخ کے درمیان لاتعداد چھوٹے چھوٹے اجرام حرکت کرتے ہیں جن میں سے قریب آٹھ سو کے اس وقت تک پہچانے جا چکے ہیں۔ ان میں بڑے بڑے ولیٹا، جونو، سیریس، اور پالاس ہیں۔

۳۔ اقمار: کل اقمار ۲۷ ہیں۔ زمین کا ایک، مریخ کے دو، مشتری کے ۹، زحل کے دس، یورینس کے چار، اور نپچون کا ایک چاند ہے، اور یہ تمام اقمار اپنے اپنے سیاروں کے گرد حرکت کرتے ہیں۔

۴۔ شہاب ثاقب: یہ چھوٹے چھوٹے آوارہ گرد اجرام ہیں۔ جو نظامِ شمسی میں داخل ہیں اور آفتاب کے گرد متحرک ہیں۔ ان میں سے جب کبھی کوئی جرم زمین کے کرۂ ہوائی میں سے گزرتا ہے تو سرعتِ حرکت کی وجہ سے مشتعل ہوجاتا ہے۔ اور کبھی زمین کی حد جاذبیت تک پہونچکر زمین پر گر پڑتا ہے۔ دنیا کے متعدد عجائب خانوں میں شہاب ثاقب کے ٹکڑے محفوظ ہیں۔

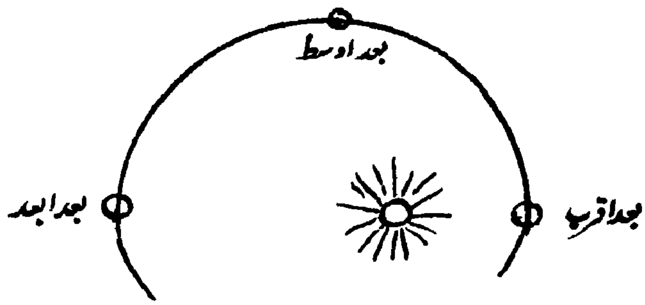
۵۔ دمدار ستارے: یہ بھی نظامِ شمسی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے اس وقت تک دریافت ہوچکے ہیں جن کے طلوع و غروب کا زمانہ نہایت صحت کے ساتھ بتایا جا سکتا ہے۔

نظامِ شمسی کی عظمت نظامِ شمسی نے اپنی عجیب و غریب حرکات سے ایک عظیم الشان فضا کو معمور کر رکھا ہے جو ۵۔ ارب میل سے بھی زیادہ ہے۔ لیکن تمام کائنات کے مقابلہ میں یہ ایک نہایت حقیر فاصلہ ہے۔ اگر آفتاب اور اس کا نظام معدوم ہوجائے تو کائنات میں ایک نقطہ کے زائل ہونے سے زیادہ اس کی اہمیت نہ ہوگی۔

سیاروں کی حرکت تمام سیارے سورج کے گرد مشرق سے مغرب کی طرف حرکت کرتے ہیں اور اُسے حرکتِ دوری کہتے ہیں اور اسی سے موسم بدلتے ہیں۔

تمام اقمار اپنے اپنے سیاروں کے گرد مشرق سے مغرب کی طرف حرکت کرتے ہیں مگر یورینس کے اقمار ان کے خلاف مغرب سے مشرق کی طرف متحرک ہیں۔

تمام سیارے آفتاب کے گرد اہلیلجی شکل کے مدار پر حرکت کرتے ہیں اور آفتاب مدارات کے مرکز سے ہٹا ہوا ہے جس کی وجہ سے سیارے اپنی گردش میں آفتاب سے ایک مرتبہ قریب اور ایک مرتبہ بعید ہوتے رہتے ہیں۔



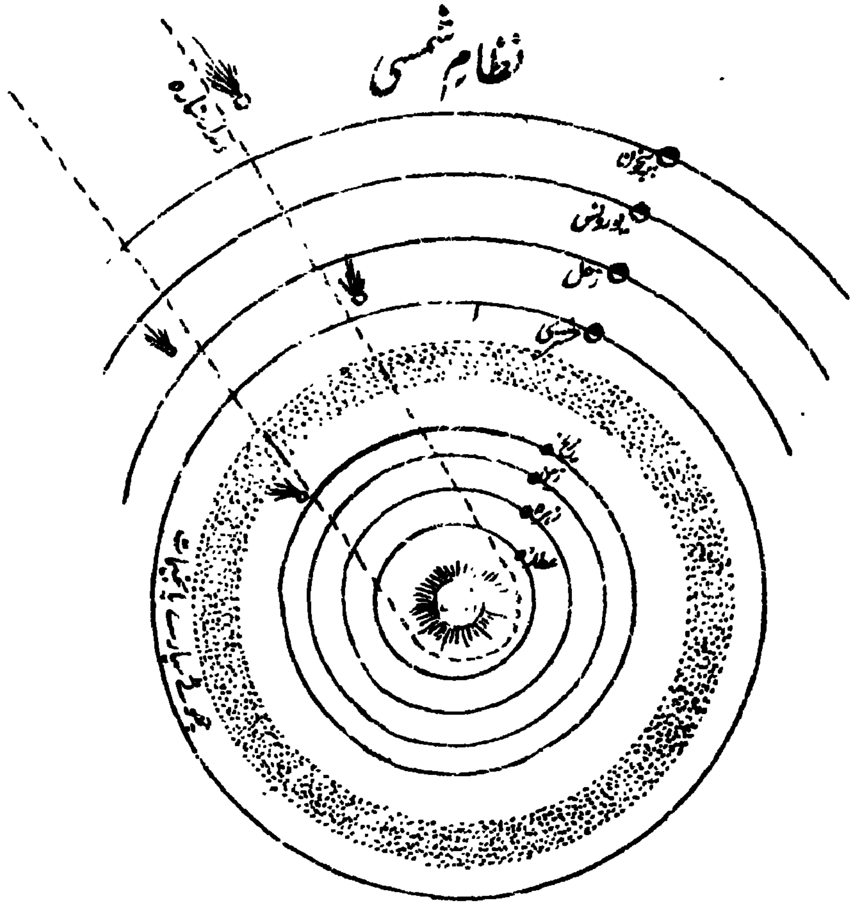
سیاروں کا بعد آفتاب سے

سیارہ	بعد ابعد	بعد اوسط	بعد اقرب
عطارد	۴۲۶۶۵۵۶۰	۳۵۳۹۲۶۳۸	۲۸۱۱۹۷۱۶
زہرہ	۶۶۵۸۵۹۳۷	۶۶۱۳۱۴۷۸	۶۵۶۷۷۰۰۹
زمین	۹۲۹۶۵۴۸۹	۹۱۴۳۰۲۲۰	۸۹۸۹۴۹۵۱
مریخ	۱۵۲۲۸۳۹۳۶	۱۳۹۳۱۲۲۲۶	۱۲۶۳۴۰۵۱۶
مشتری	۴۹۸۶۰۳۷۶۸	۴۷۵۶۹۳۱۴۹	۴۵۲۷۸۲۵۳۰
زحل	۹۲۱۱۰۵۰۲۷	۸۷۲۱۳۴۵۸۳	۸۲۳۱۶۴۱۳۹
یورینس	۱۸۳۵۷۰۰۸۲۵	۱۷۵۳۸۵۱۰۵۲	۱۶۷۲۰۰۱۲۷۹
نیپچون	۲۷۷۰۲۱۷۳۴۴	۲۶۴۶۲۷۲۲۳۲	۲۷۲۲۳۲۵۱۳۰

سیاروں کی حرکت دوری و محوری

سیارہ	حرکت دوری	حرکت محوری
عطارد	۳ ماہ	۲۴٫۹۱ گھنٹے
زہرہ	۷½ ماہ	۲۳٫۳۵ //
زمین	ایک سال	۲۴٫۰۰ //
مریخ	۲ سال	۲۴٫۶۶ //
مشتری	۱۲ سال	۹٫۹۲ //
زحل	۲۹ سال	۱۰٫۳۸ //
یورینس	۸۴ سال	۱۰٫۰۰ //
نپچون	۱۶۴ سال	۱۰٫۰۰ //

نظامِ شمسی



کرۂ آفتاب

کائنات میں آفتاب کی اہمیت ظاہر میں آفتاب ایک روشن قرص ہے جو ہر صبح مشرق سے نکلتا اور شام کے وقت مغرب میں ڈوب جاتا ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ روشن قرص ایک عظیم الشان کرہ ہے جو زمین سے کروڑوں میل فاصلہ پر رہ کر ہم کو روشنی اور حرارت پہونچاتا ہے۔ کرۂ شمسی معدنیات، نباتات، اور حیوانات کی پیدایش کا سبب ہے۔ اگر آفتاب دفعۃً معدوم ہو جائے تو زمین اپنے مدار کو چھوڑ کر خط مستقیم پر حرکت کرتی ہوئی خدا جانے کہاں سے کہاں جا پہونچے اور کس جرم سماوی سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے۔ اگر آفتاب نہ ہو تو دریا، چشمے، سمندر سب منجمد ہو جائیں۔ شدت برودت سے موالید ثلثہ فنا ہو جائیں، نہ زمین موسم بہار میں اپنی سبز رنگ پوشاک میں جلوہ گر ہو، نہ پرندے نرم و نازک شاخوں پر چہچہائیں، نہ اہلی اور وحشی حیوانات میں سے کوئی جانور زمین پر باقی رہے۔ بلکہ خود حضرت انسان کا کہیں پتہ نہ ہو جو اپنے کو زمین کا مالک بلکہ ساری کائنات کی علت غائی سمجھتا ہے۔

زمین سے آفتاب کا بعد آفتاب زمین سے ....۹۲۸۰۹ میل دور ہے۔ لیکن صرف ہندسوں سے اس بعد کی عظمت ظاہر نہیں ہو سکتی اس لئے ہم اس کو ذہن نشین کرنے کے لئے ذیل کی مثالیں فرض کرتے ہیں۔

۱- اگر بالفرض آفتاب پر ایک عظیم الشان توپ چلائی جائے تو اس کی آواز چودہ برس کے بعد زمین تک پہونچے گی حالانکہ آواز پانچ سکنڈ میں ایک میل سے زیادہ فاصلہ طے کرتی ہے۔

۲- اگر زمین اور آفتاب کے درمیان ریل گاڑی فرض کی جائے جو ۳۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے حرکت کرتی ہو تو وہ ۳۴۱ سال میں آفتاب تک پہونچے گی۔ اور یہ اس صورت میں جبکہ گاڑی بغیر ٹھیرے رات دن حرکت کرتی رہے۔

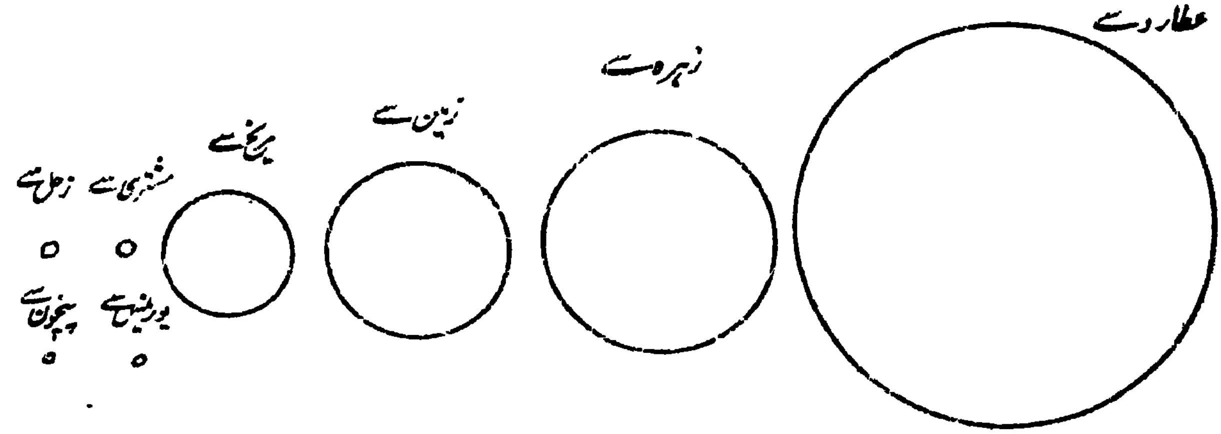
۳- اگر کوئی شخص ۱۰ مہینے تک رات دن برابر گنتا چلا جائے، تب جا کر وہ ۹ کروڑ ۲۸ لاکھ میل کی گنتی ختم کر سکے گا۔

آفتاب اور زمین کا فاصلہ باوجود اس مافوق الادراک عظمت کے ثوابت بعیدہ کے مقابلہ میں ایک نہایت حقیر فاصلہ ہے۔ ثریا کے ستارے زمین سے ......۲۰۹۹۵۶۵۶۱۹۲ میل دور ہیں اور کہکشاں کی دوری ......۳۲۳۲۴۳۴۴۱۴۳۱۴ میل قیاس کی گئی ہے۔

چونکہ اس قسم کے ابعاد عظیمہ کے ظاہر کرنے میں ہندسوں کا سلسلہ کافی نہیں ہوتا اس لئے سہولت فہم کے لئے یہ ابعاد حرکت نور کے ذریعہ سے سمجھائے جاتے ہیں۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ کہکشاں زمین سے اسقدر دور ہے کہ اس کی روشنی ۳ ہزار سال میں زمین تک پہونچتی ہے۔

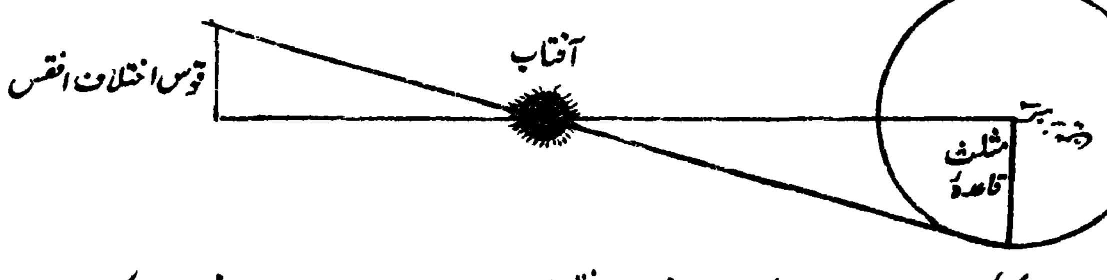
آفتاب زمین سے نہایت دور فاصلہ پر ہے اس لئے اتنا چھوٹا دکھائی دیتا ہے اگر وہ ہم سے اور زیادہ دور ہو جائے تو وہ بھی آسمان کے ایک چھوٹے سے ستارے کی طرح نظر آئے گا۔ نظام شمسی کے سیارات عظیمہ سے

آفتاب ذیل کی نسبت سے نظر آتا ہے ۔



آفتاب کا بُعد کس طرح معلوم کرتے ہیں

آفتاب کا بعد معلوم کرنے کے تین طریقے ہیں۔ پہلا طریقہ حساب مثلثات پر مبنی ہے، اور اُس کی صورت یہ ہے کہ ایک خط زمین سے نکل کر مرکز آفتاب سے گزرتا ہوا آسمان تک فرض کیا جاتا ہے اور دوسرا محیط زمین سے مرکز شمس پر گزرتا ہوا آسمان تک مانا جاتا ہے، یہ دونوں خط آفتاب پر ایک زاویہ بناتے ہیں اور اُن سے ایک مثلث بنتا ہے جس کا قاعدہ زمین کا نصف قطر ہوتا ہے۔ اس مثلث کی ساقیں آفتاب پر تقاطع کرتے ہوئے آسمان تک منتہی ہوتے ہیں۔ آسمان پر ان دونوں کے درمیان ایک قوس بنتا ہے جسے قوس اختلاف افقی کہتے ہیں۔



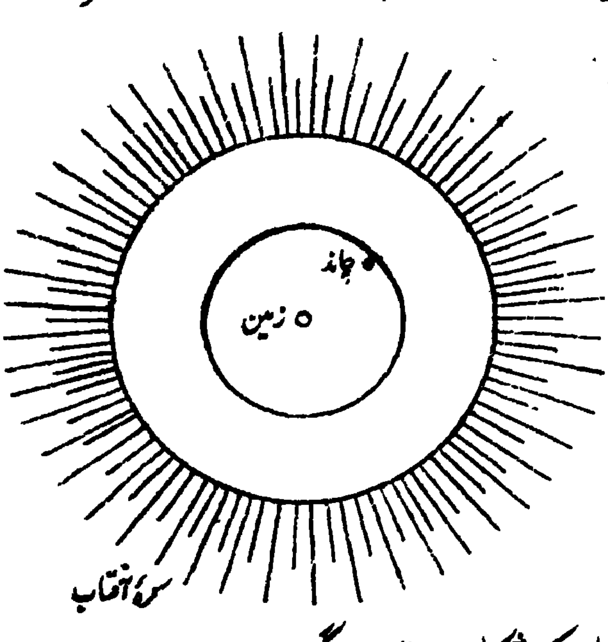
جس قدر کوئی جرم زمین سے قریب ہوگا اس قدر اختلاف افقی بڑھ جائے گا اور جس قدر بعید ہوگا اسی نسبت سے کم ہو جائے گا قاعدۂ مثلث کی پیمائش اور قرب و بعد سے قوس اختلاف کی نسبت معلوم کرنے سے بتایا جا سکتا ہے کہ آفتاب جو ۹ درجہ کا قوس اختلاف بناتا ہے زمین سے کتنے فاصلہ پر ہے۔

دوسرا طریقہ حرکت نور کا ہے۔ حرکت نور کی سرعت، اور زمین کی دوری حرکت کی رفتار معلوم کرکے بُعد شمسی معلوم کیا جا سکتا ہے۔

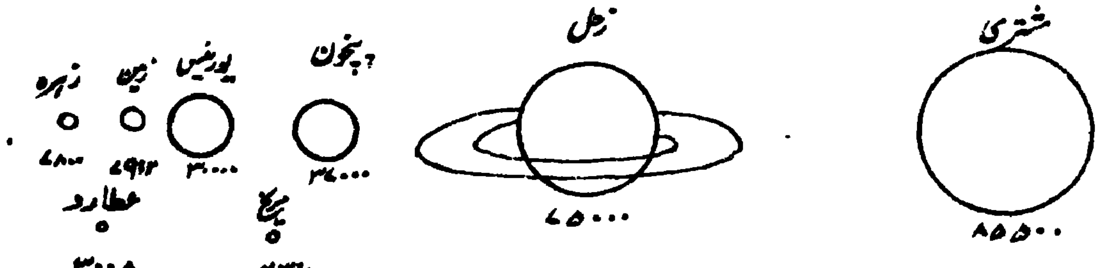
تیسرا طریقہ آفتاب کی جاذبیت پر مبنی ہے - آفتاب قرب و بعد کے لحاظ سے سیاروں پر جس نسبت سے اپنی جاذبیت کا اثر ڈالتا ہے اس سے بھی آفتاب کا فاصلہ دریافت ہوسکتا ہے۔

پہلے ان تینوں طریقوں کے نتائج میں کروڑوں میل کا فرق پڑجاتا تھا اور حقیقی بعد معلوم نہیں ہوسکتا تھا - مگر اب یہ اختلاف صرف ایک ملین میل میں محدود ہوگیا ہے - آج کل کے محقق علمائے ہیئت اس نتیجہ پر متفق ہیں کہ آفتاب کا بعد اوسط ۹ کروڑ ۲۰ لاکھ کے درمیان ہے - اور بعض قطعی فیصلہ کرتے ہیں کہ یہ فاصلہ ۹۲۸۹۰۰۰۰ میل ہے -

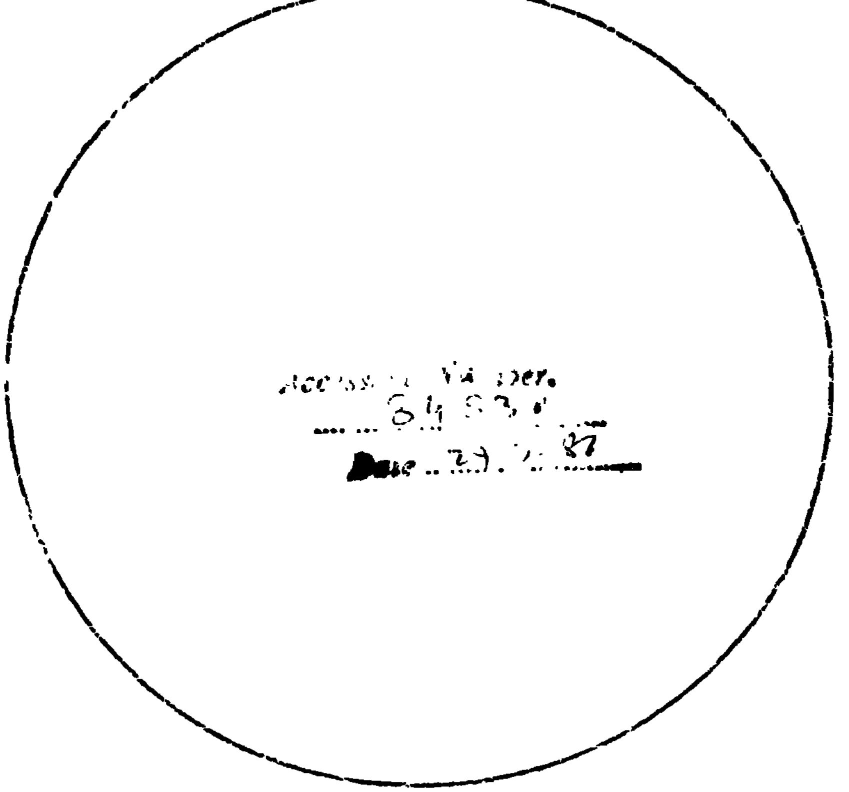
آفتاب کا قطر | آفتاب کا قطر آٹھ لاکھ چھیاسٹھ ہزار میل - اور محیط ۲،۲۱۷۱۴ میل ہے - اگر سطح آفتاب پر ریل گاڑی فرض کی جائے تو وہ اس مسافت کو دس سال میں قطع کرسکے گی - آفتاب اس قدر عظیم الشان کرہ ہے کہ اگر ہم اسے ایک کھوکھلا کرہ فرض کریں اور اس کے مرکز پر زمین فرض کرکے چاند کو اس کے گرد اسنے ہی فاصلہ پر جیسا کہ اس وقت واقع ہے (یعنی ۲۳۸۸۴۰ میل) متحرک مانیں تو چاند آفتاب کے اندر ہی اندر چکر لگاتا رہے گا اور پھر بھی تقریباً اتنی فضا خالی رہجائے گی جتنی زمین اور چاند کے درمیان ہے جیسا کہ اس شکل سے ظاہر ہوتا ہے - لیکن آفتاب باوجود اپنی عظمت کے اور ستاروں کی طرح ایک ستارہ ہے اور وہ بھی بہت بڑا نہیں، اس فضائے لاتناہی میں لاکھوں ستارے سورج سے بھی سیکڑوں بلکہ ہزاروں گنے بڑے ہیں اور کائنات عالم میں نظام شمسی کی طرح کروڑوں نظام پائے جاتے ہیں، جن میں متعلق انسان کو کچھ بھی علم نہیں۔ اس لئے اگر ہمارا آفتاب معدوم ہوجائے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ایک چھوٹے سے ستارے نے جھلملانا چھوڑ دیا۔



آفتاب اپنے سیاروں سے حجم کے لحاظ سے جو نسبت رکھتا ہے وہ ذیل کے اشکال سے ظاہر ہوگی -



آفتاب



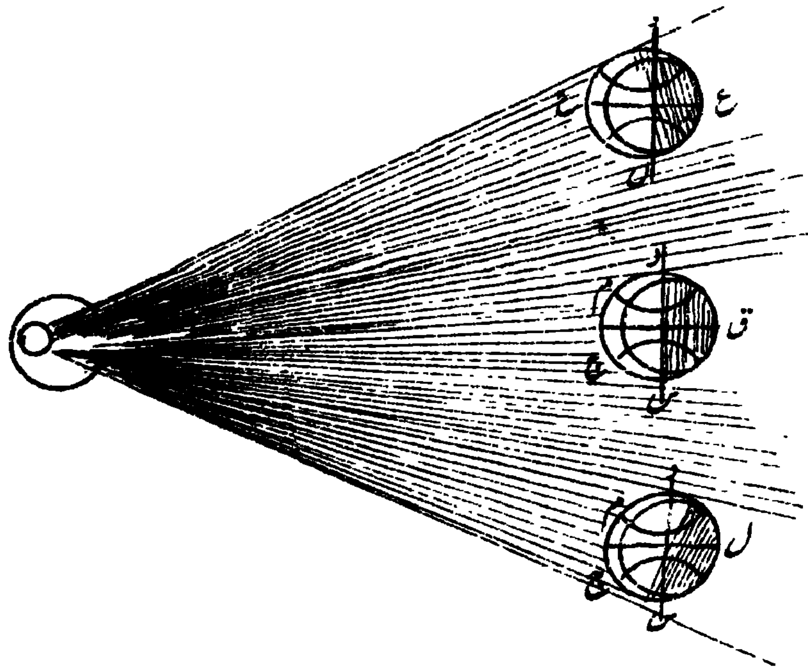
قطر ۸۶۶۰۰۰ میل

سورج کے گرد سیاروں کی حرکت تمام سیارے سورج کے گرد اہلیلجی شکل کے مدارات پر حرکت کرتے ہیں اور چونکہ آفتاب اہلیلجی مدار کے مرکز سے ہٹا ہوا ہے اس لئے سیارے اپنی دوری حرکت میں ایک مرتبہ آفتاب کے قریب اور ایک مرتبہ بعید ہو جاتے ہیں نقطۂ قرب کو حضیض اور نقطۂ بعد کو اوج کہتے ہیں۔ اسی نظام کے ماتحت سیارۂ زمین بھی اپنی سالانہ گردش میں ایک مرتبہ آفتاب سے ۳۲۱۰۰۰ میل قریب اور ایک مرتبہ اسی قدر بعید ہو جاتا ہے۔ غایت قرب ۲۲ ستمبر کو اور غایت بعد ۲۲۔ جون کو ہوتا ہے۔

بظاہر حیرت ہوگی کہ قرب جاڑے کے موسم میں اور بعد گرمی کے موسم میں ہوتا ہے حالانکہ اس کا عکس ہونا چاہئے تھا۔ بات یہ ہے کہ ۹ کرور میل کے مقابلہ میں ۳۲ لاکھ میل کا فاصلہ کچھ اہمیت نہیں رکھتا اور نہ زمین کی سردی اور گرمی پر کچھ زیادہ اثر ڈال سکتا ہے۔ اختلاف فصول اور حرارت کی کمی اور بیشی کا اصلی سبب آفتاب کی شعاعوں کا سیدھا اور ترچھا پڑنا ہے۔ چونکہ زمین کی گردش ٹھیک خطِ استوا پر نہیں ہے بلکہ وہ اسے قطع کرکے ۲۳½ درجہ شمالاً اور اسی قدر جنوباً مائل ہو جاتی ہے اسلئے میلان حرکت سے کبھی شعاعیں سیدھی اور کبھی ترچھی پڑتی ہیں۔ ترچھی شعاعوں میں حرارت کم ہوتی ہے' اور سیدھی میں زیادہ' اس لئے جس زمانہ میں انتہائی

میلان ہوتا ہے وہ جاڑے کا موسم ہے اور جس زمانے میں متوسط میلان ہوتا ہے وہ بہار اور خزاں کی فصلیں ہیں اور جب شعاعیں کامل عمودی یا مائل بعمودیت ہوتی ہیں وہی گرمی کا موسم ہے۔

جس زمانہ میں نصف کرۂ شمالی پر شعاعیں عمودی یا مائل بعمودیت ہوتی ہیں نصف جنوبی میں مائل ہو جاتی ہیں یہی وجہ ہے کہ جب نصف کرۂ شمالی میں گرمی ہوتی ہے تو نصف جنوبی میں جاڑا ہوتا ہے۔



ذیل کی شکل سے آفتاب کی شعاعوں کی عمودیت اور میلان اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ جب زمین مقام ق پر ہوگی تو م ج کے درمیان شعاعیں عمودی اور م د اور ج س کے درمیان مائل ہوں گی، اور جب زمین مقام ع پر ہوگی تو م ج پر مائل اور د م پر پہلی حالت سے بھی زیادہ مائل اور ج س پر مائل بعمودیت ہو جائیگی اسی طرح جب مقام ل پر پہنچے گی تو حالت اس کے خلاف ہو جائیگی۔

آفتاب کا دوربینی منظر اور منظر شمسی

خالی آنکھ سے آفتاب ایک صاف اور روشن کرہ نظر آتا ہے جس پر کہیں داغ یا دھبہ نہیں ہے۔ لیکن اگر اسے دوربین سے دیکھیں تو اس کی سطح روشن پر بہت سے سیاہ داغ نظر آئیں گے۔ قدماء کے پاس چونکہ خالی آنکھ کے سوا کوئی دوربین نہ تھی جس سے وہ اجرام سماوی کے حالات معلوم کرتے اس لئے وہ یہی سمجھتے رہے کہ آفتاب صاف روشن اور بالکل بے عیب ہے۔

ایک مرتبہ ایک عیسائی راہب کے مرید نے قرص شمسی پر ایک سیاہ داغ دیکھا اور اپنے مرشد کو اس کی خبر دی اس نے کہا کہ میں نے تمام قدیم فلاسفہ کی کتابیں پڑھی ہیں سب کا اس پر اتفاق ہے کہ جرم آفتاب نہایت صاف وشفاف ہے اور کہیں بھی اختلاف رنگ یا داغ وغیرہ نہیں ہے اس لئے جو داغ تمھیں نظر آیا ہے یا تو وہ تمھاری آنکھ میں ہے یا اس شیشہ میں ہے جس سے تم نے آفتاب

کو دیکھا ہے۔

مسلمانوں میں بھی یہ خیال چلا آتا ہے کہ قرص آفتاب کے وسط میں ایک چھوٹا سا سیاہ داغ ہے لیکن جدید تحقیقات سے قبل لوگ اسے محض وہم خیال کرتے رہے۔ چونکہ آفتاب کے بے داغ ہونے کا خیال طبائع میں راسخ ہو چکا تھا اس لئے جب سطح آفتاب پر کوئی داغ وغیرہ نظر آتا تھا تو اسے واہمہ کے مغالطہ سے زیادہ وقعت نہیں دی جاتی تھی۔ لیکن اب جدید اکتشافات اور دوربینی تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ آفتاب کا جرم ایسا صاف اور بے داغ نہیں ہے جیسا کہ پہلے خیال تھا بلکہ اس پر ہر وقت بے قاعدہ شکل کے بہت سے داغ نظر آتے رہتے ہیں جن سے شاذ و نادر ہی سطح آفتاب خالی ہوتی ہے۔

داغوں کے دریافت کرنے کا فخر سب سے پہلے گلیلیو اور فیبریشیوس نے سنہ ۱۶۱۰ء میں حاصل کیا ہے۔ یہ داغ مختلف صورت اور مختلف مقدار کے ہوتے ہیں، ان کی شکل بھی ایک حال پر نہیں رہتی نیز یہ داغ دائمی طریقے پر نہیں پائے جاتے بلکہ ظاہر ہوتے ہیں اور مٹ جاتے ہیں۔ ان کی شکلیں بے قاعدہ ہوتی ہیں۔ داغ کا درمیانی حصہ زیادہ سیاہ ہوتا ہے اور اطراف نسبتاً روشن ہوتے ہیں۔ حصۂ مرکزی "نواۃ" اور حصۂ محیط ظل یا ظلیل کہلاتا ہے۔


آفتاب کا داغ

کبھی ایک ظل میں متعدد نواۃ پائے جاتے ہیں اور کبھی نواۃ بغیر ظل کے بھی دیکھا گیا ہے۔

نواۃ حقیقت میں بالکل سیاہ نہیں ہے، بلکہ آفتاب کے جرم روشن کے مقابلہ میں سیاہ نظر آتا ہے پھر بڑھنے لگتا ہے یہاں تک کہ اپنے انتہائی حجم کو پہونچ جاتا ہے، پھر چھوٹا ہو کر معدوم ہو جاتا ہے۔ کبھی یہ تمام تغیرات ایک ہی دن میں ختم ہو جاتے ہیں اور کبھی یہ مراحل مہینوں میں طے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات دو تین یا اس سے زیادہ داغ مل کر ایک داغ بن جاتا ہے۔ اور کبھی ایک داغ تقسیم ہو کر متعدد داغوں کی صورت میں نظر آتا ہے۔

بعض وقت داغ اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ خالی آنکھ سے نظر آنے لگتا ہے جون سنہ ۱۸۴۳ء میں ایک عظیم الشان داغ نظر آیا تھا جس کا عرض ۷۷ ہزار میل سے زیادہ تھا۔ یہ داغ آٹھ دن تک خالی آنکھ سے نظر آتا رہا۔ سنہ ۱۸۳۷ء میں جو داغ نظر آئے تھے۔ اُن سب کی مجموعی مساحت تین ارب اکتیس کروڑ میل تھی۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں ایک داغوں کا مجموعہ دکھائی دیا تھا جس میں تنہا ایک داغ کی مساحت دو ارب چورانوے کروڑ میل تھی۔ جنوری سنہ ۱۹۲۶ء میں آفتاب کے مشرقی کنارہ پر ایک داغ نظر آیا تھا جس کا طول چند دنوں کے بعد ۲ لاکھ ۲۵ ہزار میل اور عرض ۴۷ ہزار میل ہو گیا تھا۔ یہ داغ چالیس دن تک قائم رہا۔

بعض وقت داغوں میں اس قدر سریع تغیر ہوتا ہے کہ دیکھتے دیکھتے اُن کی شکل کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے اس سریع تغیر کی وجہ وہ تلاطم ناری ہے جو سطح آفتاب پر نہایت شدت سے ہوتا رہتا ہے۔ اس تلاطم کی رفتار ایک ہزار میل فی گھنٹہ سے بھی کم نہیں ہوتی۔

داغوں کی حرکت | عموماً داغ آفتاب کے مشرقی کنارہ پر نظر آتے ہیں پھر چودہ دن میں مغربی کنارے پر پہونچکر غروب ہو جاتے ہیں پھر چودہ دن کے بعد دوبارہ مشرقی کنارے سے طلوع کرتے ہیں۔ چونکہ داغ آفتاب کی سطح پر پائے جاتے ہیں اس لئے اُن کی

حرکت سے معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب اپنے محور پر ۲۸ دن میں گھوم جاتا ہے۔

ولسن نے نہایت غور و تدقیق سے داغوں کا مطالعہ کیا اور نہایت تحقیق کے بعد اُس نے یہ ثابت کیا کہ داغ سطح آفتاب پر بطور گڑھوں کے ہیں۔ سب سے زیادہ عمیق حصہ نواۃ ہے۔ نواۃ پر ظل محیط ہوتا ہے جو تدریجاً بلند ہوتے ہوتے سطح آفتاب کی برابر ہو جاتا ہے۔

ولسن کی تحقیق تمام علمائے ہیئت نے تسلیم کر لی تھی اور ایک عرصہ تک اسے عین حقیقت خیال کیا جاتا تھا۔ خاص کر جب ڈولر نے ۱۸۸۱ء میں آفتاب کی متعدد تصویریں لیں اور اُنھیں سیر یو سکوپ[1] سے دیکھا گیا تو حقیقت اور بھی واضح ہو گئی۔

۱۸۸۶ء میں ہولٹ بطانوی نے اس کے خلاف آواز بلند کی اور داغوں کی مختلف تصویریں پیش کر کے ثابت کیا کہ ولسن کی رائے عام طور پر صحیح نہیں ہے بلکہ بہت سے داغ ایسے بھی پائے جاتے ہیں جن کی سطح آفتاب کی سطح نورانی سے بہت بلند ہے۔ اس وقت سے علمائے ہیئت کے دو فریق ہو گئے ہیں بعض ولسن کی رائے کو صحیح مانتے ہیں اور بعض ہولٹ کے ہم خیال ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ہولٹ کے دلائل سے ولسن کا مذہب پوری طرح باطل نہیں ہوتا اگرچہ بعض اصول کی تغلیط ضرور ہوتی ہے۔

داغوں کی عمر داغوں کی عمر بھی مختلف ہے بعض صرف ۲۴ گھنٹہ تک رہتے ہیں اور بعض چند ہفتوں تک نظر آتے ہیں۔ ۱۸۴۰ء میں ایک داغ دیکھا گیا تھا جس نے آفتاب کے گرد پورے ۹ چکر لگائے اور آٹھ مہینے تک باقی رہا۔ ۱۸۹۲ء تک قائم رہا اور اس عرصہ میں اُس نے آفتاب کے پورے پانچ چکر کئے۔ ہر دورہ میں یہ مجموعہ آفتاب کے خط استوائے جنوب کی طرف ہٹتا جاتا تھا یہانتک کہ آخر میں ۱۷ درجہ سے ۲۸ ½ درجہ عرض جنوبی تک پہونچ گیا۔ داغوں میں عرضی حرکت پائی جاتی ہے لیکن اس مجموعہ نے جس قدر عرضی حرکت کی اس کی مثال ابتک نہیں پائی گئی۔

داغوں کی کمی بیشی کا خاص زمانہ سب سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ آفتاب کے داغوں کے گھٹنے اور بڑھنے کا ایک ناخر زمانہ ہوتا ہے۔ قلت و کثرت کا یہ دور ہر گیارہ سال میں ختم ہوتا ہے یعنی ۳ ½ سال تک داغ بڑھتے بڑھتے انتہائی حد کو پہونچ جاتے ہیں پھر تدریجاً گھٹنے شروع ہوتے ہیں اور ۷ ½ سال تک گھٹتے گھٹتے بہت کم رہ جاتے ہیں۔ یہاں تک لبعض اوقات جرم شمس داغوں سے بالکل صاف نظر آتا ہے۔ بڑے داغ عموماً دور کثرت میں نظر آتے ہیں اور کبھی اس کے خلاف بھی ہے۔ جس دور سے ہم گزر رہے ہیں یہ داغوں کی کثرت کا دور ہے جو سنہ ۱۹۲۵ء میں ختم ہو جائیگا۔ اس باقاعدہ کمی و بیشی کا کیا سبب ہے؟ یہ راز عقول بشری کی پرواز سے ابھی تک بالاتر ہے۔

داغوں کا محل حدوث عموماً آفتاب کے داغ چھ درجے سے ۳۵ درجہ آفتاب کے عرض شمالی اور جنوبی تک منحصر ہیں اور ان دونوں منطقوں سے باہر شاذ و نادر ہی پائے جاتے ہیں۔ اور نصف کرہ شمالی میں بہ نسبت نصف جنوبی کے زیادہ

---

[1] یہ وہ آلہ ہے جس سے تصویر برجسم نظر آتی ہیں ۱۲

ہوتے ہیں اور ایک عجیب اتفاق یہ ہے کہ زمانۂ کثرت میں نصف شمالی میں زیادہ ہوتے ہیں اور جب کمی کا زمانہ آتا ہے تو نصف جنوبی میں اِن کی تعداد زیادہ ہوجاتی ہے۔

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ آفتاب کے داغ مشرق سے مغرب کی طرف حرکت کرتے ہیں اور اس باقاعدہ حرکت سے معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب اپنے محور پر ۲۸ دن میں ایک مرتبہ گھوم جاتا ہے۔ مگر حیرت میں ڈالنے والی بات یہ ہے کہ تمام داغ ایک نسبت سے حرکت نہیں کرتے جو داغ خطِ استوائے شمسی کے قریب ہوتے ہیں وہ سریع حرکت کرتے ہیں اور جو دور ہوتے ہیں اُن کی حرکت آہستہ ہوتی ہے۔

آفتاب کے داغ اور زمین کا نظامِ برقی | آفتاب کے داغوں میں اور زمین کے نظامِ برقی میں ایک خاص تعلق ہے جب آفتاب کی سطح پر زیادہ داغ پائے جاتے ہیں تو مقناطیسی سوئی کا اضطراب اور میلان بڑھ جاتا ہے اس مسئلہ کو تفصیلاً یوں سمجھنا چاہئے کہ قطب نما یا مقناطیسی سوئی شمالِ حقیقی کی طرف نہیں ہوتی بلکہ بعض بلاد میں نقطۂ شمال سے مشرق کی طرف اور بعض میں مغرب کی طرف مائل رہتی ہے۔ نیز یہ سوئی ایک حالت پر قائم نہیں رہتی بلکہ جب شہابِ ثاقب اور رعد و برق کی کثرت ہوتی ہے تو اس میں ایک خاص اضطراب بھی پیدا ہوجاتا ہے۔ دورانِ ۱۸۹۲ء میں جو عظیم الشان داغ نظر آیا تھا جب وہ دوپہر کے وقت قرصِ آفتاب کے مرکز پر پہونچا تو مقناطیسی سوئی اور نظامِ برقی میں ایک عظیم الشان اضطراب پیدا ہوگیا۔ اور کچھ دیر کے لئے ٹیلیفون اور ٹیلیگراف کے تار بالکل بیکار ہوگئے تھے۔

بعض کا خیال ہے کہ بارش کی کمی و بیشی کو بھی آفتاب کے داغوں سے خاص علاقہ ہے لیکن یہ مسئلہ ابھی پایۂ ثبوت کو نہیں پہونچا ہے۔

مشاعیلِ شمسی | مظاہرِ شمسی میں مشاعیل بھی عجیب و غریب چیز ہیں۔ یہ نہایت روشن سفید اور سرخ شعلے ہوتے ہیں جو آفتاب کے کنارے نظر آتے ہیں۔ یہ شعلے آفتاب پر ہر جگہ پائے جاتے ہیں لیکن کناروں پر ان کا دیکھنا زیادہ آسان ہے۔

کسوفِ کامل کے وقت یہ شعلے اور بھی زیادہ صاف نظر آتے ہیں اس وقت شعلے بڑے پہاڑوں اور گھنے بادلوں کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ ان شعلوں کی دو قسمیں ہیں۔ شعلہ ہائے سحابی اور شعلہ ہائے ناری۔ سحابی اور ناری شعلوں میں فرق یہ ہے کہ سحابی زیادہ پائدار اور پُرسکون ہوتے ہیں اور کئی کئی دن تک ان میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا اور سحابِ ارضی کی طرح کبھی ہلکے اور کبھی غلیظ ہوتے ہیں۔

شعلہ ہائے ناری نہایت سرعت سے فضا میں بلند ہوتے ہیں ان کی سرعت ایک سکنڈ میں ۱۰۰ میل سے زیادہ مشاہدہ کی گئی ہے۔ ۷۔ اکتوبر ۱۸۸۰ء میں ایک شعلہ دیکھا گیا جو ۴۰۰۰۰ میل تک بلند ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی بلندی ۸۰۰۰۰ میل تک پہونچ گئی تھی، دوسرے گھنٹہ میں اس کی لمعانیت حد سے زیادہ بڑھ گئی اور ۳۵۰۰۰۰ میل تک اونچا ہوگیا اور جب اس بلندی تک پہونچا تو یکایک بجھ گیا، یہ تمام انقلابات اور تغیرات صرف دو گھنٹے میں

ختم ہو گئے ۔

آفتاب کے داغوں کے گرد بھی اس قسم کے شعلے نظر آتے ہیں ۔ اور ہر طرف سے داغ کا احاطہ کر لیتے ہیں اسوقت ان کی شکل بید کے پتوں سے مشابہ ہوتی ہے ۔

کرۂ رنگین | یہ ایک غلاف کی طرح ہے جو سطح نورانی کے ہر طرف محیط نظر آتا ہے ۔ دوربین سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غلاف بخارات ناری کا ایک عظیم الشان سمندر ہے جس کا عمق ۲ ہزار سے چھ ہزار میل تک دیکھا گیا ہے ۔ یہ کرہ پورے گہن کے وقت گلابی رنگ کا نظر آتا ہے جس میں ہر وقت ایک عظیم الشان اور فائق الادراک تلاطم اور تموج برپا رہتا ہے ۔

اسپکٹر اسکوپ[1] کے ذریعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کرۂ رنگین میں ہائڈروجن اور ہیلیم دو عنصر پائے جاتے ہیں ۔ عنصر ہیلیم پہلے آفتاب میں دریافت ہوا تھا اور عناصر ارضی میں اس کا پتہ نہیں تھا ۔ لیکن ۱۸۹۵ء میں پروفیسر رمزے کی تحقیقات سے معلوم ہوا کہ زمین پر بھی اس کا وجود ہے ۔

اکلیل | یہ ایک مختلف الحدود روشنی ہے جو کسوف کامل کے وقت آفتاب کے گرد نظر آتی ہے ۔ قدما نے بھی اس کا مشاہدہ کیا تھا مگر اس کے متعلق تحقیقات کا سلسلہ کیپلر سے شروع ہوتا ہے ۔ اس جھلکتی ہوئی روشنی کو اصطلاح میں اکلیل کہتے ہیں ۔ اکلیل کے اطراف فضا میں دور تک پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں جو لمبی لمبی نورانی شعاعوں کی صورت میں ہوتے ہیں ۔ اور کبھی یہ روشنی پھیلتی نہیں ہے ۔ بلکہ ایک حلقہ کی طرح آفتاب پر محیط نظر آتی ہے ۔ اکلیل اور آفتاب کے داغوں میں بھی خاص تعلق ہے جس زمانہ میں داغ کثرت سے ہوتے ہیں اکلیل بھی بڑا نظر آتا ہے ۔

اکلیل کی ماہیت کیا ہے اور یہ کیوں نظر آتا ہے اس کے متعلق انسان کی تحقیق کسی فیصلہ کن اور تسلی بخش نتیجہ تک نہیں پہونچی ہے ۔

آفتاب کے عناصر اور اسپکٹر اسکوپ | اسپکٹر اسکوپ ایک آلہ ہے جس میں ایک مثلثی شیشہ ہوتا ہے مثلثی شیشہ کا قاعدہ ہے کہ وہ روشنی کے الوان سبعہ کی تحلیل کر کے ہر ایک کو ترتیب وار دکھاتا ہے (جس طرح کہ قوس قزح میں یہ رنگ نظر آتے ہیں) اسپکٹر اسکوپ کے ذریعہ سے جو عکس ڈالا جاتا ہے وہ مستطیل صورت میں پڑتا ہے جس میں علاوہ ساتوں رنگ کے متعدد سیاہ خطوط بھی نظر آتے ہیں ۔ اس عکس مستطیل کو اسپکٹرم یا طیف کہتے ہیں ۔

طیف شمسی میں قریب چھ سو کے خطوط پائے گئے ہیں ۔ جن میں سے متعدد خطوط کے مواقع متعین ہو گئے ہیں اور ان کے

---

[1] اسپکٹر اسکوپ ایک آلہ ہے جس کے ذریعہ سے روشنی کی تحلیل ہوتی ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ جس چیز کی روشنی ہے اس میں کیا کیا اجزا شامل ہیں حتی کہ زمین پر بیٹھے بیٹھے معلوم ہو جاتا ہے کہ اجرام سماوی میں کیا کیا عناصر پائے جاتے ہیں ۔ اس آلہ کی تفصیل آگے آتی ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ حیرت انگیز آلہ عقول انسانی کا ایک عجیب و غریب نتیجہ ہے ۱۲

نام بھی رکھ دیئے گئے ہیں تجربات سے ثابت ہو گیا ہے کہ یہ خطوط اکثر اُن عناصر کے ہوتے ہیں جو کسی جسم میں اشتعالی حالت میں پائے جاتے ہیں اگر لوہے کو حدِ بیاض تک حرارت پہنچا کر اُس کا عکس اسپکٹر اسکوپ سے ڈالا جائے تو اُس کے طیف میں لوہے کا ایک خاص خط ہوگا جسے ہم خطِ حدیدی کہہ سکتے ہیں۔ اگر چند عناصر کو ملا کر اُن کا عکس ڈالا جائے تو ہر ایک عنصر کا ایک علٰحدہ خط نظر آئیگا۔

آفتاب کی روشنی سے جو طیف لیا گیا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب میں یہ عناصر پائے جاتے ہیں:۔ لوہا، ہائیڈروجن، آکسیجن، سوڈیم، کاربن، نکل، میگنیشیم، تانبا، جست، چاندی، سیسہ، پوٹاسیم، الومینیم، کرومیم، اسٹرونیم، کیڈمیم، کلیشیم، مینگنیز

یہ تمام عناصر سطحِ شمسی پر گیس کی حالت میں ہیں کیونکہ آفتاب کی حرارت اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ جامد سے جامد چیز وہاں گیسی صورت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اگر زمین آفتاب کے قریب سے گزر جائے تو اُس کے ناپیدا کنار سمندر، وسیع بر اعظم، بلند پہاڑ، ایک سیکنڈ میں گیس بنکر فضا میں منتشر ہو جائیں۔

آفتاب کی حرارت آفتاب کی حرارت اس درجہ بڑھی ہوئی ہے کہ ہم اُس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ اگر تمام روئے زمین پر پچاس گز عمیق برف کا ایک غلاف فرض کیا جائے تو آفتاب کی وہ حرارت جو ہر سال ۹ کروڑ میل کے فاصلے سے ہم تک پہونچتی ہے، اس حرارت منتشرہ کا صرف ۱/۲۲۰۰۰۰۰۰ حصہ زمین کو ملتا ہے اور باقی سے تمام جہات مستفید ہوتے ہیں۔

آفتاب کی روشنی اگر ۵۵۵۶۳ شمع آنکھ سے ایک فٹ کے فاصلہ پر جلائی جائیں تو اُن کی روشنی آفتاب کے برابر ہو سکتی ہے سورج کی روشنی ۰۰۰ بدرِ کامل کی روشنی کے برابر ہے۔

مظاہرِ شمسی کے اسباب اور طبقاتِ شمس مظاہرِ شمسی یعنی داغ، ظل، نواۃ وغیرہ کے اسباب میں علمائے ہیئت نے بہت کچھ اختلاف کیا ہے گلیلو کا خیال تھا کہ داغ اصل میں ایک سحابی مادہ ہے جو سطحِ آفتاب سے بلند ہوتا ہے اس ابر کی وجہ سے آفتاب کی سطحِ روشن چھپ جاتی ہے اور قطعۂ سحابی داغ کی صورت میں نظر آتا ہے۔ ابر کے اطراف چونکہ نسبتاً رقیق اور سطحِ روشن سے قریب ہوتے ہیں اس لئے وہ مرکزی حصہ سے روشن ہوتے ہیں انھیں کو ہم ظل کہتے ہیں۔ اور مرکزی چونکہ نورانی سطح سے دور اور اطراف کے مقابلہ میں زیادہ غلیظ ہوتا ہے اس لئے وہ سطحِ روشن کو بالکل چھپا لیتا ہے اور سیاہ داغ کی صورت میں نظر آتا ہے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ آفتاب کا مادۂ سحابی زمین کے ابر کی طرح نہیں ہے جس سے پانی برستا ہے۔ بالکل وہ ایک گیسی مادہ ہے جس میں مختلف عناصر شامل ہوتے ہیں اور آفتاب کی شدتِ حرارت کی وجہ سے فضا میں صعود کرتا رہتا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ آفتاب ایک جامد اور تاریک کرہ ہے جس پر تین طبقے محیط ہیں۔ یہ طبقے اندر کی جانب سے شمار ہوتے ہیں پہلا طبقہ ایک نورانی غلاف ہے جو سطح پر ہر طرف سے محیط ہے۔ دوسرا طبقہ ایک رنگین غلاف ہے جس میں روشنی کے الوانِ سبعہ پائے جاتے ہیں۔ تیسرا طبقہ جو سب پر محیط ہے زمین کے کرۂ ہوائی سے مشابہ ہے۔ اس طبقہ کو کرۂ گیسی کہتے ہیں۔ اس خیال کی بنا پر داغوں کی یہ توجیہ ہے کہ بعض اوقات سطحِ نورانی پھٹ جاتی ہے اور نیچے سے آفتاب کا سیاہ جرم داغ کی صورت میں نظر آتا ہے، داغ کے اطراف چونکہ روشن سطح سے قریب ہوتے ہیں اس لئے وہ داغ کی بہ نسبت زیادہ روشن ہوتے ہیں۔

اور یہی ظل کہلاتے ہیں۔

ماریوس کہتا ہے کہ داغ اصل میں وہ خاکستر ہے جو سطح آفتاب پر احتراقی حالت میں پائی جاتی ہے۔ اور یہی خاکستر جب آفتاب سے علیحدہ ہو جاتی ہے تو مدار ستارہ بن جاتی ہے۔

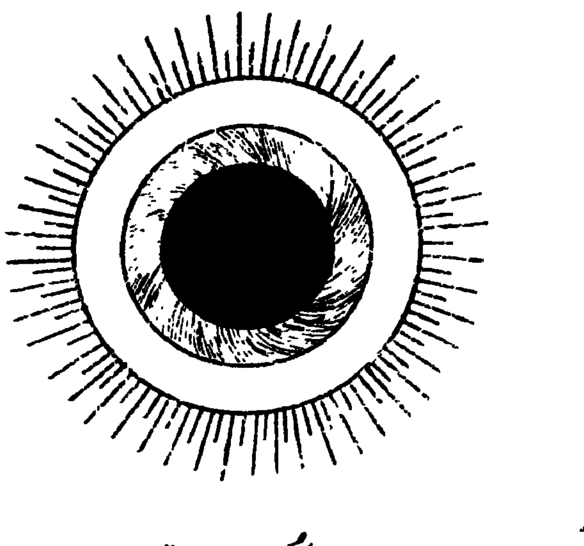
ڈرہام نے یہ توجیہ کی ہے کہ آفتاب پر آتش فشاں دہانے نہایت کثرت سے پائے جاتے ہیں، یہ دہانے جب دھویں یا اور کسی سیاہ محترق مادہ کو پھینکتے ہیں تو آفتاب کی نورانی سطح پھٹ جاتی ہے۔ اور اس میں ایک سیاہ غار پیدا ہو جاتا ہے جو داغ کی صورت میں ہمیں نظر آتا ہے۔ جب مادۂ صاعدہ تحلیل ہو جاتا ہے تو اس سوراخ میں سے شعلے بلند ہونے لگتے ہیں جو ظل اور شعلوں کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں۔

لالنڈ کا خیال تھا کہ آفتاب پر ایک نورانی سمندر محیط ہے جس میں جابجا بڑی بڑی چٹانیں ہیں جو سمندر سے اوپر نکلی ہوئی ہیں یہی چٹانیں ہمیں داغوں کی شکل میں نظر آتی ہیں اور چٹانوں کے اطراف اور ریگستانی کنارے ظل کی شکل میں دکھائی دیتے ہیں۔

ولسن (۱۷۶۹ء) کی تحقیق یہ تھی کہ آفتاب ایک جامد اور تاریک جرم ہے جس پر ایک روشن مادہ کا غلاف چڑھا ہوا ہے یہ غلاف سیلانی حالت میں ہے۔ جب آفتاب کے اندرونی جرم میں بخارات پیدا ہوتے ہیں تو وہ صعود کر کے غلاف نورانی چاک کر دیتے ہیں اور وہاں سے نیچے کا سیاہ جرم داغ کی طرح نظر آتا ہے پھر آہستہ آہستہ مادۂ سائلہ چاروں طرف سے بہ کر مرکز کی طرف قریب ہوتا جاتا ہے اور اسی کو ہم ظل کہتے ہیں۔

ہرشل کا خیال تھا کہ آفتاب ایک ٹھنڈا جامد اور تاریک کرہ ہے جس میں نشیب و فراز پہاڑ اور وادیاں وغیرہ سب کچھ پایا جاتا ہے۔ وہاں نباتات بھی ہیں اور حیوانات بھی اس تاریک کرہ کے گرد نہایت غلیظ بادل محیط ہیں اور بادلوں کے اوپر نورانی غلاف ہے جو حرارت اور روشنی کا سرچشمہ ہے اسی غلاف سے آفتاب کی اندرونی سطح پر روشنی اور حرارت پہونچتی ہے اور وہ گہرے بادل روشنی اور حرارت کو معتدل کر دیتے ہیں اور یہی نورانی غلاف تمام سیاروں کو روشنی اور حرارت پہونچاتا ہے۔ جب کبھی سطح شمس سے بخارات اٹھتے ہیں تو وہ ابر محیط اور غلاف روشن کو چیرتے ہوئے فضا میں نکل جاتے ہیں۔ بخارات کے چڑھنے سے ابر محیط اور نورانی غلاف جابجا سے پھٹ جاتا ہے اسی لئے دوربین سے آفتاب کی سطح پر ایک روشن اور تاریک جال سا نظر آتا ہے جو بالکل اس ابر سے مشابہ ہوتا ہے جو جابجا سے پھٹ جاتا ہے اور اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے آسمان پر پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اگر بخارات کثرت سے ہوتے ہیں تو سطح نورانی اور محیط سحابی میں ایک بڑا سوراخ پیدا ہو جاتا ہے جس کا مرکزی حصہ نواۃ کی صورت میں اور آس پاس کا حصہ ظل کی طرح دکھائی دیتا ہے۔

توجیہات مذکورہ کے علاوہ مظاہر شمسی کے اور بھی عجیب عجیب اسباب بیان کئے گئے لیکن یہ سب اس وقت تک تھا جب تک کہ اسپکٹرا اسکوپ سے کام نہیں لیا گیا تھا۔ جب اسپکٹرا اسکوپ ایجاد ہوا تو معلوم ہوا کہ سخت سے سخت جامد مادہ آفتاب پر شدت حرارت کی وجہ سے گیس کی صورت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جب یہ حقیقت منکشف ہوئی تو تمام توجیہات سابقہ



چھوڑ دی گئیں اور ایک نئی وجہ بیان کی گئی۔ اور وہ یہ ہے
کہ آفتاب کا تمام اندرونی حصہ بخاری یا گیسی حالت میں ہے
لیکن وہ ابخرۂ ارضی کی طرح لطیف اور رقیق نہیں ہے بلکہ
دباؤ کی وجہ سے شہد کی طرح غلیظ القوام ہے۔ اس گیس میں
ایک دائمی تموج اور تلاطم ہے اور سطح آفتاب پہ ہمیشہ گیسیں
اٹھتی رہتی ہیں جب مرکزی حصہ سے گیس بلند ہوتی ہے تو
اُس میں انتہائی حرارت ہوتی ہے لیکن سطح آفتاب تک پہنچ کر
جب وہ فضائے محیط سے ملتی ہے تو اس کی حرارت کم ہونے
لگتی ہے اور سطح آفتاب پر ایک پھٹتے ہوئے ابر کی طرح نمودار
ہوتی ہے ابر کی چوٹیاں پست حصہ سے زیادہ روشن ہوتی ہیں اس لئے آفتاب پر روشن گرے نظر آتے ہیں اسی روشن
ابر کے احاطے سے آفتاب پر ایک نورانی غلاف چڑھ گیا ہے۔

جب اِن گیسوں میں برودت اور تکاثف کی وجہ سے ثقل پیدا ہوتا ہے تو وہ پھر مرکز کی طرف گرنے لگتی ہے چونکہ یہ ثقیل گیسیں روشنی اور حرارت کی ایک عظیم مقدار ضائع کر چکی ہیں اس لئے وہ بمقابلہ اور گیسوں کے تاریک اور روشنی میں کم ہوتی ہیں۔ جب ان گیسوں کی ایک عظیم مقدار سطح آفتاب پر گرتی ہے تو اُس کے اطراف ظل کی صورت میں اور مرکزی حصہ داغ کی شکل میں نظر آتا ہے۔ چونکہ یہ ثقیل بخارات نہایت زور سے سطح پر گرتے ہیں اس لئے اُن کے اطراف سے روشن مادہ نہایت سرعت کے ساتھ فضا میں بلند ہوتا ہے۔ اور مشعلوں کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔

ہمارے خیال میں یہ توجیہ بھی کچھ ٹھیک نہیں کیونکہ اگر داغوں کے ہونے کا یہی سبب ہے تو تمام سطح آفتاب پر ایک نسبت سے کیوں نہیں پیدا ہوتے؟ حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ آفتاب کے خط استوا اور اطراف قطبین پر شاذ و نادر ہی داغ نظر آتے ہیں۔

دوسرا شبہ یہ ہے کہ اِن کی زیادتی اور کمی کا ایک خاص زمانہ اور مقررہ مدت کیوں ہے؟ خط استوا کے قریب جو داغ ہیں وہ دُور کے داغوں سے کس لئے سرعت سے حرکت کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آفتاب کائناتِ عالم میں ایک عجیب و غریب چیز ہے۔ جس پر ہر وقت ایک عظیم الشان تلاطم ناری اور طوفانِ جہنمی برپا رہتا ہے۔ ہزاروں میل عرض و طول کے داغ پیدا ہوتے ہیں لاکھوں میل اُس کی سطح سے شعلے بلند ہوتے ہیں لیکن اِن تمام مظاہرِ شمسی کے اسباب کیا ہیں۔ ان کی حقیقت ابھی تک انسان پر منکشف نہیں ہوئی ہے۔ اور اس وقت تک محض قیاسات سے کام لیا جا رہا ہے۔ نہایت طاقتور دوربین کے ذریعہ سے جب آفتاب کی تصویر لی جاتی ہے اور اُسے

اُس آلہ سے دیکھتے ہیں جو تصویروں کو مجسم کرکے دکھاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ داغ کی سطح نورانی غلاف سے بہت زیادہ پست ہے اور نورانی غلاف بھی یکساں نہیں ہے بلکہ جابجا سے پھٹا ہوا ہے۔ اور آفتاب کے کناروں سے شعلے بلند ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور اسپکٹرا اسکوپ کے ذریعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ آفتاب پر کون کون سے عناصر پائے جاتے ہیں۔ اس سے زیادہ تفصیلات معلوم کرنے کا انسان کے پاس کوئی قابلِ وثوق ذریعہ نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ مستقبل میں انسان ایسے آلات اور وسائل اختراع کرے جس سے آفتاب کے متعلق اور زیادہ معلومات حاصل ہو سکیں۔

(ابوالمحاسن) محمود علی

اولین نفسِ بہار

افق کے عنبریں شعلوں میں ہنوز اک وہمِ رنگین باقی تھا، شامِ بہاراں کی فضا کیف آلود تھی کہ تیتری، عالمِ رنگ کی اک بیقرار روح، باغ میں آئی اور ہوا کی فضا کو اپنے حرکاتِ رقصیہ سے متموج کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد یہ نرگس کے پاس گئی اور ایک بوسہ چرا لائی۔ وہ پھر کچھ دیر تک شاید اپنی اس کامیابی پر اک مسرورانہ رقص کرتی رہی، اب وہ باربار اس پھول کو چومتی اور بھاگ جاتی تھی، بوسہ لیتی اور رقص کرتی۔ رقص طویل، رقص کرتی اور بوسہ لیتی۔ بوسۂ مدید! وہ اک لرزشِ تشنگی تھی، اک مستقل اہتزاز تھی

ساغرِ نکہت کے نوشِ لطیف نے، خود اُسے پنکھڑی بنا دیا تھا۔ وہ اس کی حلاوت کے ساتھ تلخیاں بھی پیئے جا رہی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ لمحۂ نوشانوش یہی ہے۔ ..." آخرکار، افقی طلسمِ رنگ کی شکست کے ساتھ، یہ تیتری بھی اک پژمردہ برگِ گل کی طرح شاخ سے جدا ہو کر نیچے گر پڑی۔ اب، نہ اس میں رقص اضطراب تھا، نہ اضطرارِ رقص، اس کے بازو مضمحل ہو چکے تھے اور تشنگی سیراب!'

نرگس کے پھول نے یہ سانحۂ جانکاہ دیکھا، مگر نہ دیکھ سکا اور شاخ سے جدا ہو کر اک ہلکی اور مختصر سی عمودی لکیر بناتا ہوا تیتری کے سرہانے گر پڑا، اور اس شہید بوسہ ہستی کا سر اپنی گود میں لے لیا۔ گویا گلِ نرگس اس بوسۂ مدید کی تکمیل کر رہا تھا ــــ اب بلبل اپنی نوائے مرتعش سے اس کا نوحۂ ماتم پڑھ رہی تھی، اور ماہتاب کے اشک سیمیں اس غم میں سارے باغ کو نم آگیں بنا رہے تھے!

آہ! اس لئے کہ موسمِ گل کا ایک مسرور دن، اپنی زر بفتی بازوؤں کی بے چینی کے ساتھ بسر کر سکے، تیتری اپنی ساری زندگی قیمت میں دے دیتی ہے! رنگینیِ بہار کا نفسِ اولیں، تیتری کی بہارِ آخریں کی نگہِ واپسیں ہے!

ل۔ احمد

قلوبطرہ

CLEOPATRA

سنہ ۶۹–۳۰ ق م

(۱)

قلوبطرہ حسن و شباب کی اُن تمام آئینہ داریوں کے ساتھ، جنھیں صرف اُسی کا بلوریں سینہ پیش کر سکتا تھا، خوابگاہِ ناز میں اک مخملی صندلی پر متمکن تھی، اور اس کی چینِ پیشانی، جس میں فطرت نے کائنات کو درہم برہم کر دینے کی قوت پوری طرح ودیعت کی تھی سردارانِ مصر کو، جو اس وقت اس کے روبرو دست بستہ کھڑے تھے، کپکپائے دے رہی تھی۔

سرزمینِ فراعنہ کے ایک ایک نوجوان کو معلوم تھا کہ قلوبطرہ کے حسنِ برق افگن پر اک اچٹتی ہوئی نگاہ بھی ڈالنا گویا خرمن کا بجلی کو دعوت دینا ہے، چہ جائیکہ اُس کے حُسن برہم کو دیکھنا، جس کے سامنے تو نیل کی موجیں بھی تھوڑی دیر کے لئے اپنی روانی کو بھلا دیتی ہوئی نظر آتی تھیں۔

غیظ و غضب کے عالم میں اس کا سینہ سریع تنفس کی وجہ سے جلدی جلدی اُبھر رہا تھا اور کافوری شمعوں کی روشنی کا انعکاس گھڑی گھڑی اس کاغذ پر ڈال رہا تھا جسے وہ ہاتھ میں لئے پڑھ رہی تھی۔

. . . .

"بیشک میں مصر کی ملکہ ہوں، اور اس وقت تک ملکہ رہنے کی کوشش کروں گی، جب تک میرے قلب میں اسکی آخری ضرب باقی ہے۔ لیکن اگر تم یا تمہارا قانون، سلطنت میں میری شرکت کو صرف اس شرط سے گوارا کر سکتا ہے کہ میں ٹولمی کو اپنے اس بستر پر جگہ دوں، جہاں سے زندہ اٹھکر کسی کا جانا مجھے پسند نہیں آتا، تو جاؤ اور اس سے کہدو کہ اب اس کے لئے صرف دو صورتیں ہیں۔ یا تو وہ شرکتِ حکومت کے خیال سے باز آئے یا پھر قلوبطرہ، اس قلوبطرہ کی برہمی کا مقابلہ کرے، جو اک ادنیٰ اشارہ سے نیل کی تمام وادیوں کو اک ورق کاغذ کی طرح ادھر سے اُدھر الٹ دے سکتی ہے"

(۲)

جب جولیس سیزر، روم کا وہ پرشوکت و جبروت جنرل، جس نے پامپیائی کو مفتوح کر کے تمام عالم کو اپنی قوت کے افسانوں سے معمور کر رکھا تھا، حدودِ اسکندریہ میں پہونچا، تو اُسے معلوم ہوا کہ یہاں تمام ملک میں بد امنی کی حکومت ہے

تخت گاہ مصر کی گلیاں نہرِ خون بنی ہوئی ہیں اور قلوبطرہ کے جانباز سپاہی، ٹولمی کی وفادار سپاہ سے مصروف پیکار ہیں۔

اگر جولیس سیزر چاہتا تو اس تفریق سے فائدہ اٹھا کر مملکت مصر پر آسانی سے قابض ہو سکتا تھا، لیکن وہ اپنی تازہ فتوحات کے نشہ میں چور تھا اور اس وقت وہ صرف امن و سکون کے قیام ہی میں اپنے لئے تفریح محسوس کرتا تھا۔ اس نے یہ خیال کر کے کہ قلوبطرہ اک عورت ہے اور یقیناً اس کے بھائی ٹولمی نے اس کا حق سلطنت غصب کر لیا ہوگا، اپنا ایک سردار روانہ کیا کہ قلوبطرہ اور ٹولمی دونوں کو اس کے حضور سے آئے۔

(۳)

قلوبطرہ جسے اپنے حسن و جمال پر ناز تھا، جو سمجھتی تھی کہ دنیا کی کوئی بڑی سی بڑی قوت ایسی نہیں ہے جو اس کے روبرو جھک جانے کی لذت حاصل کرنے کے لئے بیتاب نہ ہو۔ آرائش کے کمرہ میں آئینہ کے سامنے کھڑی ہوئی بال سنوار رہی ہے اور مسکراتی جاتی ہے اس خیال سے کہ آج اپنا وہ حربہ استعمال کرے گی، جسے وہ اپنے بھائی ٹولمی پر نہ استعمال کر سکتی تھی اور جس کا معمول بننے کے لئے اکاسرہ و قیاصرہ ہی کی ضرورت تھی۔

نہایت باریک آسمانی رنگ کی ریشمی چادر، جس میں جا بجا موتی ٹنکے ہوئے تھے، اس کے خوبصورت جسم سے لپٹی ہوئی تھی اور باوجود کوشش کے بھی وہ سینہ و شانہ پر ٹھیرنے کی تاب نہ لا سکتی تھی۔ اس نے گیسو سنوارے، لباس درست کیا اور ان تمام دلربایانہ اداؤں کے ساتھ، جو قدرت کی طرف سے مصر کی اس جوان ملکہ کے لئے مخصوص تھیں، نکہت کی طرح نکلی اور صرف ایک سردار کو ساتھ لیکر سیزر کے پاس روانہ ہو گئی۔

(۴)

سیزر اپنے درباری خیمہ میں منتظر بیٹھا تھا کہ خادم نے اطلاع کی کہ ایک سردار ملکہ قلوبطرہ کی طرف سے کوئی ہدیہ لایا ہے اور پیش کرنا چاہتا ہے۔ سیزر نے اجازت دی اور ایک خوش رو نوجوان اپنی پشت پر ایک گٹھری لئے ہوئے آیا اور اسے زمین پر رکھکر کھولنے لگا۔

سیزر منتظر تھا کہ اس کے اندر سے سیم و زر کی کشتیاں نمودار ہوں گی، الماس و عقیق سے جڑے ہوئے بیش بہا زیور نظر آئیں گے، لیکن اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب اس کے اندر سے بجائے سیم و طلا و الماس و عقیق کے، اک سرو زریں، ایک مجسمۂ شباب، اک پیکر حسن و جمال، ملکۂ قلوبطرہ تنک و عریاں لباس میں اسی طرح نمودار ہوئی، جس طرح کبھی وینس (زہرہ) سطح آب سے اپنا بھیگا ہوا جسم لئے ہوئے پیدا ہوئی تھی۔

(۵)

ٹولمی کو مغلوب کرنے کے بعد سیزر اسکندریہ میں وہی زندگی بسر کر رہا ہے، جو قلوبطرہ ایسی حسین عورت کی معیت

میں بسر کی جا سکتی ہے۔ اس کے لئے مہر و ماہ کا طلوع و غروب، شب و روز کا ظہور و خفا، بہار و خزاں کی آمد و شد اور فطرت کے تمام متضاد مناظر صرف قلو بطرہ کے مسرت و اضمحلال سے عبارت تھے اور وہ محسوس کرتا تھا کہ دنیا کا ہر تغیر صرف اس لئے عمل میں آتا ہے کہ قلوبطرہ کی خواہش یہی ہے۔

قلوبطرہ بیتاب تھی کہ دنیا کے اس مشہور جنرل کو شادی کرکے ہمیشہ کے لئے اپنا بنا لے، لیکن چونکہ اس کی بیوی موجود تھی اور وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا، اس لئے وہ روم جانے سے قبل چاہتا تھا کہ اس کے جذبات مضمحل ہو جائیں اور جب وہ قلوبطرہ کی آغوش اور ساحل نیل سے جدا ہو تو اس کی جملہ تمنائیں ختم ہو چکی ہوں۔

کچھ زمانہ تو سیزر نے ایسے خود فراموشی کے عالم میں بسر کردیا کہ خود اُسے بھی خبر نہ ہوئی کہ وہ کیا کر رہا ہے اور اُسے کیا کرنا چاہئے، لیکن جب اس کے احباب نے روم سے اُسے اطلاع دی کہ سلطنت روما کو اس کی واپسی کی سخت ضرورت ہے، تو اُسے ہوش آیا اور اُس کے تمام وہ مردانہ عزائم جو قلوبطرہ کی آغوش میں پہونچکر سو گئے تھے، پھر بیدار ہونے لگے۔ اس نے دفعتہً روم جانے کا ارادہ استوار کیا اور قلوبطرہ سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جانا چاہا۔ مگر قلوبطرہ جو اس شکار کو اپنے قابو سے جانے دینا نہیں چاہتی تھی اور سمجھتی تھی کہ شاید روم پہونچکر وہ کسی ممبر سے اس کو عقد نکاح میں لے آئے گی، اس پر راضی نہ ہوئی اور خود بھی اس کے بعد ہی روم کی طرف روانہ ہو گئی۔

(۶)

سیزر، بروٹس کے ہاتھ سے قتل ہو چکا ہے، روم میں انطانی اور بروٹس کے درمیان جنگ ختم ہو کر کامیابی کا سہرا انطانی کے سر باندھا جا چکا ہے اور قلوبطرہ کو مصر میں حکومت کرتے ہوئے تین سال گزر چکے ہیں۔

چونکہ قلوبطرہ کی عربدہ جو اور مصلحت اندیش فطرت، درپردہ بروٹس سے بھی لگاوٹ رکھتی تھی جو سیزر کا قاتل تھا اسلئے انطانی نے اُسے طلب کیا کہ اس الزام کی جواب دہی کے لئے حاضر ہو۔

قلوبطرہ نے، جو اپنے بھائی ٹولمی کو تباہ کرا چکی تھی، جو سیزر کو بھی اپنی سموم محبت سے آشنا کرکے ہلاک کر چکی تھی، اب اپنے سامنے اک نیا شکار پایا اور یہ معلوم کرکے کہ اس وقت انطانی کے اقبال کا طوطی بول رہا ہے، اس پر اپنے حسن کا جال ڈالنا چاہا۔

قلوبطرہ جس شان سے روانہ ہوئی، وہ تاریخ کا نہایت مشہور و دلچسپ واقعہ ہے۔ اس کا جہاز زرکار تھا، ارغوانی رنگ کے ریشمی بادبان اس کے پہلو میں اُڑ رہے تھے، سرزمین مصر کی حسین ترین نوجوان لڑکیاں (اس حال میں کہ اُن کے جسم پر اک تار بھی نہ تھا) اس جہاز کو چلا رہی تھیں اور قلوبطرہ باصد ہزار پندار حسن و رعنائی، بہترین وضع یعنی عریاں ترین لباس میں ایک جڑاؤ صندلی پر جلوہ افروز تھی۔

انطانی نے پیام بھیجا کہ ملکہ مصر کی پذیرائی کے لئے اس کے جہاز میں انتظام کیا گیا ہے، لیکن قلوبطرہ نے، جو اپنے ہی

جہاز کی آراستہ فضا میں اچھی طرح اپنے افسوں کو صرف کر سکتی تھی، انطانی کو وہیں بلا لیا اور اس کا نتیجہ بھی وہی ہوا، جو ہمیشہ حسن کے اس نوع کے عزم و ارادہ کا ہوا کرتا ہے۔ انطانی نے شکست کا اعتراف کر لیا اور قلوبطرہ کے پندارِ حسن کا نشہ اور دوچند ہو گیا۔

(۷)

انطانی، اسکندریہ میں وہی زندگی بسر کر رہا ہے جو یونانیوں کی خیالی دنیا میں باخوس (شراب کے دیوتا) کو حاصل تھی اور حسن کے تمام وہ جلادے، جن کو عالم قضا و قدر میں اک امتیازی درجہ حاصل ہے، اس پر مستولی تھے۔ جس حالت میں اس نے روم کو چھوڑا تھا، اس کا اقتضا یہ تھا کہ فوراً وہاں واپس جاتا اور اپنی نئی حاصل کی ہوئی قوت میں استحکام پیدا کرتا، لیکن قلوبطرہ کی کھلی ہوئی آغوش اتنی بڑی دولت اور ایسی وسیع سلطنت تھی کہ اس کی لذتیں حاصل کرنے کے بعد انطانی کے لئے ساری کائنات کو قلوبطرہ کی آنکھوں کے عمیق سمندروں میں غرق کر دینا آسان ہو گیا تھا۔ چہ جائیکہ حکومت روم!

وہ مصروفِ نشاط رہا اور اُدھر اکٹیویس سیزر نے روم پر اقتدار حاصل کر کے انطانی کو گرفتار کرنے کے لئے اسکندریہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ انطانی کو ہوش آیا مگر اس وقت جب آکٹیویس کے جہاز سر پر پہونچ گئے، اس کا نشہ اترا مگر جب تدبیر کی منزل گذر گئی۔

....

....

جب قلوبطرہ کے بیڑہ کو شکست ہوئی اور وہ اپنے قصر کے اندر جا کر بند ہو گئی، تو انطانی کو شبہ پیدا ہوا کہ اس نے قصداً ایسا کیا اور اس لئے حد درجہ برہمی کے ساتھ دروازہ پر پہونچا اور اندر جانا چاہا، لیکن محافظین قلوبطرہ نے یہ خیال کر کے کہ انطانی کہیں برہمی کے عالم میں ملکہ کو کوئی ضرر نہ پہونچائے، عرض کی کہ "ملکہ اب کہاں وہ تو شکست کے غم میں کب کی جان دے چکی"

انطانی پر اس خبر سے ردِّ عمل کی سی کیفیت طاری ہوئی اور حد درجہ تکلیف و تاثر کے عالم میں اپنی جائے قیام پر گیا اور ایک تیز تلوار سے اپنے جسم کو زخمی کر کے چند دن تک، قلوبطرہ کی تیمارداری کی آخری لذتیں حاصل کرنے کے بعد اس جہان سے رخصت ہو گیا۔

انطانی کے مر جانے سے، قلوبطرہ کو صدمہ ہوا یا نہیں، اس کا حال کسے معلوم؟ لیکن اس واقعہ کو دنیا جانتی ہے کہ جب انطانی کے بعد اکٹیویس، روم کا ہیرو قرار پایا اسکندریہ میں اس کا اقتدار قائم ہونے لگا، تو قلوبطرہ نے اسے بھی مسحور کرنا چاہا اور اپنی وہی زہر آلود ادائیں جو اس سے قبل سیزر و انطانی کی جان لے چکی تھیں، اکٹیویس پر بھی صرف کرنی چاہیں، اور کون کہہ سکتا ہے کہ وہ کامیاب نہ ہوتی اگر فطرتِ حسن کی ان قاتل تماشہ زائیوں سے بیزار نہ ہو گئی ہوتی۔

(۸)

اکٹیویس (قلوبطرہ کے سرداروں سے):- "میں اک عورت کے خون سے، خواہ وہ کتنی ہی سفاک و ظالم کیوں نہ ہو، اپنی تلوار کو آلودہ کرنا پسند نہیں کرتا، اس لئے تم اپنی ملکہ سے کہدو کہ اس کی جان محفوظ ہے، لیکن صرف اس شرط سے کہ وہ میرے پاس حاضر ہو اور جب

میرا جلوس روم کے بازاروں سے گذرے' تو وہ میری سواری کے پیچھے پیچھے پیادہ چلی آرہی ہو۔ میں اپنی فتوحات کی تمام لذتوں کو اس مسرت کے مقابلہ میں کہ قلوپطرہ میری حلقہ بگوش ہے' آسانی کے ساتھ بھلا دینے کے لئے آمادہ ہوں۔ اس لئے جاؤ اور اُس سے کہدو کہ میرے اوپر اپنا جادو ڈالنے کی کوشش نہ کرے' کیونکہ اس باب میں میرا دل اک پارۂ سنگ ہے اور نسوانی سحر کاریوں کی دسترس سے بہت بالاتر!"

. . . .

قلوپطرہ نے اپنے قصر کے دروازے چاروں طرف سے بند کرالئے ہیں اور نہیں کہا سکتا کہ اب وہ کس تدبیر میں مصروف ہے۔ اکٹیویس جس نے جواب کے لئے صرف ایک رات کی مہلت دی تھی' صبح ہوتے ہی اپنی سپاہ لیکر آتا ہے اور قصر کے اندر مسر درانہ داخل ہوتا ہے کہ وہ قلوپطرہ کے حسین ہاتھوں میں زنجیریں ڈال کر باہر لائے گا' لیکن اسکی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب وہ فرش پر قلوپطرہ کو بیہوش پڑا ہوا دیکھتا ہے' اس حال میں کہ اس کے عریاں سینہ پر اک چھوٹا سا سانپ لہرا رہا ہے اور خدا جانے کس لذت سے سرشار ہے کہ باوجود اس ہنگامہ کے وہ اپنے دانت قلوپطرہ کے سینہ سے جدا کرنا گوارا نہیں کرتا۔

نیاز

غزل

تجسس ہو تو ملجاتا ہے سب کچھ دار امکاں میں
کوئی لمحہ خوشی کا 'آہ' ڈھونڈھیں عمر انساں میں

چراغ اک انکی محفل میں ہے' اک میری شبستاں میں
یہاں تصویر مایوسی ہے' رونق بزم جاناں میں

جنوں کی یادگار اک آشیانہ ہے گلستاں میں
عبث تنکے چنے تھے میں نے کیا فصل بہاراں میں

نہ ہوتا عشق سے مضطر' تو کیا دل کو سکوں ہوتا!
سکوں کا ذکر ہی کیا' سایۂ گردون گرداں میں

کھلے ہیں پر کھلا ہے در' مگر کب' جب خزاں آئی
میں کہتا ہوں قفس میں مر رہوں اب' یا گلستاں میں

میں لیتا رخصت یک نالہ' اور خاموش ہوجاتا
قفس اک بار اگر صیاد رکھ دیتا گلستاں میں

کبھی طرح دل آزاری تھی' لیکن ابتو اے مانیؔ
ادائے جاں نوازی دیکھتا ہوں در دہجراں میں

مانیؔ جائسی

گیسو

یہ تیری بیباک بے ترتیب و بے پرواز زلف، جو تیرے بلوریں شانہ پر منتشر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ کس استغناء کے ساتھ مجھے اُن لمحہ ہائے شوخ کی یاد دلا رہی ہے، جنکا تعلق صرف ایک عورت ہی کے مینائے جسم سے ہے

تو ان نغمہ ہائے محبت کو یکجا کرنے کی کوشش نہ کر، کیونکہ گیسو بکھرنے ہی کے لئے جمع ہوتے ہیں، بگڑنے ہی کے لئے سنورتے ہیں۔

میرا دل اس ”دامگاہِ عشق“ یعنی تیری زلفِ محبت پناہ کا دائمی اسیر و نخچیر ہو کر رہ گیا ہے اور تیری زریں زلف کا ہر خمِ سحر آگین، جس میں اک ”خلقتِ روشن“ پنہاں ہے، میرے ”عنق روح“ میں زنجیر کی خدمت انجام دے رہا ہے لیکن ایک ایسی زنجیر کی جو مجھے عالمِ نور میں ادھر سے اُدھر آزاد لئے پھر رہی ہے۔

اے حُسن حزیں، اے تاجدارِ گیسوئے زریں، تجھے معلوم ہونا چاہئے کہ میرے ”شبہائے عشق“ کے جذبات تیری ہی پُر اہتزاز زلفوں کے ساتھ وابستہ ہیں اور میری صبح تسلی انھیں کی راتوں میں پنہاں ہے۔

جب کبھی وہ میرے چہرہ پر پریشان ہو جاتے ہیں اور میں مسرور ہو کر انھیں چومتا ہوں، تو ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میری ”بہارِ حیات“ کا راز انھیں میں آسودہ ہے۔

جب تیرے پُر وفا گیسو شبِ الم میں میرے سر پر بکھر جاتے ہیں، تو میں تیرے پہلو میں لیٹا ہوا اپنے آنسو اُن میں پروتا رہتا ہوں آہ، میں اس گیسوئے ”تسلیت کار“ اس عطرِ روح پرور کو کیونکر بھول سکتا ہوں۔

اگر مجھے یہ یقین ہو جائے کہ تیری زلف ”زرتار“ میرا کفن ہو سکتی ہے تو میں اسی وقت مذہب پروانہ قبول کرنے کے لئے آمادہ ہوں۔

یہ تیرے پُر محبت اور دل میں ”کیفیتِ سکران“ پیدا کر دینے والے بال، جسقدر میرے محزوں سر پر پریشان ہوتے ہیں، اسی قدر میرے مغموم تمنا ابھرتے جاتے ہیں۔

آ اور اپنے گیسو کے معطر، منور اور ریشمی رومال سے میرے خانہ کو مست اور میری روح کو لرزاں بنا جا۔ (ترجمہ از ترکی)

نیاز

مجرم علوم جدیدہ کی نظر میں

اگر کسی بچہ کو جس کی عمر چھ سال سے زائد نہیں ہے، قید با مشقت یا سزائے موت کا حکم سنایا جائے، تو ہر شخص اس سزا کو وحشیانہ حکم خیال کرے گا، کیونکہ اس عمر کا لڑکا ضعف ادراک اور قصور عقل کی وجہ سے صحیح و فاسد نیک و بد میں تمیز نہیں کر سکتا۔ اور اگر اسی کے ساتھ اس حقیقت کو بھی شامل کر لیا جائے کہ مجرموں کا بھی اکثر حصہ عقل و تمیز، احساس و ادراک کے لحاظ سے اک کمسن لڑکے سے زیادہ نہیں ہوتا (جیسا کہ گزشتہ چند سالوں کے اندر دماغی امتحانات کی بنا پر ثابت ہو گیا ہے) تو پھر قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں انھیں قید خانوں میں بند کیا جاتا ہے، جہاں بجائے اصلاح کے اُن کی طبیعت اور خراب ہو جاتی ہے اور کیوں نہیں ان کی دماغی اور اخلاقی حالت درست کی جاتی ہے۔ تاکہ اُن کا احساس و ادراک ترقی کر کے، قوت ممیزہ پیدا کر دے ؟

زمانۂ قدیم میں سزا کے طریقے ہیئت اجتماعیہ (سوسائٹی) نے مرور زمانہ اور رفتار تمدن کے ساتھ ساتھ مجرموں کی سزا میں بھی مختلف طریقے اختیار کئے ہیں جن کا اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے جس قدر ترقی تمدن میں کی ہے اسی قدر جرائم کی سزا میں تخفیف کرتا چلا آیا ہے۔ ایک مشہور قانون دان کا قول ہے کہ "سزا کی تاریخ ایک متواتر تخفیف سزا سے عبارت ہے"

قدیم زمانہ کے لوگ جو سزا مجرموں کو دیتے تھے اگر اس کا آجکل کی متمدن دنیا کی سزاؤں سے مقابلہ کیا جائے تو زمین و آسمان کا فرق نظر آئیگا، لیکن باوجود اس کے زمانہ حال کے مصلحین، قانون سزا کے متعلق ایک جدید دور کے منتظر ہیں جس میں مجرم کو تکلیف پہنچانے کے بجائے زیادہ تر اس کی دماغی اور اخلاقی حالت کی اصلاح پیش نظر ہو گی اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دور چنداں بعید نہیں ہے۔

دنیا نے سزا میں جو کچھ تبدیلیاں کی ہیں انھیں ہم اختصار کے ساتھ ذیل میں بیان کرتے ہیں اور اس کے متعلق کسی خاص قوم کا ذکر نہیں کرتے کیونکہ تمام قوموں میں یہ تبدیلیاں یکساں طور پر ہوئی ہیں۔

سزا عہد قدیم اور عہد جدید میں

انتقام شخصی ازمنۂ قدیمہ میں سزا کی بنا محض طلب انتقام پر تھی کیونکہ اس زمانہ میں کوئی ایسی حکومت نہ تھی جو افراد کے باہمی اختلافات اور ظلم و تعدی کو مٹاتی۔ ہر شخص (یا اس کا خاندان) مجاز تھا کہ وہ اپنے حق کو دشمن سے حاصل کرے اور اس سے اپنا انتقام لے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں کس قدر مظالم ہو سکتے ہیں۔ اس لئے کہ صرف طاقتور افراد ہی دشمن سے اپنا حق اور انتقام لے سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ سزا کی کوئی حد نہ تھی بلکہ بسا اوقات، سزا حد سے گزر کر بجائے خود ایک سنگین جرم ہو جاتی تھی۔

جب دنیا میں حکومت کی عمومی قوت پیدا ہوئی تو منجملہ اور انتظامات کے سزا میں بھی تجدید ہونے لگی، جیسا کہ اس قول ماثورہ سے ظاہر ہے :-

ان النفس بالنفس والعین بالعین — بیشک نفس کے بدلے نفس، آنکھ کے بدلے آنکھ
والانف بالانف والاذن بالاذن — ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان
والسن بالسن والجروح قصاص — دانت کے بدلے دانت ہے اور زخموں کا بھی بدلہ ہے

سزا کی دوسری صورت یہ بھی قرار پائی تھی کہ جسمانی ایذا کا معاوضہ مال سے ادا کیا جانے لگا۔ قدماء نے اپنی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ اس معاوضہ سے بحث کی ہے۔

انتقام قومی جب حکومت کی طاقت اور اس کا نفوذ بڑھا تو افراد سے حق انتقام چھین کر حکومت نے اپنے قبضہ میں لے لیا اور رعایا کے درمیان اس کے ذریعہ سے امن قائم کیا۔ اب سزا نے ایک دوسری صورت اختیار کی یعنی اس میں انتقام شخصی کے علاوہ انتقام قومی کی حیثیت بھی پیدا ہوگئی۔ اجتماعی ترقی کے اس دوسرے دور میں سزا میں تخفیف اور ترہیب کا پہلو بھی شامل ہوگیا اور اب سزا کی بنا دو چیزوں پر ہوگئی۔ انتقام قومی اور ترہیب"

اٹھارہویں صدی کے آخر میں فلاسفۂ یورپ نے جو خیالات اس مسئلہ میں ظاہر کئے ہیں ان کی وجہ سے علمائے قانون کے خیالات میں بہت کچھ انقلاب پیدا ہوگیا ہے۔ اور سزا کے مختلف نظریے قائم کئے گئے ہیں جن میں سے یہ مشہور ہیں:-

۱۔ اتفاق اجتماعی اس نظریہ کا واضع اول روسو ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ لوگ زمانۂ اجتماع سے پہلے انفرادی حالت میں رہتے تھے۔ بعد میں لوگوں نے اتفاق کرکے ہیئت اجتماعیہ (سوسائٹی) کو قائم کیا اور اپنے حقوق کی حفاظت اور مجرمین کی سزا جو پہلے افراد کے ذمہ تھی ہیئت اجتماعی کے سپرد کی تاکہ باہمی قرارداد کی مخالفت کرنے والے پر جو حکم سوسائٹی کی طرف سے نافذ ہو اس کی تعمیل واجب قرار دی جائے۔

یہ نظریہ بالکل غلط ہے کیونکہ حیات انسانی ہمیشہ سے نظام اجتماعی کے ماتحت چلی آئی ہے اور کسی زمانہ میں بھی انسان اپنے ابنائے جنس سے علٰحدہ ہوکر انفرادی حالت میں نہیں رہا ہے۔ لہذا روسو کا یہ کہنا کہ انسان پہلے انفرادی زندگی بسر کرتا تھا اور بعد میں اس نے اتفاق کرکے ہیئت اجتماعیہ کو قائم کیا تخیل محض سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

۲۔ فائدہ عامہ اس نظریہ کا قائل ایک انگریز بنتھام ہے۔ اس نے سزا کی بنیاد محض فائدہ عامہ پر رکھی ہے یعنی قوت عامہ یا حکومت، صرف عام مفاد کی غرض سے مجرموں کو سزا دیتی ہے اور مجرم حقیقت میں ہیئت اجتماعی کے دشمن ہیں۔

اس نظریہ کا تقاضا یہ ہے کہ سزا اسی نسبت سے ہو جتنا کہ سوسائٹی کو ارتکاب جرم سے نقصان پہونچا ہے حقیقتاً یہ نظریہ سزا کے متعلق تخویف و ترہیب کے قدیم اصول کا اعادہ کرتا ہے اور اس نظریہ کی بنا پر متعدد قوانین بنائے گئے ہیں۔ فرانس کا قانون جرائم جو نپولین کے عہد میں (سنہ ۱۸۱۰ء) وضع ہوا تھا، اس میں اس نظریہ کی خاص رعایت رکھی گئی تھی۔

۳۔ عدل مطلق یہ نظریہ ماسبق کی بالکل نقیض ہے۔ اس نظریہ کی رو سے مجرم کو اس لئے سزا نہیں دی جاتی کہ وہ ہیئت اجتماعی پر خراب اثر ڈالتا ہے بلکہ اس میں نفس جرم کا لحاظ ہوتا ہے۔ جس قدر جرم سنگین ہو اور آداب صحیحہ اور انصاف حقیقی کے مخالف ہو اسی نسبت سے مجرم کو سزا ملتی ہے۔

اس نظریہ کا قدیم ترین قائل افلاطون ہے، اور جرمن فیلسوف کنٹ کا بھی یہی مذہب ہے لیکن یہ قول بھی ضعیف ہے کیونکہ اگر اسے صحیح مانا جائے تو قوانین اخلاق (جن کا مرتبہ نہایت بلند ہے) اور انسان کے قوانین موضوعہ میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ بہت سے جرم ایسے ہیں جو اخلاق کے خلاف ہیں۔ لیکن ہیئت اجتماعی کو اُن سے کچھ نقصان نہیں پہونچتا۔

۴۔ نظریہ متوسط | اس نے دونوں اگلے نظریوں کو جمع کر دیا ہے اس کے قائل فرانس کے فلسفی کوزان اور جیزو ہیں یہ کہتے ہیں کہ ہیئت اجتماعیہ کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی مجرم کو حدانصاف سے زیادہ سزا دے۔ یا سزا کی اس حد سے تجاوز کرے جس سے مقصود حاصل ہو سکتا ہو اس نظریہ کے مطابق ۱۸۳۲ء میں فرانس کے قانون جرائم میں بہت کچھ ترمیم و تعدیل ہوئی ہے۔ مگر اس نظریہ پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اس میں مجرم کی نیت کا بڑا لحاظ ہے جس سے سزا میں بہت کچھ تخفیف ہو جاتی ہے۔

عہد حاضر کے اقوال

علم الحیات کا اثر | علمائے علم الحیات کے نزدیک ہیئت اجتماعی ایک زندہ جسم سے مشابہ ہے، اس لئے وہ بھی زندہ جسم کی طرح قانون "حفاظتِ بقا" کے تابع ہے، لہذا سزا کے ذریعہ سے سوسائٹی اُن خطرات کو دفع کر دیتی ہے، جو اس کی بقا کے راستہ میں حائل ہوتے ہیں اگر کسی مجرم کو سزا دی جاتی ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سوسائٹی اپنی ذات اور اپنی عزت و ناموس کی حفاظت کرتی ہے۔ حقیقت میں یہ خیال بھی مذہب "تخویف و ترہیب" کا اعادہ ہے۔

علم جرائم انسانی | ابتدا میں اس علم نے یورپ کی قانونی دنیا میں بڑی ہل چل مچادی تھی، لیکن جب لوگوں پر اس کے اصول کی کمزوری قواعد کا ضعف معلوم ہوا تو اس کی طرف توجہ کم ہو گئی۔

اس علم کے مدعی (جس کا پیش رو لومبروزو، اطالوی ہے) کہتے ہیں کہ مجرموں کی جسمانی حالت عام انسانوں کی طرح فطرت کے مطابق نہیں ہوتی، بلکہ اُن کی جسمانی ساخت میں کچھ ایسے غیر طبعی امتیازات اور خصوصیات ہوتے ہیں جو انہیں لامحالہ ارتکاب جرائم پر مجبور کرتے ہیں۔ مثلاً لومبروزو کہتا ہے کہ ایک چور کے ہاتھ لمبے اور قاتل کے چھوٹے ہوتے ہیں اس طرح اُس نے مجرموں کی اور بہت سی جسمانی خصوصیات بیان کی ہیں۔ لیکن اگر یہ رائے صحیح مانی جائے تو انسانی ارادہ کوئی چیز نہیں رہتا اور نہ مجرم اپنے افعال کا ذمہ دار قرار دیا جا سکتا ہے، نیز جو خصوصیاتِ اعضاء اور علاماتِ جسمانی، لومبروزو اور اس کے متبعین نے بیان کی ہیں، وہ غلط ہیں اور اُن پر عام مجرموں کی حالت کا قیاس نہیں کیا جاتا۔

علم جرائم اجتماعی | علماء اجتماعیین کی ایک جماعت خیال کرتی ہے کہ جرائم کا سبب اولین، وہ ماحول ہے جس میں انسان تربیت پاتا ہے اور جرم نتیجہ ہے تربیت فاسدہ، عزبت، قمار بازی اور شراب نوشی وغیرہ کا لیکن یہ کلیہ بھی اگر بالکل صحیح مان لیا جائے تو مجرم سے ذمہ داری کا بار بالکل اٹھ جاتا ہے۔

نتیجہ | اب دیکھنا چاہئے کہ ان مختلف خیالات اور متناقض اقوال سے ہم کیا اخذ کر سکتے ہیں بیشک ہر ایک مذہب میں ایک پہلو صحت کا بھی ہے، مثلاً اس امر سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ نسل اور صحت جسمانی کو تکوینِ عقلی میں بڑا دخل ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ انسان پر اس کے ماحول اور امراضِ اجتماعی موثر نہیں ہوتے۔ اس لئے آج اگر ہم جرائم کو روکنا چاہتے ہیں تو چاہئے کہ پہلے انسان کی اصلاح کریں اور پھر ماحول کی۔

جس طرح کہ طب جدید کا اصل الاصول یہ ہے کہ علاج سے زیادہ حفظ صحت کی طرف توجہ کرنی چاہئے، اسی طرح آجکل کے ماہرین قانون، بمقابلہ سزا کے ان اسباب کے دفع کرنے میں زیادہ کوشش کرتے ہیں جو مجرموں کی افزائش اور ارتکاب جرائم کے موجب ہیں، مگر پھر بھی متمدن دنیا ابھی اس میدان میں نوآموز ہے اور راہ عمل میں اُسے بہت سے موانع دفع کر کے اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے ایک کامیاب راستہ اختیار کرنا ہے، لہٰذا اب ہمیں بھی سوچنا ہے کہ اس کیلئے کون سا طریقہ زیادہ مفید ہو سکتا ہے۔ ہمارے خیال میں مناسب یہ ہے کہ ہر ایک مجرم کو اس کی حالت دماغی اور استعداد عقلی کے مطابق سزا دینی چاہئے۔ کیونکہ ایسے دو مجرم بہت کم ملیں گے جن میں وہ اسباب یکساں طریقہ پر پائے جائیں، جو ارتکاب جرم کا باعث ہوتے ہیں۔ اس لئے عدالتوں کو چاہئے کہ سزا دینے سے پہلے مجرم کی حالت پر اور ان اسباب و ماحول پر غور کریں، جن کے ماتحت اس کی پرورش ہوئی ہے اور حسب ذیل اصولی مقاصد کو بھی نظر انداز نہ کریں۔

(۱) مجرم کے اثرات سے ہیئت اجتماعی کو بچانا۔

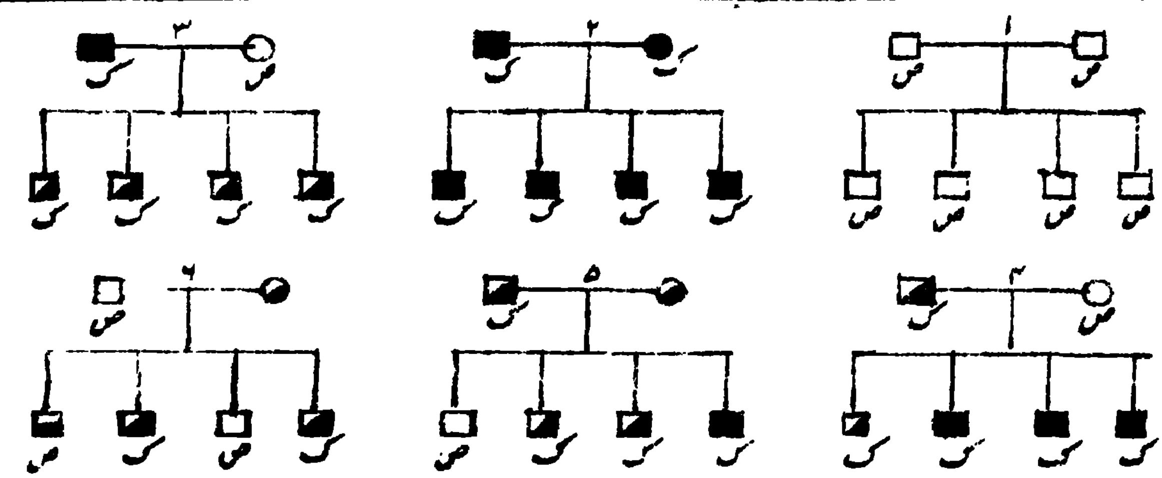
(۲) سزا کا دوسروں کے لئے بھی باعث عبرت ہونا۔

(۳) مجرم کے مستقبل کو اس کے ماضی سے زیادہ شاندار بنانا۔ اور اس کی اخلاقی اصلاح کو سزا پر مقدم رکھنا۔

ذیل میں ہم اختصار کے ساتھ وہ وسائل بیان کرتے ہیں جن کے ذریعہ سے دنیا کو جرائم کے زہر آلود اثرات سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ ان وسائل کا انحصار دو چیزوں پر ہے حفاظت اور علاج۔

حفاظت

۱۔ اصلاحِ نسل: وبائی امراض اور ہر قسم کے زہریلے اثرات خاصکر مسکرات سے محترز رہ کر نسل کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ نسل کی اخلاقی حالت کو خراب کرنے میں مسکرات کو بڑی حد تک دخل ہے۔ اس کی کثرت سے نظام عصبی میں اختلال پیدا ہو جاتا ہے اور ذرا سی تحریک سے ہیجانِ عصبی پیدا ہو کر ارتکاب جرم کا سبب بن جاتا ہے۔ یہ نظریہ کہ صفات انسانی کا انتقال بطریق وراثت ہوتا ہے مجرموں کی نسل دیکھنے سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے ہم مزید وضاحت کے لئے ذیل میں ایک نقشہ دیتے ہیں جس سے معلوم ہو گا کہ ضعف عقلی کس طرح اور کس نسبت سے والدین سے اولاد کی طرف منتقل ہوتا ہے



۲- تعلیم و تہذیب کی اشاعت: ایک مشہور فلسفی کا قول ہے کہ "جو شخص ایک مدرسہ کھولتا ہے وہ حقیقتاً ایک قید خانہ بند کرتا ہے"۔ تعلیم حاصل کرنے سے انسانی مدارک و معلومات میں وسعت ہوتی ہے، روایات مذہبی و تاریخی، سیرت اکابر، علم الاخلاق وغیرہ کے مطالعہ سے، جو عقلی نتائج حاصل ہوتے ہیں، وہ انسان کو ہر قسم کے برے خیالات سے روکتے ہیں اور اُسے ارتکاب جرائم سے باز رکھتے ہیں۔

نظری تعلیم کی بہ نسبت عملی اور صنعتی تعلیم زیادہ مفید ہے۔ اگر والدین کی عقلی اور اخلاقی حالت کمزور ہو تو اولاد کو اُن کے قبضہ سے لے لینا چاہئے اور انھیں مفید پیشے سکھانا چاہئیں، جن میں بہترین پیشہ زراعت ہے۔

۳- امراض عصبی سے حفاظت: ایک مشہور ڈاکٹر نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ اُن نوجوانوں کے لئے جو وراثت کے اثر سے ہیجان عصبی، کاہلی یا صرع وغیرہ عصبی امراض میں مبتلا ہیں، اُن کے لئے خاص شفاخانے کھولے جائیں، جہاں اُن کا دماغی علاج کیا جائے اور اُن کی عقلیں نقطہ اعتدال پر لائی جائیں۔

۴- جن افراد کی عقلی حالت تعلیم و تربیت سے درست نہ ہو سکے اور کسی قسم کا علاج اُن کے حق میں مفید نہ ہو تو اُن کی فوجیں مرتب کر کے دور و دراز کی نوآبادیوں میں بھیج دیا جائے، تاکہ عام ہیئت اجتماعی خراب اثرات سے متاثر نہ ہو۔

علاج

۱- حاکم عدالت کا ماہر فن ہونا اور نظام عدالت کی اصلاح۔

لہ اشکال مذکورہ میں دائرے عورت کی علامت ہیں اور مربعے مرد کی (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر ملاحظہ فرمائیے)

حرف "ص" صحت جسمانی اور سلامت عقل کی علامت ہے اور کاف عقلی و جسمانی کمزوری کی۔ جو دائرہ یا مربع نصف سیاہ اور نصف سفید ہے وہ بتاتا ہے اس شخص میں بعض صفات اچھی ہیں اور بعض بری۔ مثلاً شکل اول میں والدین کی جسمانی اور عقلی حالت اچھی ہے تو اولاد بھی ان ہی کی مانند ہے۔ شکل دوم میں والدین دونوں حیثیتوں سے گرے ہوئے ہیں تو اُن کی نسل بھی گری ہوئی ہے۔ شکل سوم میں باپ برا اور ماں اچھی ہے تو اولاد میں کچھ خوبیاں اور کچھ برائیاں ہیں ۱۲-

۲- مجرموں کا امتحان طبی اور عقلی اور اس کی جسمانی اور عقلی حالت کا اندازہ
۳- جدید شفاخانوں کا قیام جہاں عصبی اور عقلی امراض میں مبتلا ہونیوالے مجرموں کا علاج کیا جائے اور یہی شفاخانے اُن کے لئے قید خانے کا کام دیں -

مجرموں کی حالت کا کس طرح مطالعہ کیا جاتا ہے

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ اکثر مجرم عقلی حیثیت سے چند سال کے لڑکے سے بھی زیادہ کمزور ہوتے ہیں ایسے لوگوں کے حق میں سزا کچھ مفید نہیں ہے، بلکہ اُن کے اخلاق بجائے اصلاح پذیر ہونے کے اور بھی فاسد ہوجاتے ہیں لہذا اُن کے لئے مناسب یہ ہے کہ وہ ایک عقلی مدرسہ میں رکھے جائیں، یہاں تک کہ اُن کے اخلاق میں درستی اور عقول میں استقامت پیدا ہو اور اگر یہ نہ ہو سکے تو انہیں آبادی سے کسی دور مقام پر بھیجدیا جائے تاکہ عام سوسائٹی اُن کے شر سے محفوظ رہے -

دنیا کی متمدن سلطنتوں نے اس کی طرف توجہ کی ہے اور مجرموں کی حالت کا نہایت غور سے امتحان شروع کیا ہے چنانچہ اسی غرض سے نیویارک میں امراض نفسانی کا ایک محکمہ کھولا گیا ہے جس کا تعلق محکمۂ پولیس سے ہے - اس محکمہ کا ایک کارکن کہتا ہے :-

"ہم نے سرکاری طریقہ پر کام کرنے سے پہلے، پچاس روز تک ذاتی تجربے کئے - ہم روز چند مشتبہ اشخاص کا انتخاب کرتے تھے، جن کی ظاہری حالت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی عقلی مرض میں مبتلا ہیں، پھر ہم اُن کا امتحان کرتے تھے اس مدت میں ہم نے ۴۰۹ آدمیوں کا امتحان کیا، جن میں سے ایک دیوانہ ۲ جسم کے لحاظ سے ناقص، تین دائم الخمر، اور چودہ قاصر العقل تھے ۴۰۹ میں صرف آٹھ شخص ایسے تھے جن کی جسمانی اور عقلی حالت درست تھی - ہمارے تجربہ سے ابتک یہ ثابت ہوا ہے کہ گرفتار شدہ مجرموں میں کم از کم پانچ فی صدی کے شعور میں خلل اور عقل میں نقصان ہوتا ہے"

امتحان عقلی کے بہت سے طریقے ہیں - ایک یہ کہ مجرم سے چند سوالات کئے جاتے ہیں، جن سے اس کی قوت تمیز اور صحت عقل کا اندازہ لگایا جاتا ہے، ان سوالوں میں بعض مشکل اور بعض آسان ہوتے ہیں اور ہر ایک سوال کا جواب نموئے عقل کے ایک خاص مرتبے پر دلالت کرتا ہے -

امتحان کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے رکھ کر مجرم سے کسی چیز کی تصویر بنوائی جائے - اور لکڑی کے چند مساوی الحجم اور مختلف الوزن ٹکڑے اس کے سامنے رکھ کر اس سے کہا جائے کہ انھیں اُن کے وزن کی نسبت سے مرتب کرکے رکھے -

---

بہار کی دیوی

تمنا زا تھیں کیفیاتِ صبح صحنِ بستانی ۔۔۔ فضا میں منتشر تھے نغمہ ہائے بادِ بارانی
ابھی تک ارغوانی تھی اُفق کی شعلہ سامانی ۔۔۔ نہ تھا خورشید کا چہرہ ہنوز آگاہِ عریانی

تھی بلبل شاخِ گل پر، اور شبنم گل کے دامن میں
تھی ہر شے خلوت آسودہ غرض اپنے نشیمن میں

صباحت جلوہ گر تھی اور اسمیں اک ترنم تھا ۔۔۔ فضا خاموش تھی اور اُس میں پنہاں اک تکلم تھا
جدھر دیکھو، اُدھر امواجِ نکہت میں تلاطم تھا ۔۔۔ زمیں تا آسماں گویا تبسم ہی تبسم تھا

وہ رنگِ صبح اور وہ اہتزازِ نور کا عالم
تھیں گویا مجتمع رعنائی و دوشیزگی باہم

یہ تھی موسم کی حالت اور اسکی لطف فرمائی ۔۔۔ کہ ناگہ ایک لڑکی صحنِ گلشن میں نظر آئی
وہ نکہت اُسکی جسکو دیکھکر بڑھجائے بینائی ۔۔۔ وہ رُخ اُسکا فدا جسپر دو عالم جلوہ آرائی

یونہی رفتار اُسکی، اک اضافہ تھا قیامت پر
لچک جانے کی پھر وہ اک ادائے خاص قامت میں!

تھے ڈورے آنکھ کے یا موجِ صہبا جامِ کوثر میں ۔۔۔ تھی پتلی یا دُلھن کوئی سیہ اطلس کی چادر میں
نویدِ عشق تھا پنہاں نگاہِ کیف پرور میں ۔۔۔ مژہ کہدیتے ہم اسکو لچک ہوتی جو نشتر میں

مسیحا کی زباں ۔ اسکی نگہ اعجاز پرور تھی
خموشی اس کی گویا نطقِ عیسیٰ کے برابر تھی

تھا اُس کے حسن دوشیزہ میں کچھ کیفِ جوانی بھی　　لئے تھی یعنی مینا میں شرابِ ارغوانی بھی
تھا اُسکے حسن کی سبزی میں رنگ زعفرانی بھی　　تھی ساری اُسکی یعنی کندنی بھی اور دھانی بھی

وہ چل پڑتی تو ہر ذرہ جگہ سے اپنی ٹل جاتا
ٹھہر جاتی تو گویا نظمِ عالم پھر سنبھل جاتا

میں کہتا جسم کو الماس، اگر اس میں لچک ہوتی　　سمجھتا زلف کو عنبر اگر اس میں چمک ہوتی
میں کہتا پھول کو عارض، اگر اسمیں یہ دمک ہوتی　　دہن کو شعلہ کہدیتا، اگر اس میں مہک ہوتی

کہاں کافور میں وہ ضو کہ اس کا رنگ ہوجائے
جب اس کے رُخ کے آگے آئینہ بھی زنگ ہوجائے

سنہرے بال بھی تھے جا بجا کچھ اُسکے گیسو میں　　کرن جیسے اُلجھ کر رہ گئی ہو حلقۂ مو میں
تھا عکسِ زلفِ پُر خم اس جبینِ آئینہ خو میں　　پڑی لہرا رہی تھی یا کوئی ناگن کسی جو میں

کہوں کیا جاذبیت کسقدر تھی اس کے سینہ میں
مگر بھر دی گئی تھیں بجلیاں اس آبگینہ میں

دمِ رفتار وہ اس کی ادائے دلربایانہ　　ہوا سے سروِ زریں کا تھا گویا سو لچک کھانا
قدم اِس کا اُٹھانا تھا کمر میں بل کا پڑ جانا　　وہی بل ناگنوں نے جس سے سیکھا ایسا لہرانا

خرامِ ناز تھا اُسکا کہ تصویرِ نزاکت تھی
سلاست آب کی تھی یا نمودِ موجِ نکہت تھی

اُسے بلبل نے دیکھا اور گل رنگیں قبا سمجھا　　اُسے قمری نے دیکھا اور سروِ دلکشا سمجھا
پتنگوں نے اُسے اک شعلۂ ظلمت ربا سمجھا　　کسی نے مہر جانا اور کسی نے آئینہ سمجھا

مگر میں نے تو افکارِ ازل کا معجزہ جانا
اُسے فطرت کی یعنی اختراعِ خالقہ جانا

نیاز

لالہ رُخ کے دُوافسانے

بہشت اور پری

(۱)

صبح کی نورانی فضا میں دروازۂ عدن پر ایک پری حالتِ حزن و ملال میں کھڑی ہے۔ بہشت کا دروازہ کسی قدر کھلا ہوا ہے، فردوس کے چشموں کی روانی، اس کے سامنے کو مسحور کر رہی ہے، اور وہاں کی نورانی صباحت کا انعکاس اس کے بازوؤں کو تابناک بنا رہا ہے پری بے انتہا غمگین و ملول ہے اور اس کے موتی جیسے رخساروں پر آنسو جاری ہیں، وہ بھرا دروازہ کے اندر دیکھتی اور خیال کرتی ہے کہ "وہ پاک روحیں جو عدن کے اندر مصروفِ گلگشت ہیں، کس قدر خرم و مطمئن ہیں، اور اس بہار رنگ و بو میں، جہاں افسردگی و پژمردگی کا کوئی مفہوم نہیں ہے، وہ کس لطف سے ہمیشہ مقیم رہیں گی، ہر چند پرستان کے باغات و قصور بہت اچھے ہیں، ارض و بحر کی تمام پر فضا مناظر بھی میری ملکیت میں ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ خلد کا ایک غنچہ بھی دنیا کی تمام بہاروں کو افسردہ کر سکتا ہے کشمیر کی جھیلوں کی درخشانیاں، اس کے جزیروں کی آئینہ سامانیاں اور چشموں کے شیریں نغمے گو پر لطف ہیں، نبت کی رود زریں کی روانی بے حد تک تابناک ہے، لیکن حقیقت یہی ہے کہ سلسبیل و تسنیم کی روانی کے سامنے ان خوبیوں کا ذکر کرنا ہی کفر ہے، ایک ستارے سے دوسرے ستارے تک پرواز کرتے رہنا، ایک دنیا سے دوسری دنیا تک سیر و سیاحت پر قادر ہونا، ہر خطہ اور ہر فضا کی مسرتیں اپنے لئے جذب کر لینا گو نہایت پر لطف بات ہے، لیکن یہ سب بہشت کے ایک لمحہ کے بھی برابر نہیں ہو سکتے"۔ بابِ النور کے محافظ رضواں نے اسے زار و قطار روتے دیکھا، کسی قدر قریب ہو کر اس کا مغموم گیت سنا اور جذبۂ رحم سے ایک آنسو اس کی آنکھ میں آ کر اس طرح ٹھہر گیا، جس طرح بہشت کے فوارہ سے کوئی قطرہ اڑ کر گل نسریں کی پنکھڑی پر قایم ہو جاتا اور چمکتا رہتا ہے رضواں نے اس پیکر حسرت سے کہا:۔

"اے خطا کار مگر حسین نسل کی جمیل ترین دوشیزہ! تیرے لئے اب صرف ایک ہی امید باقی رہ گئی ہے کتاب تقدیر میں درج ہے کہ پری اگر وہ تحفہ لائے جو خدا کو بہت پسند ہے تو اس کے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔ اس لئے جا، اور اس تحفہ کی تلاش کر، تاکہ وہ تیرے گناہ کا کفارہ ہو سکے۔ مجھے بہت خوشی ہوتی ہے جب گنہگار ہستیوں کی خطائیں معاف ہو جاتی ہیں، اور میں انھیں بہشت کے اندر جاتے ہوئے دیکھتا ہوں"

جس طرح شہاب ثاقب نہایت سرعت کے ساتھ آفتاب میں جذب ہو جاتا ہے، جس طرح رات کی تاریکی میں کوئی ستارہ ٹوٹ کر

نگاہوں سے غائب ہو جاتا ہے، اسی طرح وہ پری بھی سرعت پرواز کیساتھ سقف نیلی سے اتری اور صبح کے اولین تبسم کی روشنی میں بسیط فضائے ارض کو دیکھنے لگی، وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکتی تھی کہ اس تحفہ کو جو خدا کے نزدیک بہت محبوب ہے، کہاں تلاش کرے اس نے خیال کیا :-

"چہل مینار کے ستونوں کے نیچے تابناک عقیق کے دفینے میرے علم میں ہیں، عرب کے جنوبی ساحلوں کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے جزائر عنبر بھی میری نگاہ میں ہیں۔ میں اس مقام سے بھی واقف ہوں جہاں جام جمشیدی چھپا ہوا ہے لیکن میں جانتی ہوں کہ اس قسم کے تحفے مقبول عرش نہیں ہو سکتے پھر وہ جوہر تاباں کہاں مل سکتا ہے جو بارگاہ خداوندی میں پیش کیا جا سکے ؟"

ہنوز وہ اسی فکر میں تھی کہ اس کی نظر خطۂ ہندوستان پر پڑی، جہاں کی ہوائیں روح افزا ہیں، جسکے سمندر کی گہرائیوں میں عنبر کا فرش ہے، جس کے ساحلوں کی دیواریں مونگے کی ہیں، جہاں شعاع خورشید میں غسل کرنے والے پہاڑوں کے نیچے ہیرے کی کانیں جگمگاتی رہتی ہیں اور جس کے چشمہ ہائے رواں کی موجوں میں سونا حل کر دیا گیا ہے، لیکن آج اس کے دریاؤں کا رنگ قرمزی ہے، انسانی خون سے چشمے رنگین ہو رہے ہیں اور باغات سے اس وقت موت کی بو آ رہی ہے اور ہر اس سانس میں جو سطح زمین سے بلند ہو رہی ہے۔ انسانی قربانی کی بو شامل ہے۔

پری اس منظر خونین پر ایک نگاہ ڈالتی ہے اور دیکھتی ہے کہ ایک بہادر کے ہاتھ میں تلوار کا صرف لالہ گوں دستہ رہ گیا ہے اور اس کے ترکش میں صرف ایک تیر باقی ہے۔ ایک پر غرور آواز اس سے کہتی ہے :-

"اپنی جان کا دشمن نہ بن، اور موت کے ساتھ کھیلنا پسند نہ کر"

سپاہی دریا کے بہتے ہوئے رنگین پانی کو دیکھتا ہے اور اپنا آخری تیر کمان میں جوڑ کر اس کے جواب میں روانہ کر دیتا ہے، باوجود شست کے صحیح ہونے کے تیر خطا کرتا ہے، اور دشمن اس کو زخمی کر ڈالتا ہے۔ پری اس کو گرتے ہوئے دیکھتی ہے اور آفتاب صبح کی شعاع میں نہایت خاموشی کیساتھ اس مقام پر اتر آتی ہے اور قبل اس کے کہ زخم خوردہ سپاہی کی روح جسم سے رخصت ہو آخریں قطرۂ خون حاصل کر کے آسمان کی طرف بلند ہو جاتی ہے، اور سوچتی جاتی ہے کہ :-

"خدا کرے یہی وہ تحفہ ہو، جس کے باعث باب النور پر میرا خیر مقدم ہو سکے۔ ہر چند کہ جنگ کے میدانوں میں بہہ جانے والا خون اکثر نجس و آلودہ ہوتا ہے کیونکہ خود غرضی و طمع اس کی محرک ہوتی ہے لیکن جو قطرۂ خون آزادی وطن کے لئے اور وطن کی حمایت میں بہائے جاتے ہیں، وہ ضرور مقدس و مقبول ہوتے ہیں۔ یہ خون، وہ پاک خون ہوتا ہے جس کے شامل کر دیئے جانے سے تسنیم و سلسبیل کا پانی بھی آلودہ نہیں ہو سکتا۔ پھر دنیا میں اگر کوئی شئے ایسی ہو سکتی ہے جسے خداوند عالم پسند فرمائے تو وہ یہی قربانی ہے جو حریت کی دیوی پر چڑھائی جاتی ہے"

بہشت کا دروازہ آ جاتا ہے اور جب وہ اپنے اس ہدیۂ گران قیمت کو جذبۂ امید و مسرت کے ساتھ رضوان کے سامنے لاتی ہے تو وہ کہتا ہے :-

کوئی شک نہیں کہ پرستاران وطن کے پر شہامت جذبہ کی آسمانوں میں عزت کی جاتی ہے، مگر افسوس ہے کہ جنت کا بلوریں حلقۂ در

اسی طرح قایم ہے اور ذرا حرکت نہیں کرتا۔ لہذا تجھے اس سے بھی زیادہ مقدس چیز کی تلاش کرنا چاہئے جو تیرے واسطے بابِ جناں کو کھول سکے۔"

— ۲ —

پری یہ سن کر بہت افسردہ ہوئی اور پھر زمین کی طرف لوٹی۔ اس مرتبہ اس کا رخ افریقہ کے دور افتادہ جنوبی گوشہ کی سمت ہوجاتا ہے اور جبل قمر کے دامنوں میں جہاں چشمہ مصر کی امواج پر اس کے بازو منعکس ہوتے ہیں نیل کا یہ منبع، بنی آدم کی نگاہوں سے مخفی، تنہا دغیر آباد جنگلوں کے وسط میں واقع ہے اور دریائی دیویاں اس گہوارۂ نیل کے گرد رقص کیا کرتی ہیں۔ وہ روح مجسم ٹھنڈی سانسیں بھرتی ہوئی اس فضا میں چکر لگانے لگتی ہے۔ ایک وادی میں وہ قمریوں کو مصروف شیون دیکھتی ہے اور تمامتر اس طرف متوجہ ہوجاتی ہے، دوسرے مقام پر وہ ماہی گیر زنگا غول دیکھتی ہے جو نیلگوں پانی کو متحرک کر رہا ہے، جن کے سفید ملبوس کو رخصت ہونے والے چاند کی روشنی سفیدتر بنا رہی ہے۔

ان روح افزا وادیوں کے پھلوں کا ماہتاب کی روشنی میں ڈوب ڈوب کر سنہرا ہوجانا، خرما کے درختوں کا ایک مغلوب خوابِ پرشباب دوشیزہ کی گردن کی طرح جھک جانا، اچھوتے کنولوں کا تمام شب اپنے حسن صبیح کو غسلِ شبنم دیتے رہنے کے بعد بیدار ہوکر آفتاب کی سب سے پہلی کرن کا انتظار کرنا یہ سب وہ مناظر تھے جن سے پری بہت متاثر ہوئی۔

ٹھیک اسی حالت میں ایک شاداب درختِ نارنج کے سایہ میں جس کے پھول اور پھل ہوا کے جھونکوں کے ساتھ جنبش میں آجاتے تھے اس پری کے مکان میں کراہ کی آواز آتی ہے۔ شاید یہ کراہنے والی ذات اس عالم سکوت میں اس خاموش مقام پر موت کی تلاش میں پہنچی تھی۔ وہ ہستی جس کی زندگی میں اس کی ہر ہر حرکت و عمل کی شائستگی میں صدہا قلب مضطرب ہوجایا کرتے تھے۔ اس وقت اس طرح تنہا چھوڑ دی گئی تھی، گویا دنیا میں اس کا کوئی چاہنے والا نہیں، کسی کو اس کے ساتھ تعلق نہیں اور اس کے آخری سانسوں کو دیکھنے والی اس پر دو آنسو بہانے والی کوئی آنکھ نہیں ہے۔ اف کیسا حسرت خیز منظر ہے! کوئی نہیں، جو اس وقت اس کے پاس ہوتا اور جو آگ اس کے سینے کے اندر لگی ہوئی ہے اُسے اس جھیل سے پانی کا ایک قطرہ لاکر جو سامنے اپنی خنکی و صفائی کو پیش کر رہی ہے بجھا دیتا۔

کون جان سکتا ہے کہ اس بیکس جوان کے یہ لمحاتِ آخریں، صرف ایک خیال کی لذت و مسرت سے آباد ہیں اور اس کی آمادۂ مفارقت روح پر اپنا سکون نازل کر رہے ہیں۔ اس کی یہ آخری ساعتیں مطمئن ساعتیں کہی جاسکتی ہیں، کیونکہ اسے اپنی اس بیکسی کی پروا نہیں اس لئے کہ وہ دوشیزہ جس سے وہ ایک عمر سے محبت کرتا ہے اور ہمیشہ اپنی کہکر پکارتا تھا، اس ہلاکت نیم شبی کی اذیتوں سے محفوظ تھی۔ اپنے خاندان کے ساتھ شاہانہ مکان میں فواروں کے سیمیں تقاطر سے جاری ہونیوالی روح فزا خنکی سے سکون حاصل کر رہی تھی۔

ملفوفِ سحاب چاند کی روشنی میں، دور سے ایک جسم متحرک نظر آتا ہے جو نہایت آہستہ آہستہ اس افسردگی بار کنج کی طرف بڑھ رہا ہے یہ جسم نزدیک پہنچکر ایک پرشباب دوشیزہ کی شکل میں منتقل ہوجاتا ہے جس کے رخسار یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر گل تر مستور ہیں یہ دوشیزہ اسی جاں بلب نوجوان کی منسوبہ ہے اور اپنے حبیب کے پہلو میں ہلاک ہوجانے کو ساری دنیا کے حصول پر ترجیح دیتی ہے

یہ لڑکی بیتابانہ اپنے بازوؤں کو اس کی گردن میں ڈال دیتی ہے، اپنے رخساروں کو اُس کے رخساروں پر، اور اپنی سیاہ زلفوں کو جنھیں وہ جھیل کے پانی میں ڈبو کر لائی تھی اُس کی ملتہب ابروؤں پر رکھ دیتی ہے۔

اف! کس قدر حسرت خیز نظارہ ہے وہ اس حالت کی تمنا بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ مرنے سے قبل ایک ساعت ایسی بھی آئیگی جب اس کی جان وروح کی ملکہ کے بازو اس کی گردن میں حمائل ہو جائیں گے۔ لیکن وہ جوان بھر ایک مرتبہ اپنی حالتِ زار کا احساس کر کے احتراز کرنا چاہتا ہے گویا اس دوشیزہ کے لبہائے مرجاں رنگ میں جو اس وقت اس درجہ بے محابا پیش کر دیئے گئے ہیں، تمام عالم کا سم قاتل بھر دیا گیا ہے۔ اس صورت اجتناب نے اس لڑکی پر قیامت برپا کر دی اور اُس نے روتے ہوئے کہا:۔

"آہ! اس فضا میں جہاں تم سانس لے رہے ہو، میرا سانس لینا پسند نہیں کرتے۔ یہ ہوا جو ہر چند ہلاکت بار ہے مجھے تو شہد اور دکے اثر سے لبریز نظر آتی ہے۔ کاش میرا خواں شدہ دل اس زہر کے لئے تریاق ہو سکتا، لیکن میرے پاس تو صرف یہ آنسو ہیں۔ ہاں میرے گریۂ محبت کا تقاطر ہی میرا سرمایۂ حیات ہے، اور یہی تمہارے مرض کا علاج ہے۔ باور کرو کہ ابھی وقت ہے کہ یہ چشمۂ حیات تمہیں سیراب کر سکے ورنہ اس کے خشک ہو جانے پر یہ سارا انظام بدل کر رہ جائیگا۔ تم مجھ سے اظہار نفرت نہ کرو۔ اپنا منہ نہ پھیرو کیا میں تمہاری نہیں ہوں، تمہاری عروس محبت نہیں ہوں؟ میں تو تمہاری نگاہ لطف کا ایک ہدیۂ مقبول ہوں جس کے لئے دنیا میں اور اس کے بعد بھی، سوائے تمہارے پہلو کے کوئی مقام راحت و سکون نہیں۔ میری جانب دیکھو۔ قبل اس کے کہ میں دل کی آتش سوزاں سے خاکستر ہو جاؤں، تمہارے سرد ہونٹوں کی پاکیزہ زندگی جبتک قایم ہے مجھے بھی اسی زندگی کا شریک رہنے دو۔"

فضا کی سم آلودہ ہوا اس کے چراغ حیات و محبت کو بھی گل کر دینا چاہتی ہے، وبا کا زہرناک نفس اس کی آنکھوں کے شیریں نور کو ایک فشار دے دیتا ہے، اس کا دل بیٹھنے لگتا ہے اور وہ بیہوش ہو جاتی ہے۔

تپش و کرب کا ایک خفیف اظہار کرنے کے بعد درد کی حدت گذر جاتا ہے اور ٹھنڈا پڑ جاتا ہے دوشیزہ آنکھ کھولتی ہے ایک بوسہ اپنے محبوب کا لیتی ہے اور فرشتۂ موت نوسحری کی شکل میں ان سے ملتا ہے اور ایک وداعی آہ کے ساتھ شمع کا شعلہ ماتمی لباس اختیار کر لیتا ہے۔

آمادۂ سفر روح کے لبوں سے، جس کی وفاداری دنیائے نسائیت کے لئے بہترین نمونہ ہے "آخریں" آہ و داع سنتے ہی پری کہتی ہے:۔

"آرام کر، آسودۂ خواب ہو جا اور دنیائے تعطر میں ہمیشہ کے لئے راحت گزیں رہ۔"

ان الفاظ کی شکل میں اس پری نے فضا پر ایک علوی تنفس ساری کر دیا اور اپنے طرۂ تابناک کی حرکت سے اس تاریک کنج کو روشن بنا دیا، جس میں یہ دونوں بے جان پڑے تھے۔ ان کے چہرے نورانی تھے اور انکی روحیں مطمئن!

افق پر اب نمودِ صبح کا رنگِ انفعال چڑھ جاتا ہے اور پری پاک جذبۂ محبت کی۔ بے مثال قربانی کی یادگار، یعنی ایک ..

بیش بہا "آہ و وداع" لیکر آسمان کی جانب بلند ہوجاتی ہے۔ اس دفعہ غرور مسرت سے اس کا دل غیر معمولی طور پر متحرک ہے کیونکہ وہ جانتی ہے کہ اس سے بہتر تحفہ دنیا کا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ اسے یقین ہے کہ یہ تحفہ خدا کے حضور مقبول ہوگا، اور وہ بہشت میں داخل ہوجاسکے گی۔ مسرور و مفتخر پری بہشت کے در تک پہنچتی ہے اور ایک پرمعنی تبسم کے ساتھ اپنا تحفہ رضوان کے سپرد کردیتی ہے لیکن افسوس اس کی یہ امید بھی یاس ہی ثابت ہوئی، ملتفت ہونے کی بجائے اب بھی اس کی آرزو کے منافی نظر آیا۔ انہوں نے اس کا یہ تحفہ لیا اور دیکھا اور درِ جنت کو بند کرکے بولا "ابھی نہیں۔ بے شک اس تیرہ نصیب دوشیزہ اور بدقسمت نوجوان کا افسانہ نہایت دلگداز ہے اور وہ لڑکی بےشک وفادار تھی۔ مگر اے پری، دیکھ کہ حلقۂ بلوریں اب بھی متحرک نہیں! پس وہ چیز جو تیرے لئے دروازۂ جناں کو کھول دے اس "آہ" سے بھی زیادہ مقدس ہونا چاہئے"۔

(۳)

نواحِ شام کے وسیع گلاب زاروں پر شام کی شفقی روشنی چھائی ہوئی ہے لبنان کی بلندی پر قرص آفتاب بصد شان دربائی اپنا تاجِ زریں نمایاں کر رہا ہے، وہی لبنان جس کی چوٹیاں موسم بہار میں زیادہ سفید ہوجاتی ہیں اور گرمی میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی پر فضا وادیوں میں بہار استراحت پذیر ہے اور کوئی اچھا خواب دیکھکر پڑی مسکرا رہی ہے۔

اس آنکھ کے لئے جو، جو سما میں معلق ہوکر اس طلسمی منظر کا تماشا کر رہی ہو اس رنگینیِ حیات کا نظارہ کس درجہ حسین اور دلفریب ہوسکتا ہے۔

شاداب و رنگین باغات میں، منور چشموں کے کنارے جہاں سروؤں کے کھیت دور تک چلے گئے ہیں، معابد شکستہ کی دیوار پر بے شمار کبوتروں کے جھنڈ نظر آتے ہیں اور ان کے خوش رنگ اور بیتاب بازو سورج کی قرمزی کرنوں میں اس طرح جھلک رہے ہیں گویا وہ قوس قزح کے ٹکڑے ہیں، اس قوس قزح کے ٹکڑے جو صرف پرستان کے پاکیزہ آسمانوں پر ہی طلوع ہوا کرتی ہے۔ لیکن اس بدنصیب پری کی افسردہ دلی کے لئے اس دلکش فضا میں بھی کوئی وجہ شگفتگی نظر نہیں آتی۔ اس کے بازو خستہ ہوچکے ہیں، اور وہ آفتاب کی حالت غروب کو بغور دیکھ رہی ہے۔ تیرگی آہستہ آہستہ گہری ہورہی ہے بڑے بڑے ویران معبدوں کے بلند ستونوں کا سایہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا زمانے نے اپنی رفتار شمار کرنے کے لئے سوئیاں قائم کر دی ہیں۔

لیکن کیا اس شکستہ ایوان خاور میں کوئی طلسمی جوہر کوئی حرز سلیمان السام مل سکتا ہے، جو اس پری کی آنکھوں کو روشن کردے، اور اسے معلوم ہوجائے کہ آفتاب و ماہتاب کے محور میں سمندروں اور خشکیوں کے تہ خانوں میں وہ نایاب شے کہاں پنہاں ہے کہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہوسکے؟

پری نیچے اترآنا چاہتی ہے، چشم آفتاب ابھی درخشانی کے ساتھ نگراں ہے۔ ہنوز وہ سطح زمین تک نہیں پہونچی تھی کہ اسنے دیکھا کہ بعلبک کی وادی میں وسیع فرش گل پر ایک کم عمر بچہ، ایک نیلمی لباس والی دوشیزۂ پراں، نقاشیِ فطرت کی اختراعِ جمیل، یعنی ایک تیتری کے تعاقب میں دوڑ رہا ہے، جو ایک یاسمنی کنج کے اندر رقصاں ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ ایک بھولا ہے

جس کے پر لگ گئے ہیں، یا کوئی نگینہ ہے جس کے اندر رقص سرایت کر گیا ہے۔ وہ بچہ جب اس شغل سے تھک جاتا ہے تو اپنے خوبصورت ننھے سے جسم کو پھولوں پر گرا دیتا ہے اور اپنے چہرے کے لئے پھولوں کا ایک نشیمن بنا لیتا ہے۔

ٹھیک اس حالت میں ایک شخص جو نہایت ماندہ و مضمحل نظر آرہا ہے، اپنے گھوڑے سے اترتا ہے اور بیتابانہ اس ویران عمارت کے دامن میں بہنے والے چشمہ کے کنارے پہونچکر، پانی پینے لگتا ہے اور جب پانی پی چکتا ہے تو اس حسین بچہ کو دیکھتا ہے۔ پری بھی اس مسافر پر ایک نظر ڈالتی ہے اور اس کے درشت خد و خال میں وہ تمام تاریکیاں پاتی ہے جو کسی بدترین فطرت انسانی میں پائی جاسکتی ہیں۔ اس کی آنکھیں ظلم و بے رحمی کا مسکن نظر آرہی ہیں، عورتوں کی عصمت دری اور مقدس جذبات مذہبی کی توہین و تذلیل اس کے بشرہ کی نمایاں خصوصیت معلوم ہوتی ہے، بیوفائی اور بدعہدی، اس کی پیشانی پر جدا جدا لکھی ہوئی ہیں۔ لیکن اسوقت یہ پیکر معصیت مجسمہ گناہ بھی ایک سکون و اطمینان کی حالت میں فرش زمین پر پڑا ہوا اس طفل گلستاں کے کھیل کا تماشہ دیکھ رہا ہے۔ گویا شام کی ٹھنڈی فضا نے اس کے دل میں بھی کچھ نرمی پیدا کر دی ہے۔ با اینہمہ جب اسکی بھیانک آنکھیں اس بچہ کی معصوم و مسرت ناک نگاہوں سے مقابل ہو جاتی ہیں تو محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ دو شعلیں ہیں جو تمام رات ناپاک و خبیثانہ افعال کے لئے روشن رہی ہیں۔

کرۂ درخشاں کے تدریجی غروب کے ساتھ ہی دمشق کے بے شمار مناروں پر سے اذان کی آوازیں بلند ہوتی ہیں اور وہ بچہ اس پیغام صلوٰۃ کو سنتے ہی پھولوں کے تکیہ سے اپنا سر اٹھاتا ہے اور جانب جنوب کھڑا ہوکر اپنی پیشانی کو زمین پر رکھ دیتا ہے اور اس کے ہونٹھ ایزد ذوالجلال کے نام کی تکرار میں متحرک نظر آتے ہیں۔

اس طفل معصوم کا یہ شغل عبودیت ایک نظارہ تھا جو صرف جنتوں ہی میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اور اگر اس منظر سکون و طمانیت کو ابلیس لعین بھی دیکھ لیتا، تو اپنے گم کردہ سکون پر ایک آہ تاسف کئے بغیر نہ رہ سکتا۔ یہی باعث تھا کہ یہ مسافر بھی اس منظر تقدیس کو دیکھکر اپنے آنسو نہ روک سکا اور عمر گذشتہ کے تمام افعال شنیعہ، حافظہ نے اس کے پیش نظر کر دیئے۔ اس نے باوجود سعی و جستجو کے اپنی گزشتہ زندگی کے تاریک طوفان میں ایک لمحۂ سکون نہ پایا، اس کے جذبۂ انفعال و تاسف نے اظہار تاثر کا ذریعہ صرف آنسوؤں کو بنایا نہایت رقت قلب کے ساتھ عجز و فتادگی کے لہجہ میں اُس نے کہا:-

"ایک وقت مجھ پر بھی ایسا ہی گزر گیا ہے، میں بھی تیری ہی طرح معصوم تھا اور تیری ہی طرح میں بھی اپنے معبود کے سامنے سجدہ میں گر جایا کرتا تھا"

شرافت و انسانیت، امید و رجا کے جو جذبات ایک زمانہ سے اسکے اندر نیم مردہ حالت میں تھے، دفعتاً بیدار ہو جاتے ہیں، جوش گریہ سے اسکی آواز بلند ہو جاتی ہے۔ وہ روتا ہے اور آنسوؤں کا ایک طوفان جاری کر دیتا ہے۔ جو آنسو عمق دل سے ندامت گناہ میں نکلتے ہیں، بے شبہ مقبول ہوتے ہیں۔ ایسی ہی قابل قبول اور عفو طلب روانی اشک میں ایک خاص قسم کی طمانینت کا اولین احساس ہونے لگتا ہے اور یہ احساس ایک گنہگار ہی کو ہو سکتا ہے۔

یہی وہ قطرہ ہے جو ماہتاب سے ٹپکتا ہے، اور وادی نیل کے طوفان و بار کو دفعتاً معدوم کر دیتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ

یہ وہ قطرۂ انفعال وندامت ہے، جو انسان کی اندرونی وبائے معصیت کو یکسر کالعدم کرکے اسے پاک ومقدس ہستیوں میں شامل کردیتا ہے"

پری اب اس مسافر اور طفل معصوم کو پہلو بہ پہلو مصروف عبادت گزاری دیکھتی ہے اور محسوس کرتی ہے کہ سورج کی ایک بچھڑی ہوئی کرن گنہگار ومعصوم دونوں کے سروں پر یکساں تڑپ رہی ہے۔ وہ آسمان پر حمد وصلوٰۃ کا غل سنتی ہے کہ ایک خطاکار کی توبہ قبول ہوتی ہے، ایک گنہگار کی نجات ہوتی ہے۔

آفتاب کی آخری ضیائے زریں بھی غائب ہوگئی اور اس کی جگہ ایسی روشنی نمودار ہوگئی جس کی مثال کبھی کسی ستارے کی ضیا مہیا نہیں کرسکتی۔ اس نور سماوی میں اس شخص کے افسردہ رخساروں پر آنسو اس طرح چمکتے ہیں، جیسے دن بھر کے مرجھائے گلاب پر شبنم کے قطرے۔ انسانی نگاہیں ممکن ہے کہ اس روشنی کو شہابی ضیا سے تعبیر کریں، لیکن پری جس پر وجد کی کیفیت طاری ہے خوب جانتی ہے کہ وہ روشنی فرشتوں کا تبسم تھا جو انسانی ندامت وتوبہ کے مقبول ہونے پر اُن کی مسرات کا ثبوت ہوتا ہے۔

—— پری اب اپنی مسرت کو ضبط نہیں کرسکتی تھی، اس لئے وہ جوش میں آکر پکار اُٹھی:۔

"میرا مقصد حاصل ہوگیا۔ اب میرے لئے مسرت ہی مسرت ہے، میں اب داخل ارم ہوسکونگی اور اس کا دروازہ اب میرے لئے بند نہ رہے گا"

"الوداع! اے پژمردہ ہوجانے والے پھولو، جو میرے پرستانی ہاروں میں صرف چند لمحات کے لئے تبسم ہوا کرتے تھے، الوداع! کہ اب میرا حصہ تو وہ طوبیٰ ہے جو تخت الٰہی کے سایہ میں نشوونما پارہا ہے اور جس کے پھولوں کی ہر پنکھڑی سے حیات تازہ کی لہک بلند ہوتی ہے"

"میرا مقصد حاصل ہوگیا، اب میرے لئے مسرت ہی مسرت ہے، اب میں داخل جناں ہوسکوں گی اور اس کا دروازہ اب میرے لئے بند نہ رہے گا"

افسانۂ نور محل

وادی کشمیر، اُس کے عدیم المثال گلاب اور سیوتی کے وسیع تختوں اور اُن کی شادابی کا ذکر کس نے نہیں سنا، باروں کے دلفزا کنجوں اور شفاف چشموں کی لطافت کے فسانے کون نہین جانتا۔ وہ چشمہائے شفاف، جو محبت کا مسکن بننے والی آنکھوں کی طرح ہر وقت منور نظر آتے ہیں۔

اس وادی حسین کا منظر، جب آفتاب غروب ہو رہا ہو، صرف آنکھ ہی دیکھ سکتی ہے کیونکہ اس کی سحر زائیاں الفاظ میں محدود نہیں ہوسکتیں، گرمیوں کی شام کو آفتاب کی آخری درخشاں شعاع جھیل پر اس طرح منعکس ہوتی ہے، جس طرح کوئی

نئی دولہن، وقت شب اپنے حجلۂ عروسی میں جاتے ہوئے آئینہ پر ایک آخری نگاہ ڈال لیتی ہو اور کسی بات کا خیال اس کے چہرہ کو رنگ انفعال سے رنگ دیتا ہے۔ سبزہ زاروں کے اندر نیم مستور سر بلند معابد کا اس فضا کے تقدس میں اضافہ کرنا، مؤذن کی مقدس موسیقی کا بلند ہو کر فضا پر محیط ہو جانا، مجوسی معابد سے بخور کا بلند ہو ہو کر ہوا کو معطر کرنا، اور مندروں کے سامنے رقص کا اپنے ماحول کو مرتعش رکھنا، یہ وہ معمولی مناظر ہیں جن سے وہاں کی سرزمین ہر وقت معمور نظر آتی ہے۔

اس نزہت گاہ کا منظرِ لطیف، جب ماہتاب ایک سیل نور کو جاری کر دیتا ہے اور اپنی لطافت بار روشنی سے باغات و معابد کو حسین تر بناتے ہوئے آبشاروں کے اندر شہابِ ثاقب پیدا کرتا ہے، وہ حالت و کیفیت ہے کہ حواسِ انسانی تاویل کرنے سے عاجز ہو جاتے ہیں۔

غروبِ آفتاب اور نورِ ماہ کے علاوہ، اس جلوہ گاہِ فطرت کے مطالعہ کا وقت، خود صبح کی ساعت بھی ہے، جبکہ اس کے تدریجی طلوع کے ساتھ دن کی روشنیاں، ہر لمحہ میں اک نیا جادو جگاتی ہیں اور رنگین پہاڑیاں، سفید گنبد، گوہر بار فوارے، سیال چشمے غرض ہر شے تاریکی کے غلاف سے اس طرح باہر نکل آتی ہے گویا وہ آفتاب کے اندر سے پیدا ہوئی ہے۔

جب نکہت، صبح کے ساتھ ہی پھولوں کے اندر سے انگڑائیاں لیتی ہوئی نکلتی ہے اور مست قطرِ نسیم، رندانہ وضع کے ساتھ بید مجنوں کی شاخوں سے ملاعبت کرنے لگتی ہے۔ یہانتک کہ وہ سرتاپا لرزش بن جاتی ہیں، تو وہ عالم ہوتا ہے، جسے دیکھ کر جینا دشوار ہو جاتا ہے۔ لیکن آج تک برشگال کی شبنمی راتوں اور تابستان کی نورانی صبحوں نے اس وادیِ ارم پرور کو لطافت و نزہت بہجت و مسرت سے اس قدر لبریز نہیں کیا تھا جتنی کہ وہ اس وقت ہے۔ اس کی فضا یکسر معمورِ حسن اور تمامتر لبریزِ محبت ہے۔ وہ دن کے وقت خیال بندی طلسم ہے اور رات میں سحر کاریِ خیال۔ ہر پیشانی مسرور نظر آتی ہے اور ہر غنچۂ دل نسیم بہجت سے شگفتہ ہوا جا رہا ہے۔ غرض ہر سمت لذت و انبساط جلوہ فگن ہے اس لئے کہ کشمیر کی مخلوق آج "جشنِ شگوفہ" منا رہی ہے۔ یہ وہ تقریبِ عیش و طرب ہے، جس کے طغیانِ ابتہاج اور طوفانِ لذات میں باشندگانِ کشمیر ڈوب جاتے ہیں۔ یہ وہ وقت ہے جب بارہ مولا کے بلند و شاداب درختوں کی آڑ میں دن اپنی گرم شعاعوں کو تہہ کر کے رکھ دیتا ہے، شام کی سکون پرور ساعتوں میں جھیل کا پانی ایک خنک لذت پیش کرنے لگتا ہے، کشمیر کی دوشیزہ لڑکیاں ریشمی تکیوں سے فرقِ ناز کو جدا کر کے چاندنی کے اندر زعفران زاروں پر اپنے طرزِ خرام سے وہ سحر پیدا کرتی پھرتی ہیں جو صرف حسن و فطرت کے متفق و ہم آہنگ ہو جانے کے بعد ہی نظر آسکتا ہے۔

وادی کے ہر کنج میں صدہا مشعلیں متحرک ہیں، مناروں اور گنبدوں پر ہزارہا چراغ روشن ہیں اور دور و نزدیک پھولوں کے تختے اور باغوں کی روشیں کثرتِ چراغاں سے ایسا سماں پیدا کر رہی ہیں گویا انفاس زمین اشعۂ منور کی موجیں ہیں جن کا پرتو ہر ذرہ کو ایک دنیائے نور بنا دے رہا ہے اور فضائے بسیط کا پیالہ نور و روشنی سے لبریز کر دیا گیا ہے، پھولوں کی پنکھڑیاں شاخوں سے جدا ہو کر گرتی اور روشنی کی موجیں بنتی جا رہی ہیں، اس شام تماشا اور تقریبِ مسرت کے موقع پر نازنینانِ کشمیر

اپنے نقابوں کو جدا کر دیتی ہیں اور اپنے رنگین رخساروں کو دکھا کر ایک دفعہ بلبل کو بھی بے نیاز بہار بنا دیتی ہیں۔

ہر نفس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیائے اسباب میں کسی تعلق کی گرہ سے وابستہ نہیں ہے اور قطعاً آزاد ہے۔ ہر شخص ایک دوسرے سے مل کر بھی کہہ رہا ہے کہ "شگوفہ" اس سے قبل کبھی اس قدر شادمان و فرحت ناک نہیں ہوا، چاند نے اس سے لطیف تر چاندنی کبھی نہیں پیدا کی، اور گلاب کا پھول کبھی اس درجہ حسین اور شاداب نظر نہیں آیا۔

موج گل کی شدت نے سبزہ کو مغلوب رنگ کر لیا ہے اور تا بہ حد نگاہ پھولوں کی رنگینی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، طائر صبا کے بازو امواج نکہت سے اس قدر گرانبار ہیں کہ پرواز مشکل ہے، گویا کہ اس موقع پر پھولوں کی سالہا سال کی پیداوار کو بیک وقت منتشر کر دیا گیا ہے۔ جھیل کے پانی پر مستِ تعطّر غنچے اس طرح پڑے لوٹ رہے ہیں گویا کسی پری کا ہار ٹوٹ کر سطح آب پر بکھر گیا ہے۔ سازہائے طرب کی آوازیں، رقاصہ ہائے زاہد فریب کے خلخال کی جھنکاریں، نارنجی کنجوں کے اندر ریشمی جھولوں میں جھولنے والیوں کے خندہ ہائے مسرور، گویا سامعہ کے لئے شراب کیف پرور کے جام ہیں، جو پے بہ پے دیئے جا رہے ہیں۔

سطح آب پر بھی گوناگوں آوازیں ہنگامہ بپا کر رہی ہیں۔ کشتیاں چاندنی میں جھیل پر ادھر سے ادھر دوڑتی پھر رہی ہیں اور ان کی صدائے خاموش اور ملاحوں کے پتواروں کی پانی کاٹنے کی آواز، کنجوں اور جھاڑیوں کے اندر چڑیوں کا زمزمۂ بے اختیار اور اسی قسم کی صدہا موسیقیاں، یہ معلوم ہو رہا ہے کہ موجوں کے ہر ہر بوسہ کا جواب ایک ترانۂ دلکش سے دیا جا رہا ہے۔

لیکن اس ہنگامۂ موسیقی میں، وہ آوازیں جو موسیقی و ترنم کا مستقل جزو معلوم ہوتی ہیں وہ نرم اور سادہ سانسیں ہیں، جو کسی عاشق کی بانسری سے سہمی ہوئی نکل رہی ہیں۔ عشاق دل گرفتہ کی بانسری ایسی ساعت میں ایک آہ سرد ہوتی ہے کیونکہ مسرتوں میں مسرت تو اس کی مسرت ہے جو قرب یار سے شاد کام ہے، اور جو ماہتاب و موسیقی کے تلاطم میں اپنے محبوب کو پہلو میں لئے ہوئے کشمیر کی جھیل پر کشتی رانی میں مصروف ہے۔

عورت، جو ویران ترین مقام کو بھی رشک خلد بنا سکتی ہے، ظاہر ہے کہ وہ کشمیر کی فضا میں کیا کچھ نہیں کر سکتی۔ جہانگیر کو جب شوکت و حکومت اور تفاخر فتوحات خوش نہ کر سکے، تو وہ ان اشیاء کی نمود و نمائش سے بھاگ کر کشمیر کی سرزمین میں تسکین و مسرت تلاش کرتا اور کوئی شک نہیں کہ وہ کشمیر کی فضا میں نور محل کی معیت سے اپنے مدعا و مقصود کو پا لیتا تھا۔ وہ دولت و عظمت کو فراموش کر کے، اپنی ملکۂ محبوبہ "نور جہاں" کو ساتھ لے کر جھیل کے کنارے گلگشت کیا کرتا، اور ان منتشر پھولوں میں، جنھیں نور محل، چلتے چلتے توڑ لیتی اور گیسوؤں میں لگا لیا کرتی تھی، وہ شان دلفریبی دیکھتا جو اسے اپنے تاج و نگین میں بھی نظر نہ آتی تھی اور نور محل کی سیاہ زلف کا ایک ہلکا سا چھلا، جو اس کے بلوریں گردن پر قائم ہو جاتا، جہانگیر کی نگاہوں میں ساری دنیا کی حکومت سے زیادہ عزیز و قیمتی نظر آتا۔

(۲)

نور محل، اگر کبھی غمگین و ملول ہوتی تو یہ معلوم ہونے لگتا کہ وہ رعنائی جو نازنینانِ عالم کے حسن کے لئے وجہ ناز ہو سکتی ہے،

صرف اسی کے حسن کا ایک جزو مستقل ہے۔ وہ جب کبھی برہم ہوتی تو اس کا فوراً رفع ہو جانے والا غصہ اس کے اندر ایک نئے حسن کو پیدا کر جاتا۔ جس طرح ہوا کا ہلکا سا جھونکا پھولوں کی ڈالیوں کو متحرک کر دیتا ہے، اور وہ اس جنبش لطیف میں زیادہ حسین نظر آنے لگتے ہیں اسی طرح نورمحل کا غصہ بھی اُسے بے انتہا حسین بنا دیتا تھا۔ جب اس کے دل میں رحم و کرم کے جذبات پیدا ہوتے، تو اُس کے آنکھوں کی سیاہی کا رنگ زیادہ گہرا اور مقدس ہو جاتا، اور اس کے اندر اس کے محسوسات کی روشنی اس طرح چمکتی جس طرح اندرونِ خانقاہ سے نزول برکات ہوتا ہے۔ جب وہ مسرور ہوتی تو اس کی کیفیات قلم و الفاظ کی دسترس سے بہت بلند و بالاتر ہو جاتیں۔ اور اس کی خوش طبعی اس طائرِ وحشی سے کہیں زیادہ ہو جاتی جو موسم برشگال میں ہمہ تن پرواز ہو کر فضا میں بال کشا ہو جاتا ہے۔ وہ ایسی جودت و ذہانت اور ذکاوت و ظرافت کا مرکز ہوتی جس سے حکماء عقلا مسحور ہو جاتے ہیں۔ جب وہ بشاش و خندہ ریز ہوتی تو دیکھنے والے کے لئے یہ معلوم کرنا دشوار ہو جاتا کہ اس کی ہنسی کس جگہ جلوہ فروز ہوئی ہے، کیونکہ اس کے رخسار، آنکھیں، بلکہ ساری ہستی دمکنے لگتی تھی، گویا وہ کسی چشمہ کا مصفا پانی ہے جس پر ہوا کے جھونکوں سے صدہا غبب پیدا ہو جاتے ہیں۔

یہ تھی نورمحل کے حسن بے مثال کی نیرنگی۔ یہ تھی اُس کے جمال بے نظیر کی عشوہ پردازی جس نے مشرقِ عظمیٰ کے سب سے بڑے شاہنشاہ کو اس کا غلام بنا رکھا تھا۔

لیکن آج کی شب جبکہ ہر دلِ مسرور و سرشار ہے۔ نورمحل کہاں ہے، اس رونق و شادمانی میں وادی کی اس شب عیش و طرب میں نورمحل کا جلوۂ طلسم پرور کیوں نظر نہیں آتا؟

اس حال میں کہ عیش و نشاط کا جوش، لطف و طرب کا شوق، کشمیر کے حسن و شباب کو یہاں کھینچ لایا ہے، کیا اُسے، جو شباب کی ملکہ اور حسن کی دیوی ہے، خاموشی و غمگینی میں مستور رہنا چاہئے۔

حیف کہ ایک ادنیٰ سی بات اور ایک بے حقیقت واقعہ عشاق کے دلوں میں کشیدگی پیدا کر دیتا ہے۔ غریق محبت ہستیوں کا ہجر و فراق میں مبتلا رہنا، جہاز کی اسی غریق کی مثال ہے، جو طغیانِ بحر میں تو بہتا رہے لیکن جس وقت سمندر حلیم و ساکن ہو تو ڈوب جائے وہ محبت جسے طوفان مصائب جنبش میں نہیں لا سکتا، کبھی ایک لفظ سے، ایسی ناگوار و نازیبا صورت حال پیدا کر لیتی ہے۔ کہ اس کی لطافتیں ایک ایک کر کے زائل ہونے لگتی ہیں، اور وہ دل جو حد درجہ متحد تھے، سحاب منتشر کی طرح آوارہ ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ محبت کرنے والی ہستیوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ محبت کو تو صرف پھولوں کی بدھیوں سے باندھ کر رکھا جا سکتا ہے، کیونکہ محبت کا دیوتا بھی آسمانوں کے چمن زار مسرت میں، اپنے تخت پر گلاب ہی کے ہاروں سے جکڑا ہوا بیٹھا ہے۔

اس قسم کا ایک بے حقیقت اختلاف، اُس رشتہ کو جس میں لبریز شوق دل بندھے رہتے ہیں، توڑ دیتا ہے۔ محبت کی رنجش آسمانوں پر اس ابر کی طرح ہے، جو ابتدا میں تو نہایت خفیف مگر وسعت پا کر خوفناک رعد و برق کا مسکن بن جاتا ہے، یہی ابر کثیف ہے جو اس وقت شاہنشاہ جہانگیر کے دل پر محیط ہے۔ نورمحل، اس کی حرم، اس کی دنیا، اس کی زندگی، کسی ایسی ہی شکر رنجی کے باعث اس کی آنکھوں سے اوجھل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس شب عیش و تنعم میں جبکہ زعفران زاروں اور کنجہائے باغ میں جذبۂ

لذت اندوزی نے ایک دنیائے محبت کو آزاد چھوڑ دیا ہے اور ہر متنفس اپنے مدعائے زندگی اور مقصودِ حیات کو پہلو میں لئے ہے۔ وہ بیگانۂ مسرت پھر رہا ہے۔ پری جمال کنیزوں کا وہ ہجوم جو اس فردوسِ ارضی میں مہیا ہو سکتا ہے، اس کے گرد حلقہ کئے ہوئے ہے، لیکن اس کا رنگ زرد ہے اس کی آنکھیں پرنم ہیں اور وہ ایک تمثالِ بے حس بنا ہوا ہے۔ آہ! سچ ہے، باغ میں سا دنیا بھر کے پھول موجود ہوں، تو ہوا کریں، لیکن اگر وہاں گلاب نہیں تو بلبل کو ان سے کیا غرض!

(۳)

جشنِ طرب، اور تقریبِ عیش و انبساط سے بہرہ اندوز نہ ہونے کی جو وجہ جہانگیر کے لئے باعثِ بیزاری و دل گرفتگی ہے، وہی وجہ نورمحل کو بھی اس لطف و شادمانی سے محروم کئے ہوئے ہے۔ ایک نوجوان خادمہ نعمانہ اس کے ساتھ ہے جو اپنی وفاداری و محبت کے لحاظ سے تمام کنیزوں سے زیادہ ممتاز ہے۔ ان خوبیوں کے علاوہ وہ سحر و پری خوانی کے فن سے بھی واقف ہے، جس نے اس کی ہستی کو اور زیادہ عجیب و غریب بنا دیا ہے۔

نعمانہ تسخیرِ ارواح کی ماہر تھی اور تمام نفوسِ آتشیں اس کے مطیع تھے آج کی شب اس نے تہیہ کر لیا ہے کہ اپنے علم کی پوشیدہ طاقتوں کو ملکہ کے لئے صرف کر دے گی اور بادشاہ کا تبسم ایک مرتبہ پھر نورمحل کے لئے وجہِ انبساط ہو کر رہے گا۔

نصف شب گزرنے کے بعد نعمانہ اس طرح اپنی گفتگو شروع کرتی ہے:-

"وہ ساعت یہی ہے جس میں پھول اور پودوں پر ایک اثرِ مخصوص ہو جاتا ہے، اور اس لئے بہتر یہ ہے کہ اس وقت پھول چن کر ہار گوندھے لئے جائیں تاکہ نورمحل کی پیشانی پر جو اس وقت محوِ خواب ہے باندھ دیئے جائیں اور جن کے طلسمی اثر سے بادشاہ کی نیند بھی ان خوابوں سے معمور ہو جائے، جن کے راز سے صرف گروہِ آتشین کے رہنے والے ہی واقف ہیں۔"

نورمحل، غمزدہ ملکہ، یکبارگی بیدار ہو جاتی ہے اور بیتاب ہو کر نعمانہ کا قطعِ کلام کر کے پکار اٹھتی ہے۔

"میرے لئے، اچھی نعمانہ، میرے لئے! ہاں، آج کی رات وہ ہار میرے لئے ضرور بناؤ۔" یہ کہتی ہوئی نورمحل بسرعت تمام غزالِ ختن کی طرح ریحان زار میں داخل ہو جاتی ہے کہ اس طلسم بند اور سیمیا اثر سہرے کیلئے تمام پروردۂ ماہتاب پھولوں کو جمع کر لے، جو اپنی مقدس نکہت کی وجہ سے کیوپڈ کی زیبائش تیر و کمان ہو سکتے ہیں۔

الغرض وہ ہر قسم کے پھولوں سے اپنی گود بھر رہی ہے اور جب اس میں مزید گنجائش نہیں رہ جاتی تو نعمانہ کے پاس آکر اپنا اس خزینۂ رنگ و بو کو اس کی گود میں بکھیر دیتی ہے۔

ساحری فن، نعمانہ جب اس ساعتِ تبریک و قبول کی نورانیت میں غسلِ شبنمی پائے ہوئے پھولوں اور غنچوں کے انبار کو دیکھتی ہے، تو خوشی کی ایک لہر اس کی آنکھوں اور رخساروں کو دمکا دیتی ہے۔ وہ کچھ گنگنانے لگتی ہے اور معطر رنگین کے اس انبار پر جھک جاتی ہے۔ اس پر ایک کیفِ بیخودی طاری ہو جاتا ہے اور ماحول پر وہ ایک مقدس اثر طاری ہوتے محسوس کرتی ہے۔ آخر کار وہ اس نکہت سے سیر ہو کر عمل شروع کر دیتی ہے اور پھول گوندھتی ہوئی گنگناتی جا رہی ہے۔

"میں جانتی ہوں کہ وہ روحیں، فرشِ شب جن کا بازی گاہ ہے، کہاں رہتی ہیں؟ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ وہ اپنے شہپروں کو دن کے وقت پھولوں کی کن پنکھڑیوں میں چھپا دیتی ہیں۔ اس لئے اے سہیلی، ہمیں اپنا ہار جلد گوندھ لینا چاہئے کیونکہ کل تک تو پھول کمھلا جائیں گے اور وہ خواب پر لگا کر اڑ جائیگا۔"

"محبت کا دیوتا، شوق مجسم بن کر پہونچتا اور گلہائے یاسمن کا تنفس چرا کر لے جاتا ہے، یاسمن کے وہ پھول اس دوشیزہ کی طرح جس کے نئے گیسو پر یہ تحفۂ نکہت لے جاتا ہے، سایہ کے اندر اپنی سانسوں میں اپنی روح شامل کر دیتے ہیں۔ بادام کی بے برگ شاخوں میں نقرئی شگوفے اس طرح پھوٹے ہیں جیسے کسی مصیبت زدہ پیشانی کو آئندہ راحت و مسرت کا خیال چمکا دیتا ہے۔ اس لئے اے سہیلی، ہمیں اپنا ہار جلد گوندھ لینا چاہئے کیونکہ کل تک تو پھول کمھلا جائیں گے اور وہ خواب پر لگا کر اڑ جائیگا۔ وہ ہستیاں جو مدفون خزینوں کی چمک دمک، اہلِ دنیا پر اکثر روشن کر دیتی ہیں، ان پہاڑی جھاڑیوں میں رہتی ہیں جن کے کھانے سے مویشیوں کے دانت سونے کے ہو جاتے ہیں، لیکن وہ ہاتھوں سے نہیں چھوئی جا سکتیں۔ کیونکہ ان کا نظارہ تو ایک خونی انسان کو بھی خوف زدہ کر دیتا ہے۔ اس لئے اے سہیلی، ہمیں اپنا ہار جلد گوندھ لینا چاہئے کیونکہ کل تک تو پھول کمھلا جائیں گے اور وہ خواب پر لگا کر اڑ جائے گا۔"

"اس مجروح دماغ کا خواب جو انسانی غلط کاریوں پر تبسم ہوتا ہے، الائچی کے اس تنہ کی طرح ہے جو زخمی تیشہ ہو کر زیادہ تعطر بیز ہو جاتا ہے اس لئے اے سہیلی ہمیں اپنا ہار جلد گوندھ لینا چاہئے کیونکہ کل پھول کمھلا جائیں گے اور وہ خواب پر لگا کر اڑ جائے گا۔"

پھولوں کا طرہ تیار ہو جاتا ہے اور نعمانہ اس تاجِ گل کو نورجہاں کے زیبِ سر کر دیتی ہے۔ نورجہاں کی مست خواب آنکھیں نیند سے منسوب ہو جاتی ہیں۔ اور جس آہستگی و سکون کے ساتھ گرمیوں میں خوشبو آتی ہے اسی خموشی اور ترقی کے ساتھ اس کے پپوٹوں پر نیند کا سحر طاری ہو جاتا ہے اور دفعتہً نسیمِ نیم شبی، ہلکے ہلکے سروں کی ہم آہنگی سے لبریز، جاری ہو جاتی ہے۔ نور موسیقی کی روح جو نعمانہ کے عمل کی موکلہ ہے فضا پر محیط ہو جاتی ہے اور جب اس کے بازو جنبش میں آجاتے ہیں تو عجیب دلفریب شیرینی سے مملو موسیقی پیدا ہونے لگتی ہے۔ یہ روح فضا میں چکر لگا رہی ہے اور کہہ رہی ہے:—

"ایک فوارۂ موسیقی نواز میرا مسکن ہے اور شبِ ماہ کے طرہ ہائے گل نے مجھے یہاں کھینچ بلایا ہے، ایک چشمہ میرا مامن ہے جہاں میں صبح و شام اور روز و شب امواجِ ترنم کے اندر راحت پذیر رہتی ہوں، جہاں کی ہوائیں بانسریوں کی لے سے ملی جلی ہوتی ہیں، جہاں ہر وقت بارشِ نغمات ہوتی رہتی ہے اور جہاں دل سے نکلنے والی ہر آہ ہونٹوں سے جدا ہو کر گیت بن جاتی ہے۔

میں اپنے پرستانی مسکن سے آئی ہوں اور اگر موسیقی میں اثرِ سحر ہے تو میں اس تنفس کی قسم کھا کر کہتی ہوں جو شبِ ماہ کے پردۂ سیمیں سے جاری ہے کہ تیرا عاشق پھر ایک دفعہ تیرے قدموں کو اپنی سانسوں سے پرنم کر رہا ہوگا۔

میرا نغمہ، وہ نغمہ ہے جو بہ سہولت وسعت اختیار کرتا ہے اور میرے سُر وہ ہلکے سُر ہیں جو سمندر پر بارانِ یخ کے نزول اور اس کی گرمی سے فوراً پگھل جانے کی طرح، خونِ دل میں شامل ہو جاتے ہیں اور دل کو پاک و منزہ کر دیتے ہیں۔ میرا سحر وہ سحر ہے جس کے پُر اسرار اثر کے سامنے، مسرات ماضی کی روحیں اظہار اطاعت میں جھک جاتی ہیں، میرے طلسم ترانہ نواز کی صدا کے ساتھ

یہ ارواح گروہ در گروہ جمع ہو جاتی ہیں، اور میرا گیت وہ گیت ہے جو داعیات محبت کو ایک دل سے دوسرے دل تک اسی طرح پہونچا دیتا ہے، جس طرح ایک چڑیا دلکشا ہواؤں میں تیرتی ہوئی الائچی کے بیج ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہونچا دیتی ہے۔

میرے ایک خفیف لمس سے ایک جنگجو کا دل ایسا نرم و مطیع ہو سکتا ہے، جیسے اُس کی کلغی کے سفید پر جو جنگ کی ہلاکت باریوں میں سربلند و چمکیلے نظر آتے ہیں۔

میں اپنے پرستانی مسکن سے آئی ہوں اور اگر موسیقی میں اثر سحر ہے تو میں اس تنفس کی قسم کھا کر کہتی ہوں جو شب ماہ کے قطرہ ہائے گل سے جاری ہے کہ تیرا عاشق پھر ایک دفعہ تیرے قدموں کو اپنے سانسوں سے نم آلود کر رہا ہوگا۔

صبح کی طلعت نظارہ فروز ہوتی ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ کیوں اثر افزوائی سے متاثر ہو کر پھر ایک دفعہ اپنے نقاب شب رنگ میں روپوش ہو جاتی ہے۔ گویا نمود صبح وہ معشوق مست خواب ہے جو نیند سے بیدار ہو کر ایک ہلکی سی انگڑائی لیتا اور پھر اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے۔"

ذر محل کی وہ آنکھیں، جن میں رات بھر بیدار رہنا ذیتی ہے، اس وقت بیدار ہیں۔ وہ اپنی نے نوازی میں محو ہے۔ اس وقت اس کا لحن کمتر انسانی اور بیشتر ملکوتی ہے کیونکہ اس ساعت سے قبل کسی مطرب و مغنی کی لحن طراز و گلو پرداز کو یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی ایسے تازہ نغمات قدس کسی انسان کے ہونٹوں سے ادا نہیں ہوئے وہ انفاس ملائکہ سے زیادہ شیریں ہیں، اور وہ الہام جو فرشتوں کی سانس میں ہوتا ہے اس نغمہ و موسیقی سے کم ہے۔"

ذر محل پر اس حالت و کیفیت سے ایک عالم وجدان طاری ہو جاتا ہے وہ بے تاب ہو کر پکار اٹھتی ہے:-

خدا کرے یہ حالت، یہ کیفیت، یہ سماں رات ہونے تک قائم رہے، اگر ایسا ہوا تو پھر وہ میرا اور ہمیشہ کے لئے میرا ہو جائے گا۔"

وہ پھر گانے لگتی ہے اور ہر ساعت کے بعد نیا گیت شروع کرتی ہے، اس خوف سے کہ مبادا یہ ربانی کیف و اثر شام ہونے سے قبل ہی زائل ہو جائے۔ کیونکہ وہ جانتی ہے کہ جن چیزوں میں اس درجہ مادیت ہوتی ہے وہ سریع الاثر ہوتی ہیں۔ لیکن اس کا یہ خطرہ اس کی موسیقی کا تقدس ہر لحظہ بڑھا رہا ہے۔ یہ غنا کی دیوی موسیقی کی ملکہ اندیشۂ زوال سے مجبور ہو کر بانسری کے ایک ایک سُر پر بہت دیر تک قائم رہتی ہے اور ہر سُر سے جداگانہ ایک گیت نکالتی ہے یہاں تک کہ اپنی نوائے نغمہ اور زمزمۂ موسیقی کی کیفیت میں خود بھی مست و بیخود ہو جاتی ہے (جس طرح (Echo) آلۃ الصدا خود اپنے گیت پر عاشق ہو کر اُس کے نشہ میں سرشار ہو جاتی ہے) اس توقع میں کہ نغمہ اپنی طرب انگیزی سے، سرود اپنی نشاط پروری سے اور کیف جام اپنی سرخوشی سے شاید اس کے دل کو اس عذاب محبت سے نجات دلا سکے جہانگیر نے شالامار میں آج شام کو ایک جشن قرار دیا ہے، وہ شالامار جس کے کنجوں میں، اس وقت جب ستارۂ شام آئینۂ آب میں اپنی پہلی جھلک دیکھتا ہے، کشمیر کی حوریں جمع ہو جاتی ہیں۔ صنف نازک کے بہترین افراد، نزاکت و رعنائی کے ساتھ باغ کی روشوں پر خراماں خراماں جاتے ہیں اور وہاں کے تسنیم و سلسبیل سے حسن کی شعاعیں پی پی کر شاد کام ہوتے ہیں۔

اس محشر ستانِ حسن و جمال میں، نازنینانِ کشمیر کے علاوہ، حورو شانِ حرم شاہی بھی اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ رونق افزا ہیں وہ پری جمالانِ حرم جن میں زریں زلفوں والی دوشیزگانِ مغرب، خرامِ رعنا رکھنے والی نازنینانِ مصر، قبرص کے دامنِ کوہ کی رہنے والیاں جن کا لباس پارہائے الماس سے مزین ہوتا ہے، اور خطا کی خواب آلود آنکھوں والی کنواریاں بھی شامل ہیں۔

الغرض مجمع مستوں کا منتخب نمونۂ حسن و شباب، شالا مار کے لئے وجہ زینت و افتخار بنا ہوا ہے، لیکن حیف! نور محل، وہ ملکۂ جمال جس کے ضیائے تبسم سے دنیا کی روشنیوں میں نور اور جس کی رعنائی سے عالم کے حسینوں میں شان دلربائی قائم ہے نہیں ہے۔ شاہنشاہ کا دل و دماغ اس کا آماجگاہ بنا ہوا ہے اور عیش و عشرت کی یہ نمائش بجائے وجہ دلبستگی ہونے کے اس کے لئے وحشت و تنفر کا سامان ہے، کیونکہ نور محل کے سوا اور اس کے بغیر کوئی شے اسے اپنی طرف راغب نہیں کر سکتی۔

نور محل ایک عرب دوشیزہ کے لباس میں، نفیری والوں کی جوکی میں ملی ہوئی وہاں موجود ہے اور اس کا سحر نغمہ تمام فضا پر چھایا ہوا ہے، چونکہ اس نے عرب کنواریوں کی طرح اپنا چہرہ نقاب کے اندر چھپا رکھا ہے، اس لئے وہ ابھی تک پہچانی نہیں جا سکی ہے۔ وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ چاروں طرف اس انتظار و جستجو میں پھر رہی ہے کہ جب مخصوص ساعت آوے تو وہ اپنی بانسری کا جادو آزمائے کہ آیا اس کی صدا میں اس وقت تک وہ اثر باقی ہے یا نہیں۔

باغ میں جابجا چوکیاں بچھا دی گئی ہیں اور کشمیر کی ریشمی چادروں سے ڈھکی ہوئی ہیں، جن پر نظر فریب خوا کہ و مشروبات بکثرت موجود ہیں۔ تاکستانِ قزوین کے چمپئی انگور، سمرقند کے سرخ انار، جن کو فشار دینا ایسا ہے گویا کسی سیال شے کا نچوڑ لینا، کشمیر کی ناسپاتیاں، کابل کے سرخ سیب، بخارا کے پرحلاوت زرد آلو، سمرقندی اخروٹ، خرمائے بصرہ، ایرانی خوبانیاں، خوشنما اور دلفریب برتنوں، صندلیں کشتیوں میں رکھے ہوئے ہیں اور حسین و نادر ظروف بلوریں مشروبات سے لبریز ہیں۔ ان نیلمیں و اخضریں زریں و احمریں میناؤں کے چاروں طرف ایک جلوۂ سیال مستقلاً قائم ہو کر رہ گیا ہے، بحر اخضر کے تاکستانوں میں پھوٹ نکلنے والی بادۂ انگور، شبنم متجلی معلوم ہو رہی ہے، شراب شیراز کے رنگ کا یہ عالم ہے کہ گویا وہ عقیقِ نادر و نایاب، جس کے لئے قبلائی خاں نے ایک شہر کی دولت پیش کر دی تھی، مینا کے اندر رقیق ہو کر رہ گیا ہے۔

(۵)

جہانگیر الم زدہ جہانگیر ان شرابوں کے جام پیہم پی رہا ہے، کثرت مینوشی سے اپنے خلائے دل کو پُر کرنا چاہتا ہے کہ یہ سیلابِ ناب اُس کے دل میں اس درجہ طوفان خیز ہو جائے کہ پھر وہاں طائرِ محبت کی پرواز کے لئے کوئی جگہ باقی نہ رہے، گر اس نے شائد بھلا دیا ہے کہ محبت کا شرر پر دیوتا تو ساغرِ مے کی لہروں پر بھی شناوری کرتا اور انھیں اپنے ابتسامِ دائمی سے تجلی ریز بنا دیتا ہے۔ مطربانِ ہند نے اپنے ادبی تخیل میں کامدیو کو گل رنگ کنول ہی پر گنگا کی امواجِ متبسم میں تیرتا ہوا دیکھا ہے۔

دورِ ساغر کا لطف بے مزہ ہے، اگر اس آتشِ سیال کو نغماتِ موسیقی کا تنفس نہ لے اُڑے۔ چنانچہ ایک پرشباب لڑکی اس طرح لحن طراز ہوتی ہے:—

"دن کی روشن ساعتوں میں اور رات کے تاریک لمحوں میں ہم لذتوں سے سرشار ہیں، وہ لذتیں جو کبھی ختم نہیں ہوتیں، جس طرح تابستانی سمندر کہ ایک موج کے بعد دوسری ویسی ہی اور اتنی ہی دلفریب پیدا ہوتی رہتی ہے، وہ محبت جو اپنی انتہا کو پہونچ چکتی ہے اپنے دم واپسیں میں دوسری محبت کی تخلیق کا باعث ہوتی ہے۔

اس فضا میں دوشیزگانِ مہوش سانس لے رہی ہیں اور اُن کا یہ تنفس اس پھول کی طرح معطر ہے جو شہد کی مکھیوں کے بوسوں سے ابھی ابھی کھلا ہے، اُن کے اشک محبت گوہر بار ابر نیساں کی طرح قابل قدر ہیں بلکہ اس بوسہ اور قطرۂ اشک کی قیمت تخمین واندازہ کی رسائی سے باہر ہے۔

یہاں وہ آبِ نشاط جلوہ فروز نگاہ ہے، جسے محبت نے گدازِ لطافت سے مملو کر دیا ہے اور جس کی دلکشی فرشتوں کو اپنے سماوی مسکن سے کھینچ لاتی ہے، وہ فرشتے اس بادۂ ارضی کے لئے تسنیم و سلسبیل کو خیرباد کہدیتے ہیں، اور بنات الارض کی تجلی نظر میں انجمِ فلک کو بھول جاتے ہیں پھر ان صراحیوں کی عنبر زا خوشبو کو کون سی روحِ آسمانی کو دنیا پسند کرے گی؟"

جارجیا کی اس حسین دوشیزہ کے نغموں سے ہنوز فضا خالی نہ ہوئی تھی کہ اسی بحر اور انھیں سروں میں ایک سرود اہنگ ہو جاتا ہے اور کچھ ایسی الاہتی موسیقی سے فضا کو معمور کر دیتا ہے کہ ہر متنفس نقشِ حیرت بن جاتا ہے کہ موسیقی کے اس مخرج علوم کرے گویا یہ نشید صور اسرائیل کی سب سے پہلی صدائے ہوش ربا تھی، جس نے ہر شخص کے محسوسات کو اپنے سحر سے وب کر لیا تھا۔

اسی وقت ایک لحن روح نواز اسی سرود کی طرح مبہوت کر دینے والا ساز کے تاروں پر موج زن ہو جاتی ہے اور ساز سے درجہ ہم آہنگ ہے کہ سننے والے تمیز نہیں کر سکتے کہ آیا کس میں زیادہ سماویت ہے، ساز سامعہ نواز ہے یا لحن روح پرور۔ الغرض نغمہ و موسیقی ایک ـــــ نیا عالم پیدا کر دیتے ہیں۔ متعدد آوازیں بیک وقت ہم آہنگ ہو جاتی ہیں کہ "یہ تو وہ نقاب عرب لڑکی ہے" سلیم، جو اس غنا رکا سب سے زیادہ معمول اثر ہو کر کچھ دیر کے لئے مبہوت و بیخود ہو گیا تھا، ہاتھ کے اشارہ سے نغمہ کا طلبگار ہوتا ہے اور یہ وجدانی نغمہ ہر شے پر چھا جاتا ہے:—

"چل میرے ساتھ جنگلوں میں نکل چل۔ کیونکہ ہمارے عربی خیمے تیرے لئے موزوں نہیں ہیں، بدقطع لیکن آبادِ محبت خیموں اور خوبصورت لیکن محرومِ محبت تاج و نگین کے درمیان انتخاب کرنے میں کون ایسا دل ہے جو غلطی کر سکے؟

ہرچند ہمارا مسکن ہے گر متبسم مردکی! دا کچھ کم محبوب نہیں۔

ہرچند ہمارے صحرائے برگ و شجر ہیں لیکن اُس کے دامنوں میں نقرئی پاؤں رکھنے والے غزالانِ دشت اس طرح محو خرام ہیں گویا وہ شاہی محل کے فرش مرمریں پر چل رہے ہوں،

دنیا کی نگاہوں میں ایسی نظریں بھی ہیں، دنیا کی آوازوں میں ایسے لہجے بھی ہیں جو دلوں کے اندر مسرت بن کر تیر جاتے

ہیں۔ جب پہلی مرتبہ تیری چشم کرشمہ پرور مجھ پر جلوہ فگن ہوئی اور پہلی مرتبہ تیرے لبوں نے مسیحا طرازی کی تو ہر نظر اور ہر آواز مجھ تک ایسے ہی اثر میں ڈوبی ہوئی آئی، اور گو میرے لئے ان میں اس قدر اجنبیت تھی کہ میں نے انھیں کسی دوسرے ہی عالم سے منسوب کیا، لیکن ان کی پذیرائی میں نے اس طرح کی کہ گویا میں ان سے ہمیشہ کی واقف تھی۔

اس لئے اگر تیرا دل کسی اور شعلہ کا آشنا نہیں ہوا تو میرے ساتھ نکل چل۔ لیکن اگر میرے لئے تجھے اور کسی سے بیوفائی کرنا پڑے اور اس حور کو جس کی تو نے پرستش کی ہے چھوڑ دینا پڑے تو مجھے رخصت کر دے، کیونکہ اس صورت میں مجھے اپنا مسکن کسی یخ بستہ جھیل پر بنا لینا قابل ترجیح ہوگا۔

اس نغمہ میں وہ سوز و گداز تھا کہ نغمانہ کے اثر فن کے بغیر بھی سلیم کے دل سوزاں میں گھر کر لیتا، اس کا ہر تنفس اور ہر ترانہ وہ چیز تھی جس سے دنیا کے ہونٹھ اور ساز محروم تھے، اس کے تاروں کی ہر لرزش اور گیت کے ہر بول میں نغمہ و موسیقی کی دیوی کی روح شامل تھی۔ "وہ کیا تھا" یہ نہیں بتایا جا سکتا مگر یہ کہ "وہ سب کچھ تھا" بالکل مسلم ہے۔

(۶)

جہانگیر ہوش میں آکر سنبھلتا ہے، اور لبریز ساغر کو جو ابتدائے نغمہ و ترنم سے اس کے ہاتھ میں تھا اور ہونٹوں تک نہ جا سکا تھا زمین پر دے مارتا ہے اور اس نئی مطربہ کو جس کا نام اس وقت تک کوئی نہ جانتا تھا، اس نئی مغنیہ کو جسے اس وقت کوئی نہ پہچانتا تھا بے اختیارانہ پکارتا ہے "نور محل، آ، میری نور محل" یہ سحر طراز نغمہ اگر تو نے مجھے پہلے سے سنایا ہوتا تو میں اسی وقت تیرے قصور سے چشم پوشی کرتا اور تیری آنکھوں کے سامنے سے پھر کبھی علیحدہ نہ ہوتا۔

نقاب الٹ جاتا ہے، سحر اپنا کام کر چکتا ہے اور سلیم، نور جہاں کو اپنی نور محل کو اپنی آغوش میں چھپا لیتا ہے۔ احساس رنجش زائل ہو جانے کے باعث اس کی آنکھوں میں ہر نگاہ حسن و دلفریبی سے مملو تر اور خوبی و دلربائی سے آباد تر ہے، اس کے ہونٹوں پر آ آکر کھیلنے والے تبسم کی ہر نمود زیادہ دلنشین ہے اور اس کی آہیں نکہت مسرت سے مالا مال ہیں۔ اس کا چہرہ جہانگیر کے شانے پر استراحت پذیر ہے اور وہ اپنی خندہ بار آنکھوں سے دیکھتی ہے اور کہتی ہے "میرے محبوب آقا بھول نہ جائیے کہ آج جشن شگوفہ ہے"

(ل۔ احمد)

ظریف شاعروں کا تذکرہ

تقریباً نصف چھپ چکا ہے باقی نصف بھی انشاء اللہ بہت جلد طیار ہو گا۔ اس لئے جن حضرات کا روپیہ وصول ہو چکا ہے وہ مطمئن رہیں جس وقت یہ کتاب چھپ گئی فوراً ارسال خدمت ہو گی۔ "منیجر نگار"

علومِ اسلامی پر اک مؤرّخانہ نظر

علومِ عرب قبل اسلام

ہر چند میر برگستال (مشہور جرمن مستشرق) کا یہ قول بڑی حد تک صحیح ہے کہ عرب اور عربی لٹریچر کی صحیح تاریخ اسوقت سے شروع ہوتی ہے، جب وہاں آفتاب رسالت طلوع ہوا، لیکن مطلقاً اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قبل عہدِ اسلام، عرب میں کسی علم کا رواج ہی نہ تھا اور "زمانہ جاہلیت" علمی نقطہ نظر سے بالکل تاریکی و ظلمت کا زمانہ تھا۔

علامہ شہرستانی نے اپنی مشہور تصنیف "الملل والنحل" میں لکھا ہے کہ قبلِ اسلام، عرب میں خصوصیت کے ساتھ چار علوم کا زیادہ رواج تھا:- (۱) علم الانساب (۲) تاریخ (۳) تعبیر الرویا اور (۴) علم النجوم

شاہانِ حیرہ و غسان نہ صرف علوم و فنون کی قدر کرتے تھے بلکہ وہ خود بھی شعر کہتے تھے اور ان میں بعض اچھے شاعر تھے۔

منذر، اپنی سیاسی ذہانت کی وجہ سے تاریخ میں بہت نمایاں نظر آتا ہے اور اس کے بیٹے عمرو کے دربار میں المتلمس اور طرفہ دو مشہور شاعر رہا کرتے تھے، جن میں سے موخر الذکر معلقات میں سے ایک قصیدہ کا مصنف تھا۔ منذر کے جانشین، نعمان نے جس سیر چشمی سے نابغہ اور لبید شعراء کی قدر کی وہ تاریخ کا روشن واقعہ ہے۔

بنو غسان کا آخری بادشاہ، جبلہ ابن الایہم، جو خلیفہ ثانی کے عہد تک زندہ رہا، اپنے عہد کا مشہور شاعر تھا اور فرمانروایانِ عرب کی صف میں امراء القیس کو جو مرتبہ شاعری کے لحاظ سے نصیب ہوا، اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آج دنیا میں وہ شاعر ہی کی حیثیت سے مشہور ہے اور بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ حیرہ کا تاجدار بھی تھا۔

حیرہ کی تاریخ اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا، کہ فن تحریر کو رواج دینے میں یہی رہنمائے اولین تھا، کیونکہ اہل حجاز نے اس فن کو حیرہ یا انبار ہی سے حاصل کیا تھا۔ اور پھر جب ایک صدی بعد خلیفہ ثانی کے عہد میں کوفہ کی بنیاد قایم ہوئی، تو یہ فن وہاں بھی رائج ہوگیا۔ جسے آج بھی کوفی خط سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس سے قبل اس مسئلہ میں اختلاف تھا کہ عربوں میں فن تحریر کا رواج کب ہوا اور بعض لوگ اسکی قدامت ثابت کرنے میں بہت مبالغہ سے کام لیتے تھے، لیکن اب یہ واقعہ پایۂ ثبوت کو پہونچ گیا ہے کہ قدیم ترین عربی تحریریں وہ ہیں، جو عہدِ رسالت سے ایک صدی قبل لکھی گئی تھیں۔ اس سے پہلے کسی تحریر کا پایا جانا یا اس فن کا رائج ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ قبل اسلام کی جو تحریریں پائی گئی ہیں، ان میں قصاید کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہیں۔ جو

اظہار تفاخر میں ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کے سامنے پڑھا کرتا تھا۔ اس لئے یہ امر بخوبی ثابت ہے کہ عہد رسالت سے پہلے ایام جاہلیت میں، مذاق شعری، اعراب میں پوری طرح پایا جاتا تھا، اور سوسائٹی کا کوئی طبقہ ایسا نہ تھا، جو اس سے متاثر نہ ہو چنانچہ قبیلۂ ہذیل کی نظموں کا مجموعہ یا حماسہ وغیرہ کافی شہادت اس امر کی ہے۔

علم الانساب بھی حسب بیان شہرستانی، ان میں رائج تھا، لیکن جہاں تک معلوم ہے اس کی طرف پوری توجہ حضرت عمر کے عہد سے ہوئی، جب مجاہدین کی تنخواہیں مقرر کرنے کے لئے اسم نویسی کی ضرورت لاحق ہوئی۔ اس سلسلہ میں بلاذری کی انساب الاشراف، خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے

علاوہ شاعری اور علم الانساب کے، اہل عرب میں، قبل ظہور اسلام قصہ گوئی کا بھی کافی ذوق پایا جاتا تھا چنانچہ ابو عبیدہ عہد جاہلیت کے مشہور اور بے نظیر داستان گو سمجھے جاتے تھے۔

عہد رسالت و خلفائے راشدین

جب آنحضرت نے تبلیغ اسلام شروع کی، تو جن مصائب کا سامنا آپ کو کرنا پڑا، وہ سب پر ظاہر ہے اور ایسی صورت میں جبکہ لاکھوں افکار آپ کے پیش نظر تھے علوم و فنون کی طرف کوئی توجہ نہ ہو سکتی تھی، تاہم جب آپ کے پیش نظر کوئی ایسا موقع آیا، تو آپ نے ضرور فائدہ اٹھایا چنانچہ آپ نے بدر کے قیدیوں کو صرف اس شرط پر رہا کر دیا کہ وہ لوگوں کو لکھنا سکھائیں۔ پھر اس کے ساتھ اگر رسول اللہ کی احادیث کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ آپ نے کن کن طریقوں سے لوگوں کو علوم و فنون سیکھنے کی طرف رغبت دلائی ہے رسول اللہ کے بعد خلیفہ اول کا عہد شروع ہوا، لیکن افسوس ہے کہ وہ بہت کم رہا۔ خلیفہ دوم نے نسبتاً طویل زمانہ پایا لیکن آپ کو حکومت اسلام کی بنیاد ہی استوار کرنے سے فرصت نہ ملی تھی کہ قدرت نے اس عجیب و غریب ہستی کو اپنے پاس بلا لیا۔ خلیفہ ثالث کا عہد بیشک طویل تھا، لیکن آپ کی صداقت اور نیکی سے لوگوں نے اسقدر ناجائز فائدہ اٹھایا کہ آخرکار اندرون ملک میں انتشار و افتراق کی آگ مشتعل ہو گئی، جس کی چنگاریاں صدیوں بعد تک تمام اکناف عالم میں اڑتی رہیں۔ خلیفہ چہارم نے باوجود اس کے کہ درجہ بدامنی کی حالت میں عنان خلافت ہاتھ میں لی، اور حکومت اسلام کے دو حصے آپ کے عہد ہی میں ہو گئے، تاہم آپ علم کی طرف سے غافل نہیں رہے اور آپ ہی کے اشارے سے، الاسود الدؤلی نے زبان عربی کو صحیح لکھنے اور صحیح بولنے کے قواعد مرتب کئے۔ اس کے بعد خلیل نے علم عروض کے قواعد مرتب کئے اور آخرکار بصرہ و کوفہ مسلمانوں کی ادبی تحریکات کا مرکز ہو کر رہ گئے۔ جن سے کسائی اور سیبویہ کی مشہور ہستیوں کو کبھی جدا نہیں کیا جا سکتا۔

عہد بنی امیہ

عہد بنی امیہ کے ساتھ ہی حکومت اسلام کا رنگ بدل گیا اور یہ اک تاریخی حقیقت ہے کہ وہ مذہبی حکومت، جو خلفائے راشدین کے عہد میں پائی جاتی تھی، مفقود ہو گئی اور اس کے بجائے دنیاوی جاہ و جلال کے مناظر ہر طرف نمودار ہونے لگے، لیکن اسی کے ساتھ یہ کہنا کہ بنو امیہ نے ترقی تعلیم و تہذیب کی طرف توجہ نہیں کی حقیقتاً انصاف کا خون کرنا ہے اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ "اسپرٹ آف اسلام" کے مصنف نے کیونکر ایسا غلط الزام بنو امیہ

لگا کر اپنی عصبیت کو اس بری طرح سے ظاہر کر دینا پسند کیا۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ خاندان بنی امیہ کے بعض افراد (مثلاً ولید ثانی، یزید ثالث اور مروان ثانی) ایسے تھے جن پر یہ الزام عاید ہو سکتا ہے لیکن کیسا صریح ظلم ہے کہ ان بعض افراد کے حال پر قیاس کر کے سارے خاندان بنی امیہ کی نسبت تو یہ حکم لگا دیا جاتا ہے لیکن خاندان بنی عباس میں (جس کی علم پروری کے افسانے اسقدر مشہور ہیں) مستنجد اور مقتدر کے واقعات کو پیش نظر رکھکر سارے خاندان عباسیہ کو علم و تہذیب کا دشمن قرار نہیں دیا جاتا۔

امیر معاویہ، جو خاندان بنی امیہ کے مؤسس اولین ہیں۔ ان کی نسبت خواہ کوئی کچھ ہی کیوں نہ کہے، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ بڑے دل والے اور حریم آدمی تھے۔ آپ نے اپنی رعایا کے ساتھ جس سلوک کو روا رکھا اگر اسکو بازنطائن فرمانروایان کے طرز عمل کے ساتھ ساتھ ملا کر دیکھا جائے، تو معلوم ہو سکتا ہے کہ امیر معاویہ کس قدر فراخ دل رکھتے تھے۔ دنیا کو معلوم ہے کہ آپ ہی نے ایک مسیحی طبیب ابن اثال کو اپنے دربار میں بلا کر حکم دیا تھا کہ طب کی کتابیں، عربی میں ترجمہ کرے اور آپ ہی نے عابد کو صنعاء سے طلب کر کے مجبور کیا تھا کہ وہ شاہان یمن کی تاریخ کو ایک جگہ کتابی صورت میں محفوظ کر دے۔

امیر معاویہ کا بیٹا اور جانشین، یزید بھی اچھا شاعر تھا، وہ شعرا کی قدر کیا کرتا تھا اور خالد ابن یزید کو تو علوم کی طرف خاص شغف تھا چنانچہ اس نے متعدد آدمی متعین کئے تھے کہ وہ مختلف کتابیں عربی زبان میں منتقل کریں اور اگر ابن ندیم اور ابن ابی اصیبعہ کی روایت پر اعتماد کیا جائے، تو خالد کے اکتسابات علمیہ کا درجہ بہت بلند نظر آتا ہے۔

عمر ابن عبد العزیز، مصر کے گورنر ہی تھے کہ یونانی علوم کی طرف آپ کو توجہ ہوئی، چنانچہ ابن ابجر سے جو اسکندریہ میں یونان کے علوم فلسفیہ کا بہت بڑا ماہر تھا، آپ نے ملاقات پیدا کی اور یہ مراسم اس حد تک مستحکم ہوئے کہ جب آپ خلیفہ ہوئے تو ابن ابجر کو سارے محکمہ حفظان صحت کا منتظم بنا دیا۔

ابن ابی اصیبعہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہی کے عہد میں یونان کے بہت سے علوم و فنون مصر سے انطاکیہ اور حران میں منتقل ہوئے اور وہاں سے دیگر بلاد اسلامی میں۔

ہشام بن عبد الملک، اعلیٰ درجہ کا محارب ہونے کے ساتھ ہی جیسا قابل و فاضل خلیفہ تھا، وہ تاریخ کا روشن واقعہ ہے۔ اسکا وزیر یا کاتب خصوصی وہی سالم تھا جو اپنے عہد کا بڑا مشہور زباندان تسلیم کیا جاتا تھا اور جس نے ارسطاطالیس کی متعدد کتابوں کو عربی زبان میں منتقل کیا۔ سالم کے بیٹے جبلہ نے بھی متعدد تاریخی کتابیں فارسی سے عربی میں ترجمہ کیں۔

ابن ندیم نے بیان کیا ہے کہ اکاسرۂ عجم کا جو علمی خزانہ مسلمانوں کے ہاتھ آیا تھا، اس میں ایک تاریخ ایران بھی تھی جو نہایت بسیط و مفصل ہونے کے علاوہ مصور بھی تھی چنانچہ خلیفہ ہشام نے ۱۱۳ھ میں اسکا ترجمہ عربی میں کرایا۔ جسے مسعودی نے خود بمقام اصطخر ۳۰۳ھ میں دیکھا تھا۔

عبد القاسم حماد، جس کے حافظہ کا یہ عالم تھا کہ اس نے ایک بار ایک نشست میں ۲۹۰۰ قصیدے شعراء جاہلیت کے سنائے،

ولید ابن عبد الملک اور ہشام ہی کے دربار کا شخص تھا۔ اور اگر انصاف سے کام لیا جائے، تو اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ انہیں خلفاء کی کوشش تھی جس نے قدیم شعراء کے کلام کو محفوظ رکھا ورنہ آج ایک لفظ بھی عہد قدیم کے لٹریچر کا نظر نہ آتا۔

ہرچند ہشام کے ساتھ عہد بنی امیہ کے عروج کا بھی خاتمہ ہوگیا، تاہم اسوقت تک جو کچھ ہوچکا تھا وہ بھی کم نہ تھا اور حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ بنیاد تھی جسپر بعد کو بنو عباس نے اپنی عمارت قایم کی اور اگر اسی کے ساتھ اسپین کی اموی خلافت قرطبہ پر لحاظ کیا جائے جس نے قرون وسطیٰ میں اپنے علم و تہذیب کے کارناموں سے دنیا کو متحیر کردیا، تو شاید خاندان بنی امیہ کے احسانات علمیہ کا کوئی استقصار ہو ہی نہیں سکتا۔

عہد بنی عباس

جب بنو عباس کا عہد شروع ہوا، تو انہوں نے عہد بنی امیہ کے علمی باقیات الصالحات کو نہ صرف محفوظ رکھا، بلکہ اس میں ترقی پیدا کرنے کی کوشش تام کی، چونکہ حکومت بنی عباس کے اصول بنو امیہ سے الگ تھے اور انکے امیال و عواطف زیادہ تر عجمی عنصر سے متعلق تھے اسلئے انکی کوششیں بھی جدا تھیں اور علمی مساعی کے حدود بھی بنو امیہ سے ذرا مختلف تھے۔

اس زمانہ میں نہ صرف تاریخ پر توجہ کی گئی، بلکہ علم الفقہ، فلسفہ اور دیگر علوم عقلیہ کی طرف بھی کافی اعتنا کیا گیا اور چونکہ اس عہد میں یونانی تہذیب کے ساتھ عجمی مذاق بھی مل گیا تھا، اس لئے انہوں نے شائستگی کی طرف نہایت سریع قدم اٹھایا لیکن اسی کے ساتھ انحطاط و زوال کے وہ جراثیم بھی پیدا ہوگئے جو دنیادی جاہ و جلال، مادی دولت و ثروت اور انسانی تہذیب و شائستگی کے اجزاء لازم ہیں، اور جنھوں نے آخرکار دولت عباسیہ کا شیرازہ منتشر کردینے میں کوئی دقیقہ کوشش کا فروگذاشت نہیں کیا۔

عرب میں یونانی علوم و فنون کا رواج تین ذرائع سے ہوا، اسکندر اعظم کے وقت سے دجلہ و فرات کے درمیان کا حصہ تمام تر یونانی تہذیب سے متاثر تھا۔ چنانچہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب شاہ اسپارٹا کے دربار میں کراسس کی موت کی خبر پہونچی تو اسوقت وہاں یوریدیس (یونان کا نہایت مشہور شاعر و ڈرامہ نگار) کا ایک ڈرامہ جو ٹریجڈی سے متعلق تھا، دیکھا جارہا تھا، اس کے بعد ۵۳۱ء میں ساسانی بادشاہ خسرو نوشیرواں نے خوزستان میں جندیشاپور کے مقام پر ایک اکیڈمی (مجلس علمیہ) قایم کی، جو ساسانی حکومت کے زوال کے بعد بھی تین صدی تک قایم رہی۔ یہاں یونانی طب و فلسفہ کی بھی تعلیم دیجاتی تھی۔

اس کے بعد شامیوں نے دوآبہ دجلہ و فرات میں عربوں کے اندر یونانی فلسفہ کا مذاق پیدا کیا اور یہ مذاق ان میں اس حد تک بڑھ گیا کہ مذہب عیسویت کے متعلق جو خیالات انہوں نے قایم کئے وہ بھی اس رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے اور اسطرح حکومت بازنطاین نے جو فائدہ اس سے اٹھایا وہ تاریخ کا کھلا ہوا واقعہ ہے۔

چونکہ حکومت بازنطاین کے زیر اثر، یونانی اور رومن حکماء سے اہل عرب کو تبادلۂ خیالات کا بہت موقع ملتا تھا، اس لئے وہ اقلیدس، افلاطون اور ارسطاطالیس کی کتابیں عام طور سے پڑھتے تھے اور ان سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ علاوہ اس کے انطاکیہ اور موصل کے درمیان شامی عیسائیوں کی جماعتیں خانقاہوں کے اندر یونانی کتابیں عربی میں منتقل کررہی تھیں، اور اسطرح علوم یونانی کے ساتھ ساتھ، مسیحی خیالات بھی آہستہ آہستہ عربوں میں پھیلتے جاتے تھے۔

حرّان کے رہنے والے (شام کی یہی جماعت ایسی تھی جو اپنے اصلی مذہب پر قایم رہی) بھی خاص ذریعہ ہیں جنسے عربوں نے یونانی تہذیب کو حاصل کیا، چونکہ اہل حرّان عربی زبان نہایت اچھی جانتے تھے اسلئے جو تراجم انکے ذریعہ سے ہوے وہ نہایت مکمل تھے۔

خاندانِ عباسیہ کے عروج کا بنیادی پتھر منصور نے رکھا اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے عہد میں زبان عربی کو بہت ترقی حاصل ہوئی، سیبویہ، کسائی، خلیل اسی عہد کے درخشندہ گوہر تھے اور اسی نے کسائی کو اپنے بیٹے مہدی کے تعلیم کے لئے بہ حیثیت اتالیق مقرر کیا تھا۔ اصمعی بھی اسی زمانہ میں ہوا ہے، جو اپنی قوت حافظہ کے لحاظ سے تاریخ عرب کی ایک نہایت ہی مشہور ہستی ہے۔

ذہبی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۴۳ھ میں علماء اسلام نے فقہ، حدیث اور تفسیر کی کتابیں مدوّن کرنا شروع کیں۔ چنانچہ ابن جریج مکہ میں اور امام مالک (صاحب موطّا) مدینہ میں، اوزاعی شام میں، ابن ابی عروبہ، حماد، ابو سلمہ بصرہ میں، معمر یمن میں، اور سفیان الثوری کوفہ میں مصروفِ تصنیف و تالیف تھے۔

جب سنہ ۱۴۸ھ میں خلیفہ منصور، بیمار ہوا اور اس کے دربار کے اطبار نے جواب دیدیا، تو اس نے جارج کو جو جندیشاپور کی مجلس علمیہ کا مہتمم تھا، طلب کیا اور اس کے علاج سے فائدہ ہوا۔ چنانچہ اسکے بعد سے دربار خلیفہ میں متعلقین اکیڈیمی کا اثر قایم ہوگیا اور بعد کو جارج کا پوتا (جبرئیل) ہارون الرشید کے دربار کا خاص طبیب مقرر کیا گیا۔

منصور کے عہد میں ایک اور شخص ابن مقفع بھی تھا، جو عربی اور فارسی کا بڑا زبردست ماہر تھا۔ اس نے کلیلہ دمنہ کا ترجمہ عربی زبان میں کرکے سب سے پہلے عربوں میں رومان کا مذاق پیدا کیا، جسکی ارتقائی صورت الف لیلیٰ نظر آتی ہے۔ ابن مقفع نے شاہنامہ کا ترجمہ بھی عربی میں کیا اور یہی وہ تصنیف تھی جو بعد کو شاہنامہ فردوسی کی بنیاد قرار پائی

معقولات کو، جن کی ابتدا حسن بصری سے ہوئی تھی، ابتداءِ عہد عباسیہ میں زیادہ ترقی حاصل ہوئی اور خلیفہ منصور نے غیر مذہب کی کتابوں کا بھی ترجمہ عربی میں کرایا، چنانچہ تعلیمات مانی کی کتابیں بھی اسی عہد میں ترجمہ کی گئیں۔ اسکے علاوہ سنسکرت کی کتابوں پر بھی توجہ کی گئی جنمیں سے ایک سدھنتا خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

اسمیں شک نہیں کہ اس وقت، معقولات کا رواج زیادہ ہوتا جاتا تھا، لیکن اس کے ساتھ منقولات کو بھی پس پشت نہیں ڈالا جا سکتا تھا اور انکا اثر اسقدر قایم تھا کہ مامون بھی خلق قرآن کے مسئلہ کو عام طور سے رائج نہ کر سکا۔

عہدِ عباسیہ کے ابتدائی دس سال کے اندر علم الفقہ شروع ہو کر مرتب ہوگیا، عہدِ منصور میں ابو حنیفہ، عہد ہارون میں مالک و شافعی اور عہدِ مامون میں احمد ابن حنبل وہ ہستیاں تھیں، جن سے آج بھی ہر مسلمان اچھی طرح واقف ہے۔ خلیفہ مہدی کا زمانہ چنداں قابل ذکر نہیں کیونکہ اس نے علوم عقلیہ کی سخت مخالفت کی، لیکن اس کے بعد ہارون نے اس کی بہت کچھ تلافی کردی۔

ہارون نے اک بیت الحکمۃ ہی صرف اس لئے قایم کیا تھا کہ وہاں نہ صرف پہلی کتابیں محفوظ رہیں بلکہ اور جدید تصانیف

مختلف علوم کی شایع کی جائیں۔ فضل ابن نوبخت کو فارسی کتابوں کا مہتمم بنایا گیا، اور وہ یونانی کتابیں جنہیں ہارون ایشائے کوچک کی طرف سے لایا تھا، یوحنا ابن ماسویہ کے سپرد کی گئیں۔ ہارون الرشید اپنے علم پروری کے لحاظ سے عجیب غریب خلیفہ گذرا ہے۔ سنئے ایک بار سفیان ابن عینیہ کو ایک لاکھ درم اور اسحاق موصلی کو دولاکھ درہم بطور علمی انعام کے دیدئے، اور یہی وہ خلیفہ تھا، جس نے مروان ابن ابی حفصہ کو صرف ایک نظم کے صلہ میں پانچہزار دینار، ایک خلعت زریں، ایک گھوڑا اور دس یونانی کنیزیں ایک وقت میں بخش دیں۔

الغرض اسکا دربار علما، شعرا، حکما، و فضلا کا مرکز تھا اور اس کی قدردانی علم کی شہرت تمام اطراف عالم میں پھیل گئی تھی، لیکن اسی کے ساتھ وہ معقولات و منقولات کی تطبیق کا سخت مخالف تھا۔

اس کے بعد جب مامون کا عہد آیا تو مذہبی آزادی زیادہ بڑھ گئی اور اس نے خلق قرآن کے مسئلہ کو خود پیش کرکے، علماء عصر کی تصدیق کرانی چاہی، جس میں وہ زیادہ کامیاب نہیں ہوا۔

مامون، لٹریچر، فلسفہ اور دیگر علوم و فنون کا بہت بڑا قدرشناس تھا اور اس کے عہد میں علوم اسلامی نے اسقدر ترقی کی کہ اس کی نظیر کسی اور بادشاہ کے عہد میں نہیں ملسکتی۔

چونکہ مامون کی ماں اور بیوی دونوں ایرانی النسل تھیں اور علاوہ اس کے اسکا ابتدائی زمانہ مرو میں بسر ہوا تھا، جہاں ایرانی تہذیب کے مناظر کثرت سے نظر آتے تھے، اسلئے اس کے عہد میں ایرانیوں کو بہت درخود حاصل ہوگیا اور اس نے اپنے تمدن کو ساسانی بادشاہوں کے انداز پر قایم رکھنا چاہا، جو بظاہر بہت خوش نما بات تھی، لیکن وہی آخر زوالِ خلافت کا باعث قرار پائی۔

ہارون الرشید کے عہد میں جو بیت الحکمۃ قایم ہوا تھا، اس کو مامون نے اور زیادہ ترقی دی اور اس نے قیصر روم کے پاس سے یونانی کتابیں منگوا کر عربی میں ان کا ترجمہ کرایا۔ حنین اور یعقوب کندی مخصوص طور پر یونانی کتابوں کا ترجمہ کرنے پر مامور تھے ان کے علمی کارنامے اس قدر ہیں کہ ان کے ظاہر کرنے کے لئے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے

مامون کو علم ہیئت و نجوم کی طرف بھی خاص رجحان تھا، چنانچہ اس کے اشارے سے یحییٰ ابن ابی منصور المامونی نے (الزیج الممتحن اور کتاب العمل کا مصنف ہے)، بغداد و دمشق کے قریب رصد گاہیں قایم کیں۔ لیکن مامون کی بے وقت موت کی وجہ سے یہ کام انجام کو نہ پہونچ سکا۔ محمد ابن موسیٰ بن شاکر کا زمین کی پیمایش کی طرف متوجہ ہونا بھی مامون ہی کے حکم سے ہوا تھا۔

مامون کے بعد المعتصم کا عہد شروع ہوا، جو ایک سپاہی مزاج خلیفہ تھا، اس لئے علوم و فنون کا وہ سیلاب جو مامون کے عہد میں رونما ہوا تھا، اس کے عہد میں رک گیا اور تقریباً دس سال تک اسی حالت میں رہا۔

جب ۲۲۷ھ میں واثق سریر آرائے خلافت ہوا تو پھر وہی علمی بیداری ہر جگہ نظر آنے لگی، جو عہدِ مامون میں پائی جاتی تھی۔

اس کے عہد میں بھی کثرت سے غیر زبانوں کی کتابیں عربی میں منتقل ہوئیں اور مذہبی آزادی بہت بڑھ گئی۔ یوحنا ابن ماسویہ اس کا دست راست ہو گیا اور بے شمار انعامات اس نے حاصل کئے۔ مسعودی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ واثق نے اس کو تین لاکھ درہم اٹھا کر دے دئے۔

اس کا جانشین، المتوکل ہر چند ایسا علم دوست نہیں تھا، تاہم ترجمہ و تالیف کا کام اس کے زمانہ میں بھی جاری رہا۔ متوکل کے بعد خاندان عباسیہ کا زوال شروع ہو گیا لیکن اب بھی کچھ نہ کچھ سلسلہ علوم و فنون کا جاری رہا، یہاں تک کہ شروع سے لیکر زوال خلافت عباسیہ تک بغداد کی سرزمین جو کچھ ہو گیا وہ اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ اگر اس کی تفصیل بیان کیجائے تو ایک مستقل تصنیف مرتب ہو سکتی ہے۔

اسی سلسلہ میں ہم یہاں یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ خلافت بنی عباس کی تاریخ پانچ دوروں میں تقسیم ہوتی ہے۔ اس کا بہترین زمانہ جسے عہد زریں کہنا چاہئیے، مامون پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد دوسرا دور وہ جب جماعت اتراک کو زور حاصل ہو گیا۔ یہ زمانہ ۳۳۴ھ تک قائم رہا۔ تیسرا دور بویہی خاندان کے اثر و اقتدار کا تھا، چوتھا سلاجقہ کی قوت کا اور پانچواں وہ جب انحطاط کی آخری منازل شروع ہوئیں اور آخر کار مغلوں نے آکر بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔

ہر چند ۲۳۲ھ کے بعد سے ۶۵۶ھ تک کا زمانہ انتشار و انشقاق کا ہی تھا اور بہت سی چھوٹی چھوٹی اسلامی حکومتیں قائم ہو کر وہ مرکزی اقتدار جاتا رہا تھا جو مامون کے عہد تک پایا جاتا تھا، تاہم علم دوستی کا وہ مذاق جو اس سے قبل پیدا ہو چکا تھا مفقود نہیں ہوا اور جہاں جہاں اسلامی حکومتیں قائم ہوئیں وہیں علوم و فنون کی قدر کی گئی۔

اسلئے اگر آپ خلافت عباسیہ کے سارے عہد کو پیش نظر رکھ کر (جس میں تمام چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں بھی شامل ہیں) صرف یہ معلوم کرنا چاہیں کہ اس تمام زمانہ میں کتنے علما گذرے ہیں تو ان کی صحیح تعداد بھی نہیں معلوم ہو سکتی لیکن اگر صرف مشاہیر و اکابر ہی کو لیا جائے تو ان کی فہرست مرتب کرنے کے لئے بھی ایک دفتر درکار ہے۔

فارابی، ابوبکر الرازی، ابو بشر، بو علی سینا، ابن رشید، غزالی، فخر الدین رازی وغیرہ بہت سی ایسی مشہور ہستیاں ہیں جو اس عہد میں رونما ہوئیں اور اپنے نقوش صفحات تاریخ پر ہمیشہ کے لئے ثبت کر گئیں۔

فارابی ترکستان میں پیدا ہوئے اور مختلف زبانیں انھوں نے حاصل کیں۔ جس وقت یہ بغداد گئے تو ابو بشر کے خطبات فلسفہ میں شریک ہوئے اور اس کے بعد حران جا کر، ابو یوحنا ابن خیلان سے فلسفہ مسیحیت سیکھا، جب وہ بغداد واپس آئے تو یہاں خود فلسفہ کی تعلیم لوگوں کو دینے لگے۔ ان کو تفلسف کی طرف اس قدر رجحان تھا کہ انھوں نے ارسطاطالیس کی بعض بعض کتابیں چالیس چالیس مرتبہ پڑھیں اور پھر بھی اپنی عمر کی طرف سے بیوفائی کی شکایت لے گئے۔

ان کی بہت سی تصانیف، جو ان کی شہرت کا باعث ہوئیں، بغداد ہی میں لکھی گئی تھیں۔ اس کے بعد یہ دمشق چلے گئے اور وہاں سے مصر، مصر سے واپس آنے کے بعد وہ سیدھے شام آئے اور اس جماعت علما میں داخل ہو گئے جو سیف الدولہ حاکم حلب کے دربار میں پائی جاتی تھی۔ سیف الدولہ بڑا علم دوست شخص تھا، اس نے ان کی بہت قدر کی اور جب دمشق گیا تو انہیں بھی اپنے ساتھ لے گیا۔

ابو بشر منطق میں فارابی کا استاد تھا۔ یہ عیسائی تھا اور بغداد اسکا مسقط الراس تھا۔ منطق میں اسکو بڑا تبحر حاصل تھا اور اسی علم کی خدمت کرتے کرتے اسنے اپنی عمر تمام کر دی۔ طبقات الحکماء میں اسکے تصانیف کی ایک طویل فہرست موجود ہے۔

ابوبکر الرازی، خلیفہ مقتدر کے دربار کا طبیب خاص تھا۔ اسنے چیچک پر ایک عجیب و غریب رسالہ لکھا جو اب ولایت میں معہ ترجمہ و حواشی کے شائع بھی ہو چکا ہے۔

سامانی فرمانروا، منصور ابن نوح نے بھی اس کی سرپرستی کی تھی جس کے لئے اس نے ایک رسالہ طب پر المنصوری کے نام سے تحریر کیا تھا۔

حکمت عملی کے سلسلہ میں حسن ابن حسین، ابوالوفاء اور ابن یونس خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں اور حکمت نظری کے لحاظ سے غزالی اور فخر الدین رازی اپنے عہد کے بےنظیر علماء میں سے تھے۔ غزالی نے نظام الملک طوسی کی سرپرستی میں ترقی کی اور اقتدار شہرت حاصل کر لی کہ خود ان کے استاد بوعلی سینا کو بھی نصیب نہ ہوئی تھی۔

ہر چند خلفاء عباسیہ کا سیاسی اقتدار، امتداد زمانہ کے ساتھ کم ہوتا جاتا تھا اور اس کے ساتھ علمی ذوق و شوق میں انحطاط ہو رہا تھا (یہاں تک کہ الراضی باللہ آخری خلیفہ تھا جس نے ممبر پر کھڑے ہو کر قابل ذکر خطبہ دیا اور اپنے دربار و نظام حکومت کے لحاظ سے فی الجملہ خلیفہ کہا جا سکتا تھا) تاہم یہ عجیب و غریب بات ہے کہ خلافت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کے بعد بھی مختلف خود مختار اسلامی حکومتوں نے علم و حکمت کی قدردانی کو ترک نہیں کیا۔

اسد الدولہ نے علوم و فنون کی ترقی میں جس قدر حصہ لیا وہ اس سے ظاہر ہے کہ عبدالرحمن مشہور ماہر علم ہیئت اسکے دربار کا جوہر تابندہ تھا۔ اسی طرح المنصور سامانی، سیف الدولہ حمادی نے فارابی کی سرپرستی کر کے اپنی فضل شناسی کا جو ثبوت پیش کیا وہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ نظام الملک طوسی (الپ ارسلان اور ملک شاہ کے وزیر) سے کون واقف نہیں ہے کہ اس نے کیسے کیسے اہل کمال کو یکجا کر دیا تھا اور سب جانتے ہیں کہ صلاح الدین کی صحبت میں ہمیشہ بہاؤ الدین، قاضی الفضل اور عماد الدین کاتب ایسے نفوس رہا کرتے تھے۔

کوئی اسلامی حکومت ایسی نہ تھی جہاں کتب خانے اور دار العلوم کثرت سے قائم نہ ہوئے ہوں اور ہر حکومت دوسری حکومت سے اس مسئلہ میں بڑھ جانے کی کوشش نہ کرتی ہو۔

بصرہ، کوفہ، بغداد، دمشق، مصر اور سارے عجم میں گھر گھر علم کا چرچا تھا۔ مسجدیں اور خانقاہیں اہل کمال کے فاضلانہ خطبات سے گونجا کرتی تھیں اور ممالک اسلامی کے ایک ذرہ ذرہ سے علم و فضل کا دریا ابل رہا تھا۔

کیا بصرہ کی تاریخ، واصل بن عطاء اور جماعت اخوان الصفاء کو کبھی فراموش کر سکتی ہے؟ کیا وہاں کی مسجدیں اس روایت کو کبھی فراموش کر سکتی ہیں کہ علم و ادب، فلسفہ و ریاضی، ہیئت و نجوم کے کیسے کیسے اہم مسائل انہیں کی چاند یاریوں کے اندر حل ہوتے تھے؟ کیا قدیم قاہرہ، جامع الازہر پر بجا طور سے فخر نہیں کر سکتا جہاں سے ہزاروں ہستیاں فضل و کمال کا بہترین طرۂ امتیاز حاصل کر کے باہر نکلیں؟

کیا مسجد دمشق اُن واقعات کو بھول سکتی ہے کہ ابن ہشام المخزومی، روزانہ وہاں علمی مباحث جاری رکھتے تھے؟ کیا کوفہ کی مسجد سلمی کے ان دروس قرآنی کو بھول جائے گی جن سے روزانہ اس کے در و دیوار گونجا کرتے تھے؟ اور کیا کوئی شخص، دارالعلوم نظامیہ اور مستنصریہ کو کبھی فراموش کرسکتا ہے؟ یہ حال تھا خاص خاص درسگاہوں کا ورنہ یوں تو ممالک اسلامی میں اسقدر کثرت سے مدارس طیار ہوئے کہ آج کوئی انکا شمار بھی نہیں کرسکتا پھر اس کے ساتھ جب آپ اس حقیقت پر غور کریں گے کہ شوق علمی صرف مردوں میں نہ تھا بلکہ عورتیں بھی اس میں حصہ لاتھیں، تو آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ علمی لہریں ممالک اسلامی کے مخفی ترین گوشوں میں دوڑ گئی تھیں اور کوئی جگہ ایسی نہ تھی جو ان سے فیضیاب نہ ہو۔

ازرآویہ کا دارالحکمت، نورالدولہ کی بیٹی ہی نے قایم کیا تھا اور دمشق میں بھی دو اکیڈمی ایک خاتون ہی نے قایم کی تھیں جسکا نام ست الشم تھا۔

حکومت مصر | مصر میں، فاطمین اور فرمانروایان ملوک نے بھی خاندان عباسیہ سے کم علم کی قدردانی نہیں کی۔ علامہ سیوطی نے حسن المحاضرہ میں تفصیل کے ساتھ اس عہد کے علمی کارناموں کا ذکر کیا ہے۔ المعز اور اسکے بعد تین فرمانرواؤں نے ترقی علم و تہذیب کے لئے اپنی پوری کوششیں صرف کیں اور بعض اوقات تو خلفاء فاطمین کی مساعی اس باب میں خلفاء عباسیہ سے بھی سبقت لے گئیں۔ چنانچہ الحاکم بامر اللہ کا قایم کردہ دارالحکمۃ، تمام اسلامی ممالک کے مدارس سے زیادہ وسیع تھا۔

حکومت اسپین | اسپین کی حکومت اسلام پر جب آپ مورخانہ نگاہ ڈالیں گے، تو یہاں بھی آپکو عجیب و غریب علمی مناظر آئینگے اور آپکو حیرت ہوگی کہ کیونکر ایسے دور و دراز ملک میں ہوکر مسلمانوں نے اس قدر ترقی کرلی اور کسطرح نہیں مسیحی دشمنوں کے درمیان رہکر اسقدر فرصت نصیب ہوئی کہ علوم و فنون کو بھی اپنے ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

اسپین کا مشہور مصنف، ابن سعید لکھتا ہے کہ "قواعد اور علم بیان و معانی میں، اندلس والونکو اسقدر انہاک تھا، کہ انہوں نے خلیل اور سیبویہ کے عہد کو بھی شرما دیا" پھر اسی کے ساتھ دیگر فنون میں بھی انہوں نے کم ترقی نہیں کی۔

ابن زہر کی کتاب التیسیر (جو علم طب کی بے مثل کتاب ہے اور جسکا ترجمہ اب یورپ کی تمام زبانوں میں ہوچکا ہے) الزہراوی کی تصنیف فن تشریح پر، یحیی کی کتاب علم الادویہ پر، دولت ہسپانیہ کے عہد حکومت کے خاص کارنامے ہیں۔

حکم ثانی کے زمانہ کو دیکھئے تو معلوم ہوسکتا ہے کہ اسوقت علم کا کیسا چرچا تھا۔ یہ کتابوں کا حد درجہ شایق تھا اور اس نے تمام ممالک مشرق میں آدمی بھیج بھیجکر اسقدر نادر نسخے فراہم کئے تھے، کہ اُن کی فہرست صرف چالیس جلدوں میں مرتب ہوئی تھی۔ ابن باجہ اور ابن رشد اسی کے عہد میں رونما ہوئے جنکے علمی کارنامے بیان کرنے کے لئے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے۔

اسپین کے مسلم عہد حکومت کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ عورتیں حد درجہ مہذب و شائستہ ہوگئی تھیں۔ ولادہ (المستکفی کی بیٹی) اپنے عہد کی بڑی زبردست شاعرہ تھی اور علم بیان و معانی میں اپنا نظیر نہ رکھتی تھی، اسیطرح عائشہ (شاہزادہ احمد کی

بیٹی) اس قدر فاضل تھی کہ اس کے خطبات، قرطبہ کے دار العلوم میں پڑھے جاتے تھے اور لوگ ان سے فصاحت و بلاغت کا درس لیا کرتے تھے۔ یہ حال طبقہ امراء کی عورتوں کا تھا لیکن معمولی طبقہ بھی اس سے محروم نہیں تھا۔ چنانچہ لبنیٰ، قرطبہ کے ایک معمولی خاندان کی لڑکی تھی، لیکن ادب و فلسفہ میں مشکل سے کوئی مرد بھی اس کے سامنے بروئے کار آسکتا تھا۔ اور خلیفہ مستنصر نے اس کے انہیں اکتسابات بلند کو دیکھ کر اپنے پرائیوٹ سکریٹری کی جگہ دیدی تھی، جو اس سے قبل و بعد کبھی کسی عورت کو نصیب نہیں ہوئی۔ اسی طرح ایک خاتون، مریم (یعقوب الانصاری کی لڑکی) تھی جو ادب و شعر کی تعلیم لوگوں کو دیا کرتی تھی۔

تاریخ سے ثابت ہے کہ ہسپانیہ میں، اس وقت ستر کتب خانے موجود تھے۔ اس سے نہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہاں کے مسلمان فرمانرواؤں کو علم کا بہت ذوق تھا، بلکہ اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ مذاق علم وہاں پبلک میں بھی عام ہو گیا تھا۔ یہ تھا اک ناتمام تبصرہ مسلمانوں کے مذاق علمی کا جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ان کے کارنامے کیا کیا تھے اور شاہانِ اسلام کی سرپرستی میں کیسے کیسے لوگ پیدا ہوئے اور علوم و فنون کا کیسا معتدبہ ذخیرہ فراہم ہو گیا۔

حاجی خلیفہ نے بارہ سو صرف تاریخی کتابوں کے نام اپنی فہرست میں درج کئے ہیں اور اس میں وہ کتابیں شامل نہیں ہیں جنکا پتہ اسے نہیں مل سکا۔

مورخ ابن ہشام سے لے کر (جو خلیفہ منصور کے عہد میں پائے جاتے تھے) ابن خلدون کے زمانہ تک (جو تیمور کا ہم عصر تھا) جتنی تاریخی کتابیں مدوّن ہوئی ہیں، اگر آج وہ سب دستیاب ہو جائیں تو کئی کتب خانے صرف تاریخ کی کتابوں سے بھر سکتے ہیں۔ تمام مورخین میں سے آج ہمیں صرف طبری، ابن اثیر، مسعودی، بلاذری، ابن قتیبہ، خلدون، ابن خلکان وغیرہ کے چند نام معلوم ہیں۔ اور نہیں کہہ سکتے کہ اور کتنے تھے جن کے کارنامے آج دنیا کے سامنے موجود نہیں۔

اسی طرح فن جغرافیہ میں ہمیں ابن خورداذبہ، قدامہ، مقدسی، یاقوت، ابو الفدا وغیرہ سے اور دیگر علوم میں بھی صرف مخصوص افراد سے آگاہی حاصل ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص صرف علوم اسلامی کی مفصل تاریخ لکھنے بیٹھے، تو باوجود اس کے کہ لاکھوں کتابیں مفقود ہو گئیں ہیں، ہزاروں مصنفین کے نام دماغوں سے محو ہو گئے ہیں، اپنی پوری عمر صرف کرنے کے بعد بھی وہ اس فرض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔

نیاز

علم ہیئت میں حرارت کی اہمیت

جس وقت ہم حرکاتِ اجرام، قانونِ کیپلر، گردشِ اقمار وغیرہ کے متعلق بحث کرتے ہیں تو قدرتی طور پر ہمارا ذہن یہ فرض کر لیتا ہے کہ تمام اجرامِ فلکی سخت اور منجمد اجسام ہیں اور ان کا سرد یا گرم ہونا گردش سے زیادہ تعلق نہیں رکھتا۔ اس میں شک نہیں کہ نظامِ شمسی کے تمام اجرام، خواہ وہ گرم ہوں یا سرد، باقاعدہ طور پر ایک زمانۂ غیر متعین سے لے کر اسوقت تک گردش کر رہے ہیں، اور بظاہر مسئلہ حرارت، علم الہیئت کے قوانین و مفروضات پر اثر پذیر نہیں ہوتا۔ لیکن اگر نظرِ غائر سے کام لیا جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ حرارت کے اثرات نظامِ شمسی میں بڑے بڑے تغیرات پیدا کر چکے ہیں۔ و نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ اس نظام پر کس صورت سے موثر ہونگے۔ سب سے پہلے کرۂ ارض کو دیکھئے کہ بظاہر ایک ٹھوس اور سرد جسم معلوم ہوتا ہے، لیکن چشمِ حقیقت بیں آگاہ ہے کہ آتش فشاں پہاڑ، گرم پانی کے فوارے، کھولتے ہوئے چشمے جو مختلف مقامات میں کثرت سے پائے جاتے ہیں، اس امر کا کافی ثبوت پیش کرتے ہیں کہ زمین کے اندر بہت گرمی پائی جاتی ہے، اگر ہم ایک تھرما میٹر لیکر کسی معدن میں چلے جائیں، تو معلوم ہوگا کہ ہم جس قدر زیادہ گہرائی میں پہونچتے ہیں اسی قدر درجۂ حرارت بڑھتا جاتا ہے، حتیٰ کہ اگر ہم بیس میل کی گہرائی تک پہونچنے پر قادر ہوں تو وہاں اتنی حرارت ہوگی جتنی کہ تپائے ہوئے لوہے میں پائی جاتی ہے۔

الغرض تمام اجرامِ فلکی میں موجودہ اور گذشتہ حرارت کا کافی ثبوت پایا جاتا ہے۔ چاند کے دیکھنے سے ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ کسی وقت اسمیں حرارت بہت زیادہ پائی جاتی تھی، کیونکہ اسکی سطح پر کثرت سے بڑے بڑے آتش فشاں پہاڑ پائے جاتے ہیں جو اب زمانۂ دراز سے خاموش ہیں، اسی طرح مشتری اور زحل میں دوربینی مشاہدے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں زمین کی نسبت بدرجہا حرارت زیادہ پائی جاتی ہے اور آفتاب میں اسقدر اشتعال پایا جاتا ہے کہ اسکا اندازہ کرنا مشکل ہے، علاوہ سیاروں کے بہت سے ثوابت ایسے ہیں جو آفتاب کی طرح حالتِ اشتعال میں نظر آتے ہیں اور اگر ان اجرام کا ذکر کیا جائے جو بخاری حالت میں ہیں تو حرارت کے کرشموں کا بغیر کسی مزید ثبوت کے قائل ہونا پڑتا ہے۔

اس سے بہر نوع یہ امر ثابت ہے کہ اجرامِ سماوی میں کم و بیش اسوقت بھی حرارت پائی جاتی ہے جنمیں شموس زیادہ گرم ہیں البتہ ان اجرام کا شمار نہیں ہو سکتا جو فضائے عالم میں منتشر ہیں اور جن کی حرارت زائل ہو کر برودت ان پر طاری ہو گئی ہے۔

قانونِ برودت، یا ازالۂ حرارت ہمکو بتاتا ہے کہ ہر جسم اپنی حرارت کو خارج کرتا ہے اور جب جسم کی حرارت اپنے فضائے محیط کی نسبت سے بڑھتی ہے تو خارج ہونیوالی حرارت کی مقدار بھی بڑھ جاتی ہے، یہ قانون اس قدر عام ہے کہ تمام اجرامِ فلکی اس کے

ماتحت گردش کر رہے ہیں اور کوئی اس سے مستثنیٰ نہیں اسلئے یہ ظاہر ہے کہ تمام ثوابت و سیارے بھی فضائے عالم میں اپنے چاروں طرف ایک غیر منقطع چشمہ حرارت کا منتشر کر رہے ہیں اور یہی اخراج حرارت ہے جس سے بڑے بڑے اہم نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً آفتاب کی وہ حرارت جو ناقابل قیاس طریقہ سے فضائے کائنات میں منتشر ہو رہی ہے، ہماری زمین کو واسطہ یا بلا واسطہ نہایت قلیل مقدار میں میسر آتی ہے، لیکن اسی کے یہ برکات ہیں کہ آج یہ کرہ آباد نظر آتا ہے اور تہذیب و تمدن غیر منقطع ہنگامہ سے معمور ہے۔

آفتاب کی حرارت کس درجہ کی ہے، اسکا تحقیقی علم تو از بس دشوار ہے لیکن اگر ولسن اور گرے کی تحقیقات کو اس باب میں کوئی وقعت دی جا سکتی ہے، تو ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ انسانی قوت زیادہ سے زیادہ چار ہزار درجہ تک حرارت پیدا کر سکتی ہے اور آفتاب کا درجہ حرارت کم از کم چودہ ہزار ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ اگر ۴۲ ۱/۲ فٹ موٹی چادر برف کی آفتاب کے گرد بچھا دی جائے تو وہ ایک منٹ کے اندر گل کر بہ جائے گی، سرجان مارشل کا خیال ہے کہ اگر ۴۵ میل قطر کی گول برف کی چادر روشنی کی رفتار سے سورج کے اندر جاتی ہوئی فرض کی جائے تو اس چادر کا سرا بغیر کسی توقف کے گلتا ہوا چلا جائیگا۔ جرم آفتاب کے ہر مربع فٹ سے اتنی حرارت پیدا ہوتی ہے جتنی سولہ ٹن کوئلہ سے یعنی اس سے سیکڑوں گھوڑوں کی قوت کا انجن کامل ایک سال تک متحرک رہ سکتا ہے یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ اگر چند انچ سطح آفتاب کی حرارت میسر آجائے تو تمام دنیا کے انجن اس سے حرکت میں آسکتے ہیں۔ اس لئے جب ہم پورے کرۂ آفتاب کی حرارت کا اندازہ کرنا چاہتے ہیں تو عقل متحیر رہ جاتی ہے اور مطلق سمجھ میں نہیں آتا کہ کن اعداد سے اسکی حقیقت ظاہر کیجا سکتی ہے۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب آفتاب اپنی حرارت کو اسقدر بے دریغ ہر وقت صرف کر رہا ہے تو ہم کب تک اس سے مستفید ہوتے رہیں گے۔ اور کس وقت تک اس میں یہ حرارت باقی رہے گی۔ یہ سمجھنے کے لئے سب سے پہلے ہمیں دیکھنا چاہئے کہ اسوقت تک جبکہ ایک غیر متناہی زمانہ اس کی حرارت کو صرف ہوتے ہوئے گذر گیا ہے، سورج میں کوئی نقصان پیدا ہوا ہے یا نہیں۔

جب سے یہ عہد تاریخ شروع ہوا ہے اسوقت سے لیکر اسوقت تک کوئی علامت ایسی نہیں پائی گئی جس سے آفتاب کا مضمحل ہونا ثابت ہوتا ہو۔ گذشتہ ایک ہزار سال کے اندر خفیف سا بھی تغیر اس میں پیدا ہوتا، تو نباتات و حیوانات کی پیدائش میں بھی کوئی نہ کوئی فرق ضرور رونما ہوتا۔ لیکن یورپ و ایشیا کی آب و ہوا جو اب سے ہزاروں سال قبل پائی جاتی تھی وہی اب بھی نظر آتی ہے اور جس جگہ جو جو نباتات اگتے تھے وہیں اور اسی طرح اب بھی نشو و نما پاتے ہیں، مگر ہمیں اس دلیل پر اعتماد نہیں کر لینا چاہئے، کیونکہ ممکن ہے نباتات کی نشو و نما میں جو کیمیاوی تدابیر انسان نے صرف کی ہیں انہوں نے ان تغیرات کا مقابلہ کر کے، تغیر آفتاب کے اثرات کو دور کر دیا ہو، البتہ اسقدر کہہ سکتے ہیں کہ عہد تاریخ سے لیکر اسوقت تک کوئی محسوس و نمایاں تغیر نظر نہیں آیا۔ اگر ہم عہد تاریخ سے گذر کر اور قدیم زمانہ میں چلے جائیں گے تو بیشک معلوم ہوگا کہ کرۂ ارض میں بہت تغیر پیدا ہو گیا ہے جیسا کہ علماء طبقات الارض کے بیان سے واضح ہوتا ہے۔

منطقۂ شمالیہ میں جو معدنیں کوئلہ کی پائی گئی ہیں ان کو دیکھ کر قیاس کیا جاتا ہے کہ کسی وقت یہاں تیز حرارت پائی جاتی ہوگی جو اب گھٹتے گھٹتے بالکل زائل ہو گئی ہے، لیکن یہ کوئی معتبر ثبوت اس امر کا نہیں ہے کہ آفتاب کی حرارت بہ نسبت پیشتر کے کم ہو گئی ہے

کیونکہ منطقۂ معتدلہ وہی ہے جہاں زمانۂ قدیم میں یہی حالت پائی جاتی تھی جو اب منطقۂ شمالیہ کی ہے۔ اگر آفتاب کا زوال حرارت منطقۂ شمالیہ کی برودت کا باعث ہوا ہے تو منطقۂ معتدلہ کو اب اور زیادہ سرد ہونا چاہیئے تھا۔ درانحالیکہ وہ منطقۂ شمالیہ سے بہت زیادہ گرم ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ یہ تغیرات جو زمین میں واقع ہوتے ہیں ان کا تعلق آفتاب کی حرارت سے نہیں ہے بلکہ خود زمین کی ذاتی و اندرونی تبدیلی سے ہے۔

اس لئے اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ آفتاب میں اس قدر حرارت کہاں سے پیدا ہوتی ہے کہ باوجود اسقدر اسراف کے اس میں کمی پیدا نہیں ہوتی۔ اگر لوہے کے دو گیند (ایک بڑا ایک چھوٹا) ایک ہی بھٹی میں رکھکر سرخ کئے جائیں تو نکالنے کے بعد ان میں سے چھوٹا گیند جلد ٹھنڈا ہو جائے گا اور بڑا گیند دیر میں سرد ہوگا۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ جس قدر بڑا کرہ ہوگا اسی قدر زیادہ دیر سے اس کی حرارت زائل ہوگی، پھر چونکہ آفتاب بہت بڑا کرہ ہے، اسلئے لاکھوں کروڑوں سال تک اس کا مشتعل رہنا اور حرارت پہونچانا بعید از عقل نہیں ہے۔ لیکن اگر آفتاب کی حرارت واقعی ذاتی حرارت ہے اور اسمیں اضافہ نہیں ہوتا رہتا تو اس کی حرارت کو ہر سال چند درجہ گرجانا چاہیئے اور ایک ہزار سال کے اندر اسکی حرارت میں نمایاں فرق ہونا چاہیئے۔ درانحالیکہ تجربات بالکل اسکے خلاف ہیں، اسلئے معلوم ہوا کہ اسکے اشعۂ حرارت کا پیدا ہونا صرف اسکے مشتعل مادے کے ٹھنڈے ہونے پر منحصر نہیں ہے بلکہ اسکے کچھ اور اسباب بھی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ آفتاب کو اپنی حرارت قایم رکھنے میں بہت کچھ مدد ان شہابی مادوں سے ملتی ہے جو وقتاً فوقتاً اس کی سطح پر گرتے رہتے ہیں چونکہ کرۂ ارض پر شہاب ثاقب کے گرنے سے جو زیادتی حرارت میں پیدا ہوجاتی ہے وہ ایک مسلمہ حقیقت ہے اور یہ بھی یقینی ہے کہ فضائے عالم میں جو بے شمار شہاب آوارہ پھرتے رہتے ہیں اور غائب ہو جاتے ہیں ان میں کا اکثر حصہ آفتاب میں جذب ہو جاتا ہے، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ان کا مادہ سورج کی روشنی اور حرارت میں اضافہ نہ کرتا ہے لیکن جس وقت اس نظریہ کو اصول ریاضی کے ماتحت دیکھا جاتا ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں کر شہاب ثاقب کو آفتاب کے قیام حرارت کا باعث تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

فرض کرو کہ ایک کرہ جو ہمارے چاند کے برابر ۲۰۰۰ میل کا قطر رکھتا ہے اگر ٹکڑے ٹکڑے ہوکر آفتاب میں جذب ہوجائے تو یہ ایندھن یقیناً ایک سال سے زائد کے لئے گھٹنے والی حرارت کو اصلی حالت پر قایم رکھے گا یا اگر کرۂ ارض کے ٹکڑے کرکے آفتاب کی بھٹی میں ڈالدیا جائے تو ایک صدی تک حرارت کا نقصان پورا ہوتا رہے گا اسی طرح اگر نظام شمسی کے تمام کرے سورج کے نذر ہوجائیں تو زیادہ سے زیادہ ۴۵ ہزار سال تک سورج کی حرارت کو اسکی اصلی حالت پر قایم رکھ سکتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ آیا ایسا ہوتا بھی ہے یا نہیں یعنی ہر ۴۵ ہزار سال کی مدت میں بمقدار پورے ایک نظام شمسی کے شہاب ثاقب کا آفتاب میں جذب ہونا امر واقعی ہے بھی یا نہیں؟ جہاں تک ہمارا خیال ہے کوئی صحیح الدماغ شخص اسکا جواب اثبات میں نہیں دے سکتا کیونکہ اگر فضائے عالم اسقدر کثیر التعداد شہاب ثاقب سے معمور ہو تو نا ممکن ہے کہ نظام شمسی کے سیاروں سے ان کا تصادم نہ ہو اور زمین کی حرارت

ناقابل ضبط درجہ تک نہ بڑھ جایا کرے۔ اس میں شک نہیں کہ شہاب ثاقب آفتاب میں جذب ہوتے ہیں اور آفتاب کی حرارت میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ لیکن صرف اسی کو بقائے حرارت کی وجہ قائم کرنا درست نہیں ہے۔

اس لئے قابل غور امر یہ ہے کہ علاوہ اس کے اور کیا وجہ ہو سکتی ہے اگر کوئی کرۂ گیسی حالت میں متحرک فرض کیا جائے تو گردش کے ساتھ وہ اپنی حرارت کو کم کرتا جائے گا، لیکن یہ ضروری نہیں کہ اسکا ٹمپریچر بھی گر جائے۔ ہر چند یہ بالکل خلاف عقل معلوم ہوتا ہے کہ حرارت کے ساتھ درجہ حرارت کم نہ ہو، لیکن قانون حرارت و قانون گیس کی رو سے یہ کسی طرح مستبعد نہیں ہے۔

چونکہ کرہ گردش کر رہا ہے، اس لئے اس کرۂ گیسی کی بالائی سطح یقیناً مرکز کی طرف جذب ہو رہی ہے، لیکن چونکہ قانون توازن بھی مسلم ہے اور جذب ہونیوالے حصہ کے نیچے جو طبقہ گیس کا ہے اس کے دباؤ سے یہ کشش ضعیف یا معدوم ہو جاتی ہے اس لئے ظاہر ہے کہ کشش جسقدر زیادہ ہوگی اسی قدر دباؤ زیادہ ہوگا، پھر اگر کمی حرارت کے ساتھ درجہ حرارت کا کم ہونا بھی تسلیم کیا جائیگا تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ گیس کا دباؤ بھی کم ہو گیا، درانحالیکہ گردش کے ساتھ ساتھ قوت جذب وہی باقی ہے اور قوت جذب کے ساتھ گیس کے دباؤ کی ایک نسبت ہونی چاہئے۔ اس کو دوسرے طریقہ سے یوں سمجھ سکتے ہیں۔ حرارت کچھ نہیں ہے مگر کرہ کی قوت گردش۔ اس لئے جب کرہ سے حرارت خارج ہوتی ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اس کی قوت گردش کم ہو رہی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ کرہ کی قوت کا ایک حصہ اس درجہ پر منحصر ہے، لیکن زیادہ اہم سبب اس کے اجزار کا انتشار ہے پھر اسکے اجزار جسقدر باہم متصل ہوتے جائیں گے، اسی قدر قوت کم ہوتی جائے گی، اور جو قوت اسطرح آزاد ہوجائے گی وہ حرارت کی صورت اختیار کرلے گی۔ درانحالیکہ اجزار کرہ کا اتصال کرہ کے سکڑنے کا باعث ہو رہا ہے۔ یعنی جسقدر کرہ سکڑ جاتا ہے اسی قدر اسکی قوت کا ایک حصہ حرارت میں تبدیل ہوتا جاتا ہے، یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ جسقدر حرارت کرہ کے سکڑنے سے پیدا ہوتی ہے اس سے بہت کم خارج ہوتی ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ایک کرہ کا درجہ حرارت باوجود سکڑنے اور اپنی حرارت صرف کرنے کے بڑھ رہا ہے۔

بہر حال گیسی کروں کے متعلق یہ قانون عام ہے کہ جس قدر حجم ان کا گھٹتا جاتا ہے اُسی قدر ان کا ٹمپریچر بڑھتا جاتا ہے لیکن آفتاب پر اس قانون کا پورا اطلاق نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ اب ان منازل کو طے کر رہا ہے جو گیسی حالت اور کیفیت انجماد کے درمیان ہوتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ جسقدر وہ سکڑتا جاتا ہے اسی نسبت سے اس کا درجہ حرارت اپنی اصلی حالت پر قایم ہوتا ہے۔ یعنی عام گیسی کروں کی طرح اسکا درجہ حرارت بڑھتا نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ آفتاب کی سیال حالت مائل بہ انجماد ہو رہی ہے، لیکن اسکی رفتار اس قدر بطی ہے کہ مشکل سے کوئی شخص اس کا اندازہ کر سکتا ہے اس وقت آفتاب کا قطر ۸۶ ہزار میل ہے، اگر اس کا قطر ہر سال ۵۰۰ فٹ گھٹتا رہتا ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ اب سے ایک صدی قبل اس کا قطر دس میل زائد تھا، دس ہزار سال قبل ایک ہزار میل۔ ایک وقت وہ رہا ہوگا جب وہ موجودہ حجم سے دوچند رہا ہوگا اور

غالباً وہی زمانہ اس کی سردہی حالت کا ہوگا اور یہی وہ نظریہ ہے جسے لیپ لیس نے قایم کیا ہے۔

پھر جس طرح آفتاب نے رفتہ رفتہ گیسی حالت سے گھٹ کر موجودہ صورت اختیار کرلی ہے اسی طرح اک زمانہ آئے گا کہ یہ بالکل منجمد ہوکر اپنی حرارت کو ضائع کردے گا۔ اور سارا نظام شمسی درہم برہم ہوجائے گا۔ لیکن کب! اس کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔

نیاز

رموزِ انقلاب

حصولِ مقصدِ فطرت تھا ہجرتِ اسلام　　زماں تھے قصر بہ آغوشِ خانماں تبہی
حریفِ خاکِ عرب ہو سکا نہ آخر کار　　غرورِ خسروی و افتخارِ کجکلہی
تھی اپنی چینِ جبین و جبرِ عشوۂ بہیم　　تھی اپنی چشمِ غضب لرزشِ صریرشہی
بنائے دولتِ اندلس بتا گئی ہمکو　　نہ مٹ سکے گا ستم سے غرورِ بیگنہی
ہر اک شکست ہے سامانِ صد ہزار عروج　　نویدِ نشۂ شب ہے خمارِ صبحگہی

قفس گذار و بہ سامانِ صد بہار بیا
سپند وار برون شو، سمند وار بیا

کسے خبر تھی کہ یہ پردۂ جہانبانی　　کرے گا پیشِ نظر منظرِ جہاں سوزی
قسم بہ شوقِ جفایت کہ آ گیا پھر یاد　　طریقِ ملک ستانی، اصولِ فیروزی
فشارِ تاکِ مئے پنہاں ہے رونقِ محفل　　ہے سوزِ شمع سے وابستہ بزم افروزی
نہ خون سینہ سے بہتا نہ یادِ گل آتی　　بڑا ہی لطف تھا تیرِ جفا کی دلدوزی
تمہاری تیغِ ستم بھی دو نیم ہو گی، اگر　　ہماری خوئے وفا ہو گئی بدآموزی

مرا بہ دامن اگر آتشے میسر گشت
ہزار شکر کز و جادہ ام منور گشت　　(نیاز)

ایک مصلح بت تراش

شہاب، فطرتاً نقاش تھا اور ایسا نقاش کہ ہر منظر اس کے قلم سے چھو جانے کے بعد، ذی حیات نظر آنے لگتا تھا اور اسکے ہاتھ کا ہر نقش، یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا فطرت کسی تخیل میں مصروف ہے۔

صبح و شام کی کیفیات، باغ و صحرا کی دلفریبیاں، کوہ و دریا کے مناظر، جس خوبصورتی کے ساتھ اس کے قلم کی جنبش میں منتقل ہو جاتے تھے، اس سے ہر شخص واقف تھا۔ لیکن یہ صرف اس کے خاص احباب ہی کو معلوم تھا کہ جب اسکا موضوعِ نقاشی "نسائیت" ہوتا تھا، تو وہ ایک نقاش کے حدود سے متجاوز ہو کر، اک پجاری کی حیثیت بھی اختیار کر لیتا تھا اور اسلئے ہر عورت کی تصویر، اسکے قلم سے پرستیدۂ جذبات، معبودۂ حیات ہو کر نکلتی تھی۔

اس کے پاس جنسِ نازک کی تصویروں کا ایک عجیب و غریب مرقع تھا، جسے خود اسی نے اپنی زندگی کی تنہائیوں میں طیار کیا تھا، لیکن وہ انہیں کسی کو دکھاتا نہ تھا، کیونکہ اس کے نزدیک وہ سب ناقص و نامکمل تھیں اور وہ کہا کرتا تھا کہ جب تک عورت کے خیال سے میرے کلیجہ کا منھ تک آجانا کم نہ ہوگا، میں فن کے لحاظ سے کبھی اسکی صورت گری میں کامیاب نہیں ہوسکتا وہ سب سے پوچھتا کہ یہ کب ممکن ہوگا، درآنحالیکہ اس کی جوانی روز بروز سنگین ہوتی جاتی اور اس کے ساتھ ہی اس کے سینہ کی وسعت، جذبات کے لئے گھٹتی جاتی تھی، جسے وہ کلیجہ کے منھ تک آجانے سے تعبیر کرتا تھا۔

ان تصویروں میں سب سے بہتر تصویر، اسکے نزدیک، وہ تھی، جس میں ایک نوجوان لڑکی آئینہ کے سامنے اپنے بال سنوار رہی تھی اور کسی کی آہٹ پاکر دفعتہً دروازہ کی طرف گردن موڑ کر متحیرانہ و پُر اضطراب انداز سے دیکھتی ہوئی ظاہر کی گئی تھی، وہ کہا کرتا تھا کہ مجھ سے یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ میں تصویر میں بھی کسی عورت کے پورے چہرہ کو بے حجاب دیکھ سکوں، کیونکہ صفحۂ کاغذ پر جسقدر زیادہ اس کے خد و خال نمایاں ہوتے جاتے ہیں، اسی قدر صحیح معنی میں نقاشی کی اہلیت مجھ سے سلب ہوتی جاتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہمیشہ ایک رخ کی تصویر بنانے کا عادی تھا، اس منظر میں البتہ وہ نصف سے زائد چہرہ، صرف اتنا زائد کہ دوسری آنکھ کی پلکیں نظر آتی تھیں، بنانے پر قادر ہوگیا تھا۔ جس کو وہ اپنی بہترین کامیابی سمجھتا تھا۔

امتدادِ زمانہ کے ساتھ اس کا ذوق بڑھتا گیا اور رات دن وہ اسی فکر میں مستغرق رہنے لگا کہ کیونکر عورت کی جذباتی زندگی، اسکی حیاتِ عاشقہ کو وہ نقوش میں ظاہر کرسکتا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اول اول تو اس کے عنفوانِ شباب کی حیاؤں، اس میں کامیاب نہیں ہونے دیا، کیونکہ وہ عورت کے متعلق اپنے جذبات کا خیال کرکے کانپ اٹھتا تھا، اور بعد انتہا کو پہنچ کے بعد بھی اس کی کاوش اس سے زیادہ مشکور نہ ہوسکی تھی کہ وہ اور اس کا قلم ایک مستقل لرزش ہو کر رہ جائے۔ اور بعد

جب اس میں کچھ بیباکی پیدا ہوئی تو وہ حد سے زیادہ حریص ہوگیا اور عریاں ترین نقوش بھی اس کی حسیات کو تسلی دینے کے لئے بالکل ناکافی ثابت ہوئے الغرض اس کی نقاشی اس فن کے دونوں کناروں ہی سے متعلق رہی اور درمیانی منزل پر جس سے کامیابی کا یقینی تعلق تھا۔ اس کے شباب نے اسے قیام نہ کرنے دیا۔

(۲)

اک زمانہ گذر گیا اور شہاب بدستور اپنے شغل میں مصروف رہا یا نہیں؟ اس کی جدائی ہو چکی تھی کیونکہ میں اپنے اسباب حیات فراہم کرنے میں آوارہ و سرگشتہ ہو رہا تھا، مجھے ایک عرصہ تک اس کے حالات سے بیخبری رہی۔

ایک شام ساحل قلابہ پر بیٹھا ہوا ان فطری و غیر فطری مناظر کے تماشہ میں جنہیں صرف بمبئی کے ساحل ہی پیش کر سکتے ہیں، محو تھا کہ دو جوان لڑکیاں میرے پاس ہی بنچ پر بیٹھ گئیں مجھے نہیں معلوم کہ وہ کیا گفتگو کر رہی تھیں اور غالباً آخر وقت تک اس سے بے خبر رہتا اگر ان کا یہ فقرہ کہ "شباب اسوقت یقیناً ہندوستان کا بہترین بت ساز ہے اور نمائش میں سب سے زیادہ قیمتی انعام اسی کو ملنا چاہیئے تھا" مجھے نہ چونکا دیتا۔

شہاب! بت ساز! نمائش! انعام! میں متحیر تھا اور سخت بیقرار کہ کیونکر ان سے گفتگو کر کے سارا حال معلوم کروں، پھر خیال آیا کہ ممکن ہے یہ کوئی اور شہاب ہو، لیکن جب ان میں سے ایک نے انعام حاصل کرنے والے بت ساز کی خصوصیات کو ظاہر کرنا شروع کیا تو مجھے یقین ہوگیا کہ سوائے اس شہاب کے کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔

میں بے اختیار ہو کر اس بنچ کی طرف بڑھا ہی تھا کہ تہذیب مانع ہوئی اور اس خیال کے ساتھ کہ آج اخبار میں بھی ضرور اس کا ذکر ہوگا۔ وہاں سے چل دیا۔

(۳)

شہاب:۔ "ہاں اب میں بت تراش ہوں، بت ساز ہوں، مجسمے تیار کرتا ہوں، پتھر کی مورتیں بناتا تھا، نقاشی سے زیادہ بیکار کوئی چیز نہیں، میری نگاہیں اس کو دیکھتے دیکھتے تھک گئیں، میرا ہاتھ صورت تو بنا سکتا تھا لیکن اسے چھو نہ سکتا تھا، مگر اب میں نے اپنی خواہش کے مطابق عورت اور اس کے شباب کو قابل لمس بنا لیا ہے، میں ایک ایسا خالق ہوں جو اپنی مخلوق کو اپنی آغوش میں بھی لے سکتا ہے۔ میرا وہ خیال جو پہلے صرف سطح پر مرتعش نظر آتا تھا، اب ابھر کر مجسم ہوگیا ہے، اس نے صورت اختیار کر لی ہے اور ہر چند اب میں پہلے سے کہیں زیادہ بیتاب و مضطرب ہوں، لیکن اس اضطراب میں واقعیت ہے، اس بیتابی میں حقیقت ہے، اور میں محسوس کرتا ہوں کہ صورت نے میرے دلکو معمور کر رکھا ہے وہ میرے حیات جسمانی میں بھی میرے پیش نظر ہے، میرے کمرہ کا ایک ایک کونہ اس سے آباد ہے، میں اس کو چھو سکتا ہوں اس کے سامنے دوزانو ہو سکتا ہوں اور جب چاہوں اس کے آگے سر بسجود ہو کر اپنی پرستارانہ اشکباری سے، اس کے خوبصورت جسم، اس کے حسین شباب کو تر و نم کر سکتا ہوں۔"

میں سن رہا تھا اور حیرت کر رہا تھا کہ وہ شہاب جواب سے پانچ سال قبل بے انتہا خاموش زندگی بسر کرنے کا عادی تھا کیونکر

ایسا عملی آدمی بن گیا، وہ اگر پہلے نقاشی کی طرف مائل تھا تو صرف اپنے ادبی ذوق کی بنا پر لیکن اب وہ اپنی بت سازی کے لئے دلائل بھی پیش کرسکتا تھا یعنی اگر وہ پہلے صرف ایک شاعر نقاش تھا تو اب اسکی حیثیت ایک فلسفی بت تراش کی تھی، میرا جی چاہتا تھا کہ وہ شروع سے اپنے حالات زندگی مجھ سے بیان کرے لیکن میں دیکھتا تھا کہ وہ "حال" میں اسقدر متغرق ہے کہ اس سے "ماضی" کی نسبت کوئی سوال کرنا گویا بھولا ہوا خواب یاد دلانا ہے۔

میں نے پوچھا کہ اس کی بت تراشی کی ابتدا کیونکر ہوئی، یہ سن کر اسکا چہرہ سرخ ہوگیا اور بولا یہ سوال فضول ہے، لیکن ایک عجیب و غریب واقعہ تمہیں سناتا ہوں:-

"میری بت تراشی کی ابتدا تھی اور ابھی تک میرا کوئی خیال میری خواہش کے مطابق پتھر میں منتقل نہ ہوسکا تھا۔

ایک دن ہفتوں کے غور و تامل کے بعد میں نے ایک مجسمہ کی تشکیل شروع کی، میں سمجھتا تھا کہ اگر اس میں کامیاب ہوگیا، اگر میں اپنی تمناؤں کو اس طرح منجمد و متشکل دیکھ سکا، تو اسوقت تک کی محنت کی داد حاصل کرسکوں گا، تمہیں شاید نہ معلوم ہوگا کہ ایک بت کی تعمیر ہمیشہ سر کی جانب سے شروع ہوتی ہے، لیکن میں نے عام دستور کے خلاف پاؤں کی طرف سے ابتدا کی اور کامل ایک ماہ کی محنت اور سینکڑوں نمونے بنانے بگاڑنے کے بعد دو ننھے ننھے نازک پاؤں جسمیں ایک پورا اور دوسرے کا صرف پنجہ زمین پر قایم تھا، بنا سکا اس کے بعد میں سخت الجھن میں پڑ گیا کیونکہ پنڈلیوں کو عریاں بنانا صرف اسی صورت میں ممکن تھا کہ سارے مجسمے کو عریاں بناتا اور اس کی ہمت میں اپنے ضعیف قلب میں نہ پاتا تھا۔ آخر کار میں نے حد درجہ اضطراب کے عالم میں ایک فیصلہ کرلیا اور چھ ماہ تک روز و شب اسی شغل میں مصروف رہنے کے بعد ایک عورت، وہ عورت جو اس قبل میرے خیال پر حکمراں تھی، پیدا کرلی، اور وہ عالم اجسام میں رونما ہوئی، وہ اس درجہ حسین تھی کہ مشکل سے کسی کا تصور اس کے حسن تک پہونچ سکتا تھا؛ وہ ایسی جوان تھی کہ شاید ایسی جوانی کسی انسان میں پائی جاسکتی ہے۔ اگر میں کہوں کہ اس کا شباب نہایت سنگین تھا تو کوئی عجیب بات نہ ہوگی، کیونکہ وہ واقعی پتھر کی تھی لیکن حیرت تو یہ ہے کہ میں جب اوس کے جسم کو مضطرب و بیتاب ہوکر چھولیتا تھا تو اک گرمی بھی محسوس کرتا تھا اور جب اوس کے چہرہ پر نگاہ پڑ جاتی تھی تو معلوم ہوتا تھا۔ وہ گفتگو کرکے ابھی خاموش ہوئی ہے۔

میں گھنٹوں بیٹھا ہوا اسے دیکھا کرتا تھا، رات رات بھر اوس کے چہرہ کو، اس کے جسم کو، جسم کے ایک ایک عضو کو، اعضا کے تناسب کو بجلی کی روشنی میں دیکھا کرتا اور صبح کے وقت جب زیادہ مغلوب خواب ہوتا تو اوس کے قدموں پر سر رکھ کر سوجاتا۔ رفتہ رفتہ سارے مشاغل چھوٹ گئے، میرے تمام اوقات خراب ہوگئے، حتیٰ کہ خواب و خور ترک ہوگیا اور آخر کار میں نے محسوس کرلیا کہ مجھے اوسکے ساتھ محبت ہوگئی ہے۔

میں گھنٹوں اوسکے سامنے بیٹھ کر روتا، سربسجود ہوکر اپنی تمنائیں پیش کرتا، اس کے سکوت و جمود کو برہمی سے تعبیر کرتا اور الحاح و زاری میں مصروف ہوجاتا اور کبھی ایسا محسوس کرتا کہ شاید وہ مسکرا رہی ہے۔ لیکن جب میں بیتاب ہوکر اس کے قریب پہونچتا تو پھر وہ اسی طرح سنجیدہ و غیر متحرک نظر آتی اور میں فرش پر گر کر بے ہوش ہوجاتا۔

ایک رات جبکہ میری دیوانگی بہت بڑھ گئی تھی اور میرے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارۂ کار نہ رہ گیا تھا کہ اس کے قدموں پر گر کر اپنے کو ہلاک کردوں، اس مجسمہ میں حرکت ہوئی، اس کے اعضا میں جنبش محسوس ہونے لگی، اور دفعتہً میری آغوش میں آکر مجھے بے ہوش کرگئی۔

یقیناً ایک مجسمہ کا زندہ ہو جانا، بجائے خود ایک ایسی بات تھی کہ مجھے فرطِ حیرت سے دیوانہ ہو جانا چاہئے تھا، لیکن میرے دل و دماغ میں اس کی محبت، اس کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی مسرت نے کسی اور خیال کے لئے کوئی جگہ ہی باقی نہ رکھی تھی اور بغیر اس حقیقت پر غور کئے ہوئے کہ ایسا کیونکر ممکن ہے، قدرت میری کس ادائے طلب سے مالوف ہو کر رحم کرنے پر مجبور ہو گئی، میں اس میں جذب ہو گیا اور اس زندگی میں اول بار میں نے محسوس کیا کہ عورت کا مفہوم کیا ہے اور اس کی ترکیب کن آسمانی لذات سے ہوئی ہے۔ جو دن گزرتا تھا میں اس کی ملکوتی نرمی اور سماوی شفقت کو زیادہ قوت کے ساتھ محسوس کرتا جاتا تھا، یہاں تک کہ میری ہستی اس کے لطف و رافت سے اس قدر معمور ہو گئی کہ میری روح نے بغاوت شروع کر دی اور میں ایسا محسوس کرنے لگا کہ شاید میں اس سے بیزار ہو گیا ہوں۔ وہ میری خدمت کرتی تھی اور میں اس میں کوئی عجیب بات نہ دیکھتا تھا، وہ مجھ پر مٹی جاتی تھی، لیکن میں یہ سمجھ کر کہ اسطرح وہ اپنا فرض ادا کر رہی ہے۔ بجائے اس کی طرف کھنچنے کے اپنے اندر کچھ پندار محسوس کرتا تھا اور سمجھتا کہ شاید فطرت نے عورت کو اسی لئے وضع کیا ہے کہ وہ مرد کی خدمت کرے اور کوئی احسان نہ رکھے، اور مرد کی تخلیق کا منشا یہی ہے کہ وہ عورت سے کام لے اور منت پذیری کے جذبات اس میں نہ پیدا ہوں۔

اب میری برہمی اس کی طرف سے بڑھتی جاتی تھی، میں ذرا ذرا سی بات پر مشتعل ہو جاتا تھا، اگر کوئی ادنیٰ سی بات بھی میرے خلافِ مزاج ہو جاتی تھی تو میں غصہ سے بھوت ہو جاتا تھا، وہ میری جھڑکیاں سنتی تھی اور ہنستی تھی، وہ میری سختیاں دیکھتی تھی اور پھر اسی طرح مسرت و انہماک کے ساتھ اپنے فرائض کے ادا کرنے میں مصروف ہو جاتی تھی، میرے اندر بجائے اس کے کہ اس طرزِ عمل سے نرمی و رافت پیدا ہوتی زیادہ تر سختی بڑھتی جاتی تھی اور اب میں اس سے بالکل متنفر ہو گیا تھا۔

برسات کی ایک رات جب کہ میں باہر سے بھیگا ہوا اور پریشان داخل ہوا، تو میں نے اسے اپنے کمرہ میں نہ پایا جہاں بیٹھ کر وہ انتظار کیا کرتی تھی، یہ دیکھتے ہی مجھے سخت طیش آ گیا اور گھر میں اس کی جستجو کرنے لگا، میں نے دیکھا کہ وہ ایک کونے میں کرسی پر سر ڈالے ہوئے کانپ رہی ہے (وہ حقیقتاً میرے اس وقت تک گھر نہ آنے کی وجہ سے رو رہی تھی) اس منظر نے مجھے غیر معمولی طور سے غضبناک بنا دیا، اور نہایت ہی خشن لہجہ سے میں نے اس کو آواز دیکر چونکا دیا۔ وہ میری آواز سنتے ہی آنسو پونچھتی ہوئی اٹھ بیٹھی، لیکن میری برہمی کو دیکھ کر سہم گئی اور آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے ہٹتے اسی کونہ میں جا کر کھڑی ہو گئی، جہاں میں نے اس کا بت طیار کیا تھا، اس کے اس طرزِ عمل نے مجھے حد سے زیادہ غضب آلود کر دیا اور بے اختیار ہو کر میں نے ایک لکڑی جو میرے ہاتھ میں تھی اس کے نرم و نازک جسم پر ماری، لیکن اس ضرب سے ایسی آواز پیدا ہوئی جیسے دو سخت چیزوں کا تصادم ہوتا ہو، اس سے میں اور زیادہ برہم ہوا اور دوسری لکڑی اس سے زیادہ قوت کے ساتھ ماری، میری لکڑی کے دو ٹکڑے ہو گئے اور میں نے چاہا کہ ہاتھ سے پکڑ کر اسے گھسیٹ لوں، لیکن جب اس کے قریب پہونچا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک مجسمہ تھی سنگین و بے حس، وہ ایک مورت تھی بارد و سنگین، وہ ایک پیکر حسین تھی، لیکن گہرے خواب میں مصروف۔

یہ فسانہ نومِ طویل کا ہو یا خواب کا۔ بہرحال یقینی ہے کہ اس کے بعد حقیقی معنی میں میری آنکھ کھلی اور میں نے محسوس کیا کہ اس وقت تک میں نے جس چیز کو عورت سمجھا تھا وہ عورت نہ تھی، کیونکہ عورت نام اس کے حسنِ جسمانی اور تناسبِ اعضا کا نہیں ہے بلکہ اس کے حسنِ صفات کا ہے، جس سے بہتر درسِ اخلاق دینے والی چیز دنیا میں اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

یقیناً میں اس واقعہ کے بعد بھی اپنے مشاغل میں بدستور مصروف رہا، لیکن اس قبل، میں جو مجسمے طیار کیا کرتا تھا، ان میں میرے جذبات حیوانی بھی شامل ہوتے تھے اور اس لئے وہ صنعت کے نقطۂ نظر سے (جو حد درجہ معصوم چیز ہے) ناقابل التفات ہوتے تھے۔ اور اب اُن سے وہ جذبات ظاہر ہوتے ہیں جو صحیح معنی میں فطرتِ نسوانی سے متعلق ہیں، اور اسی دور کا ایک مجسمہ تھا جس نے میری بنیادی شہرت کو بھی مکمل کرکے دکھا دیا

کیا اب بھی تم مجھے ملامت کروگے، بمبئی کی شاید ہی کوئی حسین لڑکی ایسی ہوگی جس نے مجھ سے ایسی خواہش نہ کی ہو کہ میں اسے پتھر میں تبدیل کر دوں، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ اُن کے مجسمے اس دور سے متعلق ہوں گے، جسے میں نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں، میں اُن کی یہ خواہش رد کر دیتا تھا کیونکہ یہاں کے مغربی تمدن نے عورتوں کی نسائیت کو سلب کر لیا ہے اور وہ اب صرف خواہش نفسانی کی دیویاں ہیں جن کو دیکھ دیکھ کر میری روح لرز جاتی ہے۔

(۴)

میں نے اس مجسمہ کو جا کر دیکھا، جس نے شہاب کو غیر فانی بنا دیا ہے۔

"ایک عورت جو ہزار دشواریوں سے کچھ سامان غذا فراہم کر سکی ہے بوسیدہ لباس میں اپنے اندھے شوہر کے سامنے کھڑی ہوئی اپنی دن بھر کی محنت کا ثمرہ پیش کر رہی ہے اور اپنے دونوں چھوٹے بچوں کو جو بھوک سے بیتاب ہو کر اس سے لپٹے جاتے ہیں ہاتھ سے علیحدہ کر رہی ہے تاکہ وہ سب سے پہلے اس ہستی کی تکلیف کو دور کر سکے جس کے لئے ہندوستان کی عورت جان دینا بھی ادنیٰ خدمت خیال کرتی ہے۔"

شہاب اب نقاش و بت ساز نہ تھا، بلکہ جنس لطیف کا ایک رفارمر و مصلح تھا، جس نے باوجود حد درجہ مادہ پرستی کے بھی فضائے بمبئی میں روحانیت کی لہر دوڑا دی تھی۔

نیاز

جنگل کی شاہزادی

پیوست ہے جو دل میں وہ تیر کھینچتا ہوں
اک ریل کے سفر کی تصویر کھینچتا ہوں

کچھ تازہ شعر پڑھتا مسرور جا رہا تھا
اجمیر کی طرف سے جے پور جا رہا تھا

طوفان چہچہوں کا، چڑیوں کا تھا بسیرا
سنجان جھاڑیوں کے سایہ میں تھا اندھیرا

تیزی سے جنگلوں میں یوں ریل جا رہی تھی
پہیے ستار تانا گویا بجا رہی تھی

کچھ دور پر تھا پانی، موجیں رکی ہوئی تھیں
تالاب کے کنارے شاخیں جھکی ہوئی تھیں

خورشید چھپ رہا تھا رنگیں پہاڑیوں میں
طاؤس پر سمیٹے بیٹھے تھے جھاڑیوں میں

مستی شراب کی سی آنکھوں میں چھا رہی تھی
ہر بانس اک چھلکتا ساغر پلا رہی تھی

لہروں میں کوئی جیسے دل کو ڈبو رہا تھا
"میں سو رہا ہوں" ایسا محسوس ہو رہا تھا

موسیقیت سے دل کو معمور کر رہے تھے
ٹھنڈی ہوا کے جھونکے مخمور کر رہے تھے

تھیں آخری کرن سے سب وادیاں سنہری
ناگاہ چلتے چلتے جنگل میں ریل ٹھیری

(۲)

کانوں پہ خوبصورت اک بانسری پڑی ہے
دیکھا کہ ایک لڑکی میدان میں کھڑی ہے

کافر ادا، ستمگر، ساحر، دراز مژگاں
سیمیں بدن، پری رخ، گلرنگ، آتش ساماں

خوش چشم، خوبصورت، خوش رنگ، ماہ پیکر
نازک بدن، شکر لب، شیریں ادا، فسونگر

غارت گرِ تحمل، خونریز، دشمنِ جاں
پروردۂ مناظر، وابستۂ بیاباں

پرتو ہے بجلیوں کا آئینگی میں
جان پڑ گئی ہے جنگل کی تازگی میں

صورت میں عارضوں کی، یا گل بدل گئے ہیں
ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اعضا میں ڈھل گئے ہیں

حوریں ہزار دل سے قربان ہو گئی ہیں
رنگینیاں سمٹ کر "انسان" ہو گئی ہیں

ہر چیز پہ نگاہیں حیرت سے ڈالتی ہے
جھونکے جو چھیڑتے ہیں، چادر سنبھالتی ہے

لفظ "غرور" دل پہ مرقوم ہی نہیں ہے
"میں کون ہوں" یہ اس کو معلوم ہی نہیں ہے

خونریزیوں سے اپنی واقف مگر نہیں ہے
کس پر چھری چلا دی مطلق خبر نہیں ہے

ناآشنائے راہ و رسم فسونگری ہے
درپردہ اس کی فطرت سرگرم دلبری ہے

(۳)

کچھ دیر تک تو میں نے اس کو بغور دیکھا　　گم تھے حواس خمسہ، ہر مو تھا چشم بینا
گاڑی سے پھر اتر کر اس کے قریب آیا　　جذباتِ دل کی رَو میں پھر یہ زباں سے نکلا
"اے تو کہ تیری نازک ہستی میں کام آئی　　فطرت کی انتہائی تخئیل دل ربائی
"اے درسِ آدمیت، اے شاعری کی جنّت　　اے صانعِ ازل کی نازک ترین صنعت"
"جلووں سے تیرے روشن صحرا و دشت و وادی　　عفت کی پاک دیوی، جنگل کی شاہزادی"
"گیسو پہ تیرے صدقے زلفیں سیہ گھٹا کی　　گاتی ہیں گیت تیرے، رنگینیاں فضا کی"
"بستی میں تو جو آئے، اک حشر سا بپا ہو　　آبادیوں میں ہلچل، شہروں میں غلغلہ ہو"
"میکش جو تجھ کو دیکھے، تقوا کے جام چھوٹے　　تسبیح شیخ اچھلے، زاہد کا زہد لوٹے"
"افلاک سے فرشتے لے کر خراج اتریں　　زہاد کے عمامے، شاہوں کے تاج اتریں"
"آنسو ہوں خوں بداماں، نالے شرر فشاں ہوں　　کیا کیا نہ شاعروں کے ملبوس دھجیاں ہوں"
"چہروں کو اہل دل کے بے آب و رنگ کر دے　　دنیا کو حسن تیرا، میدان جنگ کر دے"
"تیرے پجاریوں میں میرا بھی نام ہوتا　　اے کاش جنگلوں میں میرا قیام ہوتا"
"شام و سحر کے جلوے مجھ سے قریب ہوتے　　یہ چاند اور ستارے میرے رقیب ہوتے"
"کیوں؟ میری گفتگو سے حیرت کا جوش کیوں ہے　　اے زمزموں کے چشمے، اتنا خموش کیوں ہے؟"
"بجنے لگیں دنیا کی محفل میں شادیانے　　کچھ بول بھی زباں سے، اے سرمدی ترانے!"
"یوں چپ ہے، جیسے کوئی اب کام ہی نہیں ہے　　یہ وہ ادا ہے جس کا کچھ نام ہی نہیں ہے"

(۴)

یہ سن کے وہ پری وش، اس طرح مسکرائی　　سینہ میں روح میری گھبرا کے تھرتھرائی
دل کو شکست دینے سامانِ جنگ آیا　　چہرہ پہ خون دوڑا آنکھوں میں رنگ آیا
شرما کے آنکھ اٹھائی زلفوں پہ ہاتھ پھیرا　　اتنے میں رفتہ رفتہ بڑھنے لگا اندھیرا
کچھ جسم کو سمیٹا، کچھ سانس کو سنبھالا　　کاندھے پہ سرخ آنچل انگڑائی لے کے ڈالا
ہر شے سے پھوٹ نکلے جذبات عاشقانہ　　اور ہو گئی وہ کافر منہ پھیر کر روانہ

(۵)

آنکھوں سے اشک ٹپکے، سینہ سے آہ نکلی　　گردوں پہ رات، لے کر فانوس ماہ نکلی

آواز ہر طرف سے آئی کراہنے کی
اے جوش، یہ سزا ہے اچھوں کو چاہنے کی
کیا جانے دل نے کب تک غفلت کا راگ گایا
المختصر غشی سے جب مجھ کو ہوش آیا
مڑ کر جو میں نے دیکھا امید مر چکی تھی
پٹری چمک رہی تھی، گاڑی گذر چکی تھی

(جوش ملیح آبادی)

ایک مایوس کی آخری تمنّا

نوید عشرت موہوم اب نہ چھیڑ مجھے
امید لذت معدوم اب نہ چھیڑ مجھے
خوشی کے نام سے دل کی مصیبتیں نہ بڑھا
دکھا کے جلوۂ راحت کسی کا جی نہ دکھا
گداز دل کی رفاقت بہت ہے میرے لئے
"نہیں وہ میری" یہ حسرت بہت ہے میرے لئے
اسیر جرم محبت ہوں، اب گلا کیوں ہو
کوئی بتائے مجھے خواہش وفا کیوں ہو
عزا گسار ہوں، ناکام جستجوؤں کا
نہ ذکر کر مری مرحوم آرزوؤں کا
فسانۂ عہد تمنا کا اب، مجھے نہ سنا
اب ان کے ذکر نوازش سے میرا دل نہ دکھا
غم فراق ہے، ارماں کو دفن رہنے دے
مجھے اب آن کے تغافل کا رنج سہنے دے
مرے شباب کی کاوش کا قصۂ دل دوز
سنا کے اور فزوں کر نہ میرے صبر کا سوز
نہ کہہ کہ "اپنی خرابی پہ اشکبار ہوں میں
نہ کہہ کہ عہد تمنا کا سوگوار ہوں میں"
خدا کے واسطے دے اب تو درس بےخبری
کہ فاش ہو چکا عالم پہ راز چارہ گری
یہ مدعا نہیں لیکن، کہ درد ہجر مٹے
غم فراق کی لذت دل و جگر سے چھٹے،
یہ آرزو ہے، کہ وہ درد دل کا راز بنے
مرے حریم محبت کی وجہ ناز بنے
میں اس کے درد پرستش میں یوں خموش رہوں
کسی سے حال دل زار و مبتلا نہ کہوں
تپش کو اپنی، رفیق شب محن سمجھوں
میں سوز دل کو فقط شمع انجمن سمجھوں
کسی کی کچھ نہ سنوں کوئی کچھ سنا جائے
مرے وجود پہ اک بیہشی سی چھا جائے
جہاں سے دور رہے دل کی عافیت کوشی
کرے یہ حال مرا جوش خود فراموشی
کہ مجھ کو ہستی کا احساس محو ہو جائے
مری حیات بس اک جستجو میں کھو جائے
جہاں میں یہ مری بیچارگی کا عالم ہو
کہ میرا حال زبوں اک صلائے ماتم ہو

نہ آہ نیم شبی باعث رسائی ہو
نہ گریۂ سحری موجب رہائی ہو
دعائے وقت سحر جب بلند ہونے لگے
اثر خرابیٔ قسمت پہ میری رونے لگے
یہ حال کوئی جو دیکھے وہ کہہ اٹھے اک بار
کہ اب تو رحم کے قابل ہے اسکی حالت زار
کوئی کہے کہ دوا کا نہ کیا اثر ہوگا ؟
کوئی کہے نہیں درماں نہ کارگر ہوگا
اب اس کو چھوڑ دو یوں ہی نہ اس پہ جبر کرو
دوا کا وقت نہیں ہے دعائے صبر کرو
عیاں ہو جب کہ دوا و دعا کی بے اثری
تو اتنا یاد رہے اسے وفور بے خبری
کبھی وہ حسن مجسم جو سامنے آئے۔
اور اپنے جلووں سے خورشید ہمہ کو شرمائے
جب اس کے عارض گلگوں کی شعلہ سامانی
شفق کے رنگ کی زائل کرے درخشانی
اور اس کی موج تبسم سے نشہ باری ہو
فضا میں ہر طرف اک محویت سی طاری ہو
تو خواب یاس سے مجھ کو ذرا جگا لینا
حجاب دید مری آنکھ سے اٹھا لینا
کہ میں بھی اس رخ رنگیں پہ اک نظر کر لوں
وفور شوق میں بڑھ کر قدم پہ سر رکھ دوں
امید و بیم میں جس دم مجھے غش آنے لگے
وہ میری حالت نازک پہ مسکرانے لگے

انعام

انقلاب امریکہ پر اک اجمالی نظر

تمہید | ۱۷۶۳ء بھی برطانوی امریکہ کے لئے نہایت مبارک سال تھا کیونکہ نومبر میں فرانس اور انگلستان نے بساط جنگ کو الٹ دیا تھا اور صلح نامہ پیرس کی رو سے کناڈا اور وادی مسیسپی کے وسیع رقبوں کی حکومت تاج برطانیہ سے متعلق ہو کر فرانس کا اقتدار نئی دنیا سے ہمیشہ کے لئے اٹھ گیا تھا۔

اس انقلاب سے اگر نیویارک، بوسٹن اور فلاڈلفیا میں نعرہ ہائے مسرت بلند کئے گئے تو حیرت نہ کرنی چاہئے کیونکہ تمام اجنبی حکومتوں میں فرانس کی حکومت سب سے زیادہ قوی اور مستحکم ہونے کے لحاظ سے باشندگان امریکہ کی سیاسی آزادی کے لئے سب سے زیادہ حارج تھی۔

اس جنگ سے قبل برطانیہ کا قبضہ امریکہ میں ۱۳ صوبوں پر تھا اور ہر صوبہ میں وہاں کے باشندگان کے اعتبار سے مختلف قوانین رائج تھے۔ ان صوبوں میں چار صوبے میساچوسٹس (Massachusetts) کنکٹکٹ (Connecticut) نیوہیمپشائر (New Hampshire) اور جزیرہ رہوڈ (Rhode Island) نہایت اہم تھے۔ جن کو انگلستان کے مہاجرین قدیم (Pilgrim Fathers) نے آباد کیا تھا۔

نیونیدرلینڈ (New Netherland) کا قطعہ دو صوبوں پر مشتمل تھا نیویارک (New York) اور نیوجرسی (New Jersey) جسے ڈچ لوگوں نے بسایا تھا (بعد کو ڈیلاویر (Delaware) بھی جو سویڈن والوں کی نوآبادی تھا ڈچ کے قبضہ میں چلا گیا اور اس قطعہ میں شمار ہونے لگا) جب چارلس ثانی کے عہد میں ڈچ اور انگلستان کے درمیان جنگ ہوئی تو یہ تمام مقامات حکومت انگلستان سے وابستہ ہو گئے۔

پنسلوانیا (Pennsylvania) کا وسیع رقبہ جسے ولیم پن (William Penn) نے اپنے احباب کے ساتھ ہجرت کر کے آباد کیا تھا دریائے پوٹمک (Potomac) کے جنوب میں ورجینیا (Virginia) تھا جسے ملکہ الزبتھ کی مفروضہ عصمت و عفت کی یاد میں ریلے (Raleigh) نے اس نام سے موسوم کیا تھا (انگریزی میں ورجن (Virgin) عفت مآب یا دوشیزہ کو کہتے ہیں) یہ ان شاہ پرست لوگوں سے آباد تھا جو کرامول (Cromwell) کے خوف سے بھاگ کر یہاں آگئے تھے۔ یہ نوآبادی نہایت قدیم تھی (۱۶۰۷ء) اور یہاں کے لوگ اپنے کو نہایت معزز سمجھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ عہد انقلاب میں یہاں کے لوگوں نے بہت حصہ لیا اور واشنگٹن (Washington) جفرسن

(jefferson) جفرسن ہنری (Henry) اور میڈیسن (madison) جو انقلاب کے روح رواں تھے۔ اسی سرزمین کے فرزند تھے۔

میری لینڈ (Mary land) کو سسل کالورٹ (Cecil Calvert) نے ۲۰ جون ۱۶۳۲ء میں آباد کیا تھا۔

باقی تین صوبوں میں سے شمالی اور جنوبی کیرولینا (Carolina) کو ۱۶۶۳ء میں سالسبری ہیمینیا نے آباد کیا تھا۔ اور جارجیا (Georgia) کا موسس اعلیٰ جنرل اوگلی تھورپ (Ogli Thorpe) تھا جس نے ۱۷۳۲ء میں اس کی بنیاد قائم کی۔

بے چینی کی ابتدا | اس میں شک نہیں کہ ان تیرہ صوبوں پر انگلستان کا قابض ہو جانا کوئی معمولی بات نہ تھی کیونکہ اس طرح ہزاروں مربع میل کا رقبہ اس کے تصرف میں آگیا تھا اور ذرائع تجارت میں غیر معمولی وسعت پیدا ہو گئی تھی لیکن حکومت انگلستان تو اس کے لئے بیتاب تھی کہ چودہ کرور پونڈ جو جنگ میں صرف ہو گئے تھے کیونکر وصول کئے جائیں۔ پھر چونکہ انگلستان کی تاریخ سیاست کا یہ نہایت معمولی واقعہ ہے کہ وہ ہمیشہ نو آبادیوں کا مصرف یہی قرار دیتی ہے کہ اُن کو تباہ و برباد کر کے انگلستان کو دولت مند بنایا جائے اس لئے مسٹر گرنول (Greenville) نے جو یہاں کا گورنر تھا اس رقم کو باشندگان امریکہ سے ٹیکس قائم کر کے وصول کرنا چاہا۔ چنانچہ ۱۰ مارچ ۱۷۶۴ء کو گرنول نے دارالعوام میں یہ تحریک پیش کی کہ امریکہ کی برطانوی نو آبادیوں کی حفاظت و مصارف جنگ کی وصولی کی غرض سے وہاں کی اشیاء پر کچھ محصول لگانا چاہئے جس کی بہترین صورت اسٹامپ کا جاری کرنا ہے۔ نو آبادیوں کی حفاظت سے اُس کا مقصود صرف یہ تھا کہ وہاں ایک زبردست فوج رکھی جائے اور گورنر کے اثرات کو قوی بنایا جائے۔

اسٹامپ بل کا نفاذ | جس وقت امریکہ میں ان تحریکات کی خبر پہونچی تو وہاں سخت بے چینی پھیلی لیکن انگلستان میں اس تجویز کو نہایت مسرت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ مساچوسٹس (massachusetts) کنکٹکٹ (Connecticut) اور پنسلونیا (Pennsylvania) نے اس کے خلاف سخت صدائے احتجاج بلند کی اور شاہ انگلستان کی خدمت میں ایک درخواست روانہ کر کے اپنے ایجنٹوں کو جو لندن میں تھے لکھا کہ ان تجویزوں کی سخت مخالفت کی جائے۔ فروری ۱۷۶۵ء تک نو آبادیوں کی متعدد درخواستیں اور لندن کے تاجروں کی (جنھیں اپنے کاروبار کے لحاظ سے سخت اندیشہ پیدا ہو گیا تھا) بہت سی عرضیاں بادشاہ کے حضور میں پہونچ گئیں، لیکن گرنول نے کچھ پرواہ نہیں کی۔ اور آخر مارچ ۱۷۶۵ء میں اُس نے اسٹامپ بل (Stamp) جاری کر کے یکم نومبر اس کی تاریخ نفاذ قرار دیدی۔ اس درمیان میں میوٹنی ایکٹ (قانون بغاوت) میں یہ فقرہ اور بڑھا دیا گیا کہ وزراء کو اجازت ہے کہ حسب ضرورت جتنی فوج چاہیں امریکہ روانہ کر سکتے ہیں اور کوارٹرنگ ایکٹ (Quartering Act) بھی پاس کیا گیا جس کی رو سے نو آبادیوں پر لازم ہو گیا کہ وہ افواج انگلستان کو جو اُن کے ہاں مقیم ہیں، مکان، بستر، ایندھن، صابون،

روشنی اور مشروبات بھی مہیا کریں۔

اہل امریکہ کی صدائے احتجاج جب امریکہ میں یہ خبریں پہونچیں تو ان کے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی اور تمام نوآبادیوں میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔

ورجینیا میں پیٹرک ہنری (Patrick Henry) نے جو ایک نوجوان وکیل تھا، تحریک مخالفت کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مساچوسٹس کی آبادی نے تمام دیگر نوآبادیوں کو لکھا کہ ماہ اکتوبر تک ایک کانگرس نیویارک میں منعقد کی جانے والی ہے اس لئے ہر نوآبادی کو اپنے نمائندے وہاں روانہ کرنا چاہیئے۔ اسی طرح بوسٹن، نیویارک اور فلاڈلفیا میں بہت سے رسائل شائع کئے گئے جن میں ان ٹیکسوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی تھی اور ظاہر کیا گیا تھا کہ انگلستان کو ان کی آزادی چھیننے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

آخر کار نیویارک میں مسلسل تین ہفتہ تک مباحثہ جاری رہنے کے بعد ایک محضر تیار کیا گیا، جس میں انھوں نے اپنے حقوق ظاہر کئے۔ اور اسی کے ساتھ یہ بتایا کہ ٹیکس عائد کرنے کے لئے صرف انھیں کی جماعت انتظامی کی احکام قابل تعمیل ہو سکتے ہیں۔

انگلستان سے ترک موالات اس کے ساتھ نیویارک کے تاجروں نے لندن کے تجار کو لکھ دیا کہ جب تک یہ معاملات طے نہ ہو جائیں کوئی مال یہاں روانہ نہ کیا جائے۔ اور گوشت کا کھانا بھی کم کر دیا تاکہ بھیڑ کی اون کثیر مقدار میں حاصل ہو سکے اور ملک کے اندر ہی اس سے کپڑا تیار کیا جائے۔ اس وقت تک انگریزی کپڑا پہننا یہاں بڑے فخر کی بات سمجھا جاتا تھا لیکن اس کے بعد ہی یہ انقلاب ہو گیا کہ جو شخص بیرونی کپڑا پہنتا تھا اُسے نگاہ حقارت سے دیکھتے تھے۔ انھوں نے یہ بھی عہد کیا کہ کوئی وکیل کسی انگریز تاجر کے مقدمہ کی پیروی نہ کریگا اور لندن کے تجار کا کوئی قرض ادا نہ کیا جائیگا۔ عدالتوں کے حکام نے اسٹامپ کا استعمال ترک کر دیا اور چنگی کے عمال نے محصول لینا چھوڑ دیا۔ الغرض ادنیٰ سے لیکر اعلیٰ تک ہر شخص نے انگریزوں کو اقتصادی و تجارتی نقصان پہونچانے کا عزم استوار کر لیا۔

انتہا پسند طبقہ نوجوانوں کی ایک جماعت ایسی بھی تھی جو اس سے زیادہ قوی اور جارحانہ ذرائع استعمال کرنے کی طرفدار تھی اور روز بروز ان کا اثر بڑھتا جاتا تھا۔ دولت مند اور ضعیف لوگ ہر چند اس انتہا پسندی کو معیوب سمجھتے تھے، لیکن مستقبل نے ثابت کر دیا کہ یہی انتہا پسندی آخر کار کامیاب ثابت ہوئی اور امریکہ کو پنجۂ استبداد سے انھیں لوگوں نے آزاد کر دیا جو سیتاگرہ کی حد سے گزر کر سختی کا جواب سختی سے دینے کے لئے آمادہ ہو گئے تھے۔

سب سے پہلے ان فرزندانِ حریت نے یہ کیا کہ اسٹامپ تقسیم کرنے والوں کو دھمکا کر ملازمت سے علٰحدہ ہونے پر مجبور کیا اور ان کے پاس سے تمام اسٹامپ لیکر جلا دیئے۔ رفتہ رفتہ یہ شدت بڑھنے لگی، یہاں تک کہ بوسٹن میں دیودار کے ایک درخت میں (جسے اب شجر حریت کہتے ہیں) حامیانِ ٹیکس کے مجسمے بنا بنا کر آویزاں کئے گئے اور پھر گلیوں میں تشہیر کر کے اُن میں آگ لگا دی گئی۔ علاوہ اس کے انھوں نے آلیور (Oliver) سکرٹری اور ہچنسن (Hutchinson) گورنر کے مکانوں کو بھی مسمار کر دیا۔

حکومت نے بہت کوشش کی کہ مجرمین گرفتار ہو جائیں اور مخبرین کے لئے بڑے بڑے انعامات تجویز کئے لیکن اس میں مطلق

کامیابی نہیں ہوئی۔

مظاہرہ کی شدت چونکہ یکم نومبر قانون اسٹامپ کی تاریخ نفاذ تھی، اس لئے اس دن زیادہ قوت کے ساتھ شورش پیدا کی گئی۔ بوسٹن میں دن بھر گھنٹے بجتے رہے حریت پسند لوگوں کے گروہ تمام بازاروں اور گلیوں میں نغمۂ آزادی گاتے ہوئے پھرتے رہے۔ اور آلیور سکریٹری کو اسی شجر آزادی کے نیچے لے گئے اور اُسے مجبور کیا کہ اپنے عہدہ سے دست بردار ہوجائے اور اس کے علاوہ تمام مکانوں اور بازار کی دکانوں پر اشتہارچسپاں کئے گئے۔ جن میں اسٹامپ استعمال کرنے والوں کو سخت دھمکی دی گئی تھی۔ فلاڈیلفیا میں بھی قریب قریب یہی عمل کیا گیا

نیویارک میں اس سے زیادہ شورش پیدا ہوئی۔ یہاں کے نائب گورنر کولڈن (Colden) نے بخیال تحفظ تمام اسٹامپ قلعہ کے اندر مقفل کردیئے تھے جب لوگوں کو یہ حال معلوم ہوا تو انھوں نے کولڈن کی گاڑی پکڑ کے اُسے جلا ڈالا اور پھر قلعہ میں جاکر اس سے اسٹامپ حاصل کرنے چاہے تو اس نے تیغ وتفنگ کی دھمکی دی لیکن جب اس پر بھی یہ لوگ باز نہ آئے تو مجبوراً اس نے سارے اسٹامپ اُن کے حوالے کردیئے جو اسی وقت نذر آتش کر دیئے گئے۔ اس میں شک نہیں کہ بعد کو امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ شورش کم ہونے لگی لیکن اسٹامپ ایکٹ کی مخالفت بدستور باقی رہی اور بائیکاٹ ترک نہیں کیا گیا۔

حکومت برطانیہ کا نقصان اور اسٹامپ ایکٹ کی منسوخی حکومت برطانیہ کو اس ایکٹ کے پاس کرنے میں بارہ ہزار پونڈ صرف کرنے پڑے تھے جس میں سے کل ایک ہزار پونڈ، نیوفونڈلینڈ (Newfoundland) نواسکوٹیا (Nova Scotia) کوئبک (Quebec) فلورڈا (Florida) اور ویسٹ انڈیز (West Indies) سے وصول ہوسکے۔ اور علاوہ اس کے انگلستان کی تمام وہ تجارت جس کا تعلق نوآبادیوں سے تھا تباہ وبرباد ہوگئی کیونکہ انھوں نے عہد کرلیا تھا کہ نہ برطانوی تاجروں کا قرض ادا کریں گے، اور نہ وہاں کی کوئی چیز استعمال کریں گے۔ آخر کار جب انگلستان کے تاجروں نے دیکھا کہ اُن کا نقصان ناقابل برداشت ہے تو انھوں نے صدائے احتجاج بلند کی اور آخر کار پارلیمنٹ میں یہ مسئلہ پیش کیا گیا۔ ہر چند گرنول نے بہت کوشش کی کہ اسٹامپ ایکٹ بدستور جاری رہے لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی اور گرنول کو اپنی وزارت راکنگھم (Rockingham) کے لئے چھوڑنی پڑی۔

ایک جدید ٹیکس کا قیام ہر چند راکنگھم کی وزارت نہایت امن پسند تھی، لیکن پارلیمنٹ میں چونکہ مخالف عناصر بھی کام کر رہے تھے اس لئے زیادہ عرصہ تک یہ حالت قایم نہیں رہی اور آئندہ گرما تک یہ وزارت بھی ختم ہوگئی۔ اس کے بعد گرافٹن (Grafton) وزیر مقرر ہوا لیکن اسکی وزارت بالکل برائے نام تھی اور کام کرنے والے دوسرے تھے۔ چونکہ گرنول ابھی تک نوآبادیوں کے خلاف سازش کر رہا تھا اس لئے اس نے ٹونشنڈ (Townshend) کو جو چانسلر تھا طعنے دے دیکر اس بات پر مجبور کرہی دیا کہ وہ امریکہ کی نوآبادیوں کے لئے کوئی ٹیکس تجویز کرے چنانچہ اس نے ایک بل پیش کیا جس کی رو سے چاء، شیشہ، کاغذ، رنگ اور شیشے پر محصول عاید کیا گیا۔

اہل امریکہ کی مخالفت جب اس کی خبر امریکہ والوں کو پہونچی تو وہ چنگاریاں جو راکنگھم کے عہد میں دب گئی تھیں پھر مشتعل ہونے لگیں اور ہر جگہ

مخالفت رونما ہوگئی جو اس سے قبل پیدا ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ حکومت کے کمشنروں کو بھاگ جانا پڑا۔ بوسٹن میں اسقدر شورش ل گئی کہ چار رجمنٹ وہاں متعین کی گئیں لیکن جس وقت یہ افواج وہاں آئیں تو انھیں معلوم ہوا کہ وہ یہاں نہیں رہ سکتیں کیونکہ کوارٹرنگ ٹ کی پابندی میں یہاں اُن کے لئے کوئی چیز مہیا نہیں کی گئی تھی اور بوسٹن والوں نے کہدیا تھا کہ ہم خود قیام امن کے ذمہ دار ہیں اور کسی ح فوج کی مداخلت گوارا نہیں کر سکتے۔ انھوں نے اس احتجاج کے سلسلہ میں ایک خاص دن مقرر کرکے روزہ رکھا اور جا بجا میں ر دعائیں مانگی گئیں۔

مت و رعایا کے درمیان مناقشہ ۸۔ نومبر کو بادشاہ نے پارلیمنٹ کا اجلاس کیا اور باغیوں کی سرکوبی کے لئے تدابیر سوچی جانے لگیں انچہ ۱۵۔ دسمبر کو یہ قانون نافذ کیا گیا کہ امریکہ کے تمام شورش پسند آدمیوں کو گرفتار کرکے انگلستان لایا جائے اور یہیں اُن کی سزا ویز کی جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امریکہ کے وہ لوگ بھی جو اس سے قبل تحریک آزادی سے الگ تھے شریک ہوگئے اور ایک عام بے چینی پھیل گئی۔

ادی کا حصول تلوار اور بائیکاٹ سے جارج واشنگٹن (George Washington) جو امریکہ کی تاریخ انقلاب ں نہایت ممتاز و نمایاں حیثیت رکھتا ہے اس وقت تک اس شورش سے علیٰحدہ تھا اور ایک خاموش کاشتکارانہ زندگی بسر کر رہا ھا لیکن اس مرتبہ وہ بھی اٹھا اور اُس نے عام طور سے اعلان کر دیا کہ اب آزادی کے لئے تلوار اُٹھانے کا وقت آگیا ہے۔ اسی کے ساتھ انگریزی بنی ہوئی چیزوں کو بائیکاٹ کیا گیا اور عورتوں نے عام طور سے سوت کاتنا اور کپڑا بننا شروع کر دیا جس سے انگریزی تجارت کو سخت نقصان پہونچا اور تمام ملک میں سخت اضطراب پیدا ہوگیا۔

ج سے مقابلہ بوسٹن میں جو فوج متعین کی گئی تھی اس کے لئے سخت خطرات بڑھنے لگے اور آخر کار وہ وقت آگیا کہ آلات حرب کا استعمال کیا جائے۔ ایک دن کسی رسی بنانے والے نے کسی بات پر فوج کے ایک سپاہی کو مارا۔ یہ سپاہی اپنے ساتھیوں کو لیکر آیا لیکن س مرتبہ بھی رسی بنانے والوں کی جماعت نے فوجی دستہ کو بھگا دیا۔ اس کے بعد پوری فوج کی فوج آگئی اور ان لوگوں کا خون نہایت بیدردی سے بہایا۔ اس واقعہ نے لوگوں میں بہت زیادہ شورش پیدا کر دی اور سیکڑوں آدمی لاٹھیاں لے لے کر نکل کھڑے ہوئے۔ فوج نے ان پر فیر کیا جس سے چار آدمی ہلاک ہوئے اور ستر زخمی، اس کے بعد سارا شہر نکل آیا اور اگر نائب گورنر ہیچنسن، دانشمندی سے کام نہ لیتا اور تحقیقات کا وعدہ کرکے فوجیوں کو سزا کا یقین نہ دلاتا تو عام خوں ریزی بالکل یقینی تھی۔

ہرچند دوسرے دن فوج وہاں سے ہٹادی گئی لیکن اہل بوسٹن نے ۵۔ مارچ ۱۷۷۰ء کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ جب سب سے پہلی مرتبہ اُن کے بھائیوں کا خون بہایا گیا اور نہایت درد انگیز اشتہارات شائع کرکے لوگوں کے جذبات میں تحریک پیدا کی گئی۔ اس کے تین دن بعد تمام دکانیں بند کر دی گئیں اور نہایت شان و شوکت کے ساتھ مقتولین کو دفن کرنے کے لئے لے گئے

شورش کا عارضی التوا یہ حالات ایسے تھے کہ شورش کا آخری حد تک پہونچ جانا بالکل یقینی تھا، لیکن اتفاق سے اسی وقت پھر وزارت تبدیل ہوئی اور لارڈ نارتھ (Lord North) نئے وزیر نے سوائے چائے کے اور تمام چیزوں کا محصول معاف کر دیا

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام شورش پھر فرو ہو گئی اور امریکہ و انگلستان کے درمیان وہی تعلقات تجارت قائم ہو گئے جو اس سے قبل پائے جاتے تھے یعنی سوائے چائے کے باقی تمام چیزیں پھر امریکہ میں آنے لگیں۔

اگر حکومتِ انگلستان اب بھی اس راز کو سمجھ جاتی جس سے امریکہ کی حکومت قائم رکھی جا سکتی تھی تو وہ اس امن سے درس حاصل کر سکتی تھی اور آئندہ والی شورش نہ پیدا ہونے دیتی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حکومت کا نشہ انسان کے حواس کو سلب کر لیتا ہے اور ہر چیز کو وہ ہمیشہ غلط روشنی میں دیکھنے کا عادی ہو جاتا ہے۔

اس واقعہ کے بعد تقریباً تین سال تک امریکہ میں بالکل سکون رہا۔ اور کوئی خلش پیدا نہیں ہوئی لیکن بجائے اس کے کہ اہلِ امریکہ کی اس امن پسندی کو ان کی شرافتِ نفسی سے تعبیر کیا جاتا، کموڈور ہوڈ (Commodore Hood) بوسٹن کے حاکم نے اسے زوال سے تعبیر کیا اور گویا یہ لکھا کہ اب یہاں کی رعایا پر پوری طرح اقتدار قائم ہو گیا ہے۔ (حالانکہ میساچوسٹس میں ابھی تک آزادی کا خیال لوگوں کے دماغوں میں باقی تھا۔ اور بعض غیرت مند ہستیاں ہنوز حریت و خود مختاری کے لئے ساعی نظر آتی تھیں) ممکن ہے کہ کموڈور کا یہ خیال کوئی تبدیلی نہ پیدا کرتا لیکن بدقسمتی سے اس اثنا میں ہچنسن، میساچوسٹس کا گورنر بنا کر بھیجا گیا جو نہایت استبداد پسند اور سخت گیر آدمی تھا۔

استبداد کا دوسرا دور | اس وقت تک یہ دستور قائم تھا کہ گورنر کی تنخواہ نو آبادی ادا کیا کرتی تھی لیکن اس نے گورنر ہوتے ہی جماعتِ انتظامی کو اطلاع دی کہ وہ نو آبادیوں سے تنخواہ نہ لیگا، بلکہ اس کے سارے مصارف تاج کی طرف سے ادا کئے جائیں جماعت نے اسے منظور نہیں کیا کیونکہ اس طرح گورنر کے اوپر سے ان کا اقتدار اٹھ جاتا تھا۔ گورنر اور اس کے نائب آلیور (Oliver) نے وزارتِ لندن کو متعدد خطوط لکھ کر یقین دلانا چاہا کہ بغیر سخت گیری کے یہاں کا انتظام نہیں ہو سکتا۔ اتفاقاً یہ تمام تحریریں ڈاکٹر فرینکلن (Franklin) کے ہاتھ پڑ گئیں جو نو آبادیوں کا نمائندہ تھا۔ اس نے یہ تمام تحریریں فوراً بوسٹن کی جماعتِ انتظامیہ کے پاس بھیج دیں۔ اس جماعت نے بادشاہ کو لکھا کہ ہچنسن اور آلیور دونوں علٰحدہ کر دیئے جائیں۔

جذبۂ انتقام کی ابتداء | بادشاہ نے اس معاملہ کو پارلیمنٹ میں پیش کیا۔ اور باقاعدہ تحقیقات ہونے لگی۔ تاج نے ڈوبرن (Wedderburn) اٹارنی جنرل کو گورنر کی طرف سے پیروی کرنے کے لئے مامور کیا۔ اور ڈاکٹر فرینکلن کو اجازت دی کہ وہ نو آبادی کی طرف سے پیروی کرے۔

چونکہ فرینکلن کا طرفدار کوئی نہ تھا اس لئے وڈبرن نے امریکہ پر نہایت سخت حملے کئے اور فرینکلن پر کھلم کھلا سرقہ اور دیگر جرائم کا الزام لگا کر کونسل سے درخواست کی کہ اس شخص کو سزا دینا نہ صرف یورپ بلکہ تحفظِ انسانیت کے لئے ازبس ضروری ہے۔

ڈاکٹر فرینکلن ان تمام الزامات کو سن رہا تھا اور خاموش تھا جب وہ باہر نکلا تو یکسر جذبۂ انتقام بنا ہوا تھا۔ اور اس نے عہد کر لیا تھا کہ جب تک وہ اس کا بدلہ نہ لے گا اس وقت تک اپنا براؤن رنگ کا سوٹ استعمال نہ کرے گا۔ (چنانچہ اس کے دس سال بعد اس نے اسی وقت اپنا محبوب سوٹ پہنا جب برطانیہ اور امریکہ کے درمیان صلح ہو گئی اور نو آبادیاں آزاد ہو گئیں)

اسی وقت جب کہ یہ جھگڑا پارلیمنٹ میں ہو رہا تھا جزیرہ رہوڈ کے باشندوں نے ایک جہاز کو ساحل پر لاکر جلا دیا۔ اس واقعہ سے لندن میں بہت برہمی کے آثار پیدا ہوئے اور چھ سو پونڈ کا انعام اس شخص کے لئے تجویز کیا گیا جو مجرمین کا پتہ چلائے لیکن جب اس میں کامیابی نہیں ہوئی تو ایک نیا قانون یہ بنایا گیا کہ "جو لوگ شاہنشاہ معظم کے کسی جہاز یا لنگرگاہ یا ذخیرہ حربی کو آتش زدگی میں مشتبہ ہوں گے ان کی سماعت براہ راست انگلستان میں ہوگی"۔

چونکہ چاء کی خریداری اہل امریکہ نے محصول کی وجہ سے بالکل بند کر دی تھی اور تقریباً دو کرور پونڈ چاء کمپنی کے ذخیرہ میں بند کرنی پڑی تھی اس لئے اس کی درخواست پر گورنمنٹ نے فی پونڈ صرف تین پنس محصول قائم رکھا اور کمپنی نے مطمئن ہو کر چاء کے جہاز امریکہ کی طرف روانہ کر دیئے لیکن یہ جہاز بندرگاہ بوسٹن میں پہنچنے ہی پائے تھے کہ امریکہ میں شورش پیدا ہوئی اور یہ طے کر لیا گیا کہ چاء کو کسی طرح ملک کے اندر نہ لانے دیا جائے۔ چونکہ افسران بندرگاہ نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ۱۷ دسمبر کو چاء کے بکس ساحل پر اتارے جائیں گے اس لئے ۱۶ دسمبر کی رات میں ۵۲ آدمی جہاز پر گئے اور چاء کے جتنے بکس تھے سب پانی میں ڈال دیا۔ یہی عمل قریب قریب تمام بندرگاہوں میں کیا گیا اور چاء کی کمپنی کو سخت نقصان پہونچا۔

فوجی حکومت اور اعلان آزادی جب ان واقعات کی خبر انگلستان پہونچی تو حکومت اور وہاں کی تمام رعایا سخت برہم ہوئی اور فوراً پانچ قانون نافذ کئے جن کی رو سے حکم دیا گیا کہ (۱) بندرگاہ بوسٹن اس وقت تک نہ کھولا جائے جبتک وہاں کے لوگ کمپنی کے نقصان کو نہ پورا نہ کریں۔ (۲) مساچوسٹس کا چارٹر منسوخ کیا جائے اور وہاں کا انتظام ایسی کونسل کے سپرد ہو جسے حکومت براہ راست نامزد کرے (۳) تمام جلسے بند کر دیئے جائیں (۴) جہاں جہاں ضرورت ہو فوج متعین کی جائے (۵) بجائے سول گورنر کے فوجی گورنر جنرل گیگ ([illegible]) مقرر کیا جائے جو گورنر اور کمانڈر انچیف دونوں کی خدمت انجام دے۔

مئی ۱۷۷۴ء کو جنرل گیگ ایک معقول فوج کے ساتھ بوسٹن پہونچا اور آتے ہی اس نے ان تمام قوانین کا نفاذ کرنا چاہا جو اس سے قبل وزارت لندن میں منظور کئے جا چکے تھے لیکن اس کا ارادہ معلوم ہوتے ہی دوکانیں بند ہونے لگیں، لوگوں نے کاروبار چھوڑ دیا اور پھر عام طور سے اضطراب پھیل گیا۔

اس عرصہ میں مساچوسٹس کے نمایندوں نے عہد کر لیا تھا کہ جبتک ان کو پورے حقوق آزادی نہ مل جائیں گے وہ برطانیہ سے ترک موالات قائم رکھیں گے۔ چنانچہ جنرل گیگ کے آتے ہی ماہ ستمبر انھوں نے فلادلفیا میں ایک عام کانگرس کا جلسہ طلب کیا گورنر نے فوراً اپنے سکریٹری کو بھیجا کہ جلسہ کو ملتوی کر دے لیکن اس کے پہونچنے سے قبل دروازہ بند کر لیا گیا اور قومی اعلان حریت شایع ہو چکا تھا۔

ترک موالات کی شدت طرفداران حکومت کو اس واقعہ سے سخت صدمہ پہونچا اور جنرل گیگ نے ایک عام حکم جاری کیا کہ کوئی شخص اس اعلان پر دستخط نہ کرے اور مجسٹریٹوں کو اختیار دیا کہ جو شخص اس اعلان کو شایع کرے یا اس پر دستخط کرے اسے فوراً گرفتار کر لیا جائے لیکن جنرل گیگ کو اس میں کامیابی نہیں ہوئی بلکہ یہ تشدد اور زیادہ مضر ثابت ہوا۔

اب چونکہ طرفداران حکومت زیادہ پریشان تھے اور علم برداران حریت انھیں ذلیل سمجھنے لگے تھے اس لئے وہ بھاگ گ

بھاگے پھرتے تھے اور کہیں منھ چھپانے کی جگہ نہ ملتی تھی۔ مزدوروں نے اُن کا کام چھوڑ دیا، آٹا پیسنے والوں نے اُن کا آٹا پیسنا ترک کر دیا اور دوکانداروں نے اُن کے ہاتھ چیزیں بیچنے سے انکار کر دیا، آخر کار یہ لوگ بوسٹن آئے کہ فوج کی حمایت میں زندگی بسر کریں اور اس عذاب سے نجات حاصل ہو۔

ملکی کانگریس کا پہلا اجلاس | ستمبر ۱۷۷۴ء میں پہلی مرتبہ ملکی کانگریس نہایت وسیع پیمانہ پر فلاڈلفیا میں منعقد ہوئی، اس نے حکومت کے مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور یہ رزولیوشن پاس کیا کہ جو کوئی گورنمنٹ کی ملازمت کرے گا اس کو جماعت سے علحدہ کر دیا جائیگا۔ اور انسانیت کا دشمن تصور ہوگا۔

اس کے ساتھ ایک نان امپورٹیشن اسوسی ایشن (Non-Importation association) قائم ہوئی جس کے ممبران نے ایک معاہدہ پر دستخط کئے اور خفیہ طور سے لوگوں کو مامور کیا کہ نقض عہد کرنے والوں کے نام معلوم کئے جائیں۔ اس جماعت نے تمام مشاغلِ لہو و لعب (گھوڑ دوڑ، قمار بازی، رقص و سرود اور تھیٹر وغیرہ) کو بند کر دیا کیونکہ حصول آزادی کے لئے تفریح و نشاط کا ترک کر دینا ضروری تھا۔

جنگ کی ابتدا اور حکومت کی پہلی شکست | چونکہ اب حالت زیادہ نازک ہوتی جاتی تھی اور انتہا پسندوں نے ذخائر حرب بھی فراہم کرنا شروع کر دیا تھا، اس لئے جنرل گیگ نے قلعۂ بوسٹن کو محفوظ کر کے ایک دستہ فوج کا روانہ کیا کہ سام آڈمس (Sam Adams) اور جان ہینکاک (John Hancock) کو گرفتار کر کے تمام ذخائر حرب پر قبضہ کرلے جب یہ فوج لکزنٹن (Lexington) پہونچی تو سام اور جان جا چکے تھے، البتہ قومی فوج کا ایک دستہ ضرور موجود تھا۔ جس پر حکومت کے سپاہیوں نے گولی چلائی اور بعد کو ان کی دو توپیں بیکار کر کے بارود کے ذخیرہ میں آگ لگادی۔

یہ خبر منتشر ہوتے ہی تمام ملک نے ہتھیار اُٹھالئے، کاشتکاروں نے اپنی دیہاتی بندوقیں سنبھال لیں۔ مزدوروں نے اپنی اپنی لاٹھیاں اٹھالیں اور زمین کے ایک ایک ذرہ سے سپاہی پیدا ہو گیا۔ ایک انگریز (جو اس وقت یہاں موجود تھا) بیان کرتا ہے کہ مجاہدین کی تعداد اس طرح بڑھ رہی تھی گویا وہ آسمان سے برس رہے ہیں۔ آخر کار جنگ ہوئی اور انھوں نے لال کرتی کی پلٹن کو شکست دے دی۔

اس کامیابی سے انتہا پسندوں کے حوصلے بہت بڑھ گئے۔ یہانتک کہ بوسٹن کا محاصرہ کر لیا گیا اور جنرل گیگ کو مع اپنی فوج کے قلعہ بند ہونا پڑا۔

ان واقعات کو ابھی ایک مہینہ بھی نہ گزرا تھا کہ آرنلڈ (Arnold) نے ٹکنڈروگا (Ticondroga) اور کراؤن پوائنٹ (Crown Point) کے قلعوں پر قبضہ کر لیا جس سے انتہا پسندوں کی ہمت اور زیادہ بلند ہو گئی۔

کانگریس کا دوسرا اجلاس | ۱۰ مئی کو فلاڈلفیا میں کانگریس کا اجلاس ہوا جس میں تمام نوآبادیوں کے نمائندے شامل تھے۔

غالباً دنیا کی تاریخ انقلاب میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ کسی جماعت نے اس قدر کم قوت کے ساتھ اتنے مصائب کے مقابلہ میں حکومت قائم کر لی ہو۔ نہ اس کے پاس روپیہ تھا، نہ انتظام، نہ کوئی باقاعدہ فوج تھی اور نہ کوئی اور ذریعۂ کامیابی تاہم اس نے ہمت کر کے یہ فیصلہ کر لیا کہ امریکہ ہمارا ہی ملک ہے اور ہمیں کو اس کا انتظام کرنا چاہئے "نان امپورٹیشن معاہدہ" پر اب بہت زیادہ سختی کے ساتھ عمل ہونے لگا اور اس شخص کو مجرم قرار دیا جانے لگا جو افسران برطانیہ کے لئے کوئی چیز مہیا کرے۔

چونکہ صورت حالات زیادہ نازک ہو گئی تھی اور جنگ کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا اس لئے جارج واشنگٹن (George Washington) کو جو ورجینیا کا باشندہ تھا اس فوج کی سیادت سپرد کر دی گئی جس نے بوسٹن کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ یہ واشنگٹن وہی تھا جس نے ۱۷۷۵ء میں اپنے ایک دوست کو لکھا تھا کہ حکومت مستعمرات کا ارادہ کبھی یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ خود مختار ہو جائے، لیکن اب اعلان خود مختاری میں نہایت نمایاں حصہ لے رہا تھا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ دو سال کے اندر سیاسی خیالات میں کس قدر انقلاب پیدا ہو گیا تھا اور امریکہ کی نوآبادیاں حصول آزادی کے مدارج کس قدر سرعت کے ساتھ طے کر رہی تھیں۔

یہ بالکل واقعہ ہے کہ اس سے قبل امریکہ کی یہ نوآبادیاں اپنے کو انگلستان کا ایک جزو سمجھتی تھیں اور وہاں کے باشندے نہایت فخر کے ساتھ اپنے تئیں حکومت انگلستان سے وابستہ ہونا ظاہر کرتے تھے، لیکن وزارت لندن کے متمرد اور سرکش افراد نے اس کو گوارا نہیں کیا کہ امریکہ کی نوآبادیاں اپنے جائز حقوق استعمال کرتی رہیں اور اُن کے اقتصادی و سیاسی مسائل کو منصفانہ نگاہ سے دیکھا جائے۔ آخرکار یہ رنجش بڑھتی رہی حتیٰ کہ جب صبر و ضبط کا یارا نہ رہا تو اہل امریکہ نے بھی وہی کیا جو آخر میں ایک مغلوب و محکوم قوم، جابر و ظالم حکومت سے تنگ آ کر کیا کرتی ہے۔

باقاعدہ جنگ کی ابتدا | ٹکنڈروگا اور کراون پوائنٹ مفتوح ہونے کے بعد (جس کا ذکر ابھی ہو چکا ہے) آرنلڈ نومبر ۱۷۷۵ء میں کوئیبک (Quebec) پہونچا اور یکم دسمبر کو منٹگمری (Montgomery) کچھ آدمیوں کو لے کر اس سے مل گیا۔ یہ ساری فوج نو سو تھی، جس کے بھروسے پر منٹگمری نے شہر کا محاصرہ کیا۔ اس کے پاس ذخائر حرب و سامان رسد کم تھا، علاوہ اس کے بیماری بھی فوج میں پھیل گئی تھی، لیکن منٹگمری نے اسی حال میں تین ہفتہ تک محاصرہ جاری رکھا۔ اب اس کے لئے صرف تین صورتیں تھیں یا تو وہ ہتھیار ڈال دے یا واپس جائے یا حملہ کرے۔ پہلی دو صورتیں اس کی غیرت کے خلاف تھیں، اس لئے تیسری صورت پر فیصلہ کر کے ۳۱ دسمبر کو اس نے شہر پر حملہ کر دیا اور اپنی تلوار کھینچ کر سپاہیوں سے کہا کہ "اے نیویارک کے باشندو اپنے جنرل کے پیچھے پیچھے چلے آؤ" وہ سمجھتا تھا کہ شاید اس ناگہانی حملہ سے دشمن کو کچھ نقصان پہونچے گا لیکن اس کا یہ خیال غلط نکلا کیونکہ دشمن ہوشیار تھے اور انھوں نے بندوق کی باڑھ سے اس کی پذیرائی کی۔ منٹگمری کے مارے جانے کے بعد ہر چند آرنلڈ نے بہت کوشش کی کہ سپاہی ہمت نہ ہاریں، لیکن کامیابی نہ ہوئی، ملی افواج کو پسپا ہونا پڑا اور اس طرح کناڈا برطانیہ کے قبضہ میں باقی رہ گیا۔

جنگ کا پہلا سال | جب بوسٹن فتح ہوگیا تو واشنگٹن نے اپنا صدر مقام نیویارک کو بنایا اور اسکو قلعہ بند کرنے کی تدابیر میں مصروف ہوگیا۔ جولائی میں نیویارک کی افواج کو خبر ملی کہ کانگرس نے اعلانِ آزادی کر دیا ہے، چنانچہ بہت کچھ اظہارِ مسرت کیا گیا۔ تقریریں ہوئیں گھنٹیاں بجائی گئیں اور حکومت برطانیہ کے جھنڈے پامال کئے گئے۔ یہاں جارج ثالث کا ایک مجسمہ سیسے کا نصب تھا، سپاہیوں نے اس کی گردن کاٹ کر گورنر کے مکان پر پہونچادی، اور باقی حصہ لچ فیلڈ (Litch-field) بھیجدیا گیا جہاں خواتین حریت نے اس کو گلا کر چالیس ہزار گولیاں تیار کیں۔

اب جنگ کو ایک سال کا زمانہ گزر گیا تھا اور اہلِ امریکہ اپنی غیر متوقع کامیابی پر بہت مسرور تھے، لیکن بعد کو انھیں معلوم ہوا کہ انگلستان آسانی کے ساتھ ان نوآبادیوں کو نہ چھوڑ سکتا تھا اور وہ اپنی پوری قوت صرف کرنے کی طیاریاں کر رہا تھا۔

حکومت کی طیاریاں | دریاے پوٹومک (Potomac) کے شمال میں مستعمرات کی آبادی کا بڑا حصہ واقع تھا اس لئے برطانوی افواج کے کمانڈر نے یہ تدبیر سوچی کہ اُدھر سے نیویارک پر حملہ کیا جاے اور ادھر کناڈا سے چل کر بیان کا جنرل ملجائے، اس طرح یہ سارا قطعہ الگ ہوجائیگا اور پھر جنوبی حصہ کا مفتوح کرنا دشوار نہ رہے گا۔

اگست میں جنرل ہو (Howe) ۲۴ ہزار فوج لیکر آگیا اور اس سے کلنٹن (Clinton) کی ہزیمت خوردہ فوج بھی آکر مل گئی۔ اس کے بعد اور کمک پہونچی حتی کہ کل فوج ۵۵ ہزار ہوگئی۔

برطانیہ کا فریب | جنرل ہو نے واشنگٹن کو ایک تحریر بھیجی جس میں ہتھیار ڈال دینے والوں کے لئے ایک معافی نامہ بھی ملفوف تھا۔ واشنگٹن نے کہا کہ میں دشمنانِ ملک کی طرف سے کسی تحریر پر اعتبار کرنے کا عادی نہیں ہوں، جنرل ہو نے مکرر ایک تحریر روانہ کی جس کو اس نے بغیر پڑھے ہوئے واپس کر دیا۔ کانگرس نے حکم دیا کہ برطانیہ کا معافی نامہ تمام اخباروں میں شائع کیا جائے تاکہ ہر شخص کو معلوم ہوجائے کہ حکومت برطانیہ کس قدر مکاری سے کام لے رہی ہے۔

واشنگٹن کی ناکامیابیاں | جنرل ہو کے مقابلہ میں امریکہ کی قومی فوج صرف گیارہ ہزار تھی، جس میں سے دو ہزار کے پاس کوئی ہتھیار بھی نہ تھا، لیکن قومی کمانڈر شکستہ دل نہیں ہوا تھا اس نے نو ہزار آدمی فوراً بروک لین کی طرف روانہ کئے تاکہ برطانوی افواج کی پیشقدمی کو روکیں۔ لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی اور ۲۷۔اگست کو ایک سخت شکست کے بعد واشنگٹن نے اپنا مرکز ہٹاکر ہارلم (Harlem) کی بلندی پر قائم کیا، لیکن یہ تدبیر بھی سودمند ثابت نہ ہوئی اور افواج برطانیہ نیویارک میں داخل ہوگئیں، اس طرف جب واشنگٹن کو معلوم ہوا کہ جنرل ہو، نیوجرسی (New Jersey) کی طرف جا رہا ہے تو اس نے جلدی جلدی ہڈسن کو عبور کیا اور جنرل گرین سے قلعہ لی (Lee) میں مل گیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس وقت افواجِ امریکہ کی قسمت خراب تھی اور ہر جگہ ناکامیابی ہورہی تھی چنانچہ پے در پے متعدد مقامات ہاتھ سے نکل گئے اور واشنگٹن کو دریائے ڈلاور (Delaware) عبور کرنا پڑا کیونکہ اب یہی ایک دریا دشمن افواج کے راستہ میں حائل ہوسکتا تھا۔

ہر چند واشنگٹن ان ہزیمتوں سے پریشان تھا اور اہل امریکہ بھی سخت بد دل ہوگئے تھے لیکن واشنگٹن کو بدستور اپنی جگہ پر قائم

رکھا گیا اور اُسے کامل اختیارات جنگ کے متعلق دیدیئے گئے۔

چونکہ گزشتہ تجربات نے اُسے بہت مایوس کر دیا تھا اس لئے وہ اس فکر میں تھا کہ آخری مرتبہ ایک کوشش اور کرے اور اپنی جان دیدے۔ اس وقت جنرل لی بھی اپنی فوج لیکر آگیا تھا اور اس طرح واشنگٹن کے پاس کل چار ہزار فوج تھی، اس نے خیال کیا کہ دریائے ڈیلوار کو عبور کرکے دفعۃً ٹرنٹن پر حملہ کرنا چاہئے۔ (جہاں برطانوی قبضہ موجود تھا) اور ریل (Rahl) یہاں کا کمانڈر تھا چنانچہ اس کے لئے اُس نے ۲۴۔ دسمبر کی رات تجویز کی۔

واشنگٹن کی کامیابی | واشنگٹن کا خیال تھا کہ نصف شب تک اس کی فوج دریا سے عبور کر سکے گی لیکن اس کا خیال غلط نکلا اور صبح چار بجے تک وہ بمشکل اس مرحلہ کو طے کر سکا۔ بجے صبح کو اس نے حملہ کیا اس حال میں کہ کرنل ریل اور اس کی فوج مصروف استراحت تھی۔ اس جنگ میں کرنل ریل مارا گیا اور ایک ہزار قیدی، ۶ توپیں اور چار جھنڈے واشنگٹن کے قبضے میں آئے۔ اس غیر متوقع کامیابی سے اہل امریکہ کے حوصلے بہت بڑھ گئے اور واشنگٹن نے پرنسٹن (Princeton) پر حملہ کرکے یہاں بھی کامیابی حاصل کی اور دشمن کا توپ خانہ اس کے قبضہ میں آگیا۔

برطانیہ کی کمک اور اہل امریکہ کی بد دلی | مئی میں جنرل برگوائن (Burgoyne) کناڈا سے کمک آیا اور بہت بڑی فوج اپنے سا لایا تاکہ اہل امریکہ سے انتقام لے (اس وقت یورپ سے اور کمک بھی آگئی تھی) اب جنرل برگوائن کے پاس آٹھ ہزار مرتب فوج تھی، یہ کراؤن پوائنٹ کی طرف بڑھا جو بغیر مدافعت کے فتح ہوگیا۔ اور پھر یہاں سے چل کر ٹکنڈروگا کو بھی فتح کر لیا۔ اس شکست سے اہل امریکہ کو بہت افسوس ہوا کیونکہ ان کی سو توپیں اور بہت سا ذخیرہ حرب بھی قلعہ کے ساتھ ہاتھ سے نکل گیا تھا اس کے بعد قلعہ ایڈ (Edward) بھی اس کے قبضہ میں آگیا۔ جب ان واقعات کی خبر شائع ہوئی تو ملک میں بہت اضطراب پھیلا اور کانگرس میں سخت مباحثہ ہوا، حتیٰ کہ جان آڈمس نے یہ بھی کہدیا کہ جب تک ہم اپنے کسی جنرل کا کورٹ مارشل نہ کریں گے اس وقت تک کامیابی نہیں ہو سکتی۔

ردِ عمل | اس وقت شویلر (Schuyler) امریکن افواج کا جنرل تھا اس نے اس طعن و تشنیع کی پرواہ نہیں کی اور برگوائن سے آخری مقابلہ کے لئے تیار ہو گیا، اس نے دیکھا کہ اب سوائے اس کے کوئی تدبیر نہیں ہے کہ دریائے ہڈسن کو جو دشمن کے سامنے حائل ہے ناقابل عبور کر دیا جائے۔ چنانچہ بہت سے پل اس نے توڑ دیئے اور جنگل کے تمام درخت کاٹ کاٹ کر اسے دشوار گزار بناد جنرل برگوائن بڑھا، لیکن اس قدر دقت و تعویق کے ساتھ کہ امریکن افواج کو اپنی حالت درست کرنیکا کافی موقع مل گیا۔

جب برگوائن دریائے ہڈسن کے ساحل پر پہونچا تو اُسے معلوم ہوا کہ سامان رسد بہت کم رہ گیا ہے، یہ اسی فکر میں مبتلا تھا کہ ایک شخص نے اطلاع دی کہ بننگٹن (Bennington) میں امریکن افواج نے کافی سامان رسد فراہم کیا ہے جو زیادہ محفوظ بھی نہیں ہے۔ چنانچہ جنرل نے ایک افسر بام (Baum) کو تقریباً ایک ہزار سپاہیوں کی جمعیت دے کر اس طرف روانہ کیا۔ یہاں ایک امریکن افسر اسٹارک (Stark) حفاظت کے لئے متعین تھا۔ اس نے بام کو سخت شکست دی۔ ا

کامیابی کا اثر نہایت اچھا ہوا' چاروں طرف سے رعایا جمع ہونے لگی اور برطانوی افواج کے مظالم کا انتقام لینے کے لئے ہر شخص آمادہ ہو گیا۔ اب جنرل شویلر نے برگوائن کو مغلوب کرنے کا عزم کر لیا ہے۔ لیکن اسی وقت کانگرس نے جنرل گیٹس ([illegible]) کو متعین کیا۔ ہر چند جنرل شویلر کے لئے یہ وقت نہایت سخت تھا کہ جب وہ ساری تیاری کر چکا تو معزول کر دیا گیا' لیکن اس نے کچھ پرواہ نہیں کی اور معزول ہونے کے بعد بھی وہ گیٹس کی مدد کرتا رہا۔

افواج برطانیہ کی شکست اور فرانس کی طرفداری اہل امریکہ سے

اس میں شک نہیں کہ جنرل برگوائن نہایت ہمت کے ساتھ لڑا اور امریکن افواج کو سخت مشکلات کا سامنا ہوا' لیکن رسد نہ ہونے اور کمک وقت پر نہ پہنچنے کی وجہ سے آخر کار متعدد بار جنگ کرنے کے بعد اس نے ہتھیار ڈال دئے' اس کامیابی کا نتیجہ یہ ہوا کہ فروری ۱۷۷۸ء میں فرانس نے اہل امریکہ کی خود مختاری کو تسلیم کر لیا اور برطانوی پارلیمنٹ نے بھی وعدہ کیا کہ اب ان پر کوئی ٹیکس عائد نہیں کیا جائیگا' بشرطیکہ وہ ہتھیار ڈال دیں' لیکن یہاں تو آزادی کی ہوا سر میں سمائی ہوئی تھی وہ کیونکر اس کو منظور کر سکتے تھے۔

فرانس و برطانیہ کی مخالفت

چونکہ فرانس نے امریکہ کی آزادی کو تسلیم کر لیا تھا اور برطانیہ تسلیم نہ کرتی تھی' اس لئے برطانیہ نے فرانس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور لوئی شانزدہم نے فوراً ایک جنگی جہاز اہل امریکہ کی مدد کے لئے روانہ کیا۔

اس وقت تک جنگ کو جاری ہوئے تین سال کا زمانہ گزر گیا تھا اور صرف نیویارک' فلاڈیلفیا' نیو پورٹ اور دریائے ہڈسن و ڈیلاویر کے ساحل زیریں پر ان کا قبضہ تھا باقی حصہ مغلوب نہ ہوا تھا۔

برطانوی افواج کی کامیابیاں

مئی میں بجائے جنرل ہو کے سر ہنری کلنٹن (Henry Clinton) انگلستان سے مامور ہو کر آیا' اس نے چاہا کہ فرانسیسیوں کے پہونچنے سے قبل ہی اپنی افواج کو ایک مرکز پر لے آئے چنانچہ ۱۸۔ جون کو اس نے فلاڈیلفیا خالی کر دیا اور نیویارک چلا گیا۔ یہ نیویارک پہونچا ہی تھا کہ فرانسیسی جہاز چار ہزار فوج لیکر آ گیا' ہر چند فرانس کی یہ مدد برمحل تھی اور اہل امریکہ کو اس سے بہت تقویت پہونچی' لیکن برطانوی افواج کی کامیابیاں بڑھتی جا رہی تھیں' یہاں تک کہ ۱۷۸۰ء کے آخر تک تمام جارجیا کا حصہ برطانیہ کے قبضہ میں چلا گیا۔ اور باوجود اس کے کہ اب ہسپانیہ بھی امریکہ کا طرفدار ہو گیا تھا اہل امریکہ کو کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی اور جنرل واشنگٹن بدستور ناکامیاب رہا۔

اہل امریکہ کی کامیابی

۲۔ دسمبر کو جنرل گیٹس کے بجائے جنرل گرین متعین ہوا اور اس نے کیرولینا پہونچکر معلوم کیا کہ یہاں کی حالت بہت خراب ہے' صرف دو ہزار سپاہی موجود ہیں اور تین دن سے زائد عرصہ کے لئے سامان رسد نہیں ہے' اس لئے اس نے سب سے پہلے رسد کا انتظام اور پھر ۰۰ ۵ سپاہی دریائے سانتی (Sanlee) کی طرف روانہ کئے جنھوں نے دشمن کے ۸۰۰ آدمیوں کو گرفتار کیا اور بہت سا ذخیرۂ حرب بھی ہاتھ آیا۔ یہ ٹارلٹن (Tanleton) کی پہلی شکست تھی جس سے اس کے اقتدار کو سخت صدمہ پہونچا۔ اس کے بعد گرین اور مارگن (Margan) دریائے یاڈکن (Yadkin) کی طرف سے بڑھے جو ورجینیا کے راستے میں ملتا ہے۔ جنرل کارنوالس نے ان کا تعاقب کیا۔ لیکن دریا میں مد پیدا ہو جانے کی وجہ سے وہ کامیاب نہ ہوا اس کے بعد برطانوی

اج کا مرکز اعظم یارک ٹاؤن (Yorktown) قرار پایا اور واشنگٹن نے اپنی توجہ اسی طرف مبذول کردی۔ چنانچہ عین اسوقت لہ کارنوالس کمک کا انتظار کر رہا تھا۔ واشنگٹن نے فرانسیسی افواج کے ساتھ اس کا محاصرہ کرلیا۔ اس وقت اس فوج کی تعداد ہزار تھی اور تمام ضروری سامان حرب اور رسد سے آراستہ تھی چونکہ اب کارنوالس کی فتح و شکست پر اس تمام انقلاب کا انحصار تھا اس لئے ں نے بھی ارادہ کرلیا کہ آخر وقت تک ہمت نہ ہارے گا لیکن فطرت کا مقصود یہ نہیں تھا اور وہ کچھ اسباب اور پیدا کر رہی تھی۔

امریکہ کی آخری فتح اور آزادی

جب واشنگٹن نے محاصرہ کی تکمیل کرلی تو شہر پناہ پر گولہ باری شروع کی اور ۱۴۔ اکتوبر ۱۷۸۱ء کو دو برجوں پر قبضہ کرلیا چونکہ کارنوالس اپنی کامیابی کی طرف سے مایوس ہو چلا تھا اس لئے اس نے چاہا کہ رات کے وقت دریا کو بور کرکے بھاگ جائے، مگر عین اسوقت جبکہ وہ دریا سے گزر رہا تھا سخت آندھی اٹھی اور بہت سی کشتیاں غرق ہوگئیں، آخر کار مجبور ہو کر ۱۹۔ اکتوبر کو برطانوی افواج نے ہتھیار ڈال دئیے اس خبر سے امریکہ میں نعرہ ہائے مسرت بلند ہوئے اور ہر جگہ چراغاں کیا گیا۔ برخلاف ں کے انگلستان کی وزارت کو اس قدر صدمہ پہونچا کہ لارڈ نارتھ وزیر نے استعفا دیدیا کہ اُسے شرائط صلح طے نہ کرنے پڑیں۔ اس کے بد لارڈ شل برن (Shelburne) وزیر ہوا، اس نے بہت کوشش کی کہ فرانسیسیوں سے علٰحدہ ہو کر امریکہ سے جداگانہ صلح کرلے، یکن اہل امریکہ نے اسے منظور نہیں کیا۔ آخر کار ۳۔ ستمبر ۱۷۸۳ء کو ۶ سال کی جنگ کے بعد ورسلیس (Versailles) میں صلح نامہ مرتب ہوا جس کی رو سے امریکہ بالکل آزاد ہوگیا۔

نیاز

غزل

خوشی سے رنج کا بدلہ یہاں نہیں ملتا
وہ مل گئے تو مجھے آسماں نہیں ملتا

ہزار ڈھونڈھئے اسکا نشاں نہیں ملتا
جبیں ملے تو ملے آستاں نہیں ملتا

مجاز اور حقیقت کچھ اور ہے، یعنی
تری نگاہ سے تیرا بیاں نہیں ملتا

بھڑک کے شعلۂ گل تو ہی اب لگا دے آگ
کہ بجلیوں کو مرا آشیاں نہیں ملتا

وہ بدگماں کہ مجھے تاب رنج زیست نہیں
مجھے یہ غم کہ غم جاوداں نہیں ملتا

تری تلاش کا فی الجملہ ماحصل یہ ہے
کہ تو یہاں نہیں ملتا وہاں نہیں ملتا

بتا اب اے جرس دور میں کدھر جاؤں
نشانِ گرد رہ کارواں نہیں ملتا

مجھے خبر ہے ترے تیر بے پناہ کی خیر
بہت دنوں سے دل ناتواں نہیں ملتا

دیار عمر میں اب قحط مہر ہے فانی
کوئی اجل کے سوا مہرباں نہیں ملتا

(شوکت علیخاں فانی)

ناسزا جوانی

خوشا، وہ دن کہ شادابی تھی دلہن جب لڑکپن کی
گھٹا گھر کر جب آتی تھی، میں اس کے گیت سنتا تھا
ہم اکثر جھیل میں جس وقت چوپائے اترتے تھے
صدائیں دلفریب آتی تھیں چڑیوں کے بسیرے سے
نہایت لطف آتا تھا خنک جاڑوں کی راتوں میں
وہ ہنستا تھا، ہوا میں دوڑتی تھی روح نرمی کی
گلوں پر ناز سے وہ جھومتا چلتا تھا کیاری میں
زمیں سے چاند جب آہستہ آہستہ نکلتا تھا
ہوائے سرد کے جھونکے ہمیں بیخود بناتے تھے
خوشی کا دور تھا، سرشار تھے جام تلطف سے
نہ دن کو دل دھڑکتا تھا، نہ شب کو آنکھ روتی تھی

کیا کرتا تھا وہ بھی سیر میرے ساتھ گلشن کی
چمن میں گوندھتا تھا ہار میں، وہ پھول چنتا تھا
گھنے پیڑوں کے ٹھنڈے سایہ میں آرام کرتے تھے
نکل جاتے تھے ہم گلگشت کرنے منھ اندھیرے سے
انگیٹھی کے کنارے صبح ہو جاتی تھی باتوں میں
وہ سناٹا، وہ ٹھنڈی چاندنی، راتیں وہ گرمی کی
کہ جھولا جھولتا تھا سایۂ ابر بہاری میں
مرے شانہ پہ رکھ کر ہات وہ پہروں ٹہلتا تھا
فرشتوں کی طرح شفاف چشموں پر نہاتے تھے
جھجک سے بے خبر، آزاد تھے قید تکلف سے
محبت تھی مگر دونوں کو اس کی حس نہ ہوتی تھی

کسے معلوم تھا اک روز ہوگی سرگرانی بھی
زمیں ہلتی رہی، ذرات میں ہوتی رہی گردش
بھرے ظالم کے شانے کشتیِ طفلی کے کھینے سے
جلا پردے ہی پردے میں ہوئی زلف پریشاں پر
لبوں کو پرتوِ انوار سے دھوتی رہی بجلی
تغیر یہ ہوا کچھ اس طرح خاموش سرعت سے
اک آنسو تھا سرِ مژگاں کہ بچپن کا زمانہ تھا

دبے پانوں چلی آتی ہے تیزی سے جوانی بھی
نہ جانے کس طرح جذبات میں ہوتی رہی گردش
کلی کھلتی گئی بالیدگی کی سانس لینے سے
زمرد کے ورق چڑھتے رہے رخسار تاباں پر
نظر میں اس کی رفتہ رفتہ حل ہوتی رہی بجلی
کہ جب پردے ہٹے آنکھوں نے دیکھا سخت حیرت سے
تبسم برق کا تھا، خواب کی لے کا ترانہ تھا

نقاب الٹی ہوئی ہے، رونقِ محفل کا جلوہ ہے
نظر اب جو اٹھی، دیکھا کہ اک قاتل کا جلوہ ہے

چٹانیں بہ رہی ہیں، سینۂ آہن میں نرمی ہے
برابر عرش سے تا فرش ہر ذرہ میں گرمی ہے
مرے سینہ کے ہر گوشہ سے شور الاماں اٹھا
جگر میں آگ بھڑکی اور رگ رگ سے دھواں اٹھا
سکت جاتی رہی اعضا سے، سر چکرا گیا میرا
وہ دل میں درد اٹھا، ہر رونگٹا تھرّا گیا میرا
بڑھا وہ سوزِ غم ہونٹوں پہ گویا کھنچ کے دم آیا
معاً آنکھوں میں اشک، و لبِ سوزِ غم آیا
نظر آیا کوئی شمعیں سی لئے پہلے تو آنسو میں
یکایک کھل گیا پھر ایک دروازہ سا پہلو میں
حریمِ دل کی میری چشمِ گریاں نے زیارت کی
نظر آئی مجھے ہنستی ہوئی دیوی محبت کی
تپش نے حسن کی، اُف ہڈیوں تک کو گلا ڈالا
زباں سے یہ مرے بیساختہ نکلا "جلا ڈالا"

یہ سنتے ہی جبیں حسن پر پہلی شکن آئی
جلو میں سیکڑوں جلوے لئے تازہ دلہن آئی
یکایک دل میں پارہ عشق کا چڑھتے ہوئے دیکھا
جب اس نے حد سے میرے درد کو بڑھتے ہوئے دیکھا
کہا کچھ زیرِ لب زلفیں ہٹا کر روئے تاباں سے
مہک دوشیزگی کی آئی ہونٹوں کے گلستاں سے
کلی ننھے سے دل کی، غم سے کمہلانے لگی گویا
جماہی کی طرح لی سانس، نیند آنے لگی گویا
"جو چھیڑو گے تو رو دیں گے" ادائیں یہ پکار اٹھیں
تنفس میں خلل آیا، نگاہیں بار بار اٹھیں
بچا کر آنکھ دیکھا اس نے میری غیر حالت کو
ادا سے پھیر کر پلکوں سے انگشتِ شہادت کو
نظر میں آ گئے ارماں سارے کھنچ کے سینے سے
گلابی ہو گیا کچھ اور بھی چہرہ پسینے سے
بڑھی نازک دماغی، سادہ لوحی میں کمی آئی
جبیں پر خط پڑے رنگین آنکھوں میں نمی آئی
حیا کی شمع جل اٹھی، حریمِ دلربائی میں
گھمایا سر جھکا کر دیر تک کنگن کلائی میں
گلے پر ہمدمِ طفلی کے تیغ خوں فشاں پھیری
ذرا سا مسکرا کر سرخ ہونٹوں پر زباں پھیری

طرب کی روح تھی جو، موت ہے اب شادمانی کی
مری طفلی کی جنت بن گئی دوزخ جوانی کی
ہزاروں بند قائم ہو گئے ذخّارِ دریا میں
حدیں کھنچی گئیں راحت کی لامحدود دنیا میں

بیاں اے جوشؔ ہوگا حشر میں یا سوزِ نہانی کا
ہمارا ہات ہوگا اور گریباں نوجوانی کا

جوشؔ (ملیح آبادی)

غزل

ما بسر داریم دائم سازِ عشرت خانہا — از حضورِ وحشت دل میچکد ویرانہا
گریۂ بے اختیار من بہ بزمش ایں چہ کرد — نامہ برلب شود رازِ دلم افسانہا
ہاں، بکن دل را خراب و ہوش را برباد دہ — اے کہ چشم مست تو تکلیفِ صد میخانہا
ایں نہ دانم بعد من چوں شد پریشاں زلفِ او — او کہ بر دوشِ عدو افشاندہ ماتم خانہا
آرزوے لطف از اہلِ وطن داری نیاز — کے مگسہا شد حریفِ سوزشِ پروانہا

اے کہ با چشمانِ مستت ساحری فن آمدی — فرصتت بادا کہ دل را ہوش افگن آمدی
ہاں دلم برہم شکن امانہ آساں ایں چنیں — اے کہ قلبِ مستمنداں را شکستن آمدی
اے دلِ گریہ طلب آزار چشمم تا کجا — تو کہ مژگاں را ز خونِ ناب بستن آمدی
کاوشِ بے صرفہ ام تا چند با دل اے بہار — اے کہ تو گل را طراز چاک دامن آمدی
من کہ بندم صد تمنایم بہ ہر فردائے تو — تو کہ ہر فردا ز عہدِ خود گسستن آمدی
احترازت شد فزوں چندانکہ شد نشو شباب — تیرہ بختے آمدی چندانکہ روشن آمدی
از چہ رنجی اے نیاز از بے نیازیہائے دوست — تو نیاز ہستی و اینجا بس شکستن آمدی

حرکت کے کرشمے کائنات میں

عام خیال ہے کہ علوم جدید و لوگوں میں الحاد و لا اوریت کے خیالات پیدا کرتے ہیں لیکن میرے نزدیک ایسا سمجھنا بالکل ایسا ہے جیسے خدا کا انکار کر دینا، صرف اس دلیل کی بنا پر کہ وہ ہمیں نظر نہیں آتا۔

ایک معمولی آدمی دیکھنے کے معنی صرف یہ لیتا ہے کہ کوئی چیز مجسم حالت میں اسکی آنکھوں کے سامنے آجائے لیکن ایک صاحب علم و ہوش جانتا ہے کہ چھوتا، سونگھنا، چکھنا، سننا اور اس سے زیادہ صرف کسی بات کو سمجھ لینا بھی دیکھنا ہی ہے کیونکہ دیکھنا اپنے زیادہ وسیع معنی میں نام ہے اس ادراک یا حس (Phenomena [illegible]) کے ذریعے ہمیں حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے اگر ایک ہیئت داں یہ کہتا ہے کہ میں حرکت اجرام کو دیکھتا ہوں، اگر ایک ماہر کہربائیت دعوی کرتا ہے کہ تموجات برق مجھے نظر آتے ہیں، اگر ایک عالم کیمیا مدعی ہے کہ پانی کے تمام اجزاء اس کی نگاہوں کے سامنے ہیں اور اگر ایک ماہر طبیعیات کہتا ہے کہ وہ کائنات اور کائنات کے ذرہ ذرہ کو گردش میں دیکھتا ہے تو آپ اس وجہ سے انکار نہ کیجئے کہ آپ اس کے دیکھنے سے عاری ہیں بلکہ اس کو تسلیم کیجئے یہ سمجھ کر کہ خدا کی قدرت کے مظاہر و آثار غیر متناہی ہیں اور کون کہہ سکتا ہے کہ وہ موجودات کے اندر کس کس رنگ کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

زمانۂ قدیم میں زمین کو مسطح اور چپٹی جانکر آسمان کو ایک گردش کرنے والے سرپوش کی طرح سمجھتے تھے جس میں سورج جڑا ہوا تھا اور خدا کی قدرت کی یہ نشانی نہایت عجیب و غریب سمجھی جاتی تھی، لیکن اگر علوم جدیدہ کا ماہر کہتا ہے کہ خدا کی دنیا اس قدر وسیع ہے کہ اگر یہ تمام نظر آنے والے ستارے، سورج، چاند، زمین، ایک دم فنا ہو جائیں تو موجودات عالم کو اتنا بھی نقصان نہیں پہونچتا جتنا سمندر کو ایک قطرے کے ضائع ہونے سے ہو سکتا ہے، اگر ایک ہیئت داں تم کو بتاتا ہے کہ زمین کے ساتھ اور بھی اتنے اتنے بڑے کرے کہ سیکڑوں زمینیں ان میں سما جائیں آفتاب کے گرد ہزاروں میل فی گھنٹہ کے رفتار سے گردش کر رہے ہیں اور پھر سورج بھی اپنے نظام شمسی کے ساتھ کسی اور کرہ کا طواف ۲۴ ہزار سالوں میں کر لیتا ہے، تو کیا تمھارے لئے اس بیان میں خدا کی قدرت کی اور زیادہ کھلی ہوئی عجیب و غریب نشانیاں نہیں ہیں؟

ایک ڈاکٹر بیان کرتا ہے کہ پانی کے اس چھوٹے سے قطرہ میں جو سوئی کی نوک پر ٹھہر رہا ہے کروروں جاندار کیڑے موجود ہیں، تم اسے سنکر ہنستے ہو، شاید اس وجہ سے کہ خدا ایسا کرنے پر قادر نہیں ہے،

دوسرا عالم دعوی کرتا ہے کہ دنیا کا چھوٹے سے چھوٹا ذرہ بھی ان لاکھوں ذروں سے مرکب ہے جو ہر وقت گردش کرتے رہتے ہیں تو تم یقین نہیں کرتے غالباً اس لئے کہ خدا کی قدرت کو تم اس قدر وسیع خیال نہیں کرتے،

لیکن یاد رکھو کہ انسانی افکار جس قدر ترقی کرتے جائیں گے، اسی قدر زیادہ ہم کو مظاہر قدرت و مناظر فطرت کا وقوف ہوتا جائیگا اور جس قدر ہم ان کے حالات سے زیادہ آگاہ ہوں گے۔ اسی نسبت سے ہم کو خدا کی قدرت کا زیادہ یقین ہوتا جائیگا۔

یہی وہ خیال تھا جس کی بناء پر ہم نے مسائل ہیئت کے متعلق نگار میں مختلف مضامین شائع کئے (اور کرتے رہیں گے) تاکہ لوگوں کے افکار میں زیادہ وسعت پیدا ہو اور وہ سمجھ سکیں کہ خالق و مخلوق کے درمیان جو رشتہ قائم ہے وہ کس حد تک استوار ہے اور ہماری ہستی کائنات عالم میں کیا ہے؟

پھر جس طرح علم ہیئت اس لحاظ سے حد درجہ دلچسپ علم ہے اسی طرح طبیعیات، علم الکیمیا بھی ہیں اور آج کی صحبت میں ہم تمہیں حرکت کے کرشمے بتاتے ہیں کہ وہ کس حد تک نظام کائنات پر موثر ہیں اور مخلوقات عالم باہمدگر کس قدر ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔

انگریزی میں متعدد کتابیں ان فنون پر موجود ہیں لیکن اردو (جس میں آج تک وضع اصطلاحات ہی کی بحث ختم نہیں ہوئی) ایسے مضامین سے یکسر محروم ہے، حالانکہ اصل مقصود تو مضامین کا لکھنا ہے، جن سے خود اصطلاحات قائم ہو سکتے ہیں (دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں ہے جس میں پہلے اصطلاحات وضع کر لی گئی ہوں)۔

اس سلسلۂ مضامین کو جو نقولا حداد مشہور عالم طبیعیات کے افکار سے ماخوذ ہے زیادہ دلچسپ بنانے کی کوشش کی گئی ہے، تاکہ ایسے خشک علمی مضامین پڑھنے کا ذوق لوگوں میں عام ہو جائے۔

قوانین حرکت

ہم دیکھتے ہیں کہ بندر انسان کی نقل کرتا ہے، بچہ والدین کی تقلید کرتا ہے، وضع و لباس تقلید ہی کی قوت سے لوگوں میں سمندر کی موج کی طرح پھیل جاتا ہے، موسیقی جاننے والے جانتے ہیں کہ اگر ستار کے ایک تار کو حرکت دی جائے تو اس کے قریب کے تار سے بھی وہی آواز نکلے گی جو پہلے تار سے نکلتی ہے۔

بعض افراد کے درمیان الفت و انس ہوتا ہے اور بعض کے درمیان نفرت و عداوت، علم وظائف الاعضاء (Physiology) کے ماہرین کہتے ہیں کہ ہم آواز اس لئے سنتے ہیں کہ آواز پیدا کرنے والے جسم کے اہتزازات (Vibrations) ہوا میں امواج صوتی پیدا کرتے ہیں، یہ موجیں حرکت کرتی ہوئی کان کے پردہ سے ٹکراتی ہیں اور اس سے اعصاب سماعت متاثر ہو کر دماغ کو مطلع کرتے ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ فوجی باجہ سے سپاہیوں کے قدم باقاعدہ پڑتے ہیں، کائنات میں لاکھوں قسم کی مادی، حیوانی، عقلی اور اجتماعی حرکات ہیں جو ایک جگہ سے دوسری جگہ مختلف صورتیں اختیار کرتی ہوئی منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ حرکت کے کرشمے خاص روابط اور علائق کے تحت میں نمودار ہوتے ہیں، اور ان روابط اور علائق کی بناء چند غیر متبدل طبعی اصول پر ہے، انہی اصول و قوانین کا دریافت کرنا ہمارے مضمون کا موضوع اصلی ہے، لیکن اس بحث کو شروع کرنے سے پہلے حرکت طبعی کے چند قوانین کا بیان کر دینا ضروری ہے۔

حرکت کیا چیز ہے؟ | ایک خاص مدت اور خاص مسافت میں کسی قوت کا کسی مادہ پر اثر کرنا حرکت کہلاتا ہے۔ تم نے پتھر پھینکا، پتھر مادہ ہے، جس کو ہاتھ کی قوت نے پھینکا اور اس نے چالیس فٹ مسافت دو ثانیہ میں قطع کی۔ گولہ کا توپ کے منہ سے نکلکر ایک مخصوص حد تک

پہونچنا حرکت ہے۔ جاذبیت ارض کی وجہ سے پانی کا بہنا حرکت ہے۔ عضلات کی قوت سے انسان کا چلنا حرکت ہے۔ ہنسنا حرکت ہے، کلام حرکت ہے، فکر حرکت ہے وغیرہ وغیرہ۔

انتقال حرکت | اگر ایک ہموار سطح پر ایک کرہ پڑا ہوا ہو اور ایک دوسرے کرے کو اس کی طرف لڑھکائیں تو وہ حرکت کرتا ہوا اس سے متصادم ہوکر ساکن ہو جائیگا، اور کرہ ساکن میں اس کی حرکت منتقل ہو جائے گی اور کرۂ اول کی حرکت کا جز و رباقی رہ گیا تھا اس کو یہ کرہ پورا کرکے ساکن ہو جائیگا۔

گولہ جو توپ کے منھ سے نکلتا ہے، چاہے وہ کتنا ہی دور جائے، مگر زمین پر ضرور گرے گا کیونکہ جب بارود کی قوتِ دافعہ پر زمین کی جاذبہ غالب آجائے گی، تو وہ نیچے زمین پر آ رہے گی، مگر اس کی حرکت زمین پر گرنے سے ختم نہیں ہوگی بلکہ دوسرے اجسام میں منتقل ہو جائیگی جس ہوا کو گولہ چیرتا ہوا آیا ہے اس میں قوتِ تموج پیدا ہو جاتا ہے، جس سے قریب کے مکانات ہل جاتے ہیں کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ جاتے ہیں، اور اس تموج کا دائرہ وسیع ہوتے ہوتے فضا کو بھر دیتا ہے اور جب گولہ زمین پر گرتا ہے تو اس کی وجہ سے زمین ہلنے لگتی ہے اور زمین میں یہ اہتزازی حرکت پھیلتی ہوئی پورے کرۂ ارض پر محیط ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ٹرام اور ریل کی حرکت بھی زمین، ہوا اور پتھر میں تموج اور اہتزاز پیدا کرتی ہے۔ لیکن اگر انتقال حرکت میں جانب مخالف سے کوئی دوسری حرکت منتقل ہوتی چلی آرہی ہے، تو اگر دونوں قوت وضعف میں برابر ہیں تو تصادم سے دونوں حرکتیں ختم ہو جائیں گی اور اگر ایک قوی اور دوسری ضعیف ہے تو قوی حرکت باقی رہے گی لیکن تصادم سے بقدر اس قوت کے ضعیف ہو جائے گی جو ضعیف حرکت میں پائی جاتی تھی۔

تحویلِ حرکت | ٹرام میکانکی حرکت سے چلتی ہے، میکانکی حرکت، قوتِ برقی سے پیدا ہوتی ہے جو برقی تار کے ذریعہ سے ٹرام کے پہیوں تک پہونچتی ہے۔ برقی قوت ڈینمو (Dynamo) کے ذریعہ سے پیدا ہوتی ہے، ڈینمو کی حرکت بخار سے پیدا ہوتی ہے اور بخار حرارت سے پیدا ہوتا ہے اور حرارت ایندھن کے اشتعال سے، جس کی قوت اشتعال مادۂ نباتی کے دقائق میں پوشیدہ ہوتی ہے اور یہ قوت اشتعالی ایتھر کے تموجات سے پیدا ہوتی ہے جن کا ظہور کرۂ شمسی کی حرارت سے ہوتا ہے۔

لکھنا ایک عضلاتی اور عقلی حرکت ہے، عضلاتی حرکت ہاتھ کے اعصاب سے پیدا ہوتی ہے، اعصاب کی حرکت اس کیمیائی عمل کا نتیجہ ہے جو اعصاب میں جاری رہتا ہے اور یہ عمل اس کیمیائی اور فزیالوجیکل عمل سے پیدا ہوتا ہے جو جسم اور حاصل غذا کے درمیان ہوتا رہتا ہے اور غذا اس کیمیائی عمل کا نتیجہ ہے جو ہماری نباتی خوراک پر حرارت شمسی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ حرکت عقلی نتیجہ ہے مراکز دماغی اور مجموع عصبی کی حرکت کا اور یہ دونوں حرکتیں ایک کیمیائی اور فزیالوجیکل عمل سے پیدا ہوتی ہیں، جس کا سلسلہ بہ تفصیل مذکور آفتاب کی حرارت تک پہونچ جاتا ہے۔

اس بیان سے معلوم ہوا کہ حرکت ایک جسم سے دوسرے جسم میں کبھی تو بالکل سادہ طریقہ سے منتقل ہو جاتی ہے اور دوسرے جسم میں پہونچکر اس کی نوعیت نہیں بدلتی اور کبھی ہر مرتبہ ایک نئے لباس میں نمودار ہوتی ہے۔ حرارت، نور، مقناطیسیت اور میکانیت یہ سب مظاہر حرکت ہیں، پھر تحولِ حرکت کبھی بواسطہ ہوتا ہے اور کبھی بلاواسطہ۔ ہاتھ کی حرکت سے چقماق میں حرارت پیدا ہو جاتی ہے، برقی

وسے نور اور حرارت پیدا ہوتی ہے۔ حرکت کی تمام انواع پیدا کرنے کے لئے صرف زمین کی جاذبیت کافی ہے، مثلاً کسی آبشار پر ایک برقی مشین لگادی جائے تو ظاہر ہے کہ آبشار کا پانی جاذبیت زمین کی وجہ سے گرتا ہے، گرتا ہوا پانی اس مشین کو حرکت دیتا ہے اور اس تحریک سے برق، روشنی، حرارت اور میکانکی حرکات سب پیدا ہو سکتے ہیں۔

استمرار حرکت | پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ سلسلۂ حرکات، حرارت شمس پر منتہی ہوتا ہے اور حرکت متوجہ کے حدود کی انتہا بھی ہمارے حدود ادراک سے خارج ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آفتاب میں یہ قوت کہاں سے آئی، تمام کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی وجہ سے حرکت میں ہے اور ہر لحظہ میں لاکھوں تحولات حرکت ہوتے رہتے ہیں اور یہ حرکت کب ختم ہوگی؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کے حل کرنے سے عقول بشری بالکل قاصر ہیں۔ زیادہ سے زیادہ عقل یہ ادراک کر سکتی ہے کہ حرکات دائمی اور مستمر ہیں اور ان کی ابتدا و انتہا بالکل مجہول ہیں۔

حرکت کا رخ | ظاہر ہے کہ حرکت، قوت محرکہ سے متاثر ہو کر خط مستقیم اختیار کرتی ہے اور غیر متناہی حدود تک چلی جاتی ہے لیکن اگر ہم سے کہا جائے کہ واقعہ اس کے خلاف ہے تو ہم فوراً اس کا سبب تلاش کریں گے۔

اگر جہاز پر سے ایک توپ چلائی جائے تو ظاہر ہی ہے کہ گولہ خط مستقیم پر حرکت کرے گا لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے گولہ ہمیشہ خط منحنی پر حرکت کرتا ہے اور جس قدر زیادہ مسافت طے کرتا ہے اسی قدر انحناء (Curvature) بڑھتا جاتا ہے کیونکہ زمین کی قوت جاذبہ گولہ کو اپنی طرف کھینچتی ہے گولہ کی حرکت پر ایک اور چیز بھی اثر کرتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب گولہ توپ سے نکل کر ہوا کو چیرتا ہوا جاتا ہے تو تصادم ہوا سے اس کی طاقت کمزور ہوتی جاتی ہے اور جس قدر یہ طاقت کمزور ہوتی ہے اسی قدر زمین کی جاذبیت اس پر زیادہ اثر کرتی ہے۔ لیکن یہ امر ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ تصادم ہوا سے گولہ کی جتنی قوت ضائع ہوتی ہے درحقیقت میں ضائع نہیں ہوتی بلکہ گولہ سے ہوا میں منتقل ہوگی کیونکہ گولہ اثنائے حرکت میں ہوا کو چیرتا اور اس میں تلاطم پیدا کرتا ہوا جاتا ہے۔

مذکورۂ بالا بیان سے ہم اس قاعدہ کو استنباط کر سکتے ہیں جیسا کہ نیوٹن کہتا ہے:۔

"ہر جسم کا دو حالتوں پر استمرار ضروری ہے، یا ساکن رہیگا یا غیر متغیر سرعت کے ساتھ خط مستقیم پر متحرک رہیگا، بشرطیکہ اسپر کوئی دوسری مخالف قوت اثر نہ کرے"

لیکن چونکہ صرف ایک قوت سے جسم کا متحرک ہونا محال ہے بلکہ وہ مختلف قوتوں سے اثر پذیر ہو کر حرکت کرتا ہے اس لئے اختلاف محرکات سے سمت حرکت اور رفتار وغیرہ میں فرق پڑ جاتا ہے۔ لہذا ہم کو سمت حرکت کا قانون اس طرح قائم کرنا چاہئے:۔

۱۔ جب کوئی جسم، صرف قوائے جاذبہ سے متاثر ہو کر حرکت کرتا ہے، تو اس کی حرکت ٹھیک ان ہی خطوط پر ہوتی ہے جو قوت جاذبہ حاصل ہوتے ہیں، مثلاً زمین کی قوت جاذبہ اپنی سطح کے ہر طرف سے اجسام کو خطوط مستقیم پر جذب کرتی ہے، لہذا اگر کوئی جسم زمین پر گرے گا تو جب تک اس کی سمت حرکت کو کوئی دوسری قوت متغیر نہ کرے گی وہ ہمیشہ زمین کی قوت جاذبہ کے خطوط مستقیم پر حرکت کرتا ہوا زمین پر گرے گا۔

۲۔ جب کوئی جسم قوائے جاذبہ کے اثر سے متحرک ہوگا تو اس کی سمت رفتار ان ہی خطوط پر ہوگی جو قوائے دافعہ سے پیدا

ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر بندوق کا منھ ٹھیک آسمان کی طرف کرکے گولی چلائی جائے تو وہ خط مستقیم پر صعود کرے گی، کیونکہ بارود کی قوت دافعہ نے خط مستقیم پر گولی کو دفع کیا ہے اگرچہ اس صورت میں زمین کی قوت جاذبہ بھی گولی پر اثر کر رہی ہے مگر اس کی سمت رفتار کو نہیں بدل سکتی۔

۴۔ جب کوئی جسم قوائے جاذبہ اور دافعہ دونوں سے متحرک ہوگا تو اس کی سمت رفتار اس خط پر ہوگی جو دافعہ اور جاذبہ کے مشترک عمل سے پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی توپ چلائی جائے تو اس کا گولہ خط مستقیم پر حرکت نہیں کرے گا بلکہ توپ کی دافعہ اور زمین کی جاذبہ قوت کے مشترکہ عمل سے منحنی خط پر متحرک ہوگا، جس کو تفصیل سے ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، اس کے علاوہ ہوا کا تصادم اور ہوا کی حرکت بھی سمت رفتار میں فرق ڈالتی ہے، جیسا کہ ان تشریحات سے اچھی طرح سمجھ میں آ سکتا ہے۔

اجرام سماوی کی سمت حرکت بھی مختلف قوتوں کا نتیجہ ہے، چنانچہ تمام اجرام غیر مستقل دوائر پر حرکت کرتے ہیں، جس کی تفصیل آئندہ بیان سے معلوم ہوگی۔

حرکت دوری | حرکت کے مذکورہ قوانین کے علاوہ ایک اور اہم بنیادی قانون ہے جو مواد کی تحویل اور ان کی کیفیات بدلنے پر بڑا اثر رکھتا ہے، اور اس کو حرکت دوری کہتے ہیں۔

اس قسم کی حرکت ہم کو بجتی ہوئی شاخ، لہراتے ہوئے پردے، کپکپاتے ہوئے تار اور گھڑی کے رقاص (Pendulum) میں نظر آتی ہے۔

اس قسم کی حرکت کو ذہن نشین کرنے کے لئے ہم رقاص کی حرکت پر غور کرتے ہیں۔ اگر تم رقاص کو جبکہ وہ سکون کی حالت میں ہو پکڑ کر ایک طرف کھینچ کر چھوڑ دو تو وہ اپنی اصلی جگہ (یعنی زمین کے خط مرکزی) پر پہونچ کر ساکن نہ ہوگا بلکہ اس سے تجاوز کرتا ہوا تقریباً اتنا ہی دور پہونچ جائے گا جتنا کہ تم نے اس کو اصلی جگہ سے علیحدہ کیا تھا، اور پھر اسی طرح اپنی حرکت جاری رکھے گا جب تک وہ قوت جس نے اسے ڈھکیلا تھا باقی ہے۔ مثلاً گھڑی کا رقاص جس کو ہر جدید حرکت میں پہیہ ڈھکیل دیتا ہے، لیکن اگر یہ دافعہ قوت نہ رہے تو آہستہ آہستہ پچھلے دور کی مسافت اگلے دور سے کم ہوتی جائیگی، یہاں تک کہ وہ ساکن ہو جائے گا۔

اگر تم رقاص کے کپکپاتے ہوئے تار پر غور کرو تو وہ بھی رقاص کے اصول پر اہتزازی حرکت کرتا ہوا نظر آئیگا۔

اسی طرح جیب گھڑی کی بال کمانی بھی ان ہی اصول کے ماتحت سکڑتی اور پھیلتی رہتی ہے اور اسی طرح جب ہوا ایک دفعہ چل کر رک جاتی ہے یا مساوی سرعت سے اس کے متعدد جھونکے آتے ہیں، تو درختوں کی شاخوں میں لچک اور سمندر میں تموج پیدا ہو جاتا ہے جیسا کہ ہم نے یہ بیان کیا ہے، حرکت دوری چاہے وہ کسی مادہ میں پائی جائے ایک ہی اصول کے تحت میں ہوتی ہے۔ لہذا اس اجمال کو واضح کرنے کیلئے حرکت رقاص کے اصول ذہن نشین کر لینے چاہئیں۔

۱۔ رقاص کی آمد و رفت ایک معین فاصلہ میں مساوی اوقات میں ہوتی ہے اور قوت دافعہ کے قوت و ضعف سے اس میں فرق نہیں پڑتا، یہی وجہ ہے کہ گھڑی کو کوک دینے سے تیز نہیں چلتی بلکہ ہفتہ بھر ایک ہی رفتار سے چلتی ہے۔

۲۔ رقاص کی آمد و رفت میں نوعیتِ مادہ اور تفاوتِ وزن سے فرق نہیں پڑتا، بلکہ اس میں فرق پڑنے کی دو صورتیں ہیں۔

الف۔ لمبا رقاص آہستہ اور چھوٹا تیز حرکت کرتا ہے۔

ب۔ جن مقامات پر زمین کی جاذبیت زیادہ ہوتی ہے وہاں حرکتِ رقاص سست ہوتی ہے اور جہاں جاذبیت کم ہوتی ہے وہاں تیز ہوتی ہے۔

۳۔ رقاص کے طول اور اوقات حرکت میں مربع کی نسبت ہوتی ہے، یعنی طول رقاص اوقات کے مربع کے برابر ہوتا ہے۔

دوسرے اور تیسرے اصول سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ رقاص کی آمد و رفت بلحاظ طول کے مختلف ہوتی ہے (رقاص کے مادہ اور وزن کو اس میں کچھ دخل نہیں ہے)

اصول مذکورہ کی تعلیل | اگر تم رقاص کی آمد و رفت پر غور کرو گے تو معلوم ہوگا کہ یہ حرکت دو مختلف قوتوں کا نتیجہ ہے، ایک وہ قوت ہے جو رقاص کو دھکیلتی رہتی ہے مگر اس کے ساتھ لازم نہیں ہے، یعنی اس میں تجدد ہے استمرار نہیں ہے (ہر دفعہ نئی قوت پیدا ہوتی ہے)۔

دوسری قوت زمین کی جاذبیت ہے، جو ہر وقت رقاص کے ساتھ لازم ہے لیکن جب رقاص خط سمتی سے دور ہوتا ہے تو یہ قوت ضعیف ہو جاتی ہے اور جب قریب ہوتا ہے تو قوی ہو جاتی ہے (خط سمتی وہ وہمی عمودی خط ہے جو رقاص کے نقطہ تعلیق سے مرکز ارض کی طرف جاتا ہوا فرض کیا جائے)

جس طرح رقاص کی حرکت دو قوتوں کے عمل سے پیدا ہوتی ہے اسی طرح کپکپاتے ہوئے تار کی حرکت بھی دو مختلف قوتوں کا نتیجہ ہے، ایک وہ قوت ہے جو تار کو جنبش دیتی ہے مگر اس کے ساتھ لازم نہیں رہتی اور دوسری تار کی ذاتی لچک کی قوت ہے، جو اسے ہر وقت خط مستقیم پر رکھنے کی کوشش کرتی ہے اور یہ قوت تار میں دائمی طور پر پائی جاتی ہے۔

لچکتی ہوئی شاخ اور پانی کا تموج بھی دو قوتوں کا نتیجہ ہے۔ الغرض مذکورہ بالا تفصیل سے واضح ہو گیا کہ ہر حرکت دوری کم از کم دو قوتوں کا نتیجہ ہوتی ہے مگر ایک قوت دوسری سے متفاوت ہوتی ہے۔

حرکت دوری کے متعلق سپنسر کی توجیہ | حرکت دوری وہاں پائی جاتی ہے جہاں مختلف اور غیر متوازن قوتیں متصادم ہوں۔ اگر متصادم قوتیں متوازن ہیں تو نتیجہ سکون کی صورت میں نمایاں ہوگا، اور اگر ایک قوت دوسری سے زیادہ ہوگی تو حرکت بھی اسی بہت ... استمرار حرکت جبکہ وہ ایک اندازہ اور ایک صفت پر ہو تو اس کے لئے ضروری ہے کہ جسم متحرک، مختلف حرکت دینے والی ... کے باوجود بالاستمرار اپنی جگہوں کو چھوڑتا جائے اور یہ بالکل محال ہے کیونکہ جب جسم منتقل ہو کر ایک مکان سے دوسرے مکان میں پہنچتا ہے تو لامحالہ اس پر اثر ڈالنے والی قوتوں کی نسبت میں فرق پڑتا ہے۔ یا یوں سمجھنا چاہئے کہ انتقال مکانی سے ایک قوت اپنے اثر میں دوسری پر غالب آجاتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک اندازہ اور ایک نسبت سے حرکت باقی نہیں رہتی۔ لہذا ایک اندازہ اور ایک کیفیت کے ساتھ متحرک ہونے کے لئے غیر متناہی زمان و مکان کا ہونا ضروری ہے، اور یہ ایک ایسا نتیجہ ہے جس کو عقل تصور میں نہیں لا سکتی۔ اس لئے اس استمرار کے قائم رکھنے کے لئے صرف ایک صورت باقی رہ جاتی ہے، اور وہ یہ کہ حرکت دوری ہو،

چاہے وہ حرکت ایک معین قوس پر ہو جیسے رقاص کی حرکت، یا دائرہ پر ہو، جیسے زمین کی حرکت آفتاب کے گرد۔

تطبیق | اس دقیق تعلیل کو سمجھنے کے لیے ہم حرکت رقاص کی توضیح کرکے اسے منطبق کرتے ہیں:۔

اگر تم رقاص کو ایک معین طاقت سے دفع کرو تو وہ اپنے خط سمتی سے ایک قوس پر حرکت کرتا ہوا علحدہ ہوگا۔ اور اس قوس کا محدّب مرکز زمین کی طرف ہوگا، مگر زمین کی قوت جاذبہ اس حرکت اندفاعی کا مقابلہ کرتی رہے گی، اور اس کوشش میں ہوگی کہ اس کو اپنی جگہ پر واپس کردے۔ چونکہ قوت دافعہ جس نے رقاص کو دھکیلا تھا، اور اس کے ساتھ لازم نہیں ہے اسلئے جس قدر وقت صرف ہوتا جائیگا اس کی تاثیر ضعیف ہوتی جائیگی، یہاں تک کہ آخر میں زمین کی جاذبہ قوت اس پر غالب آکر اُسے واپس کردے گی۔ واپسی کے وقت رقاص جس قدر خط سمتی سے قریب ہوگا، اسی قدر اسکی حرکت تیز ہوتی جائے گی۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ زمین پر گرتا ہوا پتھر جوں جوں زمین کے قریب ہوتا جاتا ہے اسکی حرکت بھی سریع ہوتی جاتی ہے۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ رقاص جس قدر خط سمتی سے قریب ہوتا جائیگا، اس کی حرکت تیز ہوتی جائے گی۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ رقاص جس قدر خط سمتی سے قریب ہوتا جاتا ہے، اس میں ایک جدید قوت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اس لئے جب رقاص خط سمتی تک پہونچ جائے گا، تو وہاں ساکن نہ ہوگا، بلکہ اس کو تجاوز کرکے آگے بڑھتا ہوا چلا جائیگا، کیونکہ جب وہ خط سمتی تک پہونچا تھا تو اگرچہ جذب زمین کی قوت اپنا کام ختم کرچکی تھی، مگر اس جدید قوت کا عمل ابھی باقی تھا جو خط سمتی کی طرف آتے وقت رقاص میں پیدا ہوگئی تھی، لہذا وہ رقاص کو کھینچے ہوئے خط سمتی سے آگے لے گیا، لیکن اب جس قدر وہ خط سمتی سے دور ہوتا جائے گا کشش زمین کا اثر اس پر زیادہ ہوتا جائیگا اور دافعہ قوت جس کی وجہ سے وہ جاذبیت کے خلاف جارہا تھا، ضعیف ہوتی جائے گی ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ اوپر کو پھینکتے ہوئے پتھر کی حالت ہوتی ہے) اور آخر کار جاذبیت ارضی اس پر غالب آکر اس کو پھر خط سمتی پر لانا شروع کرے گی۔ پھر اس حرکت میں علاوہ جاذبیت کے ایک اور قوت اندفاعی پیدا ہوجائے گی، مگر پہلی سے کم اور وہ اُسے خط سمتی سے آگے لے جائے گی۔ غرض اسی طرح رقاص آتا جاتا رہے گا، یہاں تک کہ قوت اندفاعی بالکل مفقود ہوجائے اور جاذبیت ارضی اس کو خط سمتی پر ساکن کردے۔

اگر تم تارکے تناؤ کی جاذبیت زمین کی جگہ فرض کرو تو اس کے اہتزازات کی بھی یہی توجیہ کرسکتے ہو۔

حرکت دوری غیر تام ہوتی ہے | اسپنسر کہتا ہے کہ حرکت دوری کی آمد ورفت، اس وقت خط مستقیم پر ہوسکتی ہے جبکہ دو متضاد قوتیں زاویہ مستقیم پیدا کریں۔ اور ان دونوں کی ایک معین نسبت ہو، لیکن اکثر ایسا نہیں ہوتا۔ اس لیے مختلف قوتوں کے عمل اور اُن کی مختلف نسبتوں سے بیضوی دائرے پیدا ہوتے ہیں۔ اور جب دو سے زیادہ مختلف قوتیں اثر کرتی ہیں تو ہر پچھلا دورہ اس خط پر نہیں ہوتا جس پر اگلا دورہ ہوتا ہے، بلکہ ہر مرتبہ اس کا مدار تنگ ہوتا جاتا ہے۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ اجرام فلکی جاذبہ اور دافعہ کے باہمی تفاعل سے اپنے ہر دورہ میں مرکز کے قریب ہوتے جاتے ہیں۔

مذکورۂ بالا بیان سے واضح ہوتا ہے کہ کائنات کے تمام مادے، عناصر یا ایتھر میں حرکت کرتے رہتے ہیں اور ان کے دورے

ہوتے ہیں۔ اور دوسرے بھی جنھیں زیادہ ترتموجی اور اہتزازی کہہ سکتے ہیں اس کے ساتھ یہ بھی واضح ہوگیا ہوگا کہ تمام حرکات ایک قوت کا نتیجہ ہیں جو ہر جگہ مختلف صورتوں میں پائی جاتی ہے۔

حرکت دوری کا عموم | اگلے بیان سے واضح ہو چکا ہے کہ ہر جسم متحرک کم از کم دو مختلف قوتوں کے زیر اثر متحرک ہوتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس کی حرکت دوری ہو، عام اس سے کہ یہ دوری حرکت دائرے میں ہو یا رقاص کیطرح صعود و ہبوط کے طریقے پر۔

اگر دوری حرکت پر باقاعدہ قوتوں کا اثر ہوتا ہے تو حرکت بھی باقاعدہ اور ایک نظام کے ماتحت ہوتی ہے ورنہ بے قاعدہ اور غیر نظامی۔

اجرام سماوی اپنے مدارات پر باقاعدہ اور ایک نظام کے تحت میں حرکت کرتے ہیں اور اجرام سماوی کی دوری حرکتیں زمین پر تمام دوری حرکات کا سبب ہوتی ہیں۔ فصول اربعہ کی تکرار زمین کی حرکت دوری کا نتیجہ ہے، جو نور و حرارت کے انفعال اور جاذبیت کے باہمی تبادلہ سے پیدا ہوتی ہے

سمندر کا پانی حرارت شمسی سے معین اوقات میں بخارات بنکر مرتفع ہوتا ہے، پھر پانی بنکر مخصوص موسم میں نیچے گرتا ہے اور زمین پر بہتا ہوا سمندر میں چلا جاتا ہے۔

ہوائیں عام طور پر قطبین سے خط استوا کی طرف اور ہوا کے بلند طبقات میں خط استوا سے قطبین کی طرف چلتی ہیں، یہ بھی ایک دوری حرکت ہے جو عام حرکت دوری سے پیدا ہوتی ہے۔

سطح زمین کے نباتی اور حیوانی مظاہر حیات، یہ بھی دوری حرکتیں ہیں جو تولد، نمو، تولید اور موت سے ظاہر ہوتی ہیں عالم حیوان کی تمام حرکات، دورۂ خون، ضربات قلب، حرکات تنفس، حرکات عصبی وغیرہ تمام حرکات دوری ہیں۔

یہی حال عالم نباتات کا ہے۔ موالید ثلٰثہ کے علاوہ سیاسی اور اقتصادی حرکات جو اجتماع بشری میں ہوتی رہتی ہیں یہ بھی دوری حرکات ہیں، جن کا نتیجہ انقلابات حکومت، تغیرات قوانین و احکام اور تجارتی منڈیوں کے اترنے اور چڑھنے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

میکانیکی حرکات دوری کے اصول پر منطبق ہیں، میکانک آلات کی تمام حرکتیں دوری ہوتی ہیں۔

قوت برقی جو اکثر میکانک آلات کو حرکت دیتی ہے اس کی رو بھی حرکت دوری ہے۔

گذشتہ تمام مثالوں سے واضح ہوگیا ہوگا کہ جس قدر حرکات ہمارے احاطہ احساس میں واقع ہوئی ہیں وہ سب دوری ہیں

حرارت اور نور کا ذریعہ | قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آفتاب جو زمین سے ۹ کرور میل سے زیادہ دور ہے کس واسطے سے ہم تک حرارت پہونچاتا ہے۔ یعنی ہمارے اور آفتاب کے درمیان وہ کونسی چیز ہے جو حرارت کو ہم تک پہونچا دیتی ہے۔ چونکہ حرارت میں ایک قسم کی حرکت ہے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ ہمارے اور آفتاب کے درمیان ایک واسطہ ہونا چاہئے جو آفتاب کی حرارت کو زمین تک پہونچائے۔

فضائے عالم میں حرارت و نور کے انتقال کے لئے علماء نے ایک ایسے مادہ کو تسلیم کرلیا ہے جو ہوا سے صدہا درجہ لطیف ہے اس مادہ کو اثیر یا ایتھر کہتے ہیں تمام اجزاء فلکی ایتھر میں ڈوبے ہوئے ہیں یہی مادہ لطیف حرارت اور نور پہونچانے کا ذریعہ ہے چونکہ علی الاطلاق کائنات میں صرف دوری حرکات ہوتی ہیں اس لئے یہ اسطرح بھی دوری حرکت کرتا ہوا روشنی اور نور کو منتقل کرتا ہے، ایتھر کی حرکت دوری، امواج کی شکل میں ہوتی ہے چونکہ نور حرارت سے بہت زیادہ سریع حرکت کرتا ہے (یعنی ایک سکنڈ میں ۱۸۶۰۰۰ میل) اس لئے امواج نور کی رفتار حرارت سے زیادہ سریع ہوتی ہے اور وہ ہم تک پہلے پہونچتی ہے

فضائے عالم میں ایتھر کا فرض کرنا علماء کا ایک نظریہ ہے جس پر اس وقت تک عمل رہیگا جب تک کوئی دوسرا نظریہ اس کے خلاف ثابت نہ ہو۔

لیکن اس سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ ایتھر کی امواج زمین تک صرف روشنی اور حرارت ہی کو نہیں پہونچاتیں، بلکہ تمام ارضی حرکات و انقلابات پر بھی ان کا زبردست اثر پڑتا ہے اور حرارت سے مختلف قسم کی حرکتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

ایتھر کی موجیں زمین کے ذرہ ذرہ سے آکر ٹکراتی ہیں اور ان میں مختلف کیفیات پیدا کرتی ہیں بعض عناصر کو بعض سے ملاتی ہیں اور بعض کو آپس میں تحلیل کرتی ہیں بعض مادی مرکبات میں خاص قسم کی قوت پیدا کرتی ہیں اور بعض سے قوت کو سلب کرلیتی ہیں اور ان اثرات کی ہمہ گیری یہانتک ہے کہ کائنات کا کوئی ذرہ اس سے خالی نہیں ہے تمام عالم ارضی اس کی وجہ سے ایک دائمی حرکت میں ہے جس کی کیفیت کے ادراک تک عقول انسانی نہیں پہونچ سکتیں ذیل میں ہم ان حرکات کی حتی الامکان تفصیل پیش کرتے ہیں۔

حرکت دوری کا انتقال ہوا میں | اس بحث کے سمجھنے کے لئے ہم امواج ہوا اور اس کی تاثیرات کا ذکر کرتے ہیں جو خاص اجسام پر ہوتی ہیں۔ لہذا ہم کو پہلے تار کے اہتزازات کو سمجھنا چاہیئے۔ تار کا قاعدہ ہے کہ اسکی آواز کی بلندی اور پستی تار کے اہتزازات کی نسبت سے ہوتی ہے یعنی ایک سکنڈ میں جس قدر سرعت سے تار میں اہتزازات ہوتے ہیں اسی قدر آواز بلند ہوتی ہے اور اہتزازات کی سرعت تار کے طول اور اس کی دبازت اور تناؤ پر موقوف ہے۔ چنانچہ ستار کے تاروں سے یہ تمام باتیں بخوبی سمجھ میں آسکتی ہیں۔

ماہرین اصوات نے ہر نغمہ کے اہتزازات کو شمار کرلیا ہے اور وہ بتا سکتے ہیں کہ ایک نغمہ کو دوسرے نغمہ کے ساتھ باعتبار اعداد کے کونسی نسبت ہے۔ لندن کی مجلس موسیقی نے اہتزازات کا قیاس کرنے کے لئے ایک خاص معدنی کانٹے کو معیار مقرر کیا ہے اور اسی کی نسبت سے تمام نغمات کی نسبت معلوم کرتے ہیں۔

موسیقی کے بولوں کی باہمی نسبت اور فی ثانیہ اُن کی تعداد ذیل کے جدول سے معلوم ہوگی۔

بولوں کے نام	=	سا	رے	گا	ما	پا	دھا	نی	سا
اہتزازات فی ثانیہ	=	۲۶۴	۲۹۷	۳۳۰	۳۵۲	۳۹۶	۴۴۰	۴۹۵	۵۲۸
سب سے کم درجہ کی نسبت	=	۲۴	۲۷	۳۰	۳۲	۳۶	۴۰	۴۵	۴۸
نسبت کسری	=	۱	۹/۸	۵/۴	۴/۳	۳/۲	۵/۳	۱۵/۸	۲

اس جدول کے دیکھنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ اگر تم ہر نغمہ کے اہتزازات کو ۱۱۰ پر تقسیم کروگے تو دوسری سطر کے ہندسے حاصل ہوں گے اور اگر سا اول اور سا ثانی کی نسبت کو دیکھوگے تو معلوم ہوگا کہ ثانی سا کے اہتزازات اول سے دوچند ہیں اور تیسری سطر سب سے کم درجہ کی وہ باہمی نسبت معلوم ہوگی جب کہ سا اول کو ایک فرض کیا جاے۔

محاکاتِ موسیقی | اہتزازات کی باہمی نسبتوں کے ذہن نشین کرنے کے بعد ہم یہ بھی بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ اگر ستار کے ایک تار کو حرکت دیجائے اور باقی تار ساکن چھوڑ دئے جائیں تو اُن میں کیونکر جوابی نغمات پیدا ہوتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ تار کے اہتزاز سے ہوا میں موج پیدا ہوتی ہے اور ایک تار میں جس قدر اہتزازات پیدا ہوں گے اسی قدر ہوا میں موجیں پیدا ہوں گی، مثلاً جس تار میں ۲۶۴ اہتزاز ہوتے ہیں وہ ہوا میں ۲۶۴ موجیں پیدا کرے گا اور اہتزازات میں جس تناسب کا اختلاف ہوگا وہی تناسب امواج میں بھی محفوظ رہے گا۔ اگر تم تار پر ضرب دو تو اسکی موجیں تمام تاروں سے متصادم ہونگی اور وہی اہتزازات اور آواز پیدا کرینگے اور جسقدر شدت سے تار پر ضرب لگائی جائے گی اسی قدر دوسرے تاروں کے اہتزازات اور نغمات آسانی سے محسوس ہوسکیں گے۔

الحاصل ایک تار اپنے اہتزازات اور امواج کا اثر دوسرے تار میں پیدا کرسکتا ہے اور اس انتقال اہتزازات میں اہتزاز کے اعداد اور ان کی نسبت باہمی محفوظ رہتی ہے۔ یہ انتقال کیا چیز ہے؟ یہ وہی حرکت کا انتقال ہے، جو بذریعہ ہوا ایک تار سے دوسرے تار میں منتقل ہوتا ہے۔

قانون محاکات کا عموم | جب مذکورۂ بالا بیان سے واضح ہوگیا کہ ہر جسم جو دوری حرکت کرتا ہے دوسرے جسم میں بھی ویسی ہی حرکت پیدا کردے سکتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ ایک گھڑی کا رقاص دوسری گھڑی کے رقاص کو حرکت دیسکتا ہے، بشرطیکہ وہ ہوائی موج جو حرکت رقاص سے پیدا ہوتی ہے، ساکن رقاص کو بھی متحرک کرسکتی، مگر وہ اتنی شدید نہیں ہے، جس سے یہ نتیجہ پیدا ہوسکتا، مگر کم از کم یہ ضرور ہوتا ہے کہ جب دو رقاص قریب قریب ایک دوسرے کے مخالف حرکت کر رہے ہوں، تو ہوائی موج دونوں کی حرکت کو موافق کرسکتی ہے چنانچہ امتحان کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوسکتی ہے۔

محاکاتِ حرکت جو امواج ہوائی کے ذریعہ سے ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہوتی ہے، اسکا انتقال بھی امواج ایتھری کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ جس طرح امواجِ ہوائی حرکت دوری ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل کرتی ہے اسی طرح امواج ایتھر روشنی اور حرارت کو ایک جسم سے دوسرے میں لے جاتی ہیں، البتہ تمام اجسام میں یہ قابلیت نہیں ہے کہ وہ مساوی طریقہ سے نور و حرارت کو قبول کریں، اسلئے اگر ایک جسم ایتھر کی امواج نور و حرارت سے متاثر ہوتا ہے، تو اسکے قریب الاجسم اگر قبولِ نور یا حرارت کی قابلیت رکھتا ہے، تو روشنی و حرارت، امواج ایتھر کے واسطہ سے اُس دوسرے جسم میں بھی منتقل ہوجاتی ہے۔

ایتھر کا تموج | یہ پہلے معلوم ہوچکا ہے کہ جہاں کہیں حرکت پیدا ہوگی وہ صرف دوری ہوگی کیونکہ اسباب حرکت میں تعدد ضروری ہے اور تعداد، حرکت دوری کو مستلزم ہے۔

ایتھر، جو ساری فضائے عالم کو گھیرے ہوئے ہے اور ایک ناپیداکنار محیط اعظم ہے اور نور و حرارت کو فضائے عالم میں منتشر کرنے کا ذریعہ ہے، وہ بھی علی الدوام دَوری حرکت میں رہتا ہے۔ کیونکہ وہ تمام اجرام سماوی جو ایتھر میں ڈوبے ہوئے فضا میں تیر رہے ہیں وہ سب مع اپنے اجزاء کے دَوری حرکت کرتے ہیں، یعنی ہر فرد بذات خود بھی دَوری حرکت کرتا ہے۔ اور اسکے اجزا بھی دوری حرکت کرتے ہیں۔ چونکہ ایتھر، ہوا سے زیادہ لطیف ہے، اس لئے اس کی حرکت بھی تمام مادی گیسوں سے زیادہ لطیف ہے اور اسکے تموج میں سرعت بھی حد سے زیادہ ہے بدیں وجہ زیادہ موزوں یہ ہے کہ اسکی حرکت "اہتزاز" سے تعبیر کی جائے۔

جس طرح آفتاب کے جرم سے روشنی، حرارت، کہربائیت، اور مقناطیسیت وغیرہ مختلف حرکات پیدا ہوتی ہیں اسی طرح نور و حرارت وغیرہ کے امواج میں بھی اختلاف ہے اور روشنی چونکہ آفتاب کے اختلاف عناصر کی وجہ سے سات مختلف رنگ رکھتی ہے اس لئے ان رنگوں کی شعاعوں میں بھی (جو ایتھر کی امواج ہیں) اختلاف ہوتا ہے جس کی وجہ سے ایتھر ایک دائمی تموج اور تلاطم میں رہتا ہے۔

سالمات اور اہتزاز کرنیوالے دقایق | یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ وہ تمام اجرام جو ایتھر کے محیط اعظم میں ڈوبے ہوئے ہیں ایسے چھوٹے چھوٹے کیماوی دقایق سے مرکب ہیں جو محسوس نہیں ہو سکتے اور وہ صرف اس لئے مان لئے گئے ہیں کہ کیمیائی تجربات کی توجیہ بغیر اون کے ممکن نہیں ہے یہ دقایق سالمات سے مرکب ہوتے ہیں اور بہت سے مظاہر طبعی کے مطالعہ سے علماء اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ وہ دقایق اجسام آپس میں متصل نہیں ہیں، بلکہ انکے درمیان خلا پایا جاتا ہے جسمیں اور دقایق کا دخول ممکن ہے اور اس خلا کی وجہ سے یہ بھی ممکن ہے کہ ایک جسم اپنی امتداد میں کم یا زیادہ ہو جائے۔ اسیطرح وہ سالمات جن سے دقایق مرکب ہوتے ہیں، آپس میں متصل نہیں ہوتے اور ان کے درمیان بھی خلا ہوتا ہے جس میں اور جوہر داخل ہو کر جسم کا حجم بڑھ سکتا ہے او یہ سب مستحکم دلائل سے ثابت ہو چکا ہے، جنکی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

چونکہ ایتھر کے جواہر اجسام محسوسہ کے جواہر سے بہت زیادہ دقیق ہیں اس لئے وہ جواہر اجسام میں آسانی سے داخل ہو جاتے ہیں، جیساکہ پانی ریت میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور چونکہ ایتھر کے جواہر علی الدوام اہتزاز میں رہتے ہیں اس لئے تمام جواہر مادی کا اہتزاز میں رہنا لازمی نتیجہ ہے۔

یہ بات بھی ظاہر ہے کہ جواہر فرد یا سالمات، وزن کے لحاظ سے مختلف ہیں اور وزن کا قیاس ہائیڈروجن کی نسبت سے کیا جاتا ہے۔

ہائیڈروجن کے جواہر سب سے زیادہ خفیف اور "ایم" کے جواہر سے زیادہ ثقیل ہیں اور چونکہ جواہر اجسام بلحاظ خفت و ثقل کے متفاوت ہیں اس لئے ان کے اجزاء کا اہتزاز بھی اسی نسبت سے تفاوت رکھتا ہے۔ جس مادہ کے جواہر سب سے زیادہ خفیف ہیں، اسکا اہتزاز بھی اسی قدر آہستہ مگر وسیع ہوتا ہے، اور جس مادہ کے جواہر ثقیل ہوتے ہیں اس کا اہتزاز زیادہ سریع مگر وسعت میں کم ہوتا ہے۔

الفت کیمیائی | ایک عنصر اگر دوسرے عنصر کے ساتھ متحد ہونے کی قابلیت رکھتا ہے تو اسکو اصطلاح میں الفت کیمیائی کہتے ہیں عناصر کی

یہ الفت کیمیائی بلحاظ ان کے مختلف طبائع کے مختلف ہوتی ہے، ایک عنصر دوسرے کے ساتھ نہایت آسانی سے متحد ہو سکتا ہے مگر تیسرے کے ساتھ اس کا اتحاد دشوار ہوتا ہے۔

الفت کیمیائی کیا چیز ہے۔ اور کیونکر بعض عناصر میں باہم اتحاد ہو جاتا ہے اور بعض میں نہیں ہوتا۔ اس کے متعلق ہم کہہ چکے ہیں کہ ہر قسم کے جواہر فردہ میں ایک خاص اہتزاز ہوتا ہے، اب اگر دو جوہر ایک ہی سرعت سے اہتزاز کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ان دونوں کا اہتزاز متحد ہو جائے گا یعنی وہ دونوں ایک ہی موج کے تابع ہو کر ایک ہی طرح اہتزاز کریں گے گویا کہ وہ دونوں ایک ہی جسم ہیں لیکن وہ دونوں ایک ہی سرعت سے صرف اس صورت میں اہتزاز کر سکتے ہیں۔ جبکہ وہ دونوں ایک ہی نوع کے ہوں اور اس صورت میں کیمیائی ترکیب ہو سکتی ہے لیکن اگر ایک جوہر کا اہتزاز دوسرے سے دوچند ہے تو اس صورت میں اتحاد مشکل ہے کیونکہ ہر ایک جوہر کے دو اہتزاز دوسرے کے ایک اہتزاز کے برابر ہونگے۔

الحاصل جسقدر اہتزازات جواہر آپس میں متناسب ہوں گے اسی قدر ان کے درمیان اتحاد زیادہ ممکن ہوگا۔ لہذا اس بیان سے ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ کیمیائی تفاعل اہتزاز کرنے والے جواہر کی حرکت پر موقوف ہے۔ اور اہتزاز، حرکت دوری کی ایک قسم ہے۔

امواج ایتھر کی تاثیر جواہر فردہ کے اہتزازات پر۔ | اس سے پہلے ہم نے جواہر فردہ کی حرکت پر غور کیا ہے مگر اس چیز کی حرکت سے کچھ بحث نہیں کی جس میں یہ تمام جواہر حرکت کرتے ہیں، وہ چیز ایتھر کا بحر اعظم ہے، جو تمام جواہر فردہ کے درمیان داخل ہے اور ہر وقت حرکت میں رہتا ہے۔ ایتھر کی یہ حرکت اہتزازات جواہر پر بڑا اثر ڈالتی ہے پہلے بیان ہو چکا ہے کہ نور اور حرارت کی شعاعوں کی وجہ سے ایتھر ایک دائمی تموج میں ہے اگر بعض کیمیائی مرکبات، حرارت اور نور سے متاثر ہوتے ہیں تو ایتھر کے تموجات اس مرکب کے اہتزازات پر اثر ڈالکر اس کی الفت کیمیائی کو قوی یا ضعیف کر دیتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھنا چاہئے کہ ایتھر کے تموجات کی ایک خاص نوع جواہر فردہ کی ایک خاص نوع کے اہتزازات پر اثر ڈالتی ہے اور جواہر کو جو آپس میں متحد ہیں ایک دوسرے سے زیادہ قریب کرتی ہے یا دور کر دیتی ہے کیونکہ ایتھر مواد محسوسہ سے بہت زیادہ لطیف ہے اور اس کے جواہر فردہ، مواد محسوسہ کے جواہر فردہ سے بہت زیادہ چھوٹے ہیں

اب یہ دیکھنا چاہیے کہ اسقدر لطیف اجزا کیونکر مواد محسوسہ کے اجزا پر اثر ڈال سکتے ہیں اور انکی حرکت کو اپنی حرکت کے موافق کر دیتے ہیں۔؟

بات یہ ہے کہ ایتھر کا ایک جوہر فرد، مواد محسوسہ کے ایک جوہر فرد پر اثر نہیں ڈالتا، بلکہ ایتھر کی ایک موج جس میں جواہر فرد کی ایک کثیر مقدار شامل ہوتی ہے جواہر مادیہ پر اثر کرتی ہے تھوڑی دیر کے لئے ہم فرض کرتے ہیں کہ ایتھر کے تموجات اور جوہر کے اہتزازات میں مطابقت ممکن ہے لہذا اس صورت میں ایتھر کی موجیں جب اس جوہر سے لاتناہی مرتبہ متصادم ہوں گی تو اس جوہر کی حرکت اہتزازی کو یہ موجیں اپنی رفتار کے مطابق کر لیں گی اور اب اس جوہر کی اہتزازات ان تموجات کے مطابق ہو جائینگے

حالانکہ وہ اس سے پہلے کسی دوسرے جوہر کے مطابق تھے۔ پھر یہ جوہر جو اپنے اہتزاز میں ایتھر کے موافق ہوگیا ہے اگر وہ کسی ایسے جوہر سے قریب ہوجائے جو اہتزاز میں اس کے مطابق ہو تو وہ اسکے ساتھ متحد ہوجائے گا۔

اس موقع پر دو اصولی باتیں پیش نظر رکھنی چاہیئے۔ ایک یہ کہ کیمیائی دقیقہ (جو دو یا دو سے زیادہ اجزائے فردہ سے مرکب ہوتا ہے) ایک خاص طبیعت رکھتا ہے، جو ان اجزائے فردہ کی طبیعت سے مختلف ہے جن سے وہ مرکب ہے اور یہ دقیقہ ایک خاص اہتزازی حرکت رکھتا ہے جو جواہر فردہ کے اہتزازات سے مختلف ہے۔ لیکن جواہر فردہ کے اہتزازات اپنی حالت پر رہتے ہیں اور صرف باہمی تفاعل سے متاثر ہوا کرتے ہیں۔ الحاصل دقیقہ کی حرکت جواہر کے خلاف ہوتی ہے اور اس کی مثال بالکل اسی طرح ہے۔ جس طرح کہ سارا نظام شمسی اپنے اجزاء کی حرکات کے خلاف حرکت کرتا ہے۔

دوسری اصولی بات یہ ہے کہ جس طرح ایتھر کی موج، جواہر فردہ میں اہتزازات پیدا کرتی ہے اسی طرح جواہر فردہ بھی ایتھر میں اہتزازات پیدا کرتے ہیں اور اس نظریہ سے بنسون اور کیرشوف کے اس انکشاف کی توجیہہ ہوسکتی ہے کہ بعض مواد کے بخارات خاص قسم کی ایتھر کی نورانی موجوں کو جذب کرلیتے ہیں۔ اس سے ٹنڈل کا انکشاف بھی سمجھ میں آسکتا ہے کہ بعض گیسیں حرارت کو جذب کرلیتی ہیں، کیونکہ یہ دونوں جذب اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ان گیسوں سے ہر ایک، خاص درجہ کا اہتزاز رکھتی ہے جو ایتھر کی تموجات کے مطابق ہے۔

ایتھر کی نورانی تموجات کا اثر کیمیائی مرکبات پر۔

اگر ایک دقیقہ دو جواہر فردہ سے مرکب ہو اور ہر ایک جوہر فرد اپنی ذاتی صلاحیت کے لحاظ سے ایتھر کے نورانی تموجات سے متاثر ہونے میں مختلف ہو، یعنی ایک جوہر بہ نسبت دوسرے کے زیادہ اثر پذیر ہو تو ظاہر ہے کہ جس جوہر پر زیادہ اثر کرے گا اسکے اہتزاز میں بہ نسبت دوسرے جوہر کے سرعت ہوگی اور اس سرعت کا یہ نتیجہ ہوگا کہ وہ جوہر دوسرے سے منفصل ہونے کی کوشش کریگا۔ اب اگر الفت ترکیبی ان دونوں اجزاء کے درمیان اتنی قوت رکھتی ہے کہ اس عارضی انفصالی حرکت کا مقابلہ کرسکے، تو اس دقیقہ میں انحلال نہیں ہوسکتا۔ اور اگر اس قابل نہیں ہے تو دونوں اجزاء علیحدہ علیحدہ ہوجائیں گے۔

ڈاکٹر ڈرائر نے تجربات سے ثابت کیا ہے کہ وہ مرکبات معدنی جن کے جواہر فردہ ثقیل ہیں (مثلاً سونا، چاندی، پارہ، سیسہ) روشنی سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اور ان مرکبات معدنی میں یہ تاثیر کم ہوتی ہے جن کے جواہر فردہ خفیف ہوتے ہیں مثلاً پاسیم اور سوڈیم۔

انفصال و اتحاد جواہر میں یہ ضروری ہے کہ جو جوہر منفصل ہونے والا ہے، اس کے اہتزازات اس جوہر سے زیادہ ہونگے، جس کے ساتھ وہ فی الحال متصل ہے، کیونکہ اگر یہ دونوں ایک ہی نسبت سے اہتزاز کریں گے تو ایتھر کی موجیں انکے درمیان انفصال پیدا نہیں کرسکتیں، انفصال کے وقت بھی یہ ضروری ہے کہ ایتھر کی موجیں اس شدت سے اس پر اثر کریں کہ انکے اہتزاز میں اس درجہ وسعت پیدا ہوجائے کہ وہ ان جواہر کی اتحادی قوت کو توڑنے کے قابل ہوسکے۔

اس تعلیل کے ذریعہ سے یہ آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ روشنی دقائق نباتات میں کس طرح اپنا عمل جاری رکھتی ہے۔

اور یہ بھی معلوم ہوسکتا ہے کہ وہ حرکت جو آفتاب سے ہم تک ایک غیر محسوس طریقہ سے پہونچتی ہے کسی چیز کے جلاتے وقت کیوں محسوس ہونے لگتی ہے۔

اب اگر ذہنیات کو چھوڑ کر عالم مشاہدات کی طرف غور کیا جائے گا تو وہاں اوس کی صداقت ظاہر ہوگی، چنانچہ ظاہر ہے کہ کلوروفل جو نباتات کو سبز لباس پہناتا ہے، وہ اسوقت اپنا عمل نہیں کرتا جب تک کہ شاخیں یا پتیاں ہوا میں نکل کر آفتاب کی روشنی سے اثر پذیر نہ ہوں۔

مذکورہ بالا تفصیل سے جو اسپنسر کے اقوال سے ماخوذ ہے، یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ تموجات اثیر صرف اعمال کیمیائی میں موثر نہیں ہیں بلکہ حیوانی جسم میں بھی وہی عامل اساسی ہیں اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ صرف حرکت دوری، روشنی اور عام حرارت کی قوت کو جو تمام کائنات میں پھیلی ہوتی ہے، حیوانی اور نباتاتی قوتوں میں تبدیل کردیتی ہے۔

حرکت مقناطیسی اور حرکت کہربائی

مقناطیسیت اور کہربائیت کی ماہیت اسوقت تک معرض بحث میں ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ دقایق کی ایک خاص قسم کی حرکت ہے اور بعض کا خیال ہے کہ کہربائیت مواد محسوسہ کے علاوہ ایک مستقل اور غیر محسوس مادہ ہے اور مواد محسوسہ کے ہر ہر جز میں داخل ہے۔ یہ دونوں تعریفیں مظاہر کہربائیت اور مقناطیسیت پر اس وقت تک منطبق نہیں ہوسکتیں جب تک کہ یہ تسلیم نہ کیا جائے کہ مقناطیسیت اور کہربائیت میں ایک خاص قسم کی حرکت اہتزاز ہوتی ہے۔ پہلی تعریف کی بنا پر یہ حرکت اہتزازی دقایق مادہ میں ہوتی ہے۔ اور دوسری تعریف کی بنا پر یہ حرکت خود کہربائیت اور مقناطیسیت کے دقایق میں ہوتی ہے۔
لاسلکی ٹیلی گراف کے تموجات (تموجات) اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ کہربائیت نام ہے اس اہتزازی حرکت کا جو مادہ محسوسہ کے دقایق میں پائی جاتی ہے۔

یہ پہلے معلوم ہوچکا ہے کہ روشنی (جو اثیر کی تموجی حرکت کا نام ہے اور جسکی موجیں چھوٹی چھوٹی مگر نہایت سریع السیر ہوتی ہیں) کی موجیں بلحاظ ان سات رنگوں کے جن سے روشنی مرکب ہے، سرعت اور مسافت میں باہم اختلاف رکھتی ہیں اور یہ بھی معلوم ہوچکا ہے کہ دقایق کیمیائی اور جوہر فردہ جنسے دقائق مرکب ہوتے ہیں دائمی اہتزاز میں رہتے ہیں، اور جواہر فردہ کی اختلافات ترکیبی اور دقائق کے اختلاف سے حرکات اہتزازی میں اختلاف ہوتا رہتا ہے، دقائق اور جواہر کے یہی اہتزازات کیمیائی ترکیب و تحلیل کا باعث ہوتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہوچکا ہے کہ اثیر کے تموجات دقایق و جواہر کے اہتزازات پر زبردست اثر ڈالتے ہیں اور عالم حیات میں (نشو و نما یا انحطاط کی صورت میں) جو کچھ تغیر ہوتا ہے وہ صرف انہیں اہتزازات اور تموجات سے پیدا ہوتا ہے۔

انتقال حرکت نظام عصبی میں

اب ہم ان اعمال حیات کی طرف توجہ کرتے ہیں جو ایک حیوانی جسم اور خاص کر اونچی قسم کے حیوانات میں پائے جاتے ہیں۔

یہ ظاہر ہے کہ تمام اعضا اور رگیں صرف اسوقت اپنا کام کرسکتی ہیں جب اس کام کا صدور اعصاب سے ہو، حرکات کا صدور نظام عصبی سے ہوتا ہے اور نظام عصبی کے مرکز دماغ اور حرام مغز میں پائے جاتے ہیں۔ انہی مرکزوں سے اعصاب تمام جسم میں

پھیلتے ہیں جس طرح کہ ٹیلی فون کے تار ٹیلی فون کے مرکز سے منتشر ہوتے ہیں، ہر عصبی خط میں دو تار پائے جاتے ہیں، ایک تار کے ذریعہ سے نبضات صاعدہ خارج سے مرکز کی طرف اور دوسرے تار کے ذریعہ سے نبضات صادرہ مرکز سے خارج کی طرف منتقل ہوتے ہیں، اگر تمہارے ہاتھ میں سوئی چبھو دی جائے تو پہلے اس چبھن کی خبر حساس صاعدہ کے ذریعہ سے دماغ تک پہونچے گی۔ پھر دماغ کی طرف سے اس تار کو حکم دیا جائے گا، جو عضلات کو حرکت دیتا ہے کہ ہاتھ کو اس جگہ سے ہٹائے جہاں سوئی چبھی ہے

اسلاک عصبی کی تشریح سے واضح ہوتا ہے کہ سلک عصبی پر ایک ایسا غلاف چڑھا رہتا ہے جس سے وہ اپنے ماحول کے تاروں سے مل نہیں سکتا اور نہ ایک عصب کی حرکت دوسرے میں منتقل ہو سکتی ہے اور یہ بعینہ وہی اصول ہے جس کی بنا پر بجلی کے تار ایک دوسرے سے متصل نہیں رکھے جاتے۔

حرکت عصبی | چونکہ اسلاک عصبی اور اسلاک لہربائی میں نہایت سخت مشابہت ہے اس لئے بعض نے دونوں حرکتوں کو ایک ہی خیال کیا ہے، اور یہ حکم لگایا ہے کہ دونوں ایک رفتار سے متحرک ہوتے ہیں، لیکن تحقیق سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ حرکت عصبی بہ نسبت حرکت کہربائی کے بہت آہستہ ہوتی ہے یعنی حرکت عصبی کی رفتار ایک سکنڈ میں صرف ایک سو بیاسی فٹ ہے اور یہ حرکت بھی مختلف حیوانات کے مزاجوں کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہے یعنی جن حیوانات کے خون میں برودت زیادہ ہوتی ہے ان میں حرکت عصبی آہستہ تر ہوتی ہے۔ ان اختلافات سے ثابت ہوتا ہے کہ حرکت عصبی حرکت کہربائی سے علیحدہ ہے مگر یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ حرکت عصبی کے ساتھ حرکت کہربائی بھی ایک حد تک شامل ہے۔ اگرچہ اسکا احساس نہیں ہوتا۔

اب یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ حرکت عصبی کیونکر اعصاب کے تاروں میں منتقل ہوتی ہے۔ اس کے لئے ہم کو ڈاکٹر داوڈ فراس الیس کی کتاب "الاعصاب" کو پڑھنا چاہئے۔ ڈاکٹر موصوف اس کتاب میں ایک موقع پر لکھتا ہے۔

"اس میں شک نہیں کہ اعصاب کی جنبش ایک قسم کی حرکت عملی ہے یعنی منبہ کی تحریک سے حاس عامل کے عمل سے ہوتی ہے اور اس عامل کا صدور مرکز عصبی سے ہوتا ہے، حرکت عصبی ایک اعصاب کی طرف سے دوسرے کی طرف منتقل ہوتی ہے اس نوع عملی کی اگر تحلیل کی جائے تو اسکا مفہوم صرف یہی نکلے گا کہ یہ تموج دقائق اعصاب کے اضطراب سے عبارت ہے اور اس کے لئے ان دقائق کا اہتزاز ضروری ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ مادہ عصبی ایک طرف سے دوسری طرف منتقل نہیں ہوتا یعنی کوئی مادی چیز مرکز اعصاب سے نکلکر اسلاک اعصاب میں پہونچکر ان کو حرکت نہیں دیتے بلکہ ایک تموج اہتزازی اسلاک عصبیہ کے ذریعہ سے منتقل ہوتا ہوا عضلات سے متصادم ہوتا ہے اور یہی تصادم عضلات کی حرکت کا باعث ہوتا ہے، اور چونکہ دلائل سے یہ بھی ثابت ہے کہ جنبش اعصاب میں ایک کیمیائی عمل بھی شامل ہوتا ہے جس سے ایک برقی رو پیدا ہوتی ہے اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ اعصاب کی جنبش ایک کیمیائی لہر ہے جو اعصاب کے ریشوں میں ایک طرف سے دوسری طرف منتقل ہوتی ہے تو غلط نہیں۔

اگر سنگ مرمر کی میز پر ایک طرف سینے کی مشین چل رہی ہو اور اس کی دوسری طرف تم اپنا ہاتھ رکھو تو تمکو سنگ مرمر کے

ہتزاز سے یک خاص قسم کی حرکت محسوس ہوگی، یہ اہتزازی حرکت اعصاب کی حرکت اہتزازی کی ایک بعید تشبیہ ہوسکتی ہے ۔

الحاصل حرکت عصبی کا اشتعال دقائق اعصاب کی حرکت اہتزازی سے عبارت ہے ۔

عصاب کی حرکت ارتعاشی | پہلے معلوم ہوچکا ہے کہ دقائق اعصاب اہتزازی حرکت کرتے ہیں اور اسی کے ذریعہ سے احساس منتقل ہوتا ہے، دقائق اعصاب کی اس حرکت اہتزازی کے علاوہ اعصاب کی ایک حرکت کلی بھی ہے، اس حرکت کے متعلق ڈاکٹر ہارنیس مذکور لکھتا ہے ۔

"مختلف دلائل سے ثابت ہوچکا ہے کہ اعصاب میں ایک خفیف سی حرکت ارتعاشی بھی ہوتی رہتی ہے جو باصرہ اور لامسہ سے محسوس نہیں ہوسکتی، دلائل سے ثابت ہوچکا ہے کہ یہ حرکت ارتعاشی ایک دوری حرکت ہے جو ایک ثانیہ میں ۱۰ سے ۱۲ مرتبہ تک ہوتی ہے، یہ معلوم کیا گیا ہے کہ جب ہاتھ کسی چیز کے اٹھانے کے لئے اوپر کی طرف کھنچتا ہے تو عضلات میں ایک ارتعاش حرکت ۱۰ سے ۱۱ مرتبہ فی ثانیہ کی اوسط سے ہوتا ہے ۔

عضلات خواہ سکون کی حالت میں ہوں یا حرکت کی حالت میں ان میں ہر وقت ایک دائمی ارتعاش رہتا ہے، اگر تم اپنے دونوں کانوں کو آہستگی سے بند کرو اور ایک جبڑے کو دوسرے پر خوب جماؤ تو اس وقت تم کو اس حرکت ارتعاش کی آواز سنائی دیگی"

ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ اعصاب کی حرکت میں وہ حرکت جو مرکز اعصاب سے صادر ہوتی ہوئی عضلات تک پہونچتی ہے اہتزازی حرکت ہے کیونکہ مرکز میں اہتزاز پیدا ہوتا ہے اور یہ اہتزاز تموج کی صورت میں مرکز سے عضلات تک پہونچتا ہے ۔

اب ہم حرکت ساعدہ پر غور کرتے ہیں جو اطراف اعصاب سے شروع ہوکر اعصاب کے سلک حساس میں منتقل ہوتی ہوئی دماغ تک پہونچتی ہے ۔

حرکت سلک عصبی | حاسہ بصری :- یہ بات معلوم ہے کہ چیزیں انعکاس نور کے ذریعہ سے نظر آتی ہیں اس لئے جہاں روشنی نہیں ہوتی وہاں بصارت بھی مفقود ہوتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوچکا ہے کہ روشنی ایتھر کے تموجات سے عبارت ہے ۔

بینائی یا بصارت کیا چیز ہے ؟

ایتھر کی موجیں پے در پے پتلی سے متصادم ہوتی رہتی ہیں اور اس تصادم سے اعصاب بصارت متاثر ہوکر اہتزاز کرتے ہیں اور یہی اسلاک عصبی کے ذریعہ دماغ کے مرکز بصارت میں پہونچتا ہے اور وہاں بھی اسی کے مطابق اہتزاز پیدا کردیتا ہے۔

روشنی سات مختلف رنگوں کی شعاعوں سے مرکب ہے اور یہ رنگ قوس قزح یا موشور (مثلثی شیشہ) کے ذریعہ سے نظر آتے ہیں ۔

رنگوں کے درمیان ہم کیونکر تمیز کرسکتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ طیف شمسی کے الوان سبعہ میں ہر ایک رنگ کی شعاع ایک خاص اہتزاز رکھتی ہے اور یہ ثابت ہوچکا ہے کہ سرخ رنگ میں سب سے کم اور بنفشی رنگ میں سب سے زیادہ اہتزاز ہوتا ہے روشنی میں انحلال کے بعد سات رنگ جس

ترتیب سے نظر آتے ہیں اس لحاظ سے ان میں سرعت ہوتی ہے یعنی سب سے پہلا رنگ بہت آہستہ اور آخری رنگ نہایت سریع اہتزاز کرتا ہے۔ الوان سبعہ کی ترتیب یہ ہے، سرخ، نارنگی، زرد، سبز، نیلا، آسمانی، بنفشئی،

آنکھ رنگوں کے درمیان فرق کرتی ہے اور یہ انھیں رنگوں کے اہتزازات کی بنا پر ہوتا ہے، اعصاب بصری میں یہ قابلیت موجود ہے کہ وہ الوان سبعہ کے مختلف اہتزازات کو اس اختلاف کے ساتھ قبول کر سکیں اور اس کے ذریعہ سے ان کے درمیان فرق محسوس کر سکیں اور ان سات رنگوں کے علاوہ جو اور اہتزاز ہوتے ہیں انھیں قبول نہیں کر سکتے، طیف شمسی میں علاوہ سات رنگوں کے بہت سے سیاہ خطوط پائے جاتے ہیں، ان کے خطوط کے متعلق یہی خیال کیا جاتا ہے کہ یہ حقیقت میں سات رنگوں کے علاوہ اور رنگ ہے جن کو اعصاب محسوس نہیں کر سکتے، یہی خیال ہے کہ سرخ رنگ کے نیچے اور بنفشئی سے اوپر اور بہت سے رنگ ہیں جنکے اہتزازات کو آنکھ قبول نہیں کر سکتی اور اسی وجہ سے ان کے ادراک سے انسان قاصر ہے، چنانچہ منجملہ ان رنگوں کے جو بنفشئی کے اوپر ہیں رونٹجن کی شعاعیں بھی ہیں جو آنکھ پر اثر نہیں ڈالتیں مگر انکے وجود پر ایک خاص طریقہ سے استدلال کیا جا سکتا ہے۔

ہماری قوت متخیلہ میں اعصاب بصری کے ذریعہ سے جو کچھ منتقل ہوتا ہے وہ اہتزازی حرکت رکھتا ہے اور ہم اشیاء کے درمیان اُن کے اختلاف اہتزازات کی باہمی نسبت کی بنا پر فرق کرتے ہیں، مبصرات کی تمیز حیوانات میں یکساں نہیں ہے کیونکہ حیوانات بصری میں ان اہتزازات کے قبول کرنے کی قابلیت مختلف ہے، بعض حیوانات بعض رنگوں کے درمیان فرق کر سکتے ہیں اور بعض نہیں کر سکتے یہانتک کہ خود افراد انسانی کے درمیان اختلاف ہے بعض آدمی دو متشابہ رنگوں میں فرق کر سکتے ہیں اور بعض اس سے قاصر ہیں

حاسۂ سمعی | سامعہ اور باصرہ کی بالکل ایک حالت ہے، ہم مختلف آوازوں کے درمیان جو فرق کرتے ہیں اسکی بنا ہوا کے ضعیف یا قوی اہتزازی تموج پر منحصر ہے جو آواز کرنے والے اجسام سے پیدا ہوتا ہے۔

آواز کی حقیقت یہ ہے کہ آواز ایک تموج ہے جو ہوا کے ذریعہ سے منتقل ہوتا ہوا طبل سماعت سے ٹکراتا ہے اور اس سے اس تموج کے بالکل مطابق اہتزاز پیدا ہوتا ہے اور طبل سے متصل جو اعصاب ہیں ان میں یہ اہتزاز منتقل ہو کر مرکز سماعت تک پہونچتا ہے جس سے وہ بھی اسی کے مطابق اہتزاز کرنے لگتا ہے، اور انسان آواز کو سن لیتا ہے۔

شامہ، ذائقہ، اور لامسہ کے احساسات بھی اسی طرح اپنے مرکزوں تک پہونچتے ہیں۔

ادراکات عقلی | ادراکات عقلی جو ہمارے دماغ کے مراکز عقلی تک پہونچتے ہیں یہ بھی دراصل اعصاب کی حرکات اہتزازی ہیں اور اہتزازات کے اختلاف سے ان میں باہم تمیز کی جاتی ہے، کیونکہ جب حرکت سے حرکت ہی پیدا ہوتی ہے اس لئے یہ ممکن نہیں کہ اعصاب کی حرکت اہتزازی جو محسوسات سے پیدا ہوتی ہے حرکت پیدا نہ کرے،

حرکات دماغی کے نتائج | جب یہ ثابت ہو چکا کہ فعل عقلی مرکز دماغی کے دقایق کی حرکت ہے، جو اسلاک عصبی کے اہتزاز سے پیدا ہوتی ہے اور یہ اہتزاز محسوسات کے ادراک کا نتیجہ ہوتا ہے تو اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے

کہ اس حرکت کے نتائج کیا ہیں کیونکہ ہم مقالات دل میں لکھ چکے ہیں کہ حرکت ضائع نہیں جاتی بلکہ مادہ، زمان اور مکان کی طرح یہ بھی غیر متناہی اور مختلف صورتیں اختیار کرتی چلی جاتی ہے اور ادراکات عقلی بھی حرکت ہی کی ایک قسم ہے لہذا اس کے غیر متناہی نتائج کیا ہو سکتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ افعال عقلیہ کے مظاہر ہمارے کلام اور ہمارے افعال میں نظر آتے ہیں۔ تعلیم، تربیت، تفنن، بحث مباحثہ، ان تمام اعمال میں جنکا صدور قوائے عقلیہ سے ہوتا ہے اعصاب کا استعمال ضروری ہے، زبان کے اعصاب کلام کرنے کیلئے، انگلیوں کے اعصاب کتابت، تصویر اور موسیقی، وغیرہ کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں، اسی طرح تمام مدرکات عقلی کے نتائج تحریک اعصاب کی صورت میں نمایاں ہوتے ہیں، حرکت عقلی مرکز دماغی میں اسی طرح محفوظ ہے جس طرح حرارت نباتات میں، اور ضرورت کے وقت یہ حرکات عقلی، تموجات اہتزاز کی صورت میں اسلاک عصبی کے ذریعہ سے منتقل ہوتی ہے اور اس سے تعلیم، کتابت وغیرہ کے افعال صادر ہوتے ہیں، غرض جس طریقہ سے حرکات دماغ میں داخل ہوتی ہیں اسی طریقہ سے خارج ہوتی ہیں۔

افعال عقلی کی ایک قسم اور بھی ہے جسکا اثر براہ راست ہمارے ظاہری افعال میں نمایاں نہیں ہوتا، یہ قسم تفکر اور تامل ہے۔ جس میں تمام ہماری عقلی قوتیں مشغول ہوتی ہیں یہ تاملات بھی ایک قسم کی حرکت ہیں جسکا اثر افعال ظاہرہ پر نہیں پڑتا، جب ہم کسی فکر سے فارغ ہوتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ فکر ایک خواب تھا۔ اور اب اس کا اثر کچھ بھی نہیں رہا لیکن حقیقت یہ ہے کہ حرکات فکری بھی ایک زبردست نتیجہ پیدا کرتے ہیں۔

حرکت عصبی کا انتقال ایتھر میں | حرکت فکری ایتھر میں منتقل ہوتی ہے کیونکہ ایتھر غایت درجہ لطیف بھی ہے جو تمام اجسام کے دقایق اور جواہر میں داخل ہے، جب ہم اپنے قوائے عقلی مثلاً حافظہ متخیلہ اور متصورہ وغیرہ کو کام میں لاتے ہیں تو ان قوتوں کے مرکز دماغی میں اہتزازی حرکت پیدا ہوتی ہے، چونکہ دماغ میں ہر ہر جگہ ایتھر موجود ہے لہذا یہ اہتزاز ایتھر میں منتقل ہوتا ہوا چلا آتا ہے اور یہ اہتزاز اپنے محل مصدر کے بالکل مطابق ہوتا ہے۔

حرکت فکری کا اثر اسلاک عصبی پر بھی ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے ان اسلاک میں اہتزاز پیدا ہوتا ہے جس کی وجہ سے ایتھر بھی اہتزاز میں آجاتا ہے۔

بعض وقت عمیق تصور کرتے وقت انسان سے بلا امتیاز کوئی حرکت یا کوئی بات صادر ہو جاتی ہے یہ بھی حقیقت میں دماغ کی حرکت فکری کا نتیجہ ہے، اس لئے حرکت فکری صرف ایتھر کو متاثر نہیں کرتی بلکہ بعض وقت نظام عصبی میں بھی حرکت پیدا کر دیتی ہے۔

علمائے فزیالوجی نے ثابت کر دیا ہے کہ اعصاب کی حرکت کے ساتھ ایک برقی رو بھی شامل ہوتی ہے، یہ برقی رو جب اسلاک اعصاب میں منتقل ہوتی ہے ایتھر کی موجوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس لئے حرکت فکری اس صورت سے بھی ایتھر میں تحریک پیدا کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔

توارد افکار | جب یہ معلوم ہوا کہ دماغ کی حرکت فکری ایتھر کے دقایق میں ایک خاص قسم کا اہتزاز پیدا کرتی ہے اور ایک

فکر اور خیال کا اہتزاز دوسرے سے علیحدہ ہے تو یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا، بعض وقت ایک ہی لمحہ میں دو شخصوں کے ذہن میں ایک ہی خیال کا پیدا ہونا اسی اہتزاز کا اثر ہے، اور اس کی صورت یہ ہے کہ بعض وقت جب کسی شخص کے دماغ میں ایک خاص خیال پیدا ہوتا ہے تو اس کے دقائق دماغی میں ایک خاص قسم کا اہتزاز پیدا ہونے لگتا ہے، وہ یہ اہتزاز بذریعہ ایتھر منتقل ہوکر دوسرے کے دقائق دماغی میں اسی نوع کا اہتزاز پیدا کر دیتا ہے اور دوسرے شخص کے ذہن میں بھی وہی بات آجاتی ہے، اس موقع پر ایک سطحی اعتراض یہ ہوسکتا ہے کہ اگر توارد افکار کی یہی وجہ ہے تو چاہئے کہ اگر ایک مجلس میں دس آدمی بیٹھے ہیں اور ایک آدمی نے کوئی بات سوچی تو سب کے دماغ میں وہی بات آجانی چاہئے حالانکہ ایسا نہیں ہوتا اس لئے توارد افکار محض ایک اتفاقی امر ہے، لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ جب دو یا اس سے زیادہ اشخاص ایک مجلس میں بیٹھے ہوں تو ایک شخص کا ذہن کسی خاص خیال میں مشغول رہتا ہے، اور چونکہ اس کے ذاتی خیال میں اس کے دماغ کے دقائق حرکت کرتے رہتے ہیں اس لئے وہ دوسرے اہتزاز کو جو اس کے قریب والے شخص کے دماغ سے منتقل ہوتا ہوا پہونچتا ہے قبول نہیں کر سکتے، ہاں اگر دونوں ایک ہی خیال میں مستغرق ہوں اور ایک ہی قسم کی باتیں سوچ رہے ہوں تو اسوقت توارد اکثر واقع ہوجاتا ہے کیونکہ اس حالت میں دونوں دماغوں کے دقائق ایک ہی طرح حرکت کرتے ہیں اس لئے وہ خارجی تحریک کو جو اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتی بہ آسانی قبول کر لیتے ہیں، اس سے مراقبہ اور درویشوں کے توجہ ذہنی کی حقیقت بھی واضح ہوجاتی ہے۔ قلت توارد کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ایتھر کے تموجات کروی شکل میں پھیلے ہیں اور جسقدر وہ ہوا یا ایتھر میں پھیلتے جاتے ہیں اسی قدر کمزور ہوتے جاتے ہیں، لہذا جو شخص قریب ہوتا ہے اس کے دماغ پر بہ نسبت دور والے کے زیادہ اثر پڑ سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جو لوگ "قرأت افکار" کی مشق کرتے ہیں وہ اپنا ہاتھ دوسرے کے دماغ پر رکھ کے اسکا خیال بتا دیتے ہیں۔

ایک اور وجہ قلت توارد کی یہ ہے کہ توارد صرف انہیں اشخاص میں پیدا ہوتا ہے جو ہم خیال ہوں اور دونوں کی فزیالوجکل ترتیب ایک طرح پر ہو، ان اشخاص میں توارد خیالی بہت کم ہوتا ہے جن کے خیالات اور اخلاق میں کوئی وجہ مشترک نہ پائی جاتی ہو۔

جو لوگ قرأت افکار کی مشق کرتے ہیں وہ اپنے ذہن کو نئے خیالات اخذ کرنے کا عادی بناتے ہیں اور انکی مشق اس درجہ قوی ہوجاتی ہے کہ وہ آسانی سے اس خیال میں جو خارج سے ان کے دماغ میں پیدا ہوتا ہے اور اس خیال میں جو ذاتی طور پر ان کے دماغ میں پیدا ہوتا ہے آسانی سے فرق کر سکتے ہیں جس طرح دوسرے شخص کا خیال معلوم کرنے کی مشق ہوسکتی ہے اسی طرح دوسرے کو اپنا ہم خیال بھی بنایا جا سکتا ہے یعنی انسان اسقدر مشق حاصل کر سکتا ہے کہ وہ دوسرے کی دماغی دنیا میں اپنے خیال کے مطابق انقلاب پیدا کر سکے۔

اگر یہ ثابت ہوجائے کہ فکر روحانی ایک عمل ہے اور مادہ سے اس کا کچھ تعلق نہیں ہے (جیسا کہ روحیین کا دعویٰ ہے)

تو ممکن ہے کہ مردہ اشخاص کی روحوں سے بھی گفتگو کرنے کی مشق پیدا کر لی جائے، چنانچہ اسوقت روحانی اور مادی دونوں مذہب والے اپنی اپنی رائے کے موئدات پیش کرتے ہیں، لیکن یہ مسئلہ ابھی تک طے نہیں ہوا ہے، ممکن ہے کہ روحانی اور مادی جماعتیں دونوں کسی وقت ایک نقطہ پر جمع ہو جائیں اور یہ صرف اسوقت ہوگا جب کہ عالم روحانی اور ایتھر کو ایک ہی تسلیم کر لیا جائے۔

گذشتہ صفحات میں دماغ کے دقائق کی اہتزازی حرکت سے انتقال افکار کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے وہ ابھی تک ایک غیر متیقن نظریہ کی شان رکھتی ہے، اس لئے اس کو حقائق ثابتہ کی طرح تسلیم نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اس وقت تک اسکے اثبات میں جو دلائل پیش کئے گئے ہیں وہ کچھ زیادہ قوت نہیں رکھتے، البتہ یہ ضروری ہے کہ عالم حیات کے بہت سے مظاہر طبعی اسکی تائید کرتے ہیں۔

حرکات فکری کے علاوہ اور بھی ایسی بہت سی حرکات ہیں جنہیں عصبی اور عقلی دونوں عمل شریک ہوتے ہیں اور مادی و ایتھری دونوں حرکتیں کام کرتی ہیں اور یہ وہ حرکتیں ہیں جو محاکات اور تقلید کی صورت میں نمایاں ہوتی ہیں۔

محاکات رفتار جب دو شخص برابر چلتے ہیں تو بعض وقت انکے قدم مل جاتے ہیں، خاص کر فوجی لوگ تو اکثر قدم ملا کر چلتے ہیں ظاہر ہے کہ ہر قدم کے لئے قدم اٹھانے والا یہ ارادہ نہیں کرتا کہ وہ دوسرے کے موافق قدم اٹھائے بلکہ مشق کے بعد خود بخود موافق قدم اٹھتے جاتے ہیں، یہ توافق رفتار حرکت کے ناموس محاکات پر مبنی ہے، اس محاکات میں دو سبب کام کرتے ہیں۔

۱۔ جب ایک شخص قدم اٹھاتا ہے تو اس کے ساتھ ہوا میں ایک تموج پیدا ہوتا ہے اور جب دوسرا شخص بھی اسکے موافق قدم اٹھاتا ہے تو دونوں کا تموج بھی موافق ہو جاتا ہے اس کے بعد یہ تموج دونوں کو ایک ساتھ قدم اٹھانے میں مدد دیتا ہے۔

۲۔ جب ایک شخص زمین پر قدم رکھتا ہے اور اس کی آواز دوسرے کے کانوں میں پہونچتی ہے تو اس کے دماغ سے دوسرے قدم کو اس کے موافق اٹھانے کے لئے حکم صادر ہوتا ہے اور اس طرح برابر قدم اٹھتے چلے جاتے ہیں، اس محاکات میں تین قسم کے اہتزازات ہوتے ہیں، ایک اہتزاز احساسی جو دوسرے کے قدم کی آواز سننے سے پیدا ہوتا ہے، دوسرا اہتزاز امری جو دماغ کے حکم سے اعصاب میں پیدا ہوتا ہے، تیسرا اہتزاز محرک جو اعصاب میں تعمیل حکم کے لئے پیدا ہوتا ہے اور اس کے ذریعہ سے پیر کو جنبش دی جاتی ہے۔

محاکات تغنی محاکات حرکت بعض صورتوں میں عجیب طرح نمودار ہوتی ہے، اگر ایک جگہ دو شخص بیٹھے ہوئے کسی خیال میں بالکل مستغرق ہوتے ہیں اور ایک ان میں کوئی شعر گانے لگتا ہے تو بعض وقت دوسرے کی زبان پر بھی وہی شعر آ جاتا ہے، حالانکہ وہ اس کے پڑھنے کا مطلق ارادہ نہیں کرتا ہے بلکہ وہ بلا اختیار اور قوت ارادی سے مشورہ لئے بغیر گانا شروع کر دیتا ہے اور کچھ دیر کے بعد جب ان دونوں کو اپنے استغراق سے فرصت ملتی ہے تو انہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ دونوں ایک ہی شعر کیساتھ تغنی کر رہے تھے، اور یہ صرف ان اشعار میں ہو سکتا ہے جو مشہور ہیں اور عام طور سے زبان پر رہتے ہیں۔

اس محاکات کی وجہ یہ ہے کہ جب ایک شخص کوئی شعر پڑھنا شروع کرتا ہے تو اس کی آواز سے ہوا میں خاص قسم کا

اہتزاز پیدا ہوتا ہے جو منتقل ہوتا ہوا دوسرے کی قوت سامعہ پر اثر ڈالتا ہے اور اس کے دماغ میں بھی اس کے مطابق اہتزاز پیدا کرتا ہے اور وہی شعر جو پہلے سے اس کی خزانہ دماغ میں مخفی محفوظ تھا زبان پر آجاتا ہے۔ مگر چونکہ وہ شخص کسی خاص خیال میں مستغرق ہوتا ہے اور اس کی تمام تر توجہ اس طرف ہوتی ہے لہذا اسے خبر نہیں ہوتی کہ اس کی زبان پر کونسا شعر ہے۔ محاکات تغنی کے اصول پر رقص، داد و تالی بجانے میں بھی محاکات پیدا ہوتی ہے۔

بچوں کی تقلید | بچوں میں تقلید بہت زیادہ پائی جاتی ہے کیونکہ یا تو ان کی ارادی قوت کسی دوسری طرف مشغول ہوتی ہے یا اسقدر ضعیف ہوتی ہے کہ دماغ کے مرکزوں پر اسکا پورا اقتدار نہیں ہوتا اس لئے بچہ اپنے خیال میں بڑوں کی تقلید کرتا ہے، چھوٹے بھائی بڑے بھائی کی تقلید کرتے ہیں اور بڑے بھائی اپنے باپ کی تقلید کرتا ہے، کھیل، رفتار، گفتار، رونے، ہنسنے، کھانے پینے یہاں تک کہ تمام جزئی اور کلی افعال میں بچے اپنے بڑوں کی تقلید کرتے ہیں، بچوں میں تقلید کا مادہ اس لئے زیادہ ہوتا ہے کہ ان کے خزانۂ دماغی میں مدرکات عقلی نہیں ہوتے، یا بہت کم ہوتے ہیں اس لئے انکا دماغ خارجی اہتزازات قبول کرنے کے لئے بہت زیادہ مستعد ہوتا ہے، بیٹا جو باپ کی تقلید کرتا ہے تو یہ صرف فزیالوجکل وراثت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس میں قانون محاکات بھی بڑی حد تک موثر ہیں، یہی وجہ ہے کہ جو والدین اپنے بچے کی خود تربیت نہیں کرتے بلکہ کسی دوسرے تربیت کرنیوالے شخص کے سپرد کر دیتے ہیں وہ بچہ بجائے اپنے والدین کے اپنے مربی کے اخلاق کا نمونہ ہوتا ہے۔

تفاوت محاکات | محاکات افراد انسانی میں بہ نسبت حیوانات کے زیادہ پائی جاتی ہے، لیکن افراد انسانی کے درمیان محاکات میں تفاوت بھی ہے۔ کیونکہ محاکات میں طرفین کے درمیان تناسب کی بھی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے بچے بہ نسبت اپنے پڑوسیوں کے والدین کی تقلید زیادہ کرتے ہیں، اس طرح ایک شہر والے بہ نسبت اجنبی لوگوں کے اپنے شہر یوں کے زیادہ مقلد ہوتے ہیں، اسی طرح ایک ملک والے غیر ملکیوں کی بہ نسبت اپنے اہل وطن کی زیادہ تقلید کرتے ہیں۔

حیوانات میں وہ حیوان انسان کی بہت زیادہ تقلید کرتا ہے جس کے مراکز دماغی انسان سے زیادہ مشابہ ہیں، مثلاً "بندر" کیونکہ بندر کے مراکز دماغی تمام جانوروں کی بہ نسبت انسان سے زیادہ مشابہت رکھتے ہیں اسی نقل کا مادہ بندر میں بہت زیادہ ہے انسان کے حرکات سے جو اہتزازات ایتھری پیدا ہوتے ہیں انکو اسکا دماغ نہایت آسانی سے قبول کر لیتا ہے۔

چونکہ محاکات میں تناسب کی ضرورت ہے اس لئے اجنبی اقوام کی عادات و اخلاق کو بجائے تقلید کرنے کے نہایت نفرت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ غیر قوموں کی موسیقی ہم کو لطف نہیں دیتی، اسی طرح غیر قوموں کو ہماری موسیقی سے لطف حاصل نہیں ہوتا، وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ ہمارے دماغ میں موسیقی کا جو مرکز ہے وہ اپنی موسیقی کا خوگر ہو گیا ہے یعنی جب ہم موسیقی سنتے ہیں اور اس کے اہتزازات ہمارے مرکز موسیقی تک پہونچتے ہیں تو بھی اس کے مطابق اہتزاز کرنے لگتا ہے اور اس سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اسی قسم کے اہتزازات سے مانوس ہوتا ہے، اور جب ہم کسی

دوسری قوم کی موسیقی کو سنتے ہیں تو ہمارے دماغی مرکز کو اپنی مرغوب عادت کے خلاف اہتزاز کرنا پڑتا ہے، جس سے وہ بجائے لطف اٹھانے کے نوبت پاتا ہے، لیکن رفتہ رفتہ جب ہم کو غیر ملکی موسیقی سے مناسبت ہو جاتی ہے تو اس سے بھی لطف آنے لگتا ہے۔

غیر زبانوں کے تلفظ میں التباس | اگر تم کسی اجنبی زبان کا کوئی لفظ اسی لہجہ میں سنو اور اس زبان سے تم کو واقفیت نہ ہو تو تم مشکل سے اس کے حروف میں فرق کر سکو گے، مثلاً یونانی زبان میں ق اور ب کا فرق اور ترکی میں د اور ط کا فرق مشکل ہے اور اس فرق کو اہل زبان ہی سمجھ سکتا ہے، یا وہ شخص جو ایک مدت تک ان میں رہا ہو روسی، جاپانی، اور چینی وغیرہ جو ہم سے بہت زیادہ اجنبی ہیں ہم ان کے حروف کے درمیان بہت کم فرق کر سکتے ہیں بلکہ یہ خیال کرتے ہیں کہ شاید ان زبانوں کے تہجی بالکل مختصر ہیں، ان غیر متمیز حروف کی شکل بالکل ان سیاہ خطوط کی طرح ہے جو طیف شمسی میں نظر آتے ہیں حقیقت میں یہ خطوط سات رنگوں کے علاوہ اور رنگ ہیں مگر چونکہ ہماری آنکھیں انہیں نہیں دیکھ سکتیں یا انکے درمیان فرق نہیں کر سکتیں اس وہ سب ہم کو سیاہ نظر آتے ہیں اسی طرح ہر ایک لفظ کے تلفظ سے خاص قسم کے اہتزازات پیدا ہوتے ہیں، اب اگر ان اہتزازات سے ہمارے مراکز دماغی پہلے سے خوگر ہیں۔ تو ہم ان حروف کو سمجھ جاتے ہیں اور ان کے درمیان فرق کر سکتے ہیں، اور اگر ہم ان کے عادی نہیں ہیں تو بہت کم فرق کرتے ہیں یا بالکل نہیں کر سکتے

یہی حال ایک ہی زبانوں کے مختلف لہجوں کا ہے ہم اپنی زبان کے مختلف لہجوں میں بآسانی فرق کر سکتے ہیں، لیکن دوسری زبان کے مختلف لہجوں میں فرق کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔

ہم شکل اشخاص میں التباس | افراد انسانی کی صورتوں میں فرق کرنا بھی اسی طرح مشکل ہو جاتا ہے، ہم اپنے خاندان کے دو بھائیوں میں جو ایک دوسرے سے بہت ہی مشابہ ہوں آسانی سے فرق کر سکتے ہیں مگر بعض وقت غیر خاندان والا مشکل سے ان میں تمیز کر سکتا ہے۔ اسی طرح ہم اپنی قوم کے افراد میں آسانی سے فرق کر سکتے ہیں اور چینی، جاپانی، بخاری، وغیرہ ہم کو ایک ہی شکل کے نظر آتے ہیں

گذشتہ مقالات سے واضح ہوتا ہے کہ عالم کا ایک ایک ذرہ بالاستمرار حرکت میں ہے، تمام مظاہر قدرت جمادات، نباتات اور حیوانات کی تولید، ان کے مختلف انقلابات، اور ارضیات کے تمام تغیرات، غرض عالم کائنات کا ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ ترین واقعہ قوانین حرکت کے تابع ہے اور جو کچھ نظر آ رہا ہے صرف حرکت دوری اور اہتزازی قوت کا نتیجہ ہے، اسلئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وجود حرکت ہے اور سکون فنا۔

اب ہم حرکت اجتماعی پر کچھ روشنی ڈالنا چاہتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ اجتماعی حرکات بھی اہتزاز دقائق کا کرشمہ ہیں۔

ہمدردی اور عناد | ہم کہتے ہیں کہ فلاں کو فلاں سے ہمدردی (Sympathy) ہے یا فلاں کو فلاں سے (antipathy) عناد ہے۔ ہمدردی، عناد، محبت، نفرت، توافق، اور تنافر سے کیا مراد ہے، اگر ہم کہیں کہ محبت کے معنی ذوق، اخلاق، اور مزاج کا تناسب اور تشابہ ہے اور نفرت اس کے برعکس ہے تو یہ تعریف خود تعریف کی محتاج ہے، بلکہ تعریف الشئی بالشئی سے آگے نہیں بڑھتی، لیکن تاہم اس سے ایک گونہ وضاحت ہو سکتی ہے۔

اگر ہم نے دو شخصوں کو کبھی نہیں دیکھا اور پھر ہم انہیں دفعتاً دیکھتے ہیں، تو ایک شخص کی طرف ہم اپنا طبعی رجحان اور دوسرے کی طرف بغض محسوس کرتے ہیں، حالانکہ ہم کو دونوں کی اخلاقی اور ذہنی حالت کا مطلق علم نہیں ہے، اسکی کیا وجہ ہے۔؟

محبت اور نفرت کی چاہے کچھ تعریف بیان کی جائے، مگر سب کا رجوع، نظام عصبی بلکہ مراکز دماغ کی طرف ہوتا ہے، دماغی مراکز ہمارے اخلاق وعادات کا محل صدور ہیں، ہمارے تمام مظاہر عقلی اور اخلاقی وہیں سے پیدا ہوتے ہیں۔

جس شخص کے ساتھ ہم کو الفت ہوتی ہے اس کے دماغی اہتزازات ہمارے اہتزازات سے مشابہ ہوتے ہیں اور جس سے بغض ہوتا ہے اس کے اہتزازات برعکس،

اگر دو شخصوں کے اہتزازات دماغی ایک دوسرے کے بالکل مشابہ ہیں تو بغیر معرفت سابقہ کے اس سے محبت ہو جاتی ہے، اور اگر خلاف ہیں تو اس کی طرف دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔

ہاں بعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص کو دوسرے سے سخت محبت ہوتی ہے اور دوسرے کو اس سے سخت نفرت، لیکن حقیقت میں یہ محبت نہیں ہے بلکہ یہ ایک غیر صادق میلان ہے جو کسی مادی یا کسی اور غرض پر مبنی ہوتا ہے لیکن بعض وقت خود محبت کرنے والا ان مختلف اسباب میں فرق نہیں کر سکتا اور وہ اپنی محبت کو سچا خیال کرتا ہے۔

چہرے کے نقوش امیال وعواطف | چونکہ تمام اخلاق وعادات اور مدرکات محسوسات کا صدور دماغی مرکز سے ہوتا ہے، اور اعصاب کا اثر عضلات پر پڑتا ہے، اور اعصاب وعضلات ہی کے مخصوص اجتماع اور ترکیب سے جسم اور چہرے کی ساخت ہوتی ہے، اس لئے چہرہ کے نقوش کو دیکھ کر انسان کے اخلاق وعادات پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے اور یہی علم قیافہ کی حقیقت ہے۔

نتیجہ | ۱۔ حرکت کی تمام قسمیں (اجتماعی، حیاتی، اور جمادی) مختلف حرکات کا نتیجہ ہیں، اسی طرح یہ حرکات بھی اور حرکات کا نتیجہ ہیں اور یہ سلسلۂ حرکات غیر متناہی ہے،

۲۔ ہم جس کو "قوت" سے تعبیر کرتے ہیں وہ حقیقت میں ایک حرکت ہے اور در اصل وہ حرکت بھی مختلف حرکات کا نتیجہ ہے۔ حرکات سببی کے سلسلہ کو چاہے جتنا پیچھے ہٹا دیا جائے اس کا سلسلہ ہرگز ختم نہ ہوگا۔ جب تک ہم اس قابل نہ ہوں کہ مسبب بغیر سبب کے پیدا ہو سکے۔

۳۔ حرکت جو مختلف حرکات کا نتیجہ ہوتی ہے وہ ہر حالت میں دوری ہوگی۔

۴۔ تحول حرکت، دوری حرکت سے پیدا ہوتا ہے اگر دوری حرکت نہ ہوتی تو تحول حرکت بھی محال ہوتا۔

۵۔ حرکت کا دوری ہونا اور اس کا تحول، حرکت کے تنوع اور اس کے غیر متناہی مظاہر کا سبب ہے، اگر حرکت صرف مستقیم اور بسیط ہوتی تو وہ مختلف صورتوں میں تبدیل نہ ہو سکتی، یا دوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہئے کہ عالم کا وجود نہ ہوتا۔

نیاز

غزل

زدلم نہ گفتنے ز تو شنید نفسے
وے اینقدر بدانم کہ غمت کشید نفسے

نہ مژہ تراوش آرد نہ دلم چکید نفسے
گرہے مگر ز تار نفسم برید نفسے

زرہِ کرم سیر دی ببرم بحیرانہ گفتی
کہ قرار دست زمنت بدلے تپید نفسے

دل من ز التفات نگہت خراب گشتہ
مگر او ہنوز چو غم نارسید نفسے

چہ کنم بگو، بہ عہد نگہ فسوں طرازت
نہ مرا اسیر قرارے، نہ زرہ رمید نفسے

تو صد ہزار کیف نگہ شراب ریزے
منِ زار دار تقاش لب ناچشید نفسے

بمزارم از چہ آئی بگزر، شتاب بگزر
کہ مرا ز شورش اکنوں سر آرمید نفسے

زحدیث حسن و الفت خبرے جزایں ندارم
نگہت خلید نفسے، جگرم تپید نفسے

سخنے مگو ز حسن نگہش نیاز اکنوں
کہ دلِ زبوں رسائے غم نارسید نفسے

نیاز

غزل

تو ز واعظا ہوشے دکنار امن کوشے
من و لغزشے وصالِ ہم چشم میفروشے

نظرستم پرستم چہ شود خبر ندارم
ز نگاہِ کیف پرور اگرم دہی تو نوشے

چہ زید کسے بہ عہد نگہ کرشمہ سازت
کہ چکد ہزار بابل ز نگاہِ سحر کوشے

چو شدست حق پسندے بہ ہمیں مقالِ واعظ
نہ دہی مرا خدایا سرِ گوشِ حق نیوشے

نہ نیاز ہم ربودے دلِ پُرسکوں چو دیدے
سحر بیاض گردن، قمر برہنہ دوشے

نیاز

باب الاستفسار

غوازی مصر، حشیشیون، اخوان الصفا

(جناب سعید احمد صاحب بمبئی)

کیا آپ براہ کرم غوازی مصر، حشیشیون، اور اخوان الصفا پر بطور مقالات کے کچھ لکھکر مجھے بعض شکوک کے رفع کرنیکا موقع دیں گے

(نگار) مناسب تو یہ تھا کہ آپ اپنے شکوک ظاہر کرتے اور انہیں دور کرنے کی کوشش کی جاتی لیکن چونکہ آپ نے ابھی انکا اظہار مناسب نہیں سمجھا اس لئے میں بھی انتظار نہیں کرتا اور مختصراً آپ کے تینوں عنوانات کے متعلق عرض کرتا ہوں۔

(۱) غوازی، جمع ہے غازیہ کی۔ مصر میں، رقاصہ عورتوں کا ایک مخصوص طبقہ غوازی مصر کہلاتا ہے جو خانہ بدوشوں کی سی زندگی بسر کرتی تھیں، اور اطراف مصر میں اپنا رقص عریاں پیش کر کے کسب و معاش کی عادی تھیں۔ انکی معاشرت نہایت سادہ ہے اور تعلق ازدواج وہ اپنے ہی گروہ میں قایم کرتی ہیں۔ ان کے مرد عام طور سے نوکری اور تجارت وغیرہ میں مصروف رہتے ہیں، اپنی عورتوں کے ساتھ آوارہ نہیں پھرتے۔

غوازی میں ہنوز وہی وحشت باقی ہے جو اس سے قبل تھی، یا اب بھی جپسی ([illegible]) اقوام میں پائی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی اصل فنیشیائی قدیم اقوام سے ملتی ہے۔ رہا یہ امر کہ انہیں غوازی یا غازیہ کیوں کہتے ہیں۔ اس کے متعلق یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا، ممکن ہے کہ خود انہوں نے یا ان کے شیدائیوں نے حسن تاویل کی بنا پر ان کا یہ نام رکھ لیا ہو جس طرح ہندوستان میں پیشہ ور عورتوں کو بعض بازاری لوگ گروہ متوکلان سے تعبیر کرتے ہیں۔

اب سے تقریباً ایک صدی قبل غوازی مصر عام طور سے سڑکوں پر اپنا رقص دکھایا کرتی تھیں، لیکن ۱۸۳۴ء سے قانوناً انکا رقص، شدت عریانی کی وجہ سے ممنوع ہوگیا ہے کیونکہ ان کے اس رقص کی وجہ سے فحش بہت بڑھ چلا تھا۔

---

(۲) حشیشیوں سے مراد وہی طبقہ ہے، جو حروب صلیبی کے دوران میں شام کے پہاڑی قلعوں پر قابض تھا اور اپنے دشمنوں کو نہایت آزادی کے ساتھ قتل کر دیا کرتا تھا۔ انہیں حشیشیوں اس لئے کہتے ہیں کہ وہ حشیش (بھنگ) کا استعمال کرتے تھے علی الخصوص جب فدائیوں کو کسی کے قتل پر مامور کیا جاتا تھا تو اسے حشیش ضرور پلائی جاتی تھی تاکہ اسکا جوش فرو نہونے پائے۔ یہ طبقہ، اسمٰعیلیہ جماعت کی ایک شاخ تھی اور عام اعتقادات و اصول مذہب میں دونوں ایک تھے البتہ فرق یہ تھا کہ

حشیشیوں کی سیاسی حیثیت ذرا الگ تھی، یہ اپنے سردار کی فرمانبرداری آنکھ بند کر کے کرتے تھے اور اپنے دشمن کو قتل کر دینا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ علاوہ اس کے ان کی تمام تعلیمات نہایت مخفی رکھی جاتی تھیں اور سوائے اس شخص کے جو آکر اس سلسلہ میں داخل ہو، کسی کو پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہاں کیا ہوتا ہے۔ اس قبل ابو منصور العجلی اور مغیرہ بن سعید کے متبعین بھی جو خناق (گلا گھونٹ دینے والے) کہلاتے تھے اپنے دشمن کو ہلاک کر دینے کے عادی تھے۔

طبقۂ حشیشیوں کا موسس اول، حسن بن صباح تھا جس نے سنہ ۴۸۳ھ میں قلعۂ الموت پر قبضہ کر کے اپنے اصول کی تبلیغ شروع کی اور خاص خاص دشمنوں کو ہلاک کر کے اپنے قرب و جوار کے تمام قلعوں پر تسلط قائم کر لیا۔ چنانچہ آلِ سلجوق کا مشہور وزیر نظام الملک طوسی اسی گروہ کے ہاتھ سے شہید ہوا تھا۔

جب اسکے بعد ملک شاہ سلجوقی بھی قتل ہو گیا، تو دعویداران سلطنت کثرت سے پیدا ہو گئے اور ہنوز یہ قصہ طے نہ ہوا تھا کہ حروبِ صلیبی کی ابتدا ہو گئی۔ اس ہنگامہ سے حسن بن صباح نے بہت فائدہ اٹھایا اور اس کی قوت بہت بڑھ گئی۔ جب سلجوق سلطان محمد اول تخت نشین ہوا، تو اس نے اس جماعت کی سرکوبی کے لئے بڑا اہتمام کیا۔ اس وقت قلعہ دسنرکوہ، جو اصفہان کے قریب واقع تھا، اور جسے ملک شاہ سلجوقی، شاہ دیز کہا کرتا تھا، ابن عطاش کے قبضہ میں تھا جو اس جماعت کا سردار تھا اور جو حسن بن صباح کو بھی اپنا شاگرد بتاتا تھا۔ بمشکل تمام یہ قلعہ مفتوح ہوا۔ اور ایک ترکی سردار نوشتگین شیرگیر اس جماعت کے استیصال کے لئے مامور ہوا۔ یہ قلعۂ الموت تک پہونچ گیا تھا کہ محمد سلجوقی بادشاہ کا انتقال ہو گیا اور اسے محاصرہ اٹھا لینا پڑا۔ اسکے بعد حسن بن صباح سات سال تک زندہ رہا اور سنہ ۵۱۸ھ میں۔ اس کے بعد صباح کئی جانشین ہوئے جنکی فہرست یہ ہے:۔

حسن بن صباح	سنہ ۴۸۳-۵۱۸ھ	نور الدین محمد	سنہ ۵۶۱-۶۰۷ھ
بزرگ امید رود باری	سنہ ۵۱۸-۵۳۲ھ	جلال الدین بن حسن محمد	سنہ ۶۰۷-۶۱۸ھ
محمد بن بزرگ امید	سنہ ۵۳۲-۵۵۷ھ	علاء الدین محمد	سنہ ۶۱۸-۶۵۳ھ
حسن بن محمد	سنہ ۵۵۷-۵۶۱ھ	رکن الدین بن محمد	سنہ ۶۵۳-۶۵۴ھ

حسن بن صباح کے بعد خلفائے بغداد اور شاہان سلجوق نے بارہا اس جماعت کو مغلوب کرنے کی کوشش کی اور اسمیں شک نہیں کہ اسے بڑی حد تک پریشان کیا، لیکن پوری طرح استیصال نہ ہو سکا۔ یہ نہایت چالاکی اور ہوشیاری سے اپنے دشمنوں کو قتل کر دیتے تھے، اور حد درجہ جوش و خروش کے ساتھ اپنے اصول کی تبلیغ کیا کرتے تھے۔ شام کے ملک میں انکا قبضہ نہایت استوار ہو گیا تھا اور خلافتِ بغداد کا ضعف کسی طرح ان سے عہدہ برآ ہوتا ہوا نظر نہ آتا تھا۔ حروبِ صلیبی میں انہوں نے عیسائیوں کی بہت مدد کی اور اس سیاسی چال سے متعدد قلعے، کہف، علیقہ، قدموس، وغیرہ ان کے قبضہ میں آ گئے۔

جلال الدین بن حسن چھٹے سردار نے خلیفہ بغداد کے پاس تحریری معذرت بھیجکر اپنے عقائد باطلہ سے توبہ کی اور اس کے بعد سے اس جماعت میں بہت اختلاف ہو گیا تاہم یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ رکن الدین بن محمد کے زمانہ میں ہلاکو نے خروج کیا

اور اس جماعت کو پارہ پارہ کر دیا۔ رکن الدین قتل ہوا اور حشیشیوں کے تمام قلعے زمین کے برابر کر دیے گئے۔ اس کے بعد سے اس جماعت کی سیاسی اہمیت بالکل مفقود ہو گئی۔

بعض پہاڑی مقامات میں جو نصیری اسمٰعیلی جماعتیں پائی جاتی تھیں وہ اسی جماعت کی شاخیں ہیں، اسی طرح ہندوستان میں اسمٰعیلی اور خوجہ جماعتوں کی اصل بھی جماعت حشیشیون ہی ہے۔

---

(۳) اخوان الصفا، چوتھی صدی ہجری کے آخری نصف حصہ میں ایک مذہبی و سیاسی جماعت اہل تشیع کی پائی جاتی تھی جنھیں انکے اپنے عقائد کے لحاظ سے اسمٰعیلی کہنا زیادہ مناسب ہے۔ یہ جماعت جس کا مرکز بصرہ تھا اپنے تئیں اخوان الصفا کہتی تھی کیونکہ اس کا مقصد تصفیۂ روح تھا۔

انکی سیاسی تحریکات و تدابیر کا حال تو کچھ معلوم نہیں، البتہ ان کے علمی کارنامے ضرور ہم تک پہونچے ہیں۔ (چنانچہ انکے ۵۲ مضامین کا مجموعہ جو بمبئی میں شائع ہوا تھا، بہت مشہور چیز ہے) ان رسائل میں زیادہ تر وہ فلسفیانہ مباحث ہیں جو فیثاغورس، سقراط اور افلاطون کے اقوال سے مستنبط ہیں۔ خاص اصول انکا یہ تھا کہ دنیا کا وجود خدا سے بالکل اسطرح تعلق رکھتا ہے جس طرح نقطہ کا دونے والے سے۔ اور روح کو پھر خدا کے پاس واپس جانا ہے۔ چنانچہ اسی اصول کے ماتحت انہوں نے مختلف رسائل شائع کئے تھے۔

اس جماعت میں خاص خاص لوگ یہ تھے۔ ابو سفیان محمد بن مشیر البستی المقدسی، ابو الحسن علی بن ہارون الزنجانی، محمد بن نہر جوری العوفی اور زید بن رفاعہ۔

قمری مہینوں کی وجہ تسمیہ

(جناب رضی الدین صاحب میرٹھ)

حضرت مولانا مدیر مجلۂ نگار۔ براہ کرم مطلع فرمائیے کہ قمری مہینوں کے یہ نام کب سے رائج ہیں، اور ان کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟

(نگار) قمری مہینوں کے نام جو ہندوستان میں رائج ہیں، وہی ہیں جو اہل عرب میں پائے جاتے ہیں، لیکن یہ نام بہت بعد کے رکھے ہوئے ہیں، نہایت قدیم زمانۂ جاہلیت میں بارہ مہینوں کے نام یہ تھے: موتمر، ناجر، خوان، صوان، زبار، بائد، اصم، واغل، باطل، عادل،

ان کے ہاں سال بارہ مہینہ کا اور ۳۵۴ دن کا ہوتا تھا، یعنی قمری اور شمسی سال کے درمیان گیارہ دن کا فرق تھا، اسکا نتیجہ

یہ تھا کہ کبھی کوئی مہینہ جاڑوں میں پڑتا تھا تو کبھی گرمی میں۔

جب بعد کو ہر تیسرے سال لوند کا ایک مہینہ بڑھایا جانے لگا تو اس وقت گرمی، سردی زمانۂ بارش وکاشت وغیرہ کے لحاظ سے مہینوں کے موجودہ نام رکھے گئے۔ جن کی وجہ تسمیہ یہ ہے:۔

محرم۔ چونکہ اس مہینہ میں جنگ وقتال حرام تھا۔ (خواہ کسی مذہبی نقطۂ نظر سے یا کثرت بارش وغیرہ کے لحاظ سے) اسلئے اس مہینہ کا نام محرم قرار پایا۔

صفر۔ مشتق ہے صِفر سے، جس کے معنی ہیں خالی ہوجانے کے۔ چونکہ محرم کے بعد اس مہینہ میں جنگ کے لئے شہر کو خالی کردیتے تھے اس لئے اسکا نام صفر ہوا۔

ربیع الاول، ربیع الآخر:۔ چونکہ یہ دونوں مہینے فصل ربیع کے ہیں اس لئے وجہ تسمیہ ظاہر ہے۔

جمادی الاولیٰ، جمادی الثانیہ:۔ یہ مشتق ہے جماد سے، چونکہ ان دونوں مہینوں میں بارش کے بند ہوجانے سے زمین کی خشکی بڑھ جاتی تھی اس لئے یہ نام پڑ گیا۔ عربوں میں یہ لفظ اس معنی میں بولا جاتا ہے مثلاً السماء جمادی یعنی بارش بند ہے۔

رجب۔ رجب کے معنی ہیں عظمت کرنا، چونکہ اس مہینہ میں بھی جنگ ممنوع تھی اور اس کا احترام کیا جاتا تھا اس لئے اسکو رجب کہنے لگے۔

شعبان:۔ شعب سے مشتق ہے، جسکے معنے متفرق ہوجانے کے ہیں چونکہ اس مہینہ میں پانی کی تلاش میں لوگ باہر پھیل جاتے تھے اس لئے اس کو شعبان کہنے لگے۔

رمضان:۔ اس کی اصل رمض ہے، رمض شدت حرارت کو کہتے ہیں اور گرسنگی کے لئے بھی اس سے استعارہ کیا جاتا ہے چنانچہ اہل عرب کہتے ہیں رمضت الصائم یعنی اس کی گرسنگی بہت بڑھ گئی۔

شوال:۔ مشتق ہے شول سے، جب اونٹنی دودھ کم دینے لگتی ہے تو اہل عرب کہتے ہیں شول لبن الناقہ یعنی اونٹنی کا دودھ کم رہ گیا یا سوکھ گیا۔ چونکہ اس مہینہ میں چشمے پانی کے سوکھ جاتے تھے اس لئے اسکا نام یہ رکھ لیا گیا۔

ذوالقعدہ۔ چونکہ اہل عرب اس مہینہ کو معزز سمجھ کر جنگ سے باز آکر گھر میں بیٹھ جاتے تھے (قعود کرلیتے تھے) اسلئے اس کا نام ذوالقعدہ قرار پایا۔

ذوالحجہ:۔ اس مہینے میں بیت الحرام کا حج کرتے تھے، اس لئے ذوالحجہ کہنے لگے۔

انگریزی اصطلاحات تصوف کا ترجمہ

(جناب شاہ محمد عالم صاحب ایم۔ اے پشاور)

میں اک زمانہ سے تصوف کا مطالعہ کررہا ہوں اور قریب قریب تمام وہ کتابیں، جو انگریزی میں اس موضوع پر لکھی

گئی ہیں اور میرے پیش نظر ہیں۔ لیکن اسکی بہت سی اصطلاحیں ایسی ہیں، جنکا ترجمہ میری سمجھ میں نہیں آیا اور اُردو میں انکا بیان کرنا میرے لئے از بس دشوار ہے۔ کیا آپ براہ کرم بتا سکتے ہیں کہ میری یہ دشواری کیونکر دور ہو سکتی ہے اور کیا کوئی ایسی کتاب موجود ہے جس میں اُردو یا عربی کے اصطلاحات تصوف کے ساتھ انگریزی الفاظ بھی درج ہوں۔ فی الحال مجھے جن الفاظ کے ترجمہ کی اشد ضرورت ہے ذیل میں درج ہیں اور کہیں کہیں میں نے وہ ترجمہ بھی لکھ دیا ہے جو میری سمجھ میں آیا (اس کے بعد فہرست الفاظ ہے)

(نگار) آپ نے ایک ایسے موضوع کا ذکر کیا، جو میرے پیش نظر بھی تھا۔ میری نگاہ میں اسوقت کوئی کتاب ایسی نہیں ہے، جو آپ کے لئے باعث تسکین ہو۔ جہانتک مجھے معلوم ہے کوئی تصنیف اصطلاحات تصوف کے متعلق ایسی شایع نہیں ہوئی جو آپکے مقصد کو پورا کر سکے۔ میں نے سنا ہے کہ ذوقی شاہ صاحب (آگرہ) کوئی کتاب اس موضوع پر لکھ رہے ہیں آپ ان سے مراسلت کر سکتے ہیں۔ اب میں اپنی سمجھ کے مطابق آپ کے تحریر کئے ہوئے الفاظ کا ترجمہ درج کرتا ہوں۔

۱۔ Innovation = اسکا ترجمہ آپ نے احداث و ایجاد بلحاظ معنے کے ٹھیک کیا ہے، لیکن فقہ و تصوف کے لحاظ سے بدعت اسکا مناسب ترجمہ ہے۔

۲۔ Missionary = اس کے لئے بہترین لفظ داعی ہے۔

۳ Revelation = کشف۔

۴ Scholasticism = علم کلام۔

۵ Primal matter = ہیولے۔

۶۔ Pre-Existent = سابق Subsequent لاحق

۷۔ Imprecation = اس کا ترجمہ آپ نے بددعا، لعنت ٹھیک کیا ہے۔ لیکن مباہلہ بہتر ہے۔

۸۔ Attributes = صفات Annihilation = فنا اس کا مقابل لفظ بقا ہے جسے انگریزی میں Subsistence کہتے ہیں۔

۹ Real Certainty کا ترجمہ حق الیقین Visual certainty کا عین الیقین اور Scientific Certainty کا علم الیقین، بالکل صحیح ہے۔

۱۰۔ Secular Sciences = حکمیات اس کا بہترین ترجمہ ہے۔ ہرچند آپ کا ترجمہ بھی غلط نہیں

۱۱ Anthropomorphism = اس کے لئے اصطلاحی لفظ تجسیم ہے۔

۱۲ Mystical Illumination = صرف تجلی کافی ہے۔ علیحدہ علیحدہ ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں۔

۱۲۔ Reprobate اور Hypocrite میں وہی فرق ہے جو فاسق و منافق میں۔
۱۴۔ Wounding & authentication = اصول نقد کی اصطلاح ہے۔ جسے جرح و تعدیل کہتے ہیں۔
۱۵۔ Cognition = اسکا ترجمہ آپ نے معرفت ٹھیک کیا ہے۔
۱۶۔ Incarnation = اسکا ترجمہ تجسّم درست نہیں۔ حلول کیجئے۔
۱۷۔ Theocratic Separatists = اس سے مراد خوارج ہیں جنہیں Seceders بھی کہتے ہیں۔
۱۸۔ Omnipotence = قدرت مطلق برا ترجمہ نہیں، لیکن بہترین لفظ قاہریت ہے۔
۱۹۔ Fundamental texts = سکا ترجمہ روایات اصولی ٹھیک نہیں صرف نصوص کافی ہے۔
۲۰۔ Jurists = قانون ساز یا قانون داں کے بجائے فقیہہ مناسب ہے۔
۲۱۔ Allegorical Interpretation = صرف تاویل اس کیلئے کافی ہے۔
۲۲۔ Cormania Loricaria = اس اصطلاح کا تعلق فن اصول حدیث سے ہے اور لفظ درایات پوری طرح اس کے مفہوم کو ادا کرتا ہے۔
۲۳۔ Extremists = عربی میں انہیں غلات کہتے ہیں جو جمع ہے غالی کی۔
۲۴۔ Emanation = صدور اس کے لئے بہترین لفظ ہے۔
۲۵۔ appointed destiny = مقدر سے بہتر لفظ قضائے مبرم ہے۔
۲۶۔ Divine ordinance = اس کا ترجمہ امر الٰہی صحیح ہے لیکن اصطلاحی لفظ اس کے لئے نص قطعی ہے۔
۲۷۔ Metempsychosis یقیناً اسکا ترجمہ تناسخ ہے۔
۲۸۔ Individuality = اصطلاح تصوف میں اسے ہُویّت کہتے ہیں۔
۲۹۔ Quidditas = اسکا ترجمہ ماہیّت کیجئے۔
۳۰۔ Mystical love = میری رائے میں صرف لفظ وجد کافی ہے۔
۳۱۔ Neoplatonic mysticism = حکمت الاشراق جس کے لئے انگریزی میں ایک اور اصطلاح Philosophy of Illumination بھی مستعمل ہوتی ہے۔
۳۲۔ Adept = اس کا ترجمہ ماہر و محقق نہ کیجئے۔ عارف مناسب ہے۔ جیسے

انگریزی میں Gnostic بھی کہتے ہیں۔

۳۳۔ Relationships = اعتبارات بہترین لفظ ہے۔

۳۴۔ Hylomorphism = اس کا ترجمہ حلول ہے اور دوسرا مترادف لفظ انگریزی میں Incarnation ہے۔

۳۵۔ Heretic = اسکا ترجمہ ملحد بھی غلط نہیں، لیکن زندیق زیادہ مناسب ہے۔

۳۶۔ Divine Unity = توحید خداوندی کی ضرورت نہیں توحید کافی ہے۔

۳۷۔ Divinity = وحدانیت نہیں، الوہیت کہئے۔

۳۸۔ Document = دستاویز قانونی لفظ ہے۔ مذہبی و تصوفی اصطلاح صحیفہ ہے۔

۳۹۔ Logical Soul = روح منطقی، درست ناطقہ کہئے۔

۴۰۔ Inspiration = اس کا ترجمہ وحی آپ نے درست کیا ہے اس کے پہلے الفاظ minor اور major بڑھا دینے سے صحیح طور پر وحی و الہام کے معنے پیدا ہو سکتے ہیں۔

۴۱۔ Virtues کا ترجمہ فضائل کیجئے اور Privileges کا خصائص۔

۴۲۔ Precedent: بیشک سابق اور متقدم کو کہتے ہیں، لیکن اصطلاح فقہا میں اسے اثر کہتے ہیں۔

۴۳۔ Fundamental duty = فرض حقیقی اچھا نہیں۔ رکن کافی ہے۔

۴۴۔ Legal Provisions = احکام شریعت آپ نے صحیح ترجمہ کیا ہے۔

۴۵۔ Authorities آپ نے جس موقع کے لئے اس لفظ کو لکھا ہے اس کے لئے بجائے اسناد کے رجال زیادہ اچھا ہے۔ جو فن حدیث کی مشہور اصطلاح ہے، اسی کو Documents بھی کہتے ہیں۔

۴۶۔ Circumambulation: اسکا ترجمہ آپ نے طواف کیا ہے جو بالکل صحیح ہے۔

۴۷۔ Motive of Law = وجہ قانونی درست نہیں، علت الشرع کہئے۔

۴۸۔ Analogy = اسکا ترجمہ مماثلت غلط ہے، اصطلاحی لفظ قیاس ہے۔

۴۹۔ Sovereign Will = مشیت ایزدی یا صرف مشیت کافی ہے۔

۵۰۔ Simple Things = بسائط۔ جمع ہے بسیطہ کی۔

۵۱۔ Intellectual Knowledge = علم ذہنی کے بجائے علم عقلی کیجئے۔

۵۲۔ Subjecting = بہترین لفظ تسخیر ہے۔

۵۳۔ Literalists = علمائے ظاہر جنہیں Extremists بھی کہتے ہیں۔

۵۴۔ Pure good = خالص نیکی سے اچھا خیر محض ہے۔

۵۵ Universal reason = عقل کلی کو کہتے ہیں (۵۶) Universal Soul = اس کو نفس کلی ہے۔

۵۷۔ Space & Time = مکان و زمان صحیح ہے۔ اسی کو خلاء و ملا بھی کہتے ہیں۔

۵۸ Proof = ثبوت نہیں، حجت کہئے۔ (۵۹) Retirement = خلوت کافی ہے۔

۶۰۔ Absolute Agent = فعالِ مطلق (۶۱) Essence = ذات، حقیقت۔

۶۲ Assertion = خبر اور Unanimous Assertion = خبر متواتر۔

۶۳۔ Esoteric Sect = باطنی فرقہ ٹھیک ترجمہ (۶۴) Doctrinaire = تعلیمی فرقہ۔

۶۵۔ Ascetic = اسکا ترجمہ زاہد و عابد غلط نہیں، لیکن اسکا صحیح مفہوم وہی ہے جو لفظ یوگی یا جوگی (ہندوؤں کے تصوف کا اصطلاحی لفظ) سے ظاہر ہوتا ہے۔

۶۶۔ Entelechy ۔ کمال سے اسکا پورا مفہوم ادا ہو جاتا ہے۔

۶۷ Deductive = استدلالی، بہتر ہے۔

۶۸۔ Decision = فیصلہ معنی کے لحاظ سے غلط نہیں، لیکن جس سلسلہ میں آپ نے اس کا ذکر کیا ہے، اس کے لئے لفظ فتوی استعمال کیجئے۔

۶۹۔ Discourse = درس یا تقریر مناسب نہیں ہے، مقالہ زیادہ فصیح ہے۔

۷۰۔ Anthropomorphists = اس سے قبل میں نے Anthropomorphism کا ترجمہ تجسیم بتایا ہے، اس لئے بہ قاعدہ اسکا ترجمہ مجسمین ہونا چاہئے، مگر اصطلاح میں اس طبقہ کے لوگوں کو مشبہین کہتے ہیں۔

۷۱۔ World of Sense = دنیائے حواس، عالم آب و گل مفہوم کے لحاظ سے غلط نہیں، لیکن اصطلاحی لفظ عالم الشہادۃ ہے۔

۷۲۔ World of Power = اصطلاحی لفظ عالم قدرت ہے۔

۷۳۔ World of Ruling = اسکا ترجمہ عالم ملکوت کیجئے۔

۷۴ World of Repairing = عالم جبروت کو کہتے ہیں۔

۷۵۔ Universal Spirit = اسکا اصطلاحی ترجمہ روح اول ہے۔

۷۶ Nearer Heaven = اس سے مراد سماء الدنیا ہے۔

۷۷ Principles = اصول آپ نے صحیح ترجمہ کیا ہے۔ (۷۸) Applications اسکا ترجمہ فروع کیجئے۔

۷۹ Pilgrim = اس کا ترجمہ اختلاف محل کے لحاظ سے حاجی یا زائر ہو سکتا ہے، لیکن تصو

کی کتابوں میں یہ لفظ سالک کے معنے میں استعمال ہوتا ہے۔

۸۔ Ranagade کا ترجمہ آپ نے مرتد نفیاب کیا ہے لیکن Sooth Sayer کا ترجمہ کاہن کیجئے۔

معلومات

حرکت زمین کا مشاہدۂ عینی

تقریباً ایک ربع صدی سے زائد زمانہ ہوا، جب فرانس کے ایک حکیم نے اپنے تجربہ سے حرکت زمین کے مسئلہ کو مشاہدات عینی میں داخل کر دیا تھا اور اب امریکہ کے ایک فیلسوف لیونارڈ بیسٹن نے ایک دوسری ترکیب سے جو بہت زیادہ آسان ہے گردش ارض کو برائے العین ثابت کر کے دکھا دیا۔

ہم یہاں دونوں کے تجربات نہایت صاف و واضح الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ تاکہ ہر شخص ان پر عمل کر کے اپنی آنکھوں سے اس گیتی کے چکر کو دیکھ سکے۔ لیکن فرانسیسی حکیم لیول لیون کا تجربہ سمجھنے سے پہلے مسئلہ حرکت کے ایک خاص نکتہ کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ اس لئے ہم پہلے اس کو بتا دینا چاہتے ہیں۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ گھڑی (کلاک) میں ایک لنگر ہر وقت ادھر سے اُدھر جنبش کھایا کرتا ہے، جسے انگریزی میں پنڈولم (Pendulum) کہتے ہیں۔ اس کو یا ہر ایسی وزنی چیز کو جو کسی تار یا دھاگہ میں باندھ کر لٹکا دی جائے عربی میں رقاص کہتے ہیں اور جس خط یا سطح پر وہ جنبش کرتا رہتا ہے اس کا نام سطح ترقص یا سطح اہتزاز ہے۔ یہ مسلمہ مسئلہ ہے کہ ایک رقاص کی سطح ترقص کبھی نہیں بدلتی، یعنی جس سمت میں وہ جھول رہا ہے، ہمیشہ ایک ہی ہوگی۔ مثلاً ایک رقاص کی ترقص کسی دیوار کے متوازی ہے، تو وہ ایسی ہی رہیگی۔ اگر تم رقاص کو دائرہ کی صورت میں گردش دوگے، تو بھی وہ تھوڑی دیر کے بعد دیوار کے متوازی ہو کر جھولنے لگے گا۔

اب غور کیجئے کہ اس مسئلہ کو پیش نظر رکھکر فرانسیسی حکیم نے کیونکر حرکت زمین کا مشاہدہ کر لیا۔ وہ کہتا ہے کہ "سیسے یا لوہے کی ایک وزنی گولی لیکر فولاد کے تار میں لٹکا دو اور اس تار کو چھت میں کسی کڑے سے لٹکا کر جھٹکا دو، تاکہ وہ آزادی سے ادھر اُدھر جھولنے لگے۔ اس رقاص کے نیچے ایک میز رکھو اور اس پر ایک دائرہ کھریا یا مٹی یا کوئلہ سے بناؤ اسکے محیط پر صفر اور ۱۸۰ درجہ کے درمیان خط ملا دو۔ جب یہ کر چکو تو دائرہ پر ریت بچھا دو اور سیسے کی گولی میں ایک سوئی یا درجہ نما لگا دو تاکہ جھولنے کے وقت جب رقاص اس دائرہ پر سے ہو کر گزرے تو سوئی ایک باریک خط بناتی چلی جائے۔ ایک گھنٹہ کے بعد تمکو معلوم ہوگا کہ گولی کی سمت حرکت بدل لی اور ریت پر ایک زاویہ بنانے لگی، لیکن چونکہ یہ مسلم ہے کہ گولی اپنی سطح ترقص نہیں بدل سکتی، اسلئے ظاہر ہے کہ میز نے گردش کی اور میز کی یہ گردش، گردش زمین کیوجہ سے وقوع میں آئی۔ جہاں یہ تجربہ ہو رہا تھا، وہاں پروفیسر ڈیوار نے نہایت تیز برقی روشنی کر دی تھی جس سے رقاص کی سمت حرکت میں خفیف سی تبدیلی بھی نظر آتی تھی اور ایک ایک منٹ میں یہ معلوم ہونے لگا کہ سارا کرہ حرکت کر رہا ہے۔ خط استوا پر جو مقامات ہیں، وہاں یہ اثر نمایاں نہیں ہو سکتا، البتہ جہاں کا عرض البلد ۲۰ درجہ ہے (جیسے ملتان، ڈیرہ دون وغیرہ) وہاں یہ سوئی ۱۲ گھنٹہ میں

نصف دائرہ ختم کرلے گی اور قطبین پر پورا دائرہ۔

دوسرا تجربہ لیونارڈ ہیسٹن کا ہے، جو اس سے زیادہ آسان ہے۔ کسی کمرہ میں جہاں دھمک کا اثر نہ پہونچے، اور آبادی سے ذرا علحدہ ہو ایک بڑا گہرا پیالہ یا ٹب، جسکا قطر کم از کم ایک فٹ کا ہو، فرش پر رکھکر قریب قریب پانی سے بھر دو اور چند گھنٹوں کے لئے اسے اپنے حال پر چھوڑ دو۔ اس کے بعد نہایت باریک پسی ہوئی رال پانی پر آہستگی سے اسطرح چھڑک دو کہ پانی کی سطح پر اسکی ایک تہ جگر تیرنے لگے۔ پھر باریک پسا ہوا کوئلہ لیکر پیالہ کے مرکز سے محیط تک اسطرح چھڑکو کہ ایک خط مستقیم بنجائے اور اسی سلسلہ میں پیالہ کے کنارہ پر بھی ایک نمایاں خط کوئلہ کے سفوف سے بنادو۔ چند گھنٹے کے بعد تم دیکھوگے کہ پانی کی سطح پر جو لکیر کوئلہ کی تھی اسنے اپنی جگہ بدل دی ہے، یعنی اس پیالہ لکیر سے علحدہ ہوگئی ہے، جو پیالہ کے کنارہ پر اسی کے سلسلہ میں بنائی گئی تھی، اسکا سبب یہ ہوا کہ پیالہ کے اندر کا پانی تو اپنے حال پر قایم رہا اور پیالہ نے مغرب سے مشرق کی طرف زمین کے ساتھ پوری گردش کرلی اور اسطرح اسکے کنارہ کی لکیر پانی کی لکیر سے علحدہ ہوگئی۔

ہوائے منضغط | Compressed air

آجکل ترقی کا اصل راز یہ ہے کہ انسانی قوت کو بڑھایا جائے اور کم سے کم زمانہ میں ایک کام کو انجام دیکر وقت کو وسیع کیا جائے، یعنی اگر ایک انسان صرف اپنے اعضا سے کام لیکر کسی کام کو ایک دن میں کر سکتا ہے، تو اس کے لئے دیگر عارضی قوتیں ایسی فراہم کی جائیں کہ وہ دس آدمی کا کام تنہا کر سکیں اور بجائے ایک دن کے ایک گھنٹہ یا اس سے بھی کم وقت میں۔ اور یہی وہ مقصد ہے جس نے سائنس کی دنیا میں ہلچل مچا رکھی ہے اور ہر وقت یہی فکر پیش نظر ہے کہ وقت کی تنگی کو کیونکر وسیع اور انسانی قوت کو کیونکر عظیم بنایا جائے اور اسکے ساتھ زمین کی ماناپوں کو کیونکر کھینچکر آن واحد میں تمام عالم امکان اور زمان و مکان کو ایک مٹھی میں کر لیا جائے۔

ریل، تار، جہاز، طیارے، لاسلکی اور خدا جانے کیا کیا سب اسی مدعا کو پورا کرنے کی غرض سے رات دن کام کر رہے ہیں اور انسان باوجود اس کے کہ اسنے تمام عناصر کو اپنے قبضہ میں کر لیا ہے، ابھی تک مطمئن نہیں ہے۔ ہوا سے جسقدر کام دنیائے حکمت میں لئے جاتے ہیں، وہ کثیر اور عجیب و غریب ہیں اور انہیں میں سے ایک وہ ہے جو ہوائے منضغط سے لیا جاتا ہے۔

ہوائے منضغط ترجمہ ہے (Compressed air) کا اس سے مقصود وہ ہوا ہے جو قوت سے کام لے کر کسی ظرف میں بھر دی جائے۔ فٹ بال، سائیکل اور موٹر کے ٹائر میں یہی دبی ہوئی ہوا ہوتی ہے اس ہوا کا ایک کام تو یہی ہے جو ابھی ظاہر کیا گیا کہ وہ ربر کی کھوکھلی بنی ہوئی چیزوں کو انکا لوچ قایم رکھتے ہوئے سخت کر دیتی ہے (جیسے فٹ بال اور موٹر ٹائر وغیرہ) اور دوسرا کام یہ ہے کہ وہ ایک خادم کی طرح آپ کی چیزوں کو ادھر سے ادھر لے جا سکتی ہے، ہرکاروں کیطرح ڈاک کی تھیلوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر دیتی ہے، اور ایک خاکروب کی طرح آپ کے کمروں، میزوں اور کرسیوں کو بھی جھاڑ دیتی ہے، امریکہ کے تمام بڑے بڑے شہروں میں کوئی اہم کارخانہ، ہوٹل، دفتر اخبار، ذخیرہ، اور ڈاک خانہ ایسا نہیں ہے، جہاں ہوا ایک ادنیٰ خادم کی طرح نہ دوڑ رہی ہو۔

اگر نیویارک کے کسی بڑے ہوٹل میں جاکر قیام کروگے، تو دیکھوگے کہ ہر کمرہ کے اندر دیوار کے گوشہ میں یا فرش پر تمہاری میز کے

قریب یک سوراخ ہے جسپر ایک ڈھکنا ڈھکا ہوا ہے اور عین اسی وقت جبکہ تم اپنی میز پر بیٹھے ہوئے ڈاک کا انتظار کر رہے ہوگے، وہ ڈھکنا دفعتہً کھلے گا اور تمہاری ڈاک تمہارے سپرد کرکے پھر فوراً بند ہو جائے گا۔ تمکو بظاہر حیرت ہوگی، لیکن حیرت کی کوئی بات نہیں کیونکہ یہ سوراخ ایک نلکی کا ہے جس کے اندر سے ہوکر دبی ہوئی ہوا تمہاری ڈاک کو اڑا لاتی ہے۔

اگر تم نے کسی شہر میں ٹیلی فون کا دفتر ایکسچینج دیکھا ہے، تو تمکو معلوم ہوگا کہ کیونکر اسی ایک جگہ سے تمام شہر کے مقامات کا باہم تعلق ہو جاتا ہے، اور کس طرح مشرقی حصہ کا رہنے والا مغربی حصہ کے آدمی سے گفتگو کر لیتا ہے، بالکل اسی طرح ہر بڑے ہوٹل میں ایک مرکزی مقام ہوتا ہے جہاں سے یہ تمام نلکیاں پھیلائی جاتی ہیں، اور وہیں سے ان کے اندر ہوا پر وزن ڈالا جاتا ہے تاکہ وہ دبکر اس چیز کو نلکی کے دوسرے سرے تک پہونچا دے، جو اس کے اندر ڈالی گئی ہے۔

پھر ان نلکیوں سے صرف ڈاک ہی نہیں پہونچائی جاتی، بلکہ ملاقاتی کارڈ، رسیدات، چھوٹے چھوٹے بنڈل، ہنڈ پیپر، پیسہ وغیرہ بھی پہونچائے جاتے ہیں۔

فرض کیجئے آپ سے سیر و تفریح کے بعد ہوٹل میں آئے اور وہاں ہوٹل ہی کی کسی دوکان میں آپ نے ایک نوٹ دیکر کسی چیز کا آرڈر دیا کہ فلاں کمرہ میں پہونچا دی جائے، تو آپ کے وہاں پہونچنے سے قبل آپ کے حکم کی تعمیل ہو چکی ہوگی، یعنی جسوقت آپ اپنی منزل میں پہونچیں گے، تو دیکھیں گے کہ آپکی خریدی ہوئی چیز معہ رسید اور باقی رقم کے ایک بنڈل میں لپٹی ہوئی پڑی ہے اور یہ سب کچھ اسی ہوا کے ذریعہ سے عمل میں آیا ہے، چونکہ وہاں کے بعض ہوٹل بیدرہ منزل کے ہوتے ہیں، اس لئے اگر وہاں ان نلکیوں سے کام نہ لیا جائے تو ظاہر ہے کہ بہت سے آدمی ملازم رکھنے پڑیں گے، اور پھر بھی کام اسقدر جلد نہ ہوگا۔

اسی طرح اخباروں کے دفاتر میں بھی تمام کمروں کے اندر اسی ہوا سے کام لیا جاتا ہے، جنرل منیجر جو اخبار کے تمام شعبوں کا نگراں ہے، اسی ہوا کے ذریعہ سے ہر شعبہ کے منتظم کے پاس ہدایات و کاغذات بھیجا رہتا ہے، اگر وہ آدمیوں کے ذریعہ سے اطلاعات روانہ کرے تو بہت دیر ہو جائے اور اکثر صورتوں میں اہم ترین خبریں اور اشتہارات وقت پر شائع نہو سکیں۔

بڑے بڑے شہروں میں جہاں سے متعدد اخبار شائع ہوتے ہیں، ایک ایسوشی ایٹڈ پریس بھی قایم ہوتا ہے، جو تمام انجمن سوسائٹی کے اخباروں کو بہم پہونچاتا ہے، پھر چونکہ اسکا کام نہایت اہم ہے اور بعض اوقات نہایت طویل حالات و واقعات تمام اخباروں کو ایک ہی وقت میں پہونچانے پڑتے ہیں، اس لئے وہاں بھی اسی ہوا سے کام لیکر آن واحد میں تمام کاغذات ہر جگہ پہونچائے جاتے ہیں۔

امریکہ کے بڑے بڑے شہروں میں ڈاک خانے بھی اسی ہوا سے کام لیتے ہیں۔ جسوقت مرکزی ڈاک خانہ چھوٹے چھوٹے ماتحت ڈاک خانوں کو ان کی متعلقہ ڈاک خانوں کو انکی متعلقہ ڈاک تقسیم کرتا ہے تو اسی ہوا کے ذریعہ سے۔ پھر ان ہوا کی نالیوں سے صرف خطوط ہی نہیں روانہ کئے جاتے، بلکہ کئی کئی سیر کے وزنی بنڈل بھی بھیجے جاتے ہیں اور وہ اسی سرعت کے ساتھ پہونچتے ہیں، جس طرح اور معمولی خطوط۔

علاوہ اس کے ہوا سے جھاڑ دینے کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ ہوٹلوں کارخانوں بڑے بڑے مکانوں کی صفائی بالعموم اسی طرح ہوتی ہے، ہوا کی نالی کا منہ کھول دیا جاتا ہے جس سے نہایت تیز ہوا نکلکر فرش، قالین، میز، کرسی وغیرہ سبکو صاف کر دیتی ہے، یہانتک کہ خاک کا ایک ذرہ بھی باقی نہیں رہتا۔

امریکہ میں جب ریل کسی سفر سے واپس آتی ہے، تو ایک خاص عمارت کے اندر کھڑی کی جاتی ہے اور وہاں گاڑیوں کے تختے، گدّے وغیرہ سب اسی ہوائے منضغط کے ذریعہ سے صاف کئے جاتے ہیں۔

حالات زیر زمین معلوم کرنے کے طریقے وہ دن انسان کے لئے نہایت مبارک ہوگا جس روز کہ وہ آلات کے ذریعہ سے حالات تحت الارض معلوم کر سکے گا۔ زمین کے نیچے ہزار ہا چشمے اور کانیں ہیں لیکن ہمیں ان کی خبر نہیں ہے، جب وہ اس قابل ہو جائے گا کہ ان مدفونہ خزانوں کو معلوم کر کے نکال سکے تو اسکی دولت، ثروت، صنعت و حرفت کو جو کچھ ترقی ہوگی اس کا ہم اس وقت اندازہ نہیں کر سکتے۔

قدیم زمانے سے اس وقت تک ایک ایسی جماعت چلی آتی ہے جس کا دعویٰ ہے کہ وہ ایک خاص قسم کی لکڑی سے طبقات زمین کی حالت معلوم کر سکتی ہے۔ قدیم اور جدید کتابوں میں اس جماعت کا ذکر آیا ہے، لیکن ان کے دعویٰ کی صحت میں ہمیشہ اختلاف رہا ہے۔

اس لکڑی کے ذریعہ سے زمین کی اندرونی حالت اس طرح معلوم کی جاتی ہے کہ لوگ لکڑی کو لے کر چلتے ہیں جس جگہ زمین کے نیچے کوئی کان ہوتی ہے یہ لکڑی ٹیڑھی ہو کر ہلنے لگتی ہے اور اس سے معلوم کر لیا جاتا ہے کہ یہاں کوئی معدن ہے۔ امریکہ، فرانس اور انگلستان میں ایک بڑی جماعت اس طریقہ کی صحت کی قائل ہے لیکن ایک یہ جس چیز حرکت کیوں کرنے لگتی ہے اس میں ان کی توجیہات مختلف ہیں، گذشتہ صدی کے نصف میں انگلستان کی "جمعیت مباحثہ نفسیہ" نے اس مسئلہ کی طرف توجہ کی اور جمعیت مذکور کے ایک ممبر نے تحقیقات کا سلسلہ شروع کیا اور اس نے اس کے متعلق مختلف خیالات ظاہر کئے۔ پہلے وہ کہتا تھا کہ بعض لوگوں کو یہ ملکہ ہو جاتا ہے کہ زمین کی ظاہری حالت دیکھ کر اندرونی کیفیت معلوم کر لیتے ہیں اسکا مدار محض مٹی کے خواص اور پتھروں کی خصوصیات پر ہے لکڑی وغیرہ کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اس کے اس نے کہا کہ یہ محض اتفاقی امر ہے کبھی اتفاق سے انسان صحیح نتیجہ پر پہونچ جاتا ہے اسمیں لکڑی اور اس کے الہام کا کوئی اثر نہیں ہے۔ لیکن عام لوگ چونکہ کسی کاہن یا شعبدہ باز کی غلطیاں یاد نہیں رکھتے بلکہ محض وہ واقعات انکے ذہن میں رہ جاتے ہیں جو اتفاقاً کاہن کے بیان سے مطابقت رکھتے ہیں اس لئے وہ اس قسم کے غیبی الہام کے قائل ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد ممبر مذکور نے یہ رائے بھی چھوڑ دی اور کہا کہ قدرت نے بعض لوگوں کو ایک ایسا ملکہ عطا کیا ہے جسکی وجہ سے وہ زمین کے نیچے کی حالت بتا دیتے ہیں۔ جب وہ کسی زمین پر کھڑے ہو کر اس کے کانوں یا چشموں کی خبر دیتے ہیں تو اس احساس کے ہوتے ہی ان کے دماغ میں ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے جسکی وجہ سے نظام عصبی میں ایک نہایت ہی خفیف تشنج پیدا ہوتا ہے اور یہی تشنج لکڑی کے حرکت کرنے کا سبب ہے۔ لیکن عام طور سے اس الہام کے مدعی جھوٹے ہوتے ہیں جو اس طریقہ سے

لوگوں سے روپیہ حاصل کرتے ہیں۔

بعض کا خیال ہے کہ لوگوں کے اعضا میں ایک خاص قسم کی قوت ہوتی ہے اور وہ اس رطوبت سے متاثر ہو جاتی ہے جو معادن سے اٹھا کرتی ہے (کیونکہ معادن میں ہر وقت ایک خفیف سی انحلالی کیفیت جاری رہتی ہے اور اس کے دقایق ہوا میں پھیلتے رہتے ہیں) اور یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ بعض خاص مزاج والے خصوصاً وہ لوگ جو روماٹزم میں مبتلا ہوں رطوبت سے بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں، جو شخص چشمہ یا معدن کا پتہ بتا دیتا ہے وہ ان لوگوں کے نزدیک اسی ذیل میں داخل ہے، جب رطوبت سے اسکا جسم متاثر ہوتا ہے تو لکڑی میں (جو اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے) حرکت پیدا ہونے لگتی جسکا سبب تاثر داخلی ہے وجدانی کیفیت نہیں۔

ایک فریق کہتا ہے کہ انسان میں ایک مرئی قوت نفسی ہے جس سے آدمی ایسی چیزیں دیکھ سکتا ہے جو آنکھوں سے نظر نہیں آتیں، کوئی جامد اور تاریک چیز اس کے عمل کو نہیں روک سکتی اس قوت کا اصطلاحی نام (Clairvoyance) ہے یہ ایک ایسی نفسی قوت ہے جسکی حقیقت مجہول ہے۔ جب انسان اپنے مطلوب کو دیکھتا ہے تو اس قوت کی بنا پر اس کے عضلات میں ایک خاص تموج پیدا ہوتا ہے اور وہی حرکتِ عصا کا سبب ہے بعض لوگ بغیر عصا کے بھی معادن اور چشموں کا پتہ بتا دیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ہمیں ایسے موقع پر ایک عجیب احساس ہوتا ہے جو طبیعت کی گھبراہٹ اور تکان سے زیادہ مشابہ ہے۔ ایسا بھی واقع ہوا ہے کہ زمین کے خفیہ تہ خانوں اور گھر میں پوشیدہ رکھی ہوئی چیزوں کا بھی پتہ بعض لوگوں نے بتا دیا۔ چنانچہ ایک ناقابل اعتماد عالم نے خود اسکا تجربہ کیا، ایک شخص کے ذریعہ سے کوئی چیز کہیں پوشیدہ طریقہ پر رکھدی اور پھر اس شخص کو بھی علیحدہ کر دیا اور کاہن سے پوچھا پھر بھی اس نے صحیح جواب دیا۔ یہ امر زیادہ تعجب خیز ہے کیونکہ اگر چھپانے والا اس کے سامنے ہوتا تو کہہ سکتے تھے کہ شاید "انتقال افکار" کی بنا پر اس نے پتہ لگا لیا ہے۔

ایک جدید اختراع پچھلے زمانہ میں اس قسم کے اکتشافاتِ غیبی کے لئے متعدد آلات ایجاد کئے گئے لیکن تجربہ نے ثابت کر دیا کہ یہ آلات صرف لوگوں کو دھوکا دینے کے بنائے گئے ہیں۔

موجودہ زمانہ میں دو جرمنی مخترعین نے دو آلات ایجاد کئے ہیں اور ہر ایک کا خیال ہے کہ اس سے غرض پوری طرح حاصل ہو سکتی ہے۔ پہلی اختراع ایک جرمن انجینیر کی ہے جس کا نام جیبر وڈ ٹکا ہے آلہ میں ایک ٹرا برتن ہوتا ہے جس میں الکحول کی قسم کا ایک مادۂ سائلہ بھرا رہتا ہے اور اسمیں ایک سوئی ڈوبی رہتی ہے جو نہایت درجہ حساس ہوتی ہے۔ زیرزمین جو معدنی مواد موجود ہیں ان کے بخارات سے یہ سوئی متاثر ہوتی رہتی ہے اور جس قدر اسکا تاثر زیادہ ہوتا ہے اسی قدر مادہ زیادہ ہوتا ہے، سوئی کی حرکت بغور دیکھنے سے پوشیدہ معادن کا (اس کے خیال میں) پتہ لگ جاتا ہے۔

دوسری اختراع کا ذکر رسالہ "سائینٹفک امریکن" نے کیا ہے اگرچہ ہمیں اس آلہ کی صحت کا بھی پورا یقین نہیں ہے مگر چونکہ رسالہ مذکور ایک معتبر پرچہ ہے اس لئے ہم اس آلہ کا ذکر ذرا تفصیل سے کرتے ہیں۔

ایک سال کا عرصہ ہوا کہ مسٹر ہولز نے جو نیویارک کا رہنے والا ہے یہ خبر شایع کی کہ ایک جرمنی مخترع نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا ہے جو عصائے مخبر کے بالکل قایم مقام ہے اور تحت الارض کی چیزوں کا پتہ دیتا ہے مسٹر ہولز ایک مشہور شخص ہے اور وہ ایک مخصوص کارخانہ کا

مالک ہے جس میں وہ دقیق آلات بنائے جاتے ہیں جن سے علماء اپنے نازک علمی تجربوں میں کام لیتے ہیں۔ مسٹر مذکور بذات خود جرمنی گیا اور مخترع سے ملاقات کر کے اس کے آلہ کا متعدد بار تجربہ کیا ایک دفعہ بھی غلطی واقع نہیں ہوئی اس آلہ کی بنیاد ان اصول پر ہے۔

ہر ایک معدنی شے سے خاص قسم کی شعاعیں اور ابخرے اٹھتے رہتے ہیں اور ان سے ہوا میں ایک غیر محسوس تموج پیدا ہوتا رہتا ہے، ہر ایک معدن کی نقل نوعی میں جو فرق ہوتا ہے اسی نسبت سے ان کی شعاعوں اور ابخروں میں فرق پڑ جاتا ہے۔ اس اختلاف تموج کا مخترع نے نہایت نازک مطالعہ کیا ہے اور ان سب کو منضبط کر لیا ہے یہ آلہ انہی تموجات سے متاثر ہوتا ہے، جن کے معلوم کرنے کی ضرورت ہو، اگر ہمیں معلوم کرنا ہے کہ اس زمین میں لوہا ہے یا نہیں تو لوہے کے تموجات ہو جاتے ہیں۔ آلہ انکے مطابق کر کے رکھ دیا جاتا ہے اب اگر اس زمین میں لوہا ہے تو وہی خاص حدیدی تموجات پیدا ہونگے اور آلہ ان سے متاثر ہو کر پتہ بتا دیگا۔

تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ معدنی تموجات اور شعاعیں سخت ترین مواد میں بھی نفوذ کر کے سطح زمین تک پہونچ جاتی ہیں اس لئے یہ بالکل رانجن کی شعاعوں سے مشابہ ہیں جو ہر ایک سخت چیز میں نفوذ کرتی ہیں۔

مسٹر ہوٹر نے صرف اس آلہ کی خبر ہی نہیں شائع کی بلکہ اس کے مخترع فیلیب شرو ملی کو امریکہ میں بلایا جہاں وہ مشہور مہندسین کے سامنے اپنے تجربات پیش کر رہا ہے اسوقت اس نے جس قدر تجربہ کئے ہیں انمیں فی صدی پوری کامیابی ہوئی۔ یہ آلہ مختلف مقامات میں مختلف فاصلوں سے معادن کا پتہ بتا دیتا ہے، اگر اس آلہ کی صحت پر علمی دنیا نے اتفاق کر لیا تو بے شک یہ عجیب و غریب اختراع عالم اقتصاد اور عالم صنعت و حرفت میں ایک زبردست انقلاب پیدا کر دے گی۔

جسم بشری کی شعاعیں جس طرح کرۂ زمین کے گرد ایک ہوائی غلاف محیط ہے جس میں مختلف گیسیں پائی جاتی ہیں اسی طرح جسم انسانی کے گرد بھی ایک نورانی غلاف ہے جو خالی آنکھ سے نظر نہیں آتا، بلکہ خاص طریقہ سے محسوس ہوتا ہے۔

پروفیسر کلز نے ایک کتاب اسی موضوع پر لکھی ہے جسکا نام "فضائے بشری" رکھا ہے، کتاب میں اس نے متعدد فوٹو کی تصویریں دی ہیں۔ اور ثابت کیا ہے کہ جسم انسانی سے ایک خاص قسم کی نورانی شعاعیں نکلتی ہیں جنکا رنگ نفشی سے ذرا گہرا ہوتا ہے لیکن یہ شعاعیں اسقدر ہلکی ہوتی ہیں کہ خالی آنکھ سے نظر نہیں آسکتیں۔ پروفیسر مذکور یہ بھی لکھتا ہے کہ بعض عورتیں اپنے ارادے سے اپنی نورانی فضا کا رنگ بدل سکتی ہیں، اور اسکا یہ خیال بھی ہے کہ فضائے انسانی کہربائی اور کیمیائی عمل سے بھی متاثر ہو جایا کرتی ہے۔

شعاع انسانی کو دیکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ جس شخص کی شعاعیں دیکھنا ہوں اُسے سامنے کھڑا دیا جائے ایک رنگین مجوف شیشے سے اسے دیکھا جائے اس شیشے میں الکحل کی قسم کا ایک تیزاب ہوتا ہے جو مادۂ Zieyanin سے حاصل کیا جاتا ہے اور دیکھنے والے کو اپنے سر پر ایک سیاہ کپڑا ڈال لینا چاہیئے جس طرح کہ فوٹو گرافر ڈالا کرتا ہے، تاکہ خارجی روشنی دیکھنے میں خلل انداز نہو۔

اسکا بھی تجربہ کیا گیا ہے کہ سب لوگ ان شعاعوں کو ایک نسبت سے نہیں دیکھ سکتے۔ بعض لوگوں کو ان کے دیکھنے کیلئے دیر تک نظر جمائے رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے، اور بعض نصف دقیقہ سے پہلے دیکھ لیتے ہیں۔

صرف ایک عضو مثلاً ہاتھ کی شعاعوں کو بھی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ مگر زیادہ واضح طریقہ پر یہ شعاعیں اسی وقت محسوس ہوتی

ہیں جبکہ پورے جسم کا مشاہدہ کیا جائے کیونکہ اسوقت فضائے محیط کا طبقہ داخلی و خارجی صاف نظر آتے ہیں اور کبھی جسم سے ملا ہوا ایک خالی طبقہ بھی نظر آتا ہے جسے خیال اثیری Etheric double کہتے ہیں۔

شعاع بشری میں لحاظ عمر، اور صحت و مرض، کے بھی فرق ہوتا ہے۔ حالت صحت میں شعاعیں تیز اور مرض میں کمزور ہوتی ہیں، بعض علماء نے ان شعاعوں سے طبی تجربات میں کام لینا چاہا ہے لیکن ابھی اسمیں کامیابی نہیں ہوئی ہے۔

ایک عجیب و غریب لغوی اتفاق | عجیب و غریب اتفاق ہے کہ ریاست یا رئیس کے معنی میں جتنے الفاظ متمدن زبانوں میں مستعمل ہوتے ہیں، ان میں سے اکثر حرف "ر" سے شروع ہوتے ہیں۔ لاطینی زبان میں رئیس یا بادشاہ کو رکس (Rex) کہتے ہیں فرانسیسی میں روئیس (Roi)، اطالوی میں زبان میں رے (Re) اور سنسکرت زبان میں راجا (Raja) انگریزی میں رین (Reign) حکومت کے معنے میں نہایت عام لفظ ہے عربی میں بھی، راس، رب، اور رئیس اس معنی میں مستعمل ہیں لیکن سب سے زیادہ حیرت انگیز امر یہ ہے کہ مصر کی قدیم ہیروغلیفی (Hieroglyphic) میں بھی اسے لفظ "رع" یا "را" سے ظاہر کرتے ہیں۔

جو سماء کی حیرتناک وسعت | ماڈرن ریویو نے اسکرنبر کے حوالہ سے علم ہیئت کے متعلق ایک مضمون کا اقتباس شایع کیا ہے، جو سماء کی حیرتناک وسعت کائنات کی غیر متناہی فضا پر عجیب و غریب روشنی ڈالتا ہے۔

مقالہ نگار نے اجرام فلکی پر بحث کرتے کرتے ایک جگہ پر ظاہر کیا ہے کہ آسمان میں بعض ستارے ہیں جو حجم میں آفتاب کے برابر ہیں، لیکن اپنی روشنی زمین تک ۳۶ ہزار سال میں پہونچاتے ہیں۔ بعض ان سے بھی زیادہ دور ہیں جنکی روشنی ۳۰ لاکھ برس میں زمین تک پہونچتی ہے۔ پھر اسی کے ساتھ یہ بھی غور طلب ہے کہ روشنی ایک سکنڈ میں ۱۸۶۰۰۰ میل چلتی ہے۔ کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ وہ روشنی جو فی سکنڈ تقریباً دو لاکھ میل کا سفر کرتی ہے، ۳۶ ہزار یا ۳۰ لاکھ سال میں کتنی مسافت طے کرکے زمین تک پہونچتی ہوگی۔

ناول شرر

[illegible]

ہیرو
رنگ محل

[illegible]

دوم
سوم
چہارم
نگران فصاحت
[illegible]

ظفر عمر بی اے

چہرہ دل کا کلب
نیلی چھتری
بہرام کی گرفتاری

مولانا نیاز فتح پوری

[illegible]
عورت اور تمدن
گلستان
[illegible]

ناول

[illegible]
بالشویک شہزادی
طبیبہ وفا
نشاط بیگم
شعلۂ رنگین
جاسوس پیرس
شیخ چلی
بہادر جوگی
بہرام کی واپسی
انقلاب فرانس
حسن بنارس
خونی جاسوس
ترکی حرم سرا
جنگ طرابلس
بہرام چور
زر پرست
گنجی کا راز
عبدالرحمن نامہ
عروس مصر
سیلاب خون
[illegible]
وفادار دلہن
طوفان زمین

[illegible]
بالشویک نو بہار
عروس لیلیٰ
امین بیگ
سرگزشت بی بی یوسف
یوسف پاشا
انقلاب عثمانی
نیلی چھتری
بہرام کی آزادی
بہرام کی گرفتاری
بہرام کی سرگزشت
پرامرار قتل

ادبی کتابیں

مکمل شرح دیوان غالب
بزم خیال
مشاطۂ سخن
انشاء نسوان
مکاتیب محسن الملک
لیلیٰ مجنوں ڈراما

مراثی

مراثی دبیر
مراثی انیس
مراثی ضمیر

[illegible]
کلیات نظیر اکبرآبادی
سوانح نظیر اکبرآبادی

دواوین فارسی

دیوان شمس تبریز
کلیات عراقی
دیوان حافظ
دیوان نعمت خان عالی
کلیات انوری
دیوان بیدل
کلیات سعدی
دیوان عرفی
کلیات جامی
کلیات غالب
کلیات صائب
کلیات حزیں
دیوان عنصری
دیوان ظہیر فاریابی
دیوان غنی کشمیری
دیوان ناصر علی
دیوان ہلالی
کلیات جلال اسیر

دواوین اردو

دیوان حسن دہلوی
کلیات ظفر

نگار بک ایجنسی
لکھنؤ

دیوان [illegible]
دیوان ناسخ
کلیات میر
کلیات سودا
کلیات انشا
کلیات نظیر اکبرآبادی
گلزار داغ
دیوان رند
دیوان ذوق
کلیات اسمعیل
مرآۃ الغیب
صنم خانۂ عشق
فریاد داغ
دیوان قائم
دیوان شہیدی

عجائب و غرائب

عجائب المخلوقات مع تصاویر
بالتصویر سادہ
مجمع الفنون
طلسم فرنگ
کارخانۂ عالم

مشاہیر ادب کے ناول و ترجمے

السودین واطسن
فریب حسن
سوز عشق
روز الیبرٹ
ناول اسرار
شام جوانی
طلسمی فانوس





نگار

ایڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۱۵	فروری سنہ ۱۹۲۹ء	شمار ۲

ملاحظات

گزشتہ ماہ (جنوری) کے رسالہ سے نگار نے اپنی عمر کے آٹھویں سال میں قدم رکھا ہے، جو عورتوں کی اصطلاح میں "میٹھا سال" کہلاتا ہے اور بہت "اللہ آمین" کے ساتھ بسر ہوتا ہے لیکن چونکہ ہندوستان کی محدود حوصلہ اور ناپائدار عمر رکھنے والی علمی دنیا میں کسی رسالہ یا اخبار کیلئے اس عمر تک پہونچ جانا بھی گویا "ہفت خواں" کا طے کرلینا ہے، اس لئے میں تو یہی کہونگا کہ نگار نہ صرف اپنے شباب بلکہ سن وقوف کو پہونچ گیا ہے اور وہ اعتماد و وقار جو ملک کے اندر اسنے حاصل کرلیا ہے، بڑی حد تک اس کی حیات طویل کا ضامن ہے اگر بدقسمتی سے کوئی حادثہ سنگ راہ نہ ہوا۔

اس میں شک نہیں کہ نگار اس وقت یوپی کے تمام اردو رسائل و جرائد سے زیادہ اشاعت رکھنے کا مدعی ہے، لیکن یہ کثرت صرف تقابلی و امتیازی ہے، حقیقی نہیں۔ یعنی یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت اسکی اشاعت مقابلۃً دوسرے رسائل سے زیادہ ہے، لیکن جسوقت یہ دیکھا جاتا ہے کہ حقیقتاً اسکی اشاعت کتنی ہونا چاہئے، تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ ؎

وہ جو ہم رکھتے تھے اک حسرت تعمیر سو ہے

یہ صحیح ہے کہ رسالہ نگار نہ صرف اپنے مصارف پورے کرتا ہے بلکہ وہ میرے اسباب معیشت و معاشرت کا بھی بڑی حد تک کفیل ہے، اور ایک مشین پریس بھی مع تمام ضروری سامان کے اپنی ملکیت میں رکھتا ہے، لیکن کیا میری سات سال کی کاوش دماغ کا صرف یہی صلہ ہونا چاہئے

ممکن ہے کہ ہندوستان میں جہاں اب سرمایۂ زر و سیم کے مقابلہ میں سرمایۂ دماغ کی کوئی اہمیت نہیں، اسکو کافی سمجھا جائے، لیکن یہی سرزمین ہند پر ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے جب علم و ہنر کی قدردانی کا مفہوم مادی نقطۂ نظر سے استعارۃً نہیں بلکہ حقیقتاً زر و سیم کے برابر تولا یا جانا اور زر و جواہر سے منہ بھر دیا جانا ہوا کرتا تھا۔ ہرچند میں ان لوگوں میں نہیں کہ کسی وقت اس احترام کا مطالبہ کر سکتا، لیکن خدمت کے لحاظ سے اجرت طلب کرنا یقیناً میرا فطری حق ہے اور اگر ہمیں ملک کمی کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ میں اس کا تقاضہ نہ کروں۔

نگار نے گزشتہ سال کے اندر جو خدمت زبان و علم کی انجام دی ہے یا جو ذہنی انقلاب اس نے پیدا کر دیا ہے، وہ صحافت کی دنیا کا ایسا معمولی واقعہ نہیں ہے جس کو نظرانداز کر دیا جائے۔ احباب نکتہ سنج نے اپنے اعتراف سے اور ارباب حسود نے اپنے اضطراب سے بار ہا اسکو تسلیم کیا اور کرتے رہیں گے لیکن افسوس ہے کہ اس وقت تک نگار اپنے پیغام کی نشر و اشاعت ضروری حد تک بھی نہیں کر سکا اور یہ فرض ابتک ناتمام حالت میں پڑا ہوا ہے جسکا بڑا ذمہ دار ملک ہے۔ اگر آج نگار کے تمام موجودہ خریدار صرف ایک شخص ایسا ہمخیال و ہمنوا پیدا کر کے نگار کی اعانت پر آمادہ کر دیں، (جو ایسا دشوار امر نہیں ہے) تو ایک ہی سال کے اندر ایسا صوری و معنوی انقلاب نگار کی حالت میں پیدا ہو سکتا ہے کہ اسوقت آپ اسکا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔

بہرحال میرا فرض اس اظہار خیال پر ختم ہو جاتا ہے، اور اب مجھے دیکھنا ہے کہ ناظرین نگار کس حد تک میری اعانت کرتے ہیں۔

میں بے انتہا ممنون ہوں ان احباب کا جو وقتاً فوقتاً نگار کی توسیع اشاعت میں حصہ لیتے رہتے ہیں اور خصوصیت کے ساتھ مولوی غلام ربانی عزیز (کمبل پور) کا جنھوں نے ایک ایک وقت میں پچیس پچیس خریدار فراہم کئے۔

گزشتہ ماہ نگار چونکہ سال کا پہلا پرچہ تھا اور زیادہ ضخیم نکالنا تھا اس لئے اس مرتبہ ۲۲ء کے خاص خاص مضامین کا انتخاب اس میں درج کیا گیا۔ اس سے ایک طرف یہ مقصود تھا کہ لوگوں کے پاس ۲۲ء کا ایک منتخب مجموعۂ مضامین پہونچ جائے، اور دوسری طرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ ابتداء میں جب نگار جاری ہوا ہے تو ادارت پر اس کی ترتیب کا کتنا بار تھا۔ چونکہ موجودہ خریداروں میں بہت کم تعداد ان لوگوں کی ہے جو شروع سے خریدار ہوئے ہیں اس لئے یہ مجموعۂ مضامین بہت زیادہ پسند کیا گیا۔ بعض حضرات نے جنکے پاس ۲۲ء کا مکمل فایل تھا ان کو شکایت بھی ہوئی، لیکن انکی خدمت میں عذر پیش کر دیا گیا۔

یہ امر اس سے قبل بھی ظاہر کیا جا چکا ہے اور اب پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ نگار کا نہ کوئی خاص نمبر نکلتا ہے اور نہ اسکا کوئی سالنامہ شائع ہوتا ہے، البتہ کبھی کبھی بغیر کسی التزام و تعین کے ضخامت زیادہ کر دی جاتی ہے اور اس زیادتی حجم سے یہ فایدہ اٹھایا جاتا ہے کہ رسالہ کا اسلوب ترتیب ایک ماہ کے لئے بدل کر کچھ تنوع پیدا کر دیا جاتا ہے، اس لئے اگر کوئی صاحب نگار کی کسی ایسی مخصوص اشاعت کو سالنامہ وغیرہ کے لفظ سے یاد کرتے ہیں تو اسکی ذمہ داری انہیں پر ہے

میں اس کا معترف ہوں کہ پنجاب کے رسایل کی طرح نہ نگار میں تصاویر ہوتی ہیں اور نہ کوئی ظاہری صنعت و نمایش اس میں پائی جاتی ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ جو طبیعتیں نگار کے مضامین کی عادی ہو گئی ہیں۔ وہ تصاویر اور نقش و نگار سے زیادہ کسی اور چیز کی جستجو میں رہتی ہیں اور غالباً اسکا فقدان نگار میں کبھی نہیں ہوا۔

اس میں کلام نہیں کہ رسایل میں موزوں و مناسب تصاویر کی اشاعت کے ساتھ ساتھ معقول و سنجیدہ ترتیب کا بھی لحاظ رہے، تو بہت زیادہ قابل تعریف ہے، لیکن عام طور پر تصاویر شایع کرنیوالے رسایل اس کا لحاظ نہیں کرتے اور صرف ظاہری صورت کا سودا کرنا چاہتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس میں کامیابی نہیں ہوتی۔ ہوتی ہے اور بہت زیادہ ہوتی ہے کیونکہ دنیا معنی سے زیادہ صورت کو کیفیت سے زیادہ کمیت کو دیکھتی ہے، لیکن یہ کامیابی تجارت کی ہے، رسالہ کی نہیں ۔۔۔۔۔۔۔ تصاویر کی اشاعت کا مسئلہ عرصہ سے نگار کے سامنے ہے، لیکن افسوس ہے کہ اسوقت تک نگار کی مالی حالت اس قابل نہیں ہوئی کہ وہ اسی معیار کی تصاویر شایع کرسکے جو اس کے مضامین کا ہے۔

پنجاب میں اس وقت متعدد رسایل ایسے نکل رہے ہیں جن میں تصاویر کا التزام ہوتا ہے اور میں انکے مساعی کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں، لیکن جس وقت یہ غور کرتا ہوں کہ تصاویر نکال دینے کے بعد کونسا رسالہ دیکھے جانے کے قابل ہے تو صرف دو یا تین رسالے اس قابل نظر آتے ہیں۔

رسالہ ہمایوں اور نگار کی ابتدا ساتھ ساتھ ہوئی۔ جس طرح نگار نے ایک روش قایم کرنے کے بعد اسکو ترک نہیں کیا، اسی طرح ہمایوں نے بھی اپنا سمت مقصود نہیں بدلا، بلکہ اس کو یہ امتیاز اور زیادہ حاصل ہے کہ وہ تصاویر بھی شائع کرتا رہتا ہے جن میں سے اکثر اچھے ذوق کا پتہ دیتی ہیں۔

نیرنگ خیال، ہمایوں کے بعد جاری ہوا، لیکن تصاویر کی ابتداء اسی نے کی اور غالباً اخفار حقیقت ہوگا اگر یہ نہ کہا جائے کہ دیگر رسایل کے مصور شائع ہونے کا سبب نیرنگ خیال ہی ہوا۔ اسی نے خصوصیت کے ساتھ مخصوص نمبروں اور سالناموں پر زیادہ توجہ کی اور آج غالباً اس سے زیادہ کامیاب رسالہ اس باب میں کوئی نہیں اور جن اصول کے ماتحت اسکو جاری کیا گیا تھا اس میں اسکو قابل رشک کامیابی حاصل ہوئی۔ رسالہ مخزن کا نشاۃ الثانیہ نیرنگ خیال کے بعد ہوا اور جناب حفیظ جالندھری کی سعی و کوشش سے اس نے بھی کافی ترقی کی۔ تصاویر بھی اچھی اچھی شائع ہوئیں اور ترتیب و تہذیب میں بھی دلکشی پیدا کی گئی، لیکن ایک عجیب و غریب بات جو پنجاب کے رسایل و جرائد میں پائی جاتی ہے اور جس سے ہمایوں بھی باوجود اپنی انتہائی متانت و سنجیدگی کے نہ بچ سکا، وہ باہمی تضحیک و توہین اور سب و شتم ہے۔ خیر اگر پنجاب کے رسالے یوپی کے رسایل کے مخالف ہوں تو اسکی تاویل بھی ہوسکتی ہے، لیکن خود اُن کا آپس میں افتراق و انشقاق عجیب بات ہے۔

اسی سلسلہ میں مجھے وہاں کے ایک اور نوزائیدہ رسالہ کا ذکر ناضروری ہے جو "شبستان" کے نام سے دیوان آتم آنند شرر بی اے کی ادارت میں جنوری ۲۹ء سے جاری ہوا ہے۔ یہ رسالہ سینما کی دنیا سے متعلق ہے اور اس میں صرف وہی مضامین درج ہونگے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ سینما سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس رسالے میں دنیا کے بعض مشہور ایکٹروں کی تصاویر بھی ہیں اور طباعت، کتابت اور کاغذ نہایت ہی عمدہ و پاکیزہ ہے۔ جناب پطرس کا مضمون "فلم کی شام" دیکھنے کے قابل ہے۔

سیاسیات ہند کا سب سے زیادہ مہتم بالشان مطلب جسے گذشتہ کانگرس کی تمام کارروائیوں کا ماحصل کہنا چاہیے، ہندوستان کیلئے ذومینین ہوم رول کا مطالبہ تھا جسکی سفارش نہرو کمیٹی رپورٹ میں کی گئی تھی اور جس سے انڈیپنڈنٹ پارٹی کو سخت اختلاف تھا۔
میں اس جگہ کانگرس کی کارروائیوں کو بیان کرنا ضروری نہیں سمجھتا، کیونکہ اسکا علم ہر اخبار بین شخص کو ہے، لیکن مختصراً یہ ظاہر کرنا ضروری ہے

کہ گذشتہ کانگرس کے بعد سیاسیات ہند کا رخ کیا ہو گیا اور مسلمانوں نے اس سے کس حد تک فایدہ اٹھایا۔

مہاتما گاندھی کا چند سال سے پاؤں توڑ کر زاویہ نشین ہو جانا اور پھر دفعتہً کانگرس میں شریک ہو کر تجدید عمل کی نمایش کرنا اور وہ بھی اس شان کے ساتھ کہ کانگرس میں ہر جگہ وہ پنڈت موتی لال نہرو ہی کے حلقوم سے گفتگو کر رہے ہوں اور آزادی کامل کے مطالبہ سے ترک کر کے ڈومینین ہوم رول تک آ جائیں، کوئی معمولی بات نہیں ہو سکتی،

میں دیکھتا ہوں کہ یہ ڈرامہ جو کانگرس کے اجلاس پر کھیلا گیا، اس کی طیاری مخفی طور پر الہ آباد اور احمد آباد میں بہت عرصہ سے ہو رہی تھی یہاں تک کہ مجھے تو یہ شبہ ہے کہ انڈی پنڈنٹ جماعت کی وہ شدید مخالفت جو کانگرس میں ظاہر ہوئی، کہیں وہ بھی اسی کھیل کا کوئی منظور شدہ مقررہ حصہ نہو۔

بہرحال حقیقت جو کچھ بھی رہی ہو اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جو کچھ ہوا وہ کس حد تک صحیح ہے اور اس سے کن نتائج کی توقع کی جاتی ہے۔ گزشتہ کانگرس کی اس متفق علیہ آواز کو کہ "اگر ہوم رول ایک سال کے اندر نہ ملا تو عدم تعاون، ستیاگرہ وغیرہ کے وہی حربے اختیار کئے جائیں گے جن کی اس قبل آزمایش ہو چکی ہے" بلا اختلاف تمام جماعتوں نے پسند کیا اور کم از کم ایک سال کے لئے ہندوستان کے سیاسیات کا ایک متفقہ محاذ قایم ہو گیا۔

یہ تجویز حقیقتاً ایک کھلا ہوا پیام جنگ ہے جو حکومت برطانیہ کو دیا گیا ہے اور اگر اس چیلنج کے الفاظ کو واقعتہً عمل سے بھی ثابت کر دیا گیا تو پھر ہندوستان کا کم از کم اس منزل سے گزر جانا تو یقینی ہے، جسے سکون و جمود کہتے ہیں، رہا نتیجہ، سو اس کی جستجو بیکار ہے، کیونکہ جب انسان طوفان میں گھر کر ہاتھ پاؤں مارنے پر مجبور ہو جاتا ہے تو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ساحل مل گیا، اور اس امید پر تو اس سے زیادہ قربانی کی جا سکتی ہے۔

مسلمانوں میں باہم جو اختلاف اس مسئلہ میں پیدا ہو گیا ہے، وہ البتہ بدستور قایم ہے اور اگر ۲۹ء کے اخیر تک حکومت برطانیہ کے کسی فیصلہ نے ملک کے اندر کوئی عام اضطراب نہ پیدا کر دیا، تو اس خلیج کا وسیع ہو جانا بالکل یقینی ہے، اور کمزور جماعت ہونے کے لحاظ سے خسارہ میں رہنا لازمی۔

مسلم لیگ کے جو جلسے کلکتہ میں ہوئے ان کو کانگرس ہی کا پرتو سمجھنا چاہئے، کیونکہ ہمیں حصہ لینے والے مسلمان تقریباً سب وہی تھے جو شروع سے نہرو کمیٹی رپورٹ کے موافق ہیں۔ مخالفین کی شرکت وہاں کی فضا میں کوئی تغیر پیدا نہ کر سکی بلکہ انکار کا سہا اقتدار بھی ختم ہو گیا۔ اس کے جواب میں دہلی کی آل مسلم پارٹیز کانفرنس کا انعقاد جو اہمیت رکھ سکتا تھا اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ پذیرائی کرنے والے کون تھے اور جن کی پذیرائی کی گئی وہ کیا ہیں۔ اس کانفرنس نے کوئی قابل ذکر اہمیت پیدا نہیں کی اور نہ جمہور مسلمانان ہند کے خیالات میں اس سے کوئی تغیر پیدا ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ وقت بہت دلچسپ ہوگا جب اس اختلاف کے بانی (خواہ وہ اختلاف کتنے ہی خلوص پر کیوں نہ قایم ہو) مجبور ہو کر ترک اختلاف کا عہد و پیمان کریں گے اور ہندو سبھا کے حکم کو، برطانیہ کے حکم پر ترجیح دینا باعث فلاح سمجھیں گے۔

کانگرس میں مہاتما گاندھی کے اس الٹی میٹم کے شایع ہوتے ہی ملک و بیرون ملک کے معزز ارکان صحافت نے جن جن خیالات کا اظہار کیا وہ بہت امید افزا تھا اور ہم کو ماننا پڑے گا کہ لارڈ ارونگ کی تقریر افتتاح کونسل کے وقت بڑی حد تک انہیں خیالات و آراء سے متاثر

ہونے کے بعد کی گئی تھی۔ گاندھی کے چیلنج کا جواب جس سکون و نرمی کے ساتھ حکومت ہند نے دیا ہے وہ برطانوی ڈپلومیسی کا کوئی جدید مظاہرہ نہیں ہے۔ کیونکہ "جاہا سپر باید انداختن" کے اصول سے کام لینے کو جیسا یہ قوم جانتی ہے کسی اور قوم کو نہیں معلوم، لیکن اسی کے ساتھ تجربہ کے لحاظ سے جو مایوسی پیدا کردی ہے، وہ لندن کے قلمدان وزارت کا کوئی نیا کارنامہ نہیں جس کے نقوش پر ویسرائے ہند کے آواز کی ریکارڈنگ ہوتی ہے۔

بہرحال یہ امر یقینی ہے کہ ۱۹۲۹ء کے اخیر تک حکومت کی طرف سے علاوہ سائمن کمیشن کے کسی اور کمیشن کا وجود عمل میں آئے گا جس کو اہل ہند بائیکاٹ نہ کرسکیں گے اور اگر سائمن کمیشن اور اس دوسرے کمیشن کے فیصلہ میں اختلاف ہوا جو بالکل یقینی ہے تو پھر کسی تیسرے کمیشن کو پیدا کیا جائے گا جو زیادہ تر راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی حیثیت رکھیگی اور اس طرح کم از کم آٹھ دس سال کا زمانہ گزر جائے گا اور گاندھی جی تذبذب حالت میں بیٹھے ہوئے یہی سوچتے رہیں گے کہ انہیں اپنے ترکش کا کوئی تیر استعمال کرنا مناسب ہے یا نہیں؟

اس لئے میری رائے میں یہ زمانہ صرف انتظار میں بسر کردینا کہ حکومت کیا فیصلہ کرتی ہے اور ۱۹۳۰ء میں ہمیں کیا کرنا ہے، تضییع اوقات ہے۔ اس دوران میں سب سے پہلے یہاں کی اقتصادیات و معاشیات پر قابو حاصل کرنے کیلئے ایک نہایت زبردست مرکزیت پیدا کرنا چاہیئے اور کوشش کرکے ملک کو بتا دینا چاہیئے کہ انکی فلاح کا انحصار صرف اقتصادی اصلاح پر ہے جس کی اولین منزل کھدر کا استعمال ہے۔ ملک کی آزادی کا سوال سامنے رکھکر کھدر کے استعمال کی ترغیب کبھی مفید نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ ابھی تک عوام ملک کی آزادی کی اہمیت کو نہیں سمجھتے، بلکہ لوگوں کو دلایل سے، اعداد و شمار سے یہ بتانا چاہیئے کہ کھدر کا استعمال کتنوں کے قرضے ادا کرسکتا ہے، کتنی جائدادوں کا فک رہن اس کے ذریعہ سے ہوسکتا ہے، کتنے خاندان فاقوں سے بچ سکتے ہیں اور کتنے بچے تعلیم پاسکتے ہیں۔ کھدر پرچار میں ادنیٰ سے ادنیٰ شائبہ بھی سیاسیات کا نہ آنا چاہیئے، بلکہ اس کو صرف اقتصادی مسئلہ کی حیثیت سے رائج کرنا چاہیئے جس کے لئے اگر نیشنل کانگرس اپنی کوئی علحدہ شاخ قایم نہیں کرسکتی تو ایک اقتصادی کانگرس بالکل جداگانہ قایم کرنا چاہیئے اور تمام اکابر قوم کو کم از کم دو تین سال کے لئے اپنی ساری توجہ اسی طرف مبذول کردینا چاہیئے۔

مہاتما گاندھی جی نے اب پھر ایک جدید اسکیم اس مسئلہ کی شائع کی ہے، لیکن صرف اسکیموں کی اشاعت سے کچھ نہیں ہوسکتا جب تک کچھ عرصہ کے لئے تمام اور تحریکوں سے قطع نظر کرکے تمام اکابر ملک کی توجہ اس طرف مبذول نہ ہو۔ کیونکہ یہ تحریک اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک ایک ایک گاؤں پھر کر اس کا پروپیگنڈا نہ کیا جائے اور نہایت وسیع پیمانہ پر تجارت اور کاروبار کی صورت سے اسکی اشاعت نہ ہو۔

بیرون ہند کے معاملات میں سب سے زیادہ اہم واقعہ انقلاب افغانستان کا ہے کہ ایک بغاوت نے جو پہلے بہت معمولی معلوم ہوتی تھی یہانتک اہمیت اختیار کرلی کہ امیر امان اللہ خان کو سلطنت چھوڑ کر کابل سے قندھار آنا پڑا اور سردار عنایت اللہ خان بھی کامیاب باغیوں کی وجہ سے کابل میں نہ رہ سکے۔ اس انقلاب کے تمام واقعات و جزئیات سے ہر شخص واقف ہے اور شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جس نے شروع سے اس وقت تک اس تغیر کے مختلف مدارج و منازل کا مطالعہ اخباروں کے ذریعہ سے نہ کیا ہو۔ لیکن سب سے زیادہ حیرتناک امر یہ ہے کہ باوجود افغانستان کے اس قدر قریب ہونے کے آجتک کوئی خبر ایسی موصول نہیں ہوئی جس پر ایکدن کیلئے بھی وثوق ہوسکے اور دوسرے دن اسکی تردید کی توقع نہ ہوتی ہو۔

یہ انقلاب وہاں کیوں رونما ہوا، اور اس نے اسقدر شدت کیوں اختیار کی، کوئی ایسا راز نہیں ہے جس کی حقیقت معلوم کرنے کیلئے زیادہ انتظار کیا جائے۔ اس انقلاب کے اسباب متعدد بیان کئے جاتے ہیں جنمیں سب سے زیادہ اہم ایک سبب یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ امان اللہ خاں کی مغربی اصلاح وہاں کے تاریک خیال لوگوں کو ناگوار گزری، دوسرا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ حکومت برطانیہ نے اس بغاوت کو پیدا کیا تاکہ امان اللہ خاں جو روسیوں کے زیادہ طرفدار تھے علٰحدہ ہو جائیں" ان میں سے دوسرا سبب تو یقیناً قابل اعتماد نہیں ہو سکتا، کیونکہ نہ امیر امان اللہ خاں روسیوں کے طرفدار تھے اور نہ وہ ہو سکتے تھے جبکہ روس کی موجودہ حالت ہرگز ایسی نہیں کہ اسکی موافقت میں کوئی سلطنت، دوسرے ملک کی مخالفت مول لیکر روس سے امداد کی توقع رکھے۔ اگر آج روس اس قابل ہوتا تو موجودہ انقلاب افغانستان سے ہی سب سے زیادہ نا جائز فایدہ اٹھاتا۔ علاوہ اس کے سرحدی سیاست کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ حکومت ہند کا فایدہ اسیمیں ہے کہ افغانستان کے اندر کوئی مرکزی حکومت قایم رہے اور تفریق و انشقاق نہ پیدا ہو کیونکہ اس صورت میں اسکی خارجی پیچیدگیاں اور بڑھ جائیں گی۔ بہرحال یہ خیال لوگوں کا بربنائے غلط فہمی ہے۔

سبب اول کی کچھ حقیقت ضرور ہے، لیکن نہ اسقدر کہ اسی کو اصل وجہ قرار دیا جائے۔ میں نے جہانتک غور کیا ہے اسکا سب سے بڑا سبب افغانستان کی عام اقتصادی حالت کا کمزور ہو جانا ہے اور اس کے بعد دوسرا سبب وہاں کے عمّال کا نا قابل ہونا۔ امان اللہ خاں جس عجلت و شتاب جس مستعدی اور برق وشی کے ساتھ اصلاحات کو نافذ کر رہے تھے اسکا اقتضا یہ بھی تھا کہ رعایا پر ٹیکس بڑھا دیا جائے اور اسے وصول بھی کیا جائے، پھر چونکہ افغانستان کی رعایا جو پہلے محاصل زمین بھی صرف غلہ کی صورت میں ادا کیا کرتی تھی اور جو حقیقتاً مفلس و نادار ہے، حکومت کے جدید ٹیکسوں سے گھبرا گئی اور یہ دیکھکر کہ ابھی تو ابتدا ہے آیندہ خدا جانے اور کیا کیا دینا پڑے ان میں بد دلی پیدا ہو چلی تھی، پھر چونکہ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ وہاں کے عمّال اچھے نہیں ہیں (اور نہ اسقدر جلد تمام ملک کے اہلکاروں کی اصلاح ہو سکتی ہے) اس لئے وہ پبلک کی بدظنی کم کرنے کے بجائے اور زیادتی کا باعث ہوئے اور رفتہ رفتہ یہ آگ تمام اکناف ملک میں مشتعل ہو گئی، اور وہ تمام لوگ جو کچھ ان اسباب کی بناء پر اور کچھ دیگر قبائلی و نسلی تفریق و عناد کی بناء پر پہلے ہی سے خوش نہ تھے ملکر اس ہنگامہ کا باعث ہو گئے۔

پردہ کا مسئلہ، عورتوں کی تعلیم، لباس کی تبدیلی، ان میں سے کوئی بات ایسی نہ تھی جو بغاوت کو اس حد تک پہونچا دیتی، اگر اسوقت کابل کا خزانہ ملک کی اقتصادی حالت کو درست کرنیکا اہل ہوتا، محض جبریہ فوجی بھرتی کی مخالفت افغانستان میں کبھی نہیں ہو سکتی (کیونکہ جنگ انکی فطرت ہے) لیکن اگر فوج کو تنخواہ وقت پر نہ ملے تو بیشک اسکو بد دل ہونا چاہئے، اور یقیناً یہ بھی ایک سبب باغیوں کی کامیابی کا ہوا اور شاہی فوج پوری قوت کے ساتھ مقابل نہیں آئی۔ ممکن ہے کہ وہاں کے وزراء کا باہم شکر رنجی نے بھی اس شورش کی اعانت کی ہو۔ بہرحال اسوقت وہاں کی حالت یہ ہے کہ مختلف حصّوں پر مختلف شخصوں نے حسب موقعہ قبضہ جما رکھا ہے اور امان اللہ خاں نے پھر اپنی ملوکیت کا اعلان کر کے بچہ سقہ کے خلاف جو کابل پر قابض ہو گیا ہے، تاخت کی تدبیریں شروع کر دی ہیں۔ آیندہ کیا ہوگا۔ اس کے متعلق بھی آسانی سے پیشین گوئی کی جا سکتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ افغانستان ان ملکوں میں سے ہے جہاں نہایت آسانی سے طوائف الملوکی پیدا ہو سکتی ہے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت واضح ہے کہ اسوقت سوائے امان اللہ خاں کے اور کوئی شخص سارے ملک میں ایسا نہیں ہے جسکی حکومت پر تمام قبایل کسی وقت متفق ہو سکیں۔

امان اللہ خاں کا شاہی خاندان سے ہونا، اپنی خصوصیات ذاتی کی بناء پر صاحب اثر و اقتدار ہونا اور گذشتہ طرزِ عمل سے انکا سچا خادمِ ملک ثابت ہو جانا، یہ تمام وہ باتیں ہیں جنکا اثر ابتک قایم ہے اور رہے گا، اسلئے کوئی وجہ نہیں کہ ملک دوبارہ انکی حکومت و سیادت کو تسلیم نہ کرے، لیکن ضرورت یہ ہے کہ پہلے اس ہنگامی اشتعال کو فرو کر دیا جائے۔ اسوقت تک امان اللہ خاں کا قندھار میں خاموش بیٹھا رہنا اس لئے نہیں ہے کہ وہ آیندہ کیلئے مایوس ہو چکے ہیں یا انہیں افغانستان کی موجودہ تشتت و انتشار سے کوئی تکلیف نہیں پہونچ رہی ہے، بلکہ اسکا سبب صرف موسم کی خرابی ہے جسوقت برفباری موقوف ہو کر راستے صاف ہو گئے تو آپ دیکھیں گے کہ امان اللہ خاں نے کیا کیا۔ اور ہوا کا رخ کس طرف کو پھر گیا۔ سقہ بچہ کی ذاتی حیثیت ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ وہ برفباری کے موسم سے زیادہ کابل کو اپنے پاس رکھ سکے جسوقت یہ شدت سردی کی ختم ہوئی اور امان اللہ خاں کا آفتاب اقبال قندھار سے طلوع ہوا تو یہ تمام اپنی اپنی جگہ پر بادشاہ بن بیٹھنے والی ہستیاں شبنم کی طرح اڑ جائیں گی اور پھر وہ امن و سکون، عروج و ترقی کا زمانہ آئے گا جس کی تکمیل امان اللہ خاں کے ہاتھ پر قدرت نے لکھدی ہے۔

اس زمانہ میں برطانیہ کی نیوٹرل پالیسی کو عام طور پر بہت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اور غالباً یہ بڑی مدد تھی جو حکومت ہند کی طرف سے پیش کیگئی لیکن یہ سوال ہے کہ جب امان اللہ خاں نے اپنی ملوکیت کا اعلان کیا تو اسکو برطانیہ نے کیوں تسلیم نہیں کیا اور ابتک سرکاری پیغامات میں انکا ذکر ایک معزول بادشاہ کی حیثیت سے کیوں کیا جاتا ہے اور کیوں نہیں ان سے وہی تعلقات قندھار میں پیدا کئے جاتے جو اس سے قبل کابل میں تھے کیا امان اللہ خاں نے باقاعدہ اسکی اطلاع حکومت ہند کو نہیں دی؟ یہ راز شاید ابھی ظاہر نہیں ہو سکتا اور نہ اسپر رائے زنی مناسب ہے۔

سب سے زیادہ باعث مسرت امر اس سلسلہ میں یہ ہے کہ ہندوستان کی غیر مسلم صحافت نے جسمیں اینگلو انڈین اور ہندو دونوں شامل ہیں اپنا انداز تنقید نہایت سنجیدہ اور قابل تعریف رکھا۔ شاید ہی کوئی ایسا اخبار ہو جسنے امان اللہ خاں کیساتھ ہمدردی کا اظہار نہ کیا ہو اور اس انقلاب کو وہاں کی پبلک کی غیر دانشمندانہ پالیسی پر محمول نہ کیا ہو۔ اور یہ اسبات کا ثبوت امان اللہ خاں کی دلعزیزی کا ہے کہ شاید ہی اب اسمیں کسی اور اضافہ کی گنجایش ہو سکتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ جدید اصلاحات کے نافذ کرنے میں امان اللہ خاں نے اپنی فطرت کے لحاظ سے ذرا عجلت سے کام لیا اور صرف اپنے خلوص اور خدمت قومی کے جذبہ سے متاثر ہو کر اپنی قوم کی ذہنیت کو نظر انداز کر دیا۔ اگر وہ انہیں اصلاحات کے نفاذ کیلئے ذرا نرم پالیسی سے کام لیتے اور دفعتہً تمام نظام میں تبدیلی پیدا کرنیکے خیال سے اپنے آپ کو اور ملک کو اقتصادی مشکلات میں مبتلا نہ کر لیتے تو شاید یہ انقلاب رونما نہ ہوتا۔ امید ہے کہ جب وہ دوبارہ عنان حکومت میں لیں گے تو وہ زیادہ مصلحت اندیشی سے کام لینگے۔ مغرب سے جہاں وہ اور اصلاحات کا درس لیکر آئے ہیں، اگر انہیں کے ساتھ وہ اس ڈپلومیسی کا بھی سبق لیتے جو انسان کی زبان و قلب کو بالکل علحدہ علحدہ کر دیتی ہے تو افغانستان کی کم از کم سیاست خارجہ کا اقتدار اسقدر جلد زایل نہوتا۔

"تذکرۂ خندۂ گل" کی تکمیل میں جتنی تعویق ہوتی جاتی ہے، اتنی ہی میری شرمندگی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، لیکن پہلے یہ خیال نہ تھا کہ کتاب اسقدر ضخیم ہو جائیگی۔ بہرحال امید کیا بلکہ یقین ہے کہ زیادہ سے زیادہ وسط مارچ تک کتاب مکمل ہو جائے گی اور اخیر مارچ تک تمام ان حضرات کی خدمت میں بھیجدی جائیگی جنکا روپیہ وصول ہو چکا ہے۔

نیاز

آہو

اتنی شدت کی سردی تھی کہ اونی اوور کوٹ کی جیبوں میں بھی ہاتھ گلے جا رہے تھے۔ اور ناک تو اسقدر ٹھٹھری تھی کہ چہرے پر ہاتھ پھیرو تو معلوم ہوتا تھا جیسے بالکل غائب ہوگئی ہو۔ دستانوں اور جرابوں کی یہ حالت تھی کہ گرمی پہونچانے کے بجائے برف کی قاشیں معلوم ہو رہی تھیں۔

کانپور اسٹیشن کا پلیٹ فارم مسافروں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ متوسط طبقے کے وہ لوگ جو ریفرشمنٹ روم میں چائے پینے کی استطاعت نہیں رکھتے، چائے کے اسٹال کو شہد کی مکھیوں کی طرح گھیرے ہوئے تھے۔ گرم چائے سے زیادہ منہ سے بھاپیں نکل رہی تھیں۔

میں، رشید اور آزاد لوہے کے ایک ستون کے پاس بیٹھے سمٹائے پڑے۔ بکسوں اور ٹرنکوں کے بے ترتیب انبار پر ڈھیر تھے۔ سردی کی وجہ سے اتنی ہمت بھی نہ پڑتی تھی کہ جیبوں میں سے ہاتھ نکالکر سگریٹ ہی سلگائیں اور اسکے گرم دھوئیں سے ٹھٹھرے ہوئے سینوں کو حرارت پہنچائیں۔ کچھ دور پر چھ سات قلی زرد وردیاں پہنے ایک بڑی سی انگیٹھی کے آگے تاپ رہے تھے۔ ان سے کچھ ہٹ کر دو چار اجڈ دیہاتی موٹے موٹے کھدر کے میلے میلے لحافوں میں گٹھری بنے ہوئے تھے۔ دوسری طرف ایک کے اوپر ایک لدی ہوئی چند عورتیں جگہ کی تنگی پر اس طرح چلا چلا کر لڑ رہی تھیں کہ ان کی چیخ پکار کی آواز میں روتے بچوں کا شور و غل بھی دب گیا تھا۔

میں نے ان جاہل عورتوں کی تو تو میں میں سنی تو میں سوچنے لگا کہ انسان فطرتاً تنگ دل اور لڑاکو واقع ہوا ہے۔ بے شک تعلیم اور تمدن سے بہت کچھ یہ جانورپن کم ہو جاتا ہے۔ لیکن اس سے یہ تھوڑی ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی فطرت میں شرافت اور عالی حوصلگی کے اوصاف داخل ہیں۔ یہ چیزیں تو محض ملمع کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر ہمیں انسانی فطرت کا صحیح اندازہ کرنا ہے تو ان لوگوں کا مطالعہ کرنا چاہیے جنکی زندگی اس قسم کے ملمع سے محفوظ ہے۔ مثلاً ناسمجھ بچے یا ان پڑھ کندۂ ناتراش گنوار۔ ان لوگوں کو دیکھیے کیسا ذرا ذرا سی بات پر لڑنے مارنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ کیسی ہی کم قیمت چیز کیوں نہ ہو اس میں کسی دوسرے کا ہاتھ لگانا بھی گوارا نہیں کر سکتے۔ دور کیوں جائیے۔ انہیں زبان دراز عورتوں پر نظر ڈالئے۔ کسی نے دوسری عورت کے بستر پر اپنی گٹھری رکھ دی یا بھولے سے ایک نے دوسری کی پھٹی پرانی بدبودار چادر کے کونے پر پاؤں جما دئے تو غل شور کی وہ کان پھاڑ دینے والی آوازیں بلند ہونے لگتی ہیں جیسے کسی ہندوستانی بازار میں سبزی فروش چلا چلا کر ترکاری بیچ رہے ہوں۔

سلسلۂ خیال یہیں تک پہونچا تھا کہ دور سے ایکسپریس کے پہیوں کی گھڑگھڑاہٹ رات کی بھیگی ہوئی سرد ہوا کو چیرتی پھاڑتی

کانوں میں گونجنے لگی۔ پلیٹ فارم پر جہاں ایک لمحہ پہلے سارا مجمع دبکا یا بھیگے ہوئے پرندوں کی طرح سکڑا بیٹھا تھا، ہلچل سی مچ گئی۔ جو لوگ بیٹھے ہوئے اونگھ رہے تھے وہ بوکھلا کر لڑکھڑاتی ہوئی ٹانگوں پر کھڑے ہو گئے۔ ایک ہی منٹ میں اسٹیشن کے اس سرے سے اس سرے تک زندگی کی لہر دوڑ گئی۔

گاڑی ٹھہری تو ہم لوگ بھی گرم مفلروں سے گردن اور کانوں کو لپیٹے، قلی کے سر پر اسباب رکھوائے انٹر کلاس کے ایک لمبے درجہ میں گھس پڑے۔ یہاں پہلے ہی مسافروں کی کثرت سے تل دھرنے کی جگہ باقی نہ تھی۔ لیکن سردی میں اتنے حواس کسے تھے کہ درجے درجے سکھ ڈھونڈھتا پھرے۔ مجبوراً وہیں دروازے کے پاس سامان کے پلندوں کو الٹا سیدھا، تلے اوپر رکھ کر، ہم تینوں نے اس پر اپنا اڈا جما دیا۔

کچھ تو کھڑکیاں بند ہونے کی وجہ سے اور کچھ مسافروں کی کثرت سے یہاں مقابلتاً سردی کم تھی۔ رشید نے ایک کمبل کھول کر میرے کاندھوں پر ڈال دیا۔ دوسرے کمبل میں آزاد اور رشید دونوں نے شرکت کر لی۔ گاڑی چل کھڑی ہوئی۔ اب کسی قدر اطمینان نصیب ہوا تو میں نے چاروں طرف نظر ڈال کر اپنے ہم سفر ساتھیوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ درجہ میں کم و بیش کوئی پچیس۲۵ مسافر بھرے ہوئے تھے جن میں دو چار کے علاوہ باقی سب اونگھ رہے تھے۔

ایک کونے میں بڑی بڑی کھچڑی مونچھوں اور پھولے گالوں کے ایک گول مول سیٹھ جی جن کے کپڑوں سے ہینگ اور سونٹھ کی بو آ رہی تھی، اپنا سر بند کھڑکی کے شیشے سے لگائے، منھ کھولے بیٹھے ہی بیٹھے خراٹے لے رہے تھے۔ ان کے برابر آس پاس کی نشستوں پر آڑے ترچھے، ایک کے اوپر ایک کئی بوڑھے مسافر نیم بیداری اور نیم غنودگی کی حالت میں آہستہ آہستہ کھانس رہے تھے۔ بالکل ہمارے متصل ایک دبلا پتلا خوفناک شکل کا لانبا آدمی جو طوطے کی چونچ ایسی ناک پر سنہری عینک لگائے تھا، ہر دوسرے تیسرے منٹ کھڑکی کا شیشہ گرا کر اور سر باہر نکال کر تھوکنے لگتا ہے۔

میں ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال کر ایک کونے سے دوسرے کونے تک دیکھ گیا۔ ہمارے سامنے والی بنچ پر ایک خوش پوش نوجوان بیٹھا سگرٹ پی رہا تھا۔ دھوئیں کے روپہلے پیچ دار لچھے آہستہ آہستہ اوپر بلند ہو کر بجلی کے لیمپ کے پاس ہوا میں تحلیل ہو جاتے۔ میں بڑی دلچسپی سے دھوئیں کے گول حلقوں کو دیکھنے لگا۔ اتنے میں نوجوان کے برابر رکھے ہوئے کپڑوں کے گٹھر کو جسے میں اب تک بقچی سمجھ رہا تھا حرکت ہوئی اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے سترہ اٹھارہ سال کی ایک خوبصورت لڑکی اپنے جسم سے سبز دلائی ہٹا کر ہتھیلیوں سے آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ اس کے بال پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے۔ پپوٹے نیند کے خمار سے بھاری ہو رہے تھے۔ وہ سیاہ کنارے کی ایک سادہ سپید ساری پہنے تھی۔ اس کے ہاتھ کہنیوں تک کھلے ہوئے تھے۔

لڑکی نے نوجوان کو بیٹھے ہوئے دیکھ کر آہستہ سے کہا "بھیا! تم ابھی تک سوئے نہیں" نوجوان نے سگرٹ کا جلا ہوا ٹکڑا نیچے پھینک کر اسے جوتے سے دباتے ہوئے جواب دیا:-

"تم اٹھ کیوں بیٹھیں؟ آرام سے لیٹی رہو۔ مجھے نیند آئے گی تو دیکھا جائے گا۔ جلدی کاہے کی ہے؟" لڑکی آہستہ سے سرک کر

ایک طرف ہورہی۔

"نہیں بھیا۔ بس میں بہت سوئی۔ کب تک سگرٹ کے سہارے جاگو گے۔ اب تم آرام کرو" اور اس نے اپنے بھائی کی طرف ایسی نرم نگاہوں سے دیکھا جس میں محبت بھری التجا تھی۔ نوجوان کمبل تان کر لیٹ رہا۔ تھوڑی دیر میں خرخر کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ آزاد اور آرشید نیند کے غلبے سے چھت کی طرف منھ کئے جھوم رہے تھے۔ درجے میں سونے والے مسافروں کے خراٹوں اور بڈھوں کے کبھی کبھی کھانسنے کی آوازوں کے علاوہ بالکل خاموشی تھی۔ لمبی ناک والا طویل القامت عقاب بھی تھوکتے تھوکتے اونگھ گیا تھا۔ کبھی کبھی پٹری کے اونچے نیچے ہونے کی وجہ سے گاڑی ایک زرا سی جھٹکے کے ساتھ ہل جاتی تو بند کھڑکیوں کے تختوں اور شیشوں سے کھڑکھڑ کی آواز آنے لگتی۔

میں نے اس لڑکی کا چہرہ اور لباس دیکھنا شروع کیا۔ سکا رنگ نہ سانولا تھا نہ گورا۔ شاید گندمی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس قسم کا گندمی رنگ جسے قریب سے دیر تک دیکھتے رہو تو ایسا معلوم ہو کر لحظہ بہ لحظہ کھلتا جاتا ہے۔ بالوں کا رنگ آنکھوں کی طرح بالکل سیاہ تھا۔ مانگ کچھ بنی ہوئی تھی کچھ بگڑی ہوئی۔ بالوں کا ایک باریک گچھا اپنی جگہ سے علیحدہ ہوکر صاف وشفاف رخساروں پر آپڑا تھا۔ وہ موزہ نہیں پہنے ہوئے تھی اس کے نازک پیروں میں سیاہ وارنش کا ایک خوبصورت پمپ تھا۔ جاڑوں کی خنک ہوا سے پتلے پتلے ہونٹوں پر گلابی پپڑیاں جمی ہوئی تھیں جنہیں تر کرنے کیلئے وہ ان پر بار بار اپنی سرخ زبان پھیرتی تھی۔ ماتھے پر سیندور کا یا خدا جانے کس چیز کا لال ٹیکا تھا۔ ناک میں فیروزی رنگ کی ایک چھوٹی سی خوشنما کیل تھی۔ اس کی گردن کی جلد کی تہ سے ہلکے نیلے رنگ کے ڈورے جھلک رہے تھے۔

میں اسے غور سے دیکھ رہا تھا کہ اس کی لانبی پلکوں کو جنبش ہوئی اور اسکی امرت بھری نگاہیں اوپر اٹھیں۔ اس نے دیکھ لیا کہ میں آنکھیں پھاڑے اس کی طرف دیکھ رہا ہوں۔ میں سمجھا میری نگاہوں کے بار سے وہ لجا جائے گی اور آنکھیں نیچی کرکے اپنا جسم اس طرح سمیٹ لے گی جیسے ہوا کے تیز جھونکے سے نرم گھانس بل کھاکر مڑ جاتی ہے۔ اس نے ایسا نہیں کیا۔ بغیر جھجکے، بغیر شرمائے اس نے اپنی باریک انگلیوں سے دلائی کا کنارہ پکڑ کر اسے اپنے الجھے ہوئے بالوں پر ڈال لیا اور پھر ان ننھے ننھے پردار کیڑوں کو دیکھنے لگی جو بجلی کے لیمپ کے گرد چکر کاٹ رہے تھے۔

میں نے خیال کیا یہ نادان الھڑ لڑکی ابھی اسقدر بھولی اور ناتجربہ کار ہے کہ اسے حریص نگاہوں سے جھجکنا بھی نہیں آتا۔ یہ ابھی دنیا کی گھناؤنی مکاریوں سے واقف نہیں اور انسانی چالوں سے بالکل اسی طرح بے خبر ہے جیسے کسی غیر آباد جزیرے کی جنگلی نیل گائے جسنے کبھی کسی انسان کی صورت نہ دیکھی ہو اور جو چونک کر بھاگ جانے کے بجائے بے دھڑک آدمی کے قریب آکر کھڑی ہو جائے۔ میرا دل اس لڑکی کی ہمدردی میں پسیجنے لگا اور سانس میں دلسوزی کی گرمی پیدا ہوگئی۔

ایسی معصوم ایسی پاکیزہ دیوی کا بھائی ہونا بھی دنیا کی کتنی بڑی نعمت ہے۔ یہ نوجوان کسقدر خوش قسمت ہے جسے ایسی پیاری بہن کی بے لوث محبت حاصل ہے۔ دنیا کی تمام بے شمار دولتیں، تمام بیش بہا خزانے ایک طرف اور اس بھولی بھالی فرشتہ خصلت لڑکی کی محض ایک محبت بھری نگاہ ایک طرف۔ یہ سوچتے سوچتے میرے دل میں ایک عجیب خواہش پیدا ہوئی۔

اس نوجوان کے بجائے کاش میں اس بھولی لڑکی کا بھائی ہوتا۔ اسی طرح اپنی بہن کے ساتھ میں سردیوں کی ایک برفانی رات میں دور و دراز کا سفر کرتا۔ وہ اونگھنے لگتی تو میں اسے اپنے برابر ملائم اور گرم کمبلوں میں لپیٹ کر محبت سے سلا دیتا۔ وہ سوتی رہتی۔ میں اس کے قریب بیٹھا ہوا سگرٹ پیتا رہتا۔ دو تین گھنٹے کے بعد وہ سونے سے اٹھ بیٹھتی اور مجھے جاگتا ہوا دیکھ کر برہم بھرے لہجے میں کہتی۔ "بھیا کب تک سگرٹ کے سہارے جاگو گے۔ اب آرام کرو۔"

سلسلۂ خیال آگے بڑھتا جاتا تھا۔ بے شک اس لڑکی کا بھائی ہونا بہت بڑی نعمت ہے۔ لیکن بہن کی محبت محدود اور یک رخی ہوتی ہے۔ وہ صرف بہن بن کر اپنے بھائی سے محبت کر سکتی ہے۔ اسکی محبت میں وسعت اور لوچ بالکل نہیں۔ ہاں ایک رشتہ البتہ اس قسم کا ہے جو اپنے پھیلاؤ کے لحاظ سے دوسرے تمام رشتوں پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اس رشتہ کی محبت انسان کی زندگی کو اس طرح گھیر لیتی ہے جیسے کسی ظرف کے خلاؤں میں ہوا بھر جائے۔ صرف یہی محبت ایسی ہے جو سیل رواں کی طرح آزاد اور سمندر کی طرح بے پایاں ہے۔ یہ خیال کر کے میں نے دوبارہ اس لڑکی پر نظر ڈالی۔ مجھے یہ بتا دینے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کہ اب کی میں نے بالکل دوسری حیثیت سے اسے دیکھا۔ وہ اپنے داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے بائیں ہاتھ کی چوڑیوں کو آہستہ آہستہ پھرا رہی تھی۔ اس کی کہنیوں تک عریاں باہیں رضائی سے باہر تھیں۔ نگاہوں کا رخ اوپر کی اوس بنچ کی جانب تھا جہاں اسباب رکھا جاتا ہے۔ لیکن آنکھوں میں محویت کی ایسی جھلک تھی گویا وہ بند کھڑکیوں کے اس پار دور، میلوں دور کسی دھندلی چیز کو غور سے دیکھنے میں منہمک ہے۔

میں نے پیچھے کھسک کر لکڑی کی دیوار کا سہارا لے لیا تاکہ بالائی بنچ کا سایہ میرے چہرے کو تاریکی میں چھپا لے۔ یہ میں نے اس خیال سے کیا کہ لڑکی کے بیساختہ پن میں مخل ہوئے بغیر میں بے دھڑک اُسے دیکھتا رہوں۔

میں سوچنے لگا اس شخص کی مسرت کا اندازہ کون کر سکتا ہے جس کے دامن مراد میں یہ بے بہا موتی ٹانکا جانیوالا ہے۔ یہ خیال کر کے مجھے پیشتر سے زیادہ کامل طور پر یقین ہونے لگا کہ بیوی کا رتبہ ہر حیثیت سے زیادہ بلند ہے۔ بہن محض بہن ہے۔ لیکن بیوی ایک ہی وقت میں بہن بھی ہے، بیٹی بھی اور ماں بھی۔ کبھی وہ ایک فرمانبردار بیٹی کیطرح اپنے شوہر کی خدمت کرتی ہے۔ کبھی اس کے سینے میں مادرانہ محبت کی لہریں اٹھنے لگتی ہیں، اور کبھی وہ ایک جاں نثار بہن کیطرح دکھ درد میں شوہر کا غم اپنے سر لیلیتی ہے۔ اسی طرح ان دونوں کی محبت میں بھی فرق ہے۔ بہن کی محبت ایسی ہے جیسے لوبان کی خوشبو، جسے سونگھ کر دماغ میں تقدس اور پاکیزگی کی موجیں پھیل جاتی ہیں۔ ایسی خوشبو جو ارد گرد کی تمام فضا کو روحانیت کی شمیم سے معطر کر دیتی ہے۔ بیوی کی محبت بیلے کے ادھ کھلے تازہ پھولوں کی خوشبو ہے۔ جو دل کو بھی متاثر کرتی ہے دماغ کو بھی اور حواس کو بھی۔ جسکی عطریت روحانی جذبات کیساتھ ساتھ مادی حسیات کو بھی آہستہ سے چھیڑ دیتی ہے۔ لیکن اس لطافت سے کہ مجموعی اثر میں سے نہ ہم مادی تاثرات کا نمایاں طور پر امتیاز کر سکتے ہیں نہ روحانی تاثرات کا۔

خدا جانے کیوں، اسی ایک لمحہ میں مجھے اپنی زندگی بہت بے مزہ نظر آنے لگی۔ سال بھر تک مسلسل وہی ایک پروگرام ایک سے دن۔

ایک سی راتیں۔ صبح اٹھ کر جلے ہوئے توس اور ٹھنڈی چائے کا ناشتہ۔ ۸ بجے کتابیں لیکر کلاس چلے جانا۔ وہاں سے ۱ بجے تھکے ماندے نڈھال واپس آکر کبھی کمرے ہی پر اور کبھی ڈائننگ ہال میں کچا پکا کھانا زہر مار کرنا۔ شام کو کچھ دور ہوا خوری، یا ٹینس کا ایک آدھ سٹ۔ رات کو کالج کے مست بے فکروں کے بے معنی قہقہوں کی گونج۔ وہی یکسانیت، وہی تواتر۔ یا خدا یہ زندگی ہے یا مستقل عذاب! میں تعجب کرنے لگا کہ اس مہمل زندگی کو اب تک میں خواہ مخواہ کیوں دلچسپ سمجھتا رہا۔ مجھے ان لوگوں پر غصہ آ رہا تھا جو علیگڈھ کالج کی زندگی کو آکسفورڈ کا نمونہ کہتے ہیں اور ہر جگہ علیگڈھ کی خوبیوں کے گیت گاتے پھرتے ہیں۔ میں نے خیال کیا کہ یہ شہر بھی کوئی شہر ہے نہ کوئی پر فضا پارک، نہ تھیٹر نہ سینما۔ بہت ہوا تو سال میں ایک مرتبہ کانووکیشن کا کوئی بڑا جلسہ ہو گیا۔ یا کہیں باہر سے کرکٹ کی کوئی ٹیم آگئی۔ یا کسی مشہور لیڈر کی یونین کلب میں تقریر ہو گئی۔ اور مزہ تو یہ ہے کہ یہی وہ گونا گوں دلچسپیاں ہیں جن میں ہندوستان بھر میں جہاں تہاں آسمان پر چڑھایا جاتا ہے۔ کل علیگڈھ میں پنجاہ سالہ جوبلی کا وہ عظیم الشان جلسہ ہونیوالا ہے جس کے متعلق مسلسل تقریباً دس مہینہ سے ملک کے اخباروں میں غل مچ رہا تھا۔ مگر اس میں بھی کیا ہوگا؟ .... خیمے اور شامیانے استادہ کئے جائیں گے، پنڈال آراستہ ہونگے، پھاٹک پر موٹے موٹے حرفوں میں "ویل کم" لکھا ہوگا۔ رضا کاروں کی جماعتیں مختلف مقامات پر متعین ہوں گی جوبلی کے میدان میں ڈاکٹر ضیاء الدین ہر طرف بوکھلائے ہوئے پھرتے نظر آئیں گے۔ دھواں دھار تقریریں ہوں گی بڑے بڑے قومی رہنما سٹیج پر ہاتھ ہلا ہلا کر بکھر دیں گے اور یونیورسٹی فنڈ کے لئے چندے کی اپیل پر اجلاس ختم ہو جائے گا۔ چلئے بس، اس کے بعد کیا ہوگا؟ اسکے بعد:۔

پھر وہی زندگی ہماری ہے

کا وظیفہ ہوگا اور خشک بے نمک طالبعلمانہ حیات کی پھٹکار! کہیں ان ہنگاموں سے زندگی کی دلچسپیوں میں کوئی اضافہ ہوتا ہے؟ جن جلسوں کا مقصد ہی محض تجارت ہو وہ کیا خاک انسانی حیات کیلئے سرور و شادمانی کا باعث ہو سکتے ہیں! خصوصاً ایک امنگ بھرے نوجوان کے لئے ان چیزوں میں کیا لطف؟!

میں نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے سوچا کہ حکماء کا یہ قول لفظ بہ لفظ صحیح ہے کہ انسان کی زندگی شادی کے بغیر کبھی مکمل نہیں ہو سکتی۔ بے شک بے شک۔ میری تمام افسردگی اور بے دلی کا علاج شادی ہے۔ میں بھی کیسا بے وقوف ہوں۔ یہ خیال اب تک ذہن ہی میں نہیں آیا تھا۔ ایک سلجھے ہوئے دماغ کے تعلیمیافتہ نوجوانوں کے لئے ایک خوب رو اور خوش طینت لڑکی جو صحیح معنوں میں محبت کرنے والی بیوی ہو کس قدر لازمی چیز ہے .... ایسی ہی خوب رو اور خوش طینت جیسی یہ لڑکی ہے!!

اس لڑکی کا خیال آتے ہی میرا چہرہ کسی موہوم روشنی سے دمک اٹھا اور سینے میں ہلکی ہلکی گدگدی ہونے لگی۔ میں نے پھر ڈرتے ڈرتے اس لڑکی پر نظر ڈالی۔ میری نگاہیں اس کے ریشم ایسے چمکیلے بالوں پر سے ہوتی ہوئی اس کے ماتھے کے سرخ ٹیکے پر جم گئیں۔ میں غور سے ٹیکے کو دیکھتا رہا، بہت دیر تک دیکھتا رہا، ٹیکے میں کوئی خاص بات نہ تھی چھوٹی دونی کے برابر ایک گول چمکدار سرخ ٹیکا۔ لیکن اسے دیکھتے ہی دیکھتے میرے تمام ولولے سرد پڑ گئے، امید کے بادل دھندلے ہونے لگے اور میرا دل اس طرح بیٹھنے لگا جیسے عنقریب معدے میں اتر جائے گا۔

ایک ہی انداز سے بیٹھے بیٹھے میں تھک گیا تھا۔ میں نے پہلو بدلتے ہوئے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھا تو وہ آہستہ آہستہ دھڑک رہا تھا۔ مجھے اپنی حماقت پر خود ہی ہنسی آنے لگی۔ خواہ مخواہ ایک اجنبی لڑکی کے لئے اپنے دل کو ہلکان کرنا گدھا پن نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ بیچاری خدا جانے دلّی جا رہی ہے! کہاں! ایسی ملاقات تو خواب کی ملاقات کی طرح حبابی اور بے نتیجہ ہے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے میں علیگڈھ کا اسٹیشن آجائے گا۔ میں وہاں اتر پڑوں گا۔ چار پانچ روز تک جوبلی کے ہنگاموں میں گم رہوں گا پھر کتابوں میں سر کھپانا پڑے گا۔ کہاں میں اور کہاں یہ معصوم دیوی!!

جھوٹ کیوں بولوں، تھوڑی دیر کے لئے میں سوچنے لگا کہ یہ جو کسی ایک مذہب پر لوگ مرتے دم تک ڈٹے رہتے ہیں یہ محض ڈھکوسلا ہی ڈھکوسلا ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ شرافت اور نیک چلنی سے زندگی بسر کر دے۔ بس، ہمیں اس سے کیا غرض کہ یہ بھلا آدمی عیسائی ہے یا یہودی۔ اب فرض کیجئے ایک سمجھدار پڑھا لکھا مسلمان اپنی خوشی سے ہندو ہو جائے تو اس میں ہرج ہی کیا ہے، آخر ہندو لوگ بھی تو آدمی ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے۔ خواہ وہ روحانی آزادی ہو، خواہ جسمانی خواہ مذہبی۔ اچھا اسے جانے دیجئے۔ یہ جو عجیب غریب قانون تراشے گئے ہیں کہ فلاں مذہب کے لوگ صرف فلاں مذہب کے لوگوں سے شادی کر سکتے ہیں یہ بھی کتنی مہمل اور لغو بات ہے۔ میرے نزدیک تو یہ رکاوٹ سراسر ظلم ہے، ایسا ظلم جسے کھینچ تان کر مذہبی اصول کے حدود میں گھسیٹ لیا گیا ہو .... یہ خیال کرتے کرتے مجھے ہندو مسلمانوں کی موجودہ خانہ جنگیوں پر ایسا شدید صدمہ ہونے لگا، جیسے کسی نے تان کر دل پر زور سے گھونسہ رسید کر دیا ہے۔ ان جھگڑوں سے میرا دل ہمیشہ دکھتا تھا لیکن ایمان کی بات یہ ہے کہ جتنا رنج مجھے اس وقت ہوا اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

مجھے تعجب تھا کہ اس لڑکی کی نیند کہاں غائب ہو گئی ہے۔ میرے اور اس کے علاوہ درجے کے تمام لوگ بے خبر تھے۔ آزاد اور رشید بھی سانپ کی طرح گنڈلی مارے ایک دوسرے پر پڑے ہوئے تھے۔ تیز روشنی میں لڑکی کے کانوں کے آویزے اس طرح چمک رہے تھے جیسے بجلی کے چھوٹے چھوٹے قمقمے۔ شاید رات کے وقت دیر تک جاگنے کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں ہلکا ہلکا گلابی پن آگیا تھا۔ چہرہ کچھ بھاری بھاری سا ہو رہا تھا۔

"اُنہہ ہوگا بھی، نہیں سوتی ہے تو میری بلا سے مجھے کیا .... آخر مجھے کیا خبط ہوا ہے کہ خواہ مخواہ جاگ رہا ہوں۔ کب تک بیٹھا رہوں گا۔ اس کے علاوہ سب کو غافل پا کر کسی شریف نوجوان لڑکی کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس طرح بے حیائی سے گھورنا کتنا بڑا کمینہ پن ہے"۔

یہ سوچتے ہی میں نے اپنے جسم کے چاروں طرف اچھی طرح کمبل لپیٹ کر اس کی تہوں میں اپنا منہ چھپا لیا۔ ایک جماہی لینے کے بعد اپنی بے چارگی کا خیال کر کے میں دو چار ٹھنڈی سانسیں بھرنے ہی والا تھا کہ یکایک کمپارٹمنٹ کے ایک کونے سے پھٹے ہوئے بانس کی سی نہایت کرخت آواز بلند ہوئی۔

"اندھے ہو نرے؟ آنکھیں نہیں ہیں کیا ...... اب بکس کے اندر کی چیزیں ٹوٹی ہوں گی کہ بچ گئی

ہوں گی؟ - بدتمیز کہیں کے !!"

میں نے بوکھلا کر منہ پر سے کمبل ہٹا دیا۔ لڑکی کا بھائی جس کی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی چمڑے کے ایک پرانے بکس کے قریب کھڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر کھسیانے پن کی جھلک تھی۔ اسکے مقابل کی بنچ پر ایک موٹا تازہ بدرو آدمی جو صورت سے کوئی دولتمند تاجر معلوم ہوتا تھا، ایک کہنی کے سہارے چھینٹ کے خوش رنگ لحاف سے گردن تک نیا خوفناک چہرہ نکالے گرج رہا تھا۔

"گاڑی بھر راستہ پڑا ہے۔ مگر سوجھتا تھوڑی ہے . . . . . . نیا بکس لے کے ستیاناس کر دیا . . . . . . بے شرم کہ کوڑی کوڑی دام بھروالوں؟"

سوداگر صاحب کا چہرہ انکی داڑھی سے بھی زیادہ سیاہ تھا۔ موٹے موٹے ہونٹ آگے کی طرف لٹکے ہوئے تھے۔ بدصورت چہرہ پر ایک بھدی پچکی ہوئی ناک اس طرح رکھی تھی جیسے سانپ کے ڈر سے کوئی پھولا ہوا مینڈک دبک کر بیٹھ جاتا ہے۔

نوجوان نے منمناتی ہوئی آواز میں زیر لب معذرت خواہی کے چند الفاظ کہے اور نیچے ہونٹ میں دب کر رہ گئے۔

"بس بس، چپ رہ۔ ایک تو اتنا بڑا نقصان کر دیا۔ اوپر سے فوراً معذرت خواہی کی ٹرٹر لگائی ہے۔ پڑا آیا ہے وہاں سے فیشن ایبل کی دم بن کے"

آخری فقرہ نوجوان کے لباس کے متعلق تھا۔ وہ دھوتی کرتہ کے بجائے بدقسمتی سے نیلے بانات کا کوٹ اور فلالین کا پتلون پہنے تھا۔

مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں اٹھ کر قریب آگیا۔

"جانے بھی دیجئے۔ بیچارے نے کوئی جان بوجھ کے تھوڑی نقصان کیا۔ اور نقصان ہی کیا کیا۔ ابھی تو آپ نے بکس کھول کر دیکھا تک نہیں، بیکار بات کا بتنگڑ بنانے سے کیا فائدہ، درگذر کیجئے"

"واہ صاحب واہ، یہ بھی اچھی کہی کہ درگذر کیجئے ابھی صریحاً نیا بکس نیچے رکھا ہوا ہے۔ نہ ہو ابھی ہو تو دیکھ لے۔ مگر صاحبزادے ہیں کہ جوانی کی ترنگ میں اسی پر سے بوٹ رکھتے ہوئے کھٹ کھٹ چلے جا رہے ہیں . . . . . . یہ بھی کوئی شرافت ہے"

مجھ میں ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ خواہ مخواہ کسی کو اپنے سے کمزور کو دبائے ہوئے دیکھتا ہوں تو ضرور غصہ آجاتا ہے۔ میرے مزاج کا پارہ چڑھنے لگا۔ نوجوان نے مجھے اپنی حمایت کرتے پایا تو اس کی بھی ڈھارس بندھ گئی۔ جی کڑا کر کے بول اٹھا۔

"کہہ تو دیا کہ بھولے سے پاؤں پڑ گیا۔ تم بھی عجیب آدمی معلوم ہوتے ہو کہ اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آتی"

اس بات پر سوداگر آپے سے باہر ہو گیا۔ اکبارگی لحاف جھلا کر دور پھینک دیا اور بپھر کر بیٹھ گیا:۔

"مجھے کوئی ایسا ویسا سمجھا ہے کیا؟ زیادہ بک بک کر دئے تو گردن میں ہاتھ دے کر کھڑکی کے باہر لڑھکا دوں گا، ساری شیخی کر کری ہو جائے گی . . . . . . حرام زادہ کہیں کا، پاجی!"

میرے تمام جسم میں آگ لگ گئی، میں پوری طاقت سے چلا اٹھا:۔

"اے تم بھی کسی الٹی سیدھی باتیں کر رہے ہو، خدا جانے کہاں کا شہرا ہوا سوٹ کیس ہے اس کے لئے اس طرح ہاتھ دھو کر

پیچھے پڑ گئے ہو، گھنٹہ بھر سے کان کھا رہے ہو کہ "کیا بکس خراب ہو گیا، کیا بکس خراب ہو گیا" ...... شرم تو نہیں آتی؟"

"اجی وہ کیا ہوا، آپ کو کیا پڑی ہے جو دخل در معقولات کرنے کھڑے ہو گئے؟ جھگڑا ہو رہا ہے مجھ میں ان میں، آپ بے کار بیچ میں کود کے پڑتے ہیں۔ جائیے بیٹھئے، اپنا کام کیجئے کوئی خدائی فوجدار ہیں آپ؟"

اس چیاؤں پیاؤں میں بہت سے مسافروں کی آنکھ کھل گئی۔ کچھ لوگ سرک سرک کر قریب آ گئے۔ کچھ دور ہی سے بیٹھے تماشہ دیکھتے رہے۔ آزاد اور رشید بھی میرے پیچھے آ کر کھڑے ہو گئے۔

مجھے تاجر کے اس لہجہ پر جو بہت تاؤ آیا۔ غصہ کی وجہ سے میرا سر چکرانے لگا۔ میں نے آستین چڑھا کر سینہ تان لیا اور قریب تھا کہ ایک ہی گھونسے میں اس منہ پھٹ سوداگر کی پچکی ہوئی ناک کو درست کر دوں، بیچ اور بچاؤ میں آزاد اور رشید "جانے دو جانے دو" کہہ کر مجھ سے لپٹ گئے۔ ادھر تمام مسافروں نے ہم زبان ہو کر تاجر کو برا بھلا کہنا شروع کیا۔ معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

ہم لوگ پھر اپنی جگہ جا کر بیٹھ گئے اور لگے وہیں سے تاجر پر فقرے چست کرنے۔ دو چار منچلے مسافروں نے بھی ہمارا ساتھ دیا۔ کسی نے انکی صورت کا مذاق اڑایا۔ کوئی ان کے آبنوسی رنگ پر پھبتیاں کسنے لگا۔ پہلے تو تھوڑی دیر تاجر لال لال آنکھیں نکالے گھورتا رہا لیکن جب فوج کی فوج کو اپنے خلاف ہتھیار بند پایا تو آخر ٹھنڈا پڑ گیا۔

لڑکی کی یہ حالت تھی کہ ہم لوگوں کی ہر پھبتی پر کھلکھلا کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ ہنسی کے مارے بنے بھائی کی پیٹھ پر لوٹی جاتی تھی۔ ہنسنے میں اس کے موتی ایسے دانت کھلتے تو مجھے پہلی مرتبہ اندازہ ہوا کہ ہنس ہنس کر بجلی گرانے کا محاورہ کیوں ایجاد ہوا ہے۔ ہم لوگ اسے ہنستا دیکھ کر ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے ایک سے ایک بہتر پھبتیاں چست کرتے۔ میرے لئے یہ خوشی کچھ کم نہ تھی کہ وہ اس تماشہ سے لطف اٹھا رہی ہے۔

جب پھبتیوں اور فقروں کا ذخیرہ ختم ہو گیا تو آپس میں یہ صلاح ہوئی کہ تاجر صاحب کو جگہ کی تنگی کے باوجود پاؤں پھیلا کر اسقدر اطمینان سے لیٹے رہنے کا کوئی حق نہیں ہے لہذا فوراً انہیں اٹھا کر بٹھا دینا چاہئے۔ پہلے تو نہایت شریفانہ لہجہ میں سہولت سے ہم لوگوں نے درخواست کی کہ "اٹھ کر بیٹھ جائیے" لیکن جب دیکھا کہ یہ دیو کسی طرح ٹس سے مس بھی نہیں ہوتا تو ایک ساتھ ان پر حملہ بول دیا گیا۔ ایک نے ہاتھ پکڑا، ایک نے ٹانگ لی۔ ایک نے لحاف گھسیٹ کر دوسری طرف ڈال دیا اور سوداگر صاحب کو

پا بدستِ دگرے دست بدستِ دگرے

گٹھری کی طرح اٹھا کر دیوار سے لگا کے ایک کونے میں بٹھا دیا۔

کوئی دوسرا موقع ہوتا تو سوداگر کے تمام پاجی پن کے باوجود دل ہرگز گوارا نہ کرتا کہ اسے اس بری طرح پریشان کیا جائے۔ لیکن اسوقت اس کو جی کھول کر ستانے ہی میں بڑا مزہ مل رہا تھا۔ بلکہ مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا ہم لوگ کوئی بہت بڑا کار ثواب انجام دے رہے ہیں۔ میں فطرتاً رحمدل ہوں۔ لیکن اسوقت میں اس لڑکی کی خوشنودی کیلئے سب کچھ کرنے کو تیار تھا۔

اسی ہڑبونگ میں علیگڈھ کا اسٹیشن قریب آگیا۔ گاڑی کی رفتار سست پڑ گئی اور میرا دل یہ خیال کرکے ڈوبنے لگا کہ دو تین منٹ میں یہ دلچسپ ڈرامہ ختم ہو جائے گا۔

میں نے بہت ہمت کر کے لڑکی کے بھائی سے پوچھا۔

"آپ کہاں اتریں گے"

"میں-؟ میں چندوسی جا رہا ہوں ... ... علیگڈھ میں دوسری گاڑی بدلوں گا"

اس کے بعد اس نے رک رک کر کہا "آپ کا بہت بہت شکریہ ..... آپ نہ ہوتے تو ...... تو مجھے بہت پریشانی اٹھانا پڑتی، آپ علیگڈھ کالج میں پڑھتے ہیں نا ؟"

"جی ہاں - میں سمجھتا ہوں آپ بھی دو چار روز کے لئے علیگڈھ میں اتر پڑیے۔ ہمارے کالج کی جوبلی بڑے دھوم سے منائی جا رہی ہے دور دور سے لوگ شریک ہونے آرہے ہیں۔ ذرا لطف ہی رہے گا۔"

مجھے خیال پڑتا ہے میرے اس فقرہ پر لڑکی نے اپنے بھائی کی طرف آنکھیں اٹھا کر دیکھا تو اس کے چہرے کے خطوط سے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ کہنا چاہتی ہے" ہاں بھیا۔ ٹھہر جاؤ نا۔ ہرج ہی کیا ہے"

لیکن یہ محض میرا وہم ہی وہم تھا۔ وہ کچھ نہ بولی۔ اس کے ہونٹ تک نہ ہلے۔ اس کا بھائی کہنے لگا۔

"میں اکیلا ہوتا تو ضرور ٹھہر جاتا۔ آپ ایسے دلچسپ لوگوں کی صحبت نصیب کہاں ہوتی ہے ؟ لیکن میرے ساتھ میری بہن بھی ہے، ...... میں آپ لوگوں کا بہت شکر گذار ہوں!"

لڑکی اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اٹھائے مجھ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے صاف ٹپک رہا تھا:۔

"اور میں بھی آپ کی بہت ممنون ہوں"

اتنے میں اسٹیشن آگیا۔ گاڑی گھڑ گھڑ کرتی ہوئی ٹھہر گئی۔ میں نے قلی پر اسباب رکھوایا۔ لڑکی اور اسکے بھائی اتر کر پلیٹ فارم پر کھڑے ہوگئے تھے۔ میں نے "خدا حافظ" کہتے ہوئے نوجوان کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا تو میں نے محسوس کیا کہ اسکا ہاتھ بہت نرم ہے میں دل ہی دل میں یہ سوچتا ہوا کہ بہن کا ہاتھ اس سے بھی کہیں زیادہ نرم ہوگا بھاری قدموں سے آزاد اور رشید کے پیچھے پیچھے باہر چلا گیا۔

ہم لوگ کمرہ پر پہونچے تو ۲ بج چکے تھے۔ میری طبیعت بہت نڈھال ہو رہی تھی۔ جی چاہتا تھا اُلٹے پیر پھر اسٹیشن واپس چلا جاؤں اور کم از کم اس وقت تک وہاں بیٹھا رہوں جب تک چندوسی کی گاڑی روانہ ہو جائے۔ چندوسی کی گاڑی صبح چار بجے چھوٹتی تھی۔ ابھی پورے دو گھنٹہ باقی تھے۔ لیکن میں نے سوچا واپس جا کر اپنی آنکھوں سے گاڑی کو اوجھل ہوتے ہوئے دیکھوں گا تو اور زیادہ تکلیف ہوگی۔ آخر دل پر پتھر رکھ لیا۔ روشنی گل کر کے اپنے بستر میں گھس گیا اور کوشش کرنے لگا کہ کسی طرح جلد نیند آجائے تو یہ تمام تکلیف دہ خیالات دھل جائیں۔

کوشش کے باوجود میں کسی طرح اپنی توجہ آج کے واقعات سے نہ ہٹا سکا۔ بار بار لڑکی کی صورت آنکھوں کے نیچے پھر جاتی تھی۔ اسکی تمام چیزوں میں دو چیزیں مجھے سب سے زیادہ یاد آرہی تھیں۔ ایک تو اس کے ماتھے کا گول سرخ ٹیکا۔ دوسرے اس کے چھوٹے چھوٹے دانتوں کی چمکدار لڑی۔ مجھے اس کے تصور میں لطف بھی آرہا تھا اور تکلیف بھی ہو رہی تھی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی آہستہ آہستہ میرے سینے میں

کانٹے چبھو رہا ہو۔ اسی ادھیڑبن میں بہت دیر ہوگئی۔ رفتہ رفتہ میرے پپوٹے بھاری ہونے لگے۔ تخیلی پیکر بتدریج دھندلے پڑنے لگے اور مجھے نیند آگئی۔

میں سمجھتا ہوں میری آنکھ لگے بمشکل دس پندرہ منٹ گذرے ہونگے کہ مجھے محسوس ہوا کوئی میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ رہا ہے۔ میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ کمرہ میں اندھیرا پڑا ہوا تھا۔ میں نے آنکھیں ملکر دیکھا تو میری چارپائی کے قریب ریل والی لڑکی کا بھائی کھڑا ہوا تھا اندھیرے میں نہ اسکی صورت اچھی طرح نظر آتی تھی نہ کپڑوں کا رنگ نظر آتا تھا۔ لیکن اس کی آواز صاف پہچانی جاتی تھی۔ وہ دبی زبان سے آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا:۔

"بڑی مشکل میں آپکا کمرہ ملا ہے۔ جلدی اٹھئے گاڑی کا وقت بہت تنگ ہے...... آپ تو اس طرح غافل پڑے سو رہے ہیں جیسے آپکو کہیں جانا ہی نہیں ہے۔ آپ کو اسٹیشن واپس آنے میں دیر لگی تو میں گھبرا کر آپکو لینے چلا آیا۔ میں نہ آتا تو آپ سوتے ہی رہ جاتے"۔

"بڑی مشکل میں کمرہ ملا ہے"..... "اسٹیشن واپس آنے میں دیر لگی"...... "آپ کو لینے چلا آیا" میں حیران تھا کہ خدایا آخر یہ کہہ کیا رہا ہے۔ مجھے اس بات پر بھی تعجب ہو رہا تھا کہ بند کمرہ میں یہ کس طرح گھس آیا۔ لیکن مجھے فوراً یاد آگیا کہ سوتے وقت میں اندر سے دروازہ بند کرنا بھول گیا تھا۔

پھر مجھے یہ بھی خیال آگیا کہ میں نے اس کے ساتھ چندوسی چلنے کا وعدہ کرلیا تھا اور اس سے یہ کہہ آیا تھا کہ میں آزاد اور رشید کو بورڈنگ پہونچا کر ابھی واپس آتا ہوں۔ یہاں آکر اپنا وعدہ بھول گیا۔ میرا دل اس غیر متوقع خوشی سے دھڑکنے لگا۔ میں اچھل کر چارپائی سے نیچے کود پڑا۔ اندھیرے میں ٹٹول کے بغیر موزوں کے جلدی سے جوتا ڈانٹ لیا۔ کھونٹی پر سے شیروانی گھسیٹ کر گلے میں اٹکالی۔ اور ہاتھ میں ٹوپی لیکر نوجوان کا ہاتھ پکڑتے آہستہ آہستہ پنجوں کے بل کمرہ کے باہر نکل گیا۔

میں نے یہ احتیاط اس لئے کی کہ میں چاہتا تھا کہ آزاد اور رشید کو اس واقعہ کی ہوا نہ لگے۔ مجھے یقین تھا کہ اسوقت ذرا بھی کسی کی آنکھ کھل گئی تو پھر میں قیامت تک چندوسی نہ جاسکوں گا۔ صبح اٹھ کر یہ لوگ میرے یکایک غائب ہو جانے پر کتنے حیران ہونگے۔ یونیورسٹی کے کونے کونے میں ڈھونڈتے پھریں گے۔ ایک ایک سے میرا پتہ پوچھیں گے۔ ان مسخروں کے خواب و خیال تک میں یہ بات نہیں آسکتی کہ خود اس دلربا لڑکی کا بھائی آکر مجھے اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ یہ خیال کرکے میں آپ ہی آپ ذرا اور تن کر چلنے لگا۔

پھاٹک کے باہر ایک تانگہ کھڑا ہوا تھا۔ ہم دونوں جست مارکر اس پر بیٹھ گئے۔ راستہ بھر ہم دونوں میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ اسوقت مجھے رہ رہ کے جوبلی کے جلسوں کا خیال آنے لگا۔ پھر باہر سے آنے والے دوستوں کا اور آل انڈیا مشاعرہ کا اور نواب بھوپال کا...... مگر میں نے کہا ہٹاؤ جی، ہوگا بھی، اس قسم کے جلسے تو ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ایسا سنہرا موقع کوئی روز روز تھوڑی ہاتھ آتا ہے۔

سڑک پر ہر طرف اندھیرا گھپ تھا۔ تانگہ کا گھوڑا تک صاف نظر نہیں آتا تھا۔ دونوں طرف درخت اس طرح کھڑے ہوئے تھے جیسے کالے دیو۔ اسٹیشن پہونچکر ہم لوگ اندر داخل ہوئے۔ گیس کی روشنی جو معمولاً بہت تیز ہوتی تھی آج کسی قدر مدھم نظر آرہی تھی۔

پلیٹ فارم پر جو لوگ ادھر ادھر چل پھر رہے تھے انکی صورتیں اچھی طرح نہیں پہچانی جاتی تھیں۔ میں نے خیال کیا جاڑوں کی رات ہے کہرا بہت زور سے گر رہا ہے؛ تب ہی ہر چیز دھندھلی دھندھلی نظر آتی ہے۔

چندوسی کی گاڑی تیار کھڑی تھی۔ گارڈ سبز لالٹین دکھا رہا تھا۔ گھبرائے ہوئے مسافر جلدی جلدی اسطرف سے اسطرف آ جا رہے تھے ہم لوگ کود کر ایک درجہ میں چڑھ گئے اور گاڑی روانہ ہو گئی۔

درجہ میں صرف تین آدمی تھے، میں، لڑکی کا بھائی، اور خود لڑکی جو اوڑھے لپیٹے ایک بنچ پر دراز تھی۔ بیچاری رات بھر جاگتی بھی تو رہی تھی۔ مجھے اسکے منہ ڈھانپ کر سوتے رہنے کا مطلق افسوس نہیں تھا میرا دل مطمئن تھا کہ جب وہ جاگے گی تو میں دل کھولکر اسکی صورت دیکھ سکوں گا۔

راستہ میں اس کے بھائی سے ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر اس نے مجھے ہندی کا ایک اخبار پڑھنے کو دیا اور میں اس اخبار کو اتنی دیر تک پڑھتا رہا کہ چندوسی کا اسٹیشن آگیا۔ نوجوان نے اپنی بہن کو جگا دیا۔ ہم لوگ اسٹیشن سے باہر نکلکر ایک یکہ میں بیٹھ گئے جس میں چھوٹا سا مریل ٹٹو جتا ہوا تھا۔ ان لوگوں کا مکان اسٹیشن سے قریب ہی تھا، تھوڑی دیر میں یکہ ایک دو منزلہ عمارت کے سامنے رک گیا۔ ہم تینوں کھٹ کھٹ کرتے ہوئے زینے پر چڑھ گئے۔ یہ ایک ٹھیٹ مشرقی ساخت کا مکان تھا۔ جس کے سامان آرائش میں کہیں کہیں مغربیت کی خفیف سی جھلک نظر آتی تھی۔ جس کمرے میں ہم لوگ داخل ہوئے اس میں یہاں سے وہاں تک صاف ستھری نیلی دری کا فرش تھا کمرہ کے وسط میں دیوار سے ملا ہوا ایک رنگین اونی قالین بچھا ہوا تھا اس پر ایک سفید براق گاؤ تکیہ، ایک طرف تین چار بیچی بیچی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ دیوار پر چند پرانی مذہبی تصویر کے ساتھ ساتھ دو چار موجودہ زمانہ کی بھی تصویریں آویزاں تھیں۔ دروازوں پر سفید جالی کے پھولدار پردے پڑے ہوئے تھے بحیثیت مجموعی کمرہ میں سادگی اور نفاست تھی۔

میں جاتے ہی دھم سے ایک کرسی پر گر پڑا۔ جیسے کوئی بلا کا تھکا ہوا ہو۔ لڑکی اور اسکا بھائی مجھ سے ذرا ہٹ کر دروازہ میں کھڑے ہو کر آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ شاید میری مہمانداری کے متعلق آپس میں کچھ مشورہ کر رہے ہوں، اتنے میں ایک ادھیڑ عمر کا برہمن جسکے آگے کے دو دانت ٹوٹے ہوئے تھے اپنے برہنہ جسم پر ایک ملگجی بغلبندی ڈالے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کے طرز عمل سے میں نے فوراً تاڑ لیا کہ وہ اس گھر کا کوئی پرانا منہ چڑھا ملازم ہے۔ منہ چڑھے ہونے کا خیال مجھے زیادہ تر اس وجہ سے پیدا ہوا کہ اس نے مجھے دیکھ لینے کے باوجود سلام کے لئے ہاتھ تک نہ اٹھایا، اس نے اپنا بدن کھجا کھجا کر نوجوان سے کہنا شروع کیا:-

"ماتا جی توکل سے ڈپٹی صاحب کی بیٹی کے بیاہ میں گئی ہوئی ہیں...... مجھ سے کہہ گئی تھیں کہ بھیا صبح کی گاڑی سے آئیں تو سیدھے یہیں بھیجدینا، آپکا بھی نیوتا تھا"

"اور رجنی؟ رجنی کے لئے کچھ نہیں کہہ گئیں؟"

"ان کے آنے کا معلوم ہی کسے تھا؟ پہلے چٹھی آئی تھی کہ آئیں گی، پھر لکھا ہولی تک آنے کا کوئی ٹھیک نہیں ...... نا بابو جھوٹ کیوں بولوں، رجنی کے لئے کچھ نہیں کہہ گئیں"

نوجوان نے کسی قدر پریشان ہو کر کہا

"لیکن میں .... میں اس وقت کیسے جا سکتا ہوں! دیکھتے نہیں ہو میرے ساتھ یہ مہمان ہیں۔ آخر ان کو اکیلا تھوڑی چھوڑ سکتا ہوں؟"

لڑکی جوان دونوں کو باتیں کرتا دیکھ کر ابھی تک خاموش کھڑی اپنی ساری کے آنچل کو انگلیوں میں مروڑ رہی تھی، ایکدم بول اٹھی:۔

"بھیا تم اس کی فکر نہ کرو۔ تمہیں جانا ہے تو جاؤ۔ میں ان کی دیکھ بھال کر لوں گی، دونوں میں سے کوئی بھی نہ جائے گا تو ڈپٹی صاحب برا مانیں گے .... ہاں اور آپ کو ہارمونیم بجانا بھی آتا ہے؟"

یہ پہلا سوال تھا جو لڑکی نے مجھ سے دریافت کیا۔ میں سٹ پٹا گیا۔ میرا دل زور زور سے اچھلنے لگا۔ اپنی آواز پر قابو پا کر میں بولا:۔

"جی ہاں کچھ یوں ہی سا ...... بجانا تو کیا جانتا ہوں، یونہی الٹی سیدھی انگلیاں مار لیتا ہوں"

"آپ دیکھتے ہیں کہ ڈپٹی صاحب کے یہاں جانا بہت ضروری ہے" نوجوان عذر خواہی کے لہجہ میں مجھ سے کہنے لگا "میں زیادہ نہیں لگاؤں گا بس یہی کوئی ڈیڑھ گھنٹہ، آپ اطمینان سے شیروانی وغیرہ اتار کر بیٹھئے .... اور دیکھو رجنی وہ ماسٹر موہن کے ریکارڈ بھی ذرا آپکو سنانا، تو سمجھے آپ میں ابھی آتا ہوں گھبرائیے گا نہیں۔ کنبہ برادری کا معاملہ ہے، نہیں تو میں ٹال جاتا"

یہ کہکر نوجوان وہاں سے چلا گیا۔ میں اور لڑکی کمرہ میں تنہا رہ گئے۔ بوڑھا برہمن بھی کام کاج کرنے کے لئے رفو چکر ہو چکا تھا، اپنے کو لڑکی کے ساتھ تنہا پاکر گھبراہٹ کی وجہ سے میری سانس پھولنے لگی، لڑکی مجھ سے کہنے لگی:۔

"تکلیف تو ہوگی۔ ذرا جب تک کوئی چیز ہی سنا دیجئے، دیکھئے وہ سامنے باجہ رکھا ہے"

کمرہ کے ایک کونے میں سیاہ لکڑی کا فولڈنگ ہارمونیم رکھا ہوا تھا۔ اس کے برابر نازک سفید روغن کی کرسی رکھی تھی۔ میں نے موقعہ کو غنیمت جانا، چپکے سے اٹھ کر باجہ کے پاس بیٹھ گیا۔ لڑکی پاؤں سکیڑ کر اور کہنی سے گاؤ تکیہ کا سہارا لیکر قالین پر بیٹھ گئی۔ اسکا انداز نہ بیٹھنے کا تھا نہ لیٹنے کا دونوں کے درمیان سمجھئے۔

اب میرے لئے بڑے نازک موقع کا سامنا تھا۔ میں سوچنے لگا آخر کیا گاؤں اور کیا نہ گاؤں! دل تلملا رہا تھا کہ کوئی ایسی حسب حال موقع کی چیز چھیڑ دوں کہ یہ لڑکی بھی تڑپ کر رہ جائے۔ لیکن وہ موقع کی چیز کیا ہو؟ یہ البتہ ٹیڑھا سوال تھا۔ غزل گانا بالکل بے کار تھا۔ بھلا وہ بیچاری اس سے کیا لطف اٹھائے گی، البتہ کوئی مزے دار ٹھمری یا چلتا ہوا دادرا یاد آ جاتے تو کام چل جائے۔

تیر کی طرح میرے ذہن میں ایک بات آگئی۔ خوشی کی وجہ سے میری سانس رکنے لگی۔ مجھے ایسا داؤں یاد آگیا تھا جو کبھی پٹ نہیں پڑ سکتا تھا۔ میں بہت دیر سے اس چکر میں تھا کہ آخر اس لڑکی کو کس چیز سے تشبیہ دوں۔ لیکن اسوقت یہ معمہ آن واحد میں حل ہو گیا۔ مجھے یاد آگیا کہ کسی ایسی ہی غیر معمولی لڑکی کو ریل کے سفر میں یلدرم نے دیکھ کر "آہو" والا گیت لکھا تھا، کسقدر باموقع! کتنا مناسب حال! بے شک یہ لڑکی بھی بالکل "آہو" ہے، کالی کالی دراز پلکیں۔ سیاہ وحشت بھری آنکھیں۔ لانبی سڈول گردن۔ بس بس آہو سے بہتر اس کے لئے کوئی نام نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس آہو میں اور یلدرم کے آہو میں تھوڑا سا فرق ہے۔ اس میں شوخی اور رمیدگی، بھڑک اور چلبلا پن تھا، میرے آہو میں

معصومیت اور بھولا پن، سکون اور ٹھہراؤ ہے۔

یہ خیال آتے ہی میں نے کرسی کو باجہ کے قریب سرکالیا۔ دونوں پاؤں دھونکنی پر رکھدئے۔ اور انگلیوں سے آہستہ آہستہ پردوں کو چھیڑنے لگا۔ صبح کا وقت تھا۔ میں نے کہا لاؤ اس گیت کو اساوری کے سروں میں گاؤں، مضمون کے لحاظ سے بھی حسب حال رہے گی اور وقت کے لحاظ سے تو با موقع ہے ہی۔ میں کچھ دیر پردوں پر انگلیاں مارتا رہا۔ پھر دھیمی دھیمی آواز میں گانا شروع کیا:-

ماتھے پہ بندی ——— آنکھ میں جادو ——— ہونٹوں کی بجلی ——— گرتی تھی ہرسو
گرتی تھی ہرسو ——— ہونٹوں کی بجلی ——— گرتی تھی ہرسو ——— گرتی تھی ہرسو
ہونٹوں کی بجلی

میں نے رفتہ رفتہ اپنی آواز کو بلند کرنا شروع کیا۔ سوز میرے لہجہ میں اسقدر زیادہ پیدا ہو گیا تھا کہ مجھے خود تعجب ہو رہا تھا۔ اپنی تمام عمر مجھے اسکا اندازہ نہیں ہوا تھا کہ میری آواز میں اس بلا کا درد چھپا ہوا ہے۔ میں نے مزے میں آکر آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں خود نہیں بلکہ کوئی دوسرا شخص مجھ سے دور بیٹھا ہوا گا رہا ہے۔ مجھے اپنی آواز کسی دوسرے کی آواز معلوم ہوتی تھی لیکن نہایت نرم و شیریں، پر اثر اور درد بھری۔ میرا جی بھی اندر ہی اندر امنڈ رہا تھا۔ جیسے کوئی سینہ میں بیٹھا ہوا دل کو پکڑ کر مٹھی سے زور زور سے مروڑ رہا ہو۔ پردوں پر میری انگلیوں کی رفتار تیز ہوتی جاتی تھی، اس کے ساتھ ہی ہر اونچی تان پر مجھکو معلوم ہوتا تھا گویا میں خود اپنی الاپ کے ساتھ اوپر اٹھا جا رہا ہوں۔ میں نے آنکھیں کھول کر کنکھیوں سے لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرہ کا عجیب رنگ ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی مٹی کی بے رنگ مورت بٹھا دی گئی ہو، اس کی ضرورت سے زیادہ کھلی ہوئی آنکھیں میرے چہرہ پر جمی ہوئی تھیں۔ دونوں لب ایک دوسرے سے کسی قدر علیحدہ تھے، اور نگاہوں میں ربودگی کی عجیب و غریب جھلک تھی۔

میں تاڑ گیا کہ اس پر گیت کا اثر ہو رہا ہے۔ اور بری طرح ہو رہا ہے، میری ہمت اور بھی بڑھ گئی میں نے ایک زور کی تان لگائی:-

ایسی بھڑک تھی ——— خلق تھی حیراں ——— رین میں آیا ——— کہاں سے آہو
ماتھے پہ بندی ——— آنکھ میں جادو

آنکھ میں جادو ———

میں پوری طاقت سے جھکا ہوا دھونکنی پر پیر چلا رہا تھا۔ ہارمونیم کے پردے میری انگلیوں کے نیچے کھٹ کھٹ بول رہے تھے۔

لڑکی آہستہ سے اٹھکر میرے پیچھے آکر کھڑی ہوگئی، اور میرے شانے پر ہاتھ رکھکر جلدی سے بولی:-

"بس بس، اب اس سے زیادہ میں نہیں سن سکتی، رہنے بھی دیجئے، باجہ بند کیجئے، مجھے دھڑکن ہونے لگی ..... کیا مار ڈالنے کا ارادہ ہے؟" یہ کہہ کر اس نے زور سے میرا شانہ دبا دیا، میں اپنی کامیابی اور بھی تن گیا۔ لڑکی برابر خوشامد کر رہی تھی۔ میں نے اس کی ایک بھی نہ سنی۔ پردوں پر انگلیاں بھی تیز کر دیں اور دھونکنی پر پیر بھی۔ معلوم نہیں اس وقت مجھ میں کہاں سے اتنی طاقت آگئی تھی، مجھے تعجب تھا کہ دھونکنی پھٹ کیوں نہیں جاتی۔

"ریل میں آیا کہاں سے آہو۔۔۔۔۔۔۔کہاں سے آہو؟ آہو۔ آہو۔۔۔۔۔۔۔۔"

اتنے میں میرے کانوں میں ایک آواز آئی جیسے کوئی کوئیں کی تہہ سے کہہ رہا ہو:۔

"بھئی تم نے بھی نحوست کی حد کر دی، نو بج چکے ہیں اور آپ ابھی تک پڑے اینڈھی رہے ہیں، جلسے میں چلنے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟ چائے بھی پڑے پڑے ٹھنڈی پالا ہو گئی۔"

آنکھیں مل کے دیکھتا ہوں تو آزاد میرا شانہ پکڑ کر زور زور جھنجھوڑ رہا ہے اور کمرہ کے باہر برآمدے میں ہر طرف دھوپ پھیلی ہوئی ہے۔

"اور یہ آپ سوتے میں ہاتھ پیر کیوں اچھال رہے تھے؟ کیا کسی سے پٹہ بازی کا مقابلہ ہو رہا تھا؟"

ذوقی



فلسفۂ مذہب

مذہب اور اخلاق | انسان کی عام عادات و اطوار پر بحث کرنا علم اخلاق کی اجمالی تعریف ہے۔ مگر ایسی صورت میں اخلاق کے وسیع دائرہ میں ایسے مضامین بھی آجائیں گے جنکا تعلق زیادہ تر علم تاریخ علم انسان یا علم انساب سے ہے یعنی مختلف ادوار و زمانہ میں انسان کے گوناگوں معاشرت و تمدن پر تاریخی نقطۂ نگاہ سے نظر ڈالنا ضروری ہو جائیگا۔ اس لئے عام طور سے اخلاقی بحث صرف ان مسائل پر محدود سمجھی جاتی ہے کہ انسان کے اطوار و عادات کن اخلاقی اصول کے تابع ہیں لیکن اگر ہم اخلاق کو صرف اطوار انسانی کا ایک علم سمجھیں تو وہ دو حیثیت سے غلط ہوگا اول تو یہ کہ علم یا تو نظری ہوگا یا عملی۔ نظری حیثیت سے انسانی اعمال کی ایسی تشریح کرنا کہ زمانہ گذشتہ یا موجودہ میں ان پر نیک و بد کا اطلاق کیوں کر ہوا ممکن نہیں عملی حیثیت سے بھی یہ کوئی مفید مقصد پیدا نہیں کرتا۔ کیونکہ ایسی صورت میں ہمارے ضمیر یا ادراک اخلاقی کو ایک ہی وقت میں مجرب اور مجترب بننا پڑیگا، دوسرے یہ کہ اخلاق ایک فلسفہ ہے نہ کہ علم اور فلسفہ کے معنی یہ ہیں کہ جو مسلمات ہمارے خیالات سے پیدا ہوتے ہیں انکی کنہ و فیہ پر بحث کی جائے اخلاق پر بحث کرتے وقت ہمارے سامنے یہ مسلمات مثلاً حقوق، فرائض، ارادۂ انسانی، خیر و شر، خطا وغیرہ سب پہلے سے موجود ہوتے ہیں، اور فلسفۂ اخلاق سوائے اس کے کہ ان مسلمات کو اپنی بحث میں ضبط کرے۔ ایک حد تک اس کی تشریح نہیں کرتا۔

یہ سوال کہ ضمیر انسانی میں کس وقت اور کس دور میں نیک و بد کے تمیز کرنے کی قابلیت پیدا ہوئی۔ وہ بھی اس کے فلسفیانہ بحث سے خارج ہے، اخلاق صرف ایسے مسائل سے بحث کرتا ہے۔ جیسے انسان جب ایک کام کا ارادہ کرتا ہے تو اسکے دل پر خود بخود ایسے سوالات کیوں پیدا ہوتے ہیں، فلاں حالت میں ہمارا فعل عدل و انصاف کے متقاضی ہے یا نہیں یا فلاں شخص کی ناواقفیت سے فلاں کام کرنیکی ذمہ داری اس پر کہاں تک عائد ہوتی ہے، وغیرہ، یا پھر ان اشکال کو پورے طور سے سمجھنے کی کوشش کرنا جس کے بموجب ارادہ کو عمل کی صورت میں لایا جاتا ہے یا ایسے لوگوں کی شخصیت پر کلام کرنا جو عام طور سے اس کے معمول یا موثر ہوتے ہیں یا ان نتائج پر غور کرنا جو ان اعمال سے پیدا ہوں۔

فلاسفۂ متقدمین نے اخلاق کی بحث انسانی علم سے شروع کی ہے۔ اور متاخرین نے "قانون فطرت" سے۔ بقول گروٹیس (Grotius) "قانون فطرت" الہامی یا خدائی قانون کا ایک حصہ ہے جسکا کام انسان کے جذبات فطری کی ترجمانی کرنا ہے اور فطرت انسانی کا یہ خاصہ ہے (جسکی وجہ سے اس کو دوسرے حیوانات سے امتیاز حاصل ہے) کہ وہ اپنے ہمجنس کے ساتھ سلامت روی سے رہنے کا خواہشمند ہو اور اسوجہ سے اسکا چند اصول پر کاربند ہونا ضروری ہے، چنانچہ قانون فطرت ایسا ناقابل تبدیل قانون فطرت ہے کہ خدا کی بھی عادت اس کے تبدیل کرنے کی نہیں ہے (اسکا مقابلہ قرآنی آیت "فلن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا" سے کرو) اور اس کے اصول ویسے ہی

مستحکم ہیں جیسے ریاضی کے اصول۔ گو کہ بعض عواقب و نتائج کو مدنظر رکھتے ہوتے کسی خاص وقت و زمانہ میں اس کے بعض اصول منسوخ کردئے جائیں مگر یہ احکام ناسخ بھی خدا ہی کے ہو سکتے ہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ قانون ابدی و ازلی خدا کی ذات کی طرح ہیں۔ اگرچہ بظاہر طبیعت انسانی کے غیر مقبول و مجہول ہونے پر وہ حادث ہی "سمجھے جائیں" یہ خیال زیادہ تر متاخرین رومی قانون دانوں کے خیالات کا پرتو ہیں۔ جنکے نزدیک قانون فطرت کے یہ معنی تھے کہ وہ دنیاوی قوانین کے اصل مبادی و بنیاد ہیں۔ اور دنیاوی قوانین کے ذریعہ سے انکا پتہ لگ سکتا ہے جو شاید ایک وقت میں دنیاوی قوانین کی تفسیر سے مستغنی ہوجائیں۔ اور جب تک یہ صورت پیدا نہیں ہوتی وہ ایک ایسا نمونہ ہیں جو دنیاوی شریعت کی رہبری کرتی ہیں۔ انسانی تاریخ کا ایک زمانہ ایسا بھی سمجھا جاتا ہے جب انسان صرف اس قانون فطرت کا پابند تھا۔ اور وہ زمانہ انسان کی تربیت کے پہلے کا ہے۔ شاید یہ وہی زمانہ ہو جسکو ہنود ست جگ کہتے ہیں، یا سوڈیس (Posodeus) یونانی نے "زمانہ زرین" کے نام سے یاد کیا ہے یا بائبل نے اسکو آدم و باغ عدن سے تعبیر کیا ہے یعنی وہ زمانہ جب انسان حالت طبعی میں علٰحدہ علٰحدہ اپنے بال بچوں کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا اور اسکی پابندیوں میں صرف اسقدر تھا کہ وہ ایک دوسرے کو گزند نہ پہونچائیں۔ اور دنیا کی نعمتوں کے حاصل کرنے میں خلل انداز نہوں۔ یا اپنے والدین کا کہنا مانیں یا اپنے بیویوں سے حسن سلوک سے پیش آئیں یہ ہے قانون فطرت کی تعریف جو گروٹیس نے کی ہے اور اسکی مدد سے ایک حد تک بین الاقوامی حقوق و فرائض کے معین کرنے میں کام لیا گیا ہے کیونکہ اجتماعی حالت میں اقوام کے باہمی تعلقات قریب قریب وہی ہوتے ہیں جو دو خاندانوں یا دو انسانوں میں ہوتے ہیں۔ البتہ یہ فرض نہیں کیا گیا کہ ان قوانین کے عمل پر انسان مجبور بھی تھا۔ کیونکہ حقوق انسانی کے پامالی پر جد و جہد و جنگ کا قائم ہونا بھی فطری تصور کیا گیا ہے قانون فطرت کا یہ تصور کہ صحیح الدماغی کا ایسا حتمی فیصلہ ہے جو ہے انسان کی طبائع عقلیہ اور مدنیہ پر حادی ہو۔ اس بنا پر یہ فرض کیا گیا ہے کہ پابندی معاہدہ بھی اگر فطرت انسانی کا خاصہ نہیں ہے تو اسپر ابتدا سے اسکا معمول رہا ہے اور ان معاہدات کی پابندی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اشیائے عالم پر انسان کی ملکیت تسلیم کی جانے لگی۔ جو پہلی صورت یعنی جلب منفعت میں ایک دوسرے کی مخالفت نہ کرنے کا ایک ارتقائی درجہ ہے اور یہ ہی ابتدائی معاہدہ سلطنت و حکمرانی بنیاد ہیں۔

گروٹیس کے ان نظریات پر لازمی طور سے یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ کن وجوہات سے انسان قانون فطرت کی پابندی پر مجبور ہوا۔ انسان کہاں تک اور کس حیثیت سے مدنی الطبع کہلایا جاسکتا ہے۔ اور انسان کے طبائع عقلیہ و مدنیہ میں پابندی معاہدہ کے اوصاف کہاں پیدا ہوتے ہیں۔

انسان کے جذبات فطری کا مدعا حفظ نفس ہے یا حفظ نفس۔ عدم حفظ نفس یا عدم حفظ نفس جو انسان اپنے لئے بلا و مصیبت و بدی خیال کرتا ہے۔ اسپر جہاں تک اوسکی ذات کا تعلق ہے جان بوجھ کر انسان کبھی عامل نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ ان بدیوں اور برائیوں کے اندر وہ دنیا یا عاقبت میں اپنے حفظ نفس یا حفظ نفس کے لئے انجام نیک نہ جانتا ہو۔ مطلب یہ ہوا کہ انسان پر جو برائیاں اور مصیبتیں آتی ہیں وہ اسکے خیالات کا نتیجہ ہیں گویا علم و نیکی لازم و ملزوم ہیں۔ انسان جتنا علم میں ترقی کرتا جائے گا اتنا ہی وہ نیکی سے قریب تر ہو جائے گا۔ بادی النظر میں یہ کلیہ عجیب و غریب و خلاف واقعہ معلوم ہوگا، لیکن جب ہابس (Hobbes) کے نفسیات کے اصول سے اسکی تشریح کی جائیگی

تو یہ عقیدہ آسانی سے حل ہو جائے گا۔ ہابس کا قول ہے کہ انسان دوسرے انسان پر جو کچھ رحم و انصاف یا ہمدردی یا حسن سلوک سے پیش آتا ہے وہ درحقیقت صرف ایک دھوکا ہے خود اسکے حفظ نفس وحظ نفس کا جب تک انسان اپنا کوئی فائدہ مدنظر نہیں رکھتا، وہ دوسرے انسان کے ساتھ فطرتاً نیکی سے پیش نہیں آتا۔ رحم کیا ہے؟ بقول ہابس کے وہ دوسروں کی مصیبت و تکالیف کا رنج ہے جسکا محرک صرف وہی خیال ہے کہ کہیں ہمکو بھی ایسی رنج و مصیبت سے دوچار ہونا نہ پڑے۔ ہم دوسروں کے ساتھ نیکی اور انصاف اسی امید پر کرتے ہیں کہ وہ بھی ہمارے ساتھ نیکی و انصاف سے پیش آئے گا اس لئے اگر ہم یہ سوال کریں کہ دوسروں سے نیک برتاؤ کی ضرورت کیا ہے تو اسکا جواب یہ ہے کہ درحقیقت وہ ہمارے خود حفظ نفس وحظ نفس کا ایک قرض حسنہ ہے جو ہم دوسروں کو دے رہے ہیں۔ مگر یہ تخیل انسان میں فطرتاً پیدا نہیں ہوتا۔ اور فوری جلب منفعت کا خیال اسپر اسقدر غالب آجاتا ہے کہ ایک شخص دوسرے انسان سے برائی کرنے میں فوراً آمادہ ہوجاتا ہے۔ گویا معمولی اصول اخلاق انسان کے عمل پر منحصر ہوتے نہ کہ اسکی طبیعت پر۔

ہابس نے الحاد و مادہ پرستی میں اخلاق انسانی کو جا بجا ہے۔ اور اس لئے جب انسانی جذبات کی بے اعتدالی کے اندر اپنے اس کلیہ کو وہ پوری طرح حل نہ کرسکا تو اس نے آخرکار حکومت و سیاست کو ایک ازلی ذریعہ مانا ہے۔ جو انسان کو نیک عمل پر مجبور کرسکتا ہے۔ مثلاً ایک انسان اپنے کو مجبور نہیں پاتا کہ وہ خوانخواہ اپنی ذات سے اتمہید کی تکمیل کرے تاوقتیکہ اسکو یہ اطمینان نہ دلایا جائے کہ فریق ثانی بھی اپنے حصے کی تعمیل کرتا ہے۔ اور یہ اطمینان اسوقت تک میسر نہیں آسکتا ہے جب تک سوسائٹی ایسا نہ کرنے والوں کو اسباب دنیاوی سے مجبور نہ کرسکے پس ایک ایسی علم و برتر قوت کی ضرورت ہوئی جو جماعت کی قوت و ذرائع کو ان احکام کی فرمانبرداری پر مجبور کرے جو امن و امان کے لئے ضروری ہے اور یہ مبادیات حکومت و سلطنت ہیں مگر حکومت کی تشکیل سے پہلے اخلاق کو انسان نے کس طرح برتا، یا دوسرے معنوں میں جب حکومت نہ تھی تو اخلاقی احکام پر انسان نے کیسے عمل کیا۔ مجھے ہابس کے قول سے یہاں تک تو اتفاق ہے کہ مذہب نے بھی عقاب و ثواب کی صورت دیکر جب تک انسان کو عاقبت میں اپنے حظ نفس یا حفظ نفس کا اطمینان نہیں دلایا۔ اس نے انسان کو یہ تعلیم نہیں دی کہ فلاں کام کیوں نہ کرو اور فلاں کام کیوں کرو۔ گویا کہ جب تک انسان کو اپنا فائدہ نظر نہیں آتا خواہ دنیاوی ہو خواہ اُخروی، وہ نیکی کیطرف رجوع نہیں ہوتا۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی کہونگا کہ تمام اعمال نیک کی محرک انسانی خودغرضی کو کہنا انسان کی ایک قسم کی توہین ہے فلاسفر لاک (Locke) نے بھی اگرچہ ہابس کے اس قول کی تائید کی ہے کہ انسان کے عاقلانہ برتاؤ کی بنیاد خودغرضی ہے اور نیکی و بدی دراصل خود اس کے اپنے نفس کے حظ و کرب کے مرادف ہیں وہ ہابس کے مخالفین کا ہم نوا بھی ہے کہ احکام اخلاقی کی بجا آوری پر تمیز انسانی جماعت سیاسی کے باہر بھی مجبور ہے اور ادراک انسانی خود بخود اصول اخلاق کو اپنے عقل کی مدد سے مستنبط کرسکتی ہے گو کہ ہم اس تمیز کو فطری نہ کہیں۔ لاک کے نزدیک انکی بنیاد وہ احکام خداوندی ہیں جو عام قوانین معاملات و معاشرت سے فائق و برتر ہیں۔ اور ایک ایسا معیار ہیں جس کی وجہ سے ایک شخص پر مستوجب سزا و جزا ہونیکا حکم لگاسکتے ہیں، اور ازبسکہ یہ احکام خداوندی ہیں اس میں سزا و جزا کی پوری تشریح ہے۔ لاک کا یہ مطلب نہیں ہے کہ احکام خداوندی کسی ترتیب یا عالمانہ پیرائے میں کسی کتاب کے اندر درج ہیں جو کچھ وہ کہتا ہے وہ یہ ہے کہ انکا وجود ضرور ہے اور اس کا وہ نہایت شدومد سے قائل ہے۔ اسکا قول ہے کہ یہ خیال کہ ایک برتر ذات جس میں عقل و خبر و اختیار کی انتہائی صفات ہیں اور جسکے ہم مخلوق

ہیں اور جسپر ہم بھروسہ رکھتے ہیں صحیح ہے، تو ہمارے فرائض و اعمال کی ایسی بنیاد پیدا ہوجاتی ہے جو علم اخلاق کو قابل بحث و تمحیص کردیتے ہیں اور اخلاق کی نیکی و بدی کے معیار کے لئے ویسی ہی قابل یقین مسلمات و مفروضات پیدا ہوسکتے ہیں جیسے ریاضی میں، لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ لاک کی مراد خدا کی نیکیوں سے کیا ہے، اگر اس کے معنی سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ وہ ایسی ذات ہے جس سے لوگوں کو فائدہ یا حظ حاصل ہوتا ہے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ نیک عمل کا آخری معیار وہی سمجھا جائے گا کہ اخلاق کے معنی ان اعمال کے ہیں جنسے لوگوں کو خوشی و فائدہ حاصل ہو۔ مگر لاک نے نیکی کا یہ معیار نہیں مانا ہے اور نہ اسنے نیکی کی کوئی مثال دی ہے۔ اس نے جو چند اخلاقی حقائق و مسلمات بیان کئے ہیں وہ مبہم سے ہیں یا اس قسم کے معمولی موضوعات ہیں کہ مثلاً کوئی سلطنت انسان کو پوری آزادی نہیں دیسکتی، یا ظلم و ناانصافی کا سوال اسوقت پیدا ہوگا جب ملکیت تسلیم کیجائیگی۔

کلارک (Samuel Clarke) اصول اخلاق کو خدا یا انسان کے مستبدانہ احکام کے ماتحت نہیں خیال کرتا لیکن لاک کی طرح وہ بھی معترف ہے کہ اخلاق کے اصول بھی ریاضی کے اصول کی طرح چند بدیہات و مسلمات پر مبنی ہیں۔ تقوی (Piety) رحم و انصاف (Equity) و طہارت (Sobriety) اخلاق کے تین صفات اساسی ہیں، تقوی خدا کے لئے، انصاف و رحم مخلوقات کے لئے، طہارت اپنے حفظ نفس کے لئے۔ پہلی صفت انسان میں اسوقت پیدا ہوتی ہے جب بقول لاک بندہ اپنی ذات کو اس ذات برتر سے جو انتہائے خیر و عقل ہے اور جسپر اوسکا بھروسہ ہے مقابلہ میں لاتا ہے۔ دوسری صفت انسان کی اس خواہش سے پیدا ہوتی ہے کہ جس طرح ہم انسان ہیں اوسی طرح دوسرے انسان بھی ہیں اور جس طرح ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ساتھ انصاف کیا جائے دوسرے بھی ویسا ہی چاہتے ہیں، یا رحم کے متعلق یہ اصول کہ جسقدر نیکیاں دوسروں کے ساتھ کی جائیں اتنی ہی وہ بھی ہمارے ساتھ بھلائی کریگا۔ ایک ایسی صریحی و بدیہی بات ہے جو معمولی عقل کا انسان بھی سمجھ سکتا ہے۔ اور تیسری صفت تو اس اصول کے ماتحت ہے کہ کوئی شخص جس کے دماغ ہے اور دماغ کے اندر عقل ہے وہ اپنے نفس کے ساتھ کبھی برائی روا نہیں رکھ سکتا ہے۔ مگر کلارک کا یہ منشا نہیں ہے کہ جو چیز نیک ہے اسپر ہم عمل کرنے کیلئے مجبور ہیں خواہ اس عمل سے ہمارا مقصود حظ نفس یا حفظ نفس ہو یا نہ ہو کیونکہ اسکا یہ بھی قول ہے کہ انسان بسا اوقات اپنی بے عقلی سے جذبات کی بے اعتدالی سے مغلوب ہوجاتا ہے، اگر کلارک کا یہ قول صحیح مانا جائے کہ انسانی فطرت کا خاصہ نیکی پر عمول ہونے کے لئے حفظ نفس و حظ نفس کے مقصد سے مستغنی ہو۔ تو یہ سکہ اسوقت بالکل بدل جاتا ہے جبکہ ایک بدکار اپنی بدکاریوں سے وقتی حظ و فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اور ایک نیک انسان باوجود عمل خیر کے مصیبت و پریشانی میں رہتا ہے اور یہ بات قابل قبول نہیں کہ ایک شخص باوجود اپنی جان کے خطروں میں پڑنے اور بظاہر اپنی نیکیوں سے کوئی فائدہ نہ اٹھانے کے نیکیوں پر عمل پیرا ہو، غرض کہ اخلاق کو مذہب سے علیحدہ رکھکر محض فلسفہ کی مدد سے سمجھنا ایسا ہی مشکل ہے جیسا الہیات، و تکوین و معاد و تقدیر۔

مل (Mill) نے کہا ہے کہ اگر کسی الہامی مذہب کی تعلیم اخلاقی بری اور راستی سے دور ہے تو خواہ کسی کی طرف سے ہو ہم پر اسکا ترک کردینا فرض ہے۔ کیونکہ ایسی تعلیم کسی حکیم و خبیر ہستی کی طرف سے نہیں ہوسکتی۔ لیکن اخلاق کی عمدگی ہم کو مستحق نہیں بناتی کہ خواہ مخواہ اسے کسی فوق العادۃ سرچشمہ کی طرف منسوب کریں کیونکہ اس امر کی کوئی دلیل قوی موجود نہیں کہ جس خوبی کے پرکھنے کی

قابلیت انسان میں موجود ہے اس خوبی کو دریافت کرنے کی قابلیت اس میں موجود ہو۔ مل کے اس قول سے دو تنقیح طلب مسئلے پیدا ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ آیا مذہب کے لئے ضروری ہے کہ اس میں اخلاقی تعلیم ہو، دوم یہ کہ آیا اخلاقی تعلیم مذہب کے باہر بھی ممکن ہے۔ ان مسائل پر غور کرنے سے پہلے ہم کو موجودہ مذاہب الہامی میں اخلاق کی تعلیم دریافت کرنا چاہئے۔ اور اس کے بعد اسکا خود اپنی ادراک اخلاقی سے موازنہ کرنا ہوگا۔ بعد میں ہم یہ حکم لگا سکتے ہیں کہ آیا اس قسم کی اخلاقی تعلیم الہام سے باہر بھی دیجاسکتی ہے۔

ہم یہاں پر ان کتب الہامیہ کی طرف اپنی توجہ منعطف کرینگے جن کو عام طور سے ہم مسلمان مانتے ہیں۔ یعنی یہود و نصاریٰ، اسلام کی کتب مادی۔ ہنود، بودھ، و مجوسی کے متعلق ہم کو شبہ ہے کہ آیا ان کی تعلیم الہامی کہی جاسکتی ہے یا نہیں۔ کیونکہ مذہب کا اساس الٰہیات و حشر و نشر ہے اور وہ ان تینوں مذاہب میں تقریباً مفقود و معدوم ہے۔ اور مذہب کے اندر الٰہیات تسبیح کے ڈورے کی طرح ہے۔ جس کے نہ ہونے پر تمام دوسری باتیں منتشر ہوکر اور بکھر کر اوہام میں مل جاتی ہیں۔ ہمارا یہ مقصود نہیں کہ ان مذاہب میں کوئی بات الہامی موجود ہی نہیں۔ مگر وہ اوہام کی تاریکی میں اسقدر چھپ گئی ہیں کہ انکی تفتیش سعی لاحاصل سے کم نہیں یا بھس کے ڈھیر میں دانۂ گندم کا فراہم کرنا۔ اور اس کے لئے نہ ہمارے پاس وقت ہے اور نہ ہم نے اس کی ضرورت سمجھی ہے۔ بائبل بھی ایک حد تک اوہام میں ڈوبی ہوئی ہے مگر نہ اسقدر جیسی کہ دوسری کتابیں۔

توریت کے اخلاقی احکام اول تو وہ احکام عشرہ ہیں جو جناب باری نے حضرت موسےٰ علیہ السلام کو کوہ سینا پر تعلیم کئے تھے گو کہ وہ عام طور سے اسقدر مشہور ہیں کہ انکے لئے محض احکام عشرہ کا نام لے دینا کافی ہوگا مگر تاہم ہم انکا ضروری حصہ جس کا تعلق اخلاق سے ہے یہاں نقل کرتے ہیں۔ (دیکھو کتاب خروج باب بستم)

۱۔ اپنے والدین کی عزت کر تاکہ دنیا میں تیری عمر دراز ہو۔

۲۔ قتل نہ کر۔

۳۔ زنا نہ کر۔

۴۔ چوری نہ کر۔

۵۔ دوسروں پر جھوٹی شہادت نہ دے۔

۶۔ اپنے ہمسایہ کی عورت و مال کا لالچ نہ کر۔

انجیل کی اخلاقی تعلیم وہ ہے جو جناب مسیح علیہ السلام نے اپنے "وعظ کوہ میں دی تھی" اور جسکا خلاصہ حسب ذیل ہے (دیکھو انجیل متی کا باب ۶،۵) "پچھلوں نے کہا ہے کہ تو قتل نہ کر اور جو قتل کریگا مستوجب سزا ہوگا۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ جو شخص اپنے بھائی سے بیجا غصہ کریگا وہ مستوجب سزا ہوگا۔ اور جو اپنے بھائی کو برا کہے گا وہ سپر جماعت محاکمہ کریگی۔ اور جو اپنے بھائی کو احمق کہے گا وہ مستوجب نار جہنم ہوگا۔ اور اگر تو اسوقت قربان گاہ پر کوئی قربانی چڑھا رہا ہو اور تجھے معلوم ہو کہ تیرا ایک بھائی تجھ سے ناراض ہے تو اپنی قربانی کو وہیں چھوڑ اور پہلے جا کر اپنے بھائی کو منا اور پھر آکر اپنی قربانی چڑھا۔ اپنے دشمن سے جلد صلح کرنے ایسا نہ ہو کہ دشمن تجھے قاضی کے سپرد کردے اور قاضی تجھے سپاہی اور سپاہی

تجھے محبس میں ڈالدے، اور وہاں سے تو اسوقت تک نہ نکلے جب تک تو آخری پائی ادا نہ کر چکے

پچھلوں سے سنا ہوگا کہ زنا مت کر۔ اور میں کہتا ہوں کہ تو عورت کی طرف شہوت کی نگاہ سے بھی دیکھے گا تو تو اپنے دل میں اس کے ساتھ زنا کر چکا۔ اور اگر تیری داہنی آنکھ تجھے برائی کی طرف بلاتی ہے تو اسکو نکال کر پھینک دے۔ بہتر ہے کہ تو کانا رہے اس سے کہ تیرا سارا جسم اس کی وجہ سے جہنم میں جائے، اور اگر تیرا داہنا ہاتھ برائی کرے تو اسکو کاٹ ڈال۔ یہ بہتر ہے کہ تو ایک ہاتھ کا ہے بہ نسبت اس کے کہ تیرا سارا بدن جہنم میں ڈالا جائے۔ کہا گیا ہے کہ جو شخص اپنی عورت کو طلاق دے وہ اسکو طلاقنامہ لکھ کر دیدے۔ اور میں کہتا ہوں کہ جو شخص سوائے زنا کی علت کے اپنی عورت کو طلاق دیتا ہے اور دوسری عورت سے نکاح کرتا ہے، وہ زنا کرتا ہے اور جو مطلقہ عورت سے نکاح کرتا ہے وہ زنا کرتا ہے۔

پچھلوں نے کہا کہ سوائے خدا کے کسی کی قسم نہ کھا۔ اور میں کہتا ہوں کہ تو قسم ہی نہ کھا۔ نہ آسمان کی نہ عرش کی نہ کرسی اور نہ زمین کی اور نہ اورشلیم کی اور نہ اپنے سر کی۔ پس تیرا کلام ہاں ہاں نہیں نہیں ہو۔

تم سنا ہوگا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت۔ مگر میں تجھ سے کہتا ہوں کہ بدی کا کوئی جواب نہ دو اگر تیرے داہنے گال پر کوئی طمانچہ مارے تو بایاں گال بھی اس کی طرف پھیر دے اور جو شخص تیرا لبادہ چھینے تو اسکو چادر بھی دیدے اور جو تجھ سے ایک میل چلنے کو کہے تو اس کے ساتھ دو میل جا۔

تم نے سنا ہوگا کہ اپنے ہمسایہ سے محبت کر اور اپنے دشمن سے نفرت، اور میں کہتا ہوں کہ اپنے دشمن کو دوست رکھ اور جو تیرے ساتھ برائی کرے اوس کے ساتھ نیکی کر۔ اگر تم نے انہیں لوگوں سے محبت کی جو تجھ سے محبت رکھتے ہیں تو کیا کمال کیا، یہ تو محصول لینے والے بھی کرتے ہیں۔"

قرآن کے احکام اخلاقی جو آنحضرت کو شب معراج میں تعلیم دئے گئے تھے وہ سورۂ معراج میں بھی صراحت کے ساتھ ایک جگہ دئے گئے ہیں، اس کے علاوہ بعض دوسرے اخلاقی و معاشرتی احکام اور دوسرے سورہ میں پائے جاتے ہیں۔ سورہ معراج یا اسریٰ کے احکام اخلاقی کا ترجمہ حسب ذیل ہے :-

"اور تمہارے پروردگار نے تم کو حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا اور اگر والدین میں کا ایک یا دونوں تیرے سامنے بڑھاپے کو پہونچیں تو انکے آگے ہوں بھی نہ کرنا۔ اور نہ انکو جھڑکنا اور اُنسے کچھ کہنا تو ادب کے ساتھ کہنا اور محبت سے خاکساری کا پہلو انکے آگے جھکاتے رہنا اور ان کے حق میں دعا کرتے رہنا کہ اے میرے پروردگار جس طرح انہوں نے مجھے بچپن سے پالا ہے اور میرے اوپر رحم کیا ہے اوسی طرح تو بھی ان پر اپنا رحم کیجیو، اور رشتہ دار اور غریب اور مسافر ہر ایک کو اسکا حق پہونچاتے رہو اور دولت کو بیجا مت اڑاؤ کیونکہ بیجا اڑانے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا ہے، اور اگر تم کو اپنے پروردگار کے فضل کے انتظار میں جس کی تم کو توقع ہو، بمجبوری ان غرباء سے منہ پھیرنا پڑے تو نرمی سے انکو سمجھا دو۔ اور اپنا ہاتھ نہ تو اتنا سکیڑ لو کہ گویا گردن میں بندھا ہے، اور نہ بالکل اسکو پھیلا ہی دو ایسا کرو گے تو تم ایسا ہی بیٹھے رہ جاؤ گے کہ لوگ تمہیں ملامت بھی کریں گے اور تم تہی دست بھی ہو گے اور

افلاس کے ڈر سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرنا۔ ان کو اور تم کو ہم ہی روزی دیتے ہیں۔ اولاد کا جان سے مارنا بڑا بھاری گناہ ہے، اور زنا سے دور رہنا کیونکہ وہ بے حیائی ہے اور برا چلن ہے۔ اور کسی جان کو جسکا مارنا اللہ نے حرام کر دیا ہے ناحق قتل نہ کرنا، اور جو شخص ظلم سے مارا جائے تو ہم نے اس کے ولی کو قصاص کا اختیار دیا ہے، تو اسکو چاہئے کہ خون کے بدلے لینے میں زیادتی نہ کرے، کیونکہ واجبی بدلہ لینے میں اس کی جیت ہے، اور جب تک یتیم اپنی جوانی کو نہ پہونچ لیں انکے مال کے پاس بھی نہ جانا، اور عہد کو پورا کیا کرو کیونکہ قیامت میں عہد کی بازپرس ہوگی اور جب ناپ کے دو تو پیمانہ کو پورا بھر دیا کرو، اور تول کر دینا ہو تو ڈنڈی سیدھی رکھ کر تولا کرو، یہ بہتر طریقہ ہے اور اسکا انجام بھی اچھا ہے، اور جس بات کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے نہ ہولیا کر، اور زمین پر اکڑ کر مت چل کیونکہ تو زمین کو نہ تو پھاڑ سکے گا اور نہ پہاڑوں کی لمبائی کو پہونچ سکے گا"۔

یہ ہے مختصر نمونہ اس تعلیم اخلاق کا جو اسلام نے دی ہے، اس نمونہ کو سامنے رکھ کر اگر ہم خیر و شر کا تجزیہ کریں تو ہم کو کوئی بڑی دقت واقع نہ ہوگی۔ سب سے پہلے ہم جذبات انسانی کو تین شاخوں میں تقسیم کریں گے۔ اول عفت، دوم شہوت، سوم ارادہ، پھر ان تین جذبات کے اندر انسانی اخلاق کی تشریح کا جہاں تک ہو سکے گا، اور جہاں تک مذہب کی مدد سے ہم خیر و شر کی تمیز کر سکتے ہیں ایک نقشہ حسب ذیل مرتب کر سکتے ہیں۔ ہم نے اس ترتیب میں قرآنی اخلاق کو ایسا نمونہ قرار دیا ہے، جو تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ تقریباً عام الہامی اخلاق کی طرح ہے جہاں پر دوسرے مذاہب نے بعض رذائل کو فضائل یا فضائل کو رذائل کا درجہ دیا ہے۔ اسپر میں نے نشان بنا دیا ہے۔

غضب (حفظ نفس)

رذائل	فضائل
۱۔ فتنہ و قتل۔	۱۔ مقاومت و جہاد و سیاست۔ ※
۲۔ کبر و نخوت	۲۔ فروتنی و عاجزی۔
۳۔ غیبت، و بدکلامی۔	۳۔ صبر و خاموشی۔
۴۔ انتقام، و تعصب۔	۴۔ عفو و انصاف۔
۵۔ ظلم و ایذا رسانی	۵۔ راحت رسانی و مروّت۔
۶۔ غدر و بغاوت۔	۶۔ اطاعت (حاکم و الدین)
۷۔ بزدلی ※	۷۔ شجاعت۔ ※

شہوت (حظ نفس)

رذائل	فضائل
۱۔ زنا و رہبانیت۔ ※	۱۔ نکاح و حسن معاشرت۔

۲۔ غبن و چوری	۲۔ جود و سخا۔
۳۔ سود و قمار بازی۔ ٭	۳۔ کسب و تجارت۔
۴۔ شراب خواری و حرام خوری۔ ٭	۴۔ قناعت۔
۵۔ پلیدی نفس کشی۔ ٭	۵۔ طہارت و تن آسانی۔ ٭
۶۔ ریاکاری	۶۔ اظہار حق۔
۷۔ بےحیائی	۷۔ حیا و شرم

ارادہ یا ادراک

رذائل	فضائل
۱۔ جھوٹ۔	۱۔ سچ۔
۲۔ بغض	۲۔ ہمدردی و رحم۔
۳۔ حسد	۳۔ رشک
۴۔ نفرت	۴۔ محبت
۵۔ کفر	۵۔ ایمان
۶۔ جہل	۶۔ علم
۷۔ تملق	۷۔ توکل

مگر ایک کام کو نیک اور ایک کو برا کہنے کا معیار الہام نے کیا مقرر کیا ہے۔

اگر برائی کا معیار یہ ہے کہ وہ ایک ایسا فعل ہے جو اپنے ایک ہم جنس کو تکلیف پہونچائے یا معدوم کر دے تو بعض اعمال جو یقیناً برے ہیں ان میں بظاہر یہ معیار قایم نہیں رہ سکتا۔ مثلاً زناکاری۔ اگرچہ آگے چلکر ان کے عواقب میں یہ بات پیدا ہوجائے۔

ہم نے پہلے باب میں اسکا اشارہ کیا تھا کہ جذبات فطری جو خدا نے انسان میں ودیعت کئے ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان آپس میں لڑکر تباہ نہ ہوجائیں اور اس کارخانہ قدرت کو ستیاناس نہ کردیں۔ گویا برائیاں دراصل ایک ایسا فعل ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مخلوقات معدوم ہوجائیں۔

پروفیسر محمود علی نے اپنی کتاب دین و دانش میں وحدت شہود والوں کی طرف سے ان خیالات کو اس طرح پیش کیا ہے (دیکھو کتاب دین و دانش بر صفحہ ۲۸۶)

"بدی موجود ہونے کا سبب تلاش کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس بدی کو جس کا ہونا معیوب خیال کیا جاتا ہے۔ ان کے

نیچر کو دیکھا جائے۔ چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک بدی کے نیچر میں داخل ہے کہ وہ کسی چیز کو عدم کی طرف لے جانے کی کوشش کرتی ہے اگر زہر انسان کو مارتا ہے یا ایک انسان دوسرے انسان کو قتل کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ اپنی طاقت کے موافق اس کو عدم کی طرف لے جاتا ہے اور اگر کوئی شخص کسی کی عزت پر حملہ کرتا ہے یا اوسکے مال کو غبن کرتا ہے تو اگرچہ ظاہر میں وہ کسی چیز کو عدم کی طرف نہیں لیجاتا مگر ان چیزوں کو انکی مناسب جگہ سے ضرور معدوم کرتا ہے اور نیز اکثر حالات میں عزت کو دور کرنا یا مال چرانا انسان کو عدم کیطرف لیجانے کا باعث ہوتا ہے، اور اسکے علاوہ جسقدر روحانی یا جسمانی برائیاں انسان میں موجود ہیں ان سب میں کم و بیش کسی چیز یا کسی حالت کو معدوم کرنا پایا جاتا ہے۔ اگر اپنے اگر اپنے جرم کو چھپانے کے لئے مکر و فریب کیا جاتا ہے تب بھی اس نتیجہ کو معدوم کرنا مقصود ہوتا ہے اور علی ہذا اگر جسم میں کوئی برائی یا عیب یا مرض موجود ہے تو بھی کسی ایسے عضو یا ایسے وصف کا معدوم ہونا ہے جو جسم کے لئے ضروری یا کم از کم شان پیدا کرنے کا باعث ہے اور یہی حال تمام ان برائیوں کا ہے جو حیوانات میں پائی جاتی ہیں۔ سب انکو عدم کی طرف لے جاتی ہیں۔ اور انسان میں تو پھر بھی بعض برائیاں ظاہر میں کسی چیز کو عدم کی طرف لے جاتی ہوئی نظر نہیں آتیں۔ مگر حیوانوں میں اتنا پردہ بھی نہیں اور وہ سب براہ راست دوسرے کو معدوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور مل کے یہ الفاظ بالکل درست ہیں کہ حیوانات کا بہت بڑا حصہ دوسرے حیوانات کو پھاڑنے اور نگلنے پر زندگی بسر کرتا ہے اور یہ بڑا حصہ بھی بڑے حیوانات میں پایا جاتا ہے جو دوسرے حیوانات سے ترقی یافتہ ہیں اور جن میں سے اکثر انسان سے مانوس ہو سکتے ہیں ورنہ چھوٹے درجہ کے حیوانات بقول مل یا نگلنے والے یا نگل جانے والے" اور نیز وہ ان ہزار ہا برائیوں کا شکار ہیں جنکے سبب سے وہ اپنی حفاظت کے اسباب سے محروم ہو جاتے ہیں"

غرض یہ ہیں وہ برائیاں جن کے سبب کی تلاش ہے اور یہ ہے انکی نیچر کہ وہ سب عدم کیطرف لیجانے کی کوشش کرتے ہیں مگر ابھی نیچر کی برائیاں شمار کرنے میں کوتاہی ہوئی ہے، کیونکہ حیوانات کے نیچے کے درجوں میں بھی بہت سے عیوب موجود ہیں، مثلاً حیوانات کے نیچے نباتات ہیں اب اگر صرف نباتات ہی مدار زندگی ہوتے تو پیدا کرنے والا صرف چند ابتدائی کیڑوں پتنگوں ہی کو پیدا کرتا جو نباتات پر بسر کر سکتے ہیں اور یہ جانوروں کا لاتعداد سلسلہ جن میں ایک کی زندگی بہت کچھ دوسرے جانوروں پر منحصر ہے ہرگز وجود میں نہ آتا اور اگرچہ ظاہر میں بہت سے بڑے حیوانات بھی صرف نباتات پر گزر کرتے ہیں مگر علمی تحقیقات ثابت کرتی ہے کہ تنفس اور بدنی مسامات کے ذریعہ سے بلکہ پانی کے ہر گھونٹ میں یہ جانور بے شمار مخلوق کو ہضم کرتے ہیں۔ اس لئے نباتات میں جو دولت ہے اسی کو موجود مانکر سوا چند پتنگوں کے اور سب جاندار محروم رہتے۔ تو نباتات کا وہ بڑا نقص ہے کہ وہ اپنے نیچر سے تمام جانداروں کو معدوم رکھنا چاہتی ہے۔ اور اس کے علاوہ بہت سے زہریلے مادہ بھی ان میں ایسے ہیں کہ جانداروں کو بہت کچھ نقصان پہونچاتے ہیں اور بعض وقت ان کی سمیت سے بڑی بڑی تباہیاں وجود میں آتی ہیں۔ اور ان سے اتر کر معدنیات اور گیس وغیرہ عناصر کا درجہ ہے اور اگر صرف انہیں پر مدار ہوتا تو کیڑوں پتنگوں سمیت تمام جاندار مخلوق کا خاتمہ تھا اور صرف معدنیات کی وساطت سے دنیا محض نباتات کا جنگل ہوتا اور جو زندگی کی برکت اب ہے وہ تختہ زمین پر نظر نہ آتی اور جس قدر گیس وغیرہ کے پھٹنے اور معدنیات کی سمیت کے جوش مارنے سے جانداروں کا اور نباتات کا نقصان ہوتا ہے وہ اس کے علاوہ ہے۔ اس سے اتر کر زمین اور اس سے اتر کر آفتاب کا درجہ ہے اور ظاہر ہے کہ اگر زیست کا انحصار صرف انہی پر ہوتا

تو مادہ نہایت ہی ابتدائی اور سادہ شکل میں رہتا اور یہ انواع و اقسام کی شکلیں اور طرح طرح کی زیب و زینت عالم میں نظر آتی اور اس نقص کے علاوہ ان کے دیگر نقصانوں کا یہ عالم ہے کہ آفتاب کا ادنیٰ طوفان اور زمین کا ایک آتش فشاں پہاڑ تھوڑی دیر میں وہ بدی ظاہر کرتا ہے جو کوئی انسان یا حیوان ہزار برس میں بھی نہیں کر سکتا۔ آفتاب سے پرے ہمارا تجربہ چل نہیں سکتا۔ لیکن اتنا قیاس ضرور ہو سکتا ہے کہ جو درجات اس سے پہلے ہوں گے اگر صرف انہیں پر مدار ہوتا تو مادہ اور بھی سادہ اور ابتدائی شکل میں رہتا اور دنیا میں جو کچھ ہوتا وہ نہ ہونے کے برابر ہوتا اور علی ہذا ان درجات کے طوفان بھی اور ہوں گے وہ آفتاب اور زمین کے طوفانوں سے زیادہ تباہی بخش ہوں گے۔ یہ ہیں مجموعہ ان برائیوں کا جو نیچر میں موجود ہیں اور شمار کرنے والوں نے محض ان ہی برائیوں کو گنا ہے جن میں ایک جاندار دوسرے جاندار کو مار دیتا ہے حالانکہ جیسا جاندار کو مارنا اس کی زندگی معدوم کرنا ہے اسی طرح نباتات کو کھانا اور جلانا بھی ان کی اپنی ہستی کو معدوم کرنا ہے اور اس لئے دونوں برے ہوئے۔ اور اسی طرح سے کسی کو معدوم رکھنا اور ہستی کی نعمت سے بہرہ یاب ہونے دینا بھی اس سے زیادہ برا ہے اور اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا البتہ بولنے میں اصطلاح کا فرق ہے، زندگی معدوم کرنے کے وقت کہا جاتا ہے کہ اس نے برا کیا اور زندگی سے محروم رکھنے کا خیال کرنے پر کہا جاتا ہے کہ اس کا نقص ہے اور دونوں حالتوں میں مشترک طور پر کہہ سکتے ہیں کہ جاندار کو مار کر زندگی بسر کرنا بھی عیب ہے اور جانداروں کو پیدا کرنے کی قابلیت نہ رکھنا بھی عیب ہے۔ غرض نتیجہ دونوں کی ایک ہے اور اس لئے اعتراض کرنے والا کہہ سکتا ہے کہ دنیا اول سے آخر تک برائیوں اور عیبوں کا مجموعہ ہے۔

مگر اس کے ساتھ اتنا اور بھی کہنا چاہئے کہ مادہ کی تمام شکلوں کو دیکھتے ہوئے جس قدر ابتدا کی طرف چلے جاؤ برائی اور عیوب زیادہ ہوتے جاتے ہیں اور جس قدر انجام کی طرف آؤ بدی کے درجہ میں کمی آتی جائے گی اور نیکی یا فائدہ بڑھتا جائے گا۔ آفتاب اگر اکیلا ہوتا تو مادہ نہایت ہی سادہ شکل میں رہتا اور جاندار اور دیگر مخلوق پیدا نہ ہوتی۔ مادہ کو کسی نہ کسی شکل میں موجود رکھنا اس کا فائدہ ہے اور دیگر اعلیٰ اشکال کو پیدا نہ ہونے دینا نقص۔ مگر زمین پیدا ہونے پر نقص کم ہو گیا اور فائدہ بڑھ گیا، کیونکہ اب مادہ کو اور بھی چند پہلے سے مکمل تر شکلوں میں آنے کا موقع ملا۔ علی ہذا جمادات، حیوانات اور نباتات کے پیدا ہونے پر نقص کی کمی اور فائدہ کی زیادتی درجہ بدرجہ اور نمایاں ہوتی گئی کہ دنیا آبادی کے قریب ہوتی گئی اور پہلا سا لق ودق میدان نہ رہا، ان کے بعد بڑے حیوانات کے پیدا ہونے سے نقص میں اور بھی کمی ہو گئی کہ ان میں سے بعض مانوس ہو کر دوسری مخلوق کو خوراک کے علاوہ اور فائدہ بھی پہونچا سکے اور انہی کی وساطت سے مادہ نے آگے ترقی کی اور زیادہ لطیف شکلیں وجود میں آئیں۔ ان کے بعد انسان پیدا ہوا تو وہ اگر کسی قدر جانداروں کو مارتا ہے تو کچھ جانداروں کی پرورش بھی کرتا ہے اور نیز مانوس حیوان اگر مجبور ہو کر کام دیتے ہیں تو یہ اپنی خوشی سے بھی اپنے ہم جنسوں اور دیگر مخلوقات کے کام کرنے لگا اور نیز حیوان براہ راست معدوم کرنے کی کوشش کرتے تھے اور انسان کچھ کوشش براہ راست معدوم کرنے کی کرتا ہے تو بعض کوششوں میں صرف عزت یا مال چھیننے ہی پر قناعت کرتا ہے اور اس طرح بالکل معدوم کرنے سے اپنے تئیں کسی قدر دور رکھتا ہے اور پھر اس نے تہذیب میں ترقی کی تو جو برائیاں وحشی انسان کرتے تھے ان میں سے اکثر کو چھوڑتا گیا اور ہمدردی اور فائدہ رسانی میں بڑھتا گیا اور مہذب انسانوں سے بڑھکر وہ انسان ہے جو تہذیب کے ساتھ ایمان بھی رکھتے ہیں۔ کیونکہ مہذب انسان جب تک بانداز ہو صرف انہیں برائیوں سے

گریز کرتا ہے جو اس زندگی میں نقصان پہونچائیں اور وہی ہمدردی کرتا ہے جو اس دنیا میں مفید ہو لیکن ایماندار انسان لوگوں کو ان برائیوں سے بھی بچاتا ہے جو آیندہ زیست میں اثر کریں اور اس ہمدردی کو بھی اپنا فرض سمجھتا ہے جو اگلے جہان میں بھی فائدہ دے چنانچہ وہ مالی اور جسمانی نقصان سے بچانے کے علاوہ دوسرے کو گناہ اور کفر کی ترغیب دینے سے بھی گریز کرتا ہے اور حتی الوسع اخروی ترقی کی طرف متوجہ کرنیکی کوشش کرتا ہے مگر چونکہ سب انسان ہیں اس لئے اختیاری یا بے اختیاری سے جانداروں پر بسر کرنے یا نباتات کو کھانے کے نقص سے بالکل پاک کوئی بھی نہیں۔

غرض یہ ہے نقشہ اس نقص اور کمال یا بدی اور نیکی کا جو موجودات عالم میں پائی جاتی ہے۔ اب دیکھنا چاہئے کہ ہست سے ہست کرنے کی تصویری پر عقل کے نزدیک دنیا میں نیکی اور بدی کی یہی شکل ہونی چاہئے یا کچھ اور۔ اور چونکہ عدم و وجود باہم متباین ہیں اس لئے معدوم کے موجود ہونے کے واسطے وہی شکل قرین قیاس ہو سکتی جو دنیا کے اندر ضدین کے انقلاب میں ہوتی ہو۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ لوہے کو جسکا اصلی رنگ سیاہ ہے صیقل کرنے سے ایسا روشن کر سکتے ہیں کہ آئینہ کی طرح اس میں سے چہرہ نظر آنے اور بالکل سفید ہو جائے مگر اسکی شکل یہی ہوتی ہے کہ ایک زنگ آلود لوہے کو جب صیقل کرنے لگیں تو پہلے اسکا زنگ دور ہوتا ہے اور سطح کسی قدر صاف ہو جاتی ہے اس حالت میں اگر نور اسمیں پیدا بھی ہوا ہے تو ایسا ناقص کہ سیاہی کچھ بھی دور نہیں ہوتی اور اگر کالا رنگ نور کے مقابل میں بڑا ہے تو لوہے کو اس حالت میں یہ برائی بڑی حد تک موجود ہے اس کے بعد اور رگڑا جائے تو سیاہی دور ہونا شروع ہوتی ہے مگر اس عمل کے ہر ایک درجہ میں نور بڑھتا جاتا ہے۔ لیکن سیاہی کی کم سے کم تر ہوتی ہوئی ہر وقت موجود رہتی ہے حتی کہ وہ آئینہ جیسا چمک اٹھتا ہے اسوقت اگرچہ نور جہاں تک لوہے میں آسکتا تھا آگیا۔ اور اگر اس کو آفتاب کے سامنے رکھا جائے تو آفتاب کی جھلک اس میں نظر آجاتی ہے لیکن پھر بھی لوہا لوہا ہی ہے اور آفتاب کے برابر نورانی نہیں ہو سکتا اور نیز جسقدر نور موجود ہے وہ ایسا کمزور ہے کہ آئندہ ذرا سی بے احتیاطی کے ساتھ دور ہو سکتا ہے اور لوہا سیاہ ہوتا ہوا پھر زنگ آلود حالت کو پہونچ سکتا ہے۔ اسوقت ایک بات اور بھی یاد رکھنی چاہئے کہ لوہے میں نور کا ایسی آہستگی سے در آنا اور کامل شکل میں پھر بھی موجود ہونا اور بے احتیاطی سے فوراً دور ہونے لگنا نور آفتاب کے حضور سے نہیں بلکہ لوہا چونکہ نور آفتاب کی بالکل ضد ہے اس لئے اسکی نیچر ایسی ہی ہے کہ نور کو محض اسی شکل سے حاصل کر سکتا ہے اور نور کی رفتار اسکی طرف صرف دیر آمدن و شتاب رفتن کے اصول پر ہو سکتی ہے۔

اس نظیر کو دیکھنے کے بعد مضمون کی عظمت کے لحاظ سے ایک اور نظیر کا پیش کرنا بھی ناموزوں نہ ہوگا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب کوئی جاہل علم حاصل کرنے لگتا ہے تو پہلے علم کے بے انتہا ذخیرہ میں سے بہت تھوڑا سا مہیا کر سکتا ہے اور اسمیں سے بھی کچھ یاد رکھتا ہے اور کچھ بھول جاتا ہے اس حالت میں جہالت اگر برائی ہے تو وہ علم کے آغاز پر نہایت کثرت سے موجود ہوتی ہے پھر رفتہ رفتہ علم کا سرمایہ بڑھنا شروع ہوتا ہے اور جہالت کا عیب کم ہوتا جاتا ہے۔ مگر ترقی کے ہر درجہ میں جہالت کا بقیہ حصہ کچھ نہ کچھ موجود رہتا ہے حتی کہ انسان کسی علم یا اس کی شاخ میں ماہر اور صاحب الرائے ہونیکا فخر حاصل کرتا ہے مگر اسوقت بھی یہ عالم ہوتا ہے کہ اگر اس علم کے متعلق اس کی دس رائیں صحیح ہوتی ہیں تو ایک رائے ضرور غلط ہوتی ہے اور ایسا کمال کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا کہ اسکا کوئی قیاس بھی غلط نہ نکلے بلکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ کبھی اس نے کسی مسئلہ میں صحیح رائے قایم کی ہے تو دوسرے وقت پر دماغ ایسا چکرایا ہے کہ اسی مسئلہ میں غلطیوں کا حامی بنگیا ہے اور علیٰ ہذا جس قدر کمال حاصل کرتا ہے

اگر اسکی بحث و تکرار نہ رکھے تو وہ کمال رفتہ رفتہ زوال پانے لگتا ہے حتیٰ کہ عالم ایک وقت میں بالکل کندۂ ناتراش ہو سکتا ہے اور یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ یہ نورِ علم کا نقص نہیں ہے۔ کیونکہ جس مسئلہ میں ہم کسی وجہ سے غلطی دیکھتے ہیں۔ اسی مسئلہ میں وہی نورِ علم جو کسی اور عالم میں جلوہ گر ہے اس مسئلہ کو نہایت صحت کے ساتھ دریافت کر لیتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نورِ علم میں بیشک مسائل کی اس حقیقت دریافت کرنے کی قابلیت ہے اور جو کچھ نقص نظر آتا ہے وہ اس لئے ہے کہ جہالت کی فطرت ہی علم سے اس قدر تناقض رکھتی ہے کہ وہ جس قدر دور ہو سکتی ہے بتدریج ہوتی ہے اور پھر بھی کسی نہ کسی شکل میں اس کا بقیہ موجود رہتا ہے اور یہی جہالت ہے جو ابتدائی درجات میں پورے طور پر نمایاں ہے اور وہی جہالت ہے جو مہارت کے وقت بھی مختلف شکلوں میں اپنی بقا کو ظاہر کرتی ہے اور علم کی برکت پر پردہ ڈالدیتی ہے۔

ان کے علاوہ اور دیگر واقعات عالم میں جس قدر غور کیا جائے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک ضد کا دوسری ضد کی طرف جانا اسی ترتیب اور اسی نقص کے ساتھ ہوتا ہے۔ پس یہی کیفیت آفتاب وجود کی ظلمت عدم پر عکس ڈالنے کی ہونی چاہئے تھی اور یہی ہوئی کہ اس کی پہلی شعاع سے زنگ عدم دور ہوا اور مادہ کی ابتدائی شکل وجود میں آئی۔ اور اس کے بعد جس جس حد تک عکس پڑتا گیا اسی حد تک عدم کی ظلمتیں یعنی نقص اور عیب دور ہوتے گئے۔ اور وجود کی کامل سے کامل شکلیں بنتی گئیں حتیٰ کہ انسان اور کامل انسان میں آکر اس نابود نے وہ بود حاصل کی کہ آفتاب وجود کی شعاعیں اس کے اندر چمکنے لگیں۔ اور عقل و معرفت کے نور سے جسمانی اور روحانی جلوے ایسے ظاہر ہوئے کہ بعض حالات میں اس پر خود آفتاب وجود ہونے کا دھوکا ہوا۔ جس طرح مجلا تلوار کو سورج کے سامنے رکھنے سے اس کے اندر آفتاب معلوم ہوتا ہے، چنانچہ بعض کوتاہ بینوں نے اسی کو خود ذات خدا کا ظہور سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ وہ حقیقت میں خود ذات خدا کا ظہور نہیں البتہ ایک طرح سے نور خدا کا مظہر ضرور ہے جس طرح کہ خود آفتاب کا ظہور نہیں بلکہ اس کا مظہر ہے۔ اور یہ اس لئے ثابت ہوتا ہے کہ ادھر لوہا پہلے ایسا نورانی نہ تھا اور بعد میں بے احتیاطی سے پھر تاریک ہو جاتا ہے اور ادھر انسان پہلے ایسا عارف نہ تھا اور بعد میں ذرا سی لغزش سے پھر کور باطن ہو سکتا ہے

پس یہاں بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس معدوم کی ایسی دھیمی رفتار اور اس کے اندر نقصوں کا اس قدر ہجوم اس آفتاب وحدت کا نقص نہیں بلکہ یہ عدم ہے اس لئے کہ اس کی نیچر ہی مقتضی ہو کہ ایسی صورت سے ترقی کرے اور اس لئے ذات خداوندی کو بدی کا منبع قرار دینے کے بجائے ثابت ہوتا ہے کہ وہ محض خیر کا سرچشمہ ہے چنانچہ اس نے سب موجودات کو اس عیب سے بری کیا جو سب سے بڑھ کر تھا یعنی عدم اور بری بھی اس خوبی سے کیا کہ اب چاہے بدی کرنے والے کیسی ہی بدی کریں وہ موجودات کو موجود سے معدوم نہیں کر سکتے اور زیادہ سے زیادہ جو انکا زور چل سکتا ہے وہ ایک چیز کی محض شکل کو بدل دیتا ہے۔

اور نہ محض وجود یا مادہ کو صرف سادہ شکل عطا کرنے پر اکتفا نہیں کی گئی بلکہ ترقی کا ایسا سلسلہ معدوم کر دیا گیا ہے کہ جس چیز میں جس حد تک اس بڑی بدی یعنے عدم سے بعد ہوتا گیا اسی حد تک اس میں سے عدم کا میلان کم ہوتا گیا اور اسی حد تک وجود کی مکمل تر شکال پیدا کرنے کی طاقت بڑھتی گئی حتیٰ کہ میلان عدم کم ہونے اور وجود کی طاقت بڑھنے کا سلسلہ کامل انسان میں اس حد تک پہونچ گیا کہ وہ اپنی طاقت کے موافق کسی شخص اور کسی فرد کو نقصان پہونچانے کا ذمہ دار نہیں اور تمام عالم کو اپنے وجود سے فائدہ پہونچانے کی اور ہر چیز کی

اصل حقیقت کو اس کے مناسب حال سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن چونکہ اصلیت عدم ہے اس لئے عیب سے بالکل پاک ہونیکا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا، چنانچہ وہ بھی عدم کا بقیہ تھا جس کے سبب نباتات وغیرہ ابتدائی مخلوقات وجود کے بہت سے کمالات سے محروم تھی اور یہ بھی عدم کا بقیہ ہے جس کے سبب انسان جیسی اعلےٰ مخلوق کبھی امراض وغیرہ کی شکل میں اپنے اندر عدم کو ظاہر کرتی ہے اور کبھی شرارت وغیرہ کی شکل میں دوسروں کو معدوم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ جس طرح وہ بھی جہالت کا بقیہ تھا جو علم کے ابتدائی درجہ میں بہت سے مسائل کو مخفی رکھتا تھا اور وہ بھی جہالت کا بقیہ ہے جو ایک عالم میں کبھی کبھی غلط رائے قائم کرنے کا سبب ہوتا ہے فرق صرف اس قدر ہے کہ عدم کا ظہور نباتات وغیرہ میں اور جہالت کا ظہور علم کے آغاز میں بے ارادہ ہے اس لئے کہ ابھی ارادہ کی قابلیت بھی پیدا نہیں ہوئی۔ اور جہالت کا ظہور عالم کی غلط رائے میں اور عدم ظہور انسانی افعال میں ارادہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ اسوقت ارادہ کی قابلیت بھی موجود ہے مگر جب ماہر کی غلطی کو یقیناً جہالت کا نقص کہہ سکتے ہیں نہ نور علم کا قصور، تو انسان کی بدی کو بھی عدم کا نقص سمجھنا چاہیئے نہ کہ آفتاب وجود کا قصور۔

اب میں ان دو تنقیح طلب مسئلوں کی طرف آتا ہوں جو ل کے قول سے پیدا ہوتے ہیں یعنی آیا مذہب کے لئے ضروری ہے کہ اس میں اخلاقی تعلیم ہو۔ دوسرے کہ آیا اخلاقی تعلیم مذہب کے باہر بھی ممکن ہے۔

ہم نے تین مذاہب الہامی کے اخلاقی تعلیم کا مختصر نمونہ دیا ہے۔ جس سے یہ صریح نتیجہ ظاہر ہو سکتا ہے کہ معمولی اختلاف و افراط و تفریط کے ساتھ ان سب مذاہب میں اخلاق کا صرف ایک ہی معیار ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ایک مذہب مثلاً زنا کو اچھا کام سمجھتا ہو اور دوسرا مذہب برا۔ تو اس حیثیت سے نیکی و بدی کی تعریف متقابل نہیں ہوتی بلکہ نیکی نیکی ہے اور بدی بدی۔ اور یہ دونوں معیار اخلاق کے ایسے مسلمات ہیں جنکی تشریح فلسفہ سے نہیں ہو سکی۔ ہم نے شروع ہی میں اخلاق کی تعریف میں علم تاریخ انسان کو علیحدہ رکھ دیا تھا، ممکن ہے کہ ہم کچھ دیر کے لئے اس کو یاد کرلیں کہ انسان نے اخلاق کو اپنے متواتر تجربات سے حاصل کیا۔ اور جب جب اس کو کسی فعل سے نقصان یا تکلیف ہوئی اس کو اس نے بدی جان کر ترک کر دیا اور اپنی اولاد کو اس سے بچنے کی تعلیم دی۔ یا ہم تاریخ کی مدد سے یہ بھی ثابت کر سکیں کہ حکومت نے اجتماع اقوام کی غیر مساویانہ برتاؤ سے انصاف کرنا سکھا اور اس پر اخلاق کی بنیاد پڑی، مگر اخلاق پر انسانی بقا و نظام فطرت کی اسقدر ذمہ داریاں ہیں کہ یہ مشکل نظر آتا ہے کہ مذہب نے انسان کی اپنی فطرت پر چھوڑ دیا ہو، اور اس کو تعلیم الہام کے ذریعہ سے نہ دی ہو۔ مذہب انسان کے موت کی وجہ سے شروع ہوا جبکہ انسان نے انسان کی موت کو آخری درجہ زیست کا نہ سمجھا۔ مذہب نے آیندہ زندگی کی امید دلائی۔ اور اس کے ساتھ سزا و جزا کا سوال پیدا ہونا ضروری ہوا۔ اور جب سزا و جزا کا سوال پیدا ہوا تو اخلاق اس کا اصل سبب ہوا۔

یہ بہت ممکن ہے کہ مذہب سے باہر اخلاق کی تعلیم ہو سکے۔ مگر وہ اس حد پر جا کر ٹھہر جائے گی جہاں تک انسانی خود غرضی اسکی محرک ہوگی۔ اور مذہب اخلاق کو خود مقصود بالذات ہونے کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ قانون دنیاوی نے سیاست کے ماتحت بہت سی برائیوں سے انسان کو محفوظ رکھا ہے۔ مگر اعمال انسانی پر سوائے مذہب کے کوئی دوسری شے پوری طرح مسلط نہیں ہو سکتی اور اس لئے

یہ بھی ممکن نہیں کہ مذہب کے باہر اخلاق کی کمالہٗ تبلیغ تعلیم دی جا سکے آخر میں ہم کو یہ بھی بتا دینا چاہیئے کہ مذہب کی خوبیوں کا معیار اس بات پر نہیں ہے کہ اس کی اخلاقی تعلیم کو نہایت آئیڈیل حیثیت اور نا قابل عمل صورت سے پیش کیا جائے جس مذہب نے انسانی جذبات کا خیال کئے بغیر مس آئیڈیل تعلیم کا وعظ دیا ہے۔ وہ کاغذ کے لئے بہت اچھے الفاظ ہیں مگر عمل میں صفر ہم اسلام کو اسی لئے کامل اور نمونہ قرار دیتے ہیں کہ اخلاق کی جو اس میں تعلیم ہے وہ ایک ایسا اعتدال کا درجہ لئے ہوئے ہے جو بالکل فطری ہے اور جو دیگر مذہب میں یا تو سرے سے مفقود ہے یا بالکل اس کے خلاف پایا جاتا ہے۔ اور جو بات اسلام میں سب سے زیادہ ممتاز ہے وہ یہ ہے کہ انسانی حقوق میں اپنے نفس کے ساتھ بھی وہی فرائض ادا کرنے کا حکم ہے جو دوسروں کے ساتھ، یعنی ایسے کام جس سے خود اپنے حفظ نفس و حفظ نفس ہی مقصود محض ہوں، وہ بھی اخلاق کے فضائل میں سے ہے۔ مثلاً رہبانیت، خودکشی، اور شہید و مظلوم بننے کا شوق ان سب باتوں کی اسلام میں سختی سے ممانعت ہے۔ جو ہنود و مسیحیت کے اخلاقی فضائل مانے جاتے ہیں۔

سید مقبول احمد

لاٹری کا روپیہ

بابو گنیش بہاری کو ڈربی والی لاٹری میں پچاس ہزار روپیہ ملجانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ بیچارے میرٹھ کی میونسپلٹی میں پچیس روپیہ ماہوار کے کلرک تھے۔ بالائی آمدنی کے نام کبھی ایک پھوٹی کوڑی انہیں نصیب نہ ہوئی بڑی دقت اور عسرت سے بسر کرتے۔ اخیر مہینہ میں دو چار روپیہ ادھار قرض لیتے جب جا کے کام چلتا انکے خواب وخیال میں بھی نہ تھا کہ مجھے گھر بیٹھے اتنی دولت ملجائیگی۔ چار مہینہ پہلے رمضان چپراسی نے زبردستی کرکے ایک چونی کا ٹکٹ خرید وا دیا تھا۔ اس چونی کا غم ایک دو روز رہا پھر بھول گئے۔ گنیش بہاری بخیل نہ تھے بخیل کیا ہوتے بخل اور خست اصل دولت کی ساتھی ہے۔ جسکی آمدنی روزانہ اخراجات کے لئے بھی کفایت نہ کرے روپیہ کے معاملہ میں اسکی کشادہ دلی یا تنگ حوصلگی کا اندازہ کیونکر ہوسکتا ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ کسی تقریب میں جاتے اور وہاں صاحب ثروت لوگوں کو دیکھنے یا کسی دولت مند سے ملنے کا اتفاق ہوتا۔ تو یہ دولت کے متعلق خواب دیکھنے لگتے اور سوچتے اگر پرماتما مجھے روپیہ دیدے تو میں اپنی دولت کا تماشہ نہ بناؤں نہ میں اوسے چھپا چھپا کر رکھوں۔ امارت وثروت زندگی کا مقصد نہ ہونا چاہیے بلکہ اسے باطریقہ زندگی بسر کرنیکا ایک ذریعہ سمجھنا چاہیئے، دولت میرے نزدیک انسان کو سلیم الطبع اور صحیح الحواس بنانے میں مدد دے سکتی ہے۔ میں اس خیال سے متفق نہیں ہوں کہ دولت فسق وفجور اور لہو ولعب کی طرف مائل کردیتی ہے۔ یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جس کی معقول دلیل پیش نہیں کی جاسکتی اگر اس کو صحیح مان لیاجاسے تو اس کے یہ معنی ہونگے کہ مفلس اور تنگ دست لوگ فاسق اور فاجر نہیں ہوتے حالانکہ صحیح نہیں ہے فلاکت یا امارت پر گناہ اور بدکاری کو منحصر کرنا فطرت انسانی سے ناواقفیت کا ثبوت دینا ہے، میں ضرورت سے زیادہ روپیہ کا طلبگار نہیں ہوں مجھے خزانہ جمع کرنے کی ہوس نہیں ہے۔ میں دولتمند مرنے سے دولتمند رہ کر جینا زیادہ پسند کرتا ہوں

یہ تھے بابو گنیش بہاری کے خیالات دولت ملنے سے پہلے لیکن آج پچاس ہزار کی ملنے کے بعد ان کے جذبات عجیب طرح سے متاثر ہوئے حقیقت یہ ہے کہ جیب کو جس قدر وسعت اور کشادگی نصیب ہوتی ہے اسی قدر دل تنگ ہوجاتا ہے، دولت غلامی کی زنجیر ہے، جو دولت آسایش کا ذریعہ نہیں بنتی وہ اپنے محافظ پر حکومت کرتی ہے، یہ ایسی چیز ہے کہ اسکی زیادتی اس کی مزید افزایش کی خواہش پیدا کرتی ہے، انہوں نے سوچا جہاں تک ہوسکے اسمیں سے ایک پیسہ بھی صرف نہ کرنا چاہیے۔ چھوٹی سی رقم ہے اسکی حقیقت ہی کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ دولت پر لگا کے اوڑتی ہے۔

بابو گنیش بہاری کا وطن ہاپوڑ میں تھا بہت غور وفکر کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ ایک مہینہ کی چھٹی لیکر اپنے وطن چلے جائیں اور وہاں جاکر کاروبار کریں کھیتوں کی خرید وفروخت میں لوگ لکھپتی ہوگئے یہ بہت نفع کا کام ہے گو بجائے گر جانے کا ڈر بھی کچھ کم نہیں۔ اگر ایسا ہوا تو کیا ہوگا اس خیال سے دل میں دھڑکن پیدا ہوگئی ایسا نہ ہو کہ بیٹھے بٹھائے ساری رقم سے ہاتھ دھونا پڑیں۔ ایسا کاروبار کوئی نہیں جس میں نقصان کا اندیشہ ہو اب انکا خیال لین دین کی طرف رجوع ہوا مگر اسمیں بھی اکثر لوگ نادہند نکل جاتے ہیں۔ رقعہ پرچہ، تمسک کچھ کام نہیں آتا۔ پھر کیا ہو اس دولت نے

انہیں بہت تشویش میں ڈالدیا۔ دولت اپنے مخصوص تفکرات ساتھ لاتی ہے۔ یہ بھی اس درخت کے مانند ہے جس کی ڈالیاں اپنے پھلوں کی کثرت کا بار نہیں سنبھال سکتیں اور ان کے وزن سے ٹوٹ جاتی ہیں۔

آخر گیہوں کی تجارت کا فیصلہ کر کے بابو گنیش بہاری ہاپوڑ کو روانہ ہوئے اسٹیشن پر آئے تو گاڑی تیار تھی انکے سامنے ہی ریل کا جو درجہ تھا اس میں ۱۰ آدمی بیٹھے تھے۔ اس درجہ میں بیٹھنے ہی کو تھے کہ انہیں کچھ خیال آیا فوراً وہاں سے ہٹ گئے اور اس آگے والے درجہ میں جا بیٹھے جو بالکل خالی تھا گاڑی چھوٹ گئی سوچنے لگے خیر ہوئی میں اس درجہ میں نہ بیٹھا دو آدمی تھے جو دونوں ساتھی معلوم ہوتے تھے بہت التفات کے ساتھ آپس میں باتیں کر رہے تھے، دل میں بے ایمانی آتے کیا دیر لگتی ہے مجھے روپیہ ملنے کا حال کم سے کم میرٹھ میں سب کو معلوم ہی ہے۔ انہیں بھی ضرور معلوم ہوگا اور یہ لوگ اس سے بھی بیخبر نہ ہونگے کہ میں سارا روپیہ اپنے ہمراہ لیکر کاروبار کے ارادہ سے ہاپوڑ جا رہا ہوں ورنہ ایک ٹکٹ کی جھجی کیوں لیتا۔ اب انہیں یاد آیا کہ گذشتہ شب کو اسی ریل میں ایک شخص قتل کر دیا گیا تھا اور ڈاکو اسکا اسباب لیکے تھے۔ اس خیال کا آنا تھا کہ انہیں اختلاج شروع ہوگیا پسینے میں شرابور ہوگئے، سوچنے لگے میں بھی کس قدر احمق ہوں۔ گھبراہٹ میں بے سوچے سمجھے سیدھا اسٹیشن پر چلا آیا، موٹر میں چلا جاتا کرایہ تھوڑا سا زیادہ سہی مگر کچھ خطرہ تو نہ تھا، ممکن ہے وہ شخص اسی درجہ میں قتل ہوا ہو، اس خیال نے اوسان خطا کر دیئے۔ ممکن ہے وہ یہیں بیٹھا ہو ایسی جگہ جہاں میں بیٹھا ہوں، سنا ہے وہ بھی سارے درجہ میں تنہا تھا اور ڈاکو کھرکودے کے اسٹیشن سے سوار ہوا تھا، اسوقت بابو گنیش بہاری سخت بے چین اور مضطرب تھے انکی حالت ایسی تھی جیسے کوئی مسافر جنگل بیابان میں بھٹک کر کسی ایسے راستہ پر آ لگا ہو جو رہزنوں اور لٹیروں کا تختہ مشق بنا ہوا ہو، ریل تیزی کے ساتھ جا رہی تھی اور انہیں بار بار شبہ ہوتا تھا کہ کوئی ڈاکو چلتی گاڑی میں کھڑکی کھول رہا ہے انکی حالت قابل رحم تھی سچ یہ ہے اس مصیبت کا برداشت کرنا سب سے زیادہ مشکل ہے جو کبھی رونما نہیں ہوتی، ہم اکثر بے بنیاد خطرات کے خیال سے لرز جاتے ہیں خطرات بے بنیاد سہی لیکن انکے خیال سے جو تکلیف پہونچتی ہے وہ بے بنیاد نہیں ہوتی۔ کسی مصیبت کے خیال سے ہم قبل از وقت جس قدر مضطرب ہوتے ہیں اگر واقعی وہ مصیبت پیش آجاتے تو ہم ہرگز اتنے مضطرب نہ ہوں۔

اب ریل کھرکودے کے اسٹیشن پر پہونچ گئی، گنیش بہاری کے جذبات کا ہیجان اسی حالت پر تھا کچھ خفیف سا خیال آیا کہ کسی دوسرے درجہ میں چل کر بیٹھ جانا چاہیئے لیکن خدا جانے وہاں کیا پیش آئے کڑھائی سے نکلکر آگ میں گرنا کہاں کی عقلمندی ہے پھر سوچا کہ جس درجہ میں آدمی زیادہ ہوں، وہاں خطرہ کم ہے ابھی اسی تذبذب میں تھے کہ گارڈ نے سیٹی دے دی جوں ہی ریل نے حرکت کی ایک نہایت تنومند جسیم انسان پھرتی کے ساتھ دروازہ کھولکر انکے درجہ میں گھس آیا اور دوسرے کنارے پر کھڑکی کے پاس جاکر بیٹھ گیا۔ اس کے پاس ایک چمڑے کے بیگ کے سوا اور کچھ نہ تھا صورت سے کوئی جاٹ یا گوجر معلوم ہوتا تھا بڑی بڑی سرخ خطرناک آنکھوں سے آگ برس رہی تھی مونچھیں لبوں سے گزر کر رخساروں کو پار کرتی ہوئی کانوں کے قریب تک پہونچ گئی تھیں آتے بیٹھتے ہی چمڑے کے بکس میں سے نکالکر جرابیں پہنیں اور خاموش بیٹھ گیا۔

گنیش بہاری کا برا حال تھا، اب انہیں پختہ یقین ہو گیا کہ آج میری جان کی خیر نہیں یہ شخص ضرور کوئی ڈاکو ہے۔ گذشتہ شب بھی

اسی نے قتل کیا ہوگا وہی لالچ اسے آج پھر لائی ہے وہی وقت ہے وہی درجہ ہے انکا دل بانسوں اچھل رہا تھا بہتیرا سوچتے تھے کہ کوئی تدبیر جانبری کی نکل آئے مگر کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا، سوچنے لگے کہ پولیس بھی کسقدر غافل ہے دنیا بھر میں تو غل برپا کر رکھا ہے کہ قاتل فرار ہوگیا یہ خبر نہیں وہ کمبخت آج پھر اسی درجہ میں موجود ہے اب وہ شخص ذرا توجہ کے ساتھ گنیش بہاری کو دیکھنے لگا۔ اسوقت ان کا سارا بدن لرز رہا تھا، آنکھیں ابل آئی تھیں منہ خشک ہو کر کھل گیا تھا، ایسی عجب ہئیت کس کی نظر اپنی طرف نہ کھینچ لیتی اب گاڑی پانچی سے گذر چکی تھی اور گذشتہ شب قتل کا واقعہ پانچی اور ہاپوڑ کے درمیان ہی ہوا تھا درجہ کا دوسرا مسافر ذرا سنبھل کر بیٹھا بیگ کھولکر اس میں جھانکا پھر بیگ بند کر دیا، داہنا ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ اسوقت گنیش بہاری کے حواس قطعاً معطل ہو چکے تھے انہیں چند منٹ سے زیادہ اپنی زندگی کی امید نہ تھی وہ ہر لحظہ اس انتظار میں تھے کہ اب کوٹ کی جیب سے ہاتھ نکالا میری روح کو تن سے جدا کیا جائے گا اور بے تحاشا کہنے ہی والے تھے کہ اگر تم میری جان نہ لو تو میں (ناٹری) کی رقم میں سے تمہیں نصف روپیہ دینے کے لئے تیار ہوں کہ وہ شخص اپنی جگہ سے اٹھکر انکے سامنے آبیٹھا گنیش بہاری ایکدم چیخ اٹھے "ڈشٹ کہیں کے تو کون ہے" اس نے جواب دیا کہ "بابو صاحب میں لکھشمی بیمہ کمپنی کا ایجنٹ ہوں" اس جواب کے آخری لفظ اس کے لبوں پر تھے کہ ہاپوڑ کا اسٹیشن آگیا۔

حامد اللہ افسر

چند باتوں کا خیال رکھئے

(۱) نگار کی تاریخ اشاعت ہر چند ہر ماہ کی پندرہ تاریخ ہے، لیکن عموماً وہ پہلے ہی ہفتہ میں شائع ہو جاتا ہے، اس لئے اگر ۲۰ تک پرچہ نہ پہونچے تو فوراً اطلاع دیجئے۔ ورنہ پھر دوسری کاپی مفت نہ مل سکے گی۔

بعض حضرات دوسرے مہینہ کا پرچہ ملنے پر پہلے مہینہ کا پرچہ نہ پہونچنے کی شکایت کرتے ہیں، افسوس ہے کہ ان شکایات کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں۔

(۲) نمبر خریداری خط و کتابت میں درج کرنا ضروری ہے، بعض حضرات ڈاکخانہ کے رجسٹرڈ نمبر ۱۱۰۰۰ کو اپنا نمبر خریداری سمجھتے ہیں۔ نمبر خریداری فیدک کے اوپر داہنے جانب بلیو بلیک سیاہی سے درج ہوتا ہے اسکو ایک بار دیکھ کر کہیں نوٹ فرما لیجئے۔

(۳) طلبہ کے لئے زیادہ مناسب یہ ہے کہ وہ اپنے گھر یا کسی اور پتہ سے رسالہ طلب کریں۔ اسکول کے پتہ سے رسالہ طلب کرنا محفوظ طریقہ نہیں ہے۔

(۴) جن طلبہ یا لائبریریوں وغیرہ سے رعایتی چندہ لیا جاتا ہے وہ اگر میعاد خریداری ختم ہونے پر منی آرڈر روانہ کریں گے تو وی پی پوری رقم کا کیا جائے گا۔

(۵) حیدرآباد کے ان خریداروں سے جہاں انگریزی ڈاک خانہ نہیں ہے، یہ استدعا کیجاتی ہے کہ حتی الامکان رسالہ رجسٹرڈ طلب کریں اور یہ سالانہ اس صرف کو بھی برداشت کریں کیوں کہ سوائے اس کے کوئی صورت وہاں حفاظت سے رسالہ پہونچنے کی نہیں ہے۔

"منیجر نگار لکھنؤ"

انعام اللہ خاں یقین دہلوی

نام ونسب وشخصیت انعام اللہ خاں نام یقین تخلص نواب اظہرالدین خان بہادر مبارک جنگ دہلوی کے بیٹے نواب حمید الدین خان بہادر کے نواسے اور حضرت شیخ عبدالاحد فاروقی سرہندی کے پرپوتے تھے شجرۂ نسب انکا حضرت شیخ مجدد الف ثانی سرہندی کی وساطت سے خلیفہ دوم تک پہونچتا ہے دہلی میں پیدا ہوئے اور نقاش اول زبان ریختہ حضرت مرزا جان جاناں مظہر کے دامن تربیت میں پرورش پائی۔ مولوی قدرت اللہ شوق صدیقی اپنے تذکرہ طبقات الشعرا میں ان کے متعلق لکھتے ہیں۔

"جوانے بود خوش رو و خوشگو خوش خلق وقابل منظور نظر و تربیت کردۂ مرزا مظہر"

مولوی قدرت اللہ شوق ایک جید عالم تھے لہذا انکا یقین کی قابلیت کو تسلیم کرنا دلیل ہے اس بات کی کہ یقین فارسی وعربی کے فارغ التحصیل ضرور تھے مگر افسوس ہے کہ میر صاحب نے نکات الشعرا میں ان کے فضل وکمال کے مٹانے میں پوری کوشش صرف کردی ہے، ارشاد ہوتا ہے۔

"القصہ پرورش چند کہ یافتہ است کہ او شما نیز توانیم یافت اینقدر برخود چیدہ است کہ رعونت فرعون پشت دست برزمین میگذارد، بعد ملاقات اینقدر معلوم شد کہ دقیقہ سخن فہمی مطلق ندارد"

یقین ہی پر موقوف نہیں ہے میر صاحب کی "مشق ناز" نے "خون دو عالم" اپنی گردن پر لے رکھا ہے چنانچہ شاہ قدرت اللہ قدرت ایسے قادر الکلام کے بارے میں فرماتے ہیں "عاجز سخن است لیکن برائے خاطر عارف کہ از یاران درست فقیر است نوشتہ شد" مگر بخلاف میر صاحب کے میر حسن اسی "عاجز سخن" کو ان الفاظ میں سراہتے ہیں۔

"مرد یست از متوسلان میر شمس الدین فقیر درویش وضع خلیق طبع رتبہ قدرش رفیع وشیوۂ معانیش بدیع سمند تفکش درمیدان فارسی وہندی چالاک جست وتصویر بے نظیر معانیش در استخواں بندی الفاظ درست بندہ وے را یکبار در مشاعرہ لکھنؤ دیدہ ام"

اور تو اور استاد الاستاد شاہ حاتم بھی میر صاحب کی تنقید "خنجر بکف" سے ذبح ہوئے بغیر نہ بچے ان کے حال میں میر صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"مردیست جاہل ومتمکن ومقطع وضع ودیر آشنا غنا ندارد در یافتہ نمی شود کہ رنگ سخن بسبب شاعری است کہ ہیچ من دیگرے نیست باوضع او ہمین است"

شاہ صاحب موصوف مرزا سودا ایسے شخص کے استاد تھے پھر بھلا وہ میر صاحب کو کیا خاطر میں لاتے یہی وجہ ہے کہ میر صاحب ایسے ناراض ہیں قدرت کو "عاجز سخن" کہنا بھی کسی ایسے ذاتی مناقشے سے تعلق رکھتا ہے، اب رہے یقین تو انکی بابت اتنا سمجھ لیجئے کہ ایک نامی گرامی نواب زادہ جو ایوان شباب کی منزلوں سے گزر رہا ہو اور اس کے ساتھ ہی فضل وکمال بھی رکھتا ہو اسکی خودداری نفس کس مرتبہ

کی ہوگی میر صاحب کی نازک مزاجی کو یقین کا یہ طرزِ عمل بیشک کھٹکتا ہوگا اندریں حالات نکات الشعراء میں انہوں نے جو کچھ یقین کے بارے میں لکھا ہے اسکو ان کے جذبۂ انتقام یا رشک و حسد کا ایک کرشمہ سمجھنا چاہیئے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یقین کی زندگی ہی میں انکی سخنوری کے ڈنکے بج چکے تھے چنانچہ فتح علی گردیزی جو میر کی طرح یقین کا شناسا ہے اپنے تذکرہ میں لکھتا ہے۔

"صاحب تلاش معانی رنگین انعام اللہ خاں یقین پسر اظہر الدین خان بہادر مبارز جنگ نبیرۂ حضرت شیخ مجدد الف ثانی ست دو نواسۂ نواب جمیل الدین خاں مرحوم شہباز خیالش بصید معنی بلند پرواز است و ہمائے اندیشہ بر قلۂ سخن پر افشانی می نماید۔ اغراق ریختہ گوئی را بر طاق بلند گزاشتہ و تخم معنی در زمین سخن کاشتہ و آنچہ از طبعش سر زدہ از فرط شیوع و حسن قبول در تمام ہندوستان بر افواہ و السنہ جاری ست"

عبارت مندرجہ بالا اسقدر رفیع ہے کہ اسکے آگے میر صاحب کے خرافات کی پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں رہتی یہی نہیں بلکہ اس مشہور الزام کی بھی دھجیاں اڑجاتی ہیں جو یقین کے بعض معاصرین کی طرف سے ان پر عائد کیا جاتا ہے۔ اس الزام کی تشریح میر صاحب کی زبانی سنئے۔

"مرداں می گفتند کہ مرزا مظہر اورا شعر گفتہ می دہند و وارث شعر ہائے ریختہ خود گردانیدہ از قبول کردن ایں عقلش بندہ را خندہ می آید۔ ہمہ چیز بوراثت میرسد الا شعر مثلاً کسے کہ بر شعر پدر خود یا مضمون او تصرف شود در او نخواہند گفت تا بشعر استاد چہ رسد"

فتح علی کے خیالات سن چکے مگر وہ پھر غیر معروف شخص ہے لہذا تھوڑی دیر کے لئے خالی الذہن ہو کر میر صاحب کے بہنوئی میر محمد حسین کلیم دہلوی سے رجوع کیجئے دیکھئے وہ کیا کہتے ہیں انکا شعر ہے ؎

یقین کے شعروں پر ہیں بدگماں یعضے کہ اس کے نہیں　　　غلط ہے ہمنے یو جانا ہے کام مرزا جان جاناں کو

یہ بھی واضح رہے کہ میر محمد حسین کلیم کوئی معمولی آدمی نہیں شیخ محی الدین ابن عربی کی مشہور و معروف کتاب "فصوص الحکم" کے مترجم ہونیکی حیثیت سے ان کا پایۂ علمی بہت بلند ہے اس کے علاوہ میر صاحب نے انکو نکات الشعراء میں "کلیم ریختہ" اور میر حسن نے اپنے تذکرہ میں "استاد سخن" لکھا ہے، پس ایسے جامع کمالات شخص کی شہادت جسقدر وزنی ہوسکتی ہے محتاج بیان نہیں

فتح علی اور میر کلیم کے ماسوا مصحفی کے بیان سے بھی اس الزام رکیک کی پوری پوری تردید ہوتی ہے، استاذ الاساتذہ شیخ مصحفی فرماتے ہیں۔

"در دورۂ ایہام گویاں اول کسے کہ ریختہ را شستہ و رفتہ گفتہ ہمیں جوان بود بعد ازاں تتبعش بدیگراں رسیدہ"

آخری فقرہ کی تصدیق تذکرۂ فتح علی گردیزی سے بھی ہوتی ہے۔ فتح علی ظہور کے ذکر میں لکھتا ہے

"بخوش بیانی و نیکو بیانی مشہور است و ریختہ تتبع دیوان انعام اللہ خاں یقین میکند"

محمدہ کے ذکر میں لکھتا ہے۔

"در ریختہ تتبع دیوان انعام اللہ خاں یقین می نماید شعر را بشستگی و رفتگی می گوید"

خود یقین کو بھی اسکا دعویٰ ہے چنانچہ کہتے ہیں ؎

حق کو یقین کے یاد و برباد مت دو آخر　　　طرز یں سخن کی اس کی تم نے اڑا لیاں ہیں

یقین کا ہنگامۂ فخر یہیں پر ختم نہیں ہوتا ایک دوسری جگہ کہتے ہیں ؎

یقیں تائید حق سے شعر کے میداں کا رستم ہے
مقابل آج اس کے کوئی آسکتا ہے کیا قدرت

آگے چلکر اپنے سحر بیان اور اثر مقال کے متعلق فرماتے ہیں ؎

سخن کے سحر سے نزدیک ہے یقیں کہ کرے
مرے زمین غزل دیکھ کر یہ گردوں رقص

اس کے باوجود یقین کا خیال ہے کہ انہوں نے ریختہ کی طرف کما حقہ توجہ نہیں کی اگر کرتے تو غزل کی زمین آسمان بنجاتی چنانچہ فرماتے ہیں ؎

نہ آیا سر فرو اید ھر یقیں کی فکر عالی کا!
زمینوں کو وگرنہ ریختے کی آسماں کرتا!

اس بلندی پر پہونچنے کے بعد یقین کا یہ خیال ہو جاتا ہے کہ ان کے "لطف گفتگو" کو ان کے استاد کے سوا دوسرا شخص سمجھ ہی نہیں سکتا ؎

یقین کی گفتگو کے لطف کو بالفرض کب کوئی
بجز از حضرت استاد مرزا جان جاں سمجھے

انداز کلام بتاتا ہے کہ مرزا صاحب بھی لائق شاگرد کے لطف سخن کے معترف تھے لیکن یقین کی سعادت مندی دیکھئے وہ اگر ایک طرف اس اعتراف پر فخر کرتے ہیں تو دوسری جانب اپنی عجز طبع کے اقرار کو بھی ضروری جانتے ہیں حالانکہ ان کا ایسا کرنا صاف و صریح کسر نفسی کی مثال ہے ؎

شعر خاطر خواہ مجھ سے ہو نہیں سکتا یقیں
ہو جب استعداد ناقص پیر کامل کیا کرے

جس طرح یقین اس بات کے مدعی ہیں کہ میری "لطف گفتگو" کو مظہر کے سوا دوسرا نہیں سمجھ سکتا اسیطرح انکا بھی دعوی ہے کہ میں اور صرف میں ہی مظہر کا صحیح قدر شناس ہوں شاگردانہ عجز و منت پذیری کے رنگ میں اس مضمون کو ادا کرتے ہیں ؎

مجھ سے بے قدر کو کیا ہے جیوں یقیں حرف آشنا
کون پہچانے یقین بن حضرت مظہر کی قدر

آگے چلکر اپنی افتادگی و فروتنی اور بے پایاں عقیدت و محبت کا اسطرح اظہار فرماتے ہیں ؎

سایۂ بے شخص ٹھہرتا نہیں کہتا ہے یقیں
آپ سے مجھ کو جدا حضرت مظہر نہ کرو

اس پر بھی صبر نہیں آتا تو جوش ارادت کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں ؎

جوں نماز اپنے پہ شام و صبح لازم کر یقیں
حضرت استاد یعنی شاہ مظہر کی ثنا

یقین ایک اعلیٰ درجہ کے نباض سخن ہیں مگر یہ مرتبہ انکو شاگردانہ نیازمندیوں کی بدولت حاصل ہوا ہے اس خیال کو کلیہ کے رنگ میں بیان فرماتے ہیں ؎

طبیعت شعر کی اصلاح بن فاسد ہی رہتی ہے
وہی سمجھے یقیں یہ بات جو فن سخن جانے

دیوان یقین | یقین صاحب دیوان شاعر ہیں انکی زندگی ہی میں انکا دیوان اس حد تک مقبول ہو چکا تھا کہ بقول مصحفی دوسرے شعرا انکی تتبع پر مجبور ہو گئے تھے لیکن افسوس ہے کہ آجکل نایاب ہے بظاہر صرف ایک نسخہ کتب خانہ لندن میں محفوظ ہے جسے دیکھکر سید محی الدین صاحب قادری نے ایک مضمون بعنوان "دیوان یقین" جون ۳۸ء کے "نگار" میں سپرد قلم فرمایا ہے۔ یہ مضمون نہایت سرسری طور پر لکھا گیا ہے چنانچہ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے اسمیں مرزا سودا کے یہ دو شعر یقین سے منسوب پائے ؎

بد لا تر ے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے — اپنا ہی تو فریفتہ ہووے خدا کرے

گر ہو شراب و خلوت محبوب خوب رو — زاہد تجھے قسم ہے جو تو ہو تو کیا کرے

مضمون مذکور الصدر میں دوسرے شعر کا پہلا مصرعہ کسی قدر بدلا ہوا بھی ہے جس سے شعر بالکل مہمل ہو کر رہ گیا ہے ملاحظہ ہو۔

خلوت ہو اور شراب ہو معشوق خوبرو — زاہد تجھے قسم ہے جو تو ہو تو کیا کرے

ان فروگذاشتوں کے دیکھتے ہوئے قدرتاً یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یا تو قادری صاحب کی نظر سے "دیوان یقین" نہیں گزرا یا پھر انڈیا آفس میں جو نسخہ "دیوان یقین" کا موجود ہے وہ صدرجہ ساقط عن الاعتبار ہے۔

دیوان پیش نظر ہوتا تو یقین کی شاعری کے متعلق بہت کچھ معلومات میں اضافہ ہو سکتا تھا تاہم اگر قادری صاحب کی تحقیق پر اعتماد کیا جائے تو یقین کی شاعری صرف غزلوں تک محدود ہے اور ہر غزل پانچ پانچ شعر پر مشتمل ہے یہ دونوں باتیں شاید نئی ہیں جو قادری صاحب کے مضمون شائع ہونے سے پہلے پردۂ خفا میں تھیں دوسری شق سے یہ بات بھی مترشح ہوتی ہے کہ غالباً یقین نے اپنے کلام کا انتخاب شائع کیا ہے، مجھے اتفاق سے ایک[1] پرانی کتاب مسمی بہ "چمن بے نظیر" میں یقین کی چار غزلیں دستیاب ہوئی ہیں جن میں سے تین غزلیں قادری صاحب کے بیان کردہ خصوصیت پر پوری اترتی ہیں لیکن چوتھی غزل میں بجائے پانچ شعر کے چار شعر ہیں ممکن ہے کہ ایک شعر چھوٹ گیا ہو اس خیال کو اور بھی تقویت ہوتی ہے جب "چمن بے نظیر" کی اور فروگذاشتوں پر نظر جاتی ہے اب رہی یہ بات کہ ان غزلوں کو انعام اللہ خاں یقین کا کلام سمجھنے کی کیا ضمانت ہے تو اس کے جواب میں غزلہائے مذکورہ میں سے پہلی غزل کا مقطع پیش کیا جا سکتا ہے ؎

جوں نماز اپنے پہ شام و صبح لازم کر یقین — حضرت استاد یعنی شاہ مظہر کی ثنا

یہ شعر بالتخصیص یقین ہی کا ہے جیسا کہ فتح علی گردیزی کی عبارت ذیل سے ظاہر ہوتا ہے۔

"استفادۂ سخن از افادۂ مرزا مظہر گرفتہ چنانچہ گوید":-

جوں نماز اپنے پہ شام و صبح لازم کر یقین — حضرت استاد یعنی شاہ مظہر کی ثنا

البتہ دوسری تیسری اور چوتھی غزل کے متعلق کوئی ایسا روشن ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا تاہم رنگ کلام صاف بتاتا ہے کہ یہ وہی "جوان میر" ہے جس کو خدائے سخن میر تقی میر کے محسود ہونے کا شرف حاصل ہے۔

"یقین کی شاعری" یقین کی شاعری خالص جذباتی شاعری ہے قریب قریب ہر شعر میں سادگی اور جوش اپنی پوری قوت کے ساتھ کار فرما ہے، اسیر حسن ادا اور صفائی زبان کی دلآویزیاں مستزاد چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

انجام محبت سے پشیمان ہونا عام موضوع سخن ہے یقین بھی اس سنت دیرینہ کو تازہ کرتے ہیں مگر کب جب بتوں کی نامہربانیاں نشۂ غفلت سے ہشیار کر کے خدا کے وجود کا قایل کر دیتی ہیں اس پر بھی میلان طبیعت چونکہ بلند ہے لہذا اجتناب و گریز کا خیال پیدا نہیں ہوتا ؎

جو کچھ کہیں یہ تجھ کو یقیں ہے سزا تری — بندہ جو تو بتوں کا ہوا کیا خدا نہ تھا

---

[1] یہ کتاب مختلف شعرائے فارسی و اردو کے کلام کا مجموعہ ہے۔

واعظ کی پگڑی اچھالنا رندانِ میکدہ کا پرانا دستور ہے یقین بھی اس خوش فعلی کے مرتکب ہوتے ہیں مگر دیکھئے کس خوبی کے ساتھ کیفیت دستی کی آڑ میں پناہ لیکر اپنی معصومیت ثابت کرتے ہیں۔ ان دونوں شعروں میں استفہام کا لطف وجدانی ہے

خفیف مجھ سے الجھکر عبث ہوا واعظ　　کہ میں تو مست تھا اسکو بھی کیا شعور نہ تھا

دردِ محبت کا ہر لحظہ ایک مستقل کرنجانی ہے لیکن مے مردافگن عشق کا پامرد حریف مزے لے لیکر زہر آب غم کے یہ تلخ گھونٹ پیتا ہے اور یہ وصف امکان وہ نہیں کرتا جس سے تمام مشکلات کا دفعتاً خاتمہ ہوجائے کیا اس سے بڑھکر ایثار عاشق کا کوئی اور درجہ خیال میں آسکتا ہے ؎

تری الفت سے ہم ناخوش نہیں آتا مجھے ورنہ　　یہ ایسا کار آساں اس قدر دشوار کیوں ہوتا

ہنگامۂ بہار آخر ہوا اور بخیۂ چاک گریباں کا ہنگام آپہونچا مگر یقین کا نشۂ دیوانگی خمار ہوش سے تبدیل ہونیکا ننگ قبول نہیں کرتا ؎

بہار آخر ہوئی ہے اتو سینے دے گریباں کو　　یقیں کرتا ہے کوئی اسقدر دیوانہ پن بس کر

اسقدر سنگلاخ زمین میں ایسا شگفتہ شعر کہہ لینا یقین کی قادر الکلامی کا بین ثبوت ہے۔

"داغ درون سینہ" کو ہمیشہ چشم و چراغ عشاق کا درجہ حاصل رہا ہے یقین بھی اس "شعلۂ خرمن نور" کی شادابیوں کے رہین منت ہیں ؎

یہ سینہ عشق سے محروم درد و داغ نہیں　　ہزار شکر کہ یہ ملک بے چراغ نہیں

محبت کی دیوی پر عشاق کا بھینٹ چڑھ جانا متواترات شاعری میں داخل ہے لیکن یقین نے جس طرح یہ خیال نظم کیا ہے جواب نہیں ہوسکتا کیا بلحاظ شاعری اور کیا بلحاظ واقعیت۔ راقم الحروف کی رائے میں "گل سرسبد" دیوان یقین یہی شعر ہے ؎

یقیں مارا گیا جرم محبت پر زہے طالع　　شہادت اسکو کہتے ہیں سخاوت اسکو کہتے ہیں

عاشق کی روداد محبت ایک مشہد تمنا ہے ایک محشر عبرت ہے اسکو سنکر دل قابو میں رکھنا از قبیل محالات ہے اس پوری داستان کو صرف ایک لفظ "افسوں" میں اس طرح لکھا دیا ہے کہ تعریف نہیں ہوسکتی ؎

روداد محبت کی مت پوچھ یقیں مجھ سے　　کچھ خوب نہیں سننا افسوں ہے یہ افسانہ

عام طور پر شعرا "عشق بلا سنج" کی تصویر کا ایک ہی رخ دکھاتے ہیں مگر یقین کی نظر اس سے بالاتر ہے وہ ناکام محبت ہوسکنے کے باوجود بھی اس "مایۂ نعمت" سے اپنے کام و دہن کو ایک حد تک لذت یاب پاتے ہیں ؎

اگرچہ عشق میں آفت ہے اور بلا بھی ہے　　نرا برا نہیں یہ شغل کچھ بھلا بھی ہے

عاشق کی جور و وفا کا اثر معکوس ایک پامال مضمون ہے لیکن یقین اسی پامال مضمون کو حسن ادا سے معجزہ بنادیتے ہیں ؎

جور و جفا میں یار بہت ہوگیا دلیر　　کرنے کو کی پہ راس نہ آئی وفا مجھے

فرمایۂ عشاق کے دعیات محبت کا سدرۃ المنتہیٰ وصل معشوق ہے اور بس، لیکن ایک حقیقی عاشق کا مقام اس سے ورا الورا ہے وہ صرف رضائے معشوق چاہتا ہے خواہ بصورت وصل حاصل ہو خواہ بشکل ہجر شعر کی جسقدر تحسین کی جائے کم ہے ؎

گزر جا وصل سے گر ہجر میں دیکھے رضا انکی　　محبت میں یقیں لیتا ہے نام مدعا کوئی

فلسفۂ ہمہ اوست کی رو سے حسن صنم جلوۂ صمد کا آئینہ دار ہے پس جو لوگ اس "اتحاد و مجاز و حقیقت" کے راز داں ہیں وہ "باطل" کو "حق" سمجھتے تھے اور اس "حق" سے روگردانی کرنے والے کو باطل آشنا جانتے ہیں ؎

حق مجھے باطل آشنا نہ کرے　　میں بتوں سے پھروں خدا نہ کرے

لاجواب مطلع ہے۔

دیوانۂ عشق فصل بہار آنے سے قبل ہی احتیاطاً پابہ زنجیر کردیا جاتا ہے لیکن تبسم گل کی اثر آفرینیوں کا یہ شیدائی اس قید بیجا سے مطلق نہیں گھبراتا وہ اپنی قوت ارادی کے بھروسہ پر محافظان زندان کو متنبہ کرتا ہے کہ تم نے مجھے قید تو کردیا ہے مگر تمہارا یہ حصول استبداد میرے ولولوں کو دبا نہیں سکتا ؎

اگر زنجیر میرے پاؤں میں ڈالی تو کیا ہوگا　　بہار آنے دو میرا ہاتھ ہے اور یہ گریباں ہے

بادصبا کے انفاس جانفزا سے کلیوں کا غنچۂ خاطر کھل جاتا ہے اور وہ کلی سے پھول بن جاتی ہیں اتنا سا مضمون ہے لیکن یقین جو ایک عاشق ستم زدہ ہیں اُن کو بادصبا کے خرام ناز میں جلوۂ قیامت نظر آتا ہے اور غنچوں کی شگفتگی میں چاک گریباں کا عالم یہ شعر حسن التعلیل کی بہترین مثال ہے ؎

نظر آتا نہیں ثابت گریباں ایک غنچہ کا　　چمن پر یہ ستم کرتا ہے اے بادصبا کوئی

ناصح مشفق کا دیوانگان عشق کو پند و نصیحت فرمانا ایک قیانوسی مضمون ہے مگر یقین نے حسن ادا سے اس میں وہ تازگی پیدا کی ہے کہ بلید و شاید ؎

گریباں چاک کرنے سے کسی کے کیا تجھے ناصح　　ہمارے ہاتھ جانیں اور ہمارا پیرہن جانے

دوسرے مصرعہ کے تیور اس قیامت کے ہیں کہ جواب نہیں ہوسکتا۔

محبت ایک مرض جانستاں ہے اس معمولی سی بات کو کس جوش و خروش کے ساتھ بیان فرماتے ہیں ؎

مفت کب آزاد کرتی ہے گرفتاری مجھے　　جی ہی لیکر چھوڑے گی آخر یہ بیماری مجھے

بتان سنگدل اپنے پرستاروں کے ساتھ ہمیشہ سے بدسلوکیاں کرتے چلے آتے ہیں لیکن یقین ایک خوددار عاشق ہیں وہ اپنی مہر و وفا کو بجوں غلتیدہ دیکھکر کم حوصلگی سے نہیں بلکہ فرط غیرت سے چیخ اٹھتے ہیں ؎

اپنے بندوں کو جلا کر داغ کرتے ہیں یقیں　　ان بتوں کی ضد سے ہوجائیں مسلماں تو سہی

صرف انہیں شعروں پر موقوف نہیں ہے یقین کا قریب قریب سارا کلام یکساں شستگی و رفتگی رکھتا ہے چنانچہ مصحفی لکھتے ہیں۔

"در تمام دیوانش فصاحت و بلاغت زبان استاد جلوہ ظہور می دہد"

یہیں سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یقین کی سخن گوئی کا انکار جو انکے بعض معاصرین کی طرف سے کیا گیا اسکی تہہ میں دراصل یقین و مظہر کی "ہمزبانی" کا راز پوشیدہ ہے اور یہ بات ہر شاگرد کے لئے موجب فخر ہوسکتی ہے کہ اس کے کلام کو غیر متوقع طور پر بلند دیکھکر اس کے

استاد سے منسوب کیا جائے اس مسئلہ پر پوری وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی جا چکی ہے اعادہ و تکرار بیکار ہے لیکن پھر بھی اتنا اور سن لیجئے کہ ملک الشعراء مرزا رفیع سودا ایسے شخص نے یقین کے ایک مصرعہ کی تضمین کی ہے جو انکے کلیات میں موجود ہے تضمین کردہ کا صرف مقطع پیش کرتا ہوں۔

مصرعہ کو یقیں تیرے سودا نے سنا تھا کل　　روتا ہے وہ تب سے یوں برسے ہے گویا بادل
ہے رعد نمط نالاں بجلی کی طرح بے کل　　پھر پھر کے وہ پڑھتا ہے ہاتھوں کتئیں مل مل

"کیا کام کیا دل نے دیوانے کو کیا کہئے"

اس تضمین سے ایک طرف تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بقول فتح علی گردیزی یقین کا سارا کلام انکی زندگی ہی میں فرط شیوع اور حسن قبول سے زبان زد خاص و عام ہو گیا تھا اور دوسری جانب یہ امر پایۂ ثبوت کو پہونچتا ہے کہ مرزا سودا یقین کے علو منزلت کو تسلیم کرتے تھے ورنہ ایک نوزائیدہ کے کلام کو ہرگز قابل اعتنا نہ سمجھتے۔

مضمون کی طوالت کے خوف سے ہر شعر پر علیحدہ علیحدہ تبصرہ کرنیکے بجائے یقین کا جس قدر کلام مجھے بہم پہونچ سکا ہے وہ سب یکجا کئے دیتا ہوں قارئین کرام خود فیصلہ فرمائیں۔ پہلے پوری غزلیں لکھتا ہوں۔

کون کرسکتا ہے اس خلاق اکبر کی ثنا　　نارسا ہے شان میں جس کی پیمبر کی ثنا
سربراہ اس منہ سے ہوسکتی ہے کب نعت رسولؐ　　یا ابوبکرؓ و عمرؓ عثمانؓ و حیدرؓ کی ثنا
یہ زباں قابل ہے کب اس بات کے جو کیجئے　　حضرت زہراؓ کی اور شبیرؓ و شبرؓ کی ثنا
نام اگر کا مجھے انصاف سے لینا نہیں　　کی ہے ساری عمر تا کان ستم گر کی ثنا
جوں نماز اپنے پہ شام و صبح لازم کر یقیں　　حضرت استاد یعنی شاہ مظہر کی ثنا

خوش نہیں آتا ہے بن مجنوں ہمیں صحرا ہنوز　　ان غزالوں سے ہمارا جی نہیں لگتا ہنوز
اب تلک کرتا ہے تیشہ کام میں پتھر کے دخل　　مانتا ہے کوہکن کے نقش کو خارا ہنوز
مونکالے پر بھی مستی حسن کی اتری نہیں!　　بھر رہا ہے مے سے یہ معشوق کی مینا ہنوز
باوجود اسکے کہ ہے زخموں کے مارے خوں میں غرق　　آب خنجر کو ترستا ہے جگر میرا ہنوز
ہے یقیں کا عشق میں ہر روز بان احتیاج　　اس پہ کم ہوتی نہیں اس کی یہ استغنا ہنوز

رات دن خوباں کو ہے دلہائے مفتوں کا تلاش　　روز و شب لیلیٰ کو تھا درپیش مجنوں کا تلاش
اشک[1] رنگیں سے گلی کو اس نے شہد کر دیا　　مر گئے ہیں دیکھ کر اس چشم پر خوں کا تلاش

---

[1] چمن بے نظیر میں یہ مصرعہ اس طرح تھا "اشک رنگیں سے گلی کو تو نے شہد کر دیا" مگر "تو نے" یقیناً سہو کاتب ہے "اس نے" ہونا چاہئے۔

جس طرح سے ڈھونڈتے ہیں لوگ خاطر باصفا اس طرح رہتا ہے مجھکو جان محزوں کا تلاش
جی سے میرے لگ رہی ہے سانولوں کی جستجو جس طرح رہتا ہے افیونی کو افیوں کا تلاش
شاعری سب لفظ و معنی سے ہے لیکن یقیں کون سمجھے یاں تو ہے ایہام مضموں کا تلاش

کب سے زنجیر مجھ مجروح دیوانے کی عوض پہونچی تھی کان تک اس زلف یکتا کی عوض
گرمی اہل بزم سے مت کر کہ میں ہوتا ہوں داغ شمع کی خدمت میں ہے اپنے ہی پروانے کی عوض

ہر گھڑی صحرا نشینی پہ نہ کر جرأت یقیں آ گئی تھی راس مجنوں کو بیاباں کی ہوا

آشنا کوئی جہاں میں کبھو بے وفا نہ ہوا ملتے ہی تیرے مجھ سے یہ دل آشنا نہ تھا

سر پر سلطنت سے آستان یار بہتر تھا ہمیں ظل ہما سے سایہ دیوار بہتر تھا
مرا دل مر گیا جس دن سے نظارے سے باز آیا یقیں پرہیز اگر کرتا نہ یہ بیمار بہتر تھا

شکوہ حسن سے آنسو بہانے سوکھ جاتے ہیں یقیں سورج کے آگے کب اثر رہتا ہے شبنم کا

اس قدر غرق لہو میں یہ دل زار نہ تھا جب حنا کو ترے پاؤں سے سروکار نہ تھا
دل میں زاہد کے جو جنت کی ہوائی ہے ہوس کوچۂ یار میں کیا سایۂ دیوار نہ تھا

آنکھ سے نکلے پہ آنسو کا خدا حافظ یقیں گھر سے جو باہر گیا لڑکا سو ابتر ہو گیا

کہوں میں کیونکہ نہ صبح بہار تجھ کو کہ آج جو تو چمن میں نہ تھا گل کے منہ پہ نور نہ تھا
تری جدائی میں کیا کیا جفا اٹھائی ہے مرے جو پاس تو آتا وفا سے دور نہ تھا
مرا جو کام وفا تھا سو ہو سکا نہ یقیں دگرنہ اس کی جفا میں تو کچھ قصور نہ تھا

بتاں خون کرکے میرا اب لگے آپس یوں کہنے　　یہ کافر جیتا رہتا تو بت خانے کے کام آتا

نہیں معلوم ابکی سال پیمانے پہ کیا گزرا　　ہمارے توبہ کرنے سیتی میخانے پہ کیا گزرا

پلو کو اپنے یقیں کی چشم گریاں پہ نہ رکھ　　مت کر اے گل آبجو میں دامن رنگیں خراب

تری آنکھوں کی کیفیت کو میخانے سے کیا نسبت　　نگہ کی گردشوں کو دور پیمانے سے کیا نسبت

فصل گل بھی آن پہونچی دیکھئے کیا ہو یقیں　　ابکی چلتا ہے جنوں پر جی ہمارا بے طرح

سچ کہو اے بلبلو کس باغ سے آتی ہو تم؟　　ہے ہمارے بھی نہیں کچھ آشیانے کی خبر

تو نہ تھا حیف یقیں ورنہ دوانہ ہوتا　　آج اس طرح کا دیکھا ہے پری زاد کہ بس

ناصح سے مجھکو غم نے کیا شرمسار حیف　　سو بار پھٹ چکا یہ گریباں ہزار حیف

کوئی دن اور کرنے دو جنوں مجکو بہاراں میں　　عبث سیتے ہو اسکو کیا رہا ہے اب گریباں میں

شکوہ جفائے یار سے کرنا وفا نہیں　　بندوں کو اعتراض خدا پر روا نہیں
سو سو ہے التفات تغافل میں یار کے　　بیگانگی سے اس کی کوئی آشنا نہیں
کعبے میں ہم گئے نہ گیا پر بتوں کا عشق　　اس درد کی خدا کے بھی گھر میں دوا نہیں

فکر مرہم کی مرے واسطے مت کر ناصح　　خوب ہوتا نہیں اس عشق کا ناسور کبھو

عشق میں ملتی نہیں راحت اگرچہ کوہکن　　جان شیریں دیجئے تب خواب شیریں کیجئے

یقیں کے واقعے کی سن خبر وہ بدگماں بولا
یہ دیوانہ تو ایسا کچھ نہ تھا بیمار کیا کہیے

شب ہجراں کی دہشت کو تو اے ہمدرد کیا جانے
جو دن پڑتے ہیں راتوں کو مجھے تیری بلا جانے

خطا ہے مفت مر کر بار کیوں دیجے رقیبوں کو
ہماری ہم سے پوچھو کوہکن کی کوہکن جانے

یقیں جاتا رہا گھر بلبلوں کے ساتھ جانے دو
کوئی اس بے مروت دل کو اپنے پاس کیا رکھے

پڑیں پتھر الٰہی اس محبت پر کہ ہو بیکس
مرے فرہاد اور پرویز شیریں کو اٹھا لائے

یقیں ہوا مجھے قطرے سے اشک کے معلوم
نہ اٹھ سکے جو کوئی آنکھ سے گرا ہووے

جسکو منظور ہو مرنا اسے جینا ہے عذاب
ہے دمِ پاکِ مسیحا دمِ شمشیر مجھے

نہ نکلا کام کچھ اس صبر سے اب نالہ کرتا ہوں
مری فریاد رس شاید مری فریاد کو پہونچے

پریشاں خاک سے اٹھتا ہے سنبل اس سے ظاہر ہے
کھلے ہیں موئے لیلیٰ اب تلک ماتم میں مجنوں کے

دعا مستوں کی کہتے ہیں یقیں تاثیر رکھتی ہے
الٰہی سبزہ جتنا ہے جہاں میں تاک ہو جائے

کیا دل ہے اگر جلوہ گہِ یار نہ ہووے
ہے طور سے کیا کام جو دیدار نہ ہووے

ناصحو! یہ بھی کچھ نصیحت ہے
کہ یقیں یار سے وفا نہ کرے

جوان مرگی | افسوس ہے کہ عین عنفوان شباب یعنی پچیس ۲۵ سال کی عمر میں یقین کو چرخ کج رفتار کی نظر کھا گئی ورنہ بقول مصنف گلِ رعنا

اگر جیتے رہتے تو میر ہوں یا مرزا کسی کا چراغ ان کے سامنے نہیں جل سکتا تھا۔

تمام تذکرے متفق ہیں کہ یقین اپنے باپ کے ہاتھ سے مارے گئے مگر کیوں مارے گئے، اسکو مرزا علی لطف صاحب تذکرہ گلشن ہند کی زبانی سنئے، مارے جانے کو اس کے بعضے تو یوں نقل کرتے ہیں کہ احمد شاہ بادشاہ کے "عہد سلطنت میں بہ سبب کسی حرکت نامعقول کے کہ وہ صادر ہوئی تھی یقین سے، باپ نے اس کے اسکو قتل کیا اور نعش کو اسکی دریا میں بہا دیا، اور بعضے کہتے ہیں کہ ارتکاب اس عمل شنیع کا گزرا تھا اسکے باپ کے وصیان میں کہ وہ ممنوع ہے جمیع ادیان میں۔ یقین نے اس باب میں اکثر متنبہ کیا، ایکدن اس نے خفا ہوکر اس بیچارے کا جی ہی لیا"

تذکرہ گلشن ہند ترجمہ ہے علی ابراہیم خاں خلیل کے تذکرہ گلزار ابراہیمی کا لیکن اکثر ناقص ہے چنانچہ خط کشیدہ فقرے کو بار بار پڑھ جائیے صحیح مطلب سمجھ میں نہ آئے گا تاوقتیکہ علی ابراہیم خاں خلیل کی عبارت پیش نظر نہ رکھی جائے، علی ابراہیم خان لکھتے ہیں۔

"گویند بعہد احمد شاہ بادشاہ بنابر امر نالائمے کہ از یقین صادر می شد او را پدرش کشت و بدریا انداخت و بعضے گویند پدرش ارتکاب امرے داشت کہ ممنوع جمیع ادیان بود او منع می نمود پدرش بر آشفت و خونش بریخت"

مگر مولوی قدرت اللہ شوق نے شق دیگر کا ذکر نہیں کیا ہے انکے الفاظ یہ ہیں "در عین عنفوان جوانی پدرش نسبت بقصورے کہ از یقین بوقوع آمدہ باشد کشت یقین است کہ مغفور شدہ باشد" یہ دونوں متباین بیانات اسقدر مبہم ہیں کہ انکو پڑھکر کسی قطعی نتیجے پر پہونچنا دشوار ہے، البتہ مولوی عبد الغفور نساخ نے سخن شعرا میں حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھا دیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

"احمد شاہ بادشاہ کے عہد میں پچیس[۲۵] برس کی عمر میں تہمت زنا پر اپنے والد ماجد کے ہاتھ سے بےگناہ شہید ہوئے" نساخ کا تذکرہ اگرچہ بہت بعد کو لکھا گیا ہے مگر یقیناً انہوں نے یہ روایت کسی مستند ماخذ لی ہوگی اب ان تمام واقعات پر ایک تنقیدی نظر ڈالئے تو معلوم ہوتا ہے کہ یقیناً عشق خونریز کا سفاک ہاتھ یقین کی ہلاکت کا باعث ہوا، خود یقین نے اپنی قبل از وقت موت کی پیشینگوئی ایک شعر میں عمداً گیا اضطراراً اس طرح کی ہے ؎

یقیں مارا گیا جرم محبت پر زہے طالع شہادت اس کو کہتے ہیں سخاوت اسکو کہتے ہیں

اس شعر کے مفہوم سے بھی یہی مستنبط ہوتا ہے کہ یقین کسی "ترک جنگجو" کے گھایل ضرور تھے اس کے علاوہ عام رنگ کلام بھی یہی بتاتا ہے واقعہ بہرحال کچھ ہو یہ مسلم ہے کہ یقین کی جواں مرگی اور بے گور و کفن لاش ایک عظیم حزنیہ ادبیہ سے تعبیر کرنے کے لایق ضرور ہے۔

اولاد | یقین کے سلسلہ ذکر میں کسی صاحب تذکرہ نے انکی اولاد کے متعلق ایک حرف نہیں لکھا اور حقیقت یہ ہے کہ ان بزرگوں کے زمانے تک تذکرہ نویسی کا معیار ہی اس قدر بلند نہ تھا جو ان خفیف خفیف باتوں کی طرف توجہ کرتے، لیکن مجھے ورق گردانی کی کافی محنت اٹھانیکے بعد سخن شعرا سے ان کے تین بیٹوں کا حال معلوم ہوا (۱) صمصام الدین خاں احمد، (۲) مرید حسین خاں مرید (۳) مقبول نبی خاں مقبول

ان تینوں کی بابت نساخ نے جو کچھ لکھا ہے وہ انہیں کے الفاظ میں پیش کرتا ہوں۔

۱۔ "احمد تخلص صمصام الدین خلف انعام اللہ خاں یقین مقیم دہلی سپاہی پیشہ تھے" اسکے بعد یہ دو شعر انکے نقل کئے ہیں ؎

تن کو جلائے یا کہ تو آنسو بہائے شمع بنتی نہیں یہاں تجھے بن سر کٹائے شمع

فراق گلرخاں میں کھا کے داغ آہستہ آہستہ	کیا سینہ کو میں نے اپنے باغ آہستہ آہستہ

۲- مرید تخلص مرید حسین خاں دہلوی خلف انعام اللہ خاں یقین"

درد اور غم میں مبتلا ہیں ہم!	دردمندوں کے پیشوا ہیں ہم
مثل سیماب کیوں نہ دل تڑپے	آئینہ رو سے اب جدا ہیں ہم
تھا وعدہ سر شام کا پھر اب ہے سحر کا	ڈرتا ہوں کہیں صبح کی پھر شام نہو وے

۳- مقبول تخلص مقبول نبی خاں خلف انعام اللہ خاں یقین شاگرد ثناء اللہ خاں فراق

دسترس رکھتا ہے جو پائے حنائی تک رقیب	یا الٰہی ہاتھ اوس کا ہووے شانے سے جدا
نہ لگا تو گلے سے یار افسوس!!	آہ افسوس صد ہزار افسوس!!
ہر بات میں رکاوٹ طرز ادا تو دیکھو	ہر آن میں بگڑنا مہر و وفا تو دیکھو

یوں تو یہ سب شعر اپنی اپنی جگہ صفائی اور برجستگی کا ایک اچھا نمونہ ہیں لیکن مرید حسین خاں مرید کا یہ شعر طرز یکتائی دارد ؎

تھا وعدہ سر شام کا پھر اب ہے سحر کا	ڈرتا ہوں کہیں صبح کی پھر شام نہو وے

تلامذہ | گلستان سخن، آثار الشعرائے ہنود، اور سخن شعرا میں لالہ شیو سنگھ ظہور دہلوی اور لالہ جسیا رام عمدہ کشمیری (برادر راجہ دیا رام ہنسؔ کشمیری مقیم دہلی) کو یقین کا شاگرد لکھا ہے لیکن تذکرہ فتح علی گردیزی سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ یقین کے متبع تھے نہ کہ شاگرد ممکن ہے فتح علی کا بیان صحیح ہو اور بعد کے تذکرہ نویسوں نے اس اتباع کو شاگردوں کا مرادف سمجھا ہو، معنوی حیثیت سے دیکھا جائے تو اتباع بھی ایک قسم کی شاگردی ہے پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ ظہور و عمدہ کو یقین کا شاگرد نہ کہا جائے، انکے ساتھ ہی اگر انکے "طرز سخن" کا اتباع دوسرے شعراء نے بھی کیا ہے جیسا کہ مصحفی کے بیان اور خود انکے ایک شعر سے ظاہر ہوتا تو بلاشبہ ان سب کو بھی یقین کا خوشہ چین ماننا پڑیگا اور یہی وہ بات ہے جو میر و مرزا کی کمالات کو بھی "نقش ثانی" کا درجہ دینے کی سفارش کرتی ہے، اس سلسلے میں یہ روایت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ میر مظفر حسین ضمیر استاد مرزا دبیر نے جب مرثیے کے میدان میں علم جدت و اجتہاد بلند کیا تو صاف صاف کہدیا ؎

دس میں کہوں سو میں کہوں یہ درد ہے میرا	اس طرز میں جو کہدے وہ شاگرد ہے میرا

ظہور و عمدہ کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے۔

ظہور |
بہا اس بے بہا کا کیا بھلا ہو	سر قاتل پہ جس کا خوں بہا ہو
چشم گریاں حسن سے معمور ہے	چاندنی برسات کی مشہور ہے

عمدہ |
خراب مجھکو نہ کر جان آشنا ہوکر	برا کرے ہے کسو سے کوئی بھلا کہہ کر
مرے تابوت پر حاجت نہیں پھولوں کی چادر کی	کہ میری نعش پر وہ سر گل اندام ہو وے گا

فتح علی گردیزی ظہور کو "مشہور خوش بیان و نیکو بیان" بتاتا ہے اور عمدہ کے حال میں لکھتا ہے کہ اسکے شعر "شستہ و رفتہ" ہوتے ہیں۔

حالات عرفی پر ایک نظر
اور
عبدالمالک صاحب سے تاریخی اختلاف

مجھے عبدالمالک صاحب آروی کے مضمون "خواجہ محمد شیرازی متخلص بہ عرفی" مطبوعہ نگار بابت ماہ دسمبر سنہ ۱۹۳۸ء سے عرفی کے بعض حالات
ندگی کے متعلق اختلاف ہے مجھے اس میں کئی غلطیاں محسوس ہورہی ہیں، اپنی تحقیقات کی بنا پر انہوں نے درست تحریر فرمایا لیکن میں ایسی
تاب کی مدد سے انکے دعاوی کو باطل ٹھہرا رہا ہوں جو سنہ ۱۰۳۶ ہجری میں پایۂ تکمیل کو پہونچی ہے اسکا مؤلف ایک محتاط شخص تھا اور جہاں تک ممکن تھا
س نے پوری تحقیق سے کام لیا۔ جن اشخاص کا ذکر اس نے اپنی کتاب میں کیا ہے اگر وہ ان سے خود ملا جس سے وہ مل سکا انکے قریبی رشتہ داروں سے
الات پوچھ کر اپنی کتاب میں درج کئے ہیں۔ عرفی کے ذیل میں لکھتا ہے کہ اس کے خالو شمس الانام شیرازی سے حالات دریافت کر کے لکھے گئے
ں۔ اس کتاب کا نام میخانہ ہے مؤلف کا نام ملا عبدالنبی فخر الزمانی قزوینی ہے، یہ نایاب مگر گراں قدر صحیفہ قریباً ناپید ہوچکا تھا خدا بخشے مولینا شبلی
انی مرحوم کو، انہوں نے پہلے پہل اس کتاب کا ذکر اپنی مشہور عالم تصنیف شعر العجم کے ماخذ بیان کرتے ہوئے کیا، اسکے بعد مسیز عطر چند کپور
ینڈ سنز انارکلی لاہور نے بہ تحشی و تصحیح ایم محمد شفیع صاحب ایم۔ اے معلم عربی سنہ ۱۹۲۶ء میں شائع کی۔ اب یہ کتاب پنجاب یونیورسٹی لاہور کے امتحانات
شرقیہ کے درجہ منشی فاضل میں شامل ہے۔ میری تحقیق کا دارومدار اسی پر ہے۔

م ونسب مؤلف میخانہ فرماتے ہیں "حقیقت حال آں عندلیب گلستانِ نکتہ پردازی از خالواو شمس الانام نام شیرازی استماع نمودہ
دریں اوراق پریشاں تحریر نمود" اس سے ظاہر ہے کہ عرفی کے حالاتِ زندگی کے متعلق کسی مصنف کے قول کو شمس الانام کے
ل پر فوقیت و ترجیح نہیں۔ مؤلف میخانہ فرماتے ہیں۔ "کہ چوں ایں ضعیف مآلِ حالِ آں طوطیِ شکر مقال از و استفسار نمود گفت :- نام پدر عرفی
اجہ بلوی شیرازی است و ایں خواجہ بلوی در شہر مذکور در دفتر خانہائے شاہی تشبلی، از اشغال حکام آنجا اشتغال داشت و نام پسرش محمد حسین
در صغر سن درمیانِ مردم بمولانا صیدی ملقب گردید یاران شیراز باد عرفی تخلص دادند" اس سے معلوم ہوا کہ عرفی کا نام جمال الدین نہیں جیساکہ
م تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے اور نہ خواجہ سید محمد ہے جیساکہ عبدالمالک صاحب نے تحریر فرمایا۔ عرفی کے والد کا نام خواجہ بلوی ہے۔ نہ کہ
ن الدین علی علوی۔

اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ عرفی پہلے صیدی تخلص میں کرتا تھا عرفی تخلص دوستوں نے تفویض کیا نہ کہ والد کے عہدے کی نسبت سے۔

ادت ووفات عرفی سنہ ۹۶۶ ہجری میں بمقام شیراز پیدا ہوا۔ اور سنہ ۱۰۰۲ ہجری میں بمقام لاہور وفات پائی" ملا عبدالنبی" لکھتے ہیں
ہنوز سنش بچہل نرسیدہ بود کہ در لاہور در سن اثنی و الف عالم فانی را وداع کرد روزے از روزہا تقریباً بعد از بناہ عزت

عالی دستگاہ میرزا نظام قزوینی کہ بخشی و دیوان دار العیش کشمیر بود شنیدم کہ گفت در وقتے کہ خبر بیماری عرفی بسمع مبارک جہاں پناہ نجم سپاہ جلال الدین اکبر بادشاہ رسید بمن حکم فرمود تا من بہ بالین او رفتہ بر مآل احوالش اطلاع یابم و حقیقت مردن و زیستن او را بعد از ملاحظہ بعرض رسانم چوں نزدیک او شدم دیدم کہ کار بر او دشوار شدہ و نفسش بشمار افتادہ پرسیدم چہ حال داری جواب داد کہ "" دو کشش و کشش پنج " (اس سے بزرگ کی رباعی کی تصدیق نہیں ہوئی) ہر چہ از و پرسیدم ہمیں گفت - برگشتہ حقیقت حال آں شکستہ پر و بال را بعرض ایستادگان بارگاہ دولت رسانیدم - بادشاہ و اعیان دولت قاہرہ از استماع ایں مقدمہ تعجب بسیار نمودند" تقی کاشی نے بھی یہی تاریخ وفات دی ہے۔

ورود و قیام ہند

چودہ پندرہ سال کی عمر میں ہو کر عرفی خوبصورتی میں بدر البدر تھا اسکا حسن ضرب المثل لیکن بیس سال کی عمر میں چیچک نکل آئی جس سے کریہ منظر اور بدشکل ہو گیا یہاں تک کہ لوگ اس سے نفرت کرنے لگے عرفی شکستہ دل و آزردہ خاطر ہو کر ہندوستان چلا آیا جیسا کہ اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے:- "در سن چہاردہ و پانزدہ حسن او قبول تمام عیاری بہم رسانیدہ بود و آبلہ برآوردہ چوں سال عمرش بہ بیست رسید آبلہ سرشاری برآورد و بعد از انقضائے اشتداد و استخلاص زاں مرض تغیرے در چہرہ او بہم رسید چنانکہ بیں کہ او را امید یدتنفر میکرد و مولوی ازیں مقدمہ بغایت آزردہ و در ہم بود . . . . بنا براں از وطن خروج کردہ بہ ہندوستاں کہ خانہ دو نمائے نکتہ سنجاں و دار العیار خردمنداں است آمد"

عبد الملک صاحب کی تحقیق کے مطابق مولینا عرفی ۳۵ برس کی عمر میں ہندوستان آئے اور ایک سال ہند میں رہے لیکن مؤلف میخانہ کے بیان سے اس کی تردید ہوتی ہے بلکہ بموجب روایت خالوی عرفی شمس الانام شیرازی "بیس یا اکیس سال کی عمر میں ہندوستان آنا ظاہر ہوتا ہے۔ اس حساب سے عرفی کا قیام ہندوستان پندرہ سولہ سال ثابت ہوتا ہے نہ کہ ایک سال۔

تقی کاشی (بہارستان صفحہ ۴۳) نے لکھا ہے کہ عرفی ۹۹۲ھ ہجری میں براہ دریا ہندوستان آیا۔ پہلے احمد نگر ٹھہرا ہفت اقلیم میں (بذیل عرفی) ہے "و او از ابتدا از بندر جرون بدکن وارد شد دراں ولایت او را چنانکہ باید دست نداد لاجرم متوجہ ہند شد"۔ ان تمام واقعات کو ہم اس طرح تطبیق دے سکتے ہیں۔ کہ عرفی بیس اکیس سال کی عمر میں دکن آیا ہو سات آٹھ سال وہاں رہ کر شمالی ہند کی طرف متوجہ ہوا ہو بنا بریں مؤلفین کو عرفی کے قیام ورود ہند کے متعلق غلط فہمی ہوئی ہو۔ لیکن یہ محض قیاس ہی قیاس ہے، قیام دکن پر ہم کوئی روشنی نہیں ڈال سکتے۔ دکن میں وارد ہوا ہو یا نہ ہو یہ تو قطعی طور پر درست ہے کہ وہ ۹۸۶ یا ۹۸۷ ہجری میں شمالی ہندوستان میں وارد ہوا۔

عرفی کا نجف اشرف پہونچنا

مؤلف میخانہ لکھتا ہے" ملک الشعرائے خراساں میرزا فصیحی در سنہ ہزار و بیست و ہفت شخصے از ہرات بلاہور فرستادہ بود کہ استخواں مولوی مغفور را بہ مشہد مقدس برند - دہ روز قبل از انکہ کس میرزا فصیحی بلاہور رسد میر صابر صفاہانی کہ یکے از یاران ایں خجستہ فرجام است استخوان عرفی را بہ نجف اشرف روانہ ساختہ بود "سبحان اللہ نتیجہ ایں بیت او

ے یہ شخص جہانگیر اور شہجہاں کے عہد میں پہلے صوبہ گجرات کا واقعہ نویس دیوانی تھا۔ پھر کل دکن کا واقعہ نویس مقرر ہوا امیر نے تمام عمر تاہل اختیار نہ کیا اور تجرد میں نہایت فارغ البالی سے زندگی بسر کی ۱۰۴۶ ہجری تک وہ واقعہ نویس دکن تھا نہیں معلوم اس کے بعد کب تک جیا۔

بطور پیوست ہے

بکاوش مژہ از گور تا نجف بروم
اگر بہند بمیرانیم دگر بہ تتار

عبدالمالک صاحب تحریر فرماتے ہیں: "میر صابر اصفہانی جو غیاث بیگ طہرانی مخاطب بہ اعتماد الدولہ وزیر ہند کی خدمت میں تھے وزیر موصوف سے اجازت حاصل کر کے عرفی کی لاش لاہور سے نکالکر خراسان کی راہ مشہد لے گئے اس حصول سعادت کے دو ماہ بعد نجف اشرف میں پہونچایا۔ اور وفات کے تیس سال بعد عرفی کے ریزہ ہائے استخواں کو حصار نجف اشرف کے باہر جو جگہ "حصار" اور "مقام صاحب الامر" کے درمیان واقع ہے اور جس کو جیرہ کہتے ہیں۔ دفن کر دیا۔ ملا رونقی ہمدانی نے اس کی تاریخ کہی ہے

رقم زد از پئے تاریخ رونقی کلکم   بہ کاوش مژہ از ہند تا نجف آمد
۱۰۳۲

عبدالمالک صاحب کی تحقیق کے مطابق میر صابر صفاہانی خود استخوان عرفی کو نجف اشرف لے گئے۔ لیکن مؤلف میخانہ لکھتا ہے اس کام کو میر صابر کے ایک آدمی نے سر انجام دیا۔ نیز عبدالمالک صاحب وفات کے تیس سال بعد استخواں کا نجف اشرف پہونچنا لکھتے ہیں۔ لیکن ملا عبدالنبی فخر الزمانی قزوینی ۱۰۲۷ھ ہجری وفات کے پچیس سال بعد لاش کا نجف اشرف پہونچنا لکھتے ہیں ملا رونقی کی جس تاریخ کو عبدالمالک صاحب نے بطور سند پیش کیا ہے ہم اسی کو ان کے دعوی کے بطلان میں پیش کرتے ہیں، یہ تاریخ بقول عبدالمالک صاحب عرفی کے ریزہ ہائے استخواں کے نجف اشرف پہونچنے کی ہے جو بقول انکے اس کی وفات کے تیس سال بعد کا واقعہ ہے۔ عبدالمالک صاحب نے عرفی کی وفات ۹۹۹ھ میں واقع ہونا لکھی ہے۔ رونقی کی تاریخ سے ۱۰۳۲ھ نکلتے ہیں۔ اگر اس سے تیس ۳۰ نکال دئے جائیں، تو ۱۰۰۲ رہجاتے ہیں۔ اور یہی تاریخ وفات عرفی ہے۔ گویا عبدالمالک صاحب نے مؤلف میخانہ کی تائید کر کے اپنے دعوی (وفات عرفی ۹۹۹ھ ہجری) کی تردید کر دی۔

فضل حسین تبسم

خزینۂ حسن و عشق

کہا جاتا ہے کہ عشق کا تعلق دل سے ہے اور چونکہ دل میں صرف خون بھرا ہے، اس لئے عشق ایک خونی داستان ہے۔ آیئے خون کی سیر خوردبین میں کریں عاشق کا خون تو فالتو مانا ہی گیا ہے دیکھیں کہ اس کے خونِ دل کے ایک قطرہ میں کیا کیا رازِ حسن و عشق پنہاں ہیں.......:.......... واہ کیا دلکش نظارہ ہے.................!



خون کا نظارہ خوردبین میں۔

اس ناچیز قطرۂ خون میں تو قارون کا خزانہ دفن ہے۔ لاکھوں گول گول ٹکیاں جا بجا نظر آتی ہیں گویا کہ دینار سرخ ہیں کہ ادھر ادھر بکھرے پڑے ہیں۔ ان کو اگر متاعِ عشق تصور کیا جائے تو حضرتِ عاشق کا دل دولتِ عشق سے مالا مال ہے۔ انہی سرخ ٹکیوں کے درمیان چند سفید اور تاروں کی طرح جگمگاتے ہوئے ذرات بھی نظر آتے ہیں۔ اگر کہا جائے کہ یہ کسی مہروش کے حسنِ دلنشین کی تابش ہے جو عاشق کے خونِ دل کے ذرّوں میں سرایت کر گئی ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ غرض یہ کہ دولتِ عشق اور کسی کے حسن کی چمک دمک نے اس قطرۂ خوں میں کچھ ایسی دل آویزیاں پیدا کر دی ہیں کہ:۔

اجزائے خوں کی سیر حسیں گر کیا کریں
ہر خوردبیں کے نیچے ہمارا لہو رہے

یہ تو خون کا نظارہ ایک شاعر کے نقطۂ نظر سے تھا دیکھیں کہ سائینس دان اس کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔ انکے نزدیک یہ گول گول سکہ ہائے عشق صرف ایک قسم کے سرخ رنگ سے بھری ہوئی ٹکیاں ہیں جنکا کام یہ ہے کہ تازہ ہوا یعنی آکسیجن (Oxygen) کو ہمارے بدن کے ہر گوشہ میں پہونچائیں اور زہریلی ہوا یعنی کاربونک ایسڈ گیس (Carbonic acid gas) کو ان گوشوں سے نکالکر جسم کے باہر لیجائیں۔ سائینس کے اس خیال کے مطابق عاشقوں کا آہ سرد بھرنا اور ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں لینا نہایت مفید ہے کیونکہ جتنی لمبی اور گہری سانس کھینچی جائے گی اتنی ہی زیادہ تازہ ہوا خون میں شامل ہوگی اور خراب ہوا جسم سے باہر نکل جائیگی اس لئے عاشقوں کو طولِ شبِ فراق اور آہوں کی اذیت کا گلا فضول ہے، یہ تو ان کے حق میں نعمت غیر مترقبہ ہیں۔ ہاں لحاف یا چادر

میں منہ لپیٹ کر آہیں بھرنا بیشک بہت نقصان دہ ہے کیونکہ خراب ہوا بار بار پھیپھڑوں میں داخل ہو کر خون کو خراب کر دیگی۔ ڈاکٹر رائے دیتے ہیں کہ علی الصباح کھلے میدانوں میں ملبی اور گہری سانسیں لینے سے تندرستی پر بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔ عاشقوں کیلئے صرف اتنی نصیحت کافی ہے کہ جب کھلے میدانوں اور باغوں وغیرہ میں تشریف لیجائیں تو کسی کی جفاؤں اور بیدردیوں کا خیال کر لیا کریں، بس یہی انکی جسمانی تندرستی کے لئے بہترین علاج ہے۔

معمولی انسان کو تو مصنوعی سانسیں لینے کی ضرورت ہے، لیکن عاشق کی ہر آہ فطری اور حقیقی معنوں میں گہری ہوا کرتی ہے۔ خون کے سفید ذرات سائینس دانوں کے نزدیک ہمارے جسم کے سپاہی ہیں جو ہر مرض کے جراثیم پر نہایت سختی سے حملہ آور ہوتے ہیں اور اکثر انہیں پسپا کر دیتے ہیں۔ سائینٹیفک معلومات کی ترقی کے ساتھ ساتھ ہر مرض کے جراثیم برابر دریافت ہو رہے ہیں۔ عشق بھی ایک مرض ہے ممکن ہے کہ کسی زمانہ میں اس کے جراثیم کا بھی پتہ لگ جائے اور اس مرض لادوا کی دوا بھی دستیاب ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ سفید ذرات کی جتنی زیادہ تعداد خون میں ہوگی اسی قدر کم انسان کسی مرض میں مبتلا ہوگا، اور برخلاف اس کے ان کی تعداد جتنی کم ہوگی اتنی ہی جلد انسان امراض کا شکار ہو جائے گا۔ اس سے ثابت ہوا کہ عاشق خون کے سفید ذروں کی کمی کی وجہ سے بہت جلد مرض عشق میں مبتلا ہو جاتا ہے، اور معشوق ان ذروں کی زیادتی کی وجہ سے عرصہ تک اس کے اثرات سے محفوظ رہتا ہے۔ اس کا پتہ تو جب ہی چل سکتا ہے کہ عاشق و معشوق کے خون کا مقابلہ خوردبین میں کیا جائے۔ لیکن کس عاشق کو اتنی تاب ہے کہ وہ کسی کے خون کا تصور بھی کر سکے، چہ جائیکہ اس کا تماشہ خوردبین میں دیکھے۔

احتشام علی۔ ایم۔ ایس سی

تذکرۂ خندۂ گل

یعنی

ظریف شاعروں کا تذکرہ

نہایت تیزی کے ساتھ چھپ رہا ہے اور یقین ہے کہ فروری کے اخیر تک مکمل ہو جائے گا۔ جن حضرات نے دو روپیہ پیشگی بھیجدئے ہیں۔ ان کی خدمت میں طباعت کے بعد بذریعہ رجسٹری فوراً روانہ کر دیا جائے گا۔

اب بھی موقعہ ہے کہ آپ دو روپیہ بھیجکر نصف قیمت میں اسے حاصل کر لیں۔ ورنہ طباعت ختم ہونے پر چار روپیہ سے کم اسکی قیمت نہ ہوجائیگی، اور محصول علاوہ اسکے ہوگا۔ کیونکہ اسکا حجم ۵۰۰ صفحات سے زیادہ ہوگا۔

اردو زبان میں یہ پہلا تذکرہ ہے جسمیں تمام قدیم و جدید ظریف شاعروں کے حالات، ان کے لطائف اور انتخاب کلام کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

"مینیجر نگار، لکھنؤ"

شیخ الشیوخ حضرت نصیرالدین محمود گنج معانی رحمۃ اللہ علیہ

محمود نام، نصیرالدین کنیت، چراغ دہلی اور گنج معانی لقب اور عرف ہے۔ والد کا نام شیخ یحییٰ تھا، وہ عبدالطیف یزدی کے بیٹے تھے۔ اصلاً خراسانی ہیں۔ نسب کے متعلق اختلاف ہے، بعض نے سید لکھا ہے، بعض فاروقی کہتے ہیں، اور بعض کے نزدیک خالدی ہیں لیکن ان سب میں قابل ترجیح نسبت فاروقی ہے۔ سیادت و خالدیت محض دعویٰ ہے، کوئی ثبوت نہیں، اور نسبت فاروقی حضرت فاروق اعظم تک منتہی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں اس روایت کے حامل بھی کئی تذکرے ہیں، اور سب میں قریب قریب ایک ہی سلسلہ نسب مرقوم ہے، مثلاً سیرت المحمود۔ روضۃ الاخبار۔ احوال الاتقیا، تذکرۃ الاولیا، سیرالسالکین۔ اقتباس الانوار اس وقت پیش نظر نہیں

شیخ عبدالطیف کے اسلاف قدیم الایام سے خراسان میں رہتے تھے اور یہ خاندان تقریباً ایک صدی سے اپنی نجابت و شرافت، تقویٰ و طہارت، اور علم و دولت کی وجہ سے بہت مشہور و ممتاز تھا۔ لیکن بدقسمتی سے عبدالطیف کو وہ زمانہ ملا جب دولت مٹ چکی تھی، اور سارے سازوسامان رخصت ہو کر صرف ایک علم باقی رہ گیا تھا، جو اس فلاکت و بیچارگی کے زمانہ میں رفیق و ہمدم تھا۔ مصیبت کے مارے وطن سے نکلے، گھر سے نکلتے ہی بلاؤں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ جو کبھی دو قدم پیادہ نہ چلے تھے، اب انھیں کوسوں اور منزلوں چلنا پڑا، جن عورتوں نے کبھی گھر کے باہر قدم نہ رکھا تھا، انھیں صحرانوردی کرنی پڑی، اور یہ مصیبت زدہ خاندان معیشت کی تلاش میں برسوں آوارہ و سرگرداں رہا۔ مگر وہ جو کہتے ہیں کہ قسمت کے لکھے کو کوئی مٹا نہیں سکتا، ان مصیبت زدوں کی قسمت کا لکھا بھی کسی طرح نہ مٹا، جہاں گئے بدقسمتی ساتھ گئی۔ اور بخت کی نارسائیوں نے ہر جگہ ناکامی کا منھ دکھایا۔ ان پیہم ناکامیوں سے اکثر کی ہمتیں ٹوٹ گئیں، اور وہ تارک الدنیا ہو گئے۔ لیکن جو شیردل اور قوی بازو تھے وہ اپنی طلب میں سرگرم رہے[۵۱]، اور بالآخر کامیابی سے ہم آغوش ہوئے۔

انھیں خوش نصیب جوان ہمتوں میں شیخ عبدالطیف بھی تھے۔ جو آٹھ نو برس تک در در کی ٹھوکریں کھاتے رہے مگر کسی ناکامی سے دل تنگ نہ ہوئے، اسی سعی و تلاش میں انھوں نے ہندوستان کا رخ کیا، اور لاہور پہونچکر قسمت آزمائی میں کامیاب ہو گئے یہاں زمانے نے پوری مساعدت کی، برے دن پلٹ گئے، قسمت جاگی اور تین چار مہینہ میں عبدالطیف کا طالع چمک اٹھا[۵۲]

اس کی تقریب اس طرح ہوئی کہ ایک جاگیردار کو اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے ایک نیک ذات ادیب اور فارغ التحصیل علم کی ضرورت تھی۔ یزدی حسن اخلاق اور علم و فضل کی دولت سے مالا مال تھے جو کچھ پڑھا تھا سب ازبر تھا، معقول و منقول میں یکساں فرمانروائی تھی اس پر مستزاد یہ کہ زبان و قلم کے بھی مالک تھے، جہاں بیٹھ جاتے اپنا رنگ جما دیتے۔ جاگیردار سے ملاقات ہوئی تو وہ ایک ہی صحبت میں دلدادہ ہو گئے، دل کھول کر اس جوہر کامل کی قدر کی سارے گھر بار کا مالک بنا دیا، اور اپنی بیٹی عقد میں دیکر پندرہ ہزار کی جاگیر داماد کے نام لکھدی

---

[۵۱] روضۃ الاخبار ۱۲ [۵۲] سیرالسالکین ۱۲

مگر یزدی بلند فطرت تھا اس نے اپنی نظر ہمیشہ اونچی رکھی، وہ جاگیرداری کے عیش و آرام میں بھی سپاہی بنا رہا لہ۔

خدا نے اس رشتہ کو بہت کامیاب کیا، اور یحییٰ نامی ایک بچہ پیدا ہوا جو صورت و سیرت کے لحاظ سے عجیب چیز تھا۔ یزدی کو یحییٰ سے بہت محبت تھی، ذرا بھی ماتھا گرم ہو جاتا تو وہ تلملا جاتے، نہ کھانے کا ہوش رہتا نہ پینے کا، وہ معمولی معمولی بیماریوں میں کئی کئی راتیں آنکھوں میں کاٹ دیتے تھے عہ۔ لیکن اس دیوانی محبت کے ساتھ یہ تیور بھی دیکھو کہ تعلیم کی طرف سے ایک دم کو غافل نہ ہوئے، اور پیار ایسا نہ کیا کہ بیٹا مرزا پھویا بن جائے سہ۔ انھیں اپنی مصیبت کے دن یاد تھے، وہ چاہتے تھے کہ یحییٰ کو خراب عادتوں سے بچائے رکھیں، قلم و تلوار کا دھنی بنا دیں، رزم و بزم، عیش و مصیبت، تنگی و فارغ البالی سب کے مزے چکھا دیں سہ۔ لیکن خدا کو ان کی یہ آرزو دیکھنی منظور تھی، وہ یحییٰ کی تربیت مکمل کرنے سے پہلے چل بسے، اسوقت یحییٰ کی عمر کل بارہ برس کی تھی شہ

مگر یحییٰ کی ماں ام ربیعہ کی ماں تھی۔ شوہر کے مرتے ہی وہ مرد بن گئی، اور بیٹے کی تعلیم و تربیت کا انتظام ایسے سلیقہ سے اپنے ہاتھ میں لیا کہ لوگ حیران رہ گئے۔ دور دور سے استاد بلوائے، جہاں ضرورت ہوئی ساتھ لے گئیں، امتحانوں میں خود جا کر دیکھا، دن کا پڑھا ہوا سبق رات کو اپنے سامنے بٹھا کر یاد کرایا۔ اس کے علاوہ شہ سواری، نیزہ بازی، تیر اندازی، تحریر و تقریر سب چیزیں سکھائیں، اور پچیس برس کی عمر میں یتیم یحییٰ کو قابل رشک نوجوان بنا دیا۔ سیرت المحمود میں یحییٰ کی زبانی لکھا ہے کہ ان کی والدہ نے ان کی تعلیم پر ساٹھ ہزار روپیہ سے زیادہ خرچ کیا تھا۔ کئی کئی استاد رات دن گھر پر رہتے تھے، اور فنون سپہ گری کے ماہروں کی خدمات اسطرح حاصل کی گئی تھیں کہ ان کے کل مصارف برداشت کئے جاتے تھے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد یحییٰ ماموں کی دعوت پر بنفیض آباد آئے۔ ماموں کا کاروبار دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں۔ وہ ایک معزز عہدہ دار اور بہت بڑے زمیندار تھے۔ والدہ نے اُن کی لڑکی سے ان کا پیام دیا، شادی ہو گئی، اور اس سنگم سے امرت کی وہ جوئے سلسبیل نکلی جس نے اپنے خاندان کو ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا۔ والدین نے اس کا نام محمود رکھا تھا لیکن وہ نصیر ملت و دین تھا۔ فرشتوں نے آسمانوں میں اور انسانوں نے زمین پر اسے چراغ دہلی اور گنج معانی کے نام سے پکارا۔

کہتے ہیں فولاد جب کسی اچھی دھات سے مل جاتا ہے تو اسکی خوبیاں کئی گنا بڑھ جاتی ہیں۔ شیخ محمود ماں کی طرف سے سید اور باپ کی طرف سے فاروقی تھے۔ سیادت و فاروقیت جب ملی تو سنگریزہ لعل شب تاب بن گیا۔ محمود کو اپنے نسب پر بہت ناز تھا، کہتے تھے یہ اللہ کی ایسی رحمت ہے کہ شکر ادا نہیں کر سکتا، اور نہیں چاہتا کہ اس نشہ سے ایک دم کو بھی میرا دماغ خالی ہو۔ جسطرح ددھیال نجابت و شرافت میں مشہور و ممتاز تھی، اسی طرح ننھیال بھی اپنی عالی نسبی میں ضرب المثل تھی۔ یہ لوگ صرف نام کے سید نہ تھے، بلکہ حقیقی اور عملی سید تھے تیغ و قلم کے ساتھ صداقت پاکبازی، زہد تقوی، اور حیرت پسندی ان کی شہادت کا اصلی رنگ روپ تھا۔

تذکرہ نویسوں نے بچپن کے جو حالات لکھے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ستارۂ بلندی اسی زمانہ سے چمکنے لگا تھا۔ پاکی اور

لہ سیرت المحمود و اخبار الاولیا ۱۲ عہ اخبار الاولیا ۱۲ سہ حکایات الصالحین ۱۲ سہ سیرت المحمود ۱۲ شہ حکایات الصالحین ۱۲ صہ سیرت محمود ۱۲

نفاست کا بہت خیال تھا، عبادت کے بیحد شائق تھے، کھیل کود سے بھاگتے، اور پڑھنے لکھنے کی طرف دوڑتے تھے۔ اس پر ذکاوت حاضر جوابی، فراست اور حافظہ وگویائی نے اس مجموعۂ خوبی کو اور قیامت بنا دیا تھا۔ جس استاد سے پڑھتے وہ عاشق ہو جاتا۔ مولانا عبدالکریم شیروانی کہتے ہیں۔ میری ساری عمر پڑھنے پڑھانے میں گزری، لیکن ایسا ہونہار بچہ میں نے کوئی نہیں دیکھا۔ نصیر الدین نے پڑھانے کا مزہ کھو دیا، اب ایسا عالم نہیں ملیگا۔ آپ یہ باتیں سنتے تو خدا کا شکر ادا کرتے، اور کہتے کہ اس کا مستحق میں نہیں ہوں بلکہ وہ ہے جس نے مجھے یہ دولت عطا کی ہے۔ اسکی عنایت شامل حال نہ ہوتی تو میں کیا کر سکتا تھا[1]

اخبار الاولیا میں لکھا ہے کہ شیخ محمود نے صرف تین مہینے میں سارا قرآن حفظ کر لیا تھا، اور حافظہ اتنا قوی تھا کہ اپنا سبق یاد کر کے اوروں کے سبق بھی یاد کر لیتے تھے۔

مولانا فخر الدین زرادی سے شیخ یحییٰ کے بہت گہرے مراسم تھے، ان کے بلانے پر محمود دہلی بھیج دیئے گئے یہاں انھوں نے سات آٹھ برس رہکر مختلف علوم کی تحصیل و تکمیل کی اور نہایت محنت و جانفشانی سے درجۂ تبحر حاصل کیا۔ اس سلسلہ میں جن شیوخ علم سے استفادہ کیا، ان میں مولانا فخر الدین زرادی، مولانا علاء الدین نیلی، مولانا فخر الدین گیلانی، مولانا رکن الدین خجندی، مولانا وجیہ الدین پائلی، مولانا خطیب الدین بھکری، مولانا جلال الدین اودھی، مولانا صدر الدین نادی اور مولانا شمس الدین یحییٰ کے نام بہت نمایاں ہیں۔ آپ نے مولانا یحییٰ کی تعریف تعریف میں عربی میں ایک قصیدہ بھی لکھا تھا، اس کا ایک شعر یہ ہے [2]

سَالت العُلم من اَحیاك حقاً فقال العلم شمس الدّین یحییٰ

ایک دفعہ مولانا شمس الدین یحییٰ کے ساتھ حضرت محبوب الٰہی سے ملنے گئے، انھوں نے پوچھا کیا پڑھتے ہو بولے ہاں فی الحال مولانا سے ابن سینا کی اشارات پڑھ رہا ہوں۔ انھوں نے بعض مشکل مقامات پوچھے، آپ نے کہا اگرچہ مولانا پوری طرح سمجھا چکے ہیں، اور مجھے کوئی اعتراض بھی نہیں ہے، لیکن ہنوز قلب مضطرب ہے، شیخ نے ایک مختصر سی تقریر میں پہلے ابن سینا کا نظام فلسفہ سمجھایا، پھر ان مقامات کی ایسی واضح تشریح کی کہ آپ مطمئن ہو گئے۔ اس ملاقات کے بعد سے آپ اکثر ان کی خدمت میں جایا کرتے تھے[3]

اخبار الاولیا میں یہ آمد و رفت نسبت بیعت کی وجہ سے لکھی ہے، لیکن یہ غلط ہے۔ اس سفر اور اس ملاقات کو بیعت سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس زمانہ میں آپ لیلائے علم کے سودائی تھے۔ اور رات دن اسی کے لئے سرگرداں رہتے تھے۔ البتہ اس ملاقات سے آپ حضرت محبوب الٰہی کے علم و فضل کے معتقد ہو گئے تھے۔ تذکرۃ الفضلا میں لکھا ہے :۔

"اثبات را اعتقاد در حق او راسخ شد، بعد از مدتے مرید شد و بمرتبۂ کمال رسید"

باوجودیکہ آپ کا زیادہ وقت لکھنے پڑھنے میں گزرتا تھا، تاہم آپ کے دوست بکثرت تھے۔ آپ جب دہلی آئے تو یہ دنیا بالکل اجنبی تھی، لیکن چند روز میں یہ اجنبی دنیا وطن بن گئی اور بیگانے یگانے ہو گئے۔ کوئی مشہور و ممتاز مدرسہ ایسا نہ تھا جس کے طالب علم

[1] روضۃ الاخیار، سیرت المحمود، حکایات الصالحین [2] سیرت المحمود [3]

اسیر محبت نہ ہوں۔ جوہر قابل کو دیکھکر استاد بھی دوستوں کی طرح ملتے تھے[۱]، اور دہلی کے تمام علمی حلقوں میں آمد و رفت شروع ہو گئی تھی۔
سیرت المحمود میں لکھا ہے کہ دہلی کے جن جن مدرسوں میں پڑھا تھا، ہر جگہ تمام شاگردوں کے لئے استاد کے جانشین رہے۔

اُسی زمانہ میں وعظ و خطبہ کا سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا اور رسائل و مقالات بھی لکھتے رہتے تھے۔ یہ رسائل اتنے مقبول ہو گئے تھے[۲] کہ اکثر مدرسوں میں داخل درس ہو گئے تھے۔ لیکن جب زندگی میں انقلاب پیدا ہوا تو دنیا بدل گئی اور تمام رسائل جمع کر کے آگ کے نذر کر دئیے[۳] کہ

ایں جملہ قیل و قال پامال شود!

عہد طالب علمی کی ان عالمانہ شہرتوں نے آپ کو دربار شاہی تک پہونچا دیا تھا۔ خصوصاً شہزادہ محمد تغلق سے دوستانہ مراسم ہو گئے تھے۔ یہ اسکی طالب علمی کا زمانہ تھا۔ بے تکلف ہو کر ملتا اور نیاز مندی سے پیش آتا تھا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے آپ سے کچھ استفادہ بھی کیا تھا۔ جب آپ دہلی سے رخصت ہوئے تو مشایعت میں وہ بھی شریک تھا اور بہت سے تحفے تحائف ساتھ کئے تھے[۳]

اس علم و فضل اور شہرت و عزت کے ساتھ جب آپ وطن پہونچے، تو دور و نزدیک دھوم مچ گئی اور سلرا فیض آباد ایک رات کے لئے شہر چراغاں بن گیا۔

دو تین برس وطن میں رہکر مزید تحصیل علم کے لئے بیرون ہند کا سفر کیا۔ کئی برس مصر اور عراق و حجاز میں پھرتے رہے۔ مختلف شیوخ سے حدیث کی سماعت کی۔ حجاز و یمن اور نجد کے ادیبوں سے علم ادب حاصل کیا۔ شافعی، حنبلی، مالکی طریقوں کے فقہا سے برنگ محدثانہ فقہ کا درس لیا۔ پھر ایران، کاشغر، سمرقند، بخارا، فرغانہ وغیرہ کا سفر کرتے ہوئے براہ افغانستان ہندوستان میں آئے۔ یہاں اس زمانہ میں سلطان محمد تغلق سریر آرائے ملک و دولت تھا، اس نے سنا تو آپ کو دہلی ہوتے ہوئے جانے کی دعوت دی، اور وزارت دینی کا عہدہ پیش کیا۔ آپ تیار ہو گئے اور یہ ٹھیرا کہ وطن سے واپس ہو کر جائزہ لے لیں گے۔ مگر خدا کو یہ منظور نہ تھا، اور اس سے زیادہ معزز بنانا چاہتا تھا۔ جس کے آگے یہ سربلندی ادنی ترین پستی تھی۔ مشیت کی چارہ گری سے وطن آکر پے درپے ایسے صدمات و حوادث میں مبتلا ہوئے کہ پریشان ہو گئے، یکایک والدہ کا انتقال ہو گیا، نوبرس کا ایک بچہ مرا، والد پر فالج گرا، بیوی بیمار ہو گئیں[۵] اور اندر باہر کے تمام کاروبار درہم و برہم ہو گئے۔ ان وجوہ سے مجبوراً جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اعلیٰ عہدے کیلئے انتخاب ہی بڑی چیز ہوتا ہے، گو قلمدان وزارت ہاتھ میں نہ آیا، مگر یہ بات ساری مملکت میں پھیل گئی، ہزاروں نظروں کا مرکز بن گئے، دیوان خانہ دربار عام بنا رہتا، لوگ خدمت میں حاضر ہونا فخر سمجھنے لگے۔ علما کی گردنیں بھی دست بوسی کے لئے جھکنے لگیں اور اک دنیا اس شمع پر پروانہ وار ٹوٹ پڑی۔ تذکرۃ الفضلا میں لکھا ہے:—

"ہر جا کہ رفتے مخلوق جوق جوق بخدمت شریفش حاضر گشتے، بیشتر مردم تلمذ بوے انتخاب می کردند، و علما بدست بوسی کردہ مفتخر و مبتہج می بودند"

جاگیر کا انتظام ایسی خوش اسلوبی سے کیا کہ سال بسال آمدنی میں اضافہ ہونے لگا، چھٹے مہینے سارے علاقہ کا دورہ کرتے،

---

[۱] حکایات الصالحین و تذکرۃ الفضلا ۱۲ [۲] سیرت المحمود ۱۲ [۳] سیرت المحمود و تذکرۃ الاتقیا ۱۲ [۴] سیرت المحمود ۱۲

آمد خرچ کا حساب کتاب لین دین کے معاملات اپنی نگرانی میں رکھے، مقدمات کے فیصلے خود کرتے تھے[۵۱]۔ قابل تعریف بات یہ بھی کہ باوجودیکہ زندگی بھر ان باتوں سے علٰحدہ رہے، تاہم اس طرح کام کیا جیسے کوئی بہت ہی آزمودہ کار کرتا ہے۔ بعض خوش عقیدہ تذکرہ نویسوں نے اس حسن انتظام کو بھی خرق عادت لکھا ہے۔ ان کے خیال میں آپ ولی مادرزاد تھے[۵۲]۔

لیکن علم کا فدائی ان مصروفیتوں میں بھی خدمت علم سے نہیں رہا، اس کا جوش ان کاروبار میں بھی شباب پر رہا، اور نشر علوم ومعارف، انہدام بدعت و قیام شریعت کے فرائض اسی طرح انجام پاتے رہے جس طرح عہد فراغ میں انجام پاتے تھے، سیرت المحمود میں لکھا ہے:۔

"غالب وقت در افادۂ علم گزشت، و کار حفظ شریعت نیز انجام پذیرفت۔"

مولوی احمد علی نامی ایک صاحب آپ کے سخت مخالف تھے، اس مخالفت میں بدنام کرنے کی کوئی تدبیر ایسی نہ تھی جو انھوں نے نہ کی ہو۔ اخلاق و ایمان کے ذلیل سے ذلیل الزام لگائے، اور بری سی بری صورت میں پیش کیا، لوگوں میں طرح طرح کی افواہیں اڑائیں۔ لیکن۔ انھوں نے جتنی برائیاں کیں سب انھیں کے خبث نفس کا ثبوت بن گئیں، ہر ایک کی نظروں میں ذلیل و خوار ہوگئے۔ مگر اس جلن میں بری فطرت بد سے بدتر ہوگئی۔ گالیاں دیتے تھے۔ جان کے درپے ہوگئے۔ شیخ محمود فضائل اخلاق کا پتلا تھا، وہ یہ باتیں سنتا تو افسوس کرتا۔

ایک روز اتفاق سے مولوی صاحب ایک جگہ مل گئے، اور حسب عادت نہایت ترشروئی سے پیش آئے، لیکن گرم لوہے کو ٹھنڈا لوہا کاٹ دیتا ہے، یہ ترشروئی بھی خندہ پیشانی سے کٹ گئی جس کی قدر انداز یاں ساری دہلی کو تسخیر بنا چکی ہوں، اس کے لئے ایک دل کو اپنے فتراک میں باندھ لینا کیا مشکل تھا۔ دیکھتے ہی ان کی طرف بڑھے اور لطف و محبت کے انداز سے چند باتوں میں وہ جادو کیا کہ مولوی صاحب قدموں پر گر پڑے، بولے: "مولانا! میں بہت شرمندہ ہوں، خدا کے واسطے مجھے معاف کر دیجئے۔" آپ نے انھیں گلے سے لگا لیا، اور کہا "میرے عزیز! اس کا غم نہ کرو، میرا دل صاف ہے"[۵۳]

غرض امیرانہ شان و شوکت اور عالمانہ جلال و جبروت کی یہی انجام سے بے خبر زندگی تھی جس کی آغوش میں آپ سودۂ راحت تھے، اور کوئی نہ جانتا تھا کہ مستقبل قریب میں کیا ہونے والا ہے۔ ہر غرض مند، ہر وابستۂ دامن، ہر ذلہ ربائے خوان کرم کی یہی دعا تھی کہ خدا اس دور کو ہمیشہ قائم رکھے۔ مگر قسمت کا لکھا اٹل ہوتا ہے، اس کے آگے شاہ و گدا بے بس ہیں، نہ کسی کا زور اسکو بدل سکتا ہے۔ نہ کسی کی عاجزانہ دعائیں۔ جب وقت آیا تو تقدیر پوری ہوئی اس پیدا و پنہاں معشوق نے ماسوائی محبت دل سے نکال کر اپنی لگن لگا دی، آنکھوں کو اپنا جلوۂ عریاں دکھا کر تڑپا دیا۔

بظاہر اس انقلاب کی ابتدا جس واقعہ سے ہوئی وہ بہت معمولی ہے۔ ایک دفعہ شیخ محمود کہیں جا رہے تھے، وابستگان دامن دولت کا جمگھٹا ساتھ تھا، ناگاہ ایک مجذوب سے ملاقات ہوگئی، اس نے کہا "مولانا! کہاں جاتے ہو؟" لیکن محمود نے سنی ان سنی کر دی، انھوں نے پھر پوچھا: "مولانا کہاں جاتے ہو؟ لیکن محمود نے اب بھی کچھ جواب نہ دیا، اور منھ موڑے آگے بڑھ گئے۔ یہ دیکھکر مجذوب غیظ وغضب سے بھر گیا، آنکھیں انگارے کی طرح سرخ ہوگئیں، چہرہ تمتما اٹھا، رونگٹے کھڑے ہوگئے، جسم سے آگ کے شرارے نکلنے لگے، اور وہ ایک رعد آسا آواز کے ساتھ

---

[۵۱] سیرت المحمود، و اخبار الاولیا ۱۲ [۵۲] حکایات الصالحین ۱۲ [۵۳] سیرت المحمود، حکایات الصالحین و اخبار الاولیا ۱۲

محمود کا ہاتھ پکڑ کر بولا : "او مردود نابکار ! بتا تیرے پاس وہ کون سی چیز ہے جس پر تو اتنا مغرور ہو گیا ہے ؟ کیا یہ جھوٹی عزت ؟ یہ مصنوعی شہرت ؟ یہ فانی دولت ؟ یہ علم جس پر جہل بھی ہنستا ہے ؟ مگر او کم ظرف ! یہ ایسی کون سی چیزیں ہیں جن پر تو گھمنڈ کرتا ہے ؟ ہاں تو بد گہر تھا، تیری فطرت ذلیل تھی، تیرے ظرف میں علم و دولت کے لئے سمائی نہ تھی، تو ذرا سی پونجی لیکر اچھل پڑا، لیکن او مغرور ! یہ تیری دیوانگی ہے، اسوقت سے ڈر جب خدا کی فطرت تجھے پکڑے گی، اور تیرے پاس اس فرعونیت کا کوئی جواب نہ ہوگا۔ تو اُجلی اُجلی، خوش وضع، قیمتی پوشاکیں پہنکر اکڑتا ہے، لیکن کہیں تو نے کبھی اپنے باطن کو بھی دیکھا کہ وہ کتنا غلیظ اور سیاہ ہے، آج تو زمین پر اتراتا ہے، مگر یاد رکھ کہ کل تجھے آسمانوں میں ذلیل ہونا پڑے گا۔"[۵۱]

آپ نے اسوقت تو یہ باتیں جبراً و قہراً سن لیں، اور اُن سے پیچھا چھڑا کر خوب مذاق اُڑایا، لیکن یہ تیر خالی جانے والے نہ تھے، آہستہ آہستہ دل میں اُتر گئے۔ یہ جاڑے کی چوٹ تھی جو اسوقت تو کچھ نہ معلوم ہوئی مگر ہڈی ہڈی میں بیٹھ گئی۔ فطرت صالحہ کو ایک اشارہ کافی تھا، وہ یہ مہمیز پاتے ہی اپنی راہ لگ گئی۔ اب شب و روز یہی فکر تھی کہ کسی طرح ان کاروبار سے چھٹکارا پائیں اور کسی گوشہ میں بیٹھکر یاد دلدار سے جی بہلائیں مگر وہ دلدار کہاں تھا؟ دل میں ہر وقت اسی نامعلوم کو ڈھونڈھنے کا جذبہ بیقرار رکھتا تھا۔ عزیز و اقارب اس جذب وحشت سے بہت متفکر تھے، انھوں نے تفریح کے لاکھوں سامان پیدا کئے، دوستوں نے ہر طرح جی بہلانے کی کوشش کی، لیکن یہ درد ایسا نہ تھا جو کسی رماں سے جلا جائے۔ عشق کی آگ میں جل جل کر تڑپنا مقسوم تھا، تڑپتے رہے، گریبان کا چاک دامن کے چاک سے آملا، گھر کو چھوڑ دیا، مال و دولت پر لات ماردی، اور دشت و صحرا میں آبلہ پا ٹھکراتے پھرے۔ لیکن اس سے کیا ہو سکتا تھا، دل کی وحشت زدگی کے لئے شہر و ویرانہ دونوں ایک ہیں، دل کی ویرانیاں جنگل کی سنسانیوں سے آباد نہیں ہو سکتیں۔

اسی وحشت کے عالم میں پھرتے پھراتے روھیل کھنڈ کی طرف نکل آئے، یہاں ایک دوست مل گئے، وہ آپ کو ایک زمانہ میں بڑی شان و شوکت سے دیکھ چکے تھے، اب اس حال میں دیکھا تو رو پڑے۔ پوچھا "نصیر الدین ! خیر تو ہے ؟ یہ تم کس حال میں ہو ؟ بولے ہاں اچھا ہوں، جس حال میں ہوں خوش ہوں، دعا کرو کہ خدا میرے مقصد میں مجھے کامیاب کرے۔" انھوں نے کہا : میرے ساتھ دہلی چلو، وہاں شاید کوئی صورت نکلے، آپ نے کہا، مجھے یہیں رہنے دو، وہاں جا کر کیا کروں گا، میرا جی انھیں بیابانوں میں بہلتا ہے[۵۲]

لیکن وہ مجبور کر کے اپنے ساتھ دہلی لائے۔ یہاں جس نے دیکھا افسوس کیا، اور اپنے اپنے خیال کے موافق ہمدردی کی کہ ان کا منشا نظر صرف ظاہری کامیابی نہیں، مگر اہل نظر میں جس نے دیکھا خوش ہوا۔ قاضی محی الدین کاشانی مل کر بولے۔ نصیر الدین یہ کیفیت مبارک ہو۔ اور اپنا مہمان بنا کر تربیت دی[۵۳]

حسن اتفاق سے قاضی اسی زمانہ میں بیمار ہو گئے اور یکایک مرض اتنا بڑھ گیا کہ زیست کی امید نہ رہی۔ حضرت محبوب الٰہی عیادت کو تشریف لائے۔ قاضی اسوقت بیہوش تھے، شیخ نے اپنا ہاتھ ان کے منھ پر پھیرا، وہ فوراً ہوش میں آ گئے، اور طبیعت ایسی بحال ہو گئی کہ جیسے بیمار ہی نہ ہوئے تھے۔

---

[۵۱] سیرت المحمود، اخبار الاولیا، روضۃ الاخبار ۱۲ [۵۲] حکایات الصالحین ۱۲ [۵۳] سیرت المحمود ۱۲

آپ یہ دیکھکر ششدر رہ گئے، اور یہ سمجھ کر کہ میرے درد کی دوا یہی کریگا، اک عجب انداز سے اٹھے اور روتے ہوئے شیخ کے قدموں پر گر پڑے۔ انھوں نے شفقت سے آپ کا سر اُٹھا کر سینہ سے لگا لیا، اور دیر تک سینہ سے لگائے تسکین دیتے رہے۔ کہتے ہیں شیخ کا ہاتھ لگتے ہی اک ٹھنڈک سی میرے سارے جسم میں دوڑ گئی، سارا رنج و غم سکون و مسرت سے، اور تمام درد و تپش کشف و مشاہدہ سے بدل گئی، اور میں ایسا محسوس کرنے لگا کہ میں دنیاوی زندگی ختم کر کے نئے جنم میں آگیا ہوں۔ چلتے وقت میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے مجھے اپنے ہاں لے گئے اور میری مشکل آسان کردی[۱]۔

بیعت ہونے کے بعد رات دن سلسلہ کے اشغال و اذکار کے سوا کسی سے سروکار نہ تھا۔ بیشتر اوقات تنگ و تاریک گوشوں میں بیٹھکر اپنا کام کرتے۔ رات کا سونا بالکل چھوڑ دیا تھا، ابتدائے سلوک میں معمولی روزے رکھتے تھے، لیکن بعد کو ایک ایک ہفتہ کا روزہ رکھنے لگے[۲]۔ اس پر جوش و پرخلوص محنت و ریاضت سے آپ ساری بزم میں ضرب المثل ہوگئے، اور ان لوگوں سے بھی آگے بڑھ گئے جو آپ سے پہلے اس راہ میں قدم رکھ چکے تھے۔ حضرت محبوب الٰہی ان باتوں کی وجہ سے آپ پر بہت عنایت فرماتے، اور ہمیشہ اپنے پہلو میں جگہ دیتے تھے۔ عام مرید اور عقیدت مند شیخ کے مزاج میں آپ کا یہ درخور دیکھ کر بہت قدر و منزلت کرنے لگے، اور آپ کا حجرہ بھی ایک چھوٹا سا دربار بن گیا[۳]۔ لیکن اب آپ کا رنگ دوسرا تھا، ان باتوں سے دل سیر ہوچکا تھا، ہنگامہ آرا بزم افروزیاں اسی وقت تک اچھی معلوم ہوتی تھیں جب تک حقیقت سے دور تھے۔ اب جو حقیقت کا رُخ زیبا دیکھ لیا تو سب سے بیزار ہوگئے، اور مدام اسی میں مشغول و مستغرق رہنے لگے، تھوڑی دیر کی مشغولیت دنیا بھی بیحد گراں گزرتی تھی۔ لوگوں کے ہجوم و ہنگامہ میں دن بدن زیادتی دیکھکر حضرت امیر خسرو کے ذریعہ شیخ سے کہلوایا کہ یہاں رہنے سے مشغولی میں فرق آتا ہے، حکم ہو تو کسی اور سنسان مقام پر چلا جاؤں اور فراغ خاطر سے عبادت کروں۔ حسب معمول حضرت امیر خسرو نے آپ کا پیغام عرض کردیا۔ شیخ نے کہا۔ نصیر الدین سے کہو کہ تمہیں اسی مزاحمت میں رہکر اپنا کام کرنا چاہئے، وہ سلوک ناقص ہے جو جنگلوں میں تکمیل پاتا ہے۔ چنانچہ آپ بدستور وہیں رہے اور "دل بہ یار و دست بکار" کے اصول پر کاربند ہوگئے[۴]۔

بیعت کے پانچویں چھٹے برس حضرت محبوب الٰہی نے مدینہ منورہ جانے کا حکم دیا۔ آپ ایک خادم کو لیکر فیض آباد ہوتے ہوئے روانہ ہوگئے اور قریب قریب دو سال مقیم رہے[۵]۔ خلوص، محبت اور سچی طلب کے یہ دو سال آپ کی سالکانہ زندگی کے لئے دو صدیوں سے بھی زیادہ تھے۔ جن جن مقامات کی سیر کی، جو جو کیفیتیں طاری ہوئیں بیان سے باہر ہیں۔ ناسوت سے جبروت و لاہوت و ہاہوت کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جو نہ دیکھ ڈالا ہو اور جسکی ہر منزل سے پوری طرح نہ گزر گئے ہوں۔ ایک مراقبہ کی کیفیت ہے: میں نے اپنے جسم کو دیکھا کہ نور ہو کر عرش کو محیط ہو گیا ہے، اور اس نور کے اثرات آسمان و زمین کے سارے عالموں میں پہونچ رہے ہیں۔ پھر میں نے دیکھا کہ میرا روان روان ایک صورت ہو گیا ہے، اور ہر صورت بالکل میری سی ہے۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ تمام زمینیں اور تمام آسمان، تمام انفس اور تمام آفاق اپنے اصلی رنگ میں میرے سامنے آگئے ہیں، اور کل افعال و اسماء، آثار و صفات پر میری دسترس ہوگئی ہے۔ اسی کے ساتھ میرے کانوں میں اک ایسے نغمہ کی آوازیں آنی شروع

---

[۱] حکایات الصالحین و سیرت [۲] روضۃ الاخیار [۳] اخبار الاولیا [۴] سیر الاولیا و اخبار الاخیار [۵] سیر السالکین ۱۱

ہوئیں کہ مجھ پر کچھ آمیز بیخودی طاری ہو گئی۔ اسی میں میں عین ذات کے بے نقاب نظارہ سے مشرف ہوا۔ اسی زمانہ میں حضور سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے بھی کئی بار شرف اندوز ہوئے۔ تمام صحابہ اور انبیا سے ملاقاتیں کیں، اور یہ کیفیت اتنی بڑھ گئی کہ چشم باطن کے کشف وذوق ہی سے نہیں بلکہ چشم ظاہر سے بھی، ان کو دیکھتے، اور ان سے گفتگوئیں کرنے لگے۔ اور یہ واقعہ تو بہت مشہور ہے کہ آپ نے محی الدین ابن عربی، امام غزالی، جلال الدین رومی، عثمان ہارونی، مودود چشتی، ابو اسحاق شامی، شیخ جیلانی، امام بخاری اور عین القضاۃ ہمدانی سے ان کے خاص خاص مسائل کے متعلق بالمشافہ گفتگوئیں کی ہیں۔ فرماتے تھے: یہ بات مجھے مدینہ طیبہ جانے اور وہاں رہنے ہی سے حاصل ہوئی۔ میں پہلے محض زیارت کیلئے مدینہ جانے کا قائل نہ تھا، لیکن اب معلوم ہوا کہ قرب زمان کی طرح قرب مکان بھی بے اندازہ رحمت و برکت کا باعث ہوتا ہے اور اپنے پچھلے اعتقاد پر توبہ کرتا ہوں[1]۔

یہاں کے قیام میں وہ شہرت حاصل ہوئی کہ اس صدی میں شاید ہی کسی کو حاصل ہوئی ہو۔ اخبار الاولیا میں لکھا ہے کہ: ایک جہان نے شرف وابستگی حاصل کیا، اور دنیائے اسلام سے دیار نبی میں آنے والے علما و مشائخ نے اعتراف کیا کہ: "ایں آفتاب بعصمت کہ مثل ماہزاراں ستارہ ہا در سایۂ او گم اند" سیرت المحمود میں لکھا ہے:—

"علما از دور و نزدیک بخدمت رسیدند، وامرا از ترک و تاجیک بشرف حضور بہرہ ور گردیدند، مشائخ عہد ارادت آوردند، اکابر زمانہ بتواضع برخاستند"

تذکرۃ الفضلا میں ایک قادری بزرگ کے الفاظ مرقوم ہیں کہ:—

"ذات بابرکات ایشاں آیتے بود از آیات الٰہی، ونعمتے بود از نعمائے ربانی"

اور یہی نہیں کہ صرف انھوں ہی نے اعتراف کیا ہو، صرف دوستوں نے ہی نے تربیت کی ہوں، صرف متعلقین و متاثرین ہی نے نیازمندی کا اظہار کیا ہو۔ بلکہ آپ کے حسن کا اصلی کمال یہ تھا کہ دشمنوں نے بھی کمال علم و طریقت کا اعتراف کیا[2]، بزرگوں اور استادوں نے بھی گردنیں جھکائیں اور قاضی محی الدین کاشانی نے جو آپ کے استاد بھی تھے اور راہ سلوک کے اولین رہنما بھی، ایک جماعت کے سوال پر کہا: "بدولت ایشاں من طلا شدہ و ذرہ ہا آفتاب"[3]

(باقی)

[1] سیرت المحمود، اخبار الاولیا و حکایات الصالحین [2] حکایات الصالحین [3] سیرت المحمود

تاریخ عرب کی ایک روایت جمیل

پہلی صدی ہجری کا ایک واقعہ حسن و عشق

اور معاویہ و حسین کے کردار کا فرق

وہ روایت جو اس مختصر مضمون کی بنیاد ہے، کوئی فرضی واقعہ نہیں بلکہ ایک تاریخی حقیقت ہے جسے مسعودی صاحب اغانی ابن قتیبہ، حموی اور ابن بدرون وغیرہ نے بیان کیا ہے۔

اس واقعہ سے غوامض تاریخ عرب کا اگر ایک باب سامنے آتا ہے کہ خلفاء راشدین کے بعد امویین کی حکومت کیا اسلوب اختیار کر رہی تھی اور انکی حیات اجتماعی میں کن اخلاق کا نشو و نما ہو رہا تھا، تو دوسری طرف معاویہ کے بالکل برعکس حسین کی سیرت کا وہ نمونہ بھی سامنے آتا ہے جو بعد کو "ذبح عظیم" کی صورت میں حکومت بنی امیہ پر ایک ایسی بے لاگ تنقید کر گیا جس کی نظیر دنیائے حق و صداقت میں مشکل سے دوسری مل سکتی ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوگا کہ اس زمانہ میں اہل عرب کی "طرز ادب" کس ذوق سے وابستہ تھی اور انکے ہاں ایک "عورت" کی تکمیل نسائیت کا صحیح معیار کیا تھا۔

نیاز

افراد:-

حسین	ابن علی مرتضےٰ
معاویہ	ابن ابی سفیان (امیر وقت)
یزید	معاویہ کا بیٹا اور ولی عہد
رفیق	معاویہ کا معتمد علیہ نوجوان غلام
عبداللہ بن سلام	والئ عراق
ارینب	عبداللہ بن سلام کی بیوی اور اپنے عہد کی بے مثل جمیل عورت
ابوہریرہ	صحابی رسولؐ

ابوالدرداء - صحابی رسول

معاویہ کی ایک جوان لڑکی

(رات کا وقت - یزید اپنے کمرہ میں مسند زرکار پر مغموم سا بیٹھا ہوا ہے۔ عود و عنبر کا دھواں فضا کو معطر کئے ہوئے ہے۔ سامنے اسباب بادہ نوشی مہیا ہے۔ اور رفیق (معاویہ کا غلام) سامنے خاموش حکم کا منتظر ہے)

یزید (جام شراب ہاتھ میں لیکر) "اے رفیق، میں نے تجھے اس لئے یاد کیا کہ آج ترک نشاط کا عہد کرنے والا ہوں اور شاید تجھ سے بہتر شاہد اس کا اور کوئی نہ ہو سکتا (جام رفیق کی طرف بڑھا کر) لے، اس کو باہر جاکر کہیں دور پھینک آ اور یہ سارا سامان چور چور کر ڈال۔ رفیق، جا، یہ کہ یہ خون کے گھونٹ کب تک پیونگا، اور دل کی آگ کو کہاں تک اس طرح اور بھڑکاتا رہوں گا!"

رفیق (دوزانو ہوکر یزید کے ہاتھ سے جام لیتے ہوئے) "اے خاندان امیہ کے چشم و چراغ، تعمیل حکم مجھ پر فرض ہے، لیکن اگر کبھی بھی غلام کی گستاخیاں معاف کی جاسکتی ہیں، تو مجھے پوچھنے دیجئے کہ اس وقت سرزمین عرب کی وہ کونسی دولت و لذت ہے جو آپ کے قدموں تک پہونچنے کی آرزومند نہیں اور وہ کیا آزار ہو سکتا ہے جو عرب کے ایسے حسین و جمیل شاہزادہ کو اسدرجہ ملول بنا دے؟

یزید - (منہ پھیر کر) "رفیق، جا، اصرار نہ کر، دل کا چھالا پھوٹتا ہے، تو زہراب بہاتا ہے، بہتر یہی ہے کہ میرا آزار، راز ہی رہے، ورنہ ممکن ہے کہ اسکا اظہار خود میرے لئے اور زیادہ باعث زحمت ہو جائے"

رفیق - (کمر سے پیش قبض نکالکر یزید کے سامنے رکھتے ہوئے سرجھکا کر) لاعلمی کی حالت میں اصرار کئے جانا اور ہلاک ہو جانا اس سے بہتر ہے کہ زندہ رہوں اور اس علم کے ساتھ کہ آپ نے مجھے رازداری کا اہل نہ سمجھا - اگر آپ کو اخفاء پر اصرار ہے تو مجھے اس بے اعتباری کی زندگی بسر کرنے سے انکار۔ رفیق اب اپنا سر لے کر یہاں سے واپس نہیں جا سکتا۔ اس لئے میں ادھر جام پھینکتا ہوں، ادھر آپ اس پیش قبض کو میری گردن پر پھیر دیجئے

یزید - (پیش قبض کو لیکر دور فرش پر پھینکتے ہوئے) "رفیق کیوں مجھے مجبور کرتا ہے کہ اپنے غم میں تجھے بھی شریک کروں جبکہ اسکا مداوا دنیا میں کوئی نہیں امیر المومنین (امیر معاویہ) کی پدرانہ شفقت، امیرانہ مرحمت کونسی ایسی ہے جو مجھے حاصل نہیں، لیکن یہ میری بدقسمتی کی انتہا ہے کہ باوجود ان تمام الطاف خسروانہ کے میری بے نوائی کا وہی عالم ہے اور میری مجبوریاں علی حالہا قایم -

اگر زندگی کی حقیقی راحت و مسرت، اگر حیات کی سچی لذت و مسرت کا تعلق کبھی قلب و روح سے بھی ہو سکتا ہے تو مجھ سے زیادہ ماتم گسار اور کون ہو سکتا ہے کہ ٹھیک اسی وقت جبکہ میرا جسم ملبوس زرکار سے آراستہ نظر آتا ہے، میری روح ایک گدا کی طرح محتاج ہے اور جس وقت دنیا حشم و خدم کے ساتھ مجھے دیکھتی ہے، میرا قلب ایک ویرانہ کی طرح سنسان ہوتا ہے -

میری یہ امیرانہ زندگی، یہ شاہانہ سطوت، یہ ملوکانہ اقتدار، یہ خسروانہ جاہ و جلال، حقیقتاً یہ سب ایسے پردہ کے نقش و نگار ہیں جن کے اٹھ جانے کے بعد سوائے سوگ اور ماتم کے کچھ نظر نہیں آسکتا -

جسم سے نہیں میرے قلب سے پوچھ کہ اس نرم مسند سے زیادہ سنگ خارا کوئی اور ہو سکتا ہے، کام و دہن نہیں روح سے دریافت کر کہ ان نعائم و لذائذ سے زیادہ گرسنگی کوئی اور ہو سکتی ہے - دنیا جس وقت مجھے نشہ شراب میں بدمست دیکھتی ہے، اس وقت مجھ پر خود اپنا ہی

خون پینے کا جنون ہوتا ہے، اور زمانہ جب مجکو محو نغمہ و موسیقی دیکھتا ہے، تو اسوقت میری ہستی یکسر فریاد و آہ ہوتی ہے، لیکن کس سے کہوں کہ کوئی رازداں نہیں، اور کیوں کہوں جب میرے درد کا کوئی درماں نہیں "

رفیق "سچ ہے، مجھ میں نہ رازداں بننے کی اہلیت اور نہ تلاش درماں کا سلیقہ، لیکن یہ تو آپ بھی جانتے ہوں گے کہ آپ کے ساتھ اپنا دل دکھانے اور آپ کے قدموں پر اپنی جان دیدینے کی تمیز مجھ میں ضرور ہے۔ اس لئے مجھے اسکا موقعہ دیجئے، اسکی اجازت دیجئے، حیران ہوں کہ معاویہ کا بیٹا، سفیان کا پوتا جس کا مردانہ عزم سنگین سے سنگین قلعہ فتح کرسکتا ہے، وہ ایک عورت کے نرم و نازک دل کی طرف سے اس درجہ خائف ہو، ذرا میں بھی تو سنوں کہ حرم کی کنیزوں، امراء کی بیٹیوں میں وہ کون ایسی بدنصیب ہے جو آپ کی پُرجوش محبت کی قدر کرنا نہیں جانتی۔ حسن و شباب نہایت بیش بہا دولت ہے، لیکن مجھے معلوم ہے کہ اس سے زیادہ ارزاں سودا بھی کسی اور چیز کا نہیں ہوتا۔ کچھ کہئے تو سہی کیا یہ عتاب حیا یہ و عذرا رباب و سلمہ پر ہے، یا کوئی اور سرزمین نجد کی لڑکی ہے جسنے آپ کو اسقدر دیوانۂ محبت بنا رکھا ہے "

یزید۔ (ایک آہ سرد کے ساتھ) "نہ وہ میری کنیز ان حرم میں سے حبا یہ و عذرا ہے نہ نجد کی کوئی لیلی، بلکہ وہ عراق کی تارۂ کج شراب ہے، وہاں کے باغ کی بہار ہے، وہ ارنیب ہے اور خوش نصیب عبداللہ بن سلام، والی عراق کی بیوی جس کے حصول کے لئے میں صرف وہ ایک لمحہ چھوڑ کر جس میں اس کے لب میرے لب سے متصل ہوں، اپنی ساری زندگی دیدینے کے لئے آمادہ ہوں۔ اے رفیق تو نے اسے نہیں دیکھا اس لئے شاید مجھ پر ہنسے لیکن باور کر کہ صحرائے عرب آج تک کوئی ایسا غزال رعنا پیدا نہیں کرسکا، اور نہ سرزمین شام نے ایسی سیہ چشم نازنین آج تک کبھی دیکھی۔ اسکی رعنائی ایک ایسا تیر ہے جو ایک بار دل میں پیوست ہو جانے کے بعد نکالا نہیں جا سکتا، اس کی چشم شہلا کی ہر نگاہ غلط انداز ایک ایسا کرشمہ ہے جس میں بیک وقت سحر بھی ہے اور شراب بھی جو مسحور بھی کر دیتا ہے اور مخمور بھی۔ اس کی لانبی سیاہ پلکیں جنکی ہر جنبش بہ حالت التفات رگ جاں ہے اور بصورت عتاب نوک سناں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس حریر سے بنائی گئی ہیں جسے نازنینان رومائی نرم و مخملی انگلیاں طیار کرتی ہیں۔ وہ اس کے نازک لب جن کے دیکھنے کے بعد ہی گلاب کی ملفوف پنکھڑی کا مفہوم ذہن میں آسکتا ہے، ایک ایسا چشمۂ حیات ہیں جس سے سیراب ہونے کے لئے جان کی قربانی حد درجہ ناقص تعبیر شوق ہے۔ وہ اس کا صبیح رنگ جس سے آفتاب طلوع صباح کا استعارہ کرتا ہے، وہ اس کے سیاہ بال جن سے برسات اپنی بھیگی ہوئی خنک رات طلب کرتی ہے، وہ خوبصورت دانت جس سے الماس اپنے سرمایۂ ضیا کا آرزومند ہے، وہ رخسار جن سے شمع محفل کسب نور کرتی ہے، اور اسی طرح اس کے جسم کا ہر ہر حصہ، اس کی خوش اداؤں کا ایک کرشمہ، اس کی عشوہ فرمائیوں کا ایک ایک رمز، اک مستقل دنیائے لذت و نشاط ہے جس کے اظہار کے لئے عالم نقش و شعر میں اس وقت تک کوئی نقاش و شاعر پیدا ہی نہیں ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں بتاؤں کہ میں نے کب اور کس عالم میں اول اول اسے دیکھا تھا۔ آہ، کلیجہ شق ہو جانا چاہتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ابھی دوشیزہ تھی، اس کی شراب حسن ناچشیدہ تھی اور کیف مستی رمیدہ، ایک رات، وہ ایک ظالم رات جب میں نے اسے دیکھا، تو اپنے تمام ملکوتی جمال کے ساتھ، وہ زینت و آرائش کا بھی مجسمہ تھی اور ایک تقریب میں اپنی بہت سی ہمسن لڑکیوں کے ساتھ مصروف نشاط تھی، میں نے پوشیدہ طور پر ساری رات اسکو محو لہو و لعب دیکھا اور نہیں کہہ سکتا کہ کھیلتے ہی کھیلتے اس نے کتنی بار اور کس کس طرح میری روح، اور میری حیات کا سودا کر لیا۔ اس عمر میں خدا معلوم کتنی حسین لڑکیاں میری نگاہ سے گذر چکی ہیں جنکے حسن و جمال جن کے شاعرانہ ذوق اور نغمہ و موسیقی نے مجھے مالوف کیا اور میں ان کی قدر کرنے پر

مجبور ہو گیا، لیکن میرا ذرّوں کے سامنے جھک جانا اس وقت تک تھا جب تک آرنیب کے آفتاب حسن نے میرے سامنے طلوع نہ کیا تھا لیکن جس وقت اس نے طلوع کیا تو میں اس کے سامنے جھک گیا، اس کو پوجنے لگا اور عہد کر لیا کہ ساری عمر اس کی پرستش میں صرف کر دوں گا۔

اس رات اس نے جن کمالات نسائی کو پیش کیا ان کا اظہار بالکل محال ہے، وہ اس کا بلند ذوق شعری، وہ برجستہ و برمحل فصیح و بلیغ فقروں کا استعمال، وہ اس کا جاں نواز لحن، وہ اس کا رعشہ بر اندام کرنے والا رقص، الغرض اس کی وہ تمام دلربائیاں جنہیں مشکل سے ایک تصور انسانی ایک جگہ فراہم کر سکتا ہے حقیقی صورت میں میرے سامنے تھیں اور میں زندہ تھا!

رفیق، تو یقین کر کہ اس واقعہ کے بعد ایک ہفتہ تک مجھ پر مدہوشی کی سی کیفیت طاری رہی اور اس کے بعد جب میں نے دریافت حال کیا تو معلوم ہوا کہ اس درمیان میں عبداللہ بن سلام سے اس کا عقد ہو چکا ہے۔ تو اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ خبر سنکر مجھ پر کیا گذری ہو گی اور اب میں کیونکر دنیا میں مسرور زندگی بسر کر سکتا ہوں۔ اے رفیق اگر تیری کوئی تدبیر اس باب میں کامیاب ہوگئی تو میرے اور تیرے درمیان خدا ہے کہ مجھ سے زیادہ انعامات کی بارش کرنے والا تجھے کوئی نہ ملیگا۔

رفیق: "آپ پر میری جان فدا ہو، کیا مجھے اس سے زیادہ کسی انعام کی خواہش ہو سکتی ہے کہ آپ نے مجھے اپنا رازدار بنایا اور کیا میں حصول تمنا کے لئے کوئی دقیقہ کوشش کا اٹھا رکھونگا"

(یزید سر جھکا کر رہجاتا ہے اور رفیق پردہ کھول کر باہر نکل جاتا ہے)

(۲)

(صبح کا وقت معاویہ کی خلوت گاہ، معاویہ ٹہل رہے ہیں اور رفیق ان سے باتیں کر رہا ہے)

معاویہ - "یقیناً میں نے یزید کو اپنا جانشین نامزد کرنے میں غلطی کی، اور جو دن گزرتا ہے مجھے اپنی اس غلطی کا احساس زیادہ ہوتا جاتا ہے غضب خدا کا شب و روز میخواری، رات دن فسق و فجور اور ہر لحظہ ایک نئی معصیت کی جستجو، میں نہیں سمجھتا کہ اگر یہ میرے بعد خلیفہ ہو بھی گیا تو کون اس کی اطاعت کرے گا اور عباس و علی کا خاندان کب اسکو حکومت کی مہلت دیگا"

رفیق - "امیر المومنین کا ارشاد بجا و درست ہے، لیکن غلام کا خیال یہی ہے کہ یزید کی موجودہ زندگی کی ذمہ داری بڑی حد تک ان لوگوں پر بھی ہے جو اپنے آپ کو اسکا بزرگ سمجھتے ہیں"

معاویہ - "(غصہ کی حالت میں کھڑے ہو کر) رفیق یہ تو نے کیا کہا، کیا تیرا مطلب یہ ہے کہ میں نے اس کو معصیت میں مبتلا کیا، میں نے اس کو شراب کا عادی بنا دیا، میں نے اس کے بیوقوف دماغ میں گناہ کا خیال پیدا کیا؟"

رفیق (ہات جوڑ کر) نہیں، اے امیر المومنین نہیں - یہ کون کہہ سکتا ہے، اس خلاف حقیقت بات کو کون مان سکتا ہے، لیکن میرا مطلب یہ ہے کہ بعض اوقات انسان حالات سے مجبور ہونے کے بعد بھی بعض گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے یہاں تک کہ اگر وہ اسباب نہ پیدا ہوتے تو شاید وہ گمراہ نہ ہوتا۔ اور مجھے یقین ہے کہ یزید کی میخواری اس کی فطرت نہیں بلکہ مجبوری ہے۔

معاویہ۔ "مجبوری! مجبوری کیا ہوسکتی ہے۔ میں کبھی اس کے ماننے کے لئے طیار نہیں"
رفیق۔ "امیر المومنین، جب انسان پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے تو وہ اپنی جانبری کی ہر ممکن تدبیر کرتا ہے۔ اگر یزید ارنیب کی طرف سے مایوس ہوکر ان مشاغل تفریح سے اپنے نفس کو دھوکا نہ دیتا تو وہ غریب کب کا ہلاک ہوگیا ہوتا۔ اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اگر آج ارنیب حاصل ہوجائے تو کل یزید سے زیادہ متقی کوئی ہو نہیں سکتا"

(معاویہ خاموش، سر پکڑ کر رہ جاتے ہیں اور دیر تک یہی عالم رہتا ہے۔ رفیق باہر جانا چاہتا ہے، معاویہ اس کو روک لیتے ہیں)۔

معاویہ۔ "رفیق، تجھ کو یقین ہے کہ یزید کی زندگی میں انقلاب ہوجائے گا اگر ارنیب مل گئی!"
رفیق۔ "اے امیر المومنین، ایسا ہی یقین ہے، جیسے اس وقت طلوع آفتاب کا"
معاویہ۔ "اچھا، کاتب کو بلاؤ"

(کاتب آتا ہے)

معاویہ۔ "عبداللہ بن سلام والی عراق کے نام میری طرف سے ایک خط لکھو کہ جس قدر جلد آسکتے ہو میرے پاس آجاؤ کیونکہ ایک تمہارے ہی فلاح و بہبود کا سامنے ہے"

(۳)

(عبداللہ بن سلام، معاویہ کا مہمان ہے اور نہایت عزت و اکرام کے ساتھ ایک جگہ ٹھہرا دیا گیا ہے۔ معاویہ، ابوہریرہ اور ابوالدرداء کے ساتھ اپنے مکان میں بیٹھے ہوئے گفتگو کر رہے ہیں)

معاویہ۔ "(ابوہریرہ اور ابوالدرداء سے) آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ میری بیٹی جوان ہوگئی ہے اور میں اس کی شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے عبداللہ بن سلام کو پسند کیا ہے۔ آپ لوگوں کی کیا رائے ہے"
دونوں۔ "انتخاب اچھا ہے اور آپ کی رائے بہت مناسب معلوم ہوتی ہے"
معاویہ۔ "تو پھر آپ جاکر عبداللہ بن سلام کو میری طرف سے یہ پیغام دیجئے، یقین تو ہے کہ وہ منظور کرلے گا"

(وہ دونوں جاتے ہیں۔ امیر معاویہ، کنیز کے ذریعہ سے اپنی لڑکی کو طلب کرتے ہیں۔ لڑکی حاضر ہوتی ہے۔)

معاویہ۔ "جس وقت ابوہریرہ اور ابوالدرداء تیرے پاس آکر عبداللہ بن سلام کے ساتھ شادی کرنے کا پیغام تجھ کو دیں تو اس پیغام کو مسرت سے سننا اور جواب دینا کہ مجھے کوئی عذر نہیں، سوائے اس کے کہ فی الحال ارنیب اس کے پاس موجود ہے اور ایسی صورت میں میری غیرت شادی کی اجازت نہیں دیتی، اگر وہ اس کو طلاق دیدے تو بیشک میں راضی ہوں"

(۴)

(عبداللہ بن سلام اپنے خیمہ میں منتظر بیٹھا ہوا ہے اور ابوالدرداء اور ابوہریرہ پردہ کھولکر اندر داخل ہوتے ہیں۔)

ابوہریرہ۔ "معاویہ بہت مسرور ہے کہ تم نے اس تعلق کو خوشی کے ساتھ قبول کیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ معاویہ نہ صرف امیر وقت ہی بلکہ صحابی رسول

اور کاتب رسول ہونے کا بھی فخر اسے حاصل ہے۔ پھر یوں بھی شرافت و سیادت، نجابت و امارت ہمیشہ سے اس خاندان میں چلی آرہی ہے، اس لئے یقیناً تم کو خوش ہونا چاہئے کہ اس نے اپنے خاندان میں تم کو شامل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ لیکن اس کی لڑکی کو اس امر میں اعتراض ہے کہ ارنیب کے ہوتے ہوئے وہ تمہارے ساتھ مسرت کے ساتھ زندگی بسر کر سکے۔ اس لئے اب صورت صرف یہ رہجاتی ہے کہ تم ارنیب کو طلاق دو، یا اس رشتہ سے ہاتھ دھو۔"

(عبداللہ یہ سن کر گھبرا جاتا ہے اور افسردگی اس کے چہرہ پر چھا جاتی ہے۔)

ابوالدردار۔ "یقیناً تمکو ارنیب کا چھوڑ دینا بہت شاق ہوگا، کیونکہ علاوہ حسن و جمال، تہذیب و شائستگی کے محبت دیرینہ کا خیال بھی اس کے منافی ہے، لیکن اگر تم سمجھتے ہو کہ معاویہ کے خاندان میں شامل ہونا تمہارے لئے باعث فلاح ہو سکتا ہے تو تمکو چار و ناچار ارنیب کو طلاق دینا پڑے گی۔"

عبداللہ۔ "یہ صحیح ہے کہ ارنیب ایسی بیوی کا ملجانا میرے لئے انتہائی خوش قسمتی ہے، لیکن ارنیب کے لئے یہ امر باعث فخر نہیں ہو سکتا کہ میں اس کا شوہر ہوں۔ اس لئے میرا اسکو چھوڑ دینا اس کے لئے باعث تکلیف نہیں ہو سکتا، جو تکلیف ہوگی مجھی کو ہوگی۔ اس لئے اب جبکہ میں اتنا سفر کر کے یہاں آیا ہوں، امیر معاویہ کی خود یہ خواہش ہے اور میں اس پر راضی بھی ہوں، تو اب میرا انکار کر دینا صرف جذبات محبت کی بنا پر غالباً سیاست کے خلاف ہے اس لئے میں اسوقت آپ دونوں کو شاہد بنا کر ارنیب کو طلاق دیتا ہوں، آپ جائیے اور امیر معاویہ اور ان کی صاحبزادی کو اطلاع دیجئے کہ میں نے انکی یہ خواہش بھی پوری کر دی ہے۔"

(عبداللہ بن سلام باقاعدہ طور پر ارنیب کو طلاق شرعی دیتا ہے۔ اور ابوالدردار، ابوہریرہ طلاق کے شاہد ہو کر باہر چلے جاتے ہیں۔)

(۵)

(عراق میں عبداللہ بن سلام کا مکان۔ امام حسینؑ ارنیب کے مکان فرش پر بیٹھے ہوئے ہیں اور ارنیب اندر حجرہ میں بیٹھی ہوئی ہے ابوالدردار داخل ہوتے ہیں)۔

ابوالدردار۔ "اسلام علیکم"

حسین۔ "وعلیکم السلام اے صحابی رسول"

ابوالدردار۔ (آنکھوں میں آنسو لاکر) اے حسین تمہیں دیکھکر میرے سامنے عہد نبوی آگیا، آہ! وہ بھی کیا مسعود و متبرک زمانہ تھا کہ ہمارا جو قدم اٹھتا تھا خدا کی راہ میں اٹھتا تھا اور آج میں دیکھتا ہوں کہ میری ہر سانس نار استی کی فضا میں نکلتی ہے۔ خیر، خدا کی مرضی یہی ہے میں یہاں ارنیب کو معاویہ کی طرف سے یزید کا پیغام نکاح دینے آیا ہوں۔ لیکن اے جگر گوشۂ رسول آپ یہاں کیسے تشریف لائے؟"

حسین۔ "میں بھی اسی غرض سے آیا ہوں کہ ارنیب کو اپنا پیام دوں۔"

ابوالدردار۔ "افسوس ہے مجھے وہ خدمت انجام دینا پڑتی ہے جس کو میرا دل نہیں چاہتا، عبداللہ بن سلام ارنیب کو طلاق دینے کے بعد معاویہ کی بیٹی کو بھی حاصل نہ کر سکا کیونکہ اس نے انکار کر دیا۔ غالباً آپ نے سنا ہوگا اور چونکہ عبداللہ بن سلام کو یہ یقین ہو گیا کہ یہ سب مکر و فریب تھا

صرف اس لئے کہ کسی طرح ارنیب کو طلاق دلوا کر یزید سے اس کی شادی کرادی جائے اور ہر جگہ اس کا چرچا ہوگیا، اس لئے معاویہ نے برہم ہوکر اسے معزول بھی کردیا اور اب وہ غریب کسی طرف کا نہ رہا"

حسین۔ "یہاں، یہ ساری خبریں ہو پہنچ چکی ہیں اور چونکہ آپ بھی اس غرض کو لیکر آئے ہیں اس لئے اب مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ ارنیب سے دریافت کیجئے وہ مجھ میں اور یزید میں کس کو پسند کرتی ہے"

(ابوالدرداء حجرہ کے پاس جاکر رنیب کو مخاطب کرتے ہیں)

ابوالدرداء۔ "اے ارنیب، مجھ کو تیرے حال سے بہت ہمدردی ہے، لیکن اب جبکہ عبداللہ بن سلام تجھے طلاق دے چکا ہے اس لئے کوئی چارہ نہیں سوائے اس کے کہ تو کسی اور سے نکاح کرے۔ اسوقت دو شخص تیرے خواہشمند ہیں، ایک یزید معاویہ کا بیٹا، اور اسکا ولی عہد اور دوسرا حسین ابن علی۔ ان میں سے تو جس کو مناسب سمجھے اپنے لئے اختیار کرلے"

ارنیب۔ (دیر تک سکوت کرنے کے بعد) "اے ابوالدرداء، اگر آپ اس وقت یہاں نہ ہوتے اور یہ مسئلہ میرے سامنے آتا تو میں اسوقت بھی آپ ہی پر اس کا انحصار کرتی، اس لئے میں آپ سے دریافت کرتی ہوں کہ مجھے اس صورت میں کیا کرنا چاہئے اور میرے لئے فلاح کس کے انتخاب میں ہے"

ابوالدرداء۔ "میرا اس باب میں کوئی مشورہ دینا مناسب نہیں ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تم خود فیصلہ کرو"

ارنیب۔ "ابوالدرداء، میں تمہارے بھائی کی بیٹی بھی ہوں، اس لئے یوں بھی تمہیں مشورہ دینا چاہئے تعجب ہے کہ تم صحابی رسول ہوکر یوں امر حق کے ظاہر کرنے سے احتراز کرتے ہو"

ابوالدرداء۔ "اگر تجھے اصرار ہے تو میں یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ حسین ابن علی میرے نزدیک زیادہ قابل ترجیح ہیں، کیونکہ میں نے رسول اللہ کو حسین کے لب چومتے ہوئے دیکھا ہے"

ارنیب۔ "تو بہتر ہے میں حسین کو پسند کرتی ہوں"

(اسی جگہ اور اسی وقت حسین کا عقد ارنیب سے ہوجاتا ہے اور ابوالدرداء چلے جاتے ہیں)۔

(۶)

(کچھ زمانہ کے بعد امام حسین اپنے مکان میں بیٹھے ہیں اور عبداللہ بن سلام داخل ہوتا ہے۔ اس حال میں کہ اس کا چہرہ بہت مغموم ہے اور غربت و افلاس اس کے کپڑوں سے ظاہر ہے)۔

حسین۔ "عبداللہ بن سلام، آؤ، مبارک ہو تمہارا یہاں آنا، کہو، معاویہ کو تم نے کیسا پایا"

عبداللہ بن سلام۔ (آہ سرد بھرکر) "معاویہ وہ ہے جس نے دھوکا دیکر میری زندگی کی بہترین لذت و نعمت مجھ سے چھین لی، میری امارت و سرداری کو غربت و افلاس سے بدل دیا اور میرا یہ حال ہے کہ دنیا میں کوئی ہستی ایسی نظر نہیں آتی جو میرے حال پر رحم کرے اور اپنی محبت سے میرے مصائب کو قابل برداشت بنادے"

حسینؓ۔ "اے عبداللہ بن سلام، اللہ تجھ پر رحم کرے اور تیری تکلیفوں کو دور کرے۔ اگر میرے لایق کوئی خدمت ہو تو بلا پس و پیش بتاؤ، میں اس کے انجام دینے کے لئے ہر وقت آمادہ ہوں"

عبداللہ بن سلام۔ "ہاں، میں اسی لئے آیا ہوں کہ آپ کے ذریعہ سے ارنیب سے اپنی ایک امانت طلب کروں جو میں نے اس کو دی تھی اور ہمیشہ کے لئے اس سے رخصت ہو لوں"

حسینؓ۔ (اوٹ کے اندر ارنیب سے) "عبداللہ بن سلام اپنی امانت تم سے طلب کرنے آئے ہیں۔ وہ کیا چیز ہے؟"

ارنیب۔ "مجھے نہیں معلوم کہ وہ کیا چیز ہے کیونکہ وہ تھیلی میں سر بہ مہر ہے اور میں نے اسے کھولا نہیں"

حسینؓ۔ "تو بہتر یہی ہے کہ جس شخص نے امانت رکھی ہے خود اس کو اپنے ہاتھ سے واپس کر دو"

(حسینؓ باہر چلے جاتے ہیں اور ارنیب پردہ سے باہر آکر عبداللہ بن سلام کے سامنے آجاتی ہے۔ عبداللہ تحیرانہ اس کو دیکھنے لگتا ہے اور پھر دونوں رونے لگتے ہیں۔ کچھ دیر بعد)۔

عبداللہ بن سلام۔ (آنسو پونچھتے ہوئے) "اے ارنیب، مجھے تیری جدائی کا اتنا ڈر نہیں ہے، جتنا اس امر کا کہ میں اپنے آپ کو تیرے قابل نہ ثابت کر سکا۔ میں نے جس طمع سے تجھے طلاق دی اس کی سزا اگر کوئی ہو سکتی ہے تو صرف یہ احساس کہ میں نے تجھ سے بیوفائی کی اور اس احساس کے ساتھ تمام عمر بے چین رہنا۔ اے ارنیب مجھے شرم آتی ہے کہ میں تجھ سے ہمکلام ہوں، اور غالباً میں کبھی نہ آتا اگر میری موجودہ سقیم حالت امانت واپس لینے پر مجبور نہ کرتی، کیونکہ اس تھیلی میں ایک قیمتی موتی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس کو فروخت کر کے کسی جگہ گوشۂ گمنامی میں اپنی زندگی بسر کروں"

ارنیب۔ (دامن سے آنسو خشک کرتے ہوئے) "یہ آپ کی امانت حاضر ہے، اور اگر کوئی اور چیز ایسی ہے جو میں پیش کر سکتی ہوں تو اسے بھی بتایئے۔ آپ نے جس محبت و عزت کے ساتھ میرے حقوق ادا کئے ہیں، وہ مجھ سے بہت زیادہ قربانی طلب کر سکتے ہیں، چہ جائے کہ مال و زر جو نہایت حقیر چیز ہے"

عبداللہ بن سلام۔ "میں نے تجھے دیا ہی کیا ہے جو طلب کروں، البتہ اگر مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ تو نے میرے اس قصور کو معاف کر دیا ہے تو غالباً میں ایک حد تک سکون کے ساتھ زندگی بسر کر سکتا"

ارنیب۔ "اللہ اور اس کا رسول شاہد ہے کہ میں آپ کی ہر غلطی کو سچے دل سے معاف کرتی ہوں اور آپ سے بھی یہی استدعا ہے کہ میری طرف سے اگر کوئی فروگذاشت ہوئی ہو جس کا مجھے علم نہیں ہے تو آپ بھی درگذر کیجئے"

(عبداللہ بن سلام کا دل یہ سنکر بھر آتا ہے اور اٹھکر روتا ہوا باہر جانا چاہتا ہے۔ حسینؓ اندر داخل ہوتے ہیں)۔

حسینؓ۔ "اے عبداللہ، تم کو اپنی امانت واپس مل گئی"

عبداللہ۔ "ہاں، مل گئی، اور اب میں جاتا ہوں، آپ کی اس عنایت کا شکریہ"

حسینؓ۔ "لیکن ابھی ایک امانت اور ہے جو تم کو ملنا چاہیئے"

عبداللہ - "وہ کیا، میں نے تو اور کوئی چیز زینب کے پاس امانت نہیں رکھوائی تھی۔"

حسین - "لیکن میرے پاس تو ہے"

عبداللہ - "وہ کیا، اے میرے سردار"

حسین - "وہ زینب بنت اسحاق ہے جس سے میں نے صرف اس لئے شادی کی تھی کہ طلاق دیکر پھر تمہارے ساتھ شادی کردوں ظاہر ہے کہ اُس شدید طلاق کے بعد جو تم نے دی تھی اب یہ تمہاری نہیں ہوسکتی تھی تاوقتیکہ کوئی دوسرا شخص اس سے عقد کر کے طلاق نہ دے، اور میں نے مناسب سمجھا کہ یہ خدمت میں ہی انجام دوں۔

(حسین یہ کہکر باہر چلے جاتے ہیں اور عبداللہ سلام اور زینب دونوں کیف کی حالت کے ساتھ جس میں مسرت کا غیر معمولی جذبہ زبان کو گنگ بنا دیتا ہے۔ ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے ہیں)۔

نیاز

عالم فطرت، ماوراء علم و ادراک

دماغ انسانی کی خارق عادات اعجوبہ نمائیاں

اخبار عن الغیب کے محیر العقول واقعات

انسان جسکی زندگی کے تمام تجربات بظاہر صرف اس کے حواس متعینہ پر منحصر ہوتے ہیں، اگر ایک طرف اپنی سادگی فطرت کے لحاظ سے ایک ایسی بے بس و بیچارہ مخلوق ہے کہ اگر اس کی آنکھ کے سامنے ایک ہلکا سا کاغذ بھی رکھدیا جائے تو وہ آفتاب ایسی عظیم الشان چیز کو بھی نہیں دیکھ سکتا، تو دوسری طرف وہ ایک ایسا لاینحل معمہ ہے کہ اس وقت تک یہی نہیں معلوم ہو سکا کہ اسکی ترقی کی آخری حد کیا ہے، یہاں تک کہ اب گفتگو اس میں ہے کہ کہیں خدا ہی تو نہیں ہے۔

انسان جس چیز سے عبارت ہے وہ نہ اس کے ہاتھ پاؤں ہیں، نہ آنکھ کان اور نہ کوئی اور عضو جسمانی، بلکہ علم و حکمت والے کہتے ہیں کہ انسان نام اس حقیقت کا ہے جسے عقل سلیم کہتے ہیں اور جس کے مظاہر ابتدائے کائنات سے لیکر اسوقت تک تمام عالم میں ہر جگہ منتشر نظر آتے ہیں۔ لیکن ایک جماعت اور ہے جو علم و حکمت کی حامل تو نہیں ہے لیکن اس کے معلومات کا ذریعہ علم و حکمت سے زیادہ کوئی بلند چیز ہے۔ اس کا خیال ہے کہ انسان نام عقل سلیم کا بھی نہیں، فضل و کمال کا بھی نہیں، بلکہ صحیح معنے میں انسان وہ ہے جو انسان پیدا ہوا ہے اور بلا کسی سبب کے انسان ہے کیونکہ اگر انسان نام صرف اس ذہنی اکتساب، علمی ترقی، اور تربیت دماغ کا ہے جسمیں ہر شخص برابر کا شریک ہو سکتا ہے تو پھر اس کو کیا کہیں گے جس کو اس نوع کی سعی و کوشش کا کوئی موقعہ میسر نہیں آیا، لیکن اس سے ظہور ہوتا ہے ایسی باتوں کا جس کو دنیا کا بڑے سے بڑا حکیم و فیلسوف بھی سمجھنے سے عاری ہے۔

عالم فطرت کے تمام غوامض و نوامیس میں سب سے زیادہ حیرت انگیز چیز اگر کوئی ہو سکتی ہے تو وہ انسان ہے جس کے بالشت بھر دماغ کی حقیقت کا بھی اسوقت تک انکشاف نہیں ہو سکا۔ اور بعض صورتوں میں بڑے بڑے عقل والوں کو اپنی کم فہمی اور جہل کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

انبیاء اور رسل کی نسبت بعض علماء ظاہر کا خیال ہے کہ ان میں کوئی فطری خصوصیت موجود نہیں ہوتی۔ ہر شخص کوشش سے نبی ہو سکتا ہے، لیکن جسوقت ان سے کہا جاتا ہے کہ وہ سعی و کوشش سے صرف ہوڈینی ہی کے درجہ تک پہونچ جائیں، جو ٹھوس دیوار کے اندر سے گذر جاتا تھا، یا ہندوستان کے ایک جاہل سادھو کی طرح صرف چند گھنٹے ہی زمین میں دفن ہو کر زندہ رہیں، تو انکے پاس اسکا کوئی جواب نہیں ہوتا، اور انکو سوائے سکوت کے اور کوئی چارہ نہیں رہتا۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح نہ میں فورڈ و ماڈیسن ہو سکتا ہوں اور نہ فورڈ و ماڈیسن، تان سین اور بیجو باورے بن سکتے ہیں، اسی طرح نہ کوئی فلسوف ہر واقعہ کا سبب دریافت کر سکتا ہے اور نہ کوشش کر کے ان حدود سے متجاوز ہو سکتا ہے جو اس کے اندر اس کے دماغ کی ساخت ہوئی ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ شاعر، نقاش، مغنی، صناع اور نبی سب پیدا ہوتے ہیں اور بننے سے نہیں بن سکتے۔ روئے زمین پر ہمیشہ متعدد ایسی غیر معمولی ہستیاں پائی گئی ہیں اور ہمیشہ انکے صدق و کذب پر بحث کی گئی ہے۔ پھر چونکہ اس سلسلہ میں روح و بقائے روح کا سوال بھی پیش آجاتا ہے اس لئے مذہب اور مابعد الطبیعیات دونوں کے نزدیک اس بحث کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے، اور انسان جو فطرتاً بہت جستجو پسند واقع ہوا ہے نہایت دلچسپی کے ساتھ نہ صرف ان مظاہر کا مطالعہ کرتا ہے بلکہ انکی علمی توجیہ بھی کرنا چاہتا ہے۔

اس وقت اس قسم کے مظاہر پیش کرنے والے دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو بذریعہ مسمریزم یا ہپناٹیزم (تنویم مقناطیسی) براہ راست خود یا کسی وسیط یا معمول (medium) کے ذریعہ سے مختلف قسم کے حالات بتاتے ہیں، روحوں کے طلب کرنے کے مدعی ہیں اور بعض اوقات روحوں کی تصاویر بھی دکھا دیتے ہیں، اور دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو بغیر واسطہ مسمریزم لوگوں کے دل کا حال معلوم کر لیتے ہیں، خط کے اندر کی عبارت پڑھ لیتے ہیں، زمین کے اندر دفن ہو کر گھنٹوں زندہ رہتے ہیں۔ موٹی موٹی زنجیر توڑ ڈالتے ہیں، موٹر کو روک لیتے ہیں، جامد اجسام سے عبور کر جاتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

پہلی قسم کے لوگوں کا یہ دعویٰ کہ وہ روحوں کو طلب کر لیتے ہیں یا ان کی تصاویر دکھا دیتے ہیں، کسی طرح قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کے تسلیم کرنے میں بہت سے علمی محالات کو ماننا پڑے گا۔ روح اگر جسم سے جدا ہونے کے بعد باقی رہنے والی چیز ہے تو ظاہر ہے کہ اسکا وجود بغیر کسی وساطت کے نہیں پایا جا سکتا اور اگر اس کو وجود محض مانیں تو دوسرے الفاظ میں گویا اسکو خدا ماننا پڑے گا۔ پھر بلانے سے اسکا آجانا اور تھوڑی دیر کے بعد واپس چلا جانا کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ اس طرح حیز زمانی و مکانی دونوں کا وجود اس کے لئے ضروری ہوگا اور یہ بالکل خلاف عقل ہے۔ روحوں کی جو تصویریں دکھائی جاتی ہیں، وہ خود اس کا ثبوت ہیں کہ یہ سارا تماشہ محض شعبدہ ہے کیونکہ یہ تصویریں بالکل انسانی جسم کی تصویریں ہوتی ہیں، وہی تمام اعضاء، وہی وضع و ملبوسات، وہی خط و خال۔ اول تو روح محض جو غیر مرئی چیز ہے فوٹو کے شیشہ پر نمایاں ہو ہی نہیں سکتی، اور اگر اس سے قطع نظر کر لیں تو بھی اس کا جسم انسانی اور اس کی تمام خصوصیات اور دنیاوی وضع و لباس کے ساتھ رونما ہونا کوئی معنے نہیں رکھتا۔ امریکہ کے مشہور علمی پرچہ سائنٹفک امریکن نے زر کثیر صرف کر کے ایک جماعت انکی تحقیق کیلئے متعین کی تھی، اور اس نے جو رپورٹ پیش کی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف روحوں کی تصویریں بلکہ اکثر و بیشتر مسمریزم کے ذریعہ سے یا وسیط و معمول کی وساطت سے روحوں کا طلب کرنا بھی محض مکر و فریب ہے۔ لیکن بعض صورتوں میں یہ ضرور ماننا پڑیگا کہ مسمریزم یا ہپناٹزم ضرور ایک ایسی دماغی قوت ہے جو دوسروں کو متاثر کر کے بعض غیر معمولی باتوں کو دائرہ علم میں لے آتی ہے، لیکن یہ صرف عامل کی قوت ارادی اور دماغی برتری کا نتیجہ ہے۔ اسکو کسی روح کی آمد و رفت سے کوئی علاقہ نہیں۔

دوسری جماعت سے جو خارق عادات واقعات ظہور میں آتے ہیں، ان میں بعض کا سبب مشق و تربیت ہے، مثلاً زنجیروں کا توڑنا، موٹر کا روک لینا وغیرہ کہ اعصاب انسانی میں فطرت کی طرف سے ایک غیر معمولی اہلیت ودیعت ہوئی ہے کہ اگر انکی پرورش کی جائے تو

اس نوع کے بہت سے مافوق الفطرت واقعات اس سے ظہور میں آسکتے ہیں۔ لیکن بعض باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو اکتساب و مشق، تعلیم و تربیت سے متعلق نہیں ہیں۔ بلکہ خود فطرت ذہن و عقل، روح و دماغ کو غیر معمولی پیدا کرتی ہے اور بند تحریروں کو پڑھ لینا، پوشیدہ سوالوں کا جواب دیدینا، مستقبل کے متعلق صحیح پیشین گوئیاں کر دینا اکثر و بیشتر ایسے ہی دماغ والوں کی طرف سے ظاہر ہوتا ہے۔

حال ہی میں یورپ کا ایک شخص ہوڈینی جو ساحر کے لقب سے مشہور ہو گیا تھا، انہیں لوگوں میں سے تھا اور اس سے ظاہر ہونیوالے واقعات کسی لاگ یا شعبدہ کا نتیجہ نہ ہوتے تھے بلکہ فطرتاً اسکی قوت ارادی اتنی بڑی زبردست تھی کہ جس بات کا وہ ارادہ کرتا تھا پوری ہوجاتی تھی، یورپ میں مختلف مقامات پر بڑے بڑے جلسوں میں اسکا امتحان لیا گیا اور آخر کار ہر شخص کو اعتراف کرنا پڑا کہ جو کچھ اس سے ظاہر ہوتا ہے وہ باوجود غیر فطری ہونے کے بالکل فطری ہے۔ مثلاً ایک ادنیٰ سی بات یہ تھی کہ کوٹھری کے اندر بند کر دینے کے بعد وہ دیوار کے اندر سے نکل آتا تھا، بظاہر یہ کس قدر ناممکن سی بات ہے، لیکن ایسا ہوتا تھا اور لوگ دیکھتے تھے۔ یا یہ کہ اسکو کتنی ہی موٹی زنجیروں سے باندھ دیجئے، لیکن بغیر زنجیر توڑے ہوئے وہ اپنے آپ کو آزاد کر لیتا تھا۔ بہر حال اسکی زندگی کے بہت سے واقعات ہیں جن سے یورپ کا ہر شخص واقف ہے۔

اس سے قبل ایک نہایت مشہور شخص جو لوگوں کے دل کا بات معلوم کر لیتا تھا اور جس سے کسی راز کا چھپانا دشوار نہ تھا، کمبرلینڈ تھا، جس کو اپنی اس قوت کا حال اتفاق سے معلوم ہوگیا۔ ایک مرتبہ وہ اپنے دوست کے مکان پر بیٹھا ہوا تھا کہ مسمریزم پر گفتگو شروع ہوئی، کمبرلینڈ نے کہا کہ دوسرے کے دل کی بات معلوم کر لینا دشوار نہیں ہے، اور یہ کہکر اس نے غور کیا تو اپنے دوست کے دل کی بعض باتیں اسپر منکشف ہونے لگیں، اتفاق سے اس وقت اس کے دوست نے کمبرلینڈ سے دریافت کیا کہ اگر یہ ممکن ہے تو بتاؤ میرے دل میں کیا ہے اور جس وقت کمبرلینڈ نے بتا دیا تو اس کو سخت حیرت ہوئی۔ اس واقعہ کے بعد کمبرلینڈ نے جو غور کرنا شروع کیا تو اسے اپنی اس قوت کا حال زیادہ وضاحت کیساتھ معلوم ہونے لگا۔

کمبرلینڈ نے اس کے بعد کے جو تجربات اپنے قلمبند کئے ہیں وہ نہایت عجیب و غریب و پرلطف ہیں۔ وہ لکھتا ہے پہلے مجھے یہ یقین نہ تھا کہ گھر کے اندر کی کسی پوشیدہ چیز کا تھکانا مجھے معلوم ہو سکتا ہے، لیکن ایک بار میں مارکوئیس لورن کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا کہ اس نے کہا میں اپنے دل میں کسی چیز کا خیال کرتا ہوں، بتاؤ وہ کیا ہے۔ میں نے اپنی آنکھ پر پٹی باندھ لی اور مارکوئیس کا ہاتھ پکڑ کے باہر گیا میرے قدم خود بخود اٹھتے جاتے تھے یہاں تک کہ میں گھر سے باہر نکلکر اصطبل تک گیا اور وہاں میں نے ایک جاندار چیز پر ہاتھ رکھکر کہا کہ آپ نے اس چیز کا تصور کیا تھا جس کی اسنے تصدیق کی۔ میں نے آنکھ سے پٹی کھولی تو معلوم ہوا کہ وہ ایک ہرنی تھی

اسی طرح ایک مرتبہ آسٹریا کے ولی عہد نے ایک ایسے سیاہ کتے کا تصور کیا جس کا علم خود اس کو بھی نہ تھا، لیکن کمبرلینڈ اس کا ہاتھ پکڑ کر لے چلا یہاں تک کہ ایک بازار میں اس طرح کا کتا نظر آگیا جسے ولیعہد نے خرید لیا۔ ایک مرتبہ امتحاناً چند لوگوں نے ایک سوئی کہیں چھپادی لیکن کمبرلینڈ نے اسے بھی ڈھونڈھ نکالا۔

ایک مرتبہ ایک انڈا سفیر امریکہ کو دیا گیا کہ جہاں چاہے اسے چھپادے چنانچہ اس نے چھپا دیا۔ اس مرتبہ یہ کیا گیا کہ ایک باریک

زنجیر کا ایک سرا کمبرلینڈ کے داہنے ہاتھ میں باندھ دیا گیا اور دوسرا سفیر امریکہ کے بائیں ہاتھ میں۔ کمبرلینڈ آگے اور سفیر اس کے پیچھے پیچھے تھا، آخر کار یہ اصطبل میں پہونچا اور وہاں ایک صندوق کے پاس ٹھہر گیا جو مقفل تھا، کمبرلینڈ نے سفیر کی جیب سے کنجی نکال کر اس کو کھولا اور انڈا نکال لیا۔

ایک مرتبہ کئی آدمیوں نے ملکر کمبرلینڈ کو دھوکا دینا چاہا یعنی انہوں نے یہ ترکیب کی کہ اس کو باہر کر کے اندر دو قزاقوں اور ایک مسافر کی نقل کی اس طرح کہ دونے قزاق بنکر تیسرے شخص کو جو مسافر بناتھا گرفتار کیا اور اس کے بال میں سے خنجر سے اسے ذبح کیا اور پھر خنجر کو صاف کر کے رکھ دیا۔ کمبرلینڈ جب اندر آیا تو اس نے اسی طرح تمام نقل کر کے دکھا دی یہاں تک کہ خنجر کو بھی اس نے بالکل اسی طرح صاف کیا جس طرح ان لوگوں نے کیا تھا۔

ایک مرتبہ انگلستان کے مشہور وزیر گلیڈسٹون نے ایک عدد تین ہندسوں کا اپنے جی میں لیا اور اس کے دو ہندسے ۳ اور ۷ بتا کر کہا کہ تیسرا ہندسہ بتاؤ۔ کمبرلینڈ نے گلیڈسٹون سے کہا کہ اس عدد پر کامل غور کیجئے۔ اس کے بعد کمبرلینڈ نے بتا دیا کہ وہ عدد ۳۶۷ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ گلیڈسٹون سے یہ بھی دریافت کیا کہ آپ تیسرے ہندسے کے لئے ۵ اور ۶ کے درمیان کیوں مذبذب رہے تھے گلیڈسٹون نے اسکا اقرار کیا اور کہا کہ بیشک میں یہ تردد کر رہا تھا۔

الغرض اس قسم کے متعدد واقعات کمبرلینڈ نے قلمبند کئے ہیں اور اس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوت اس میں بالکل فطری ہے جس میں اکتساب کو بہت کم دخل ہے۔ خود یہاں ہندوستان میں ایک بار میں نے ایک گمنام ہندو شخص کو دیکھا تھا جو بند خط کی عبارت کی عبارت پڑھ دیتا تھا۔ میں نے اس سے گفتگو کی تو معلوم ہوا کہ اس میں بھی یہ قوت بالکل عطیۂ فطرت تھی۔

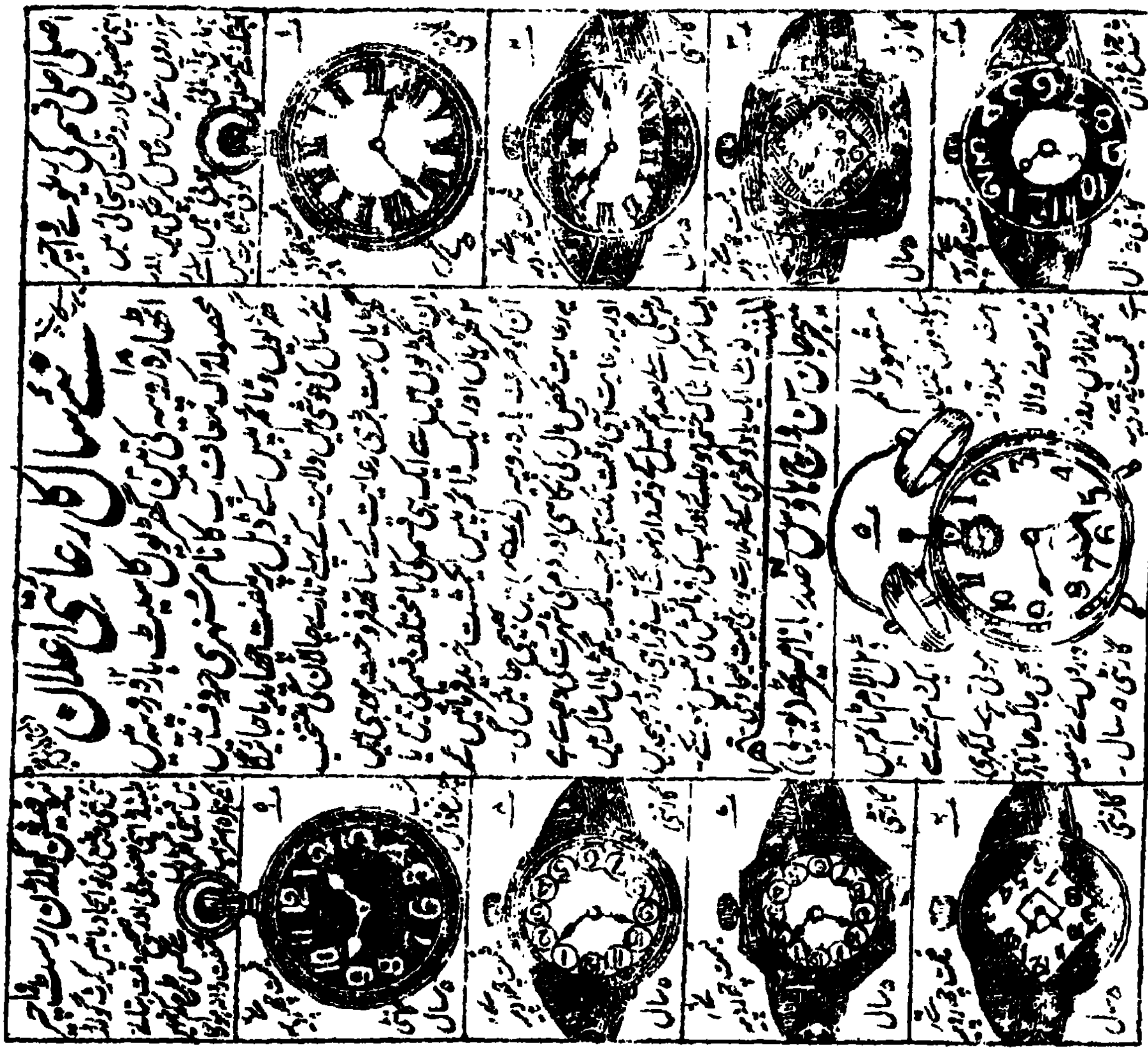
اب ایک محقق کے سامنے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے اور دماغ کی وہ کونسی ساخت ہے جو ایک شخص میں یہ غیر معمولی ملکہ پیدا کر دیتی ہے، لیکن اسوقت تک اس میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی اور کسی قسم کی تسکین بخش علمی توجیہ اس کی نہیں ہو سکی۔ ممکن ہے کہ آیندہ اس میں کامیابی حاصل ہو لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اس وقت تک اور جدید غوامض فطرت رونما ہو کر انسان کو پھر اسی احساس بیچارگی کے سوگ میں مبتلا نہ کر دیں گے۔

انسان کو فطرت نے کبھی اس پر مجبور نہیں کیا کہ وہ ہر نامعلوم شئے کو معلوم کرے بلکہ اس کا اقتضا امر یہ ہے کہ جو معلوم ہو اس سے کام لیا جائے۔ اگر اس طرح کے دماغ دنیا میں موجود ہیں جن سے ایسے غیر معمولی افعال کا ارتکاب ہوتا ہے تو وہ زیادہ قابل اعتنا نہیں بلکہ قابل لحاظ وہ معمولی دماغ ہیں جن کی کاوشیں ہماری روز کی زندگی اور تمدن کی ضروریات کو پورا کرتی ہیں۔

آج تک کبھی کوئی قوم کمبرلینڈ، ہوڈینی، یا کسی صاحب کرامات ولی کے خوارق عادات سے ترقی نہیں کر سکی، اگر ترقی ہوئی ہے تو صرف اس معمولی اصول کی بنا پر کہ زمین میں ہل کیسے چلایا جاتا ہے، پتھر ہتوڑے سے کیونکر توڑا جاتا ہے، روئی کا تاگا اور تاگے کا کپڑا کس طرح بنایا جاتا ہے، اس لئے میری رائے ہے کہ اگر کوئی ایسا آدمی نظر آجائے جو اس طرح کی باتیں بتاتا ہے یا اس سے ایسی غیر معمولی عجیب باتیں ظاہر ہوتی ہوں، تو اس کی طرف توجہ نہ کرو کیونکہ وہ ایک تعجب انگیز مظہر قدرت تو ضرور ہے لیکن ہماری

دنیاوی زندگی کے لئے اسکا وجود بالکل بیکار ہے۔ انبیاؑ و رسلؑ نے بھی دنیا میں کوئی کامیابی معجزوں کے ذریعہ سے حاصل نہیں کی اور نہ معجزہ و کرامات ہمارے لئے مفید ہیں۔ بلکہ کامیابی کا اصل راز قوت عمل اور عزم راسخ ہے، سو اس کا استعمال آسمان سے تارے توڑ کر لانے کے لئے نہ ہونا چاہئے بلکہ صرف اپنے کو صحیح بنانے کے لئے ہونا چاہئے۔ غیب کی باتوں کا معلوم ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ واردات حال کو سمجھنا لازم ہے کیونکہ زمانۂ مستقبل کی ہر چیز کو ایک نہ ایک دن حال ہو جانا ہے اور حال کا ماضی ہو جانا بالکل یقینی جس پر انسان کا کوئی قابو نہیں۔

نیاز



لفظ حسین کے ساتھ امامت کی نسبت احترام و عزت کا غلط معیار

نگار کی کسی گذشتہ اشاعت میں بہ سلسلہ "باب الاستفسار" میں نے جناب سکینہ بنت حسین کے مسائل ازدواج اور انکی بعض خصوصیات فطرت کے متعلق کچھ لکھا تھا جس کو ہمارے شیعہ احباب نے اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا اور بعض نے مجھے متنبہ کرتے ہوئے اس قدر عجیب و غریب ذہنیت کا اظہار کیا کہ میں یہ چند سطور لکھنے پر مجبور ہو گیا، نہ کہ اصلاح کے لئے نہیں بلکہ صرف اپنا مقصود ظاہر کرنے کے لئے۔

اعتراض کرنے والوں میں صرف ایک صاحب میرٹھ کے ایسے تھے جنہوں نے یہ لکھا کہ جناب سکینہ کے جو حالات میں نے قلمبند کئے ہیں وہ تاریخی نقطۂ نظر سے بالکل غلط ہیں (حالانکہ انہوں نے بھی تاریخ سے مدد لیکر میرے تحریر کردہ حالات کی تردید نہیں کی اور نہ خود صحیح حالات تحریر فرمائے)، باقی جتنے حضرات تھے انہوں نے اپنی برہمی کا اظہار جس انداز سے کیا وہ نہایت ہی پر لطف ہے۔ مثلاً ایک صاحب نے جو اودھ کے ضلع کے معزز وکیل ہیں تحریر فرمایا کہ "چونکہ نگار میں آپ کی تصنیف سکینہ بنت حسین کا اشتہار درج ہوتا ہے اس لئے آئندہ سے نگار کی خریداری منظور نہیں ہے"۔ ایک اور بزرگ نے مطالبہ کیا کہ "لفظ حسین کے بعد چونکہ آپ علیہ السلام نہیں لکھتے اس لئے نگار نہ بھیجا جائے" الغرض اسی طرح کے مطالبات تھے اور اسی قدر کی برہمی تھی جو شیعہ حضرات کی طرف سے ظاہر کی گئی۔ چونکہ میرا مسلک تفریق و تعیین مذاہب سے بہت بلند ہے اور میں ایک شیعہ کیا معنی، ایک بت پرست کو بھی برا نہیں کہتا اور نہ انکی طرف سے مذہبی عناد رکھتا ہوں، جیسا کہ نگار کے مطالعہ کرنے والوں پر واضح ہے۔ اس لئے میں نے ضروری سمجھا کہ اپنے برہم ہو جانے والے شیعہ دوستوں سے اس باب میں تھوڑی سی گفتگو کر لوں۔

جناب سکینہ کے متعلق جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ بڑی نزدیک انتہائی وثوق کے ساتھ لکھا ہے اور اگر کوئی صاحب تاریخ سے اسکی تردید کر دیں گے تو میں بلا تامل تسلیم کر لوں گا۔ علاوہ اس کے میں نے جو کچھ تحریر کیا ہے اس میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے جسے جناب سکینہ کی شان کے منافی سمجھا جائے۔ شاعری یا موسیقی کا ذوق۔ وضع و ملبوس کے باب میں اظہار خوش سلیقگی میرے نزدیک ایک عورت کی بہترین صفت ہے اگر اس کا استعمال اچھا کیا جائے اور یقیناً جناب سکینہ کے لئے یہ امر کم باعث امتیاز نہیں کہ آپ کی زندگی میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا جو انسان کی بلند ترین فطرت کے معیار سے گرا ہوا ہو۔ پھر اگر اس اعتراف کیساتھ ساتھ میں نے یہ بھی ظاہر کر دیا کہ آپ کا ادبی ذوق نہایت پاکیزہ تھا یا موسیقی سے آپکو خاص مناسبت تھی یا یہ کہ آپ نہایت خوش سلیقہ تھیں، تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے جناب سکینہ کی کیا توہین ہوتی ہے۔ اگر اس سارے الزام کے جواب میں یہ عرض کر دوں کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ اس سے بہت کم ہے جو خود ایک شیعی مورخ (صاحب اغانی) نے تحریر کیا ہے، تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرات شیعہ اس کتاب کو بھی اسی سلوک کا مستحق سمجھیں گے جو نگار کے لئے روا رکھا گیا یا نہیں؟

بہرحال جہاں تک روایات تاریخی تعلق ہے میں نے ہر اس عزت و احترام کا لحاظ رکھتے ہوئے اقتباس کیا ہے جس کی جناب سکینہ مستحق ہیں، اور اگر نتیجۃً ہمیں کچھ غلطی ہوئی ہے تو ہر وقت اسکے اعتراف پر آمادہ ہوں لیکن یہ قیامت تک ماننے کیلئے تیار نہیں کہ اس کی تہ میں میری عصبیت کام کر رہی تھی یا قصداً میں نے دل آزاری کی -

اب رہا سوال لفظ حسین کے بعد علیہ السلام یا اس سے قبل لفظ امام کا اضافہ، اسمیں البتہ میرا مسلک ذرا عام روش سے علیحدہ ہے میں یہ سمجھتا ہوں کہ انسان جسقدر زیادہ بلند و بالا ہوتا جاتا ہے اسی قدر کمی ان القاب و خطابات میں بھی ہوتی جاتی ہے جو محض تخصیص و تعیین کیلئے وضع کئے جاتے ہیں۔ اور اگر انکو قائم رکھا جائے تو گویا حقیقی عزت میں کمی کرنا ہے۔ حسین کی امامت مسلم ہے اور یہ بھی یقین ہے کہ وہ سلام و صلواۃ کے مستحق ہیں، لیکن اگر گمان یہی کر حدیث ... نام کیساتھ اسکا اظہار نہ کیا جائیگا لوگ نہیں سمجھ سکیں گے تو میرے خیال میں یہ حسین کی اہمیت کو کم کرنا ہے، بڑھانا۔ حسین ہی ان تمام خصوصیات کا نام ہے جسمیں امامت و سیادت وغیرہ شامل ہیں دنیا میں صرف ایک ہی ہوا ہے اور جو چیز دنیا میں صرف ایک ہی ہو اور اسکا کوئی مثیل و نظیر نہ ہو، اسکے نام کے ساتھ الفاظ تخصیص کا اضافہ فعل عبث ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ صرف حسین کہکر ہم جس قوت کے ساتھ انکی بزرگی کو ثابت کر سکتے ہیں، وہ نہ لفظ امام کے بڑھانے سے پیدا ہوتی ہے نہ کسی اور لقب کے اضافہ سے۔ اگر ایسا ہوتا تو آج لفظ خدا سے زیادہ کسی اور لفظ کے ساتھ طومار ضمیموں کا نہ ہوتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ خدا کی ذات بے نیاز ہے اور اس کو کسی چیز کی ضرورت نہیں، تو میں پوچھتا ہوں کہ حسین ہی کو کب ضرورت ہے کہ آپ انہیں امام کہیں اور علیہ الصلواۃ والسلام کے دعاؤں کا محتاج سمجھیں۔ نہ وہ کسی کے کہنے سے امام ہو سکتے ہیں اور نہ آپ کا سا امتی کی دعا ان کے لئے مفید ہو سکتی ہے -

البتہ اگر اس کے جواب میں کسی نے یہ کہدیا کہ اس سے مقصود خود برکت و ثواب حاصل کرنا ہے تو بیشک میرے پاس اسکا کوئی توڑ نہ ہوگا اور مجکو پھر سپر ڈالدینی پڑیگی، کیونکہ گفتگو اعتقاد کی اس تاریک دنیا کی چھڑ جائیگی، جہاں ہر جہل کا نام علم ہے اور مجھے اسکا علم ہے کہ بحمد اللہ میں اسقدر جاہل نہیں -

بہرحال اگر کوئی شخص حسین کے نام کے ساتھ انکے تمام صفات کا اظہار بربنائے غلوئے شوق ضروری سمجھتا ہے تو مجھے اعتراض کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کے ضمیر کو تسکین ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ صرف لفظ حسین کا کہدینا زیادہ پر عظمت طریق اظہار ہے تو دوسرے کو برا ماننے کی ضرورت نہیں علی الخصوص اس وقت جب کہ میں عیسیٰ، موسیٰ، محمد، ابوبکر، عمر، عثمان وغیرہ کے ساتھ بھی کسی اور لفظ کا اضافہ نہیں کرتا

اب رہا معاملہ ثمر کی کتاب سکینہ بنت حسین کا، سو چونکہ اس کا تعلق صرف تجارت سے ہے اور محض تجارتی نفع کے خیال سے میں کسی کا دل دکھانا پسند نہیں کرتا اس لئے میں نے منیجر کو ہدایت کر دی ہے کہ آیندہ سے اسکا اشتہار بند کر دیا جائے، لیکن جناب سکینہ کے متعلق اپنے لکھے ہوئے واقعات کو میں اس وقت تک غلط نہیں سمجھ سکتا، جب تک اس کی غلطی مجھ پر ثابت نہ کر دی جائے -

نیاز

نشاطِ بہار

فریبِ رنگ و بو کہیں　　ہوائے جستجو کہیں
فضائے آرزو کہیں　　خلائے ہاؤ ہو کہیں
نزولِ آبِ جو کہیں　　گلوں میں ہے نمو کہیں
نماز بے وضو کہیں　　بے خُم کہیں سبو کہیں
سرور بے خمار ہے
بہار ہی بہار ہے

ارم فریب ہے زمیں　　مہک رہی ہے یاسمیں
لٹک لٹک کے پتیاں　　ہوئی ہیں کیف آفریں
چہک رہی ہیں بلبلیں　　گلاب کے قریں قریں
کنارے پنگھٹوں کے ہیں　　حسین و شوخ نازنیں
نشاط ہے ترنگ ہے
امنگ سی امنگ ہے!

بہار سبزہ زار ہے　　کہ حسن کیف بار ہے
فضائے کیف زا ہے یہ　　کہ لطف بادہ خوار ہے
صبا میں ہیں زمزمے　　کہ نغمہ بے قرار ہے
یہ سرخ سرخ پھول ہیں　　کہ حسن اشکبار ہے
جو ہے وہ لاجواب ہے
شباب کا شباب ہے

خروشِ سیل گنگ ہے　　طلسمِ آب و رنگ ہے
صدائے قہقہے اب　　گلوئے حسن تنگ ہے
ہر ایک مطربہ سے لئے!　　رباب اور چنگ ہے

غنائے دلپذیر ہے　　فضا میں خاص رنگ ہے
جمال تابدار ہے!
کہ حسن لمعہ بار ہے!

نمائشِ شباب ہے　　ہجومِ اضطراب ہے
کھلی ہوئی ہے یاسمن　　عروسِ بے نقاب ہے
اسے خبر ہی یہ کہاں　　کسی کو پیچ و تاب ہے
نگاہ شوقِ دید ہے　　مگر وہی حجاب ہے
گناہ پر عذاب ہے
عذاب بھی ثواب ہے

نیاز، سرفروش ہے　　تو ناز، لطف کوش ہے
پیامِ شوق میں نہاں　　لطافتِ خموش ہے
نگاہِ کیف آفریں　　حریفِ بادہ نوش ہے
ردائے جوش میں چھپی　　ادائے گل فروش ہے
نمود میں نمود ہے!!
شہود میں شہود ہے!!

لگاوٹیں شباب کی　　عداوتیں حجاب کی
جھلک کے قہر ڈھا گئیں　　یہ سرخیاں گلاب کی
رلائیں گی مجھے لہو!　　یہ شوخیاں نقاب کی
ہنوز لن ترانیاں　　سوال پر جواب کی
کلیم ناصبور ہے
خموش کوہِ طور ہے!!

حلاوتِ بہار ہے کہ لطفِ آبشار ہے
وہ آئینہ ہوں دہر میں کہ روئے پُرغبار ہے
فوئے زخم دل کہاں کہ جیب تار تار ہے
ہے "پیکرِ خموش" یہ کہ حافظِ نزار ہے
مشین ہے خموش ہے!
مگر بہار دوش ہے!

حافظ غازی پوری

خدا محبت سے

اے خالقِ اربابِ وفا چھوڑ نہ مجھکو
اے عشق و محبت کے خدا! چھوڑ نہ مجھکو

اے وہ! کہ شہنشاہ بھی محتاج ہیں تیرے
میں بھی ہوں ترے در کا گدا چھوڑ نہ مجھکو

کمزور ہوئی روح مری۔ دور ہے منزل
ہے کشمکشِ لغزشِ پا چھوڑ نہ مجھکو

ہر ذرہ گنہگار ہے تعمیر کا میری
لیکن مرے "معصوم خدا" چھوڑ نہ مجھکو

میرے لئے ہے تیرہ و تاریک زمانہ
اے چشمۂ انوار و ضیا! چھوڑ نہ مجھکو

ہوں کب سے تیری راہ میں افتادۂ ذلت
الفت سے مرے سر کو اٹھا چھوڑ نہ مجھکو

یہ ہاتھ تو وابستۂ زنجیرِ وفا ہیں
آقا! مرے دامن نہ چھڑا۔ چھوڑ نہ مجھکو

قطرہ کو بھی دریا سے ہی اک نسبتِ جاوید
ہوں گا نہ کبھی تجھ سے جدا چھوڑ نہ مجھکو

تو میرا خدا ہے تو میں تیرا ہی روشؔ ہوں
اس طرح نہ جو مجھ سے خفا۔ چھوڑ نہ مجھ کو

(روش صدیقی)

گونڈہ کی یاد (دکن میں)

تیرے اندر "رود موسی"[۱] ہے نہ "باغ عام"[۲] ہے — کوئی واقف تک نہیں، تو اس قدر گمنام ہے
اونچے اونچے بام و در والے مکاں تجھ میں نہیں — لکھنؤ کی تو بہو رنگینیاں تجھ میں نہیں
چشم ظاہر کے لئے ہر چند تو ویران ہے — پھر بھی تیری سادگی میں بانکپن کی آن ہے
دیکھنے میں یوں تو بے رونق ہے تیری سرزمیں — شہر کہلاتا ہے، لیکن شہریت بالکل نہیں

تیری گلیاں تنگ و ناہموار، سڑکیں خام ہیں
تیرے کچے گھر مسرت کا مگر پیغام ہیں

میری نظروں میں ہیں "رادھا کنڈ"[۳] کی وہ سیڑھیاں — چاندنی راتوں میں گھنٹوں میں ٹہلتا تھا جہاں
ہلکی ہلکی چاندنی میں وہ ہوائے مشکبار — وہ کنول کے سرخ پھولوں پر قیامت کا نکھار
کوکتی تھیں کوئلیں جب دکھ بھری آواز سے — دل تڑپ اٹھتا تھا سینہ میں عجب انداز سے
دور آموں کے درختوں پر پپیہا بول اٹھا — یا لب صحرا کوئی دہقاں اگر گانے لگا!

وہ دبی جاتی تھیں آوازیں دل مہجور میں!
تیرنے لگتی تھی میری روح موج نور میں!!

آم کی فصلوں میں وہ گنجان باغوں کی بہار — وہ سڑک پر دونوں جانب سبز نیموں کی قطار
ہم جلیسوں میں وہ بے معنی خوشی کے چہچہے! — عہد طفلی کا تبسم، نرم و شیریں قہقہے!
ہائے وہ "ساگر"[۴] کی موجیں، "انجمن"[۵] کا سبزہ زار — شام کی تازہ ہواؤں میں وہ ٹینس کی بہار

حضرت اصغر کی وہ رنگیں نوائی کے مزے!
بیخودی میں وہ جگر کی خوش ادائی کے مزے!

ہائے اب تک کمسنی کی رنگ رلیاں یاد ہیں — وہ محلے یاد ہیں، وہ تنگ گلیاں یاد ہیں
کوئی موسم ہو، کوئی رت ہو، سحر ہو شام ہو — منزل آوارگی ہو، گوشۂ آرام ہو!!!
یہ مناظر دل سے اپنے میں بھلا سکتا نہیں — مجھ کو کیوں ان سے محبت ہے، بتا سکتا نہیں

ذرہ ذرہ اس زمیں کا جلوہ گاہ ناز ہے
میری اس وابستگی میں ایک گہرا راز ہے

ذوقی

---

[۱] حیدرآباد کی ندی [۲] حیدرآباد کا ایک خوبصورت باغ [۳] گونڈے کا ایک تالاب [۴] ایک دوسرا تالاب [۵] کلب کا نام

ترانۂ دل

جب راز ہوں سرتاپا — جب ایک معمّا ہوں
پھر بحث ہے لاحاصل — محمل ہوں کہ لیلےٰ ہوں
یہ دیکھ کہ دانا ہوں! — یہ دیکھ کہ بینا ہوں
یہ دیکھ کہ ہوں سب کچھ — مت پوچھ کہ مَیں کیا ہوں؟
مَیں رونقِ محفل ہوں
دل ہوں مَیں ترا دل ہوں

امکاں مری وسعت کا! — نادیدہ و نشنیدہ
یعنی ہوں ابھی تک مَیں — اک فتنۂ خوابیدہ
صد نغمۂ نشنیدہ — صد جلوۂ نادیدہ
جبریل مرا خادم — خالق مرا گرویدہ
میں جوہرِ قابل ہوں
دل ہوں میں ترا دل ہوں

امین حزیں

عورت

حسن کے اور عشق کے جذبات کا
قلزم زخّار لہراتا ہُوا

قاصدِ عشق اور شاہنشاہِ حُسن
نامۂ عصمت کی توقیع حیا

نیش ہے لیکن مثالِ نوش ہے
نرّشش پیہم ۔ برنگ مومیا

یا شرابِ عشرت و عیش و نشاط
یعنی آدم کا نخستیں مدّعا

یا کہ ہے غارت گرِ ہوش و حواس
بادۂ کیف آور ایماں رُبا

یا کہ ہے گوسالۂ مسلم فریب
سامری کا سحر ہے چلتا ہوا

یا پری جو کسوت آدم میں ہے
نور کے سانچے میں ہے یا بت ڈھلا

یا گلِ رنگین فردوسِ نظر
یا ترنّم حضرت داؤد کا

یا حدیثِ غالبِ جادو طراز
یا کہ شعرِ حافظِ معجز نما

یا اچھوتا سا تخیّل جو کہ ہو
سرحدِ افکار شاعر سے وری

یا کہ یہ قدرت کا گہرا راز ہے
پردۂ حسن و جوانی میں چھپا!

کیا جنونی کہیے مشتِ خاک کو
فتنۂ محشر کہ طوفانِ بلا

فضل حسین تبسّم

غزلیات

اثر رامپوری

گھر سے باہر جاتا ہوں جب ان کو وحشت ہوتی ہے
میرے حالِ ابتر سے دنیا کو عبرت ہوتی ہے

دل کو جذب کرنیوالی اچھی صورت ہوتی ہے
جو دل میں گھر کرتی ہے وہ اچھی سیرت ہوتی ہے

عرضِ حسرت کو یہ سمجھے میری شکایت ہوتی ہے
کہتے ہیں وہ ان باتوں سے ہمکو اذیت ہوتی ہے

دردِ الفت کے میں صدقے دردِ الفت کے قرباں
بڑھتا ہے یہ جتنا دل میں اتنی راحت ہوتی ہے

اے دل رنجِ فرقت میں گھبرانے سے کیا حاصل ہے
راحت بھی ملتی ہے اسکو جسکو مصیبت ہوتی ہے

ان سے نظر کا ملنا بس اور سمجھ میں آنا تھا
جو دل کو بس میں کرتی ہے کونسی طاقت ہوتی ہے

مشکل راحت کیونکر دیکھے کوئی عشقِ دلبر میں
جب دل بس میں ہوتا ہے راحت کی صورت ہوتی ہے

دیکھ لیا کرتے ہیں اثر ہم سوئے گردوں ایک نظر
رونے دھونے سے فرقت میں جسدم فرصت ہوتی ہے

شوق مرادآبادی

ہوں خاکِ نامراد۔ تری رہگذار میں
جو ذرہ اڑ گیا ہو۔ ہوا سے غبار میں

ہمت ہے آج دیکھئے کس جاں نثار میں ؟
ہر اک ادا۔ پکار رہی ہے ہزار میں

یہ تنگنائے دہر کا ہے نقشۂ حیات
گویا پڑا ہوا ہوں کسی انتظار میں

ہے ہر ہوا کے ساتھ جو رقصاں بگولہ وار
مٹ کر بھی۔ یہ جنون ہے میرے غبار میں

ہے عاشقوں میں دھوم رکوع و سجود کی
جوہر تڑپ رہے ہیں جو شمشیرِ یار میں

واللہ۔ ایک ہی ہے تو۔ وصال و مرگ
اُف بے بسی۔ کہ وہ بھی نہیں اختیار میں

پیغامِ وصل۔ شوقؔ بس اک حادثہ ہے
ابتک گذر رہی تھی کسی انتظار میں

اختر شیرانی

کبھی، کاش، رحم کا بھی اثر ملے چشمِ فتنہ نگاہ میں!
کہ کوئی گدا سا پڑا ہوا ہے ترے عشق کی راہ میں!

نہیں یاد عیش و ملالِ عمرِ گذشتہ کی کوئی داستاں
مگر آہ چند وہ ساعتیں، جو بسر ہوئی ہیں گناہ میں!

گلۂ ستم کی مجال تو ہے، پہ آہ اس کو میں کیا کروں
یہ جو ایک بجلی سی بیقرار ہے ان کی نیچی نگاہ میں!

جو نظامِ دل نہ بدل سکا، تو مذاقِ دہر کا کیا گلہ؟
وہی تلخیاں ہیں ثواب میں، وہی لذتیں ہیں گناہ میں!

نہیں عذر زاہدو! لاکھ مرتبہ جائیں خلدِ دوام کو ہم
مگر ایک شرط ہے میکدہ نہ مذکرے کہیں راہ میں!

بخدا کہ دونوں جہان میں کوئی شے بھی اس سے بڑھ کے مزہ نہ تھا
اگر ایک تلخئ انفعال کی حس نہ ہوتی گناہ میں!

دل شاہجہانپوری

کر چکا برباد جب عشق قیامت زا مجھے
دل نے رندوں میں نظر آئی نئی دنیا مجھے

جب ازل سے حسن کی فطرت ہے خلوت آشنا
تم نے کوئے عشق میں پھر کیوں کیا رسوا مجھے

وہ تغافل کیش، میں صبر آزما، دل باوفا
یہ شبِ وعدہ نہ دے اے زندگی دھوکا مجھے

آپ پر گذری ہوئی ہے خود سمجھ لیں اے کلیم
کیا کہوں اس جلوہ گہ میں کیا نظر آیا مجھے

آرزوئے دید، شوقِ وصل، سب خواب و خیال
ہستیِ موہوم نے دھوکے دیئے کیا کیا مجھے

شدتِ تنویر آخر بن گئی وجہِ حجاب!
پردہ اٹھنے پر بھی اک پردہ نظر آیا مجھے

حشر میں عذرِ وفا کا اب نہیں کوئی محل
یاد ہے اے دل کسی کا وعدۂ فردا مجھے

فرخ بنارسی

طریقِ عشق میں لذّت کشِ فنا ہوں میں
مٹا ہوا سا سرِ راہ نقشِ پا ہوں میں

جہانِ عشق میں اک راز ہے مری ہستی
بیان ہو نہ سکے جو وہ مدعا ہوں میں

مذاقِ درد ملا درد آشنا نہ ملا!!
محیطِ دہر میں لب تشنۂ وفا ہوں میں

ہر ایک ذرّۂ فطرت ہے گوش بر آواز
سمجھنے والے سمجھتے ہیں وہ صدا ہوں میں

مآلِ ہستیِ موہوم اک معمّہ ہے
خبر نہیں کوئی جس کی وہ ابتدا ہوں میں

ازل سے جو نہیں منّت پذیرِ چارہ گری
وہ خوگرِ خلشِ دردِ لا دوا ہوں میں

جفائے عشق کی مجبوریاں معاذ اللہ
نہ دیکھ سکتا تھا جو کچھ وہ دیکھتا ہوں میں

نہیں ہے اپنی خبر ہوش ماسوا کیسا
تلاشِ یار میں کچھ ایسا گم ہوا ہوں میں

بڑھی ہے کیفِ محبت سے بیخودی ایسی
کہ اپنا حال اب ایک اک سے پوچھتا ہوں میں

سرابِ وہم ہے سارا نمودِ ہستی ہے
یہ سب فریبِ نظر ہے جو دیکھتا ہوں میں

زمانہ چاہیئے تکمیلِ ذوقِ عرفاں کو
ابھی تو اپنی پرستش میں مبتلا ہوں میں

مری حقیقتِ ہستی ہے راز اے فرخ
کوئی سمجھ نہیں سکتا مجھے کہ کیا ہوں میں

راز رامپوری

سرِ نیاز کو کس کس کا آستاں نہ ملا
مگر جہان میں وہی زینتِ جہاں نہ ملا

ذرا سمجھ سکے مری حسرتوں کی داد مجھے
نمک ملا جو کبھی تو نمک فشاں نہ ملا

مرے فرائضِ ہستی میں خامشی تو نہ تھی
بقدرِ وسعتِ غم کوئی رازداں نہ ملا

قفس میں کتنی گذاری خبر نہیں لیکن
چمن میں آکے جو ڈھونڈھا تو آشیاں نہ ملا

حسابِ حسرتِ سجدہ بتائے دیتا ہوں
یہی کہ مجھکو کبھی تیرا آستاں نہ ملا

قفس میں فکرِ خور و نوش اور میرے لئے
ہوں جسکی قید میں وہ بھی مزاجداں نہ ملا

عبث ہے شکوۂ فقدانِ آشنائے راز
جہاں میں جب کوئی تجھکو عدوئے جاں نہ ملا

باب الاستفسار

شطرنج ۔ خواب

(جناب مشتاق حسین صاحب۔ وکیل۔ بشلر)

(۱) اس سے پیشتر میں نے شطرنج کے بارے میں آپ سے دریافت کیا تھا کہ یہ کس شخص کی ایجاد ہے اور کب کہاں ایجاد ہوئی آپ نے جو مختصر سا جواب (پرائیوٹ) عنایت فرمایا تھا اس سے تسلی نہیں ہوئی۔ امید کہ ذریعۂ نگار مفصل جواب مرحمت فرمائیے۔

(۲) خواب کی بنیاد کیا ہے۔ نیند کی حالت میں اکثر عجیب قسم کے خواب نظر آتے ہیں جنکا وہم و خیال بھی نہیں۔ اسکے متعلق علماء و اطباء نے کن خیالات کا اظہار کیا ہے اور خواب کی جو تعبیر بیان کیجاتی ہیں وہ کہاں تک قابل تسلیم ہیں۔

(**نگار**) مجھے یاد نہیں کہ شطرنج کی بابت میں آپ نے کب دریافت فرمایا اور میں نے کیا جواب دیا تھا۔ آپ اس مسئلہ میں کیا تفصیل چاہتے ہیں جب کہ یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

عام طور پر یہی مشہور ہے کہ مسلمانوں نے یہ کھیل ہندوؤں سے سیکھا اور ہندو ہی اس کے موجد ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ یہ کھیل یونان کے عہد قدیم میں بھی رائج تھا اور اہل یونان فلامیدوس یونانی (Palamedes) کو اسکا موجد کہتے ہیں۔ مشرق کے عہد وسطےٰ میں نرد اور شطرنج دونوں کا رواج تھا اور نہ صرف ہندوستان بلکہ مشرق کے تمام ممالک میں یہ دونوں کھیل کافی رائج ہو چکے تھے، اس لئے گمان غالب یہی ہے کہ مسلمانوں نے اس کو ایران سے حاصل کیا۔ مگر یہ ہو سکتا ہے کہ ایران میں اسکا رواج ہندوستان سے آیا ہو۔

لفظ شطرنج کی تحقیق میں بعض نے لکھا ہے کہ اس کی اصلیت سنسکرت ہے، لیکن میرے نزدیک یہ لفظ بگڑی ہوئی صورت ہے فارسی کی "شصت رنگ" کی۔ ممکن ہے کہ وہاں اس زمانہ میں ساٹھ مہروں کی بساط ہوتی ہو اور اسی لئے اس کو "شصت رنگ" کہتے ہوں۔ یا پھر یہ نام اس لئے وضع کیا گیا ہو کہ اس کھیل میں ہمیشہ مختلف رنگ کے نقشے بنتے ہیں

مسعودی کا بیان ہے کہ ہندوستان کے راجاؤں میں علوم و فنون کا بہت ذوق تھا اور ان کے عہد میں بہت سی باتیں ایجاد ہوئیں چنانچہ راجہ باہ بود کے عہد میں نرد کا کھیل ایجاد ہوا اور بلہیت کے زمانہ میں شطرنج ایجاد ہوئی، اور اس فن پر ایک کتاب بھی لکھی گئی جس کا نام ترک جنکا تھا۔ مہرے آدمیوں اور جانوروں کی شکل کے بنائے جاتے تھے۔ مسعودی کے زمانہ میں یہ کھیل بارہ مہروں سے ہونے لگا تھا لیکن اس سے قبل

اس کی مختلف صورتیں تھیں۔

البیرونی نے لکھا ہے کہ یہ کھیل ہندوستان میں مختلف طریقوں سے رائج تھا، لیکن سب سے زیادہ عام طریقہ پانسہ کے ذریعہ سے کھیلنے کا تھا مثلاً اگر پانسہ میں ایک اور پانچ آتے تھے تو بادشاہ یا فیل کو چلنا پڑتا تھا، دو میں رخ کو تین میں گھوڑے کو چلنا پڑتا تھا۔ مہروں کی مقررہ قیمت ہوتی تھی جن کا اندراج شمار ہوتا تھا اور زیادہ قیمت کا مہرے رکھنے والا کامیاب سمجھا جاتا تھا

فردوسی نے بھی شطرنج کا ذکر کیا ہے اور وہ بالکل موجودہ شطرنج کے مطابق ہے یعنی وہی ۶۴ خانوں کی بساط اور وہی درمیان میں شاہ و وزیر اور اس کے داہنے بائیں فیل، گھوڑا، اور رخ کا قائم کیا جانا۔

شطرنج کے واضع کے متعلق ایک قصہ مشہور ہے کہ اسنے اس کے صلہ میں بادشاہ سے صرف گیہوں یا چاول کی اتنی مقدار طلب کی تھی جو ۶۴ خانوں میں پہلے خانے سے دوچند کے حساب سے آجائے۔ لیکن بعد کو حساب کرنے سے معلوم ہوا کہ ۶۴ خانوں تک اس کی مقدار اتنی ہوجاتی ہے کہ شاہی خزانہ بھی اس کے لئے کافی نہیں ہو سکتا۔ اس کا ذکر صفدی نے کیا ہے اور البیرونی نے بھی اسپر گفتگو کی ہے۔

بہرحال یہ کھیل عہد وسطیٰ میں مشرق و مغرب ہر جگہ رائج تھا اور حروب صلیبیہ کے زمانہ میں میدان جنگ کے اندر خیموں میں دونوں فریق اس کو کھیلتے تھے۔ ہارون الرشید کا شارلمین کو تحفہ میں شطرنج کا بھیجنا مشہور تاریخی واقعہ ہے۔

---

(۲) خواب کے متعلق بحث کے دو طریقے اختیار کئے جا سکتے ہیں ایک وہ جس کا تعلق صرف فزیالوجی (عضویات) اور سائکالوجی (نفسیات) سے ہے اور دوسرا مذہبیات سے۔ اول الذکر علوم میں جو مباحث پیش کئے گئے ہیں وہ بہت بسیط و طویل ہیں، لیکن ان کو مختصر الفاظ میں اگر ظاہر کیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان علوم میں خواب کا تعلق بالکل دماغ سے رکھا گیا ہے اور اسکی مختلف صورتیں گویا ان نقوش کی مختلف صورتیں ہیں جو دماغ میں پیدا اور محو ہوتے رہتے ہیں۔

اگر آپ نے عضویات کا مطالعہ کیا ہوگا تو معلوم ہوگا کہ انسان کا سر یا کھوپڑی چند ہڈیوں سے مرکب ہے۔ کھوپڑی کے اندر دماغ انسانی ہے جو بیشمار باریک رگوں اور ریشوں کا مجموعہ ہے، یہیں سے ایک شاخ ریڑھ کی ہڈی میں چلی گئی ہے اور یہیں سے تمام اعضاء انسانی کے اعصاب و عروق منشعب ہوکر پھیلتے ہیں۔ اس لئے دماغ کو مرکز اعصاب کہتے ہیں اور اسی بناء پر ادراک و حس کا مخزن دماغ کو بتایا جاتا ہے۔

جب تک انسان جاگتا رہتا ہے، دماغ مع اپنے تمام نظام عصبی کے متاثر ہوتا رہتا ہے اور اس تاثر کے نقوش اس کے اندر محفوظ ہوجاتے ہیں۔ لیکن یہ نقوش امتداد زمانہ کے ساتھ دھندلے بھی ہوجاتے ہیں اور مٹتے بھی رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ہم ایک شخص کو بہت دنوں کے بعد دیکھیں تو کبھی زیادہ غور کرنے کے بعد اسکی صورت یاد آتی ہے اور کبھی بالکل نہیں۔

انسان جب سوجاتا ہے تو دماغ کے بعض حصے معطل ہوجاتے ہیں اور بعض حصے کام کرتے رہتے ہیں۔ اور انہیں کام کرنیوالے حصوں کی یہ تمام اعجوبہ نمائیاں ہیں جنہیں خواب یا رؤیا سے تعبیر کرتے ہیں۔ ابھی یہ ہم بیان کرچکے ہیں کہ انسان جو کچھ دیکھتا یا سنتا ہے اسکے

نقوش دماغ میں محفوظ رہجاتے ہیں۔ اس لئے سوجانے کے بعد دماغ کے جو حصے کام کرتے رہتے ہیں انکا مشغلہ یہی ہوتا ہے کہ ان نقوش پر نظرثانی کرتے رہیں، یا ان میں مختلف قسم کی تبدیلیاں کرکے تماشہ دیکھتے رہیں۔ مثلاً اگر ہم نے دن کو بکری کو درخت پر چڑھتے دیکھا ہے تو بالکل ممکن ہے کہ دماغ بہ حالت نوم اس منظر کو بالکل الٹ کر یوں دکھادے کہ درخت بکری کی پیٹھ پر اُگا ہوا ہے، یا اگر دن کو ہم نے ایک پٹاخہ کی آواز سنی ہے تو رات کو یہ آواز توپوں کی گرج میں تبدیل ہوجائے، یا اگر ہم نے نل سے پانی کو قطرہ قطرہ کرکے ٹپکتے دیکھا ہے تو رات کو دماغ اسے سیلاب اور طوفان کی صورت میں دکھادے۔ پھر دماغ یہی نہیں کرتا کہ حال ہی کے نقوش میں تغیر و تبدل کرکے پیش کرے بلکہ وہ نئے پرانے تمام نقوش کو ملاکر بھی کبھی پیش کرتا ہے اور انسان حیرت کرتا ہے کہ جن باتوں کا وہم و گمان بھی نہ تھا وہ خواب میں نظر آئیں۔ حالانکہ اکثر و بیشتر یہ قدیم نقوش دماغی کی نظرثانی ہوتی ہے اور انہیں کے تغیر و تبدل اور گڈمڈ ہوجانے سے مختلف صورتیں خواب کی پیدا ہوتی ہیں۔ شیخ بوعلی سینا اور امام رازی ان کے شارح نے بھی خواب کی حقیقت یہی بیان کی ہے اور جدید تحقیقات بھی یہی ہے۔ اور اس میں کلام نہیں کہ خواب کا تعلق بالکل انسان کے دماغ سے ہے۔ لیکن مذہبی دنیا میں خواب کی مختلف قسمیں قرار دیکر ایک قسم کا نام بشارت خدا اور فیضان الٰہی رکھا ہے، جو انبیا، اولیا، صلحا، وغیرہ کو حاصل ہوتا ہے اور جو وحی، الہام، القاء کی ایک صورت سمجھا جاتا ہے۔

قبل اس کے کہ ہم اس پر بحث کریں، اس کی تعیین ضروری ہے کہ خواب یا رویا کے اقسام میں واقعی کوئی قسم ایسی بلند ہے یا نہیں جسکی کوئی علمی تاویل بظاہر نہیں ہوسکتی ہے اور جس کو فیضان الٰہی کہا جاسکتا ہے۔ اس کے متعلق لوگوں کے تجربات مختلف ہیں بعض اس کے قائل نہیں ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ رویائے صادقہ کا وجود پایا جاتا ہے۔ اور حقیقت میں رویاء صادقہ سے انکار نہیں ہوسکتا اور بہت سی مثالیں ایسی ملتی ہیں، جن میں خواب کے ذریعہ سے آیندہ ہونے والے یا کسی اور جگہ وقوع میں آنے والے حالات کا علم ہوگیا، چونکہ بظاہر اس قسم کے خواب قدیم نقوش دماغی کا نتیجہ نہیں ہوتے اس لئے ان کو انتباہ غیبی کا کہا جاتا ہے اور ملاء اعلیٰ کے عالم ارواح سے اس کو متعلق سمجھا جاتا ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ اس قسم کے رویاء کا جو نام جی چاہے رکھ لیا جائے، لیکن ہیں وہ ایک ہی علمی اصول کے ماتحت اور نفسیات انسانی کے مسلمات سے انکو علیحدہ نہیں کرسکتے۔ کہا جاتا ہے کہ اکثر نفوس مقدسہ اور بزرگان دین کے خواب سچے ہوتے ہیں اور کوئی نہ کوئی معاصر دراں میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ لیکن رویاء صادقہ کے لئے ہمارے نزدیک بزرگ یا غیر بزرگ کی کوئی قید نہیں لگائی جاسکتی اگر ایک شخص بغیر ولی یا بزرگ ہوئے حالت بیداری میں کوئی پیشین گوئی کرسکتا ہے، کسی کے دل کی چھپی ہوئی بات معلوم کرسکتا ہے، بند خطوط کے اندر کی عبارت پڑھ لیتا ہے (ملاحظہ ہو اس ماہ کے رسالہ میں مضمون "عالم فطرت، ماوراء علم و ادراک")، تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ سونے کے بعد اس قسم کے خواب نہ دیکھ سکے، اس لئے میری رائے یہ ہے کہ رویاء صادقہ کا وجود تو یقینی ہے لیکن اس کے لئے خاص دماغ پیدا ہوتے ہیں اور اکتساب و سعی کو اس میں مطلق دخل نہیں ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ایک شخص کی دماغی ساخت ایسی مکمل تو نہ ہو کہ وہ بہ حالت بیداری اس قسم کی صاف صاف طور پر خبریں دے سکے لیکن سونے کے بعد اشارات یا استعارات کی صورت میں اس کے دماغ کو کچھ علم ہوجاتا ہو اور یہی صورت ایک ایسی ہے جس کا تعلق

تعبیر عن الرؤیار سے ہے۔

شیخ بو علی سینا لکھتا ہے کہ جن لوگوں کے نفس کامل ہیں ان کو خواب میں ملاء اعلیٰ سے فیضان ہوتا ہے اور وہ فیضان انکے صور خیالیہ میں سے کسی صورت میں منتقل ہوکر خواب میں نظر آتا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب کا بیان ہے کہ صرف اس قسم کے خواب قابل تعبیر ہوتے ہیں۔ باقی سب لغو و مہمل ہیں۔

بو علی سینا اور محدث دہلوی کا یہ ارشاد میری رائے سے مختلف نہیں ہے بلکہ ایک ہی ہے صرف بیان اور تعبیر کا فرق ہو تو ہو۔

اس امر کا ثبوت کہ بعض دماغوں کو اشارات کے ذریعہ سے آیندہ کے حالات سے خبردار کیا جاتا ہے۔ سورۂ یوسفؑ سے بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ یوسفؑ کے جس خواب کا ذکر کلام مجید میں ہے وہ اس قسم کا اشاری و کنائی ہے اور غالباً تمام پیغمبروں میں یوسفؑ ہی ایک ایسے پیغمبر تھے جن کا دماغ نہ صرف اس قسم کے خوابوں کے دیکھنے کا اہل تھا بلکہ اس قسم کے خواب سنکر ان کے مفہوم تک پہونچ جانے کی بھی قابلیت ان میں اچھی پائی جاتی تھی۔

پھر چونکہ اس طرح کے دماغ کم پیدا ہوتے ہیں، اس لئے ہر شخص کو اپنے خواب کی تعبیر تلاش کرنا لغو سی بات ہے۔ کیونکہ اکثر و بیشتر خوابوں کی حقیقت امتلاء معدہ، سوء ہضم، تاثرات دماغی، مشاہدات روزانہ، فکر و خیال، واہمہ و تصور سے زیادہ نہیں ہوتی اور ان کے لئے تعبیر نامہ کو لیکر بیٹھ جانا مہمل سی بات ہے۔ جب کہ نہ یہ کوئی علم و فن ہے اور نہ صحت کے ساتھ کوئی اصول تعبیر خواب کے منضبط ہو سکتے ہیں۔

آپ کو اگر رؤیار سے بہت دلچسپی ہے اور اس کے متعلق آپ زیادہ بسیط معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو پہلے عضویات و نفسیات کی کتابوں کا مطالعہ کیجئے اور انکو پڑھ کر خود غور فرمائیے کہ انکے تسلیم کرنے میں کیا قباحتیں اور ہر خواب کو قابل تعبیر سمجھنے یا عالم رؤیا کو کسی اور دنیا سے متعلق سمجھنے میں کیا فواید ہیں۔

عربی میں بعض اچھے رسایل اس موضوع پر شایع ہوتے ہیں، انگریزی میں تو خیر بہت کافی مواد موجود ہے۔ ان دونوں زبانوں کی کتابوں سے آپ مدد لے سکتے ہیں، کئی سال ہوتے اردو میں دار الاشاعت صوفی پنڈی بہاؤ الدین نے ایک رسالہ میرے ایک دوست کا لکھا ہوا شائع کیا تھا جسمیں عربی معلومات سے مدد لیگئی تھی اسکو طلب کر کے ملاحظہ فرمائیے اسوقت وہ رسالہ میرے پاس نہیں ہے ورنہ میں اسکا نام بھی لکھ دیتا۔

تعبیر کی کتابیں جو عام طور سے بازار میں نظر آتی ہیں بالکل لغو و مہمل ہیں اور انپر اعتماد کرنیکے نقصانات کا مجھے پورا علم ہے، کیونکہ میرے بعض احباب ہمیشہ اپنے خوابوں کو رؤیار صادقہ سمجھ کر انہیں تعبیر ناموں سے مدد لیا کرتے تھے، اور ہمیشہ امداد غیبی کے منتظر رہتے تھے، جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ غیب نے انکی مدد کی اور نہ زمانہ نے اتنا قیام کیا کہ ان کے کام کرنیکی عمر باقی رہتی، الغرض اس وہم نے انہیں تباہ کر دیا اور وہ اب بالکل بیکار ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ اگر کسی شخص میں رؤیار صادقہ دیکھنے کی اہلیت موجود ہو تو بھی، تو بھی اسکو قابل لحاظ نہ جاننا چاہئے کیونکہ اسکے خواب دنیا میں نہ ہماری کوئی مدد کر سکتے ہیں اور نہ کسی مصیبت سے بچا سکتے ہیں، چہ جائیکہ شخص کا اس خبط میں مبتلا رہنا۔ اگر آپکا انہماک اسطرف زیادہ ہے تو میں آپکو مشورہ دونگا کہ کوشش کر کے اپنے دماغ کو دوسری طرف متوجہ کیجئے اور کبھی ایسی باتوں کے علم کی کوشش نہ کیجئے جسکا علم آپکو کوئی فائدہ نہیں پہونچا سکتا۔

نیاز

اقتباسات علمیہ

صحافت اور عجائب تلغراف

اخبار مانچسٹر گارڈین کے دفتر میں ایک بالکل جدید قسم کا آلہ تلغراف نصب ہے جو یورپ و امریکہ کے کسی اخبار کے دفتر میں نہیں پایا جاتا چونکہ اس اخبار کا ایک دفتر لندن میں بھی ہے اس لئے لندن کے دفتر سے مانچسٹر کے دفتر تک ایک خاص تار لگایا گیا ہے جس کے ذریعہ سے آن واحد میں متعدد پیغامات اِدھر اُدھر آجا سکتے ہیں۔ اس آلہ کے پاس پانچ ٹائپ کی مشینیں رکھی ہوئی ہیں جو لندن سے آنیوالی خبروں کو از خود ٹائپ کرتی رہتی ہیں۔ اسکی تفصیل یہ ہے کہ لندن کے دفتر میں بھی پانچ ٹائپ کی مشینیں ہیں جن پر کلرک مختلف خبروں کو ٹائپ کرتے ہیں اور انکو دفعۃً اسی ایک تار کے ذریعہ سے مانچسٹر روانہ کرتے ہیں۔ مانچسٹر میں یہ مختلف پیغامات ایک آلہ کے ذریعہ سے علیحدہ ہوجاتے ہیں اور مختلف مشینوں پر پہونچکر ٹائپ ہوجاتے ہیں۔ سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ ایک وقت میں ایک ہی پیغام جاسکتا ہے، لیکن اس تار کی خصوصیت یہ ہے کہ وقت واحد میں متعدد پیغامات بھیجے جاسکتے ہیں۔

روشنی اور سانپ کا زہر

مشہور ہے کہ صحرا کے رہنے والے سانپوں میں زیادہ مہلک زہر ہوتا ہے۔ اس شہرت کی بنا پر فرانس کی اکاڈیمی کے دو عالموں کا خیال اس طرف منتقل ہوا کہ ممکن ہے اسکا تعلق آفتاب کی سے ہو چنانچہ انہوں نے اس کے تجربات شروع کئے اور تحقیق کے بعد دریافت ہوا کہ مافوق البنفسجی شعاعوں کا اثر سانپ کے زہر کو زیادہ سریع الاثر اور مہلک بنادیتا ہے۔ ایک ہی سانپ کا زہر دو جگہ تقسیم کرکے ایک پر یہ شعاعیں ڈالی گئیں اور دوسرے کو اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا، اور پھر ان دونوں زہر کو دو جانوروں کے جسم میں پہونچایا گیا تو اس زہر کا فعل بہت شدید ثابت ہوا جس پر شعاعیں ڈالی گئی تھیں۔ یہ بھی قدرت خداوندی ہے کہ وہی مافوق البنفسجی شعاعیں، جو نشو و نما اور ازالۂ مرض کے لئے اسقدر ضروری ہیں، وہی سمیت بھی پیدا کرتی ہیں، یعنی اگر ایکطرف وہ تریاق ہیں تو دوسری طرف سم قاتل بھی ہیں۔

مستقبل کا تمدن

جرمنی کی ایک فلم کمپنی نے فلم طیار کیا ہے جس کے ذریعہ سے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ آیندہ دنیا کی آبادی اور اسکے شہروں کی کیا حالت ہوگی۔ اس فلم کا نام "مٹروپولس" ہے اس میں دکھایا گیا ہے کہ اس قرن کے اخیر تک مکان اتنے بلند بننے لگیں گے کہ حال کی بلند عمارتیں ان کے سامنے کوئی حقیقت نہ رکھیں گی۔ ان مکانوں کے درمیان سلسلۂ آمد و رفت چھوٹے چھوٹے ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے ہوا کریگا، اور ان کی کثرت اس قدر ہوجائے گی جیسے اب سڑکوں پر موٹریں نظر آتی ہیں۔ سڑکیں پلوں کیطرح بالکل معلق بنیں گی۔ صنعت و حرفت کے کارخانے صرف ایک شخص کی ملکیت میں ہوا کریں گے اور تمام کام صرف بجلی کا بٹن دبانے سے ہوجایا کریں گے۔ تفریح کے لئے باغ اور پارک بھی معلق ہونگے۔ الغرض شہر کا شہر بالکل میکانکی اور مشین کا بنا ہوا ہوگا جس میں تمام کام بجلی اور مشین سے اس طرح ہوا کریں گے جیسے نظام عالم کے موسموں کا ظہور آفتاب کا طلوع و غروب اور تمام حوادث طبیعی سب ایک وقت

مقررہ پر اپنے آپ ہوتے رہتے ہیں اور کوئی ہاتھ اس نظام کو عمل میں لانے والا نظر نہیں آتا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس فلم بنانے کا خیال سر فلپ گبس کی کتاب کو دیکھ کر پیدا ہوا جس میں علمی طریقہ سے بتایا ہے کہ دنیا کا عہد مستقبل کسقدر عجیب و غریب آنے والا ہے، ممکن ہے کہ اس وقت یہ پیشین گوئیاں صرف لطائف سمجھی جائیں، لیکن اگر میکانکی ترقی کا یہی عالم ہے تو کچھ حیرت نہ کرنا چاہیئے، کیونکہ اسوقت جو کچھ نظر آرہا ہے، اگر پچاس سال قبل اسی کی پیشین گوئی کی جاتی تو لوگ اسپر بھی ہنستے، حالانکہ اب وہ سب حقیقتیں ہیں۔

فن پرواز کیلئے ایک جدید اختراع

ڈٹرائٹ امریکہ کا وہ مقام ہے جہاں فورڈ کا کارخانہ ہے اور جس میں اب موٹروں کے علاوہ ہوائی جہاز بھی طیار ہوتے ہیں۔ یہاں ہوائی جہاز کے لئے ایک ایسی جدید اختراع ہوئی ہے جس سے فن طیران میں بہت کچھ انقلاب و تغیر کی توقع کی جاتی ہے۔ یہ اختراع متعلق ہے جہاز کے محرک (موٹر) سے جو بجائے بنزین کے کہربائی مقناطیسی قوت سے چلیگا اور اس کی حرکت زمین کی طرح ہوگی۔

ماہرین فن نے اس اختراع کا امتحان کرنے کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ یہ آلہ ایک منٹ میں ۱۸۰۰ مرتبہ گردش کرتا ہے اور دو ہزار گھنٹے تک برابر بغیر دوبارہ قوت پہونچائے ہوئے یہ آلہ گردش کر سکتا ہے۔

ایک جماعت ماہرین فن کی طلب کی گئی ہے تاکہ اس کی کامل تحقیق کرکے رپورٹ پیش کرے۔ اور دنیا نہایت بیتابی سے نتیجہ کی منتظر ہے۔

مطبوعات جدیدہ

تاریخ اسلام

صدیق بکڈپو لکھنؤ نے حال ہی میں یہ کتاب ۵ جلدوں میں شایع کی ہے۔ کتاب کا موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے۔ یہ ترجمہ ہے مصری مورخ علامہ محی الدین کی کتاب کا اور اسمیں شک نہیں کہ ترجمہ اچھا کیا گیا ہے۔ اس وقت عربی زبان میں یہ تاریخ خاص اہمیت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے اور اکثر جگہ نصاب میں داخل ہے۔ یورپین ممالک کے اخبار و رسایل نے بھی اس تالیف کی بہت تعریف کی ہے اور اس میں شک نہیں کہ جمع واقعات اور اسلوب بیان کے لحاظ سے یہ کتاب ہر تعریف کی مستحق ہے۔ پہلے حصہ میں فن تاریخ کی ماہیت بیان کرکے عہد نبوی سے بحث کی گئی ہے، دوسرے حصہ میں خلفائے راشدین کے حالات ہیں، تیسرے حصہ میں خلافت بنی امیہ کی تاریخ ہے، چوتھے حصہ میں خلافت عباسیہ کے حالات قلمبند کئے ہیں اور پانچویں میں اسپین اور دوسری اسلامی حکومتوں سے بحث کی ہے۔ کتابت و طباعت پسندیدہ ہے، پانچوں حصوں کی قیمت پانچ روپیہ ہے اور منیجر نگار سے مل سکتی ہے۔

سیر المصنفین جلد دوم

مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا بی۔ اے نے سیر المصنفین کی پہلی جلد لکھ کر جو مقدر شہرت حاصل کر لی تھی، اگر وہ سیر المصنفین کی دوسری جلد نہ مرتب کرتے تو بعض حضرات کے نزدیک ان پر ناشکر گزاری کا الزام عاید ہو سکتا تھا لیکن اگر تنقید صحیح کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے

تو میں یہ کہونگا کہ جس طرح پہلی جلد انکا کوئی قابل فخر کارنامہ نہیں تھا اسی طرح افسوس ہے کہ دوسری جلد بھی ایک کامیاب سعی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ پہلی جلد میں انہوں نے دو دور سے بحث کی تھی، پہلا دور جسے انہوں نے میر محمد عطا حسین خاں صاحب تحسین سے شروع کرکے محمد خلیل اللہ خاں اشک پر ختم کیا تھا، اور اس سلسلہ میں میر لطف علی، میر بہادر علی حسینی، میر امن دہلوی، میر شیر علی افسوس، سید انشاء اللہ خاں انشاء، مولوی شاہ رفیع الدین دہلوی، مولوی شاہ عبد القادر دہلوی، مولوی اسمٰعیل شہید، منشی نہال چند لاہوری وغیرہ کے حالات اور لٹریچر سے بحث کی تھی، دوسرے دور کو فقیر محمد خاں گویا سے شروع کرکے منشی امیر احمد مینائی پر ختم کیا تھا اور اس سلسلہ میں مرزا رجب علی بیگ سرور، اسد اللہ خاں غالب، غلام امام شہید، غلام غوث بیخبر وغیرہ کے تذکرہ سے اعتنا کیا گیا تھا۔ اب یہ دوسری جلد تیسرے دور سے متعلق ہے جس میں سر سید، مولوی چراغ علی، محمد حسین آزاد، ذکاء اللہ، سید علی بلگرامی، ڈپٹی نذیر احمد، الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، رتن ناتھ سرشار اور شرر شامل ہیں۔

شکر ہے کہ چوتھا دور "شایان دست و بازوئے قاتل" نہیں سمجھا گیا ورنہ وہ بھی اسی تنقید عالیہ اور صحت ذوق کا شکار ہوتا جو انہوں نے گذشتہ تین ادوار کے حالات قلمبند کرنے میں صرف فرمائی ہے۔ تنہا صاحب نے یقیناً اپنے آپ کو سمجھنے میں بہت بڑی غلطی کی ورنہ وہ ہرگز سیر المصنفین ایسی اہم کتاب کی تالیف کی جرأت نہ کرتے۔ اگر سیر المصنفین سے انکا مقصود یہ تھا کہ بعض مصنفین کے حالات نہایت سرسری طور پر لکھ کر انکی تصانیف پر ایک غیر ماہرانہ رائے کا اظہار کر دیا جائے تو بیشک تنہا صاحب کو کامیاب مولفین کی صف میں جگہ دیجا سکتی ہے لیکن اگر سیر المصنفین کے ذریعہ سے کوئی ایسی تالیف پیش کرنا مقصود تھا جو تذکرہ نویسی، سیرت نگاری، مورخانہ کاوش و تحقیق، تنقید صحیح، فلسفیانہ استنتاج تاریخ کی معیاری چیز ہو، تو ہر شخص ادنیٰ تامل کے بعد کہدیگا کہ تنہا صاحب اس میدان کے مرد نہ تھے اور اگر وہ اتنا وقت اپنے پیشہ وکالت ہی کی ترقی میں صرف کرتے تو زیادہ موزوں تھا۔

جمیع واقعات و حالات میں انہوں نے سوائے چند رسائل یا مشہور کتب تذکرہ و تاریخ کے اور کوئی دوسری صورت استفادہ کی اختیار ہی نہیں کی اور تنقید کی حقیقت اس سے ظاہر ہے کہ شرر کے ناولوں میں وہ فردوس بریں کو سب سے بہتر ناول خیال کرتے ہیں (جو حقیقتاً سب سے بدتر ہے) اور محمد حسین آزاد کی زبان کو ٹکسالی کہتے ہیں، جو غلط ہے۔ چونکہ فاضل مولف نے اقتباسات کی کثرت سے اس جلد کو بھی بہت ضخیم بنا دینے کی کوشش کی ہے، لیکن افسوس ہے کہ اقتباسات بھی سب ادنیٰ قسم کے ہیں اور کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ تنہا صاحب کا دماغ کبھی بھول کر بھی حقیقت کی طرف مائل ہو سکتا ہے۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ جامعہ ملیہ دہلی نے اس کتاب کو شائع کرکے کوئی خاص خدمت اردو زبان یا فن تذکرہ نویسی کی انجام دی ہے۔

اس کتاب کی قیمت تین روپیہ ہے جو حسن طباعت و کتابت اور ضخامت کے لحاظ سے زائد نہیں ہے۔

قرآن اور پردہ

مرزا عظیم بیگ چغتائی بی۔اے (علیگ) نے اس رسالہ میں روایت و درایت دونوں طرح عورتوں کے موجودہ پردہ کو ناجائز و غیر ضروری ثابت کرنے میں اس اجتہاد و سعی و کاوش سے کام لیا ہے جسکا جدید تعلیمیافتہ حضرات میں فقدان ہے۔ انکی اس تالیف سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب چغتائی ایک اچھے مولف و مصنف ہونیکی اہلیت اپنے اندر رکھتے ہیں اور میرے نزدیک یہ فال نیک ہے کہ انکی یہ اہلیت حسن نسائی کے ساتھ ساتھ بے نقاب ہوئی۔ ہر چند اس لحاظ سے کہ عورتوں کے پردہ کا مسئلہ اس وقت مردوں کے لئے قابل توجہ ہوتا ہے، جب خود عورتوں نے اسکی کراہت کو محسوس کرکے اسکا اعلان کر دیا ہو، اس نوع کی سعی و کوشش کوئی خاص امتیاز نہیں رکھتی، لیکن یہ ضرور ہے کہ اگر کسی وقت عورتوں کو خود علمی مقابلہ مستبد قسم کے مردوں سے کرنا پڑے تو ایسی تصانیف ان کیلئے اچھا آلۂ حرب و دفاع ثابت ہونگی۔

شروع میں آنریبل ڈاکٹر جسٹس شاہ محمد سلیمان چیف جسٹس الہ آباد کا مختصر لیکن نہایت مدلل مقدمہ کیا بلکہ فیصلۂ آخری بھی شامل ہے، جو نہ صرف

اس لحاظ سے کہ وہ یوپی کی سب سے بڑی عدالت گاہ کے سب سے بڑے عادل حاکم کا فیصلہ ہے بلکہ اس حیثیت سے بھی کہ وہ قوم کا بہترین [illegible]
کتاب نہایت عمدہ چھاپی گئی ہے اور ۱۲ میں مع محصولڈاک سکریٹری انجمن اصلاح پردہ علیگڈھ سے ملسکتی ہے۔

صراط الحمید سفرنامہ ہے محمد الیاس برنی ایم۔ اے۔ پروفیسر معاشیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کا جو (مقامات مقدسہ) شام فلسطین و حجاز کی [illegible] کے سلسلہ میں مرتب کیا گیا ہے۔

جناب برنی نے جس ولولہ و شوق، اور جس جذبۂ خلوص و عقیدت سے یہ سفر کیا ہے وہ کتاب کے ہر ہر لفظ سے ظاہر ہے۔ اور غالباً اسی کیفیت کا اثر ہے کہ ہر شخص اس کے مطالعہ سے کافی لطف اندوز ہوتا ہے۔ مقامات مقدسہ کی زیارت کرنے والوں کیلئے یہ سفرنامہ بہترین رہبر و ہمدم کی خدمات انجام دے سکتا ہے [illegible] رحلت، خصوصیات اماکن وغیرہ کے متعلق کوئی ایسی بات نہیں ہے جو اس میں درج نہ ہو۔ اگر وہ معاشیات و اقتصادیات کے ماتحت بھی ان مقامات پر [illegible] غالباً بے محل نہ ہوتا، لیکن برنی صاحب کا یہ سفر ایک عاشق سا سفر تھا، نہ کہ پروفیسر کا۔ کتاب کی طباعت و کتابت کی نفاست پر رائے زنی بیکار ہے [illegible] مسلم یونیورسٹی پریس میں چھپی ہے اور غالباً وہیں سے ۱۲ میں ملسکتی ہے۔

مطلع الانوار سلسلۂ کلیات خسرو کی یہ ساتویں کتاب ہے جو مولوی محمد مقتدا خاں صاحب شروانی کی تنقید و نگرانی میں مسلم یونیورسٹی پریس سے [illegible] ہے اس سے قبل جو حضرات اس سلسلہ کی اور کتابوں (مجنوں لیلیٰ، آئینہ سکندری، ہشت بہشت، دول رانی خضر خاں، قران السعدین، ہشت بہشت) کو دیکھ چکے ہیں، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس مثنوی کو بھی کیسا ہونا چاہئے۔ صحت و حسن کتابت اور تصحیح و تنقید کے لحاظ سے یہ مثنوی بھی [illegible] شائع ہوئی ہے اور نواب محمد اسحاق خاں مرحوم جو اور برکات اپنے بعد چھوڑ گئے ہیں، انہیں میں سے ایک علمی برکت یہ بھی ہے۔

اس سے قبل جو مثنویاں شائع ہوئی ہیں ان میں مولوی مقتدا خاں صاحب کی کوشش محض حسن طباعت تک محدود تھیں، لیکن اس میں [illegible] بھی شامل ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ یہ مثنوی قابل قدر نہ ہو۔ رہا کلام خسرو سو اسکے متعلق لکھنا بیکار ہے کہ ہر شخص اس کی عظمت سے واقف ہے [illegible]

الایمان یہ ایک رسالہ ہے ۵۲ صفحات کا جسے مولوی محمد مقتدا خاں شروانی نے مسلمان بچوں کی تعلیم عقاید کی غرض سے لکھا ہے۔ [illegible] سلیس ہے اور ترتیب معقول۔ ۲ آنہ میں مسلم یونیورسٹی پریس سے ملسکتی ہے۔

سفرنامہ شاہ امان اللہ خاں حصہ اول مولوی زاہد القادر صاحب نے ان تمام واقعات کو جو شاہ افغانستان کی سیاحت یورپ کے متعلق اخباروں میں شائع ہو چکے ہیں ایک جگہ جمع کر کے اس نام سے شائع کیا ہے۔ چونکہ یہ حالات کوئی جدید چیز نہیں ہیں اس لئے اس کے متعلق رائے زنی بیکار ہے، البتہ اسقدر جدت ضرور کیگئی ہے کہ جا بجا تصاویر دیکر اسکو زیادہ دلچسپ بنایا گیا ہے، اور شروع میں شاہ امان اللہ خاں کے مختصر حالات بھی دیدیئے گئے ہیں۔ اس حصہ میں سیاحت روس تک کے حالات درج ہیں، باقی حالات دوسرے حصہ میں ہونگے، اسکی قیمت قسم کے لحاظ سے دو روپیہ اور ایک روپیہ رکھی گئی ہے۔

ملنے کا پتہ قریشی بکڈپو کوچہ چیلاں دہلی ہے۔

ابن سعود یہ ایک ناول ہے جسمیں جناب حسرت لکھنوی نے ابن سعود (سلطان نجد) کے حالات افسانہ کے پیرایہ میں دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اسکے ذریعہ سے بہت سے ایسے راز بھی [illegible] بے نقاب کئے گئے ہیں جنکا علم عوام کو نہیں ہے۔ یہ کتاب گویا اس لٹریچر میں شامل ہے جو ہندوستان کے اندر ابن سعود کے معاہدہ نا خوشگن پالیسی کی مخالفت پیدا ہو گیا ہے۔ اسکی قیمت ایک روپیہ رکھی گئی ہے جو ۲۰۰ صفحوں کی کتاب کے لئے زاید ہے۔ ملنے کا پتہ قریشی بکڈپو کوچہ چیلاں دہلی ہے۔

رجسٹرڈ نمبر ل ۱۲۰۴

جلد ۱۵ - شمارہ ۳

نگار

فہرست مضامین مارچ ۱۹۲۹ء

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۱۵	مارچ سنہ ۱۹۲۹ع	شمار ۳

ملاحظات

اگر غور کیا جائے تو یہ بات آسانی سے معلوم ہو سکتی ہے کہ حکومت زیادہ سے زیادہ چار قسموں کی ہو سکتی ہے: ۱- ایک شخصی و استبدادی ملوکیت جسمیں قوم کی رائے اور اسکی آواز کو کوئی دخل نہیں ہے اور شاہِ وقت ملک کے سیاہ و سفید کا مختارِ کُل ہوتا ہے اس قسم کی حکومتیں انیسویں صدی سے قبل اکثر جگہ پائی جاتی تھیں اور کچھ زمانہ پیشتر روس ترکی اور ایران میں بھی یہی "سلطنت مطلقہ" پائی جاتی تھی، لیکن اب سوائے سیام اور بعض ہندوستانی ریاستوں کے، یہ طریقِ حکومت تمام دنیا سے معدوم ہو گیا ہے اور اس کے حیلہ کی اب کوئی امید بھی نہیں۔

دوسری قسم حکومت کی حکومت جمہوری دیمقراطی ہے جو قوم اور نمایندگان قوم کے زیر اثر ہوتی ہے اور کسی ایک شخص کو اختیار کامل نہیں دیا جاتا جس کی ایک مثال فرانس کی حکومت ہے تیسری قسم کی حکومت وہ ہے جسے حکومت اتحادی کہتے ہیں جمہوری اور اتحادی حکومت میں یہ فرق ہے کہ اول الذکر میں صرف ایک مخصوص قوم و جماعت تمام اہل ملک کے لئے وضع قانون کا خیال رکھتی ہے (مثلاً ملک فرانس کہ وہاں کا ہر شخص خواہ وہ کسی جگہ کا رہنے والا ہو پیرس کی پارلیمنٹ کے وضع کردہ قوانین کے آگے سر جھکا دیگا) اور موخر الذکر طریق حکومت میں ایک ملک کے مختلف حصے اپنے اپنے مفاد کے لحاظ سے مختلف قوانین وضع کرتے ہیں

وہ انکا تعلق ایک مرکزی حصہ سے ہوتا ہے جس کو یہ مختلف حصے کچھ زاید حقوق دیدیتے ہیں۔ اسکی مثال میں امریکہ، سوئٹزرلینڈ اور جرمنی کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

چوتھی قسم حکومت کی سوویٹ ہے یعنی وہ جو اب روس میں پائی جاتی ہے اور مجالس عمّال پر قایم ہے۔ یہ تو صرف وہ تقسیم ہے جسے عقل بھی تسلیم کرتی ہے اور جو عملاً بھی اس وقت دنیا میں پائی جاتی ہے، لیکن ایک پانچویں قسم حکومت کی اور ہے، جو اپنے وجود کی اہمیت اور عمل کی وسعت کے لحاظ سے ساری دنیا پر چھائی ہوئی ہے، لیکن عقل حیران ہے کہ اس کو کیا سمجھے۔ آپ نے اگر کبھی غور کیا ہوگا تو آپ بھی شاید حیران ہوئے ہونگے کہ حکومت برطانیہ کو کس نوع کی حکومت میں شامل کرنا چاہئے اور اسکے متضاد عناصر کو دیکھتے ہوئے اسکا کیا نام رکھنا چاہئے۔ وہاں ملوکیت بھی ہے لیکن ناقص و ناکمل، وہاں دستوریت بھی ہے لیکن محدود و مقید، وہاں دیمقراطیت (Democracy) بھی ہے مگر لا یعنی و بیکار، اور وہاں ارستقراطیت (Aristocracy) بھی ہے لیکن لغو و بے معنی۔ پھر اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان، جسکی نجات و ہلاکت کا تنہا ذمہ دار اب گاندھی اور نہرو نے بھی حکومت برطانیہ کو تسلیم کر لیا ہے، اس سے کس نوع کی حکومت کا مطالبہ کر سکتا ہے، اور ایسا نظام حکومت اسے کیا عطا کر سکتا ہے۔ مطالبہ کی صورت ہمارے سامنے نہرو رپورٹ کی شکل میں موجود ہے جو عطا ہونیوالا ہے۔ اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جناب سائمن ہمارے حال کی تفتیش کے لئے مامور ہوئے ہیں جن کو کونسل و ملک کے لحاظ سے بعید ترین تعلق بھی ہندوستان سے نہیں ہے۔

ڈومی نین ہوم رول، کوئی الہامی فقرہ نہیں، جس کے دنیا میں صرف ایک ہی معنی لئے جا سکیں، اس لئے یہ ضروری نہیں کہ ہندوستان کے ڈومی نین ہوم رول کے بھی وہی معنے ہوں جو کناڈا یا آئرلینڈ کے ہوم رول کے ہیں اور اگر وہی ہوں، تو بھی یہ لازم نہیں کہ برطانیہ اسی اصول پر ہمارا خط سرنوشت تحریر کر دے، جبکہ وہ خود نوعیت حکومت کے لحاظ سے ایک نہایت ہی عجیب و غریب مجموعہ اضداد و مناقضات کا ہے۔

نہرو رپورٹ میں جس نوع کی حکومت ہندوستان کے لئے طلب کی گئی ہے وہ یقیناً کسی خود دار قوم کے لئے باعث فخر و ناز نہیں ہو سکتی اور نہ اس سے کسی قوم کی عالی حوصلگی کا پتہ چلتا ہے، لیکن ادھر برطانیہ کی پیچیدہ پالیسی اور عجیب طرز حکومت کو دیکھتے ہوئے اور ادھر خود سرزمین ہند میں بسنے والی دیوانۂ مذہب قوموں کے اختلاف آرا پر نگاہ ڈالتے ہوئے، جو کچھ طلب کیا گیا وہ بڑی حد تک سب کو ایک مرکز پر لانے کا امکان اپنے اندر رکھتا تھا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ برطانیہ کا اقبال یہاں بھی کام کر گیا اور مسلمانوں کی ایک جماعت نے، جسکی نیت سے بحث کرنیکی ضرورت نہیں، نہرو رپورٹ سے اختلاف کر کے ایک ایسا عذر لنگ نہیں بلکہ صحیح الذکا اس کے ہاتھ میں دیدیا کہ اگر دسمبر ۲۹ء کیا معنے دسمبر ۳۹ء تک بھی حکومت آرام سے سوتی رہے تو گاندھی کو اپنے الٹی میٹم کے مطابق عمل کرنیکی کوئی عقلی دلیل میسر نہیں آسکتی۔ اس لئے مستقبل میرے سامنے ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ وقت آئے گا جب نہرو رپورٹ اساطیر الاولین میں داخل ہو جائے گی اور کوئی اور خدا کا بندہ دوسری رپورٹ طیار کریگا اور اسوقت بھی یہی سوال پیدا ہوگا کہ ہم برطانیہ سے کیا طلب کریں اور وہ ہمیں کیا دے سکتا ہے جبکہ نہ اسکے پاس کچھ دینے کو ہے اور نہ ہم لینے کے اہل۔

یقیناً ایک قوم کی یہ بڑی بے مائگی ہے کہ اسپر غیروں کی حکومت ہو، لیکن ایک درجہ اس سے بھی فروتر ہے اور وہ یہ کہ وہ غیروں کی حکومت کی محتاج ہو۔ اور اس سے نظم و عدل کی اہلیت سلب کر لی گئی ہو۔ پھر جس وقت تک ہم اس منزل میں ہیں نہ ہمردار پورٹ سے کچھ کام نکل سکتا ہے، نہ عدم تعاون کے الٹی میٹم سے اور نہ مسٹر پٹیل کے پاس اجتماعی آسنن وگاندھی سے۔

جس وقت تک مسلمان (نزاع کفر و ایمان کے نقطۂ نظر سے) مسلمان، اور ہندو (اپنی گئو سالہ پرستی اور چھوت چھات کے اعتبار سے) ہندو ہے، ہندوستان کبھی غلامی کی لعنت سے نہیں نکل سکتا اور نہ اس کو نکلنا چاہئے۔ اس قعر میں جس طرح مسلمان مبتلا ہیں بالکل اسی طرح ہندو بھی گرفتار ہیں، نہ انکی نگاہ وسیع، نہ انکا سینہ فراخ اور جبتک دونوں میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ صرف اپنے ہی کو نجات اخروی اور ملکی کا اہل سمجھتا ہے اس وقت تک کوئی امید فلاح کی نہیں ہے۔

اس لئے جس وقت میں یہ دیکھتا ہوں کہ بعض اکابر قوم بجائے اس کے کہ ان کے ذہن میں وسعت اور دماغ میں اخوت عامہ قائم کرنیکا خیال پیدا ہو، روز بروز تنگ نظر اور رسم و رواج کے پابند ہوتے جاتے ہیں تو میری یاس کی کوئی انتہا نہیں رہتی اور مجھ کو خود اپنی ذات سے نفرت ہونے لگتی ہے کہ میں کیوں نہ بجائے مسلمان ہونے کے انسان پیدا ہوا۔ پس اگر ہندو مسلمان چاہتے ہیں کہ صحیح معنے میں باہم اتحاد پیدا ہو تو انکا اولین فرض یہ ہے کہ وہ تمام ان نقوش کو قلب سے محو کر دیں جنسے بوئے عصبیت آتی ہے ورنہ جب تک ہندو یونیورسٹی کا نام ہندو یونیورسٹی، مسلم یونیورسٹی کا نام مسلم یونیورسٹی ہے جب تک ہندو چوٹی میں گرفتار ہے اور مسلمان اپنی ریش دراز میں، اور جس وقت تک مذہب کا مفہوم اخوت عامہ اور انسانیت پرستی نہیں ہو جاتا، نہ ہندوستان کبھی آزاد ہو سکتا ہے اور نہ حریت کی صحیح روح پیدا ہو سکتی ہے۔

آزادی نام ایک کیفیت کا ہے جو پہلے قلب انسانی میں خود اس کے آزادی ضمیر کے ساتھ پیدا ہوتی ہے اور وہ علائق مذہب و ملت سے بہت بلند ہے۔ اگر آج ہندوستان موجودہ ذہنیت کے ساتھ آزاد و خود مختار ہو جائے تو بھی ہمارے لیے باعث مسرت نہیں، کیونکہ وہ امن و سکون جو آزادی کے بعد حاصل ہوتا ہے اس وقت تک میسر نہیں آ سکتا جب تک ہماری روحیں آزاد نہ ہوں، ہمارے خیالات وسیع نہ ہوں اور تفریق ملت، امتیاز کفر و اسلام کا پردہ درمیان سے نہ اٹھ جائے۔ اور یہ ممکن نہیں جب تک مذہب مفقود نہ ہو جائے، یا لوگ مذہب کے صحیح مفہوم سے آشنا نہوں اور اسکو انفرادی عقیدہ کی چیز جانکر اجتماعیات سے علحدہ نہ رکھیں۔

ہندو مسلمانوں کے جتنے اکابر آج آزادی کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں وہ سب بلا استثنا سیاہ لیست اپنے اندر نہیں رکھتے اور جس وقت کورانہ تقلید اور قدامت پرستی کا سوال آتا ہے تو گاندھی ایسا انسان بھی گاؤ پرستی کے احمقانہ جذبہ سے متاثر ہو کر ملک کے تمام مصالح قربان کرنے کیلئے آمادہ ہو جاتا ہے اور شبہ سے تمہے ذی ہوش مسلمان لیڈر کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ سرے سے قربانی کرنا کونسا محمود فعل ہے کہ گائے اور بکری میں انتخاب کا سوال پیدا ہو۔

افغانستان کا مسئلہ بدستور الجھا ہوا پڑا ہے اور اسوقت تک واقعات نے کوئی خاص رخ ایسا اختیار نہیں کیا، جنکی بنا پر کوئی صحیح رائے قائم ہوسکے، امیر امان اللہ خاں بدستور قندھار میں ہیں۔ بچہ سقہ اسی طرح کابل میں موجود ہے۔ سردار علی احمد جان گورنر کابل جو اس درمیان میں خود دعویدار سلطنت ہوکر اٹھے تھے، پھر امیر امان اللہ خاں کے طرفدار ہوگئے ہیں اور جنرل نادر خاں جنکی آمد کا سخت انتظار تھا آگئے ہیں، بہ ایں ہمہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کیا کرنا چاہتے ہیں اور کیا کر سکیں گے۔

جنرل نادر خاں کا افغانستان میں بہت اثر ہے، اس کو وہ خود بھی جانتے ہیں، اس لئے قدرتاً انکو اسکا خیال کرنا چاہیئے کہ کہیں کوئی امر انکی اس عظمت کو کم کرنیوالا نہ پیدا ہو جائے اور یہی سبب ہے کہ اسوقت تک وہ کوئی رائے قائم نہیں کرسکے کہ کیا کرینگے، تاہم اسقدر ضرور معلوم ہوا ہے کہ وہ پہلے جلال آباد جاکر وہاں کے قبائل کو جمع کرکے معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ان کا کیا خیال ہے اور پھر اتفاق آراء سے کسی بادشاہ کا انتخاب کرینگے۔ گویا وہ اس وقت نہ امیر امان اللہ خاں کے طرفدار ہیں اور نہ مخالف لیکن سوال یہ ہے کہ آیا جنرل نادر خاں کا موجودہ طرز عمل وہاں کے حالات کے لحاظ سے مناسب ہے یا نہیں اور اگر انتخاب حکمراں کا بعض قبائل نے امیر امان اللہ خاں کے خلاف کیا تو جنرل نادر خاں اُن قبائل کے ہم آہنگ ہوکر کامیاب ہوسکیں گے یا نہیں۔

یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ افغانستان میں ابھی دستوری یا جمہوری حکومت قائم نہیں ہوسکتی وہ اس منزل سے بہت پیچھے ہے۔ اس لئے وہاں کسی نہ کسی خود مختار حکمراں کا ہونا ضروری ہے، لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ امیر امان اللہ خاں کے ہوتے ہوئے یعنی ایک جائز و اہل حکمراں کی موجودگی میں انتخاب حکمراں کے سوال کا پیدا ہونا کیا معنے رکھتا ہے۔ نادر خاں کا اپنی قطعی رائے ظاہر کرنیسے انکار، کسی نتیجہ پر پہونچنے میں پس و پیش اور اگر خبریں صحیح وصول ہوتی ہیں تو انکا قندھار جانیسے باوجود طلب کرنے کے انکار کرنا، پوری طرح اس خیال کی تصدیق کرتا ہے کہ وہ امیر امان اللہ خاں کے طرفدار ہوکر نہیں آئے اور افغانستان کی موجودہ پیچیدگیوں کو وہ امیر امان اللہ خاں کے نقطۂ نظر سے دور کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ افغانی قوم نہایت کینہ پرور قوم ہے۔ لیکن تعلیمیافتہ طبقہ میں تو اس قومی خصوصیت کو بہت ضعیف ہوجانا چاہیئے، اگر جنرل نادر خاں نے بیماری کی حالت میں یورپ سے افغانستان کا سفر برداشت کرنے کی زحمت کسی انتقام طلبی یا کینہ پروری کی بنا پر اختیار نہیں کی ہے (جسکا یقین ہے) تو پھر اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ جنرل نادر خاں صرف ایک پتلی ہیں جسکا رشتہ کسی غیر ملکی ہاتھ میں ہے اور اسی کی جنبش پر ان کی نقل و حرکت کا انحصار ہے۔ بہرحال اسوقت تک تمام معاملات پر نگاہ ڈالنے سے یہ امر تو یقینی طور پر محقق ہوچکا ہے اور وہ یہ کہ بچہ سقہ افغانستان کا فرمانروا نہیں رہ سکتا، اس لئے اب صرف یہ دیکھنا ہے کہ آئندہ امیر امان اللہ خاں کے سر پر تاج شاہی رکھا جاتا ہے یا کسی اور کے، جنرل نادر خاں اور ان کے بھائی اس کا اعلان کرچکے ہیں کہ وہ تخت و تاج کی تمنا نہیں رکھتے، سردار علی احمد جان کے سر سے بھی یہ سودا نکل چکا ہے، اس لئے بظاہر منطقی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ سوائے امیر امان اللہ خاں کے اور کوئی افغانستان کی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتا لیکن اندرونی پیچیدگیاں اور بیرونی سیاسی ریشہ دوانیاں اسقدر گہری نظر آتی ہیں کہ یہ سب کچھ آسانی سے حاصل ہوتا ہوا نظر نہیں آتا۔

اگر امیر امان اللہ خاں کی اس تقریر پر نگاہ ڈالی جائے جو انہوں نے پشاور میں ایک جماعت کے سامنے کی تھی، تو اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ اس انقلاب میں بعض وزراء کابل کی غداری بھی اپنا کام کر رہی تھی (جیسا کہ اس سے قبل ہی ہم نگار میں ظاہر کر چکے ہیں) اور اس لئے آگ لگانے والے نے یہ آگ باہر سے نہیں لگائی تھی، بلکہ اندر سے بھی اس پر تیل چھڑکنے کا کافی انتظام کر لیا تھا۔

ایک قزاق کا اس قدر قوت حاصل کر لینا کہ وہ مستقل حکومت کی بنیاد کو ہلا ڈالے، ایک ایسی کھلی ہوئی داستان مکر و سازش اپنے اندر پنہاں رکھتی ہے جس کے سمجھنے کیلئے زیادہ غور و تامل کی ضرورت نہیں اور اس کا جواب اگر کوئی ہو سکتا ہے تو صرف یہ کہ امیر امان اللہ خاں بغیر وساطت نادر خاں کے اپنی ضرورت ملک سے تسلیم کرا لیں اور اگر جنرل نادر خاں کے فیصلہ ہی پر انحصار ہونے والا ہو تو اس کے ماننے سے انکار کر دیں اور بجائے بادشاہ ہونے کے آزاد انسان کی زندگی کو ترجیح دیں۔

بہر حال امید کی جاتی ہے کہ اپریل تک ادھر یا ادھر کوئی فیصلہ ہو جائے گا اور اگر یہ چنگاری گذشتہ جنگ عظیم کی سرویا کی سی چنگاری ثابت نہ ہوئی تو نہ برطانیہ کو اپنی غیر جانبداری توڑنے کی ضرورت ہوگی اور نہ روس کو فوجی نقل و حرکت کی۔

اس وقت جمہوریۂ ترکی کی توجہ کا مرکز ملک کی تعلیم عام ہے۔ اب سے چار سال قبل اس باب میں سب سے پہلا دانشمندانہ قدم یہ اٹھایا گیا تھا کہ قدیم مذہبی مدارس کو فنا کر دیا گیا، کیونکہ غازی مصطفےٰ کمال اس امر کو اچھی طرح جان گئے تھے کہ ملک کی ترقی کا سب سے بڑا مانع علماء کا وہ گروہ ہے جو اس وقت ہاتھ کی چھٹی انگلی کی طرح بیکار ہونے کے ساتھ ہی بدنما بھی ہے اور ملک میں اس نوع کی پیداوار کو جاری رکھنا گویا خود بیماری کے جراثیم منتشر کرنا تھا، اس لئے انہوں نے ان مدارس ہی کو بند کر دیا جس سے یہ موذی جماعت بڑھتی جا رہی تھی اور ملک کو انحطاط کی طرف ڈھکیل رہی تھی، لیکن اس کے بعد ملک کی دیگر ضروریات کی وجہ سے کوئی دوسرا قدم اصلاحات کی طرف نہیں اٹھایا جا سکا تھا۔

اس وقت وہاں کا نظام تعلیم یہ تھا کہ ہر صوبہ میں علیحدہ تعلیم کا بجٹ مقرر کیا جاتا تھا اور اس کی ساری ذمہ داری صوبہ کی حکومت پر ہوتی تھی، لیکن اب اس دستور کو مٹا کر صرف ایک مرکزی بجٹ سارے ملک کے لئے مقرر کر کے انگورہ سے متعلق رکھا گیا تاکہ تعلیم کا انتظام قلب حکومت سے وابستہ رہے اور اس پر زیادہ توجہ صرف کی جا سکے۔

اس وقت وہاں ۰۰۰۶ ابتدائی مدارس ہیں جن میں ۰۰۰۳۴ طلبہ تعلیم پاتے ہیں۔ ۱۹ ثانوی مدارس ہیں جہاں ۴۰۰۷ طلبہ پڑھتے ہیں، ۲۲ مدارس مدرسوں کے لئے ہیں جہاں خاص طور پر زراعت و تجارت وغیرہ کی بھی تعلیم ہوتی ہے۔ انمیں ۲۰۰۵ طلبہ پائے جاتے ہیں۔ یونیورسٹی صرف ایک ہے۔ غیر ملکی مدارس کی تعداد ۰۰۲ جہاں ۰۰۰۳۶ طلبہ پڑھتے ہیں، ان اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ابھی بہت زیادہ مدارس قائم کرنے کی ضرورت ہے اور اسی لئے اس شعبہ کو مرکزی حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور امسال وہاں صرف قسطنطنیہ میں ۶۴ جدید ابتدائی مدارس تعمیر کئے جا رہے ہیں تاکہ ملک کے بڑھے ہوئے شوق تعلیم کو پورا کیا جا سکے۔ . . .

جب سے وہاں لاطینی خط کا رواج ہوا ہے، سارے ملک میں تعلیم کی طرف سے عجیب و غریب شوق پیدا ہو گیا ہے اور اس آسانی کو دیکھتے ہوئے جو اس جدید خط کی وجہ سے پڑھنے میں پیدا ہو گئی ہے، طلبہ اس قدر کثرت سے آنے لگے ہیں کہ موجودہ ملک کے لئے بالکل ناکافی نظر آتے ہیں۔ بہر حال اس وقت ترکی جس خوبی کے ساتھ ترقی کی طرف مائل ہے، اس کا اعتراف سوائے قدیم رنگ کے مولویوں کے سبھوں نے کیا ہے اور اگر ایک ربع صدی تک انکی یہی حالت رہی تو ممکن ہے کہ ملک اس عنصر ہی سے پاک ہو جائے جس کی طرف سے اندیشہ مخالفت کا کیا جاتا ہے۔

کانگرس کے پروگرام میں بدیسی کپڑوں کے مقاطعہ کی طرف عملی قدم اٹھایا گیا ہے، جس کی بہت مبارک ابتدا گاندھی جی کی گرفتاری سے ہوئی۔ ہر چند یہ گرفتاری صرف اس بناء پر ہوئی تھی کہ کلکتہ کے مقامی قانون کی رو سے آبادی کے اندر کسی ڈھیر میں آگ لگانا ممنوع ہے اور بدیسی کپڑوں کے اندر جہاں آگ لگائی گئی تھی وہ آبادی ہی کے اندر تھا، لیکن چونکہ تصادم ہمیشہ جذبات میں اشتعال پیدا کرتا ہے، اس لئے جو کچھ ہوا بجا نہ ہوا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ برما سے واپسی کے بعد گاندھی جی اس مقدمہ کی جوابدہی کرتے ہیں یا نہیں اور ان کو اس جرم کی سزا بھی ملتی ہے یا نہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ گورنمنٹ اس مقدمہ کو اٹھا لیگی اور چلانا مناسب نہ سمجھے گی، لیکن اگر ایسا نہ کیا گیا تو قدرتاً اس تحریک کو مدد ملنا چاہئے اور زیادہ قوت کے ساتھ اس تحریک کو قائم رہنا چاہئے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ اگر مقامی حکومتیں زیادہ صبر و ضبط سے کام نہیں لے سکتیں تو ہم کو دامن اعتدال ہاتھ سے نہ دینا چاہئے اور جو کچھ کریں اس کو انتہائی امن و سکون کے ساتھ کرنا چاہئے، قانون شکنی کی صرف یہی ایک صورت نہیں ہوتی کہ اس کی مخالفت کی جائے، بلکہ اسکی بہترین صورت یہ ہوتی ہے کہ اس کے استعمال کا موقعہ ہی نہ دیا جائے۔ قانون جرم کرنے سے بیکار نہیں ہوتا بلکہ ترک جرم سے۔

مسلم لیگ کی دونوں مخالف جماعتوں کا اجلاس جو حال ہی میں ہوا ہے اور جس میں باہم مفاہمت و مشارکت کی سعی کی گئی ہے، نہایت مبارک خیال ہے۔ جو راہ عمل اب اختیار کی گئی ہے، اس کو اس سے قبل ہی اختیار کرنا چاہئے تھا، لیکن "بعد از خرابی بسیار" کسی صحیح راستہ کو اختیار کرنا ہمارے اکابر ملت کی خصوصیت ہے۔

اس اجلاس میں مولانا محمد علی نے جو طریق عمل و انداز گفتگو اختیار کیا، وہ انسانی نفسیات کا کوئی اہم راز نہیں ہے۔ اس دوران میں نہرو رپورٹ کی مخالفت اور اجلاس کلکتہ میں ان کی غیر مدبرانہ تقریر نے (جیسا کہ ہمیشہ ہوا ہے) انکی سیادت و قیادت کو ایسا سخت صدمہ پہونچایا کہ اس وقت تک باوجود کوشش کے اس کی تلافی نہ ہو سکی۔ اس کے بعد افغانستان کے معاملہ میں انکے خیالات و آراء نے جس غیر دانشمندانہ ذہنیت کا ثبوت دیا، اس نے اور بھی رہے سہے وقار کو کھو دیا، اس لئے ان کو قدرتاً غمگین ہو جانا چاہئے تھا اور یہ دیکھ کر کہ علیحدہ وہ کوئی جماعت اپنی پیدا نہیں کر سکتے، ان میں فطری طور سے یہ خواہش پیدا ہوا

چاہیئے تھی کہ کسی طرح پھر اس جماعت میں داخل ہو جائیں جس سے وہ علیحدہ ہو گئے تھے۔ چنانچہ یہی وہ جذبہ تھا جس کے ماتحت انہوں نے محمد علی جناح کے ہم آہنگ ہو کر کہہ دیا کہ اگر مسلمانوں کا مفاد محفوظ رہے تو وہ مخلوط انتخاب کے موافق ہیں حالانکہ اب سے قبل یہیں دہلی کے کانفرنس میں جس کی صدارت سر آغا خاں نے کی تھی، یہ امر مولانا محمد علی کی کوشش ہی سے طے پایا تھا کہ انتخاب جداگانہ لازم ہے۔

بہرحال ہم خوش ہیں کہ انہوں نے اپنی غلطی کا اعتراف صراحۃً نہیں تو کنایۃً کر لیا، لیکن آئندہ کے لئے بھی انکو اچھی طرح جان لینا چاہیئے کہ ہر چیز کی ایک عمر ہوا کرتی ہے اور غالباً انکی سیادت بھی اب عالم شیب ہی کی گھڑیاں بسر کر رہی ہے اور دنیا کو اسکی زیادہ پرواہ نہیں ہے۔

اس ماہ کا رسالہ چار چھ دن کی تعویق سے شائع ہو رہا ہے، جس کا ایک ضعیف سبب تو فروری کے مہینہ کا اختصار تھا اور دوسرا قوی سبب یہ کہ نگار کے جدید کاتب جو ضرورت سے زیادہ متقی واقع ہوئے ہیں، ماہ رمضان کی وجہ سے کافی وقت نہ دے سکے اور اس طرح اس ماہ کے نگار کو اپنی پابندی بطور خراج ان کے زہد و ورع کے حضور میں پیش کرنی پڑی، چونکہ میں پابند صیام نہیں ہوں اس لئے میں نے بھی یہ کفارہ دینا آسانی سے گوارا کر لیا۔

حامد رضا خاں تبسم نظامی جو نمایندۂ نگار کی حیثیت سے کام کر رہے تھے بعض اسباب کی بنا پر جنکے اظہار کی فی الحال ضرورت نہیں، اپنی خدمت سے معزول کر دیئے گئے ہیں اور اب دفتر نگار سے انکا کوئی تعلق قایم نہیں رہا، اس لئے اگر کسی صاحب نے انکو کوئی رقم نگار کے متعلق مرحمت فرمائی تو اس ذمہ دار دفتر نگار نہ ہوگا۔

اس درمیان میں بعض چیزیں علاوہ کتابوں کے اور بھی ریویو کیلئے آئی ہیں جن میں خصوصیت کیساتھ ایک کا ذکر یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ ایک تیل ہے جسکے متعلق مخترع کا دعویٰ ہے کہ خواہ کسی سبب سے سر کے بال گر جائیں اسکے استعمال سے پھر پیدا ہو جاتے ہیں۔ میں نے خود اپنے ایک عزیز دوست کو یہ شیشی استعمال کیلئے دی اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ انکا وہی سر جو بالکل ہتھیلی کی طرح صاف تھا ایک ہی شیشی کے استعمال کے بعد خوشنما گھنے بالوں سے بالکل ڈھک گیا۔ تقویت دماغ اور تقویت بصارت کی بھی انہوں نے تصدیق کی۔

اگر کسی صاحب کو مزید حالات معلوم کرنا ہوں تو ذیل کے پتہ سے خط و کتابت کریں۔

سخاوت حسین۔ ذریعہ سید احمد حسین صاحب پیر مل۔ لکھنؤ

نیاز فتحپوری

ورنگل کے آثار قدیمہ

ہر قوم کے آثار گویا مراۃ تاریخ ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس سے ان کے گرد رکا جس قدر تعلق رہا ہے۔ اور اس کے ذریعہ سے انکے سمجھنے میں جسقدر سہولت و آسانی ہوتی ہے۔ وہ اصل میں انہی کے اس جستہ جستہ آثار پر مبنی ہے۔ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ ان فرقوں کی ابتدائی تاریخ ابھی نامکمل ہے۔ کیونکہ آئے دن کی جدید تحقیقات سے ان کے اثری کارناموں پر جو روشنی پڑ رہی ہے۔ اور ان سے جو بیش قیمت معلومات اخذ ہو رہی ہیں وہ ان کے نام اور کام دونوں کی مجسم تاریخیں ہیں۔

ان قوموں کے آثار جو کئی اصناف اور مختلف ازمنہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور جن سے انکا تمدن قدیم برقرار ہے، ہندوستان کے ہر حصہ میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ زمانہ نے ان کو جس بیدردی) اور اپنے تباہ کن ہاتھوں سے برباد کیا ہے۔ اور اس سے انکی عظمت پر جو گمنامی کا پردہ پڑ گیا ہے۔ حقیقت میں وہ تمدن موجودہ کے لئے نا قابل تلافی ہے۔ ان کے تمدن قدیم سے تعلق رکھنے والی جس قدر چیزیں باقی ہیں وہ سب ان کے احساس مذہبی، مراسم معاشرتی اور اصول زندگی کی یادگار ہیں۔

ہندوستان کے عہد قدیم کی ہندو عمارت کا سلسلہ جناب مسیحؑ سے تقریباً دو سو پچاس سال پہلے سے شروع ہوتا ہے۔ اس کی ابتدا غاری مندر سے ہوتی ہے کیونکہ تمدن قدیم نے ہندوستان میں اسی زمانہ سے نشو و نما حاصل کی تھی، اور اسی زمانہ سے ان کے کارنامے عالم وجود میں آنے لگے تھے، اصل میں انکے زرین کارناموں سے یہی چیزیں مراد ہیں۔ ان سے انکی تہذیب کا تعلق جسقدر ہے۔ انہوں نے اسکے فروغ دینے میں جسقدر کوششیں کی ہیں وہ انکے نام کے ساتھ ہمیشہ یادگار رہے گی۔

اس فن کی نشو و نما اور ابتدا کا زمانہ ۲۵۰ سنہ قبل عیسیٰؑ تھا۔ اس زمانہ کو فن تعمیر کا پہلا دور قرار دینا چاہئے۔ کیونکہ ۱۵۰ سنہ قبل مسیحؑ کے بعد سے اس فن میں بہت سی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں چنانچہ دور اول کے طرز تعمیر کا یہ حال تھا کہ انکی عمارات بھیانک اور تاریک ہوا کرتی تھیں ان میں آسائش و زیبائش کے سامان بہت کم مہیا ہوتے تھے۔ لیکن ۱۵۰ سنہ قبل مسیح سے ان میں ایک طرح کی شائستگی اور راحت و آرام کی تدبیریں عمل میں آنے لگیں اور اس زمانہ کی متعلقہ عمارات نہایت کھلی اور ہوادار ہوتی تھیں۔ یہ زمانہ فن سنگتراشی کا دوسرا دور ہے۔ اس کی زندگی ساتویں صدی عیسوی تک رہتی ہے۔ اسی زمانہ کی یادگاروں میں سے ایلورا اور اجنتا کے مشہور غار ہیں۔

اس کے بعد اس میں تدریجی ترقی ہونی شروع ہوئی۔ اور اس میں نئے نئے انداز تعمیر استعمال کئے جانے لگے۔ اور اس فن نے تھوڑے ہی عرصہ میں، اس قدر ہر دلعزیزی حاصل کر لی کہ آٹھویں اور بارھویں صدی عیسوی کا وسطی زمانہ اس کے عروج کا انتہائی زمانہ تھا کیونکہ اس زمانہ میں یہ قدیم طرز تعمیر کو چھوڑ کر کشادہ اور ہوادار تعمیرات کی طرف زیادہ مائل ہونے لگے تھے۔ انکا یہ طریقہ تعمیر مسلمانوں کے دکن پہونچنے تک برابر ایک حالت میں جاری رہا۔ لیکن مسلمانوں کے قبضہ کے بعد اس کا خاتمہ نظر آتا ہے۔

—— فرانس کے مشہور مورخ ڈاکٹر گستاولی بان کا خیال ہے کہ دکن کے طرز تعمیر کی ابتدا بھی اوسی طرح نامعلوم اور غیر محقق ہے جس طرح شمالی ہند کی۔ انکے اس قیاس سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں غاری مناد نے اپنے طرز تعمیر میں غیر معمولی ترقی کی تھی لیکن پھر اس بیان کے بعد ان کا خیال زمانے کے تعین کرنے سے قاصر رہتا ہے اور بقول انکے جنوب میں مدورا اور اس کے نواح جو دکن کے قدیم دارالحکومتوں سے ہیں۔ عجب نہیں کہ ہمیں انہوں نے یونان اور روم کے محققین کے بیان کے مطابق اپنی اثری یادگاریں تعمیر کی ہوں گی لیکن انکو زمانہ کی دست برد آپس کی خانہ جنگیوں اور بیرونی چڑھائیوں نے باقی نہیں رہنے دیا۔ اس زمانہ کو جس سے تاریخ آشنا ہے زمانہ حجری سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہمیں چوتھی صدی عیسوی تک ایک ایسا وقفہ ہوگیا ہے جس کے متعلق ہمیں کچھ معلوم نہیں۔

دراصل دکن کے آثار میں چھٹی صدی عیسوی کے زمانہ سے پہلے کی عمارات بہت کم پائی جاتی ہیں جنکا ہم کوئی حقیقی زمانہ متعین نہیں کرسکتے۔ البتہ سنگی کتبہ یا قدیم تحریریں جو ان پر ثبت ہیں۔ ان سے ایک حد تک زمانہ کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ جن اصول کے ماتحت ان آثار کو زمانہ حجری قرار دینا پڑتا ہے۔ وہ ان کے طرز تعمیر پر موقوف ہے کیونکہ قدیم تمدن میں جن چیزوں کا رواج تھا۔ وسطی زمانہ میں وہ زیادہ قابل قبول نہیں ہوئی۔

جنوبی ہند میں دکن کا علاقہ قدیم ہندو آثار اور مختلف ازمنہ کی غیر معمولی یادگاروں کا ایک ذخیر خطہ سمجھا جاتا ہے۔ ہمیں راجگان قدیم کی جو یادگاریں محفوظ ہیں۔ انکا جواب سارا ہندستان پیدا نہیں کرسکتا!

قسمت تلنگانہ میں ہندوؤں نے بہ نسبت دکن کے اور مقامات کے اپنی اثری یادگاریں زیادہ چھوڑی ہیں، کیونکہ تلنگانہ کے ہندو راجہ مسلمانوں کی فتوحات کے ایک عرصہ بعد تک دکن میں حکمران تھے۔ ان کی تعمیرات زیادہ تر وسطی زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں حقیقت میں اس سرزمین کو قدیم ہندو دھرم کے اعتبار سے جو اہمیت حاصل ہے، وہ دکن کے کسی حصہ کو نصیب نہیں۔ خاص کر اس خطہ میں ہندوؤں کے جس قدر آثار ہیں وہ سب طریقۂ تعمیر کے اعتبار سے خاص اہمیت اور وقعت رکھتے ہیں۔ ان آثار کا دکن کے آثار میں وہی درجہ ہے جو شمالی دکن میں ایلورہ اور اجنتہ کا ہے

تلنگانہ کی یادگاریں مختلف ازمنہ پر مشتمل ہیں۔ اور یہ کئی راجاؤں کی متحدہ اور اجتماعی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ ان عمارات کو دکن میں جو شہرت حاصل ہے، یا جس کے باعث یہ اسقدر شہرت رکھتے ہیں وہ محض انکا طرز تعمیر ہے۔ اس طرز کی خصوصیت یہ ہے کہ انکی عمارت کے ستون نہایت زبردست اور اونچے ہوتے تھے اور انکی ہر چیز میں اسقدر اعتدال برتا جاتا تھا کہ یہ سب اپنی اپنی جگہ بڑی موزونیت رکھتی تھیں۔ ان سب میں قابل لحاظ جو چیز تھی وہ ہوا، اور روشنی کا باضابطہ انتظام تھا۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ ہندستان یا دکن میں جسقدر دیولیں یا خانقاہیں ہیں ان میں ہوا اور روشنی کے نفوذ کا بہت کم لحاظ رکھا گیا ہے۔ اصل میں دیول کی موزونیت اور خوبصورتی کا دار مدار صرف ہوا اور روشنی کے اعتدال پر ہے لیکن عام دیولوں میں اس التزام بالکل نہیں ہے۔ خاصکر مورتوں کے تناسب میں بھی اسی قسم کی بہت سی لغزشیں واقع ہوئی ہیں جس کے باعث دیول یا عمارت کا حقیقی حسن باقی نہیں رہتا۔ برخلاف اس کے تلنگانہ کی تمام عمارتیں ہر لحاظ سے قابل اہمیت ہیں۔ کیونکہ ان میں یہ سارے تعمیری تناسب اسقدر اہتمام اور موزونیت کے ساتھ جمع کئے گئے ہیں کہ انکی کوئی عمارت کبھی خلاف

اصول نظر نہیں آئے گی۔ اصل میں یہی ایک ایسی چیز ہے جس سے عمارت کی وقعت اور عزت بڑھ جاتی ہے بقول ماہرین علم آثار کے اسی سے انکی صنعت اور غیر معمولی محنت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ہم اس تمہید کے بعد اس سلسلہ کو ختم کر کے تلنگانہ کی ان مشہور عمارات کا حال لکھتے ہیں جو بجائے خود نہ صرف دکن کیا بلکہ سارے ہندوستان میں یکساں شہرت رکھتی ہیں۔

ہزار ستونی دیول

تلنگانہ کی مشہور عمارت میں تاریخی اعتبار سے اس دیول کو فوقیت حاصل ہے کیونکہ اس میں جو کتبہ کندہ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیول ۱۱۶۲ء و ۱۱۶۳ء کے درمیان تعمیر ہوئی ہے۔ اسکا بانی رودر دیو اول (۱۱۶۳ء ۔ ۱۱۹۵ء) تھا جو کاکیتیا خاندان کا مشہور و معروف راجہ ہے۔

اس دیول کا ذکر قدیم تاریخوں میں نہایت وضاحت کے ساتھ آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیول رایان تلنگانہ سے متعلق ہے۔ ان تواریخ کے علاوہ تلنگی زبان میں ایک کتاب پرتاب چرترا کے نام سے لکھی گئی ہے۔ جس میں راجگان تلنگانہ کا مفصل و مبسوط تذکرہ ہے۔

اس کتاب کے مصنف نے اس دیول کے تعمیر کئے جانے کی نسبت ایک عجیب و غریب وجہ بیان کی ہے جس کو ہم ذیل میں بطور اقتباس نقل کرتے ہیں:۔

> تلنگانہ کے مشہور راجہ کاکیت پول (پرولا) کے گھر ایک لڑکا پیدا ہوا جس کی نسبت نجومیوں نے راجہ سے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ یہ لڑکا بڑا ہوکر تمہارے قتل کا باعث ہوگا۔ چنانچہ راجہ نے اس واقعہ کے بعد اس کو پارس لنگم کے مندر کے ایک پوجاری کو دیدیا اور ساتھ ہی ساتھ لڑکے کو ہمیشہ اپنے پاس رکھنے کی تاکید بھی کی۔ اس نے راجہ کے حکم کے موافق لڑکے کو لیجاکر اپنے گھر رکھ لیا۔ باضابطہ تعلیم دلوائی یہاں تک کہ ایک فاضل و کامل بنادیا۔ جب راجہ کو اپنے لڑکے کے اس فضل و کمال کی اطلاع ملی تو بڑا خوش ہوا۔ اور اس پوجاری کو اس خدمت کے معاوضہ میں دو ہزار کی جمعیت سے سرفراز کر کے مہادیو کے مندر کی نگرانی کے لئے روانہ کیا اور حکم دیا کہ بلا میری اجازت کے اس کو باہر جانے نہ دینا۔
>
> اتفاق سے انہیں دنوں میں راجہ خود اسی مندر میں پوجا کی غرض سے چلا گیا، اس کا لڑکا دروازہ پر سو رہا تھا، جب اوسکو کسی آدمی کے گذرنے کی آہٹ محسوس ہوئی تو فوراً جاگ اٹھا۔ اور برچھے سے راجہ کو اسقدر زخمی کر دیا کہ سوائے موت کے اوسکا اور کوئی علاج نہ تھا۔ مرتے وقت راجہ نے اس سے یہ وصیت کی کہ میرے اس قتل کے کفارہ میں تو کاشی اور لنگم کے دیولوں کو جا اور ہر ایک دیول کی اپنے لیاقت کے موافق خدمت کر۔ اور وہاں سے آکر ایک دیول بنا جس کے ہزار کھم ہوں
>
> چنانچہ اس نے راجہ کے حسب وصیت یہ مندر تعمیر کیا۔

اس دیول کا تین تیرتھی دالان نہایت قدیم ہے۔ نندی منڈپ اور اس کے ایوان کی توسیع بعد میں کیگئی ہے جس میں باہر کا

بڑا دالان بھی شامل ہے۔ دیول جس مقام پر تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کی بلندی سطح زمین سے تقریباً ۴ فٹ ۸ انچ ہے۔ یہ دیول بقول ماہرین علم آثار کے شیوا، سوریا، اور وشنو کے ناموں سے منسوب ہے۔ کیونکہ اس میں تین قطعے ہیں جو ایک دوسرے سے بالکل علحدہ ہیں اور ہر ایک قطعہ اس کا تیرتھ کہلاتا ہے اور یہ تینوں تین مختلف نام سے (شیوا، سوریا اور وشنو) مشہور ہیں اور ہر ایک تیرتھ پر ہر ایک دیوتا کی مورت نہایت صفائی کیساتھ کندہ ہے۔ جس سے ان مخصوص مقامات کے سمجھنے میں بڑی سہولت ہوتی ہے۔ اس کے بعض شواہد اس بات کے موید ہیں کہ یہ دیول جب راجگان کاکیتیا (گنپتی) کے قبضہ سے نکل گئی تو اسپر لنگاتیوں کا قبضہ ہو گیا جنہوں نے اسکے سارے اوتاروں کی مورتیں اصلی جگہ سے علحدہ کر دیں اور اسکی جگہ اپنے اوتار سلنگا کو بٹھا دیا۔ جو ابھی تک موجود ہے اور اس جگہ سے ان مورتوں کے علحدہ کرنے کے موہوم سے نشانات ابھی پائے جاتے ہیں۔

اس دیول کی تعمیری خصوصیات میں سب سے بڑی خصوصیت اس کی صناعی ہے۔ جو نہایت اعلیٰ درجہ کے سنگتراشوں کی برسوں کی محنت کا نتیجہ ہیں چنانچہ اس میں دوار پالک ایک ایسا مقام ہے۔ جہاں ہر قسم کے نقش و نگار بیل، بوٹے، پھول، پتے ایک نئی انداز میں نظر آتے ہیں۔ اس مقام پر جو صناعی کی گئی ہے وہ اس قدر بہتر اور خوبصورت ہے کہ اس کا جواب ساری دیول پیدا نہیں کر سکتی۔

اس حصہ سے ملا ہوا ایک دالان ہے۔ جو بالکل سادہ ہے۔ اس کے بیچ کا کمرہ دیو کی نشست گاہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ اس میں بھی کسی قسم کی کوئی مورت نہیں ہے البتہ اندرونی حصہ کی چوکھٹ میں گلکاری کا بہت کام ہے۔ اور اس کے ہر دو جانب بہت سی مورتیں کندہ ہیں جو بحالت رقص ہیں دکھائی دیتی ہیں۔

اس دیول میں متعدد کتبے ہیں جو نہایت قدیم اور مختلف زبانوں میں کندہ ہیں۔ اور یہ اکثر جگہ سے ٹوٹ گئے ہیں جس کی وجہ سے ان کے پڑھنے اور سمجھنے میں دقت ہوتی ہے۔ اس میں کے اکثر کتبے ایسے بھی ہیں جو تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں، ان سے اس کے بانیوں کے سلسلہ پر جو روشنی پڑتی ہے وہ تاریخ کے لئے بالکل نئی چیز ہے۔

اس دیول میں سب سے قدیم کتبہ وہی ہے جو اس کے تعمیر کے زمانہ میں نصب کیا گیا تھا۔ یہ کتبہ نہایت طویل اور عریض پتھر پر قدیم سنسکرت زبان میں کندہ ہے۔ یورپ کے اکثر محققین نے اسپر بہترین مقالے لکھے ہیں، اور یہ متعدد بار مختلف رسائل میں چھپ چکا ہے اور محققین نے اس کی تحقیق پر اپنی اپنی بساط کے موافق روشنی ڈالی ہے۔

سب سے پہلے اس کتبہ کی قدامت پر بنگال رایل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالے نے ایک مضمون شائع کیا تھا جس میں اسکے فاضل نامہ نگار نے اس کی صحیح تاریخ تحریر ۱۰۵۴ء ساکا (شک) قرار دی تھی۔ اس کے بعد اسی عنوان پر بمبئی رایل ایشیاٹک کے جرنل میں بھی مسٹر باؤ دجی کا ایک مضمون چھپا تھا۔ جو نہایت طویل ہے۔ اس میں انہوں نے اسکی تاریخ کندگی ۱۰۶۴ء ساکا (شک) بیان کی ہے۔ اس کے علاوہ موصوف نے کتبہ کے تحت اس کے بانی کے حالات بھی لکھے ہیں۔

لیکن ان مضامین کے تھوڑے ہی دنوں بعد مسٹر رائس نے اس کتبہ پر تحقیقی نظر ڈالی ہے۔ اور اس پر اپنے جدید معلومات مہیا کر کے اسکی صحت تاریخ پر ایک خاص مضمون لکھا ہے جس میں انہوں نے اسکی ابتدائی تحقیقات سے گریز کرتے ہوئے اس کی صحیح تاریخ تحریر نویں صدی عیسوی کی قرار دی ہے۔ اور ان کے خیال میں اس میں تیلائے اول اور بھیمائے دوم جو مغربی چلوکیا خاندان کے مشہور

راجہ ہیں، ان کے قسمت کے نوشتوں کا حال ہے۔

ان تحقیقی مضامین کے شایع ہونے کے بعد مسٹر فلٹ نے بھی اس کی تحقیق بہ قول اپنے شروع کی اور ایک مضمون قدیم سنسکرت کتبوں پر لکھا جو انڈین انٹی کویری کی گیارھویں جلد میں شایع ہوا ہے، اسمیں موصوف نے ان سارے محققین کی تحقیق سے بالکل علاحدگی اختیار کی ہے اور نہایت ہی زبردست وجوہ کے ساتھ ان سب سے اختلاف کیا ہے۔ اور اس کی صحیح تاریخ تحریر ۱۱۶۲ء و ۱۱۶۳ء کے وسطی زمانہ کی قرار دی ہے۔

یہ آخری نظریہ ہیں بھی نہایت صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان کے بعد کے مورخین نے بھی اسی کا اتباع کیا ہے۔ اسی مضمون پر میجر ہیگ اور مسٹر یزدانی کے مقالوں کی بنیاد ہے۔

یہ کتبہ بڑی اہمیت رکھنے والی چیز ہے کیونکہ اس میں ورنگل کے متعلق اس قدر صحیح معلومات ہیں کہ اس سے بہتر معلومات سرزمین دکن کی کسی تاریخ میں یکجا جمع نہیں دکھائی دیتیں۔

اس کتبہ کے ایک بیان کے متعلق میجر ہیگ نے اپنے مقالہ ورنگل میں ایک نظریہ قایم کیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:-

> ورنگل کے کاکیتیا خاندان نے کبھی خود مختاری کا اعلان نہیں کیا تھا۔ کیونکہ رودرادیو اول نے اپنے آپ کو مہامنڈلیشور کے لقب سے ہمیشہ یاد کیا ہے جس کے معنے ایک بہت بڑے امیر کے ہیں۔ اس سے خود ظاہر ہے کہ رودرادیو اول ایک باجگذار راجہ تھا۔ کیونکہ یہ لقب صرف باجگذار راجہ ہی اپنے نام کے ساتھ استعمال کرتے تھے۔

مولوی غلام یزدانی صاحب ناظم آثار قدیمہ سرکار عالی نے اس بیان کی تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ:-

> اس کتبہ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ رودرادیو اول کسی راجہ کا باجگذار تھا گو بعد کے راجہ نے بھی اپنے آپ کو مہامنڈلیشور کے لقب سے ہمیشہ منسوب کیا ہے، حالانکہ وہ ایک خود مختار اور ذی اقتدار راجہ تھا۔

اس سے خود ظاہر ہے کہ یہ القاب صرف رواجی ہیں، ان کو اصلیت سے کوئی تعلق نہیں ہے، اور اس رودرادیو اول نے بھی بطور رواج عام کے اختیار کیا تھا۔

میجر ہیگ نے اس کتبہ کے علاوہ ایک اور تلنگی زبان کے کتبہ کا ذکر کیا ہے جس کی ترشوائی کتبہ اول الذکر کے بہت بعد کی ہے۔ یہ کتبہ شتاب خاں کی تعریف میں ہے جو پندرھویں صدی عیسوی کے اخیر زمانہ میں ورنگل کا صوبہ دار تھا۔ اس نے اپنے زمانہ صوبہ داری میں ہندؤں سے خوب راہ و رسم پیدا کی تھی جس کی وجہ سے کچھ دنوں کے لئے یہ تلنگانہ اور کھم میٹ کا خود مختار بادشاہ بھی بن گیا تھا۔ اس کو بہ قول میجر ہیگ کے مسٹر برگس نے ہندو سمجھا اور سیتاپتی کے نام سے یاد کیا ہے۔

قلعہ ورنگل اس کے بعد تاریخی حیثیت سے ورنگل کا مشہور قلعہ ہے جس کی بنیاد گنپتی دیو (۱۲۳۱ء تا ۱۲۶۱ء) نے رکھی تھی اس کا زمانہ تعمیر ۱۲۳۱ء تا ۱۲۹۴ء کا درمیانی زمانہ ہے۔ کیونکہ اسکی تکمیل رودرما دیوی (۱۲۵۶ء یا ۱۲۶۱ء تا ۱۲۹۴ء) کے زمانہ حکومت میں ہوئی تھی۔

یہ قلعہ مضبوطی اور استحکام کے اعتبار سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اور یہ دکن کے قلعوں میں ایسا ہی ممتاز ہے۔ جیسے گولکنڈہ اور بیجاپور کے قلعے مشہور ہیں جبکہ پہاڑ پر یہ تعمیر کیا گیا ہے، اس کی شکل کسی قدر بیضوی ہے۔ جس مقام پر اسکا انتہائی ارتفاع ہے اس کی بلندی سطح زمین سے تقریباً ۴۰۰ فٹ ہے۔

اس قلعہ میں دو فصیلیں ہیں، پہلی مٹی کی ہے، دوسری پتھر سے باندھی گئی ہے، اس کے اطراف میں ایک نہایت عمیق خندق ہے۔ جس کا عرض تقریباً ۱۵۰ فٹ اور عمق ۴۵ فٹ کے قریب ہے۔ یوں تو قلعہ کے تین حصار ہیں لیکن پہلا حصار زمانہ کی دستبرازیوں کے باعث باقی نہیں رہا۔ اس کے موہوم سے نقوش اگلی یادگار کے شاہد ہیں، اس کے متعلق مسٹر کاؤزنس کا خیال ہے کہ یہ حصار تقریباً ۴ میل کے حلقہ پر مشتمل تھا کیونکہ بقول ان کے ہنمکنڈہ کے جانب جنوب ایک سنگین دہلیز ملی ہے جس کا طول ۲۰ فٹ ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ یہ دہلیز اسی فصیل سے تعلق رکھتی ہے۔

ہمارے خیال میں یہ فصیل قلعہ کی فصیل میں شمار نہیں کی جاسکتی بلکہ اسکو شہر پناہ کی فصیل کہنا چاہئے اس لئے کہ سارے ہندوستان میں اتنا بڑا حصار کسی قلعہ میں نہیں پایا گیا ہے۔

قلعہ کی اندرونی فصیل جو پتھر کی ہے، اس میں چار دروازہ ہیں، شمال اور جنوب کے دروازے ہمیشہ بند رہتے ہیں، ان دروازوں کا طرز تعمیر بالکل عجیب واقع ہوا ہے۔ اس کے ہر دروازے کے اوپر شیر ببر کی مورت کندہ ہے۔ یہ ببر بھی بالکل نئی طرح کے ہیں۔ انکی نسبت ڈاکٹر سپنیٹ ماہر آثار قدیمہ کا خیال ہے کہ یہ ببر اشور یا اور بابل کے ببروں سے قریب قریب بہت مشابہت رکھتے ہیں۔

ان دروازوں کی دہلیز کے اندرونی سنگی ستونوں پر نہایت قدیم کتبہ کندہ ہیں جو استداد زمانہ کے باعث محو ہونے کے قریب ہو گئے ہیں۔

قلعہ کے حصار مختلف ناموں سے مشہور ہیں۔ بیرونی حصار بھومی کوٹ کہلاتا ہے۔ اندرونی پیداکوٹ کے نام سے منسوب ہے، ان دونوں حصاروں کا درمیانی رقبہ تقریباً ۴ میل کے مساوی ہے۔ گمان غالب ہے کہ اس حصہ میں پہلے زراعت ہوتی ہوگی کیونکہ اب بھی اس کے اکثر زرخیز مقامات اس امر کے شاہد ہیں۔

قلعہ کے بیرونی فصیل کے اطراف میں خندق حائل ہے اس لئے یہ غیر معمولی بلند دکھائی دیتی ہے۔ دراصل اسکی حقیقی بلندی سطح زمین سے تقریباً ۳۰ یا ۴۰ فٹ ہے۔ اس میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے نہایت نفیس برج ہیں انکا اندرونی اور بالائی حصہ زیادہ کشادہ ہے

یہ قلعہ جب مسلمان فاتحین کے ہاتھ آیا تو انہوں نے اس میں غیر معمولی توسیع کی۔ اسکے علاوہ اس میں نئی ایک نئی چیزوں کا اضافہ کیا بقول مولانا یزدانی کے اسمیں کی قدیم عمارتیں جو زمانہ ہنود میں تعمیر ہوئی تھیں وہ مسلمانوں کی معرکہ آرائیوں سے تباہ ہوگئیں۔ منہدمہ پتھر نہایت نفیس اور نقشی تھے، مسلمانوں کی جدید عمارات میں استعمال کئے گئے ہیں۔ جس کی وجہ سے اس کی قدیم فن تعمیر کے آثار مفقود ہو چلے ہیں۔

اس قلعہ کی قابل ذکر خصوصیات میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اوپر جانے والی ساری سیڑھیاں بالکل مستطیل واقع

ہوئی ہیں جو طول میں تقریباً ۲۰۰ فٹ کے قریب ہیں۔ شاید اس کے تعمیر کرنے سے انکا یہ منشا تھا کہ بیرونی حملوں سے ان کے ملکی اثرات پر جو اثر پڑتا تھا، اور جس کے باعث ان کو جانی اور مالی نقصانات برداشت کرنے پڑتے تھے اس کا اندیشہ جاتا رہے مگر اس پر اس قدر صدیاں گزرنے کے بعد بھی اس کی اصلی صورت میں کسی قسم کا فرق نہیں آیا۔ اب بھی نہایت اچھی حالت ہے۔

ابتدا میں یہ قلعہ راجگان کاکتیا کے زیر اثر تھا ان سے محمد تغلق (سنہ سنہ) نے ۱۳۲۳ء میں فتح کیا۔ مگر ان سے صلح ہوجانے پر پھر اس کو بطور خراج مسترد کر دیا۔ ۱۴۲۲ء میں یہ قلعہ بیدر کے شاہان بہمنیہ کے قبضہ میں تھا۔ ان سے سلاطین قطب شاہیہ کی عملداری میں آیا۔ ان کے بعد اسپر اورنگ زیب عالمگیر کا قبضہ ہوا۔ اب یہ حیدرآباد کے آصفیہ خاندان کی عملداری میں ہے۔

قلعہ کی دیول

قلعہ کی اندرونی یادگاروں سے ایک قدیم دیول ہے جس کو ہم سلسلہ کے لحاظ سے تیسرے دور میں شامل کرتے ہیں۔ یہ دیول گنپتی دیو مہاراج (۱۲۳۱ء تا ۱۲۶۱ء) نے تعمیر کی تھی۔ لیکن یہ ایسی عظیم الشان عمارت ہے کہ اوسکا ایک راجہ کے عہد حکومت میں تعمیر ہو جانا بالکل ناممکن تھا اس لئے یہ نامکمل حالت میں رہ گئی۔ اسکی خراب و خستہ حالت تباہ و بوسیدہ چھت منہدمہ ستون جواب یادگار زمانہ ہیں اون کے دیکھنے سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ یہ مندر طرز تعمیر کے اعتبار سے فن سنگ تراشی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ اگر یہ اپنی پہلی حالت میں موجود رہتا تو اسکا شمار تعمیری نقطۂ نظر سے تلنگانہ کا کیا بلکہ سارے دکن کی ہندو عمارت سے غیر معمولی درجہ رکھتا۔

اس دیول کے منہدمہ دروازوں کی نسبت مسٹر فرگوسن لکھتے ہیں کہ یہ دروازے سانچی کے دروازوں سے بالکل مشابہت رکھتے ہیں، جن کو شتکے سانکو احانا خاندان نے پہلی صدی عیسوی میں تعمیر کیا تھا۔ ان دروازوں کا طرز تعمیر بالکل بدھی پایا جاتا ہے، لیکن اس طرز کا استعمال کن دنوں سے شروع ہوا۔ اس نے یہیں نشوونما پائی اور بدھ مت کے ختم ہو جانے کے بعد بھی ایک زمانہ تک اس کا دکن میں عام رواج تھا۔ اس قسم کے دروازے اکثر ملک کے نواح میں اکثر پائے جاتے ہیں۔

ورنگل کے دروازے، حالانکہ سانچی کے دروازوں سے زیادہ مختلف الوضع نہیں ہیں، تاہم مشابہت ضرور رکھتے ہیں ہرچند قلعۂ ورنگل کے دروازے سانچی کے دروازوں سے ایک ہزار سال بعد بنائے گئے ہیں۔ لیکن ان کو غور سے دیکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ دروازے لکڑی کے سانچے کا نمونہ ہیں۔ اس قسم کے ستونوں کا رواج دکن میں آجتک موجود ہے۔ چنانچہ اس نوعیت کی ایک حاضر مثال راجہ صاحب گونڈی کا مکان ہے۔

ان دروازوں کے شمالی اور جنوبی حصہ کا درمیانی فصل ۴۷۰ فٹ ہے۔ اس کے مغربی اور مشرقی حصہ کو ۴۳۰ فٹ کی مسافت جدا کرتی ہے۔ اس طویل اور عریض مربع سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ یہ دیول کس قدر وسیع ہوگی!

جس حصہ میں اسکا سنگ بنیاد رکھا گیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ مندر جب تباہ ہوگیا تو اس وقت اس کے بہت سے اساس بھی تہ خاک پیوند ہو گئے۔ اور بہت سارے کتبے جنسے ان کی گذشتہ تاریخ کی ترتیب میں مدد ملتی تھی وہ سب اس حصہ میں محفوظ ہیں اگر

اس حصہ کو کھدوا لیا جائے تو عجب نہیں کہ ہمیں سے نہایت قدیم قدیم کتبے نکلیں گے۔ جس سے ان کے خاندان کی عظمت و امتیاز پر غیر معمولی روشنی پڑے گی۔ اور ان کے سلسلۂ نسب کا بھی حقیقی پتہ لگ جائے گا۔ اس کے علاوہ اور بہت سی ایسی چیزیں عالم وجود میں آئیں گی جن سے دنیا ابھی تک ناواقف ہے۔

قلعے کے بعض قدیم منادر — اس مندر کے سوا قلعہ میں اور بہت سی قدیم اور جدید دیولیں ہیں۔ ان میں کی بعض دیولیں تو نہایت قدیم ہیں۔ ان کا سنہ تعمیر یقیناً بڑی دیول سے بہت پہلے کا ہے۔ لیکن یہ فن تعمیر کی ابتدائی کڑی ہونے کے لحاظ سے نہایت مبتذل واقع ہوئی ہیں۔ اور فنی اعتبار سے ان کا کوئی خاص درجہ نہیں ہے۔ البتہ قدیم کتبات جو ان پر کندہ ہیں۔ ان سے انکی شان ایک حد تک ارفع و بلند ہو جاتی ہے۔

سمبھوگدی "مندر" — ان مندروں کے سامنے ایک مندر واقع ہے، جس کو سمبھوگدی کا مندر کہتے ہیں۔ اس کے صحن میں پتھر کے تین ہاتھی ہیں ان میں کا ایک ہاتھی کسی قدر مجروح ہو گیا ہے۔ ان کی نسبت ہمارا خیال ہے کہ یہ ہاتھی عجب نہیں کہ بڑے مندر کے لئے بنائے گئے، لیکن جب یہ مندر تباہ ہونے کے قریب ہو گیا تو ان کو اس کی اصلی جگہ سے علیحدہ کر کے یہاں رکھدیا گیا ہے۔

ونکاٹیساگدی "مندر" — اسی قبیل سے ایک اور مندر ہے جس کو ونکاٹیساگدی کہتے ہیں۔ اس میں نہایت نفیس صناعی کی گئی ہے۔ وہ یہ طریقۂ کندیدگی کے اعتبار سے بڑا درجہ رکھتا ہے۔ کیونکہ اس کے اندرونی استادہ ستون اس نزاکت سے تراش کر نصب کئے گئے ہیں کہ انہیں جس پہلو سے دیکھا جائے، ایک ہی سیدھ میں دکھائی دیتے ہیں۔

شتاب خاں کا دربار ہال — اس مندر کے دروازے سے بالکل قریب میں ایک پٹھان طرز کی عمارت ہے۔ جو شتاب خاں کے دربار ہال کے نام سے مشہور ہے۔ یہ عمارت بھی نامکمل حالت میں ہے۔

چیتی مندر — اس کے بالکل سامنے ایک دیول ہے جو کئی ستونوں پر قائم ہے۔ اس دیول کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ اس کے سارے ستون خطوط متوازی کی شکل میں ہیں۔ یہ ستون اس دیدہ ریزی اور کاریگری سے اپنی اپنی جگہ نصب کئے گئے ہیں کہ باوجود اس پر سات سو سال کے طویل عرصہ کے گذرنے کے بعد بھی انکی استقامت میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں آیا۔ اس کے ایک ستون پر ایک کتبہ کندہ ہے جس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہ دیول ۱۱۳۵ء میں رودرا جوتی نے اس یادگار میں تعمیر کی تھی جو اسکو راجہ نگا... کے مقابلہ میں فتح حاصل ہوئی تھی۔

ان آثار قدیمہ کے علاوہ اس میں اور بہت سی یادگاریں محفوظ ہیں جو جدید ہونے کی وجہ سے نظر انداز کی گئی ہیں۔ ان میں سے بعض ایسی بھی ہیں جو قدیم ہیں مگر انکی کوئی تحقیق نہ ہو سکی۔

مسجد — ان منادر کے جنوب میں ایک مسجد بھی واقع ہے۔ جس کو مسلمانوں نے قلعہ فتح کرنے کے بعد تعمیر کیا تھا۔

انبار خانہ اور رسد خانہ — قلعہ کے شمال میں بہت سے بوسیدہ مکانات ہیں جنکی نسبت ماہرین آثار کا خیال ہے کہ یہ راجگان ورنگل...

انبار خانے اور رسد خانے کے کمرے تھے۔

ان مختصر آثار کے علاوہ تلنگانہ کے آثار قدیمہ میں اور کوئی قابل ذکر چیز نہیں ہے۔

کتبہ

جو ہنمکنڈے کے مشہور ہزار ستونی دیوال پر (سنہ ۱۱۶۲ء و سنہ ۱۱۶۳ء کا) سنسکرت زبان میں کندہ ہے۔[1]

خدا ہمارے ملک کو فتح و کامرانی سرسبزی و شادابی عطا کرے۔ ارنگل دیوار مہا منڈلیسور اجیسے ذی اقتدار راجہ کا زمانہ حکومت شوکت و دبدبہ اور فخر و سربلندی سے لبریز تھا اور ہنمکنڈہ جیسے بہترین شہر پر نہایت جاہ و جلال کے ساتھ حکمران تھا۔ مہا منڈلیسور کا بخت پاینہ ستارہ تھا۔ اس کے سارے افعال مالک کی خاطر تھے۔ وہ شرم و مروت کا مجسم پتلا تھا۔ طرز جہانبانی کو اسکی شیریں بیانی نے چار چاند لگا دیئے تھے

وہ دورہ[2] ۱۰۸۴ ساکہ سال سک میں لیسویسری دشنودیوا اور سری دیوامک کے نام سے اپنے نام کا کتبہ لگایا۔

میں ہری کی تعریف میں رطب اللسان ہوں جب اس نے کرہ زمین کو اوپر کی طرف اٹھایا تو سات سمندر کی موجیں اٹھ اٹھ کر اوس پر یورش کرنے لگیں جو بمشکل تمام اس کے پاؤں کے انگوٹھوں کے ناخن تک پہونچ سکے۔ اور تینوں عالم پانی کے ایک قطرہ کی طرح اسکی جھونپڑی میں سما گئے۔ یہ جھونپڑی اس کے دانت کا صرف ایک گوشہ تھی۔ اے سری ہر پیارے مرے حال پر لطف و کرم کی نظر کر۔ تو ان شہد کی مکھیوں کا نشیمن ہے جو تیرے پائین کے عطر بیز پھولوں کی کشش سے کھنچی ہوئی پاس چلی آتی ہیں۔ خدا کرے سرسوتی علم کی دیوی مرے دل میں آبسے جس کو میں اپنی ماں کے برابر سمجھتا ہوں۔ وہ دودھ کی حلاوت میں بلند مدارج پر پہونچائی تی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سرچشمہ علم سرسوتی چاند کے نور سے گوندھی ہوئی ہے یا ہلکے ہلکے صندلی رنگ کا ایک مجسمہ ہے۔ میں بینا اچتند دیا سری ارجیس وردا کشتیا کا بیٹا ہوں جو بہرت راجہ کے خاندان کی عزت کا بڑھانے والا تھا۔ اور سرو تا کے رسوم کو نہایت توقیر کے ساتھ ادا کیا کرتا تھا۔ وہ دنیا کا بہترین آدمی تھا۔

نہری ہوانا ملا کا کیتیا نسل کا ایک نعمتدار راجہ تھا۔ جس سے ذی بروت دشمنوں کی بیویوں کا سہاگ جاتا رہتا تھا۔ اسکے نام سے بڑے بڑے سرکشوں کے دل ہل جایا کرتے تھے۔ مستحق لوگ اس کے فیض و کرم سے مستفید ہوتے تھے۔ خوش گلو اور

---

[1] اس کتبہ کا ہم نے انڈین انٹی کویری جلد ۱۱ صفحہ ۱۹ سے خلاصہ کیا ہے۔
[2] یہ عبارت بطور جملہ معترضہ کے آئی ہے۔

حسین نازک اندام نازنین اس کی دل و جان سے گرویدہ ہوتی تھیں۔

اس کے بیٹے پرولے نے بڑی ناموری حاصل کی تھی اور ایک لمحہ میں اس نے تیلاپا دوا جیسے سپاہی منش راجہ کو جو چلوکیا خاندان کی ناک تھا ایک معرکہ میں قید کر لیا، اس نے گووندراجہ پر بھی چڑھائی کی اور اسے دم بھر میں اسیر کر لیا۔ اور پھر دونوں کو اپنی شاہانہ فیاضی سے رہا کر دیا۔ اسکی سلطنت آدیوار راجہ کو دے دی۔ بیشرم (دابا جگدار) گووند کے ہاتھوں شکست کھا کر اپنے شہر کی طرف فرار ہو گیا جس کے بعد پرولے نے پھر اس جنگ کے لئے مقابلہ کو طلب لیا۔ جگدیوار جیسے ذی اقتدار راجہ کی شخصیت کو اس نے معرض زوال میں ڈال دیا۔ اور اسکی ساری قوتیں سلب کر لیں۔ اس کے بعد پادانی اس کی بیوی بنی۔ جس کے دلفریب حسن کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ اس کے بطن سے دنیا کا مشہور بیٹے سری رودر ادیوار پیدا ہوا جس کا تعلق سری کرشنا سے وابستہ ہے۔

اس نے آن کی آن میں دوٹا کا سارا زور توڑ ڈالا، جو بڑا قد آور صاحب قوت اور شہسوار تھا۔ اس کے بعد راجہ رودرا نے کئی بہتر سے بہتر شہر اپنی راجدھانی میں شامل کئے۔

ظاہر میں سری رودر کی تعریف کرتا ہونگا جو میدا اس کی شرارتوں کو کچل سکتا ہے۔ اور جو بلند اور اولوالعزم ارادوں کا اور مشوروں کا علمبردار ہے۔ جس کی تاب اوس کے دشمن نہیں لا سکتے۔ اس نے ظفر مند میلی گیدوا جیسے مغرور شخص کی شان و آبرو کو خاک میں ملایا۔ سری پلوا سا جیسے زبردست راجہ کی ساری دولت سمیٹ لی۔ گو کرانا گو یہ ایک کم اصل انسان تھا۔ لیکن وہ تمام دنیا کا ہیرو بن بیٹھا تھا۔ اس کو بھیما جیسی خوفناک ہستی نے موت کے گھاٹ اتارا۔ اور پھر وہ چمکتے ہوئے بلبل کی طرح دنیا سے سدھارا۔ انہی دنوں میں راجہ چیدو دیا نے بھی عالم دیوانگی میں راہ لی۔ اور تیلپا بھی سری رودرا دیوار کے رعب و دہشت سے چل بسا۔ بھیما جیسے بدبخت نے اس کی جگہ سنبھالی۔ یہ اپنی حکومت کے نشہ میں چور تھا، اور سری رودرا جیسے بہادر کے مقابلہ میں خم ٹھوکنے کی جرأت کر بیٹھا۔ رودر نے بھیما کی شیخیاں سنیں تو اس کا خون معرکہ آرائی اور فتحمندی کے جوش میں ابلنے لگا۔ چنانچہ ایک لشکر جرار کے ساتھ روانہ ہوا۔

اس کی ان شاندار تیاریوں کو دیکھ کر بڑے بڑے مخالف راجہ کانپنے لگے۔ سب پہلے راجہ نے شہر دہمن نگری کو اپنے قہر و غضب کا نشانہ بنایا۔ بھیما نے راجہ کی اس شان جلالی کو دیکھا تو ہوش جاتے رہے اور سب چھوڑ چھاڑ کر بڑی بے حیائی کے ساتھ اپنے بھائی، ماں، بہن، بیوی، کو لیکر جنگل کی راہ لی، راجہ نے بھی اس کا تعاقب کیا اور چیدو دیا کے شہر کو آگ لگا دی، اور بڑے بڑے جنگلوں کا صفایا کر ڈالا، جو اس کی راہ میں حائل ہوئے پھر اس نے ایک عظیم الشان اور عجیب و غریب تالاب شہر کے بیچوں بیچ بنایا۔

بھیما اور دوسرے راجہ جو کانچی اور ونڈھیا کے درمیان رہتے تھے۔ جو سلطنت کے غرور میں اپنی اپنی جگہ خدا

بنے بیٹھے تھے۔ لیکن جب ان کے مزاج درست ہو گئے، اور ہوش ٹھکانے لگے تو رودرا کے دامن میں پناہ گزیں ہوئے۔

اس کا دار الحکومت ماکنڈہ شہر کندریا کی طرح راحت و آرام کا محور تھا، اور اس کا ہر گوشہ خندری کی طرح جشنو اور وشنو کی دیولوں سے آراستہ و پیراستہ ہے۔

یہاں پر نازک اندام اور پری پیکر جادو بھری نینوں والی عورتوں کا ایک میلا لگا رہتا ہے۔ جو نہایت ناز و انداز کے ساتھ مسکراتی ہوئی اپنی بھری بھری چھاتیوں کو سنبھال سنبھال کر چلتی ہیں، برہمنوں کے مکانوں میں نوجوان طالبعلموں کے ساتھ سینے نے طوطے بھی ہیں۔ جو ان کے ہم آہنگ ہو کر وید کی رٹ لگاتے ہیں۔

سری رودرا کے گھوڑے آسمان پر دھاوے نہیں کرتے۔ کیونکہ یہ وہ مقام ہے جہاں وشنو کے قدم بڑھے تھے۔ نہ وہ اپنی ٹاپوں سے زمین کو پامال کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ ان کے نزدیک ایک مقدس گائے کا رتبہ رکھتی ہے۔ لیکن گھوڑوں کی یہ فوج غنیم کے حق میں ایک بلائے ناگہانی ہے۔ اس کے گھوڑے مشہور و معروف خصائل سے متصف ہیں۔ بڑے چھبیلے، برق رفتار اور انتہا کے بار بردار ہیں ان کی عمر بھی خاصی دراز ہوتی ہے۔ رفتار کی پانچوں قسموں میں خوب طاق ہیں۔

اس کی قلمرو شرق میں دریائے شور تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس کی قوت اقتدار کا سکہ تمام جنوبی حصہ میں یعنے [illegible] تک رواں ہے۔ اس کے حدود کے ایک جانب کٹک ہے۔ دوسری جانب تمام مغربی ممالک جانب شمال ملیاونتا کے پہاڑ جو اپنی ناہموار بلندیوں کی دلفریبی میں مشہور ہیں۔

راجہ رودر دیو تے، جس کی سب عزت و تکریم کرتے ہیں۔ سری مہیسار ادی اور سورنی جیسے دیوتاؤں کی پرستش کیلئے ایک عظیم الشان قبضہ متی جور دولہ مستقل طور پر وقف کر دیا۔

ماخذ

(۱) انڈین انٹی کوری (جنرل) . . . . جلد (۱۰) و (۱۱)

(۲) جنرل دکن ارکیولوجیکل سوسائٹی آف حیدر آباد۔ بابتہ ۱۹۱۶ء

(۳) لینڈ مارک آف دکن . . . . مصنفہ لفٹنٹ میجر ہیگ مطبوعہ ۱۹۱۷ء

(۴) ہسٹاریکل ڈسکرپٹیو اسکیچ آف دی نظام ڈومینس . . . . . . مولفہ عماد الملک بہادر طبع قدیم۔

(۵) تاریخ قادری . . . . مصنفہ منشی قادر خاں بیدری سنہ تصنیف ۱۲۴۹ فصلی

(۶) تاریخ قلمروئے نظام . . . . مترجمہ مولوی شمس الدین صاحب نجم

(۷) گزیٹیر ممالک محروسہ سرکار عالی مرتبہ مہدی خاں صاحب مطبوعہ ۱۹۰۹ء

(۸) امپیریل گزیٹیر آف انڈیا .... جلد ۴

(۹) واقعات بیجاپور حصہ سوم .... مصنفہ مولوی بشیر احمد صاحب مطبوعہ ۱۹۱۵ء

(۱۰) ہندوستان کا فن تعمیر .... از فرگوسن　جلد (۱)

(۱۱) جنرل بنگال رائل ایشیاٹک سوسائٹی .... جلد (۷) صفحہ (۹۰۱)

(۱۲) جنرل بمبئی رائل ایشیاٹک سوسائٹی .... جلد (۱۰) صفحہ (۴۶)

(۱۳) رپورٹ مغربی تعمیرات ہندوستان .... از مسٹر کاونس بابتہ ۹۵-۱۸۹۴ء

(۱۴) تمدن ہند .... مترجمہ ڈاکٹر سید علی بلگرامی مطبوعہ ۱۹۱۳ء

(۱۵) پرتاپ چرترا (تلنگی) .... قلمی

(۱۶) رپورٹ آثار قدیمہ سرکار عالی .... مرتبہ مولوی غلام یزدانی صاحب

ان کتابوں کے سوا ذیل کے رسایل اور کتابوں سے بھی مجھے استفادہ کیا ہے۔

"رسالہ نمائش حیدرآباد بابتہ اگست ۱۹۲۳ء، اخبار ریاست دہلی جلد ۵ نمبر ۶ بابتہ ستمبر وہسٹری آف میڈیول انڈیا صفحہ ۵۲، تاریخ جہانگیر مولفہ سورج نرائن صاحب صفحہ ۵۶"

سید احمد اللہ قادری - ایم آر اے ایس (لندن)

شکستِ عہد

پرناچندر پڑھنے کو یوں تو بی۔اے میں پڑھتے تھے لیکن انگریزی تعلیم اور ایک انگریزی تعلیم پر کیا منحصر تھا نئی روشنی اور مغربی تمدن کی کل چیزوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یہ صرف خاندان اور سب سے بڑھکر انکی ماں کا شدید اصرار تھا کہ وہ اپنے مزاج اور طبیعت کے خلاف کالج میں پڑھ رہے تھے۔ ورنہ واقعات تو یوں بتاتے ہیں کہ وہ سینٹ زیویر کالج کلکتہ کی شاندار عمارت میں پڑھنے کے بجائے کسی پنڈت کے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے میں زمین پر بیٹھکر مذہبی کتب کا درس لیتے رہتے۔ وہ سنسکرت زبان کے عاشق تھے۔ اور ہرچند کالج کے مشاغل سے بہت ہی کم فرصت ملتی تاہم کوئی نہ کوئی سنسکرت کی کتاب یا پران کے زیر مطالعہ رہا کرتی۔ پوجا پاٹ اور اپنے مذہب کے احکام کی تعمیل وہ بہت ہی خلوص اور انہماک سے انجام دیا کرتے۔ ان کے دوستوں کا بیان ہے کہ وہ بعض وقت جاڑے کے ایام میں دو دو بجے شب کے وقت گنگا جی میں اشنان کے لئے گئے ہیں۔ انکی وضع بالکل قدیمانہ تھی۔ موٹا کھاتے موٹا پہنتے اور نہایت ہی سادہ بے تکلف زندگی بسر کیا کرتے۔ وہ نئی روشنی کے دشمن تھے اور ان کے خیال میں ملک کی تباہی و بربادی کا اصل راز انگریزی تعلیم کے اندر مضمر تھا وہ جس وقت راجہ رامچندر جی اور سری کرشن جی مہاراج کا زمانہ یاد کرتے تو انکی چھاتی پر ایک سانپ سا لوٹ جاتا۔ دل میں کہتے۔ وہ زمانہ تو خیر آنا مشکل ہے۔ نہ ویسے لوگ پیدا ہونگے۔ نہ انکی تعلیم پر کوئی چلنے والا ہوگا۔ آج سے سو دو سو سال قبل ہی کی حالت کا مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ ہماری ذہنیت میں کتنی تبدیلی پیدا ہو چکی ہے۔ انکا خیال تھا کہ ہماری مذہبی روح اور ہماری روحانی قوت محض انگریزی تعلیم اور مغربی تمدن کی بدولت دن بدن فنا ہوتی جا رہی ہے۔

پرناچندر اکثر کہتے کہ ہندوستان کی بھلائی نہ ترک موالات سے ہو سکتی ہے اور نہ شدھی و سنگھٹن سے۔ نہ کانگریس اور کانفرنس سے کوئی مفید نتیجہ نکالا جا سکتا ہے اور نہ ہندو سبھا کی کوشش سے تاوقتیکہ نئی روشنی اور جدید تہذیب کا قطعی طور پر قلع قمع نہ کر دیا جائے۔ جبتک ہماری ذہنیت میں تبدیلی پیدا نہ ہوگی۔ جبتک ہم انکی تعلیم پر عمل پیرا نہ ہونگے جب تک ہم میں وہی قدیمی روح پیدا نہ ہوگی، ان تحریکوں سے سوائے ذلت و پریشانی اور آپس میں نفرت و عناد کا جذبہ پیدا ہونے کے، کوئی مفید اور عملی نتیجہ ظاہر نہیں ہو سکتا

بھارت کی سادہ زندگی انہیں بہت مرغوب تھی۔ جب کبھی وہ مکان آتے اور سیدھے سادے بھولے بھالے کاشتکاروں کے جھرمٹ میں بیٹھکر ہمکلام ہوتے تو انہیں ایک روحانی مسرت حاصل ہوتی جس کا بیان مشکل ہے۔ کلکتہ کی چہل پہل اور گہما گہمی سے کون ناواقف ہے؟ ٹ لہوری اور چورنگی کے دلچسپ مناظر کس کو محو حیرت نہیں بناتے! لیکن پرناچندر کی آنکھوں میں ان چیزوں کی کوئی وقعت نہ تھی۔ وہ ہوسٹل کی چار دیواری سے شاذ و نادر ہی باہر آتے۔ انہیں سوائے کالج جانے، ہوسٹل میں رہنے، اور مذہبی کتب کا مطالعہ کرنے کے کوئی دوسرا مشغلہ ہی نہ تھا۔ اس لئے نہیں کہ انہیں آبادی سے نفرت تھی یا وہ اپنے ابنائے جنس سے ملنا ناپسند کرتے تھے بلکہ اس لئے کہ انہیں ان تمام باتوں میں تکلف اور تصنع کا رنگ نظر آتا تھا۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ مذہبی تعلیم ان باتوں کے سراسر منافی تھی۔

یوں تو زمانہ کی زبان کون پکڑ سکتا ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے حوصلہ کے موجب پرناچند کی نسبت جو چاہتا تھا کہتا تھا۔ لیکن اسمیں شک نہیں کہ وہ اپنے اصول کے بہت پکے، مذہب کے بہت پابند اور انسانی اوصاف کے لحاظ سے بہت ہی سچے اور راست باز انسان تھے

(۲)

دسہرا اور پوجا کی تعطیل تھی۔ کالج ایک ماہ کے لئے بند تھا کالج کے طلبہ سیر و تفریح کی غرض سے مختلف مقامات میں جانیکی تیاریاں کرتے تھے۔ لیکن پرناچندر نے ابھی تک کہیں جانیکا ارادہ نہیں کیا تھا۔ وہ ہوسٹل ہی میں رہے اور نصف سے زیادہ تعطیل تن تنہا ہوسٹل ہی میں گذار دی۔ ان کے وقت کا زیادہ حصہ مذہبی و دینی کتب کے مطالعہ میں بسر ہوتا تھا اور وہ ہمیشہ اس سوچ میں رہتے تھے کہ ہم کیا تھے اور اب ہماری کیا حالت ہو گئی ہے۔ جب اختتام تعطیل کو بہت کم دن باقی رہ گئے تو انہوں نے مکان جانے کا ارادہ کیا اور شام کی ایکسپرس سے سوار ہو کر دوسرے دن اپنی بستی گونڈھ میں پہونچ گئے۔

(۳)

صبح کا وقت تھا۔ پرناچندر پوجا پاٹ سے فارغ ہو کر کسی ہفتہ وار کا ایک اخبار اٹھا کر دیکھ رہے تھے۔ ان کی ماں مسکراتی ہوئی کمرہ میں داخل ہوئیں۔ وہ ایک بیوہ عورت تھیں۔ پرناچندر کے پتا عرصہ ہوا مر چکے تھے۔ انہوں نے کمرہ میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "پرنا! میں تم سے ایک بہت ضروری بات کہنے آئی ہوں۔ جہاں تک ممکن ہو جلد جواب دینا۔ تم ساری تعطیل ختم کر کے تو یہاں آئے ہو۔"

پرناچندر دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر مودبانہ کھڑے ہو گئے۔ وہ اپنی ماں کی بڑی عزت کرتے تھے۔ سر جھکاتے ہوئے بولے۔ "جی ہاں۔ کیا بتاؤں۔ کالج کے مشاغل سے بہت کم فرصت ملتی ہے۔ کیا کوئی بہت ضروری کام ہے"

"ہاں بہت ضروری" ماں نے چوکی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اتنا ضروری کہ تمہیں آج ہی بلکہ اسی وقت جواب دینا ہوگا"

ماں کو ہنسی آگئی۔ پرناچندر بھی مسکراتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئے

تھوڑی دیر کے بعد ماں بولیں۔ "پرنا! میری خواہش ہے اور دلی خواہش ہے کہ اب میں تمہاری دلھن بیاہ کر لاؤں۔ دنیا ہنستی ہے کہ ابھی تک لڑکے کا بیاہ نہ کیا۔ میں، سچ پوچھو، تو شرم سے گڑی جاتی ہوں۔ بات بھی سچ ہے۔ جوالا تم سے چھوٹا ہے۔ ڈیڑھ دو سال چھوٹا ہوگا۔ جیت میں پیدا ہوا تھا۔ ابھی اٹھوارھواں لگے گا۔ ایشور کی دیا سے اس کی شادی بھی ہو گئی۔ ایک بچہ بھی پیدا ہوا۔ اور تم ہو کہ شادی کے نام سے کوسوں بھاگتے ہو۔ آخر میں کب تک جیتی رہونگی۔ میری زندگی میں تمہارا بیاہ نہ ہوا تو آخر کب ہوگا؟ اب تو میں تمہاری ایک نہ سنوں گی۔ اسی کرسمس کی تعطیل میں میں بیاہ کا انتظام کرتی ہوں۔ جدو بابو وکیل کو تو تم جانتے ہی ہو۔ ان کی بیوی کل آئی تھیں۔ راجکماری کی بابت ذکر آیا۔ مجھے بھی بے حد پسند ہے۔ ایسی اچھی لڑکی میرے خیال میں ملنا بہت مشکل ہے۔ دیکھو اگر تم نے اس مرتبہ میری بات نہ مانی تو مجھے بہت صدمہ ہوگا۔

پرناچندر شادی کے مخالف تھے۔ کئی پیغام اب تک مسترد کر چکے تھے۔ انکا شادی کرنے کا ارادہ نہ تھا۔ اور وہ کچھ عجیب و غریب قسم کی دلیل اس کے متعلق رکھتے تھے۔ عموماً لوگ طالب علمی کے زمانہ میں شادی کرنا ناپسند کرتے ہیں۔ چونکہ تجربہ نے ابتک یہی بات

بتائی ہے کہ شادی کے بعد تعلیم جاری رکھنا بہت دشوار طلب امر ہے۔ لیکن پرناچندر کے پاس یہ بھی دلیل نہ تھی۔ وہ اس لئے شادی کے مخالف نہ تھے کہ وہ طالبعلم تھے اور شادی کے بعد تعلیم پر اسکا ناخوشگوار اثر پڑتا ہے۔ وہ اس لئے بھی شادی کے مخالف نہ تھے کہ جب تک وہ چار پیسے اپنی قوت بازو سے حاصل کرنے کے لائق نہ ہوجائیں وہ ازدواجی زندگی میں نہیں آسکتے۔ کچھ یہ بات بھی نہ تھی کہ شادی کے بعد فکر معیشت کے تردداتکا انہیں سامنا کرنا پڑتا۔ وجہ اگر کوئی تھی تو یہ اور جیسا کہ انہوں نے اپنے بعض بے تکلف دوستوں سے بیان بھی کیا کہ موجودہ زمانہ میں جیسی بیوی ملنی چاہئے ویسی ملنی مشکل ہے۔ انہوں نے مذہبی کتب میں دیکھا تھا کہ اگلے زمانہ کی بیویاں کس درجہ اطاعت شعار کتنی مطیع اور کیسی فرمانبردار ہوتی تھیں۔ بخلاف اس کے آجکل کے مشاہدات انہیں بتاتے تھے کہ بیوی شوہر کے لئے نہیں بلکہ شوہر دراصل بیوی کے لئے ہوتا ہے۔ شوہر اگر بیوی کی اطاعت شعاری اور فرمانبرداری نہ کرے تو ہر جگہ اور ہر سوسائٹی میں بدنام و مطعون ہوتا ہے۔ وہ کہتے کہ آجکل کی بیویاں عموماً پڑھی لکھی ہوتی ہیں اور اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کھانا پکانا، کوٹنا پیسنا تو ایک علیحدہ چیز رہی، انہیں اپنے شوہر کو ایک گلاس پانی کا بھی دینا گراں گذرتا ہے۔ وہ اخبارات پڑھتی ہیں۔ انہیں عشقیہ ناولوں سے دلچسپی ہوتی ہے۔ وہ بناؤ سنگار میں اپنے وقت کا زیادہ حصہ صرف کرتی ہیں۔ اور ان کے دل میں شوہر کی عزت ایک ستم زدہ عاشق سے زیادہ نہیں ہوا کرتی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ مساوات برتنا چاہتی ہیں اور اگر انکے احکام کی تعمیل میں ذرہ برابر بھی بے عنوانی ہو تو پھر مرد کا انکے سامنے "سراسر تقصیر" ہو کر رہ جانا ناگزیر ہے۔

یہی خیالات تھے جنکی بناء پر پرناچندر نے عرصہ ہوا یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ صنف نازک میں سے کسی فرد کو بھی اپنی زندگی کا شریک نہ بنائیں گے۔ لیکن بالآخر لوگوں کا اتنا شدید اور پیہم اصرار ہوا کہ انہیں اپنے فیصلہ میں کچھ ترمیم کرنی پڑی۔ انہوں نے سوچ لیا تھا اور یہ فیصلہ انکا اب بالکل قطعی تھا کہ اگر آیندہ شادی کے لئے انہیں مجبور کیا گیا تو وہ اپنی رضامندی ظاہر تو کر دیں گے۔ لیکن "عورت" کا انتخاب خود انکے ذمہ ہوگا۔

اتفاق یہ کہ پوجا کی تعطیل کے دو چار ہی دن قبل انہوں نے ہوسٹل کے بعض لڑکوں سے بھی اپنے خیالات کا اظہار کر دیا تھا کہ اول تو حتی الامکان وہ شادی ہی نہ کریں گے۔ اور اگر اسکا کبھی موقع آیا بھی تو ان کی نظر انتخاب اس عورت کی طرف جائیگی جو ظاہری و جسمانی ساخت کے لحاظ سے انتہائی بدقسمت عورت کہی جا سکے۔ یہ بات انکے خیال میں اچھی طرح جم گئی تھی کہ حسن ہی ایک وہ شئے ہے جس پر عورت کے سارے طلسم کا دارومدار ہے۔

پرناچندر کی اس عجیب و غریب ذہنیت کو سن کر بعض لڑکوں نے انکا مذاق بھی اڑایا اور بعضوں نے کہا کہ صاحب کہنے اور کرنے میں بڑا فرق ہے۔ اس وقت کہہ لیجئے لیکن جب موقع آئے گا تو یہ ساری باتیں بھول جائیے گا۔ پرناچندر نے اسکا اور کچھ تو نہ دیا صرف اتنا کہکر خاموش ہوگئے کہ آپ مانیں چاہے نہ مانیں لیکن کم از کم میں تو اپنے آپ کو اپنے ارادہ میں راسخ، اور اپنے "عہد" میں پختہ سمجھتا ہوں۔

الغرض یہ تھے وہ خیالات جو پرناچندر اپنی آیندہ زندگی کی نسبت رکھتے تھے۔ آجتک تو ان کی ماں نے دوست احباب کے ذریعہ سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس مرتبہ جب انہوں نے خود اپنی زبان سے اتنی آزادی و بیباکی کے ساتھ گفتگو کی تو پرناچندر سوائے "ہاں" کے نہیں کہنے کی جرات نہ کر سکے۔ انہوں نے کہا "میں آپ کے حکم کی تعمیل کے لئے ہر وقت مستعد ہوں لیکن نہیں معلوم جس لڑکی کا آپ

ذکر کر رہی ہیں اسے کبھی آپ نے دیکھا بھی ہے یا نہیں؟" ماں کے لئے پرناچندر کی رضامندی بالکل غیر متوقع اور خلاف امید تھی۔ انہوں نے خوشی کے لہجہ میں جواب دیا "نہیں میں نے بذات خود تو نہیں دیکھا لیکن سنتی ہوں بہت خوبصورت لڑکی ہے۔ ۱۳، ۱۴ سال کا سن ہے پڑھی لکھی، سلیقہ مند، شگفتہ صورت، جب دیکھو یہی معلوم ہوتا ہے مسکرا رہی ہے۔"

کم سن! خوبصورت!! پڑھی لکھی!!! شگفتہ صورت!!!! پرناچندر کانپ اٹھے۔ ہر چند وہ اپنی ماں کی بڑی عزت کرتے تھے۔ لیکن اس وقت انہوں نے آزادی سے کہہ دیا کہ میں تو ایک ایسی لڑکی چاہتا ہوں جو ان اوصاف کے بالکل برعکس ہو۔ میں جدو بابو کے ہاں شادی نہیں کر سکتا آپ انکی بیوی سے کہہ دیجئے۔

"تو کیا تمہارا یہ مطلب ہے کہ تم ایک بدصورت اور جاہل لڑکی چاہتے ہو؟" ان کی ماں نے حیرت و استعجاب کے لہجہ میں پوچھا۔

"ہاں" انہوں نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا "میں ایک حسین اور خوبصورت لڑکی سے شادی کرنے کے بالکل مخالف ہوں اور مجھے امید ہے کہ آپ بھی میری رائے کے موافق ہونگی۔"

"میں! میں کیوں ہونے لگی" ان کی ماں نے حالت اضطراب میں کہا "آخر تمہارا کیا مطلب ہے۔ تم صاف صاف کیوں نہیں کہتے"

پرناچندر نے اختصار کے ساتھ اپنی دلیل پیش کی۔ ماں نے خیال کیا اس وقت گفتگو کا ملتوی رکھنا مناسب ہے۔ اور یہ کہتی ہوئی باہر چلی گئیں کہ "اچھا کم از کم تم شادی کے لئے تو راضی ہوگئے۔ جدو بابو کے یہاں نہ سہی۔ کہیں اور سہی۔"

(۴)

بابو جدونندن سہائے کنگ پور ضلع بردوان کے ایک مشہور و معروف وکیل تھے۔ کلکتہ ہائی کورٹ میں پریکٹس کرتے تھے۔ انکی آمدنی تین چار ہزار روپے ماہانہ سے کم نہ تھی۔ خاندانی آدمی تھے۔ موروثی جائداد بھی اچھی تھی۔ ان کے صرف ایک اولاد راجکماری تھی جو ماں باپ کی آنکھوں کا تارا تھی۔ راجکماری کا تیرھواں سال تھا۔ متعدد جگہوں سے شادی کے پیغامات آرہے تھے۔ لیکن جدو بابو کی نظر میں سوائے پرناچندر کے دوسرا نہ جچتا تھا۔ پرناچندر کے والد اور جدو بابو ہم جماعت تھے۔ اور خاندانی مراسم ایک زمانۂ دراز سے چلے آتے تھے۔ پرناچندر کے والد کے مرنے کے بعد بھی جدو بابو نے اپنی وضع کو اسی طرح نباہا اور اپنے اوضاع و اطوار میں کسی قسم کا بھی فرق نہ آنے دیا۔ پرناچندر کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے اور ہمیشہ سے انکی پسندیدہ اطوار کے ثناخواں تھے۔ انکی سادگی اور مذہبیات سے دلچسپی انہیں اتنی پسند تھی کہ انکا خیال تھا کہ راجکماری کے لئے اگر کوئی بہترین رفیق زندگی مل سکتا ہے تو وہ پرناچندر ہیں۔

پرناچندر نے جب اپنی ماں سے صاف صاف انکار کر دیا کہ وہ جدونندن بابو کے ہاں محض اس لئے شادی کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ وہ ایک بدشکل اور بدصورت لڑکی چاہتے ہیں تو انکی ماں کو سخت پریشانی لاحق ہوئی۔ پرناچندر کا کالج کھل گیا تھا۔ وہ تو کلکتہ چلے گئے۔ لیکن غریب ماں کو بیحد تشویش تھی کہ آخر وہ جدونندن بابو کی بیوی کو کیا جواب دیں گی۔ چونکہ وہ ان سے یہ کہنا نہیں چاہتی تھیں کہ پرناچندر کچھ ایسی عجیب و غریب خواہش رکھتا ہے۔ اسی طرح آٹھ دن گزر گئے کہ یکایک جدو بابو کی بیوی پھر آموجود ہوئیں۔ تھوڑی دیر تک تو ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد انہوں نے پھر وہی گفتگو شروع کی اور پوچھا کہ پرناچندر سے انہوں نے اس کا ذکر کیا یا نہیں؟ پرناچندر کی ماں اول تو

کچھ سراسیمہ ہوئیں لیکن آخر انہوں نے مناسب سمجھا کہ واقعہ کی اصل حالت سے انہیں من و عن آگاہ کر دیا جائے۔ تاکہ آیندہ وہ غلط فہمی میں مبتلا نہ رہیں۔ انہوں نے کہا۔ "بہن بات یہ ہے کہ تم پرنا کے مزاج سے تو واقف ہی ہو۔ مذہبی کتابوں کو پڑھتے پڑھتے وہ بالکل سادھو ہو گیا ہے۔ پہلے تو وہ شادی کے لئے راضی ہی نہ تھا لیکن میں نے بہت مجبور کیا تو یہ کہتے ہیں کہ وہ ایسی لڑکی سے شادی کریں گے جو حسین و شکیل ہونیکے بجائے بصورت و بدشکل ہو۔ انہوں نے اس کے متعلق دلیل بھی پیش کی۔ میں کیا کہوں میری تو دلی خواہش تھی کہ میں اس نئے رشتہ کو جہانتک جلد ممکن ہو انجام دوں۔ لیکن اس صورت میں تم خود سمجھ سکتی ہو میں کیا کر سکتی ہوں۔ میں نے تو حتی الامکان انہیں بہت سمجھایا لیکن وہ کسی صورت سے راضی ہی ہوتے نظر نہیں آتے۔ مجھے سخت افسوس ہے کہ میں اس حالت میں محض بےبس ہوں"

چندر بابو کی بیوی کو پرنا چندر کی اس دنیا سے نرالی خواہش کو سنکر حیرت تو ضرور ہوئی لیکن وہ خاموشی کے ساتھ ان کی ماں کی باتوں کو سنتی رہیں۔ پھر بولیں۔ "پرنا کی یہی خواہش ہے تو کیا مضائقہ ہے۔ اس کا سب سے سہل طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی آنکھ سے لڑکی کو دیکھ لیں۔ اگر انہیں پسند ہو تو شادی کر سکتے ہیں۔ اگر ناپسند ہو تو انہیں کوئی دباؤ دینے تو نہ جائے گا اس میں جہانتک میں سمجھتی ہوں انہیں عذر نہ ہوگا"

"ہاں۔ اس میں تو انہیں کوئی عذر نہ ہونا چاہئیے" پرنا چندر کی ماں نے مایوسی کا سانس لیکر کہا۔ "تو پھر آج ہی انہیں ایک خط لکھدو کہ وہ آیندہ اتوار کو کنگ پور براہ راست چلے آئیں اور لڑکی کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھکر کسی آخری نتیجہ پر پہونچیں"

(۵)

اتوار کا دن تھا۔ چندر بابو کے یہاں پرنا چندر کا بےچینی کے ساتھ انتظار ہو رہا تھا۔ صبح کی گاڑی سے آنے کی وجہ سے سب کو پریشانی تھی کہ آخر باوجود تار دینے کے پرنا چندر ابھی تک کیوں نہ آسکے۔ کوئی کہتا، گاڑی چھوٹ گئی ہو گی۔ کوئی کہتا ممکن ہے کچھ سوچ کر ارادہ فسخ کر دیا ہو۔ کوئی کچھ کہتا۔ کوئی کچھ کہتا۔ اسی طرح سارا دن گذر گیا۔ شام ہو گئی۔ لیکن پرنا چندر نہ آئے۔ الغرض سب کو مایوسی ہو گئی تھی کہ یکایک شام کی گاڑی سے پرنا چندر تشریف لے آئے۔ ان کے آنے سے گھر میں پھر اہل چہل ہو گئی نوکرانیاں اشارے کرنے لگیں۔ چھوٹے اور کمسن بچے نئے مہمان کو دیکھنے کی غرض سے باہر نکل آئے۔ چندر بابو کی بیوی کھانے پینے کے انتظام میں مصروف ہو گئیں۔

صبح کے وقت پرنا چندر اندر بلائے گئے۔ ایک وسیع کمرہ میں جہاں آرام و آسائش سے زیادہ عیش کا سامان موجود تھا انہیں بٹھایا گیا۔ یہ تکلفات پرنا چندر کی فطرت کے بالکل خلاف تھے۔ لیکن مجبوری یہ تھی کہ ان کی حیثیت ایک مہمان کی تھی کچھ بول نہ سکتے تھے۔ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ اور نئی تہذیب اور مغربی تمدن کو کوس رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک لڑکی جو سر سے پاؤں تک سونے کے زیور میں لدی ہوئی تھی، کمرہ میں داخل ہوئی۔ وہ ایک نہایت بیش قیمت سرخ ریشمی ساری پہنے تھی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک چاندی کا طشت تھا جس میں کچھ رنگترے، انگور اور انار کے دانے رکھے ہوئے تھے۔ لڑکی نے اس طشت کو پرنا چندر کے سامنے لاکر رکھدیا اور خود ذرا ہٹ کر علٰحدہ ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ یہی وہ لڑکی ہے جو پرنا چندر سے منسوب ہے۔ چونکہ لڑکی گھونگھٹ میں تھی اس لئے پرنا چندر تو نہ دیکھ سکے لیکن ہاتھ پیر کا اگلا حصہ جسے انہوں نے آتے وقت اتفاقیہ دیکھ لیا تھا اس سے انہیں اتنی بات معلوم ہو گئی تھی کہ لڑکی گوری یا سانولی نہیں بلکہ سیاہ فام ہے۔ یہ دیکھ کر انہیں یک گونہ تسلی ہوئی۔ لیکن جب تک وہ چہرہ نہ دیکھ لیتے انہیں اطمینان ہونا مشکل تھا نوکرانیاں

جوان معاملات میں بہت زیادہ قیافہ شناس واقع ہوئی ہیں انہوں نے فوراً ان کے چہرہ سے دل کی بات دریافت کر لی اور لڑکی کے چہرہ سے گھونگھٹ اُٹھا دیا۔ پرناچندر نے اسے دیکھا اور تھوڑی دیر کے لئے بالکل محوِ حیرت ہو گئے۔ لڑکی قیاس سے باہر بدشکل تھی۔ اس کے سر کے بال کنگھی نہ کرنے کی وجہ سے الجھ الجھ کر سادھو کی جٹ کی طرح ہو گئے تھے۔ مدت کے بعد جو سر میں تیل پڑا تھا تو وہ پیوست ہو نکلے بجائے پیشانی پہ بہہ رہا تھا۔ اُسکی آنکھیں بڑی تھیں لیکن اتنی بڑی کہ دیکھنے سے بھیانک معلوم ہوتی تھیں۔ سیاہ چہرہ پر بڑے بڑے چیچک کے داغ اور اسپر بڑی بڑی سرخ آنکھیں۔ پرناچندر کی آنکھوں نے آجتک ایسا منظر نہ دیکھا تھا۔ ہونٹ اس قدر باریک کہ بند ہونے کی حالت میں ناک کی نوک سے ٹھوڑی تک بالکل ایک سطح نظر آتی تھی اور کوئی خط، کوئی نشیب و فراز درمیان میں ایسا نہ معلوم ہوتا تھا جس سے دہن کا وجود متعین کیا جا سکے۔ قد چھوٹا۔ قامت ناموزوں۔ بدن فربہ۔ ہاتھ پاؤں بڑے۔ الغرض وہ ایک ایسی ہستی تھی کہ اسے دیکھتے ہوئے قدرت پر ناانصافی کا الزام لگانا ہرگز ناروا نہ ہو سکتا تھا۔ یہ صرف بشریت کا تقاضہ تھا کہ پرناچندر بھی تھوڑی دیر کے لئے حیرت و استعجاب میں آ گئے تھے۔ ورنہ انکی خواہش کے مطابق لڑکی میں کل اوصاف بدرجۂ اتم موجود تھے۔ انہوں نے دل میں کہا۔ "بیشک میں اس لڑکی کو شریکِ رنج و راحت بنانے کی بنانے کی جرأت کر سکتا ہوں اس میں وہ کل اوصاف موجود ہیں، جسے پرناچندر کی آنکھیں مدت سے ڈھونڈھ رہی تھیں۔ یقیناً میں ایسی ہی لڑکی چاہتا ہوں۔ زبیر، شیونندن، رام سیوک، میرا مذاق اڑاتے تھے لیکن اب انہیں معلوم ہو جائے گا کہ دنیا میں اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں، جو کہہ کے نہیں بلکہ کر کے دکھاتے ہیں۔ میں غلط کیوں کہتا۔ مجھے اس سے کیا فائدہ تھا۔ لیکن وہ لوگ کیوں یقین کرتے۔ اب انہیں یقین کرنا پڑیگا۔ مجبوراً ماننا پڑیگا"

تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے لڑکی سے پوچھا "تمہارا کیا نام ہے؟"

لڑکی نے اپنی گردن اونچی کی اور کچھ اس طور سے پرناچندر کو گھور کر دیکھا کہ انکی آنکھیں خود بخود نیچی ہو گئیں۔ پھر بولی۔ اسکی آواز اتنی گرجدار تھی کہ سارا کمرہ گونج رہا تھا۔ "کیا کہتے ہیں؟"

"تمہارا کیا نام ہے؟" پرناچندر نے سانس کو روکتے ہوئے دہرایا۔

"نام؟......... کس کا نام؟ .... میرا؟ .... رجکماری ... نا... نا... نا...... جگدمبا"

"راجکماری۔ جگدمبا" دو نام۔ پرناچندر سوچنے لگے۔

عورتوں نے بتایا کہ پنڈتوں نے انکا نام جگدمبا رکھا تھا۔ لیکن گھر والے انہیں راجکماری کے نام سے پکارتے ہیں۔

پرناچندر نے دل میں کہا "راجکماری یہ نام نامناسب ہے۔ اگر شادی ہوئی تو میں اسی اصلی نام کو رواج دونگا جو مقدس پنڈتوں نے تجویز کیا ہے۔ یہ مذہبی نام ہے اور اگلے وقتوں میں عورتوں کے ایسے ہی نام ہوتے تھے۔ جگدمبا کیسا پیارا اور کیسا بھلا نام ہے!"

لڑکی اندر بلا لی گئی۔ پرناچندر سے دریافت کیا گیا کہ وہ اس نسبت کو پسند کرتے ہیں یا نہیں؟ انہیں کیا عذر ہو سکتا تھا۔ انہوں نے اثبات میں جواب دے دیا۔

(۶)

اسی دن شام کو پرناچندر رخصت ہوئے۔ تانگہ تیزی کے ساتھ گذر رہا تھا۔ پرناچندر اپنے خیالات میں مستغرق تھے۔ خیالات کا طوفان تھا

چلا آرہا تھا۔ وہ اپنی فتح پر خوش تھے لیکن ساتھ ہی انکے قلب کی کچھ عجب حالت تھی۔ دل اندر ہی اندر بیٹھا جا رہا تھا۔ اور رہ رہ کر جگد مبا کی خوفناک صورت ان کی آنکھوں میں گھوم رہی تھی۔ انہوں نے آج اپنی عادت بلکہ فطرت کے خلاف ان عورتوں کو غور سے دیکھا جو انہیں راستہ میں گذرتی ہوئی ملیں۔ ان کی آنکھیں بے اختیارانہ نامحرم عورتوں کے چہرہ پر پڑ رہی تھیں۔ اور وہ یہ سوچ رہے تھے کہ ان میں کیا کوئی ایک عورت بھی جگد مبا کی شکل و صورت کے مشابہ ہے۔ لیکن باوجود تلاش و کوشش کے بھی انہیں کوئی عورت جگد مبا کی شکل و شباہت کی نظر نہ آئی تھی۔

ماں سے ملکر اور اتنا کہنے کے بعد کہ انہوں نے شادی کے لئے اپنی رضامندی ظاہر کردی ہے، وہ کلکتہ چلے آئے۔ ہوسٹل میں آتے ہی لڑکے ان کے اردگرد جمع ہوگئے۔ چونکہ کنگ پور جاتے وقت پرنا چندر نے لڑکوں سے واقعہ کی اطلاع دیدی تھی۔ کسی نے پوچھا "کہئے پرنا بابو کیا خبر ہے؟" پرنا چندر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "میاں زہر سے پوچھئے۔" انہیں کسی طرح یقین نہ آتا تھا" ایک نے پوچھا۔ "لڑکی آپ کو پسند ہے؟" کسی نے دریافت کیا "دلہن کیا ہوگا؟" غرض چاروں طرف سے سیکڑوں سوالات ہونے لگے۔ پرنا چندر وقار و تمکین کے ساتھ سب کا جواب دیتے جاتے تھے اور اپنی فتح پر بیحد مسرور نظر آتے تھے۔ اتفاقاً کسی نے پوچھا "اور لڑکی کا نام کیا ہے؟" پرنا چندر نے سنجیدگی کے ساتھ کہا "جگد مبا"

یہ نام سنکر ہنسی تو سبھی کو آگئی لیکن شیونندن کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ "واقعی پرنا بابو بہت اچھا نام ہے۔ واقعی بہت اچھا ہے۔"

نگندر بابو نے بناوٹی غصہ سے شیونندن کو ڈانٹا "نہایت بیہودہ ہو۔ تمہیں کبھی تمیز نہ آئے گی۔"

شیونندن نے ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے کہا:۔

"نہیں میں کیوں ہنسنے لگا۔ تم خواہ مخواہ الزام لگاتے ہو" لیکن یہ کہتے کہتے آخر اس سے ہنسی برداشت نہ ہوئی اور بستر پہ ملے ہنسی کے لوٹ گیا۔

جوگندر بابو نے کہا "آخر آپ لوگوں کو یہ نام کیوں نیا معلوم ہوتا ہے۔ شریف گھرانوں میں عورتوں کے ایسے ہی نام رکھے جاتے ہیں۔ اس میں اچنبھے کی کون سی بات ہے۔ آپ لوگ تو تھیٹر کے ناموں کو پسند کرتے ہیں۔ یہ کون؟ فیروزی۔ یہ کون؟ بسنت دیوی یہ کون؟ سری متی منجری۔ واہ واہ، کتنے اچھے نام ہیں۔ آپ لوگوں کو شرم نہیں آتی۔"

(۷)

یہ تو خیر اسی وقت کا واقعہ ہے جب پرنا چندر کے ہوسٹل میں داخل ہوتے ہی لڑکے ان کے چاروں طرف جمع ہوگئے تھے۔ لڑکوں کے جانے کے بعد جب ذرا تنہائی ہوئی تو پرنا چندر پھر اپنے خیالات کی سیر کرنے لگے۔ جگد مبا کی شکل ان کی آنکھوں میں پھرنے لگی اور وہ سوچنے لگے کہ کیا قدرت بھی ایسی مہیب صورت، انسانی شکل میں پیدا کرسکتی ہے۔

دوسرے دن ان کی ماں کا خط آیا کہ شادی کی تاریخ اسی مہینہ میں رکھی گئی ہے۔ اور شادی سے دو دن قبل انہیں مکان چلے آنا ہوگا۔

اگرچہ انہوں نے خود ہی اپنی رضامندی شادی کے لئے ظاہر کی تھی اور انہیں معلوم تھا کہ شادی بھی عنقریب ہوگی لیکن اس خط کو دیکھتے ہی اختلاج قلب ہونے لگا اور کچھ ایسی حالت طاری ہوئی جسکا بیان مشکل ہے

دو چار دن تک تو یہ کالج گئے بھی لیکن رفتہ رفتہ ان کے معمولات میں فرق آنے لگا۔ یہاں تک کہ صبح کا اشنان اور پوجا پاٹ بھی ناغہ تین چار چار دن تک ناغہ ہونے لگا۔ انکی نیند اڑ گئی تھی۔ کھانے پینے کی مطلق خواہش نہ رہتی تھی۔ وہ ہمیشہ بستر پر پڑے رہتے تھے اور خدا معلوم کن کن خیالات کی سیر کرتے تھے۔ وہی ایک خیال، ایک تصور، ان کے دماغ کی آزادی کو معطل کر رہا تھا، اور وہ لاکھ خیالات کو تبدیل کرنا چاہتے تھے لیکن یہ نہ ہوتا تھا۔ جگدمبا کی شکل ہر وقت، ہر لحظہ انکے سامنے تھی اور انہیں کسی طرح بھی اس سے نجات نہ ملتی تھی۔

(۸)

شادی کی مقررہ تاریخ کو صرف پانچ دن باقی رہ گئے تھے۔ رات کا وقت تھا۔ کائنات پر ایک سکون مطلق طاری تھا۔ دنیا بیخبر سوتی تھی لیکن ایک ہستی صرف پنا چند کی تھی جس کی آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ وہ بستر پر کروٹیں بدل رہے تھے۔ کبھی اٹھتے کبھی بیٹھتے، کبھی ٹہلتے اور کبھی کراہتے لیکن کسی طرح طبیعت کو کل حاصل نہ ہوتا۔ وہ پریشان تھے۔ خود اپنے اوپر حیران تھے "یا پرمیشور میری یہ کیا حالت ہے؟ میرا دل کیوں بیٹھا جاتا ہے! میں ایسا کیوں پاگل ہو گیا ہوں؟ یا پرمیشر۔ یا بھگوان تو میری مدد کر۔ میرے قلب کو اطمینان دے۔ میری طبیعت کو سکون عنایت کر۔ مجھے موت دے اگر تو میری مدد نہیں کر سکتا۔ میری زندگی کو ختم کر دے، اگر تو مجھ سے ناخوش ہے۔ میری جان لیلے اگر میرے گناہ معاف نہیں ہو سکتے"

صبح کاذب کا وقت تھا کہ تھوڑی دیر کے لئے انکی آنکھ لگ گئی۔ اب آپ خیالات کا اثر کہو یا دماغی انتشار کا نتیجہ سمجھو انہوں نے خواب دیکھا کہ ایک وسیع میدان میں تنہا کھڑے ہیں۔ صحرا پر خار ہے اور راستہ نامعلوم۔ کہاں جائیں؟ کدھر جائیں؟ وہ یہ سوچ رہے تھے۔ ناگاہ ایک خوفناک درندہ ان پر حملہ آور ہوا۔ انہوں نے بھاگنا چاہا لیکن یہ جانور قریب آگیا اور انہوں نے دیکھا کہ اسکا چہرہ بالکل جگدمبا کے مشابہ ہے۔ قریب تھا کہ جانور انہیں اپنی سینگوں سے اٹھا کر پھینکدے کہ انہوں نے ایک چیخ ماری اور ساتھ ہی آنکھ کھل گئی۔ روشنی گل ہو گئی تھی۔ تمام اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ دس منٹ تک تو وہ بے حس و حرکت بستر پر پڑے رہے۔ پھر تکیہ کے نیچے سے دیا سلائی نکال کر لالٹین روشن کی اور دیر تک خواب کی تعبیر کو سوچتے رہے۔

دن رات کے چوبیس گھنٹے تیزی سے گذر رہے تھے۔ یہاں تک کہ اب صرف دو دن پنا چند کی روانگی کو باقی رہگئے۔ دن کا وقت تھا لیکن مسلسل کئی راتوں کی شب بیداری کے باعث فطرت نے انہیں پھر تھوڑی کے لئے دنیا سے بیخبر کر دیا تھا۔ غنودگی کا طاری ہونا تھا کہ انہوں نے پھر ایک خواب دیکھا جو اگلے خواب سے زیادہ وحشت ناک اور ہولناک تھا انہوں نے دیکھا کہ ایک تنگ و تاریک کمرہ میں جسکی دیواریں بجائے سفیدی کے خون سے رنگی ہیں، وہ مقید ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد "کالی دیبی" ایک ہاتھ میں چھرا اور دوسرے ہاتھ میں ایک کٹا ہوا سر جس سے تازہ خون ٹپک رہا تھا، انہیں اپنی طرف آتی ہوئی دکھائی دی۔ انہوں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ "کالی دیبی" کی موجودہ شکل بالکل جگدمبا کے مشابہ ہے اور وہ کٹا ہوا سر جسے وہ اپنے ہاتھوں میں لئے ہے خود انکی صورت سے مماثلت رکھتا ہے

وحشت کے عالم میں ان کی آنکھ کھل گئی۔ لیکن دیر تک سینہ بلیوں اچھلتا رہا۔

انہوں نے سوچا۔ ماں کو لکھدوں۔ شادی منقطع کر دیجئے مجھے پسند نہیں۔ اس خیال کا آنا تھا کہ انہوں نے دوات قلم نکال کر خط لکھنا شروع کیا۔ متعدد مسودے بنائے اور چاک کئے۔ لیکن ایک سطر بھی نہ لکھی گئی۔ یہ بات نامناسب ہے۔ شادی کے کل انتظامات ہو گئے ہونگے اں خوشی خوشی چیزوں کی فراہمی کر رہی ہونگی۔ انہیں کیا معلوم کہ یہاں پرناچندر پر کیا بیت رہی۔ لیکن بہرحال امتناعی خط لکھنا مناسب ہیں ہے۔ ماتا کو تو صدمہ ہو ہی گا۔ مجھے بھی لوگ کمینہ اور مجہول مشہور کریں گے۔ نہیں ایسا نہ ہوگا۔ اور میں ایسا خط نہ لکھونگا۔

خیالات کا طوفان تھا جو امڈا چلا آرہا تھا۔ جب اس صورت بھی ناامیدی ہوئی تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ کلکتہ چھوڑ کر کسی دوسرے شہر میں جانا زیادہ مناسب ہے لوگ سمجھیں گے۔ گنگا جی اشنان کے لئے گئے ہوں گے پیر پھسل گیا ہوگا ڈوب گئے ہونگے۔ گھر خبر ملیگی، لوگ رو پیٹ کر خاموش ہو جائیں گے۔ مجھے تو کم از کم دماغی تکلیف اور روحانی اذیت سے نجات حاصل ہو جائے گی۔ یہ خیال اتنا مستحکم اور یہ تدبیر اتنی مناسب تھی کہ انہوں نے فوراً سامنے کی میز سے ٹائم ٹیبل اٹھایا اور بمبئی جانیکا وقت دیکھنے لگے۔ بمبئی کلکتہ سے بہت دور ہے۔ وہاں پرناچندر کو کون پہچانتا ہے۔ رزق کے مالک بھگوان ہیں۔ اس کا کیا تردد ہے۔ وہاں اطمینان سے زندگی بسر ہوگی۔ رہی ایک ماں کی خیریت سو کسی طرح معلوم کر لی جائے گی۔ –

دماغ آخری نتیجہ پر پہونچ گیا۔ کمرہ بند کر کے یہ اپنا بستر باندھنے لگے۔ زیادہ چیزوں کا لے جانا مناسب نہیں ہے۔ اس سے تو بات معلوم ہی ہو جائے گی۔ لوگ تلاش میں نکلینگے۔ خدا معلوم کہاں کہاں ڈھونڈیں گے۔ اخبارات میں اشتہارات شایع کریں گے۔ اس سے اور بدنامی اور رسوائی ہوگی۔ نہیں نہیں میں تنہا جاؤنگا۔ اکیلا جاؤنگا۔ سب چیزوں کو یہیں چھوڑ دوں گا۔ اس خیال کا آنا تھا کہ انہوں نے بستر وغیرہ کھول ڈالا۔ ابھی صرف آٹھ بجے ہیں۔ گاڑی دو بجے چھوٹتی ہے۔ بہت وقت ہے۔ گیارہ ساڑھے گیارہ بجے چپ چاپ نکل جاؤں گا کسی کو خبر بھی نہ ہوگی۔

گیارہ بجگئے ان کا دل دھڑکنے لگا۔ کیا میں بمبئی چلا جاؤں؟ زندہ ہو کر مردہ بنجاؤں؟ غریب ماں رو رو کر مرجائے گی۔ اسکا پاپ کس کے سر پڑیگا۔ میرے ہی سر پرنا؟ میں کتنا پاپی ہوں۔ کیا سوچتا ہوں۔ نہیں نہیں۔ یہ بات نہ ہوگی۔ ہرگز نہ ہوگی۔ میں ایسا نہ کروں گا کبھی نہ کروں گا۔

شادی کے معنے خوشی و شادمانی کے ہیں لیکن پرناچندر کی شادی درحقیقت سو مصیبتوں کی ایک مصیبت تھی۔ انکا دماغ جواب دے رہا تھا۔ ان کے قلب کی حالت بگڑی جاتی تھی۔ اور انہیں اس مصیبت سے نجات دلانے والا کوئی بھی نظر نہ آتا تھا۔

آخرکار پرناچندر کے یہ کل خیالات عارضی ثابت ہوے۔ اور انہوں نے فیصلہ کرلیا کہ جو کچھ بھی ہو وہ اب تو زبان ہار چکے ہیں اور انہیں اب ہر نتیجہ کو برداشت کرنا ہی ہے۔

(۹)

وقت مقررہ پر پرناچندر اپنے مکان پہونچ گئے۔ بارات نہایت ہی تزک و احتشام کے ساتھ گنگ پور کی طرف روانہ ہوئی۔ اسوقت

پرناچندر کے دل میں نہ خوشی کے جذبات تھے اور نہ غم کے۔ خوف وہراس کا بھی تسلط دل سے اٹھ گیا تھا میدانِ جنگ میں قاعدہ ہے کہ بزدل سے بزدل سپاہی بھی اپنی موت کو بھول جاتا ہے۔

رسم کے مطابق دولہا دولھن ایک جا بٹھائے گئے اور رونمائی کے لئے ایک بڑا آئینہ لایا گیا۔ پرناچندر کو دولھن کی صورت دکھائی گئی۔ لیکن ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ بجائے کریہہ صورت جگدمبا کے ایک کمسن دبلی پتلی اور پری جمال لڑکی اس کے پہلو میں بیٹھی ہے۔

بعد میں خود راجکماری ہی کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ لڑکی (یعنی جگدمبا) دراصل محلہ کے ایک تیلی کی تھی جو قصداً اس لئے دکھائی گئی تھی کہ کسی طرح ان کی یہ عجیب وغریب ذہنیت بدل جائے۔

اب تو یہ حالت ہے کہ پرناچندر کی آنکھیں ہوسٹل کے دروازہ پر لگی رہتی ہیں۔ وہ ابھی تک ڈاکیہ نہیں آیا۔ خدا معلوم کہاں ہے۔ بہت دیر ہوگئی ہے۔ ایک دن بھی خط نہیں آتا تو پرناچندر بےچین ہو جاتے ہیں۔

ظہیر الدین حیدر (آروی)

چند باتوں کا خیال رکھئے

(۱) نگار کی تاریخِ اشاعت ہر چند ہر ماہ کی پندرہ تاریخ ہے، لیکن عموماً وہ پہلے ہی ہفتہ میں شائع ہو جاتا ہے، اس لئے اگر ۲۰ تاریخ تک پرچہ نہ پہونچے تو فوراً اطلاع دیجئے۔ ورنہ پھر دوسری کاپی مفت نہ مل سکے گی۔

بعض حضرات دوسرے مہینہ کا پرچہ ملنے پر پہلے مہینہ کا پرچہ نہ پہونچنے کی شکایت کرتے ہیں، افسوس ہے کہ ان شکایات کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں۔

(۲) نمبرِ خریداری کتابت میں درج کرنا ضروری ہے، بعض حضرات ڈاکخانہ کے نمبر (جو ...) کو اپنا خریداری نمبر سمجھتے ہیں، نمبرِ خریداری قیمت کے اوپر داہنی جانب بلو بلیک روشنائی سے درج ہوتا ہے اس کو ایک بار دیکھ کر کہیں نوٹ فرمالیجئے۔

(۳) طلبہ کے لئے زیادہ مناسب یہ ہے کہ وہ اپنے گھر یا کسی اور پتہ سے رسالہ طلب کریں۔ اسکول کے پتہ سے رسالہ طلب کرنا محفوظ طریقہ نہیں ہے۔

(۴) جن طلبہ یا لائبریریوں وغیرہ سے رعایتی چندہ لیا جاتا ہے وہ اگر میعاد خریداری ختم ہونے پر منی آرڈر نہ روانہ کریں گے تو وی۔ پی پوری رقم کا کیا جائے گا۔

(۵) حیدرآباد کے ان خریداروں سے جہاں انگریزی ڈاکخانہ نہیں ہے، یہ استدعا کی جاتی ہے کہ حتی الامکان رسالہ رجسٹرڈ طلب کریں اور ... سالانہ اس صرف کو بھی برداشت کریں کیوں کہ سوائے اس کے کوئی صورت وہاں رسالہ پہونچنے کی نہیں ہے۔

منیجر "نگار" لکھنؤ

فلسفۂ مذہب

مذہب اور عبادات

معمولات مذہب کا تعلق مذہب سے ویسا ہی ہے جیسا انسان کا تعلق اسکی اپنی عادات سے جس طرح عادات کا یہ خاص عمل ہے کہ وہ انسانی جسم و قوا میں ایک قسم کا قرار و سکون ڈالدیں تاکہ ان میں دماغ کے معمول بننے کی صلاحیت پیدا ہو اسی طرح معمولات مذہب کا یہ مدعا ہے کہ مذہب کو آئین معاشرت میں مقیم و متعین کرنے کے لئے اعمال انسانی کا ایک ایسا نظام یا ترتیب مقرر کرے جس سے علاوہ اس کے کہ ایک جماعت میں تشکیل یا تنظیم پیدا ہو سکے وہ انسان کی خواہشوں اور ارادے کو روحانیت کی طرف منتقل کر دیں۔ بغیر معمولات مذہبی کے انسان کے اندر عملی مذہب کی صورت پیدا کرنا ممکن نہیں اور بقول علمائے نفسیات مذہب کی فطرت کا ایک نظام عمل اور دستور کے ماتحت ہونا لازم ہے او تاکہ ایک مذہب کے ماننے والوں کے اندر باہمی تعلقات و روابط قایم و وابستہ رہیں یہ ضرور ہے کہ مذہب میں کچھ نہ کچھ ظاہری معمولات ہوں۔ معمولات مذہبی کی ایک صورت مراسم مذہبی ہے اور وہ تاریخی حیثیت سے اس سے زیادہ عمیق نتیجہ پیدا کرتی ہیں جتنا معمولات مذہب۔

تقریباً دنیا کے جتنے مذاہب ہیں وہ عموماً مراسم مذہب کو بجائے خود ایک ایسا زود اثر نسخہ مانتے ہیں جس سے انکی دلی منتیں اور آرزوئیں پوری ہو جاتی ہیں جو رکاوٹیں پیدا ہونے والی ہوں وہ اس سے دور ہو جائیں۔ قبل اس کے کہ ہم ان مراسم کی ابتدا پر غور کریں بہتر ہوگا کہ بعض اعلیٰ مذاہب میں ان خیالات کی تشریح کر دیں جو ان رسمیات کے متعلق ہیں۔ عموماً ان خیالات کے اندر دو مقصد پنہاں رہتے ہیں۔ اول تو یہ مراسم کا ادا کرنے والا اس بات کو باور کرتا ہے کہ اسکی جو کچھ دلی آرزوئیں اور منتیں ہوں اور جس کی خواستگاری میں اسکو قبولی درخواست پر شبہ ہوتا ہے کہ اس کو ملے یا نہ ملے وہ ان مراسم کے انجام دینے کے بعد زیادہ تیقن سے بدل جائے دوسرا مقصد ان مراسم کی ادائیگی سے یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسا ذریعہ سمجھے جاتے ہیں جس سے عابد و معبود میں یگانگت پیدا ہو سکے۔

اگر مذاہب عالم کے عام معمولات و رسمیات پر غور کیا جائے تو انکی فہرست حسب ذیل اعمال کے اندر آ جاتی ہے۔

۱۔ طہارت ۲۔ قربانی چڑھانا ۳۔ بخور جلانا یا ہون کرنا ۴۔ نماز ۵۔ روزہ ۶۔ زکوۃ ۷۔ اجتماع ہم مذہب افراد

مختصراً ہم ان اعمال کے کنہ و فیہ پر ایک مبصرانہ نظر ڈالیں گے۔

طہارت طہارت مذہبی کا مقصد یہ ہے کہ بعض عمل ظاہری سے ایسی گندگی اور پلیدی کو دور کیا جائے جو ایک جماعت یا ایک انسان میں یا ایک مقام پر پیدا ہو جاتی ہے اور جس کا لازمی نتیجہ بیماریاں۔ تکالیف اور موت ہیں مذہب کی ارتقائی حالت میں یہ خیال صفائی قلب و باطن اور گناہوں سے محفوظ رہنے کی صورت میں بدل گیا اور جو فرق ظاہری و باطنی صفائی کا ان دونوں خیالات

کے دوران ارتقا میں پیدا ہوا وہ ایسے مذاہب مثلاً یہود و نصاریٰ یا ہنود و مجوس یا اہل یونان و روما میں بالکل نہیں پایا جاتا، اور گناہوں کو دھونے کے لئے جو ظاہری اور جسمانی طہارت کی ان مذاہب میں ہدایت ہے اور جس کے لئے اصطباغ، گنگا اشنان وغیرہ کا استعمال ناگزیر سمجھے جاتے ہیں وہ صفائی قلب اور گناہوں کے محو کرنے میں ویسی ہی کارآمد ہیں جیسا توبہ و استغفار۔ اسلام نے یا موجودہ زمانے کے بعض ترقی یافتہ مذہبی سوسائٹیوں نے صفائی قلب کے لئے ظاہری طہارت کو صرف ایک ذریعہ سمجھ کر محض اعمال انسانی کو کافی سمجھا ہے۔ اور ان مذاہب میں طہارت کوئی خاص مقصود بالذات عبادت سمجھی نہیں جاتی۔ بلکہ عبادت کے لئے طبیعت کو مطمئن ساکن کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ ناپاکی سے عموماً طبیعت پراگندہ اور مشوش رہتی ہے اور غسل بدن سے اور جگہ کی صفائی اور لطافت سے آدمی مطمئن و بشاش ہو کر خدا کی عبادت زیادہ رجوع قلب سے کرتا ہے: مسلمانوں میں اسی واسطے طہارت کی ضرورت اس وقت تک فریضۂ مذہبی نہیں سمجھا جاتی جب تک کہ اس کے بعد خدا کی عبادت نہ کی جائے۔

ابتدائی خیالات انسانی نے مذہبی ناپاکی کے خاص ذرائع۔ موت مباشرت۔ بیماریاں۔ ہر قسم کے خون (خصوصاً حیض و نفاس کے خون) کے نکلنے کو جانا ہے اور ایک پاک انسان کا اس قسم کی ناپاکیوں سے ملوث ہو جانے کے بعد اس کے لئے ضروری ہوتا تھا کہ وہ مذہبی طہارت کو عمل میں لائے۔ یہ مذہبی طہارت اکثر تو اس خیال پر مبنی ہوتی تھیں کہ پلیدی ارواح خبیثہ کے مساس سے پیدا ہوتی ہیں اور اس لئے ان ارواح کو نکالنے یا انکے اثر کو دور کرنے کے لئے کچھ خاص قسم کے منتروں کا جپنا بھی ضروری ہوتا تھا جس سے پاک روح خوش ہو کر ناپاک روح کو نکالنے پر اور آمادہ ہو جائے جو ناپاک مقام پر آکر اپنا ڈیرہ جما لیتی ہیں کیونکہ ابتدائی عقول انسانی کا ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ بیماریاں اور خصوصاً دماغی بیماریاں ناپاک ارواح کے حلول اور اثر سے پیدا ہوتی ہیں انسانی عقل نے جب زیادہ ترقی کی تو ان بیماریوں کو دور کرنے کے لئے اس نے دواؤں کا استعمال بھی شروع کیا۔ مگر ایک زمانہ تک اسکا خیال رہا کہ دوائیاں کوئی اپنی ذاتی خاصیت رکھنے کی وجہ سے اثر نہیں کرتیں بلکہ وہ ایک قسم کے طلسمی جوہر ہیں جو پیٹ میں جا کر اپنے طلسمی قوت کے کرشمے دکھلاتی ہیں۔

طہارت مذہبی کی بعض صورتیں جو مختلف اقوام میں پائی جاتی ہیں ان کی یہاں پر ایک فہرست دینا نامناسب نہ ہوگی گو کہ یہ فہرست حاوی نہیں۔

۱ - پانی سے عضو جسمانی کو غسل دینا جو پانی پہلے سے بابرکت کر لیا گیا ہو۔ کسی چیز کے ڈالنے سے یا اس پر کچھ دعا پڑھنے سے۔ مثلاً عیسائیوں میں اصطباغ، ہندوؤں گنگا اشنان۔

۲ - گائے کے پیشاب سے عضو جسمانی کو دھونا (ہندوؤں اور پارسیوں کا طریقہ)

۳ - قربانی کا خون چھڑکنا۔

۴ - بخور و لوبان کی دھونیاں دینا۔

۵ - بعض چیزیں مثل گندھک اور سیندور یا زیتوں کے تیل کو سر یا پیشانی پر ملنا۔

۶۔ آگ سے جلانا۔

۷۔ بعض منتروں کا جپنا جس کی وجہ سے پلید روح نکل جاوے۔

۸۔ کسی ایسی چیز پر نگاہ ڈالنا جس سے ناپاکی خود بخود دور ہو جائے (جیسے پارسیوں میں کتوں کو دیکھنا)

۹۔ مکانوں میں پھونکی ہوئی کیل گاڑنا۔

۱۰۔ بعض اشیاء مثلاً نمک، شراب، سرکہ وغیرہ کا اندرونی استعمال۔

۱۱۔ عورتوں کی مقاربت سے پرہیز کرنا۔

۱۲۔ آگ کے اندر سے گزرنا۔

۱۳۔ اپنے بدن کو ریت یا مٹی سے ملنا۔ بدن کو داغنا یا اس پر نشان بنانا۔ موٹے جھوٹے کپڑے میں اپنے کو لپیٹنا

۱۴۔ عقیقہ کرنا۔

۱۵۔ ختنہ کرانا۔

۱۶۔ بعض اشیائے ماکولات سے پرہیز کرنا

دنیا کے اکثر موجودہ مذاہب میں بعض یہ صورتیں طہارت مذہبی کی پائی جاتی ہیں مگر غالباً اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے طہارت مذہبی کی ضرورت کو ایک حد تک تسلیم کرتے ہوئے اسکو جسمانی صفائی کا ذریعہ جان کر عبادات کا پیش خیمہ بنایا ہو۔ اور اس کا مدعا ایسی طہارت سے سوائے موجودہ طبی اصول صفائی و حفظان صحت کے کچھ نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں میں ختنہ، عقیقہ اور حج کے مراسم میں بعض ایسی طہارت مذہبی کا رواج پایا جاتا ہے جس کی ابتدا ان ہی اوہامی خیالات سے ہوئی ہے جو اور مشرک اور وحشی اقوام میں پائے جاتے ہیں۔ مگر یہ سب عرب کے قومی اور قدیم مراسم ہیں جن کا ذمہ دار دین اسلام نہیں جو قرآن میں سب ان مراسم کا مٹانا قرآن کا کوئی مشن نہ تھا۔ اور نہ قرآن کا یہ منشا ہے کہ عربوں کی قومی عادات وہ بھی اسلام کے ساتھ دوسری قومیں بھی اختیار کریں۔ قرآن نے صرف اس عقیدے کو مٹا دیا ہے کہ اس قسم کی جسمانی طہارت سے بجز اس کے کہ عبادات میں ایک قسم کی یکسوئی و اطمینان و انبساط قلب حاصل ہو وہ گناہ دھونے کے لئے کوئی مقصود بالذات شئے نہیں[1]۔ اور اسلام میں ناپاکی کی تعریف وہی ہے جو حضرت مسیحؑ

---

[1] غسل جنابت کی فرضیت اور بغیر اس کے نماز کا قبول نہ ہونا۔ ایک عرصہ تک مجھے بھی اس کی علت سمجھ میں نہ آئی اور میں یہ سمجھا کرتا تھا کہ کہیں قرآن کا یہ منشا تو نہیں ہے کہ آدمی پر یہ ناپاکی ارواح خبیثہ کے مساس سے پیدا ہوتی ہے لیکن ایک روز ایک انگریزی ڈاکٹر کا ایک مقالہ مباشرت پر پڑھ رہا تھا جس کا قول تھا کہ مباشرت کے بعد بدن کو سکون و راحت دینا نہایت ضروری ہے ورنہ خوف ہے کہ انسان ایسا نہ کرنے پر جلد یا بدیر نامرد ہو جائے یا دسکو دماغی اور اعصابی امراض پیدا ہو جائینگے اور اسنے یہ مشورہ دیا ہے کہ یا تو مباشرت کے بعد سو جانا چاہئیے یا ٹھنڈے پانی سے غسل کر ڈالنا چاہئیے کہ اعصاب میں جو ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ وہ رفع ہو جائے۔ اس وقت مجھے غسل جنابت کی مصلحت سمجھ میں آئی۔ (س۔م۔ا۔)

کی طرف سے انجیل میں منقول ہے۔ یعنی ہر وہ چیز جو انسانی اعضاء سے خارج ہو کر نکلے وہ ناپاک ہے اور اس میں بول و براز۔ خون۔ پیپ حیض و نفاس۔ کھنکار (اور ایک حد تک تھوک اور پان کی پیک) سب شامل ہیں۔ ناپاکی کا یہ معیار بہت ہی اچھا ہے ورنہ طبیعتوں کے اختلاف سے یہ مشکل امر تھا کہ بدبو و نیکی کی طرح ناپاکی کا بھی کوئی معیار مقرر کیا جائے۔ اور ظاہر ہے کہ نفاست طبیعت۔ صفائی اور حفظان صحت کا تقاضا ہے کہ اس پلیدی کو پہلے کپڑے یا جسم سے دور کیا جائے اور پھر خدا کی عبادت میں مصروف ہوا جائے۔ وہ نہ اس کے بغیر عبادت نامقبول۔ اس سے زیادہ قرآنی طہارت کا اور کوئی مدعا نہیں۔

طہارت کے ضمن میں بعض قسم کے ماکولات (خصوصاً جانوروں کے گوشت) بھی شامل ہیں۔ وہ بھی مذہبی نقطۂ نظر سے دیکھے گئے ہیں۔ جہانتک قرآن کا تعلق کا ہے کھانوں میں ناپاک چیزیں وہی ہیں جو انسانی صحت کو نقصان پہونچانے والی ہیں۔ اور انہیں ہر قسم کی نشہ آور چیزیں۔ خون و مردار ہیں جنکے استعمال سے بدن میں مفسد مادہ پیدا ہونا یا اسکا اندیشہ ہونا اصول طب کے مسلمات میں سے ہے۔ اگرچہ قرآن نے سڑی گلی اور بدبودار چیزوں کو حرام نہیں کیا۔ لیکن مذہبی اصول کا کوئی مطلب و مدعا ہے تو ان چیزوں کا حرام ہونا ویسا ہی ضروری تھا جیسے سور کا گوشت۔ مگر قرآن نے دم اور میتہ اور لحم الخنزیر کو مذہباً حرام قرار دیا ہے۔ مگر سڑے گلے پھلوں کو جس کو مومنین بوجہ افلاس کے زیادہ کھا کر ہیضہ کا شکار ہوجایا کرتے ہیں اسکو مذہباً حرام قرار نہیں دیا۔ حالانکہ سور کا گوشت عام طور سے ایسا مضر صحت نہیں جیسا یہ چیزیں ہیں۔ عرب کی آب و ہوا میں مضر ہو تو ہو ورنہ اہل یورپ اسکا متواتر استعمال کرتے ہیں اور انکی صحت و اخلاق پر اسکا کوئی مضر اثر نہیں پڑتا۔ اور نہ دیکھا گیا۔ بس معلوم ہوا کہ مذہب کا مدعا نہ صرف حفظان صحت ہے بلکہ اس سے زیادہ کچھ اور ہے۔ یورپ کے لال بوجھکڑوں نے تو یہودیوں کی فہرست حلال و حرام ماکولات کو جو کتاب تیشنہ میں ہے (اور جسے بدقسمتی سے ہمارے فقہائے قرآن کے باوجود جیسا اس آیت سے ہویدا ہے۔ اپنا شعار مذہبی بنالیا ہے۔

"قل لا اجد فی ما اوحی الی محرما علی طاعم یطعمه الا ان یکون میتة او دما مسفوحا او لحم خنزیر فانه رجس او فسقا اهل لغیر الله به ۚ فمن اضطر غیر باغ ولا عاد فان ربك غفور رحیم ○
وعلی الذین هادوا حرمنا کل ذی ظفر ۚ ومن البقر والغنم حرمنا علیهم شحومهما الا ما حملت ظهورهما او الحوایا او ما اختلط بعظم ۚ ذلك جزینهم ببغیهم ۚ وانا لصدقون" (سورہ انعام رکوع ۱۷)

مسلمانوں کو اس آیت کو پڑھکر اپنی گریبان میں منہ ڈالنا چاہئے۔ کہ آج ان پر یہ جملہ صادق آتا ہے (وعلی الذین هادوا حرمنا کل ذی ظفر ۚ")

اس کی وجہ وہی قرار دی ہے جو وحشیان جزائر اوقیانوس کی ٹابو (Taboo) کی ہے۔ یعنی اقوام اولین وحشیہ کا یہ خیال تھا کہ ان کے آباؤ اجداد مختلف قسم کے جانوروں سے پیدا ہوئے ہیں اور انکی روح مرنے کے بعد انہیں جانوروں کی روح میں حلول ہوجاتی ہے۔ یہ اوہام جسکو یوروپ کی اصطلاح میں "طوطم" (Totem) کہتے ہیں انکو مجبور کرتا تھا کہ وہ ان جانوروں کے گوشت سے پرہیز کریں جو خود ان کے مورث اعلی رہے ہیں۔ مثلاً بھیڑیوں والا قبیلہ بھیڑ کو نہ کھائے یا کتے والا قبیلہ کتے کے گوشت سے

پرہیز کرے۔ چنانچہ تقریباً انہیں خیالات کی وجہ سے ہندو گوشت سے پرہیز کرتے ہیں کہ کہیں انکے آباؤ اجداد کی روح ان جانوروں میں ہو۔ متوفی مہاراجہ کشمیر نے اپنے زمانے میں یہ حکم جاری کر دیا تھا کہ کشمیر کے اندر کوئی مچھلی کا شکار نہ کرے۔ اس لئے کہ ایک پنڈت کی زبانی مہاراجہ کو معلوم ہوا تھا کہ ان کی والدہ کا جنم مچھلی میں ہوا ہے۔ لیکن جہاں تک میں نے غور کیا سوائے سور کے گوشت کے قرآن نے کہیں حلال و حرام گوشت کی فہرست نہیں بنائی ہے۔ قرآن میں درحقیقت بعض کھانے کی چیزوں کی ممانعت محض حفظان صحت کے خیال سے ہے۔ اور اگر یہ مقصد فوت نہ ہو تو ہمارے معدہ پر بجائے ایمان کا موقوف ہونا یہودیوں اور ہندوؤں کا خیال ہو تو ہو۔ اسلام قرآن کا خیال ہرگز نہیں۔ لفظ میتہ (مردار) میرے خیال میں ان تمام چیزوں پر حاوی ہے جو سڑ گئے ہوں۔ یا بدبودار ہو گئے ہوں یا کیڑے پڑ گئے ہوں۔ اور اگر قرآن نے اس کی تخصیص ممانعت ماکولات میں نہیں کی ہے تو اس کی غالباً یہی وجہ ہے کہ ان سے کراہت کرنا خود انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ ظاہر ہے کہ فطرتاً کوئی انسان بول و براز کے استعمال پر مائل نہ ہوگا۔ اس لئے اس کی ممانعت ایک فضول امر ہوتا۔ اسی طرح بعض طبیعتیں سانپ۔ بچھو۔ کتے۔ بلی کا گوشت دیکھ کر فطرتاً نفرت کرتی ہیں۔ لیکن اگر بعض بلند طبیعتیں اس کے استعمال کر سکتی ہیں تو کیا۔ نیکی ایمانداری اور اسلام ان کے کھانے پر موقوف نہیں۔ البتہ قرآن نے سور کے گوشت کے ممانعت کی تخصیص کیوں کی۔ یہ ضرور ہے کہ قرآن نے ماکولات ممنوعات کے لئے یہ شرط بھی کر دی ہے کہ اگر اس کے بغیر کھائے کوئی چارہ نہ ہو تو کھایا جا سکتا ہے۔ مگر پھر حرام قطعی کرنے کے کیا معنے۔ گویا اگر مسلمان اسکو بلا عذر کھائے تو وہ احکام قرآنی سے صریحی انحراف کر رہا ہے اور نجات کو خطرہ میں ڈال رہا ہے۔

حالانکہ ہم قرآن کے احکام اخلاقی اور شرعی کے اوامر و مناہی میں کچھ نہ کچھ فوائد اور علت ضرور پاتے ہیں۔ میرا اپنا خیال ہے (ممکن ہے کہ غلط ہو) کہ سامی قوم سوروں کی ریوڑوں کو پلیدی اور ناپاکی کا منبع سمجھتے تھے۔ چنانچہ انجیل میں ایک واقعہ کا ذکر ہے کہ جب مسیح نے پلید ارواح کو نکالا تو انہوں نے استدعا کی کہ انکو سوروں کے ریوڑوں میں رہنے کے لئے بھیج دیا جائے۔ اور یہ دیکھا بھی گیا ہے کہ جہاں سور کے ریوڑ رکھے جاتے ہیں وہ جگہ نہایت غلیظ و گندی ہوتی ہے۔ گویا سور ہی ایک ایسا جانور ہے، جو بول و براز اور گندگی میں پرورش پاتا ہے۔ اور اگر عرب لوگ آبادیوں میں پالنے کے لئے ان کو رکھتے تو یقیناً ایسے زمانہ میں جب کہ عرب کو حفظان صحت کی تدابیر پوری طرح معلوم نہ تھیں۔ وہ بہت قسم کی وباؤں اور ہلاکت کا سبب ہوتیں۔ پس اگر انکے کھانے کی اجازت نہ دی جائے گی تو کوئی انکو پالنے پر بھی آمادہ نہ ہوگا اور اس طرح ایک لازمی آفت سے شہر و دیہات کو بچانا مقصود تھا۔ اور اگر یہ وجہ نہیں ہے تو غالباً اقوام سامیہ جس میں۔ یہود۔ عرب و اہل بابل حبش و مصر شامل تھے، ان کا یہ قدیم مسلک تھا جس کی کوئی خاص وجہ نہ تھی یا وہی ہو جیسا ہندوؤں میں گائے کے گوشت کی ہے۔ اور قرآن نے عربوں کی اس قومی عادت کی تائید کر دی اس لئے کہ اسلام کو یہود کے آگے بھی پیش کرنا تھا۔ اور اگر عربوں کو ایسی باتوں سے منع نہ کر دیا جاتا۔

؎ دیکھو اسلامک ریویو ماہ اکتوبر ۱۹۲۸ء دوکنگ مضمون ڈاکٹر محمد جعفر۔ جس میں فاضل ڈاکٹر نے میرے خیال کی تائید کی ہے۔

تو یہود بغض قومی کے وجہ سے ان پر ناپاک ہونے کا طعنہ بھی دیتے اور اسلام کی طرف مشکل سے مائل ہوتے۔ ایسی صورت میں فمن اضطر غیر باغ ولا عاد کے معنی کو اور وسیع کرنا پڑے گا اور سامی قوموں کے علاوہ دوسری اقوام میں اس کے کھانے اور نہ کھانے پر چنداں زور نہ دیا جائیگا لیکن اب تو ہماری ذہنیت کا یہ حال ہے کہ جب میں عراق میں ترجمان جیوش تھا اور میرا کھانا سارجنٹ کے مس (Sergts. M.) میں ہوتا تھا میں نے کبھی سور کا گوشت چھوا تک نہیں البتہ میز پر ضرور آتا تھا۔ اور انگریز اس کو کھاتے تھے، مگر اتنے قصور پر تمام پنجابی مسلمان سپاہیوں نے میرا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ حالانکہ پنجابی اصحاب میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جو خوب شرابیں پیتے تھے۔ اور بعض اوقات ایسے نالائق حرکات کرتے تھے، جو ذکر نہیں کئے جا سکتے۔ اس سلسلہ میں ایک بات ذبیحہ کے متعلق رہ جاتی ہے اور جس کے متعلق عام طور سے مسلمانوں کا خیال ہے کہ جانور جو ایک خاص طریقہ سے ذبح نہ کئے جائیں اور ذبح کرتے وقت بسم اللہ اللہ اکبر نہ پڑھا جائے تو ایسے جانور کا پیٹ میں اترنا اور ایمان کا سلب ہونا لازم و ملزوم ہے۔ مگر یہ ساری غلط فہمی اس بات سے پیدا ہوئی کہ قرآن شریف میں مسلمانوں کو بتوں کی قربانی کے گوشت کی ممانعت ہے یعنی ایسے تمام جانوروں کے گوشت سے جو خدا کے نام پر ذبح نہ کئے جائیں، اس کے یہ معنی نہیں کہ مسلمان نے جہاں بغیر ذبح کئے ہوئے گوشت کو کھایا اور اسکا ایمان بگڑا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اہل کتاب کا کھانا ہر طرح حلال ہے اور اہل کتاب کے ذبح کا طریقہ ہمارا سا نہیں اور نہ وہ خدا کا نام لیتے ہیں۔ اور اسی لئے یہ بھی کہ اگر کتا شکار کو پکڑ کر مار ڈالے تو اس کے کھانے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ مگر اس قول پر ایک اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ قرآن نے جب یہ کہا کہ تم مسلمانوں کو اہل کتاب کا کھانا حلال ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ جو مسلمان یا اہل کتاب نہ ہوں ان کا کھانا مسلمانوں کے لئے مباح نہیں اور اسمیں ہندوؤں کے چھوت چھات کی بو آتی ہے۔ اور ہمارا قول یہ ہے کہ احکام قرآنی کا مقصد محض خود اپنے اور اپنے تمام ابنائے جنس کی حفاظت نفس ہے۔ اور یہ ایک لایعنی سی بات ہے کہ ہم دوزخ میں اس لئے ڈالے جائیں کہ ہم ایک خاص طریقہ سے کھانا نہ کھائیں۔ یا ایک شخص کے ہاتھ سے یا اس گھر سے جو مسلمان یا اہل کتاب نہو، میرا اپنا قیاس یہ ہے (اور خدا کیلئے میرے قیاس کو قیاس ہی سمجھو اور اگر اس سے بہتر باتیں تم جانتے ہو اور اسکی تائید میں قرآن ہو تو میرے قیاس کو نہ مانو) کہ طعام سے ہر قسم کی مواصلت و سوسائٹی ہے۔ مشرکین کے ساتھ اس زمانہ میں جب کہ انکے اور مسلمانوں کے درمیان حالت جنگ قائم تھی۔ اسکی ممانعت ہوگی۔ مگر اہل کتاب کے ساتھ حالت جنگ قائم نہ رہی ہوگی، اس لئے ان کے ساتھ مواکلت و مشاربت بہر حال خود کر دی گئی۔ اور مشرکین سے حالت جنگ ختم ہونے کے بعد کسی امر کی ضرورت اس سے باقی نہ رہی کہ کوئی مشرک باقی نہ رہ گیا تھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ ذبیحہ مثل دوسرے احکام معاشرت کے مذہب سے علیحدہ شے ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو ہمکو در حقیقت ہندوؤں کی ظاہر پرستی اور چھوت چھات پر اعتراض کا کوئی حق ہو ہی نہیں سکتا۔

قربانی

قربانی کا مقصد جیسا میں نے اس کتاب کے پہلے باب میں دکھلایا ہے اور جیسا ڈاکٹر ٹائلر (Dr. Tylor) کا خیال ہے سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ اقوام وحشیہ نے موت و بیماریوں کا سبب ایک قسم کا خونخوار دیوتا خیال کیا تھا اور ان کی پرستش کے ساتھ ان کو خوش کرنے یا ان کی بھوک کو رفع کرنے کیلئے اپنی جان کا بدل جانوروں کے ذبح کرنے اور ان کی نذر گزراننے کا (تاکہ انکی خونخواریت بھوک سے مجبور ہو کر خود انکی جان نہ لے) عام طریقہ اختیار کیا۔ یہ تو اس قربانی کا ۲۴

مشابہ تھا جس کا مترادف انگریزی میں سیکریفائس (Sacrifice) اور ہندوؤں میں بھینٹ اور پرشاد ہے، مگر خود قربانی کا لفظ اقوام سامیہ کی ایک ایسی اصطلاح ہے جس کے معنی سے یہ خیال پیدا نہیں ہوتا، قربانی کے معنی نزدیکی کے ہیں۔ اور یہی معنی عربی زبان میں بھی ہیں۔ چنانچہ قرآن میں آیا ہے "واتل علیھم نبا ابنی آدم اذ قربا قربانا فتقبل من احدھما ولم یتقبل من الآخر" (المائدہ رکوع ۵) اسی واسطے رابرٹسن اسمتھ (Robertson Smith) مصنف "مذاہب سامیہ" کا خیال ہے کہ قربانی کی رسم کا مدعا اصل یہ تھا کہ دیوتاؤں اور پجاریوں کے درمیان ایک سفرۂ ضیافت بچھایا جائے اور اس ذریعہ سے دونوں میں ایک قسم کی قربت و مؤانست یا یگانگت پیدا کی جائے۔ ڈاکٹر فریزر (Dr. Frazer) کا خیال ہے کہ دیوتاؤں کی زندگی کو تازہ کرنے اور ان کو بوڑھا نہ ہونے دینے کے لئے ہر سال جانوروں کو مار کر اس کے خون و روح سے انکی زندگی کو تازگی و تقویت پہونچائی جائے۔ جیسا پرانے زمانے کے بعض سلاطین بشریہ اپنی زندگی کے بڑھانے کے لئے دوسرے انسانوں کی جان لینے میں دریغ نہ کرتے تھے۔ ماریلیر (Marillier) فرانسیسی کا قول ہے کہ قربانی کا خیال سحر کے خیال پر مبنی ہے کہ ابتدائی قوموں کا خیال تھا کہ خون کے گرنے سے سحر کا اثر جو انسان اپنے اوپر وہم کرتا ہے جاتا رہتا ہے۔

جن لوگوں نے یہود، ہنود و پارسیوں کے کتب مذہبی کا مطالعہ کیا ہے وہ غالباً اس بات کو حیرت سے دیکھیں گے کہ یہ مذاہب جو الہامی ہونے کے مدعی ہیں رسم قربانی میں عام وحشیوں کے ہم نوا ہیں۔ گویا قربانی کا ان مذاہب میں ایک رسم مذہبی اور عبادت قرار پانا صرف اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ وہ مذاہب بھی اپنے اندر بہت سے ایام وحشت و جہالت کی یادگار رکھتے ہیں۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ہم کسی مذہب کے الہامی اور غیر الہامی ہونے کا کوئی معیار مقرر کر سکتے ہیں تو ہمارے لئے اسقدر کافی ہے کہ یہ جانچ کر لیں کہ اس مذہب میں قربانی کرنا ایک مذہبی فریضہ ہے یا نہیں۔ اور اگر اسکے مذہب میں قربانی مناسک مذہب میں سے قرار پائی ہے تو ہم یقیناً یہی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ وہ مذہب خدا شناسی سے قاصر ہے اور اس نے انسانی ہراس موت کی تشفی کے لئے قربانی کا طریقہ ایجاد کیا، کیونکہ ظاہر ہے کہ یہ فعل اسی اسی خیال پر مبنی ہوگا کہ دیوتاؤں کی خونخواری کے لئے تازہ خون ہم پہونچایا جائے ورنہ اگر ان کو بھوک نے ستایا تو وہ ہماری جان کو لیکر رہیں گے۔ اور یہ اعتقاد ہرگز الہامی اعتقاد نہیں ہو سکتا۔

عرب میں اسلام کی تجدید سے قبل تمام دنیا کا یہی مسلک رہا ہے۔ اور اگر قربانی کا طریقہ الہامی مذاہب میں پایا جاتا ہے تو اسکی صرف دو ہی توجیہہ ہو سکتی ہیں یا تو یہ طریقہ بعد کو اوہامی خیالات کے فروغ سے الحاق ہو گیا یا پھر قربانی کا مقصد یہ تھا کہ انسان اس خالق و رزاق کے سامنے چند ہدایا گزران کر اپنی عبدیت اور ممنونیت کا اظہار کرے۔ غالباً اسی وجہ سے مسلمانوں میں قربانی کا گوشت فقراء و مساکین میں تقسیم کر دیا جاتا ہے جو ایک قسم کی خیرات ہے اور یہودیوں کی طرح وہ قربان گاہ پر جلا کر چراہند پیدا نہیں کرتے۔ شاید اسی قسم کی نذر و ہدیہ کا حوالہ قرآن کی اس آیت میں ہے جو میں نے ابھی نقل کی ہے۔

مگر اس تاویل میں دقت یہ آپڑتی ہے کہ جانور کا ذبح کیا جانا کیوں شرط قربانی ہے حالانکہ اگر بلاضرورت جانور کو ذبح کیا جائے تو یہ ایک قسم کی سنگدلی اور شقاوت ہے اور اس سے خونخوار دیوتا خوش ہو تو ہو۔ خدائے اسلام کو کوئی دلی حظ یا مسرت نہیں حاصل ہو سکتی خود

قرآن شریف میں ہے "لن ینال اللہ لحومہا ولا دماؤھا ولکن ینالہ التقویٰ" اور یہ کہ کسی جانور کو بلا وجہ ایک شے ہم پر ذبح کر دیا جائے ایک عبث و برا فعل ہے وہ اس مشہور حدیث سے ثابت ہے۔ کہ آنحضرت کے زمانے میں کسی عورت کے پاس ایک اونٹ تھا، اس اونٹ نے اسکو ایک خطرہ سے اور جنگل میں گم جانے کے وقت بچالیا تھا اس شکر گذاری میں اس عورت نے چاہا کہ وہ اس اونٹ کو کعبہ میں قربانی دے۔ آنحضرت نے جب اس کے اس ارادہ کو سنا تو فرمایا۔ سبحان اللہ اونٹ کی خدمت کی جزا کیا اچھی دی گئی اور آپ نے فوراً اس اونٹ کو اس سے لے لیا اسلئے اگر یہودیوں کا مذہب الہامی سمجھا جائے تو اسکی تاویل یہی ہو سکتی ہے کہ یہودیوں نے امتداد زمانہ اور مشرکین کنعان کی صحبت بد سے یہ رسم اختیار کر لی۔ اور یہ ثابت ہے کہ یہودیوں نے حضرت موسیٰ اور بنیا کے زمانہ میں بت پرستی اختیار کر لی تھی یکم سے کم انکا بعل دیوتا کو پوجنا ایک تاریخی واقعہ ہے۔ باقی رہا اسلام۔ اس کے متعلق میں آزادی سے محاکمہ کر سکتا ہوں۔ سب سے پہلے ہمکو یہ دیکھنا ہے کہ عید الضحےٰ یا ایام حج میں خصوصاً منا کے روز جو جانور ذبح کئے جاتے ہیں وہ کس اعتقاد پر مبنی ہیں۔ ہمارے علما تو بحث یہ فرما دیں گے کہ جناب یہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی سنت دینیہ ہے۔ جب وہ حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی دینے چلے تھے تو خدا نے انکے ایمان کی آزمائش میں انکو پورا پاکر بہشت سے ایک موٹا تازہ دنبہ بھجوا دیا، اور حضرت ابراہیم نے اس کو پکڑ کر اپنے بیٹے کی جگہ اسکی قربانی کردی۔ حضرت ابراہیم کا اپنے بیٹے کی قربانی کرنا یا اسکی جگہ کسی دنبہ کی قربانی کرنا کوئی خلاف واقعہ بات نہیں۔ حضرت ابراہیم خود عرصے تک اور انکے آباؤ اجداد بابل کے قدیم مذہب کے پابند تھے جس میں قربانی کی رسم تھی، حضرت ابراہیم نے جب اپنے آبائی مذہب اور وطن کو ترک کیا اور نبوت و رسالت کو پہونچے تو شیطان نے انکو پرانی مذہبی رسم یاد دلاکر دھوکا دیا کہ یہ رسم تمکو اب بھی کرنا چاہیئے۔ وہ اس دھوکے میں آنے ہی والے تھے کہ خدا کے فرشتے نے انکو وقت پر آگاہ کر دیا۔ چونکہ حضرت ابراہیم ایک بہت بڑی غلطی سے بچائے گئے تھے۔ ممکن ہے انہوں نے اسکی یادگار میں ایک دنبہ اسوقت ذبح کر دیا ہو۔ یا ہر سال ایک دنبہ ذبح کر دیا کرتے تھے۔ جو اس یاد کو تازہ کرنے کے ساتھ انکی خوراک کے کام آتا تھا۔ اور یہ یادگار مکہ میں قایم رہ گئی شاید و فدیناہ بذبح عظیم میں اسکا حوالہ ہو۔ اب رہا ارکان حج میں سے قربانی کا ضروری ہونا تو ارکان واجبات حج کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

ارکان:۔ احرام۔ طواف۔ سعی۔ وقوف عرفات

واجبات:۔ رمی جمار۔ قیام مزدلفہ۔ قیام منا۔ طواف وداع

فقہا نے واجبات کے ترک پر قربانی کا کرنے کا حکم دیا ہے۔ مگر یہ واجبات بذات خود اختیاری ہیں اور اس کے کفارہ میں قربانی کا حکم فقہا کا محض قیاس ہے۔

مناہیات حج۔ مردوں کو سلا ہوا کپڑا پہننا۔ عورتوں کو منہ ڈھانکنا۔ خوشبوؤں کا استعمال کرنا۔ عورتوں سے ہم بستر ہونا یا مقدمات جماع میں کوئی بات کرنا۔ شکار کرنا۔ انمیں سے کسی کام کے خلاف کرنے پر فقہا نے قربانی کا حکم دیا ہے۔ مگر یہ بھی محض انکا قیاس ہے۔ قرآن تو علیحدہ رہا حدیث بھی اس سے خاموش ہے۔ فقہا نے ان صورتوں کے علاوہ اور بہت سی صورتوں میں محرم کو قربانی کی ہدایت کی ہے مگر ہمکو کوئی ایسی مرفوع اور متصل الاسناد حدیث نہیں ملی جس سے ثابت ہو کہ فقہا کی تجویز کی ہوئی صورتوں میں قربانی کرنا ضروری ہے۔ ممکن ہے کہ فقہا نے صور مذکورہ کو قتل صید وغیرہ پر قیاس کرکے ان میں بھی فدیہ تجویز کیا ہو ورنہ کوئی نص صریح و صحیح تو ان پر قائم ہی نہیں۔

قرآن مجید میں صرف چار صورتوں میں فدیہ دینے کا حکم ہے۔ تین صورتیں تو آیۂ واتموا الحج والعمرۃ للہ میں مذکور ہیں جو عنوان حج کی پہلی آیت ہے اور ایک ساتویں پارے کے دوسرے رکوع میں یعنی قتل صید میں۔ واجبات کی تاکید اگر آنحضرتؐ نے کی ہے اور مناہیات سے منع کرنے کا اگر کہیں حکم ہے تو قربانی کے ذریعہ سے فدیہ دینے کا حکم کم سے کم میری نظر سے نہیں گذرا بلکہ اگر اس حدیث[1] کو صحیح مانا جائے تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص حالت احرام میں خوشبو سے لتھڑا ہوا کپڑا پہن لے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ کپڑے کو تین دفعہ دھو ڈالے، اور اسی پر اور صور ممنوعہ کو قیاس کر لینا چاہیئے۔ الغرض اس حدیث سے بھی ہمیں اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ آنحضرت نے ان صورتوں میں فدیہ کا حکم فرمایا ہو، اور جب یہ ہے تو ہمارے نزدیک ہمیں خون پر اکتفا کر لینا چاہیئے جو قرآن و حدیث میں آئے ہیں۔ پھر جو لوگ یوم النحر میں کثرت سے قربانیاں کرتے ہیں یہاں تک کہ ایک شخص سو سو دو دو سو جانور ذبح کر ڈالتا ہے وہ محض بے سود اور نہ محض بے سود بلکہ بدعت میں داخل ہے۔ سنا جاتا ہے کہ یوم النحر کو منا میں اسقدر قربانیاں ہوتی ہیں کہ گوشت کثرت کی وجہ سے کھتوں میں دبا دیا جاتا ہے اور اسکا کوئی کھانے والا نہیں ملتا۔ خیریت یہ ہے کہ عرب کی آب و ہوا خشک ہے ورنہ مکہ اور اسکے جوار میں ایسی ہولناک بیماریاں پیدا ہو جاتیں کہ مذہب اسلام کی اقوام پر ایک لعنت ظاہر کرنے کے لئے دشمنان دین کو اچھا موقع ہاتھ لگ جاتا۔

قرآن میں ایک جگہ ہے فصل لربک وانحر اور النحر کے معنے قربانی کرنے کے عام طور سے سمجھے جاتے ہیں مگر میرا خیال ہے کہ یہاں پر النحر کے معنی وہ نہیں ہیں جو عام طور سے سمجھے جاتے ہیں۔ اور نہ سیاق عبارت سے یہاں پر اسکی مراد لی جا سکتی ہے۔ النحر کے عربی کئی معنے ہوتے ہیں اور ایک معنی دل کی توجہ کے ہیں جو یہاں پر زیادہ موزوں معلوم دیتا ہے۔

غرضکہ جہاں تک میں نے غور کیا ایام حج کو جانور ذبح کئے جانے کا کوئی مذہبی فریضہ اسلام میں معلوم نہیں ہوتا۔ البتہ اس کے عربی قومی رسم ہونے میں کوئی کلام نہیں اور اگر یہ عبادت اسلام عرب میں باقی رکھی گئی ہے یا رکھی جائے تو اسکا مقصد جاہلیت میں خواہ کچھ ہو اب صرف اسی قدر ہو سکتا ہے کہ ان ایام عید و جشن و اجتماع میں ضیافتیں دعوتیں ہوں۔ اور لوگ سیر ہو کر کھائیں اور اس کے لئے جانور ذبح کئے جائیں۔ خصوصاً ایسے زمانہ میں جبکہ ایام حج میں دس روز تک ہر قسم کے شکار کی ممانعت کر دی جاتی ہے۔ لیکن یہ کسقدر شرم اور افسوس کی بات ہے کہ باوجودیکہ قرآن ہی دنیا کی ایک ایسی مذہبی کتاب ہے جس نے سب سے پہلے اس تصریح کو ضروری سمجھا ہے کہ جانور کا خون و گوشت خدا کو نہیں پہونچتا جیسا کفار جاہلیۃ و وحشیہ کا خیال تھا۔ اب تو مسلمان قربانی کو تقریباً اسی اعتقاد پر کرتے ہیں جو ایک ہندو کالی مائی پر بکرے کے بھینٹ سے کرتا ہے۔ اور ہر مسلمان جو قربانی کرتا ہے اسکو یہ بتایا جاتا ہے کہ قیامت کے روز وہ تمام جانور اسکی سواریوں کے کام آویں گے اور فقہا نے تو یہودیوں کی طرح نقل کی ہے کہ اگر جانور عیب دار ہو یا اس کے کان کٹے ہوں یا کوئی سا بھی عیب شرعی

---

[1] عن یعلی بن امیہ قال کنا عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم بالعمرۃ اذ جاءہ رجل اعرابی علیہ جبۃ وھو منضمخ بالخلوق۔ فقال یا رسول اللہ انی احرمت بالعمرۃ وھذہ علی فقال۔ اما الطیب الذی بک فاغسلہ ثلث مرات واما الجبۃ فانزعھا ثم اصنع فی عمرتک کما تصنع فی حجک (صحیحین)

اس میں ہو تو اللہ میاں کو ایسا بکرا پسند نہ آئے گا اور اس کی قربانی بے سود ہوگی (و نعوذ باللہ من تلبیس الاباليس و الخرافات العوام) اگر جانوروں کو بلا ضرورت ذبح کرنے کا یہی مقصد ہے کہ اس سے خدا خوش ہوتا ہے تو ایسے مذہب کو اور ایسے خدا کو دور سے سلام ہے۔ خدا کی شان نظر آتی ہے کہ جن مذاہب میں ان خیالات کی بنا پر قربانی ایک فریضۂ مذہبی ہے مثلاً یہود، ہنود و مجوس انھوں نے تو اکثر اس دور تمدن میں اس مذموم حرکت کو ترک کر دیا ہے اور مسلمان جن کے قرآن نے اس رسم کے خلاف سب سے پہلی آواز اٹھائی تھی وہ جنون و جہالت مذہبی اور نیز یہودیت کے احکام سے متاثر ہو کر اس کو ایک فریضہ جانکر اسلام کو بدنام کر رہے ہیں اور مذہب اسلام کو ایک خونی مذہب دکھلا رہے ہیں۔ اور ہندوستان میں تو وہ بکروں اور گایوں کے ساتھ اکثر اوقات اپنی ہمسایہ قوموں کے ہاتھوں سے خود بھی قربان ہو گئے ہیں اور یہ کتنی بڑی لطف کی بات ہے کہ مسلمان کا گھر سال بھر میں ایک بار بوچڑ خانہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ بھی خیریت ہے کہ مسلمان ابھی انھیں ممالک میں پھیلے ہیں جہاں تمدن ادنیٰ درجہ پر ہے۔ اور جہاں کی میونسپلٹیوں کو بھی اپنے احکام حفظان صحت کو پورے رواج دینے کا خیال نہیں آیا لیکن اکثر اوقات میں سوچتا ہوں کہ اگر ہمارے مولوی یورپ یا امریکہ کے کسی ملک میں مبعوث کیے جائیں تو بیچارے اس فریضہ مذہبی کو اپنے گھر کے اندر کیسے بجا لائیں گے۔ مگر چونکہ اب تقریباً اسلام ایک قسم کا قومی مذہب ہو گیا ہے جو صرف گرم ملکوں کے غیر ترقی یافتہ قوموں کے اندر محدود ہے۔ یورپ و امریکہ کا اندیشہ لایعنی سی بات ہے میں نے یہ جملہ اس لئے کہہ دیا تھا کہ میرے سامنے قرآن کا اسلام وہ ہی جو تمام دنیا میں پھیلایا جا سکتا ہے۔ اور جو ہمارے موجودہ اسلام سے بیّن فرق رکھتا ہے۔

بخور جلانا یا ہوَن کرنا

عبادت مذہبی کی دوسری صورت یعنی بخور و خوشبو میں جلانا گویا قربانی کی ایک ارتقائی صورت ہے پہلی صورت کا مقصد یہ تھا کہ دیوتاؤں کی بھوک کی خصبناکی انکو خوراک دیکر دور کی جائے اور بخور جلانے کا یہ مقصد ہے کہ دیوتاؤں کا غصہ و قہر خوشبوؤں کے پھیلانے سے ٹھنڈا کیا جائے۔ بائبل کے عہد نامۂ قدیم کے صفحات اس بات کا پورا پتہ دے رہے ہیں کہ ابتدائی عقول انسانی کیونکر رفتہ رفتہ جانوروں کی قربانی سے ترقی کرتے کرتے بخور جلانے والی عبادت پر پہونچے ہیں۔ کیونکہ بخور جلانے کا ذکر شریعت موسوی کے قبل کہیں نہیں ہے لیکن مصر کے آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ مصریوں میں یہ معمولات بہت زمانہ دراز سے گئے ہیں مصر میں جس قدر پرانے معابد کے آثار باقی رہ گئے ہیں ان کے نقش و نگار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملوک و فراعنۂ مصر اپنے دیوتاؤں کے آگے بخور جلانے والے برتن لئے ہوئے کھڑے ہیں۔ ان کے ایک ہاتھ میں بخور جلانے والا برتن ہے اور دوسرے ہاتھ سے وہ بخور لے کر اس میں جلانے کے لئے ڈال رہے ہیں۔ بعض اوقات ایک ہاتھ میں بخور جلانے کا برتن ہوتا ہے، اور دوسرے ہاتھ میں کوئی سرکہ یا کسی قسم کی شراب یا شربت وغیرہ دیوتاؤں کے نذر کرنے کے لئے زمین پر ڈال رہے ہیں۔ سب سے صاف نقش و نگار اس قسم کی عبادات کا اہرام مصری جیزہ میں ہے جس میں فرعون تماسس ( ) آفتاب کے دیوتا "را" (Ra) کے سامنے ایک ہاتھ سے شراب کی نذر دے رہا ہے اور دوسرے ہاتھ سے بخور جلانے کا برتن لئے دھونیاں دے رہا ہے مصریوں (بلکہ عموماً تمام غیر آریہ

قوموں) کا عام دستور یہ تھا کہ وہ اپنے دیوتاؤں کی تین وقت پرستش کیا کرتے تھے۔ صبح ظہر و شام۔ صبح کے وقت وہ بخور کے لئے لوبان استعمال کیا کرتے تھے۔ عصر کے وقت مُر اور شام کے وقت ایک قسم کا مخلوط مسالہ۔ پلوٹارک (Plutarch) نے لکھا ہے کہ بخورات میں علاوہ اس تاثیر کے جو دیوتاؤں کی غضبناکی کے فرو کرنے کا کام دیتا تھا۔ اس سے ایک دوسرا فائدہ یہ بھی ہوتا تھا کہ اسکی خوشبوؤں سے پجاریوں پر ایک خاص قسم کا اعصابی اثر پڑتا تھا۔

یہودیوں کی کتاب مقدس میں بخورات کے لئے لفظ "کتورہ" استعمال کیا گیا ہے جو فعل "کتر" سے بنا ہے اور جس کے معنی یہ ہیں کہ ایسی خوشبوئیں جو تسلی دینے والی ہوں اور اس میں قربانی کے گوشت کی چربی سے لیکر ہر قسم کی ادویات جس کے جلانے سے خوشبودار دھواں پیدا ہو سب شامل تھے۔ ارمیاہ اور یشعیاہ کے نوشتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے زمانے میں بخورات کے لئے لوبان جلانے کا عام دستور تھا، قربان گاہ پر یہودیوں کے احبار صبح کے وقت جبکہ عبادت گاہ کے چراغ میں بتی الکسائی جاتی تھی اور ہر شام کے وقت جبکہ عبادت گاہ کے چراغ روشن کئے جاتے تھے اور سال میں ایک بار ہیکل کے سب سے زیادہ مقدس مقام پر آگ کے ان شعلوں سے جو قربان گاہ سے لئے جاتے تھے یہ خوشبوئیں جلائی جاتی تھیں۔ اور پھر سبت کو بخور اور قربانی کا گوشت اور فطیری روٹی قربان گاہ پر چڑھائی جاتی تھی۔ اس بخور جلانے کا جو مقصد ہوتا تھا اسکی پوری توجیہہ کتاب استثنا کے باب ۱۶ کے ۲ اور ۱۷ آیتوں میں مسطور ہے۔ توریت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مردوں کے پاس اور اکثر اوقات گھروں میں بھی اسکا استعمال کیا جاتا تھا۔

نینوا (Assurbanipal) کی عمارتوں کے نقوش و نگار سے پتہ چلتا ہے کہ اہل اسور و کلدان بھی اپنی دیوی اور دیوتاؤں کے سامنے بخور جلایا کرتے تھے۔ شاہان اسور اور مذہب کے یہ دستور بخور جلانے اور شجر زندگی پر شراب ڈالنے کی تمثالیں اکثر عمارتوں پر پائی گئی ہیں۔ بقول ہیروڈوٹس تقریباً ایک ہزار مروجہ کی خوشبوئیں بعل دیوتا کے میلے میں بابل کی سب سے بڑی قربانگاہ پر جلائی جاتی تھیں۔ پرسیپولس (Persepolis) یا اصطخر قدیم پایہ تخت فارس کے آثار اور شاہان ساسان کے قدیم سکوں سے پتہ چلتا ہے کہ خوشبو کا جلانا ایران قدیم کی بھی ویسی ہی ایک مذہبی عبادت تھی۔ جیسا کہ مصر و بابل اور یہودوں میں تھی۔ سامی قوموں میں عبادت کے معینہ تین تھے یعنی صبح، عصر و شام۔ مگر مجوسیوں میں اوقات عبادات پانچ ہوتے تھے دو زائد وقت دوپہر اور مغرب کے تھے۔ ان پانچ اوقات میں موبدان مجوس خوشبوؤں کو اپنی مقدس آگ کی قربانگاہ پر جلاتے تھے۔ اوستا میں خوشبوئیں جو عبادات میں مستعمل ہوتی تھیں، انکا نام "رو ہوگا دنو" لکھا ہے۔ ہیروڈوٹس کا بیان ہے کہ دارا کے وقت میں عربوں سے تقریباً ہزاروں مروجہ کے قریب خوشبوئیات کا خراج لیا جاتا تھا۔ اب بھی ہندوستان کے پارسیوں میں یہ قدیم مذہبی رسم اس طرح جاری ہے [illegible] تھی۔

[illegible] رامائن اور مہابھارت میں ہندوؤں کا زمانۂ قدیم سے اپنے دیوتاؤں کے آگے خوشبوئیں جلا[illegible] چلتا ہے۔ [illegible] بودھ کے زمانہ میں بھی ہندوؤں میں خوشبو جلانے کا عام دستور تھا، اور اب بھی جہاں جہاں بدھ مذہب [illegible] ہے وہاں خوشبو جلانیکی عام رسم مذہبی پائی جاتی ہے۔ موجودہ ہندو مذاہب میں ہون کرنا خاص فریضۂ مذہبی ہے۔ ہون میں اور خوشبوؤں کے علاوہ گھی کا جلانا بھی ضروری سمجھا جاتا ہے۔

قدیم یونانیوں میں ہومر کے بعض جملوں سے لوگوں کو شک ہوگیا ہے کہ آیا بخور کا جلانا قدیم یونانیوں کا مذہبی فریضہ تھا یا نہیں۔ اور آیا وہ لوگ قربانی کے ساتھ اسکا استعمال کرتے تھے۔ لیکن عود کا گھروں میں جلانا تو یقینی طور سے کہا جا سکتا ہے۔ مگر چونکہ یہ خوشبو ہندوستان میں پیدا نہیں ہوتی تھیں اور ان کی تجارت یونان میں آٹھ صدی قبل مسیح تک وسیع نہیں ہوئی تھی۔ اسواسطے قیاس یہ ہے کہ یونانی بھی اپنے دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے کسی نہ کسی قسم کی خوشبو کرتے تھے۔ گو کہ وہ بخور نہ ہوتے تھے۔ چنانچہ منا جاتیں جو "اُرنِک" کے نام سے موسوم ہیں ان میں اس بات کی پوری صراحت ہے کہ کون کون سے دیوتا کن کن خوشبوؤں سے محظوظ ہوتے تھے۔ ان ادویات میں بعض ایسی چیزیں بھی ہیں جو بلحاظ خوشبو کے کوئی خاص وقعت نہ رکھتی تھیں مگر شاید ان میں کوئی اور خاص خصوصیت پائی جاتی ہوئی۔

قدیم رومیوں میں بخور کا جلانا مذہبی فریضہ کے طور پر اس سے بہت قبل رائج تھا جبکہ ہندوستان کے خوشبودار مصالحوں سے وہ لوگ واقف ہوئے تھے اور اس کے بعد تو بخور ایک مخصوص شغل مذہبی ہوگیا تھا۔ اور نہ صرف عبادتگاہوں میں استعمال کیا جاتا تھا بلکہ بعض ایسی تقریبات میں جبکہ ایک فاتح فتحمندانہ طریقے سے شہر میں داخل ہوتا تھا۔ خانگی زندگی میں بھی خوشبوؤں کا استعمال اکثر وقتوں پر کیا گیا ہے۔ رومی اپنے خاندانی دیوتا لار فیملیر یائس ([illegible]) کے آگے اسکو روزانہ وقت معینہ پر جلایا کرتے تھے اور قربانیوں میں جانوروں کے سر پیر میں یہ خوشبو میں لگاکر ذبح کئے جاتے تھے اور اسکے بعد وہ قربانی کے خون میں ملا کر دیوتاؤں کو چڑھایا جاتا تھا اور اکثر اوقات اس آگ میں بھی ڈالا جاتا تھا جسپر قربانی جلائی جاتی تھی۔

مسیحیوں میں بھی بخور کا استعمال مذہبی فریضہ کے طور سے کیا گیا ہے اور اب بھی بعض کلیسا میں کیا جاتا ہے قبل اس کے عقائد منبقیہ کے لئیں سے قسطنطین نے مسیحیت کو قدیم رومیوں کے مذہب کی صورت میں مسخ کر دیا علمائے مسیحیت نے بخور کا استعمال مشرکانہ اور بت پرستانہ رسم قرار دیکر محض خانگی ضرورتوں میں اس کے استعمال کی اجازت دی تھی اور ٹرٹیلین نے اس کا جواز صرف اس واسطے تسلیم کیا تھا کہ یہ چیزیں محض ناپاکی اور بدبو دور کرنے کا ذریعہ ہیں۔ لیکن ابتدائی زمانہ مسیحیت میں حواریان مسیح کی بعض تحریروں سے ثابت ہوتا ہے کہ خوشبوؤں کا استعمال یوکارسٹ کے رسوم میں کیا گیا ہے۔ اور "ادیگیرسیس" ([illegible]) نے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے حسروان عجم خوشبوؤں کا ایک بڑا ذخیرہ یروشلیم کی ہیکل میں جلانے کے لئے بھیجا کرتے تھے۔ پوپ گریگوری ([illegible]) کے زمانہ سے پہلے اس کا استعمال مذہبی جلوس اور عبادات میں کثرت سے کیا گیا ہے۔ غالباً ابتدائی زمانے میں مسیحیت میں بھی ان مراسم کے ادا کرنے کا وہی منشار تھا جو بت پرست مشرکین اور یہود کی قوموں کا تھا گو کہ بعد کو علمائے مسیحیت نے اسکی توجیہہ یوں کر لی کہ خوشبو کا استعمال محض گندگی اور بدبو کو دور کرنے کے لئے ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک مورخ نے شارلمین (Charleman) کے زمانہ میں خوشبو پر برکات دینے کا یہ منشار لکھا ہے کہ "خدائے قدوس ان خوشبوؤں کو برکت دے تاکہ اس سے بری بدبوئیں دور ہوں اور تاکہ اچھی خوشبوئیں پھیلیں" مگر اولین متقدین علمائے مسیحیت کا بخور جلانے کی رسم سے انکار اور انکا احتجاج اس بات پر ضرور دلالت کرتا ہے کہ ابتدائی مسیحیت میں قربانی اور

خون کی چراہند کے ساتھ بخور کا استعمال انہیں عقائد سے ہوا کرتا تھا جو عام مشرکین اور یہود کا خیال تھا۔

مسلمانوں میں بخور کے متعلق کوئی مذہبی احکام نہیں پایا جاتا۔ اگرچہ صوفیہ میں مزارات اولیا پر بخور جلانے کی رسم ہے۔ مگر مزارات و بخور دونوں باتیں اسلام سے باہر ہیں۔ اور جو لوگ اسکو کرتے ہیں وہ اسکو مذہبی فریضہ نہیں جانتے۔ بلکہ یا تو بد اعتقادی اور بدبختی سے یہ باتیں کرتے ہیں یا اپنے معاش کا ایک ذریعہ جان کر قبروں کو بتکدہ بناتے ہیں۔ اسلام انکے فعل کا ذمہ دار نہیں۔

(باقی آیندہ)

سید مقبول احمد

قبیلہ بنی عذرہ کی داستان حسن و عشق

اور
معاویہ کی امارت و سیادت کے مقابلہ میں ایک بدوی جمال کا شاہانہ استغنا

تاریخ عرب میں قبیلۂ بنی عذرہ کو اپنے شرف حسن و جمال اور امتیاز عشق و محبت کی وجہ سے جو خصوصیت حاصل ہے وہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں۔ سرزمین نجد کے اس قبیلہ کی کسی لڑکی کا نام لے دینا، اب بھی گویا "جمال بارع" اور "محبت عفیفہ" کے کسی مجسمہ کا ذکر کر دینا ہے، یہاں تک کہ عربی زبان میں "الھوی العذری" (یعنی بنی عذرہ کی سی محبت) ضرب المثل کی صورت اختیار کر چکی ہے۔

ذیل کا واقعہ اسی قبیلہ کے "افسانہ ہائے عشق و حسن" کا ایک ورق ہے جس کا ذکر ابن جوزی، نویری وغیرہ نے کیا ہے اور راویوں کے سلسلہ سے ہشام بن عروۃ تک پہونچا ہے جو قرن اول کے مشہور محدث تھے۔

نیاز

(۱)

امیر معاویہ میں دیگر امیرانہ خصوصیات کے ساتھ ایک خصوصیت ان کی معیشت و معاشرت کی نفاست و پاکیزگی بھی تھی۔ اسلام کی وہ سادگی جو عہد سعادت یا زمانۂ خلافت اربعہ میں پائی جاتی تھی، اس کا نہ معاویہ کی زندگی میں کہیں پتہ تھا نہ ان کے اعمال و افعال میں۔ وہ ایک امیر تھے، رئیس تھے بلکہ ایک خود مختار بادشاہ تھے اور انکی امارت و سیادت میں ان اکاسرۂ عجم کی سی شان و شوکت پائی جاتی تھی جنکو اسلام نے فتح کیا اور مسلمان خود اس سے مفتوح ہوگئے۔ عرب نے عجم کی زمین پر قبضہ کیا اور عجم نے عرب کے اخلاق پر، جس کی سب سے پہلی روشن مثال امیر معاویہ کی ملوکیت تھی۔ وہاں حاجب و دربان بھی تھے، اور نقیب و چاؤش بھی، عجم کی درباریاں بھی تھیں اور انعام و اکرام کی بارشیں بھی، زریں کمر غلام بھی تھے اور نازک کمر کنیزیں بھی (وہی ریگزار عرب جس کے عیش و نشاط کی ساری کائنات بقول فردوسی "شیر شتر خوردن و سوسمار" سے زیادہ نہ تھی، وہیں نصف صدی کے اندر اندر، ایک ایک امیر عرب کا گھر فردوس بنا ہوا نظر آتا تھا اور دنیا کی تمام وہ عشرتیں جو دولت و حکومت سے حاصل کی جا سکتی ہیں، آن کی مملوک تھیں۔ چنانچہ امیر معاویہ کے دسترخوان کی وسعت، مختلف قسم کے لذیذ کھانوں کی اختراع اور کھانے کے وقت نغمہ و موسیقی، لطائف و ظرایف کی صحبتیں تاریخ عرب کے کھلے واقعات ہیں۔[۱]

---

[۱] امیر معاویہ کے بہت سے لطائف مایدہ "تاریخ میں محفوظ ہیں۔ انہیں میں سے ایک یہ بھی نہایت لطیف واقعہ ہے جو جناب حسینؓ کے ساتھ ہوا۔ ایک بار جناب حسینؓ بھی مدعو تھے اور دسترخوان پر مختلف قسم کے کھانے چنے ہوئے تھے۔ جناب حسینؓ نے مرغ مسلم لیکر اسکا گوشت جدا کرنا چاہا۔ امیر معاویہ نے مزاحاً کہا "ھل بینك و بینھا عداوۃ" (کیا آپکے اور اس مرغی کے درمیان کچھ عداوت ہی) جناب حسین نے برجستہ فرمایا (ھل بینك و بین امھا قرابۃ) کیا تمہارے اور اس کے بیٹے کے درمیان کچھ قرابت ہے۔

ایک دن کا واقعہ ہے کہ معاویہ کا دسترخوان پوری وسعت کے ساتھ بچھا ہوا ہے اور ہر شخص کو شرکت کی اجازت ہے۔ ہجوم آہستہ آہستہ بڑھتا جاتا ہے اور کھانا شروع کرنے کی اجازت ہونے ہی والی ہے کہ قبیلۂ بنی عذرہ کا ایک خوش رو نوجوان، جس کے چہرہ سے شرافت غمگینی و جذبات حزیں ظاہر ہو رہے تھے، اٹھا اور اس نے معاویہ کو مخاطب کرکے کہا۔

معاوی، یاذ الفضل والحلم والعقل   وذا البر والاحسان والجود والبذل
اتیتک لما ضاق فی الارض مسلکی   وانکرت مما قد اصبت بہ عقلی
ففرج کلاک اللہ عنی فاننی   لقیت الذی لم یلقہ احد قبلی
وخذ لی ہداک اللہ حقی من الذی   رمانی بسہم کان اہونہ قتلی
وکنت ارجو عدلہ ان اتیتہ   فاکثر تردادی مع الحبس والکبل
سبانی "سعدیٰ" وانبری لخصومتی   وجار ولم یعدل وغاضبنی اہلی
فطلقتها من جہد ما قد اصابنی   فہذا امیر المومنین من العدل؟

اس کا خلاصہ مفہوم یہ ہوا کہ "اے صاحب فضل و کرم معاویہ، میں آپ کے پاس اس وقت آیا ہوں جبکہ خدا کی زمین مجھ پر بالکل تنگ ہو گئی، اس لئے میری فریاد کو پہونچئے اور میرا حق اس سے دلوایئے جس نے مجھے ان تیروں سے زخمی کیا ہے جن سے زیادہ آسان میرے لئے قتل کیا جانا تھا۔ میں اس سے عدل و انصاف کی توقع رکھتا تھا، لیکن اس نے مجھ پر قید و بند کی مصیبت ڈالدی، اور میری محبوبہ سُعدیٰ کو مجھ سے چھین لیا۔ پھر اے امیرالمومنین آپ ہی بتایئے یہ کہاں کا عدل و انصاف ہے؟

امیر معاویہ نے اس نوجوان کی یہ دردناک اشعار سنے اور خواہش کی کہ وہ اپنی سرگذشت زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کرے۔

اس نے جواب میں کہا کہ:۔

"اے امیرالمومنین آپ کی عمر دراز ہو۔ میں قبیلۂ بنی عذرہ کا ایک حقیر فرد ہوں اور میری داستان بہت دردناک ہے۔ کچھ زمانہ ہوا جب میری شادی میری بنت عم (چچا کی لڑکی) سے ہوئی اور میں نے اسکی محبت میں جو کچھ میرے پاس تھا اپنے چچا کی نذر کر دیا۔ جب میرے چچا نے دیکھا کہ میرے پاس سوائے محبت کے اور کچھ نہیں رہا تو اس نے بے اتفاقی شروع کی اور اپنی بیٹی سُعدیٰ کو مجبور کیا کہ مجھ سے علٰحدہ ہو جائے۔ ہرچند یہ امر اس کے لئے نہایت شاق تھا لیکن اس غیرت و حیا کی وجہ سے جو قبیلۂ بنی عذرہ کی خصوصیت ہے، وہ اپنے باپ کے فرمان کی مخالفت نہ کر سکی اور مجھ سے زیادہ دردمند دل لئے ہوئے وہ اپنے باپ کے گھر چلی گئی۔

میں نے پہلے تو کوشش کی کہ کسی طرح اس غم کے بار کو برداشت کروں، لیکن جب کام صبر و ضبط سے باہر ہو گیا تو میں آپ کے عامل مروان بن الحکم کے پاس گیا اور اس کو اپنی داستان درد سنا کر مداوا چاہا۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ اس ظلم کی تلافی کر دے گا جو مجھ پر سُعدیٰ کے باپ کی طرف سے توڑا گیا تھا، لیکن میرا یہ خیال بالکل غلط نکلا۔ کیونکہ جب اس نے میرے چچا اور میری بیوی کو بلا کر دریافت حال کیا تو وہ خود اس کے حسن کا مبتلا ہو گیا اور دس ہزار درہم میرے چچا کو دے کر سُعدیٰ کے نکاح کا پیام دے دیا

میرا چچا جو بہت زیادہ طماع ہے راضی ہوگیا اور مروان بن الحکم نے مجھے بلاکر زندان میں ڈالدیا اور مجبور کیا کہ میں سعدیٰ کو طلاق دیدوں میں نے اول اول تو انکار کیا، لیکن جب میں نے دیکھا کہ اگر میں طلاق نہیں دونگا تو وہ کسی نہ کسی طرح اسپر قابض ہوجائے گا اور ادھر قید کی سختیاں بھی ناقابل برداشت حد تک پہونچ گئیں تو میں نے حد درجہ مجبور ہوکر اس کو طلاق دیدی اور اب ملے امیرالمومنین آپ کے دربار میں آیا ہوں کہ میرے اس درد کا مداوا کیجئے۔

یہ کہکر وہ نوجوان بے اختیارانہ طور پر رونے لگا اور اسی حالت میں اس نے یہ شعر برجستہ پڑھے:-

فی القلب منی نار — والنار فیہا استعار
والعین تبکی بشجو — فدمعہا مسدرار
والحب داء عسیر — فیہ الطبیب یحار
حملت منہ عظیما — فما علیہ اصطبار
فلیس لیلی لیل — ولا نہاری نہار

یعنی میرے دل میں وہ آگ بھڑک رہی ہے جس کا کوئی آگ مقابلہ نہیں کرسکتی اور میری آنکھیں جو طوفان اشک لارہی ہیں اسکا کوئی طوفان مقابلہ نہیں کرسکتا۔ سچ ہے کہ محبت ایسی سخت بیماری ہے جس کا علاج کسی طبیب کے بس کی بات نہیں، اور اب میرا حال صبر و ضبط کی حد سے اسطرح گذر گیا ہے کہ اب میری زندگی میں نہ دن کا کوئی مفہوم رہگیا ہے نہ رات کا۔

یہ سن کر امیر معاویہ بہت متاثر ہوئے اور اسی وقت ابن الحکم کے نام ایک خط تحریر کرایا جس میں یہ اشعار بھی تھے۔

رکبت امرا عظیما لست اعرفہ — استغفر اللہ من جور امرء زانی
قد کنت تشبہ صوفیا لہ کتب — من الفرائض او آیات فرقان
حتی اتانا الفتی العذری منتحبا — یشکوا الی بحق غیر بہتان
ان انت راجعتنی فیما کتبت بہ — لاجعلنک لحما بین عقبان

(مدعا یہ کہ تم نے نہایت سخت جرم کا ارتکاب کیا جس کا علم مجھے ایک نوجوان بنی عذرہ کی فریاد سے ہوا، اچھا اگر تم نے حکم کی تعمیل نہ کی تو سخت سزا دی جائے گی)

امیر معاویہ نے کمیت اور نصر بن ذبیان کو متعین کیا کہ ابن الحکم کے پاس یہ فرمان لے جاویں اور جلد سے جلد پہونچنے کی ہدایت کی جس وقت یہ فرمان ابن الحکم کے پاس پہونچا تو اس نے پڑھکر ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا "کاش امیرالمومنین ایک سال تک مجھے اور سعدیٰ کو اسی حال میں چھوڑ دیتے اور اس کے بعد اگر تلوار سے وہ میری گردن بھی مار دیتے تو مجھے عذر نہ ہوتا"

الغرض نہایت جبر و اکراہ کے ساتھ اس نے سعدیٰ کو طلاق دی اور پیغامبروں کے ساتھ اسے کردیا۔ جس وقت ان لوگوں نے

اسکی صورت دیکھی تو مبہوت ہو گئے کیونکہ انہوں نے بھی آجتک ایسا حسن ساحرانہ دیکھا تھا۔ ابن الحکم نے فرمان معاویہ کے جواب میں جو شعر لکھے وہ یہ تھے

اعذر فانك لو ابصرت بهجتها منك الاماني على تمثال انسان
وسوف تاتيك شمس ليس يعدلها عند البرية من انس ومن جان
حوراء يقصر عنها الوصف ان وصفت اقول ذلك في سر و اعلان

(یعنی میں نے اگر یہ حرکت کی تو معذور تھا کیونکہ اگر آپ اسے دیکھتے تو آپ کا بھی وہی حال ہوتا۔ بہرحال وہ آفتاب حسن عنقریب آپ کے پاس پہونچنے والا ہے جس کا نظیر روئے زمین پر نہیں مل سکتا بلکہ میں تو یہ کہونگا کہ اگر اسکو حور سے تشبیہ دی جائے تو بھی حقیقتاً اسکی توہین ہے۔)

امیر معاویہ نے ابن الحکم کی تحریر پڑھکر کہا کہ میں اس کی تعمیل حکم سے خوش ہوا لیکن سعدی کی تعریف میں اس نے معلوم ہوتا ہے زیادہ مبالغہ سے کام لیا ہے۔ معلوم نہیں نغمہ و موسیقی اور شعر و ادب کا بھی کچھ ذوق رکھتی ہے یا نہیں۔ یہ کہکر امیر معاویہ نے اس کے بلانیکا حکم دیا اور جس وقت وہ سامنے آئی تو سارے بدن میں اک لرزش سی پیدا ہوگئی اور اسی وقت انہوں نے طے کر لیا کہ اس نوجوان کو دولت اور کنیزین وغیرہ دیکر راضی کر لینا چاہئے، اور سعدی کو اپنے لئے مخصوص۔

یہ سوچ کر امیر معاویہ نے اس نوجوان کو طلب کیا اور پوچھا کہ "اے نوجوان کیا کوئی ایسی صورت ہو سکتی ہے کہ تو سعدی کیطرف سے غافل ہو جائے"

نوجوان ۔ "ہاں، اک صورت ہے"

امیر معاویہ ۔ "کیا؟"

نوجوان ۔ "یہ کہ میرا سر میرے تن سے جدا کر دیا جائے"

امیر معاویہ ۔ "میں سعدی کے عوض تجھے تین نہایت حسین دوشیزہ لونڈیاں دیتا ہوں اس حال میں کہ ہر لونڈی ہزار ہزار دینار رکھتی ہوگی علاوہ اس کے بیت المال سے تیرے لئے اتنی رقم مقرر کر دونگا کہ تو نہایت امن و سکون سے ان کنیزوں کے ساتھ زندگی بسر کرسکے"

امیر معاویہ ابھی اپنے انعام و اکرام کی فہرست پوری طرح پڑھنے بھی نہ پائے تھے کہ نوجوان چیخ مارکر فرش پر گرا اور ہر شخص نے گمان کیا کہ شاید وہ مر گیا ہے۔ جب وہ کچھ ہوش میں آیا تو امیر معاویہ نے دریافت کیا

"اے اعرابی کیا حال ہے؟"

نوجوان ۔ "اس شخص کا حال آپ کیا پوچھتے ہیں جسکی مایوسی اس حد تک پہونچ چکی ہو، میں سمجھتا تھا کہ ابن الحکم کے ظلم کی چارہ جوئی آپ سے کروں گا، لیکن جب آپ بھی اس رنگ کے نکلیں تو پھر اب کہاں جاؤں، زمین سخت ہے آسمان دور ہے

لا تجعلني والامثال تضرب بي كالمستغيث من الرمضاء بالنار

ارددسعاد علی حیران مکتئب — یمسی ویصبح فی ھم وتذکار
قد شفه قلق ما مثله قلق — واسعر القلب منه ای اسعار
کیف السلو وقد ھام الفواد بھا — واصبح القلب عنھا غیر صبار

یعنی اے امیر المومنین اپنے طرزِ عمل سے میرا حال اس شخص کا سا دیکھیے جو گرمی سے بھاگ کر آگ کی پناہ ڈھونڈھنے نکلے۔ میری محبوبہ سعاد کو مجھ حیران ومغموم کے سپرد کر دیجیے کیونکہ اسکے درد مفارقت نے مجھ کو زار ونزار بنادیا ہے اور اب قلب میں صبر کی طاقت باقی نہیں رہی"۔

یہ سن کر امیر معاویہ کو غصہ آیا اور بولے کہ اے اعرابی تو اقرار کرتا ہے کہ تو نے سعاد کو طلاق دیدی۔ مروان بھی اس کا مقر ہے اسلئے وہ تیرے سپرد کیونکر کیجا سکتی ہے جب تک کہ پھر تیرے ساتھ نکاح نہو، اس لئے اس سے دریافت کرنا ضروری ہے کہ وہ تیرے ساتھ نکاح پر راضی ہے یا کسی اور شخص کے ساتھ"۔ یہ کہکر امیر معاویہ نے ایک مخفی اشارہ سعدی کیطرف کیا جس سے مقصود اپنے آپ کو پیش کرنا تھا اور دریافت کیا کہ "اے سعدی، تو کس کو پسند کرتی ہے، امیر المومنین کو جو صاحب عزو شرف ہے، یا ایک اعرابی کو جو مفلس ومحتاج ہے"

سعدی نے جواب میں اعرابی کی طرف اشارہ کر کے کہا:۔

ھذا، وان کان فی فقر واضرار — وکان فی نقص من الیسار
اکثر عندی من ابی وجاری — وصاحب الدرھم والدینار

یعنی مجھے تو یہ اعرابی چاہیے جس کا فقر وافلاس مجھے ساری دنیا کی دولت سے زیادہ عزیز ہے"۔ (باقی)

شیخ الشیوخ حضرت نصیر الدین محمود گنج معانی رحمۃ اللہ علیہ

(بسلسلۂ گزشتہ)

مناقب و فضائل کا یہ سلسلہ بہت طویل ہے، مگر ہم اس کو یہیں قلم انداز کرتے ہیں۔

درس و تدریس کا سلسلہ مدینہ منورہ ہی سے شروع ہو گیا تھا، اور سیکڑوں لوگ آپ کے علم و فضل اور سلوک و طریقت کی تاجداری کے باج گزار ہو چکے تھے۔ چنانچہ جب ہندوستان واپس آئے تو اپنی عقیدت مند ساتھ تھے۔ جن میں بعض شیوخ و علماء بھی تھے[1]

دہلی میں بہت پرجوش استقبال کیا گیا، خود حضرت محبوب الٰہی بھی اسمیں شریک تھے، خانقاہ پہونچ کر اعلان کیا کہ: نصیر الدین میرے روحانی فرزند اور میرے جانشین ہیں۔ یہ سنتے ہی کھلبلی مچ گئی، بڑے بڑے مریدوں کی امیدیں خون ہو گئیں، ساری محفل سراپا رشک و تعجب ہو گئی۔ یہ اعلان معمولی اعلان نہ تھا، ہمیں اس کو اسی رشک و تعجب کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے۔ اس سے ہم شیخ محمود کے جوہر فضل کا صحیح اندازہ کر سکینگے۔ حضرت محبوب الٰہی کی بزم سلوک جن لوگوں سے آراستہ ہوتی تھی۔ اس میں ہر شخص علم و فضل کا رازی و غزالی، اتباع سنت و سیر کا ابن تیمیہ و ابن حنبل، شعر و ادب کا ابو تمام و ابن رشیق، اور سلوک و طریقت کا جنید و شبلی تھا۔ مثلاً کمال الدین زاہد، رضی الدین عراقی۔ شرف الدین کرمانی، ضیاء الدین رومی، ابوبکر عدمی، شیخ نور ترک، مخلص الدین، امیر خسرو، حسن ملائی، شیخ تقی الدین، برہان الدین نسفی، شیخ شہاب الدین قاضی منہاج، شیخ احمد، قطب الدین منور، حسام الدین ملتانی، فخر الدین زرادی، شمس الدین یحیٰ، وجیہ الدین یوسف، محی الدین کاشانی، فخر الدین مروزی، علاء الدین نیلی، وجیہ الدین پائلی، رکن الدین اصوبی، صدر الدین نادی، ظہیر الدین بھکری، حسن افغان وغیرہ۔ تاہم باوجودیکہ آپ سب کے بعد آئے مگر سب سے آگے بڑھ گئے، حضرت محبوب الٰہی نے اپنی زندگی ہی میں سجادۂ ارشاد و ہدایت سونپ دیا، اور اپنے پرانے پرانے لوگوں میں کوئی بھی اس قابل نہ سمجھا گیا کہ اُسے مسند محبوبیت پر سرفراز کیا جائے۔

تم جانتے ہو کہ اس سرفرازی کی کیا وجہ تھی؟ اگر کامیابیوں کا انحصار محض اللہ کے فضل و کرم پر ہے، تو یہ کیا فضل و کرم تھا کہ ایک نیا شخص تو قبول کر لیا گیا، اور پرانے شعلۂ آشام رد کر دیئے گئے؟ اور اگر انسان کے علم و عمل اور استحقاق کو بھی کچھ دخل ہے، تو ان گون میں بڑے بڑے عالم بڑے بڑے زاہد و مرتاض جو شیخ کے مستعین بھی تھے، ان کی تمناؤں پر نہ امیدوں کا قلم کیوں پھیر دیا گیا؟

لیکن یہی رد و قبول ہے جس نے وہ عظیم الشان مگر غیر محسوس فرق نمایاں کر دیا ہے۔ ان سلاطین علم و تقویٰ میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو علم و فضل، زہد و تقویٰ اور جاہ و دولت کے ساتھ عشق و محبت، محنت و جفاکشی، اعتقاد و اخلاص، صدق و دیانت، انقیاد و تسلیم گ

---

[1] سیرت المحمود ۱۲ [2] سیرت المحمود ۱۲

ایثار دست سر بانی، بے نیازی، دیرچشمی، اور صبر و استقامت کے خزانوں کا ایک سکہ بھی اپنے پاس رکھتا ہو۔ مگر شیخ محمود مصر سلوک کے وہ تنہا یوسف تھے، جو اس دولت حسن کے عظیم الشان سرمایہ دار تھے۔ اور یہی وہ خوبی و زیبائی تھی جس نے آپ کو سب سے آگے بڑھا دیا، اور ہفت اقلیم کی شہنشاہی کا تاج آپ کے سر پر رکھ دیا۔

ایک روز حضرت محبوب الٰہی پر ایک خاص کیفیت طاری تھی، فرمایا: اجابت کے دروازے کھلے ہیں جسکی جو خواہش ہو کہے" ہر شخص نے اپنے اپنے مطالبات پیش کئے۔ کسی نے دنیا چاہی، کسی نے عقبیٰ اور کسی نے دونوں۔ مگر آپ کا مقصد دنیا و عقبیٰ سے بلند تر تھا، کچھ نہ بولے۔ شیخ نے کہا تم بھی تو کچھ کہو، کیا چاہتے ہو؟ بولے: بندہ را خواستی نہ باشد، خواست خواست مولیٰ باشد" حضرت محبوب الٰہی نے یہ سنکر منھ چوم لیا، اور کہا: واللہ یہی چیز ہے جس نے تم کو سب سے بڑھا دیا ہے۔ (حکایات الصالحین)

عزت اور قبول عام کی یہ کیفیت تھی کہ امراء، علماء، اور مشائخ خدمت شریف میں حاضر رہتے، اور نہایت خلوص و اعتقاد سے زمین پاپکو کو بوسہ دیتے تھے۔

لیکن آپ کے اخلاق و عادات میں ذرہ برابر فرق نہ آیا، وہی انکسار جو پہلے تھا اب بھی قائم رہا۔

خادم جو رات دن خدمت اقدس میں حاضر رہتے تھے، کہتے ہیں: آپ ہی نے ہمارے زیادہ کام کر دئے ہوں گے، ہم نے آپ کے اتنے کام نہیں کئے۔ محلے والوں کے کام کاج ان کے گھروں پر جا جا کر اور پوچھ پوچھ کر کر دیتے تھے (روضۃ الاخیار)

والد سے ترکہ میں کئی ہزار ایکڑ زمین، باغ اور مکانات ملے تھے، جن کی سالانہ آمدنی کئی ہزار اشرفی تھی۔ لیکن آپ اس سے ایک پیسہ بھی نہیں لیتے تھے۔ نقد و جنس کا اندازہ دو ڈھائی لاکھ تھا، مگر وہ سب راہ خدا میں صرف کر دیا۔ سیرت المحمود میں لکھا ہے:۔

حضرت شیخ را دو باغ و ہشت ہزار ایکڑ زمین وسی و پنج مکانات بود، اما آنحضرت یک فلوس نہ گرفتے۔ نقد و جنس کہ اندازہ آں زاید از دو لکھ بود بخلق اللہ انفاق نمود"

تذکرۃ الفضلا کی شہادت:۔

"باین ہمہ کہ او دولت فراواں داشتے، اما بر وجود خود یک حبہ صرف نہ کردے، و بر خلق بخشش ہائے بے اندازہ کردے"

یہ سب دے دلا کر اپنی معاش کے لئے، خود اپنے قوت بازو سے کما کر تلوکھڑی میں تھوڑی سی زمین خرید لی تھی اس میں کچھ ساگ پات اور اناج بو لیتے تھے۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا تھا کہ غربا و مساکین کی تواضع کر دیتے تھے۔ اور خود بجائے غذا کے پانی کے گھونٹ پر اکتفا کرتے۔ حکایات الصالحین میں لکھا ہے:۔

"برائے معاش خود در تلوکھڑی یک دو طناب زمین خریدہ بدست مبارک می کاوید و تخم می ریخت و قوت لایموت ازاں می ساخت"

اپنے کسی کام کے لئے کسی کو تکلیف نہیں دیتے تھے۔ کھانا پکانا۔ کپڑے دھونا، اور سینا پرونا سب کام خود ہی کر لیتے تھے کھانے میں ابلا ہوا بغیر نمک مرچ کا ساگ، اور جو کی روٹی ہوتی تھی (حکایات الصالحین)

ہمدردی و غمخواری کا ایسا جذبہ تھا کہ کسی کو مبتلائے مصیبت نہ دیکھ سکتے تھے۔ انسان تو انسان جانوروں کی تکلیف و مصیبت بھی متاثر ہو جاتے۔ ایک دفعہ ایک شخص گھوڑے پر سوار جا رہا تھا، اس نے گھوڑے کو اس زور سے چابک مارا کہ اس کی گردن پر بدھی پڑ گئی۔ آپ یہ دیکھ کر تلملا اُٹھے اور اُسے گھوڑے سے اُتار لیا (سیرت المحمود)

فقر و فاقہ اور توکل و قناعت کا یہ عالم تھا کہ نہ عزیز و اقارب کی محبت کی پرواہ کرتے تھے نہ جاہ و عزت کی، یہ دونوں جادو آپ پر بالکل بے اثر تھے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ دنیا کی عزتیں اور نعمتیں پری پیکر عروس بنکر سامنے آئیں، مگر ایک غلط انداز نظر بھی نہ پا سکیں۔ محمد تغلق کے رشتہ داروں نے اپنے جال میں پھنسانا چاہا، اور عزیزوں نے بھی بہت کوشش کی، مگر یہ عنقا کسی دام میں نہ آیا۔ انھوں نے زیادہ اصرار کیا تو صاف کہدیا کہ: جانتے ہو اس کا کیا نتیجہ ہوگا؟ تم میرے ایمان سے اپنی قرابت کو ٹکرانے کی کوشش نہ کرو، جو دل خدا کا ہو چکا ہے وہ اب بندوں کا نہیں ہو سکتا۔ چھوٹی اور ذلیل عزتیں تمھارے نزدیک کچھ ہوں، لیکن مجھے اپنی طرف مائل نہیں کر سکتیں (سیرت المحمود)

حضرت محبوب الٰہی سے ایسا خلوص تھا کہ جب یہ سنا کہ سلطان تغلق ان سے پرخاش رکھتا ہے، تو خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے ایک بڑے ابتلا سے بچا لیا (روضۃ الاخیار)

دوست احباب اور ملنے جلنے والوں سے نہایت سادگی و بے تکلفی سے ملتے تھے۔ نہ کسی سے یہ خواہش کی کہ وہ جھک جھک کر سلام کرے، اور نہ یہ چاہا کہ جب آئے ہاتھ پیر چومے۔ بلکہ جو لوگ ایسا کرتے، انھیں منع کر دیتے کہ یہ باتیں خلاف شریعت ہیں (روضۃ الاخیار)

شاگردوں اور عقیدتمندوں کے ساتھ برادرانہ سلوک کرتے تھے، اور کسی سے ناجائز احترام و عقیدت کے روادار نہ تھے۔ ان میں جو بیمار ہوتا روزانہ اُس کی عیادت کو تشریف لیجاتے، اور بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ تیمار داری بھی کرتے اور اپنے ہاتھ سے دوائیں پیس پیس کر پلاتے تھے۔ حیضر کی بیماری میں ایک مہینہ تک نوکروں کی طرح ان کی خدمت کی، اور شیخ صدر الدین کی عیادت کو روزانہ کئی میل چل کے جاتے تھے۔ سیرت المحمود میں اس قسم کے اور بہت واقعات لکھے ہیں۔

حضرت محبوب الٰہی کے مریدوں سے بہت تپاک سے ملتے تھے (حکایات الصالحین) حمید قلندر ان کے مرید اور آپ کے شاگرد تھے۔ لیکن آپ کو یہ بات معلوم نہ تھی۔ ایک روز کسی نے اس نسبت سے قلندر کا ذکر کیا، وہ آئے تو فرمایا: "تو مرید شیخی؟ من نمی دانستم، بیا کنار گیرم" (اخیار الاخیار)

محنت و ریاضت کی اتنی شدت تھی کہ ہمیشہ روزہ رکھنے کے ساتھ دو کلام اللہ روزانہ ختم کرتے، اور دوسرے اوراد و وظائف کے علاوہ تین لاکھ مرتبہ درود پڑھتے تھے۔ اشغال و مراقبے اس سے علاوہ رہتے۔ سید محمد کہتے ہیں: میں برسوں خدمت عالی میں حاضر رہا ہوں لیکن کبھی ایک گھنٹہ سے زیادہ رات کو سوتے نہیں دیکھا (سیر الاولیا)

شریعت کی پابندی کا حد درجہ خیال تھا، ہمیشہ اس بات کے کوشاں رہتے کہ مریدوں اور دوستوں میں کوئی شخص اعتصام سنت اور تخلق باخلاق الانبیا میں کمزور نہ ہو، اسی غرض سے ارشاد و ہدایت اور تعلیم و تدریس کا سلسلہ شروع کیا، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے مقدس فرائض انجام دینے کے لیے شیوا زبان اور بلند آہنگ داعی طیار کئے، اور ایک ایسی صادق العمل پرجوش جماعت پیدا کر دی کہ خانقاہیں ایک

پھر کلمۃ الحق کی پکاروں سے گونج اٹھیں، اور چشتی دعوت طریقت کو حیات تازہ مل گئی (سیرت المحمود و حکایات الصالحین) اس بارے میں آپ کی مساعی جمیلہ ہندوستان کے ارباب طریقت سے بہت زیادہ ہیں، سلوک چشتیہ ہمیشہ آپ کے احسانات کو یاد رکھے گا۔

سماع چشتیہ سلوک میں روحانی غذا سمجھا جاتا ہے، خصوصاً اس زمانہ میں تو یہ غذا انتہا درجہ فرض ہوگئی تھی۔ لیکن آپ ایک دفعہ بھی اس روحانی غذا میں شریک نہ ہوئے اور سختی سے اس زمانہ کے شیوخ کی مخالفت و ممانعت کی۔ گو بعض سماع پرست تذکرہ نویسوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آپ بھی سماع کے دلدادہ تھے لیکن یہ سراسر اتہام ہے۔ اس بارے میں آپ کا مسلک سب سے علیحدہ تھا۔ دارا شکوہ نے لکھا ہے:-

"باوجود آنکہ دریں سلسلہ سرود و سماع می کردند، شیخ نصیر الدین سماع نمی فرمودند و می گفتند کہ خلاف سنت است"

(سفینۃ الاولیا مطبوعہ لاہور صفحہ ۱۷۱)

ایک روز حضرت محبوب الٰہی کے حضور سماع ہو رہا تھا، آپ تشریف لائے، اور سماع کی آواز سنتے ہی اُلٹے پیروں واپس چلے گئے۔

(روضۃ الاخیار)

ایک دفعہ حضرت محبوب الٰہی کے یاران بزم کی ایک صحبت میں آپ بھی رونق افروز تھے۔ وہاں سماع شروع ہوگیا، آپ اسی وقت اٹھ گئے سب نے بہت روکا، مگر آپ نہ مانے۔ فرمایا: خلاف سنت ہے۔ انھوں نے کہا: کیا سماع سے منکر ہوکر اپنے پیر کے مشرب سے علیحدہ ہوگئے؟ فرمایا حجت نہیں ہے دلیل کتاب و سنت سے ہونی چاہئے۔ یہ واقعہ خیر المجالس میں لکھا ہے اس کے اصل الفاظ یہ ہیں:-

"روزے بعضے از مریدان شیخ نظام الدین اولیا مجلسے داشتند۔ و از دف زناں سرودے می شنیدند۔ شیخ نصیر الدین در مجلس بود برخاست تا برآید۔ یاران تکلیف نشستن کردند گفت خلاف سنت است۔ گفتند: سماع۔ سماع منکر شدی؟ و از مشرب پیر برگشتی؟ گفت حجت نمی شود دلیل از کتاب و سنت می باید۔"

دوست دشمن سب کے ساتھ آپ کی مراعات یکساں تھیں۔ مولانا معین الدین عمرانی اپنے وقت کے ایک جید عالم تھے اور جیسا کہ اکثر ظاہری علماء اہل اللہ سے پرخاش رکھتے ہیں، یہ بھی حضرت محمود سے پرخاش رکھتے تھے، اور بلا وجہ بدگوئیاں کرتے تھے۔ مولانا خواجگی کو دو واسطہ بزرگوں سے علاقہ تھا، وہ آپ کے مرید اور اُن کے شاگرد تھے۔ لیکن مولانا کو یہ نسبت بہت ناگوار تھی، جب موقع ملتا جی بھر کے گالیاں دیتے تھے خواجگی نے چاہا کہ مولانا سے نسبت منقطع کرلیں مگر شیخ نے منع کردیا۔ قضا را ایکدفعہ مولانا نہایت شدید سفرا میں مبتلا ہوئے، اور کئی مہینے بیمار رہے کے بعد بھی تندرستی کی نوبت نہ آئی۔ علاج سے عاجز آگئے تھے، اور مرض دن بدن بڑھتا جاتا تھا، خواجگی نے کہا: اگر مخدوم شیخ کی ملاقات کو تشریف لے چلیں تو مضائقہ نہیں ہے۔ شاید شفا کی کوئی صورت نکلے۔ مولانا پہلے تو بہت چیں بہ جبیں ہوئے، لیکن پھر تکلیف کی وجہ سے تیار ہوگئے شیخ نہایت لطف و محبت سے ملے، بغل گیر کیا، اور اسی وقت خادم کو حکم دیا کہ چانول اور جغرات تیار کرے۔ دسترخوان چنا گیا تو مولانا کے آگے چانول اور جغرات کی قاب رکھی گئی۔ مولانا نے شیخ کے اصرار سے مجبور ہوکر چند لقمے کھائے۔ لیکن یہ کھانا تھا کہ صفراوی مادہ میں ہیجان آگیا، اور پیہم استفراغوں سے اتنی بری حالت ہوگئی کہ مولانا کے ہوش و حواس اڑگئے۔ اور انھوں نے سمجھ لیا کہ بس آج زندگی کا خاتمہ ہے مگر یہ دراصل تریاق تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک عرق پلایا، اور اس کے پیتے ہی مولانا بالکل صحیح و تندرست ہوگئے۔ اس واقعہ نے اُن کے

دل سے زنگ کدورت وحسد یا حسد کی آگ بجھ گئی، اور وہ خلوص و اعتقاد کے ساتھ بیعت ہو کر شیخ کی خدمت میں رہنے لگے (سیرت المحمود)

درس و تدریس کا سلسلہ اخیر عمر تک جاری رہا، عہد سلوک کے تلامذہ کی تعداد تو حد شمار سے باہر ہے لیکن بعد کے طلبہ بھی سینکڑوں سے متجاوز ہیں چند نام یہ ہیں: برہان الدین - شیخ عثمان، شاہ علی، عزیز الدین، سید محمد کرمانی، خواجہ شمس الدین، حمید قلندر، ضیاء برنی، نظام الدین شیرازی، میر جعفر، موید الدین، شمس الدین دہاری، عثمان سیاح، شیخ ابوبکر، مولانا مظہر، شیخ شہاب الدین، سید محمد گیسو دراز، شیخ احمد، مولانا خواجگی، سید جلال الدین، شیخ صدر الدین حکیم، سید ابو یوسف، قاضی عبد المقتدر، شیخ زین الدین - مخدوم جہانیاں - کمال الدین علامہ شیخ اخی سراج پروانہ - یہ لوگ علم و فضل میں مشہور آفاق اور اقلیم فقر و فنا کے تاجدار تھے، اور حضرت محمود نے ہندوستان کے مختلف حصوں کی عنان نظم ان کو تفویض کی تھی (سیرت المحمود وغیرہ)

آفتاب کی روشنی ایک ہوتی ہے - لیکن ہر جگہ اس کے اثرات ایک نہیں ہوتے - اس آفتاب علم و طریقت کے جلوے بھی رنگ برنگ میں ہر جگہ ایک نئی اور مکمل شان ہے - صفحات میں گنجایش نہیں کہ مفصل طور پر اس کا بیان ہو سکے - لیکن یہ کہنا ایک اہم ترین فرض ادا کرنا ہے کہ آپ کی یہی وہ ادائیں تھیں جن کی وجہ سے ایک دنیا نے نیازمندانہ سر جھکا دیئے تھے، ہندوستان سے روم و شام اور مصر و قیروان تک گنج معانی، چراغ دہلی اور شیخ الاسلام کا ڈنکا بج گیا تھا - خود حضرت محبوب الٰہی بھی آپ کو انھیں ناموں سے پکارتے تھے مرآۃ الاسرار میں لکھا ہے :-

"از کثرت فضل و دانش و قیام امر بالمعروف و نہی عن المنکر شیخ المشائخ او را گنج معانی، و شیخ الاسلام می گفتند"

مخدوم جہانیاں کہتے ہیں: میں جس زمانہ میں مکہ معظمہ میں مقیم تھا، ایک روز شیخ عبد اللہ یافعی سے ملاقات ہوئی - انہوں نے کہا دہلی اب صرف ایک چراغ رکھتی ہے - میں نے پوچھا وہ کون ہے: بولے: شیخ نصیر الدین (سیرت المحمود)

تاریخ فرشتہ میں بھی اس کے متعلق ایک روایت لکھی ہے - ایک روز حضرت محبوب الٰہی کے پاس دور دور کے مشائخ کا مجمع تھا آپ آئے اور ان کو چاروں طرف بیٹھا دیکھ کر کھڑے رہ گئے - شیخ نے فرمایا بیٹھو؟ بولے: درویشوں کی طرف پشت ہوتی ہے - شیخ نے کہا: چراغ را پشت و روئے نیست" اس روز سے چراغ دہلی مشہور ہو گئے - شیخ صدر الدین، حمید قلندر، میر جعفر، مولانا مظہر، عثمان سیاح، قاضی عبد المقتدر - جہاں گشت کہتے ہیں ہم جہاں جاتے تھے حضرت محمود کا ذکر سنتے تھے، اور ہر جگہ کے علماء و مشائخ بہت تعظیم و تکریم سے نام لیتے تھے (فرشتہ جلد دوم صفحہ ۴۱۱ مطبوعہ لکھنؤ)

ہر صدی کا ایک مجدد اور فائق ہوتا ہے، اس صدی کے مجدد اور فائق آپ تھے کیونکہ آپ نے صرف حجرہ و خانقاہ ہی کے کام نہیں کئے بلکہ مدرسہ و منبر کے بھی کام کئے، اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی عملی کوششوں میں سب کو مات کر دیا - اور تجدید و تاسیس کے مدارج آپ نے صد درجہ حسن کے ساتھ طے کئے -

کہنے والوں نے یہ بالکل سچ کہا ہے کہ شیخ نصیر الدین ہمارے زمانہ کے لئے رحمت و برکت ہیں - ان کا وجود اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم کا ایک نشان ہے - ان کی جامعیت نے سلوک و شریعت کو الگ ہونے اور ٹکرانے سے روک لیا ہے - وہ بظاہر ایک متشرع عالم ہیں - لیکن بہ باطن اپنے وقت کے

شبلی و جنید ہیں۔ ان کی ذات ہمارے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے، وہ ایک ہی وقت میں امام ابن تیمیہ بھی ہیں اور شیخ عبدالقادر جیلانی بھی وہ اس دور کے مجدد، اس عصر کی روح، اور اس صدی کے زندہ کرنے والے ہیں۔ ہم نے ان کا نظیر نہ دیکھا نہ سنا، حسن بصری و بایزید بسطامی کے حالات کتابوں میں پڑھتے ہیں، لیکن شیخ محمود کو رات دن اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ (یہ مختلف بزرگوں کے اقوال ہیں جو سیرت المحمود وغیرہ میں نام بنام لکھے ہیں۔) مگر میں سوائے اس کے اور کیا کہوں۔ کہ ع

اے تو مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم!

اس زمانہ کے اکثر شعراء نے آپ کی مدح میں قصائد بھی لکھے ہیں۔ یہ تمام قصائد احمد الدین نامی ایک مرید نے ایک کتاب کی صورت میں جمع کئے ہیں، کل (۱۰۵) قصیدے ہیں، ۳۸ عربی میں ہیں اور باقی فارسی میں۔

لیکن مشیت کی عجب نیرنگیاں ہیں، ایک طرف تو آپ کی درباریاں عالمگیر ہو رہی تھیں، ہندوستان سے گزر کر تمام عالم اسلامی میں آپ کا سکہ چل رہا تھا۔ دوسری طرف مصیبتیں گھر گھر آ رہی تھیں۔ محمد تغلق کی دوستیاں دشمنی سے بدل رہی تھیں۔ اور ابتلاء و آزمائش کا نہایت سخت زمانہ آ رہا تھا۔ مگر یہ بھی بلندی فطرت کا ایک پیمانہ تھا، مصیبت کی اس آگ نے اس طلاء احمری پوشیدہ حقیقتیں عالم آشکارا کر دیں۔

ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں میں سلطان محمد تغلق اپنے علم و فضل، دانش مندی و نیک نفسی، علو خیال اور عزم و ارادہ کی وجہ سے ایک خاص امتیاز رکھتا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ وہ نہایت فخر پسند مغرور اور طالب جاہ بھی تھا۔

ممکن ہے سلاطین اسلام میں اور بادشاہ بھی اس خو بو کے گزرے ہوں، لیکن عام اخلاق میں جو حیرت انگیز تشابہ صلاح الدین، منصور اور محمد تغلق میں ہے، دوسرے بادشاہوں میں نہ ہوگا۔ صلاح الدین نے شیخ الاشراق کو بڑھایا، منصور نے ابن رشد کی دماغی پرورش کی، تغلق نے شیخ محمود کی قدر دانی کر کے علماء ہند کا محسود بنا دیا۔ لیکن پھر کیا ہوا خندۂ لب چین جبیں سے بدل گیا۔ جنھوں نے رفعت و سربلندی کی قبائیں پہنائی تھیں، پھر انھیں نے تباہی و بربادی کی زنجیریں بھی ڈالیں۔ صلاح الدین نے شیخ الاشراق کو قتل کیا، منصور نے ابن رشد کو تباہ کیا، محمد تغلق نے شیخ محمود کو تکلیفیں دیں، اور جب تک زندہ رہا دشمنی سے باز نہ آیا۔

چونکہ محمد تغلق زمانۂ شہزادگی سے آپ کا بیحد دوست تھا اور دوستی کے بعد ایسی شدید دشمنی ایک حیرت انگیز واقعہ ہے اس لئے تذکرہ نویسوں نے اس کے اسباب کی تحقیق میں بہت جد و جہد کی ہے، اور ہر ایک نے مختلف اسباب بتلائے ہیں، ہم یہاں سب کا خلاصہ درج کرتے ہیں۔

تغلق گو ابتدا سے نہایت فخر پسند اور مغرور تھا، لیکن شہزادگی میں یہ باتیں دبی رہیں، مگر جب وہ سلطان ہوا تو یہ باتیں بھی سلطان ہوگئیں۔ شیخ محمود پہلے تو اسکی (ایک حد تک) من مانی عزت کرتے رہے، لیکن بے نیازی کا دور آنے کے ساتھ ہی بیجا عزت و حرمت چھوڑ دی اب وہ اسکو دوست من اور عزیز من وغیرہ الفاظ سے مخاطب کرتے تھے، جو اسکو بہت ناگوار گزرتا تھا۔ (سیرت المحمود)

جب اس نے دیوگیر کو مرکز سلطنت بنانا چاہا، تو آپ سے بھی درخواست کی کہ مع اپنے تلامذہ و مریدین کے تشریف لے جائیں لیکن آپ نے انکار کر دیا (سیرت المحمود)

اسی طرح جب وہ چنگیزیوں کے مقابلہ میں خراسان و ترکستان پر یلغار کرنا چاہتا تھا، اور عام مسلمانوں کو ابھارنے کی غرض سے تمام

علماء و مشائخ کو دعوت دی تو خاص طور پر آپ سے کہا کہ: "ما می خواہیم کہ آن چنگیز ملعون را براندازیم، حضرت شیخ با ما دریں کار موافقت خواہید فرمود" آپ نے کہا میں تیار ہوں لیکن پہلے گھر کا تو انتظام کرلو، ملک قحط کی مصیبت سے تباہ ہوا جارہا ہے (سیرت المحمود)

ایک دفعہ آپ مہرولی جا رہے تھے، راستہ میں تغلق کی سواری مل گئی، آپ اس کو دیکھکر دوسری طرف ہو گئے، اتفاق سے زین الدین۔ مخلص الملک کی نگاہ پڑ گئی، اس کو آپ سے خصومت تھی، سلطان سے بولا: "شیخ نصیر الدین ابھی اس راہ سے جا رہے تھے، لیکن کو کبۂ سلطانی کو دیکھ کر بھاگ گئے" (اخبار الاولیا)

ایک روایت یہ بھی ہے کہ تغلق نے ایک دفعہ حریر و اطلس کے چند تھان، اور کئی ہزار اشرفیوں کی تھیلی آپ کے پاس بھیجی۔ آپ نے حسب عادت لینے سے انکار کر دیا (سیر الاولیا)

ان سب پر مستزاد اس کا حضرت محبوب الٰہی سے عناد رکھنا، اور اس عہد کے صوفیاء و مشائخ پر ظلم و ستم تھا جس سے آپ اسکو ہمیشہ روکتے تھے، اور کئی دفعہ صاف لفظوں میں کہہ چکے تھے کہ: "بادشاہوں کے لئے جو اخلاق ضروری ہیں، افسوس ہے کہ تم ان سے دور ہوتے جاتے ہو۔ استقلال نام کو نہیں، کانوں کے کچے، ظلم و ستم میں شیر، درویش آزاریوں کے خوگر ہو۔ غرور و خود پسندی تمھاری سرشت اور نخوت و کینہ پروری تمھارا شیوہ ہوتی جا رہی ہے۔ میں تم کو کئی دفعہ ان بری عادتوں سے روک چکا ہوں، مگر دیکھتا ہوں کہ تمہیں اس طرف ذرا التفات نہیں۔ بری عادتوں میں روز بروز زیادتی ہے، اور تم بجائے سلطانی و فرماں روائی کے سزاوار بننے کے دن بدن ناقابل بنتے جاتے ہو۔ کاش تمھیں اب بھی ہوش آئے، اور یہ بری عادتیں تم سے چھوٹیں۔ ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ زمانہ اپنا رنگ لائیں اور اس بلندی کو پستی دیکھنی پڑے" (سیرت المحمود و تذکرۃ الفضلا)

بہرحال ان وجوہ سے محمد تغلق آپ کا جانی دشمن ہو گیا تھا، اسپر مخلص الملک، نوازش علی اور محمد عمر کی چغلیاں گویا جلاد کے ہاتھ میں تلوار تھیں ان کی لگائی بجھائی سے ان کی پیاس اور بڑھتی جاتی تھی، اور وہ یہ چاہتا تھا کہ کسی حیلۂ شرعی سے شیخ کا قصہ پاک کر دے۔

ایک دفعہ شیخ کو مع احباب و موالی مدعو کیا، سونے چاندی کے برتنوں میں کھانا چنا گیا کہ اگر ان برتنوں میں کھانا کھا لیا تو فعل نامشروع کی سزا دی جائے گی، اور اگر انکار کیا تو قبول دعوت سے انکار کا جرم لگایا جائیگا۔ مگر آپ نے کعبہ و بتخانہ کے بیچ سے راہ نکال لی، طشتریوں میں کھانے کے بجائے تھوڑے سے چاول ہتھیلی پر رکھ کر کھا لئے، اور سب نے اسی کا اتباع کیا۔ تغلق افسوس سے ہاتھ ملنے لگا۔ (اقتباس الانوار)

اسی طرح اور مختلف طریقے اختیار کئے، کبھی مسائل میں گفتگو کی، کبھی اعتقادات پر بحث کی، کبھی تفسیری مباحث چھیڑے، کبھی علم کلام پر مناظرہ کیا، کبھی صوفیاء کرام پر اعتراضات کئے، کبھی حضرت محبوب الٰہی کی بدگوئیاں کیں۔ کبھی اپنے دربار کے دو لامذہب عالموں (اسعد منطقی و علم الدین فلسفی) کو بحث کے لئے آگے کر دیا: مگر آپ اپنے علم و فضل اور دانش و فراست سے ہر منزل سے کامیابی کے ساتھ نکلتے رہے (سیرت المحمود)

جب وہ اپنے تمام اوچھے وار ختم کر چکا، تو اب اس نے اپنے ترکش سے آخری تیر نکالا۔ یہ تیر خدمت و چاکری کا تیر تھا اخبار الاولیا میں لکھا ہے:-

سلطان محمد تغلق، حضرت شیخ نصیر الدین را باوجود کمال ارادت که داشت از راه عناد ایذا ہا کردے، ودر سفر ہمراہ خود گردانیدے، وقتے اورا جامہ دار خود گردانیدہ بود"

تاریخ فرشتہ بھی کہتی ہے کہ:۔

"شیخ نصیر الدین محمود در تکلیف جامہ پوشانیدن تمود" (سیرۃ المحمود جلد دوم)

یہ سنکر مرید وشاگرد اور تمام عقیدت مند بہت برافروختہ ہوئے، اکثر غصہ میں آپے سے باہر ہو گئے، تیوریاں بدل گئیں، نیاموں سے تلواریں نکل آئیں۔ مگر جو شورش و ہنگامہ کا دشمن ہو، جو فساد و خوں ریزی سے اللہ کی زمین کو پاک کر دینا چاہتا ہو، اور جس کا مقصد نیکی و راستی، صدق و محبت اور امن و خدا پرستی کے پاک جذبات سے دنیا کو لبریز کر دینا ہو، اور جس نے اپنی ساری زندگی میں گالیاں سن سنکر، اور مصیبتیں سہہ سہہ کر انسانیت کی خدمت کی ہو، وہ ان باتوں کو کب گوارا کر سکتا تھا۔ فرمایا:۔ میرے دوستو میں نہیں چاہتا کہ میرے لئے کسی مسلمان کے خون کا ایک قطرہ بھی بہے۔ خدارا محمود پر رحم کرو، اسے روز حشر کی پرسشوں سے بچا لو وہ اس روز اس ہنگامہ آرائی کا کوئی جواب نہیں دے سکیگا۔ واللہ یہ گناہ کفر سے زیادہ ہے۔ مسلمان کو فتنہ انگیزی سے بچنا چاہئے، تم اس کی طرف لپکتے ہو، مسلمان کا کام امن و عافیت پھیلانا ہے، لیکن افسوس کہ تم دعوی اسلام کے ساتھ فساد کو پھیلاتے ہو، مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں، لیکن آہ کہ تمہاری جلد بازیاں تمہارے ہاتھ خون سے رنگنا چاہتی ہیں، اور تم وہ کام کرنے پر تل رہے ہو جس کے تصور سے میری روح کانپتی ہے۔ مجھے بتلاؤ تمہاری ناراضی کی وجہ کیا ہے؟ کیا میرا خدمت کرنا اسلام کے خلاف ہے کیا اس سے خدا کی وحدانیت، رسول کی رسالت اور قیامت کے برحق ہونے کا انکار لازم آتا ہے؟ اگر یہ نہیں ہے تو پھر کیا ہے جس کے لئے تمہاری چٹکیاں تیر پھینکنے پر بے تاب ہیں۔ کیا ہزاروں آدمیوں کا خون بہنے، اور مدتوں قید و بند کا سلسلہ جاری رہنے سے یہ بہتر نہیں ہے کہ میں خوشی خوشی سلطان کی خدمت کے لئے تیار ہو جاؤں؟ سوچو، سمجھو اور اپنی جان ہلاکت میں نہ ڈالو۔ میری خوشی یہی ہے کہ تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، اور اطمینان و یکسوئی سے اپنے اپنے کاموں میں مشغول رہو، یاد رکھو بادشاہ کی اطاعت معصیت کے سوا ہر حال میں فرض ہے۔ خواہ اس سے کسی کو تکلیف ہو یا خوشی۔ جماعت کے مقابلہ میں اشخاص کوئی چیز نہیں ہیں۔

اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم، فان تنازعتم فی شیء فردوہ الی اللہ والرسول،

پھر تمہیں کیا منظور ہے؟ صاف صاف کہدو کہ تم میرے دوست ہو یا دشمن؟ میری روح کو تکلیف دینی چاہتے ہو یا خوشی؟ اسی فیصلہ پر میرے تمہارے تعلقات کا انحصار ہے (یہ تقریر سیرت المحمود۔ اخبار الاولیا اور تذکرۃ الفضلا میں بہ تغیر الفاظ لکھی ہے۔ میں نے الفاظ کو چھوڑکر تینوں کا مفہوم لیا ہے) سب نے گردنیں جھکا لیں، تلواریں اور کمانیں پھینکدیں۔ اس کے بعد آپ دربار میں تشریف لے گئے، وہاں سب آپ کے منتظر تھے، سلام مسنون کے بعد آپ نے تغلق سے کہا: "میں خدمت کیلئے تیار ہوں مجھے اس سے بھی انکار نہیں ہے کہ دربار مجھ سے ذلیل سے ذلیل کام لے میں اس کے لئے بھی مستعد ہوں کہ سلطان اب مجھے مشرق سے مغرب تک دوڑنے کا حکم دے، مجھے اس میں بھی تامل نہیں ہے کہ فلک بوس بلندیوں سے کودنے کا حکم دیا جائے میں اس کے لئے بھی آمادہ ہوں نہ بادشاہ پر

اپنے تئیں نثار کر دوں۔ لیکن اے میرے دوست! کیا تم اپنے جاں نثار کی ایک بات قبول کرو گے؟ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم اپنے اندر اخلاق حسنہ پیدا کرو۔ تغلق یہ آخری الفاظ سنکر اثر میں ڈوب گیا اور کہتے ہیں کہ کئی دن اس اثر میں ڈوبا رہا (سیرت المحمود) مگر افسوس دہ بہت ہی کمزور تھا، نفس اس پر حاوی ہوگیا۔ مگر وہ اس پر قابو نہ پا سکا۔ اس کے دل سے راستی کا جذبہ تیر کی طرح نکل گیا، اس نے حکم دیا کہ شیخ سفر و حضر میں پابہ زنجیر اس کے ساتھ رہیں، پھر کئی برس کپڑے پہنانے کی خدمت لی، اس کے بعد دہلی سے آدھ گھنٹہ میں نکل جانے کا حکم دیا، اور عاملوں کو لکھ بھیجا کہ شیخ محمود حدود دہلی میں نہ آنے پائیں۔ چنانچہ جب تک وہ زندہ رہا آپ بنا باسی رہے۔

فرشتہ نے لکھا ہے۔

"از قضا دراں مدت پادشاہ را قضا ہائے عجیبہ پیش آمدہ درہماں زودی فوت شد و بندگانِ خدا خدا خلاصی یافتند"

(جلد دوم صفحہ ۵۷)

لیکن تغلق کی کشتی کنارے آلگی تھی اور شیخ کا دہلی سے باحال پریشان نکلنا، دراصل کامیابیوں کے ساتھ واپس آنا تھا۔ (اخبار الاولیا بضمن تذکرہ مولانا نور ترک) تار نزول پہونچتے پہونچتے تخت حکومت تغلق سے فیروز شاہ کو منتقل ہوگیا۔ فیروز شاہ آپ کا بہت معتقد تھا۔ اس نے اسی وقت نامہ بھیجکر آپ کو بلایا اور بہت خاطر تواضع کی (سیر السالکین)

بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ آپنے قبول خدمت سے انکار کر دیا تھا، اور انتہائی مصیبتیں بھگتنے پر بھی خدمت کے لئے تیار نہ ہوئے تھے، یہاں تک کہ فیروز شاہ کا زمانہ آیا اور اس نے رہائی دی۔ لیکن یہ واقعات غلط ہیں، اس روایت کی حامی صرف دو کتابیں ہیں ایک اخبار الاولیا، دوسری سلسلہ نظامیہ۔ فرشتہ مذبذب ہے اس نے دونوں روایتیں لکھ دی ہیں۔ اس کے مقابلہ میں واقعات مذکورہ کے ماخذ چھ سے زیادہ ہیں، اور سب یک زبان ہیں کہ "ہمہ را تحمل کرد و دم نہ کشید"

سیرت المحمود میں لکھا ہے کہ تسلیم و رضا کا جذبہ اخیر عمر میں بہت بڑھ گیا تھا جس کی سب سے بڑی نظیر واقعہ وفات ہے۔ اس زمانہ میں زیادہ وقت ذکر و شغل اور تلاوت قرآن میں صرف ہوتا تھا، ملنا جلنا، آنا جانا پڑھنا پڑھانا قطعاً بند ہوگیا تھا، عصر کے بعد سے صبح تک کسی سے نہیں ملتے تھے اور حجرہ میں دروازہ بند کرکے اپنے خاص کاموں میں مشغول رہتے تھے۔

ایک روز ایک قلندر آیا، خادموں نے اس کو کچھ دے دلاکر رخصت کرنا چاہا، مگر وہ قلندر کی صورت میں ملک الموت تھا سب کچھ لے کر بھی نہ ٹلا، اور اپنا سوال بڑھاتا رہا، آخر میں بولا: میرا سوال ایک گھوڑا ہزار دینار، دو زربفت کے تھان اور شیخ سے ملنا ہے۔ جب تک یہ سوال پورا نہ ہوگا نہیں جاؤں گا" خادموں نے شیخ سے اجازت لیکر اس کو اندر بھیجدیا، اب کیا تھا اس کو من مانی مراد مل گئی، اس نے حجرہ میں قدم رکھتے ہی دروازہ بند کرکے بغیر کچھ کہے سنے خنجر سے ایسے زخم لگائے کہ سارا جسم لہولہان ہوگیا، رگیں کٹ گئیں۔ خون کے فوارے چھوٹ نکلے اور شیخ تڑپ تڑپ کر بیہوش ہوگئے۔ مگر اس ظالم نے اسپر بھی بس نہ کی لاتوں سے خوب روندا، داڑھی نوچ ڈالی، انگلیاں توڑدیں، ناخن جدا کر دیئے اور پوری طرح اپنا اطمینان کرکے (کہ دم نکل گیا ہے) دروازہ کھول کر بھاگا۔ خادموں نے خون آلود کپڑے دیکھکر پکڑ لیا، شیخ کو آکر دیکھا تو حالت بہت ہی زار و نزار تھی۔ مولانا صدر الدین حکیم کو

اطلاع دی وہ شہر کے تمام طبیبوں کو لیکر اسی وقت آئے، فیروز شاہ بھی یہ ماجرا سنکر آیا، قلندر حراست میں لے لیا گیا، چوتھے دن بڑی مشکل سے ہوش آیا۔ تمام عقیدت کیش حاضر تھے، فیروز شاہ بھی موجود تھا، قلندر پیش کیا گیا، آپ اس کو پابہ زنجیر دیکھکر آبدیدہ ہوگئے، بولے "اس کو چھوڑ دو، یہ بے قصور ہے" اس کے بعد اس سے فرمایا "میں بہت شرمندہ ہوں کہ میری وجہ سے تم کو اسقدر تکلیف پہونچی، امید ہے کہ تم معاف کر دوگے" پھر فیروز شاہ سے کہا کہ اس کا سوال پورا کردو، مجھپر احسان ہوگا (یہ واقعہ قریب قریب تمام تذکروں میں ہے مگر یہ تفصیل صرف سیرت المحمود اور اخبار الاولیا میں ہے)

دم آخر تھا لوگوں نے قبر کی نسبت پوچھا، فرمایا "اسی حجرہ میں بنے گی، پختہ نہ کرنا" تبرکات ساتھ جائیں گے، خرقہ پہنے پڑ کاسہ سرہانے تسبیح ہاتھ میں اور عصا پہلو میں رکھا (اقتباس الانوار) فرشتہ کا بیان ہے کہ سید گیسو دراز کو توقع تھی کہ یہ چیزیں انھیں انعام ہونگی، لیکن یہ وصیت سنکر بہت رنجیدہ ہوے، اور اس رنج میں دہلی سے نکل کر دکن چلے آئے (جلد دوم صفحہ ۵۰۷)

شہر میں وفات کی بہ پہونچتے ہی کہرام مچ گیا، نماز جنازہ میں دہلی کے چھوٹے بڑے سب شریک تھے کئی جماعتیں ہوئیں۔ کہتے ہیں کہ اس روز در و دیوار پر ماتم کی سی تاریکی چھاگئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا دہلی بے چراغ ہوگئی ہے (سیرت المحمود) اسی درد و غم میں اکثر شعرا نے نوحے اور مرثیے لکھے۔ ان صفحات میں گنجائش نہیں ہے کہ ان کے منتخب اشعار بھی لکھے جائیں، شیخ کو مولانا مظہر سے خاص انس تھا، اس لئے یہاں ان ہی کے نوحے کے چند شعر لکھے جاتے ہیں (اخبار الاخبار)

زد ورصحت ایں سپہر زنگاری — کدام دل کہ نہ خوں گشت از جگر خواری
کجا بہ جام طرب مجلسے بنا کردند — کہ از سپہر بباریدہ سنگ قہاری
وفا ز عالم فانی مجو کہ مشہور اند — فلک بخیرہ کشی اختران بغداری
خزینہ ایست سپہر از نفوس انسانی — دفینہ ایست زمیں از بتان فرخاری
ترا اے عزیز کہ در ملک و مال معذوری — مباش ایمن اگر عاقلی و ہشیاری
چہ دانی آنکہ در اوراق کارخانۂ غیب — قضا چہ نقش برآرد ز کلک جباری
زمانہ صلح کند بادل تو باخصمے — فلک بدشمنی آید بہ پیش با یاری
چہ وقت آں برسد ہیچ کس نگیرد دست — نہ ملک بے ملکی نے سپاہ سالاری
بقا بقاے خدا یست ملک ملک خدا — کہ نیست قائم و دائم کسے بجز باری
ز دست چرخ ندانم کجا کنم فریاد — کہ برگزشت بما جور او ز بسیاری
جہاں بماتم خواجہ نصیر دیں محمودؒ — ہزار گونہ فغاں کرد نوحہ و زاری
بقیۂ سلف و یادگار اہل کرم — کہ کرد ختم خلافت بملک دیں داری
ہمینا ملکاً منعما خدا وندا — بحق نعمت قرآن و دولت قاری

برحمت تو کہ عام ست در جہاں باقی — بعزت تو کہ خاص ست در جہانداری
کہ لے روح اعظم آں شیخ پیشوائے کرام — کہ مقتدائے جہاں بود دست زاخباری
ندیم قرب خود کن غریق رحمت خویش — مجاور رسل و انبیائے مختاری
بساط صحن دہ از حلہ ہائے فردوسی — غلاف قبر کن از پردہ ہائے غفاری

صفحات بالا میں آپ شیخ کے حسن سیرت کے خد و خال دیکھ چکے ہیں، اب آئیے ایک نظر صحبتوں کے حسن بیان پر ڈال لیں۔ قاضی عبد المقتدر رح نے مناقب الصدیقین میں اور حمید قلندر رح نے خیر المجالس میں آپ کے ملفوظات جمع کئے ہیں، سطور ذیل میں چند جواہر ریزے پیش کئے جاتے ہیں:-

چند طالب علم اجزائے سلوک پر بحث کر رہے تھے۔ کوئی علم کا طرفدار تھا کہ یہی سلوک کی انتہائی بلندیوں تک پہونچا سکتا ہے۔ کوئی عمل کا حامی تھا کہ بغیر عمل علم بے سود ہے، اور کوئی صرف نیت ہی کو لیتا تھا کہ نیت کے صدق و خلوص پر ہر کام کے فتح یاب کا انحصار ہے۔ آپ نے انکی یہ بحث سنکر فرمایا: تم سب اپنے اپنے خیال میں سچے ہو، افراط و تفریط اٹھا دو تو تمہارے خیالات ایک ہی زنجیر کی کڑیاں بن جائیں گے۔ مراتب سلوک میں پہلا درجہ علم کا ہے، دوسرا عمل کا، تیسرا نیت کا۔ علم کے بغیر عمل درست نہیں ہوتا، عمل کے بغیر نیت کا وجود نہیں، اور نیت صالح نہیں تو علم و عمل دونوں بیکار ہیں۔ سالک کے لئے یہ تینوں غذا، پانی اور ہوا کی طرح ضروری ہیں۔

فرمایا مبتدی کے لئے اولین کام دل کی نگرانی ہے، اسکو چاہیئے کہ ہر وقت دل پر نظر رکھے اور خدا کی طرف متوجہ کرکے اسی میں مشغول کر دینے کی کوشش کرے۔

فرمایا: لوگ کرامت پر مرتے ہیں، حالانکہ سالک کے لئے یہ چیز موت ہے۔ ایمان کی فکر کچھ کم نہیں ہے کہ اور باتوں کی طرف توجہ ہوئے ان ہوں کہ خلق بغیر مشاہدہ کیسے جیتی ہے۔

فرمایا: شریعت میں کمال حاصل کئے بغیر طریقت میں آنا بیحد خطرناک ہے۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ زہر کا پیالہ پیتے ہیں۔ استقامت شرع کی صورت میں طریقت سے گر کر شریعت میں رہ سکتے ہیں، لیکن عدم استقامت کی صورت میں طریقت سے گر کر کہاں جائینگے جن کا ظاہر پاک نہ ہو اُن کا باطن بھی پاک نہیں ہو سکتا۔

کسی نے پوچھا درویشوں پر جو حال طاری ہوتا ہے اسکی کیا وجہ ہے؟

فرمایا: حال صحت اعمال کا نتیجہ ہے۔ اعمال کی دو قسمیں ہیں، ایک عمل جوارح دوسرا عمل قلب۔ عمل جوارح عبادات و مجاہدات ہیں، اور عمل قلب مراقبہ والمراقبتہ ان تلازم قلبك العلم بان الله ناظر الیك ان دونوں عملوں سے روح پر انوار نازل ہوتے ہیں ان کا اثر قلب پڑتا ہے، قلب سے جوارح متاثر ہوتے ہیں۔ پھر آپ ہی نے کہا کہ صاحب عوارف نے اہل حال کو متوسط کہا ہے، "المبتدی صاحب وقت والمتوسط صاحب حال، والمنتہی صاحب انفاس" حاضرین کو یہ سنکر بہت تشویش ہوئی، فرمایا: گھبراؤ نہیں، بات بالکل صاف ہے۔ مبتدی کا سب سے پہلا کام اوقات کی نگرانی اور ہر لمحہ کو غنیمت جان کر کام میں لگانا ہے۔ جو شخص ایسا کرتا ہے وہ صاحب وقت ہے۔ چونکہ مواہب سلوک کا سب

نتیجہ ہوتے ہیں، اور مکاسب میں یکسانی نہیں ہوتی، ہمیشہ گھٹا بڑھا رہتا ہے، اس لئے عالم علوی سے روح پر جن انوار کا نزول ہوتا ہے۔ وہ دوامی نہیں ہوتے بلکہ بجلی کی طرح چمکتے اور غائب ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا ایسا شخص جو اس درجہ میں ہو متوسط ہے۔ لیکن جب اس کیفیت میں قیام و دوام ہو جاتا ہے تو اضطراری احوال استمراری ہو کر انفاس سے مل جاتے ہیں، اور کوئی سانس بغیر احوال کے نہیں گزرتا۔ جو شخص اس درجہ میں پہونچ جاتا ہے وہ سلوک کی منزل اول کا منتہی ہوتا ہے۔

ایک شخص نے دریافت کیا کہ انسان مرنے کے بعد اپنی اصل کی طرف راجع ہوتا ہے یا نہیں؟

فرمایا: راجع وہی ہوتا ہے جو زندگی میں اپنے مرجع کو پہچان لیتا ہے، اور موافق و علائق کو قطع کرکے اپنے تئیں اسیں فنا کر دیتا ہے۔ لیکن جس کا جینا ایسا نہیں ہوتا، وہ مرنے کے بعد انہیں چیزوں کی طرف رجوع ہوتا ہے جن کے اندر زندگی میں منہمک تھا۔

فرمایا: سلوک میں اصل چیز نفس کی محافظت ہے، صوفی کو مراقبہ میں نفس پر نگاہ رکھنی چاہئے، اس کا ہر سانس دیکھا اور گنا ہوا تاکہ خاطر جمع رہے۔ نفس سے توجہ ہٹتے ہی خاطر پریشان ہو جاتی ہے، بعض مشائخ نے المنتہی صاحب نفس کے یہی معنی لئے ہیں، اور ہندوؤں میں سادھو ایسا ہی کرتے ہیں۔

کسی نے پوچھا: ظاہری اور باطنی طہارت میں کیا فرق ہے؟ بولے: ظاہری طہارت وضو سے قائم ہوتی اور حدث سے ٹوٹ جاتی ہے۔ لیکن باطنی طہارت اس کی بھی متحمل نہیں ہوتی۔ محدثات میں پہلی چیز دنیا ہے، اس کا خیال گزرتے ہی سالک پر غسل طریقت فرض ہو جاتا ہے۔

فرمایا: اے عزیز میں نہ خلوت رکھتا ہوں نہ مشغولی، سارا دن لوگوں سے ملنے جلنے میں گزر جاتا ہے۔ لیکن تمہارے پاس فرصتیں ہیں، خلوتیں و تنہائیاں ہیں، انھیں ضائع نہ کرو، جو دم بھی گزر جائے غنیمت جانو، ایسا وقت پھر نصیب نہ ہوگا۔ کوشش کرو کہ نفس پر قابو ہو جائے، اور ہر جگہ اور ہر حال میں وہ اپنے کام میں مشغول رہے۔

پوچھا گیا راہ کیا ہے اور منزل کونسی؟ فرمایا: کس راہ و منزل سے سوال کرتے ہو؟ ارباب شریعت کی راہ و منزل سے یا اصحاب طریقت کی؟ عرض کیا۔ دونوں سے۔ کہا: ارباب شریعت کی راہ و منزل نفس و مال سے اٹھ جانا ہے: ان اللّٰہ اشترٰی من المومنین انفسھم و اموالھم اور اصحاب طریقت کی راہ و منزل جان و دل سے اٹھ جانا اور وحدت میں رہنا ہے۔ و تبتل الیہ تبتیلا ہ وان الی ربک المنتھی۔ دوستو! تم مسافر ہو، مسافروں کی طرح رہو۔ مسافروں کو اقامت کی نیت درست نہیں ہوتی، پھر تم نے راستہ میں کیوں پڑاؤ کر لیا؟ اٹھو چلنے سے ایمان تازہ ہوتا ہے، بیٹھ رہنا گناہ ہے۔ تم خواہ شریعت میں ہو خواہ طریقت میں۔ ہر حال میں مسافر ہو۔ تمہارے سفر کی منزل مقصود مالک الملک کا مشاہدہ ہے۔ عرض کیا: مالک الملک کہاں ہے کہ روئے دل اسکی طرف پھیریں؛ فرمایا کونسی جگہ ہے جہاں وہ نہیں ہے؟ اینما تولوا فثم وجہ اللّٰہ۔ یہ نہ خیال کرو کہ وہ تم سے دور ہے، اور ہم اس کو کہاں ڈھونڈیں۔ ذرا اپنے محجوبات و علائق سے نکل کر تو دیکھو ؎

تا دیدہ بود دیدہ کجا آید دوست خواہی کہ شود دیدہ بروں آئی ز پوست

از دیدہ و دید ای چو تو بگذشتی دانی کہ کسے نیست بہ بینی ہمہ اوست

فرمایا: سلوک میں آستین کوتاہ کردی جاتی ہے اور سر کے بال تراش دیئے جاتے ہیں۔ مگر جانتے ہو اس کا کیا مطلب ہے؟ دنیا سے دست کشی اور راہ حق میں سربازی سلوک کی منزل اول ہے۔ آستین چھوٹی کرنا اور بال تراشنا۔ سالک کو اسی طرف ہدایت کرتا ہے۔ مگر افسوس کہ اہل طریقت جانتے بوجھتے ان باتوں سے روگرداں ہو گئے ہیں، اور سلوک کی ان معمولی معمولی باتوں کی بھی پابندی نہیں کرتے "تا بدیگراں چہ رسد"

کسی نے کہا: مشائخ نماز کے بعد مصافحہ کیوں کرتے ہیں۔ ؟ فرمایا: مسافر باہر سے آکر مصافحہ کرتے ہیں۔ مشائخ بھی نماز سے فارغ ہوتے ہیں تو باہر سے آتے ہیں۔ ان کی نماز روحانی سفر ہوتی ہے، وہ اسوقت اپنے آپے میں نہیں ہوتے۔

فرمایا۔ طلب و جوع ہر کامیابی کے لئے ضروری ہے، وہ طلب ناقص ہے جس کے لئے قربانیاں نہ کی گئی ہوں۔ جو مقصد جتنا اعلیٰ ہوتا ہے اس کے لئے اتنی ہی زیادہ قربانیاں کرنی پڑتی ہیں۔ خدا کی محبت تکمیل انسانیت کا آخری مقصد ہے۔ سالک کو اپنے اندر صدق طلب اور حصول مقصد کے لئے جان توڑ کوشش کرنی چاہئے۔ مشائخ نے ابتدا میں روزہ اسی لئے قرار دیا ہے، تاکہ جس مقصد سے محبوبات و مالوفات کو ترک کیا گیا ہے۔ اسکی یاد ہر دم تازہ رہے، مادیت کم ہو، روح میں تازگی آئے۔ دنیا کی طرف سے دل ہٹے، اور ولولۂ طلب دمبدم بڑھتا رہے۔ جو لوگ اس حصار میں داخل ہو جاتے ہیں، نفس اور شیطان کی آمد و شد سے محفوظ ہو جاتے ہیں، اور اُن کے خطرات رحمانی ہوتے ہیں۔ میں ہر مبتدی کو جوع بے صوم کی (جو قوی ہو) اور جوع با صوم کی (جو کمزور ہو) ہدایت کرتا ہوں۔

پوچھا: جاھدوا فینا کے کیا معنی ہیں؟ فرمایا: اہل ادب کلمہ فی کی اتصالیت پر زور دیتے ہیں، اور ظرف و مظروف کی بحث چھیڑتے ہیں، لیکن مشائخ کے ہاں کچھ اور معنی ہیں۔ وہ کہتے ہیں مجاہدہ کی تین قسمیں ہیں۔ ایک دوزخ سے ڈرنے والے، دوسرے بہشت کے امیدوار، تیسرے خدا کے طالب۔ جنت و دوزخ کی امید و بیم مجاہدہ مجاہدہ للہ ہے، اور طلب مولیٰ کا مجاہدہ مجاہدہ فی اللہ ہے۔ اول الذکر مجاہدے معمولی اور آسان ہوتے ہیں۔ لیکن آخر الذکر مجاہدہ نہایت سخت اور مشکل ہوتا ہے، اسی کی نسبت ہے جاھدوا فی اللہ حق جھادہ مطلوب جتنا بلند ہوتا ہے۔ اتنی ہی زیادہ اس کے لئے محنت کی جاتی ہے۔

فرمایا: اعمال کی قبولیت جذبہ پر موقوف ہے، جو کام جذبہ سے نہ ہوگا قبول نہیں کیا جائیگا۔ جذبہ کے لئے کوئی وقت معین نہیں ہے، کبھی بچپن میں پیدا ہوتا ہے، کبھی جوانی میں، کبھی بڑھاپے میں۔ لیکن اس کے مراتب ہیں، عوام کا جذبہ اعمال میں توفیق پاتا ہے اور خواص کا جذبہ عشق خالق میں فنا ہو جاتا ہے۔

فرمایا: محبت کی دو قسمیں ہیں، ایک محبت ذات دوسرے محبت صفات۔ محبت ذات مواہب سے ہے، اور محبت صفات مکاسب سے ہماری دسترس سے باہر ہے، اور یہ بالکل ہمارے ہاتھ میں ہے ہمیں چاہئے کہ اس قدرت کو کام میں لائیں، اور ایک دم کے لئے بھی اپنے اس اختیار اور فرض سے غافل نہ ہوں، ہمارا کام بالکل صاف اور واضح ہے، ہمیں فانی زندگی، اور ماسوی کے الجھاؤ سے نکل کر عشق الٰہی کی سرشاری لینی ہے ہمیں اسکو لینے کی جد و جہد کرنی چاہئے۔ اس کے چار رکن ہیں: عزلت، قناعت، توبہ، قلندری۔ جو لوگ ان کی حقیقت کو پالیتے ہیں وہ تمام خطرات و مہالک سے محفوظ ہو جاتے ہیں، ان کے آگے روحانی نعمتوں کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اور وہ ابدی

زندگی حاصل کر لیتے ہیں۔

فرمایا: جب تک راہ نہ چلیں منزل کو نہیں پہونچ سکتے' جدوکوشش ضروری ہے: والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا
مجاہدہ بھی راہ روی ہے' اس سے روح آلودگیوں سے پاک اور مادی گرفتاریوں سے آزاد ہوجاتی ہے۔ جس مقصد سے جو کام کیا جاتا ہے
اور جتنے جوش و سرگرمی سے کیا جاتا ہے وہ آخر عروس کامیابی کی صورت دیکھتا ہے۔

فرمایا: سالک کو اپنے کام میں سپاہی کی طرح مضبوط' مستعد' اور بلند ہمت ہونا چاہئے۔ زمانہ کے گرم و سرد کے طوفان اٹھیں اور
گزر جائیں' راحتوں اور خوش حالیوں کی حکومتیں قائم ہوں اور چٹ ہوجائیں۔ لیکن اس کا دل اس جلوۂ سراب سے میلان ہو وہ
اپنی جگہ سے سر موجنبش نہ کرے' اس کا ارادہ لوح محفوظ کی طرح اٹل رہے' اس کی نظر دم بھر کو نہ چوکے۔

انسان لیسیر الحصول کامیابیوں کی قدر نہیں کرتا' اس لئے کوئی کامیابی سامنے نہیں آجاتی۔ آرام کا خوگر ہونے کے لئے
تکلیف کا مزہ چکھنا ضروری ہے۔ حضرت موسیٰ کو نبوت کی منزل تک پہونچنے کے لئے بیشمار مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ تنور میں ڈالے گئے تابوت
میں رکھے گئے۔ دشمن کے ہاتھ گرفتار ہوئے۔ قبطی کی موت کا واقعہ پیش آیا' چودہ برس غریب الوطنی کی مصیبت اٹھائی' اور ایک دم کو
آرام نہ پایا۔ تاہم وہ دل تنگ نہ ہوئے ہر منزل فاتحانہ اولوالعزمی سے طے کی۔ ایک رات زمین سے آسمان تک اندھیرا چھا رہا تھا' بجلی
چمک چمک کر غائب ہوجاتی' اور کڑک سے ساری مخلوق کپکپا جاتی تھی' بادلوں کی گرج سے کوہ و صحرا ہلے ہوئے تھے' مینہ کہتا تھا
اب برس کے پھر نہ برسوں گا' سردی ایسی شدید تھی کہ معلوم ہوتا تھا برف کٹ رہی ہے' جنگل کے وحشی جانور اپنے بھٹوں سے نکل پڑے
تھے' اور موسیٰ اپنی بی بی کو لئے لق و دق جنگل میں بھٹک رہے تھے۔ اسی حال میں ان کو درد زہ اٹھا' اور آناً فاناً اتنا بڑھ گیا کہ وہ ضبط
نہ کر سکیں۔ موسیٰ نے کونے کھدروں میں آگ ڈھونڈی' مگر اس موسلا دھار مینہ میں وہ کہاں مل سکتی تھی' چقماق کی آگ بھی سردی اور پانی
سے بجھ گئی تھی۔ مجبور و مایوس ہو کر بیٹھ گئے۔ لیکن مصیبتوں کی یہ آخری منزل تھی۔ خدا نے اسی کف دست جنگل کو کامرانیوں کا باغ سدا
بہار بنا دیا۔ قریب کی پہاڑی پر آگ کا شعلہ چمک کر بولا: انی انت نادا' موسیٰ بے تابانہ دوڑے مگر وہاں پہونچے تو ادھر ہی گل کھلا
آواز آئی انا ربک فاخلع نعلیک انک بالوادالمقدس طویٰ۔ پس میرے دوستو! راہ مقصود میں مصیبتیں برداشت کرنے کیلئے
تمہیں بھی ایسا ہی قوی دل' بلند ہمت' اور جوان عزم ہونا چاہئے۔

در رہ منزل جاناں کہ خطرہاست بسے شرط اول قدم است کہ مجنوں باشی

فرمایا: موجودات محسوس کو اصطلاح تصوف میں عالم ملک کہتے معقول کو عالم ملکوت' بالقوہ کو عالم جبروت۔ اور اس کے
ماوراء کو عالم لاہوت کہتے ہیں۔ ان میں سے ہر عالم دوسرے عالم پر محیط ہے اور یہ احاطہ لطافت کی وجہ سے ہے۔ ملک کے مقابلہ میں
ملکوت کے اور ملکوت کے مقابلہ میں جبروت کے لطائف بہت لطیف ہوتے ہیں۔ مگر لاہوت کے لطائف لطیف تر ہوتے ہیں اسی
وجہ سے لاہوت' ملک و ملکوت اور جبروت کے ذرہ ذرہ پر محیط ہے۔ اور اسکی ساری حقیقتیں آئینہ کے مانند اس پر منعکس ہوتی ہیں
جو لوگ اس مقام میں پہونچ جاتے ہیں' زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوجاتے ہیں' ان کے لئے قریب و بعید سب یکساں ہوجاتا ہے۔

ظاہر و باطن سب پر ان کی نگاہ ہوتی ہے یہی مقام ہے جہاں وھو معکم اینما کنتم" اور نحن اقرب الیہ من حبل الورید ۔ راست آتا ہے۔

فرمایا عشق کا کمال یہ ہے کہ عاشق کے لئے منع وعطا، رد وقبول، رحمت ولعنت ایک ہو جائے، جب تک فرق کا احساس باقی ہے عشق ناقص ہے ۔کمال وہاں ہے جہاں فرق نہیں ہے۔ جو عشق اس درجہ کو پہونچ جاتا ہے وہ سچا عشق ہے' اس کے لئے لعنت بھی رحمت اور ہجر بھی وصال ہے

فرمایا: صفات بشریت حقائق کے منافی ہیں جب تک بشریت کے صفات باقی ہوں سالک مقام حقائق تک نہیں پہونچ سکتا ۔اسی لئے کہا ہے تخلقوا باخلاق اللہ ۔

فرمایا: جس کا دل قوی، امید صادق، ہمت بلند ہو اس کا باطن اس تجلی کے ظہور سے چمک اٹھیگا جس کے ادراک سے عقول ملکی و بشری عاجز ہیں ۔سلوک اسی وقت پختہ ہوتا ہے جب کوئی آرزو باقی نہیں رہتی اور ہمت دنیا و آخرت سے گزر جاتی ہے میرے عزیزو! تم کو اتنا بے نیاز اور سیر چشم ہونا چاہئے کہ دونوں جہان کی نعمتیں بھی تمھارے قدموں پر ڈالدی جائیں تو تمھارا دل ان کی طرف مائل نہ ہو۔ تمھارا مطمح نظر ہمیشہ یہ ہونا چاہئے کہ ؎

دنیاست بلا خانۂ عقبی ہوس آباد ما حاصل ایں ہر دو بیک جو نہ ستانم

فرمایا: خم خانۂ رحمت سے جو کچھ پلایا جائے' قدح قدح پیو اور پستی نہ کرو۔ یہاں کام صرف ہمت پر ہے جتنی ہمت بلند ہوگی طلب اور تشنگی اتنی ہی زیادہ ہو گی۔

ہر کہ صاحب ہمت آمد مرد شد ہم چو خورشید از بلندی فرد شد

فرمایا: توحید ایک دریا ہے جسمیں علم و عقل، دانش و بینش، محسوسات و مدرکات سب غرق ہیں جو اس دریا میں ڈوب جاتے ہیں ان پر مدام حیرت طاری رہتی ہے۔

قطرہ کو غرق در دریا بود ہر دو کونش جز خدا سودا بود

اس حیرت زدگی میں کسی سے کچھ رہ جائے تو اس کے لئے وہ معذور ہے' اسکی بزرگی کی وجہ سے اس کا کوئی قول و فعل دوسروں کے واسطے حجت نہیں ہے۔

فرمایا: امام شبلی سے کسی نے پوچھا: ما صفۃ العارف ؟ بولے: صم بکم عمی۔ پس ہمیں یہ شور و غوغا کیا فائدہ دے سکتا ہے افسوس ہے کہ اب ہماری زبانیں چلتی ہیں اور عمل خاموش رہتے ہیں' پہلے عمل چلتے تھے اور زبانیں خاموش رہتی تھیں۔

دوستو! منہ بند کر لینا چاہئے' لکھنا پڑھنا پردہ کے باہر ہے' پردہ کے اندر عمل اور خاموشی ہے ؎

چوں سر ازل طعمۂ ابدال شود آں جملہ قیل و قال پامال شود
ہم مفتی شرع را جگر خوں گردد۔ ہم خواجۂ عقل را زباں لال شود

فرمایا: ہمارے ہاں پسندیدہ روش الاستقامۃ علی الشریعۃ مع کتمان السر ہے

فرمایا: صوفی خدا کا طالب ہوتا ہے' اسے لباس کی قیود سے آزاد ہونا چاہئے ۔ خرقہ' عمامہ' پیراہن' کفنی محض عادت پرستی ہے۔ اخلاق

اچھے نہ ہوں تو روزہ نماز کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ یہ ظاہری اسلام اور باطنی بت پرستی ہے۔ صوفی کا کام اخلاق انسانی سے گزر جاتا ہے خدا لباسوں کو نہیں دیکھتا، اسکی نظر ہمیشہ اخلاق پر رہتی ہے، وہ دلوں اور نیتوں کو دیکھتا ہے۔ ان اللہ لا ینظر الی صورکم و اعمالکم ولکن ینظر الی قلوبکم و نیاتکم۔

فرمایا: سالک کو مرنج و مرنجاں ہونا چاہئے۔ اس کے اقوال و افعال سے کسی کو صدمہ نہ پہونچے، دوستوں کے ساتھ لطف و محبت اور دشمنوں کے ساتھ خاطر مدارات سے پیش آئے۔ سچ کو کبھی ہاتھ سے نہ دے، اور خدا سے اپنا معاملہ بالکل راست رکھے۔ اسکی نظر وجودیات سے بلند رہے۔ اس کے طائر فکر کو فضائے ربوبیت میں پرواز کرنی چاہئے۔

فرمایا: سالک کو دشمن کی طرح اپنے اعمال کا محاسبہ کرنا چاہئے۔ اس کا کام یہ ہے کہ رات دن برائیوں کی گھات میں لگا رہے، اور جلاد کی طرح ایک ایک برائی کو چن چن کر ہلاک کر دے۔ اسکو ہمیشہ ٹوہ لگی چاہئے کہ اعضائے ظاہری و باطنی میں کون کون پاک ہے اور کون کون پلید۔ جو پلید ہو جائیں انھیں توبہ اور تجدید ایمان سے پاک کرنا چاہئے اور کوشش کرنی چاہئے کہ پھر وہ ناپاک نہ ہونے پائے۔ جب اس پر پوری طرح قدرت حاصل ہو جائے گی تو حقیقت ایمانی جلوہ گر ہوگی، اور محاسن و محامد کا ظہور ہونے لگیگا۔

فرمایا: سالک کیلئے اکل حلال پہلی اور سب سے بڑی پاک دامنی ہے جسکی روزی حلال اور عادتیں اچھی ہوں وہ جنید وقت ہے جس کو یہ سعادت نصیب ہو جائے اسکو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے۔

حضرت محمود کی خوبیوں اور رعنائیوں کی داستان ابھی بہت طویل ہے، ان کے ملفوظات (عربی اور فارسی میں) اتنے زیادہ ہیں کہ خواجگانِ چشت میں اتنے کسی کے نہ ہوں گے۔

ناظر دہلوی

تذکرہ خندۂ گل

یعنی

ظریف شاعروں کا تذکرہ

نہایت تیزی کے ساتھ چھپ رہا اور یقین ہے کہ جلد مکمل ہو جائیگا۔ جن حضرات نے غالباً پیشگی بھیجدئے ہیں، انکی خدمت میں طباعت کے بعد ذریعہ رجسٹری فوراً روانہ کر دیا جائے گا۔

اب بھی موقعہ ہے کہ آپ دو روپیہ بھیجکر نصف قیمت میں اسے حاصل کرلیں، ورنہ طباعت ختم ہونے پر چار روپیہ سے کم اسکی قیمت نہ لیجائے گی، اور محصول علاوہ اس کے ہوگا، کیونکہ اسکا حجم ۳۰۰ صفحات سے زیادہ ہوگا۔

اردو زبان میں یہ پہلا تذکرہ ہے جسمیں تمام قدیم و جدید ظریف شاعروں کے حالات، انکے لطائف اور انتخاب کلام کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

منیجر "نگار" لکھنؤ

فضل حسین صاحب تبسّم کے مضمون حالاتِ عرفی پر ایک نظر کی تنقید

اور ملّا عبد النبی مرحوم کے تذکرہ "میخانہ" پر ایک ضمنی تبصرہ

اسوقت جناب فضل حسین صاحب تبسم کا تنقیدی مضمون، جو "حالات عرفی پر ایک نظر" کے عنوان سے فروری ۲۹ء کے نگار میں چھپا ہے، میرے پیش نظر ہے اور چونکہ اس میں میرے مضمون "عرفی" پر تنقید کی گئی ہے اس لئے مجھے حق حاصل ہے کہ براہ راست انہیں سے مخاطب ہو کر جواب عرض کروں

میرے محترم دوست! قبل اسکے کہ میں آپکی تنقیدی تحریر پر روشنی ڈالوں یہ ضروری ہے کہ چند الفاظ میں آپکا شکریہ ادا کرلوں، کہ آپنے میری ناچیز تحریر کو کم از کم اہمیت کی نظر سے تو دیکھا، لیکن معاف فرمائیے اگر اسی کے ساتھ یہ بھی عرض کروں کہ "سخن شناس نہ دلبرا سخن اینجاست"

جیسا کہ آپ نے خود تحریر فرمایا ہے، آپکی تنقید محض صاحب "میخانہ" کی تحقیقات پر مبنی ہے، جسکی تصنیف کا زمانہ ۱۰۲۸ھ ہے یعنی عرفی کی وفات کے ۲۹ سال بعد یہ کتاب لکھی گئی، آپ نے اسے بھی بڑی اہمیت دی ہے کہ مصنف عرفی شیرازی کے خالو سے ملا تھا، میری تحقیقات کا دارومدار اورینٹل لائبریری (پٹنہ) کی متعدد قلمی کتابیں تھیں جنمیں ایک مآثر رحیمی مصنفہ عبد الباقی نہاوندی کا قلمی نسخہ بھی تھا، اپنی بدقسمتی کا شکوہ کروں یا آپ کی نظر عنایت کا شکریہ، کہ جو تنقید بھی (باستثنائے ایک واقعہ) آپ نے کی وہ ان واقعات سے متعلق ہے جنہیں میں نے صاحب مآثر رحیمی کے حوالہ سے لکھا تھا، کیا آپکو خبر نہیں کہ مآثر رحیمی کب لکھی گئی، اور اسکا مصنف عرفی کے زمانہ سے صاحب میخانہ کی بہ نسبت قریب تھا یا بعید؟ اگر آپ کو مآثر رحیمی کا زمانہ تصنیف معلوم ہوتا، اور پھر یہ حقیقت بھی آپ پر واضح رہتی کہ مآثر رحیمی کی روایتیں صاحب میخانہ کی بہ نسبت زیادہ قابل وثوق اور مرجح ہیں تو غالباً آپ تکلیف کرنے کی جرات نہ کرتے، کیا ترمذی شریف کے اندر آپنے صحیح اور ضعیف، موصول اور مقطوع، حسن اور مرفوع کے مدارج و تقسیم کے واقعات نہیں دیکھے، ؟ صاحب میخانہ کی روایات موصول ہیں یا مقطوع؟ آپنے خود ہی اعتراف کیا کہ صاحب میخانہ عرفی سے نہیں ملا، بلکہ اسکی وفات کے بعد صرف اسکے خالو سے ملا، آپنے حدیث کے اقسام، رواۃ کے طبقات، اور اصول حدیث کا مطالعہ کیا ہوگا، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ایسے راوی کی روایت جو نہ واقعہ کے وقت موجود ہو، اور نہ خود صاحب واقعہ سے ملا ہو، علمائے تاریخ و سیر کے نزدیک کہاں تک قابل اعتنا و استناد ہے؟

آپنے بڑے جوش کے ساتھ یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ علامہ شبلیؒ نے ماخذ شعر العجم میں میخانہ کا تذکرہ کیا ہے، معلوم ہوتا ہے، شعر العجم کا

وہ حصہ آپ کی نظر سے نہیں گذرا، جو عرفی شیرازی کے متعلق ہے، عرفی کے متعلق علامہ مرحوم کی تحقیقات کا زیادہ حصہ مآثر رحیمی ہی پر مبنی ہے۔

یہاں تک تو آپ کی مایۂ ناز کتاب میخانہ کی حقیقت تاریخی کے متعلق تھا، اب اپنی تنقید کا بھی سلسلہ وار جواب سن لیجئے۔

نام و نسب یہ صحیح ہے کہ میں نے صاحب مآثر رحیمی کے حوالے سے عرفی کا پورا نام خواجہ سید محمد بن زین الدین علی علوی بن جمال الدین مشہور بہ "چادر باف" لکھا تھا، آپ لکھتے ہیں کہ اسکا اصل نام محمد حسین تھا، اور اس کے والد کا نام خواجہ بلوی" ہے، اصول روایت کے مطابق تو صاحب مآثر رحیمی ہی کا قول مرجح ہونا چاہئے، لیکن درایۃً بھی یہاں آپ پر چند اعتراضات ہوتے ہیں: "محمد" تک ہم آپ متفق ہیں باقی رہا "حسین" تو ممکن ہے گھر والوں نے محمد حسین ہی نام رکھا ہو لیکن دنیا نے اسے جس نام سے مخاطب کیا وہ وہی ہے جو میں نے اپنی ناچیز تحقیق میں ظاہر کیا تھا، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ تمام تذکرہ نویسوں نے یہی نام لکھا ہے، مآثر رحیمی، صحف ابراہیم، مخزن الغرائب، مجمع النفائس، ریاض الشعراء میں یہی نام پائے جاتے ہیں، آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ہزاروں اکابر اس نام سے مشہور نہیں ہیں، جو ماں باپ نے رکھے تھے، اگر کوئی شخص اپنی تحقیق کی بنا پر متقدمین کے حوالے سے یہی نام لکھے تو کیا آپ کو اسمیں تاریخی غلطی نظر آئے گی؟ یہ تو درایت کے لحاظ سے میں کہہ رہا ہوں، ورنہ روایت کے لحاظ سے تو مجھے صاف انکار کر دینا چاہیے کہ صاحب میخانہ کی تحقیق کو میں عبد الباقی نہاوندی کی تحقیق کے مقابلہ میں ماننے کیلئے تیار نہیں،

آپ نے اس کے والد کا بھی ایک نہایت ہی غلط نام پیش کیا ہے، آپ ہی فرمائیے "عقل" "زین الدین علی علوی" تسلیم کرنے کیلئے تیار ہے، یا "خواجہ بلوی" نہ معلوم بلوی کس لغت کا لفظ ہے اگر صاحب میخانہ کی تحقیق آپ کے نزدیک زیادہ قابل اعتبار تھی، تو کم از کم آپ فارس کے جغرافیہ کا مطالعہ تو کر لیتے، یاقوت حموی کی کتاب معجم البلدان عربی میں موجود ہے، ناصر خسرو علوی کا سفرنامہ فارسی ہی میں نہیں بلکہ ایم شیفر کی بدولت فرنچ میں بھی پایا جاتا ہے آپ کو جستجو کرنی تھی کہ آیا "بلو" فارس میں کوئی مقام بھی ہے یا نہیں اور اگر یہ بات آپ ثابت کر دیں تو بھی آپ پر یہ اعتراض قائم رہے گا، کہ یہ نام اضافت یہ ادنی ملابست کے رشتہ سے ہے حقیقی نام کچھ اور ہے: اگر میں امام بخاری کو محمد بن اسمعیل، اور رازی کو فخر الدین، یا محمد بن زکریا لکھوں تو آپ اسے تاریخ کی روشنی میں غلط ثابت کرنیکی کوشش کریں گے، ہ سنجیدہ دماغ صاحب میخانہ کی تحقیق "خواجہ بلوی" کو ماننے کے لئے تیار نہیں، اگر آپکو اسپر اصرار ہے، تو آپ براہ کرم لفظ "بلوی" پر مزید روشنی ڈالئے۔

آپنے وجہ تخلص پر بھی اعتراض کیا ہے، آپ نے فردوسی کی ابتدائی زندگی کا مطالعہ کیا ہوگا، تو آپکو معلوم ہوگا کہ ابتداً "فردوسی" اس کا تخلص نہ تھا اسی طرح مرزا نوشہ دہلوی کو دیکھئے، وہ پہلے "اسد" تخلص کرتے تھے، اب کوئی صرف فردوسی اور غالب لکھے اور ان کے ابتدائی تخلص کا تذکرہ نہ کرے تو کیا آپ کو اعتراض ہوگا، اگر عرفی ابتداً صیدی تخلص کرتے تھے، تو بعد میں انہوں نے میری تحقیق کے مطابق شرعی اور عرفی (سوشل) معاملات کی مناسبت سے عرفی تخلص اختیار کیا تو کونسا استبعاد عقلی ہے، یہ بھی میں نے صاحب مآثر رحیمی کے حوالہ سے لکھا تھا، یہ تو آپ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اسکے والد حکومت میں ایک عہدہ پر فائز تھے

اگر صاحب مآثر رحیمی کے مفصلۂ ذیل قول کو صحیح مانا جائے تو اعتراض ہی کیا ہے؟ فرماتے ہیں:-

"سبب عرفی تخلص نمودن ایشان آنست کہ چوں پدرش بعض اوقات در دیوان حکام فارس باہر داروغہ دارالفاضل شیراز مشغولی می نمود مناسبت شرعی عرفی را منظور داشتہ تخلص خود عرفی کرد"

لطف تو یہ ہے کہ صاحب میخانہ کی روایت سے یہاں تضاد بھی واقع نہیں ہوتا، اور آپ اپنے جوش تنقید میں اسے متضاد ہی خیال فرمارہے ہیں، صاحب میخانہ بھی اپنی جگہ پہ صحیح اور مآثر رحیمی کی روایت بھی معتبر اگر تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کرلیا جائے، کہ والد نے شیراز ہی سے تخلص عرفی کا "انتخاب" کیا، تو میں نے یہ تو کہا نہیں کہ عرفی نے "خود" انتخاب کیا، بلکہ صرف "اختیار کیا" لکھا تھا۔

ولادت و وفات

برادرم یہ دیکھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی کہ اس بادیہ پیمائی میں آپ جتنے قدم آگے بڑھاتے گئے ہیں، اسی قدر منزل دور ہوتی گئی ہے، آپ نے ملا عبد النبی مرحوم کا تاریخی حیثیت سے یہ غیر ذمہ دارانہ جملہ تو نقل کر دیا، لیکن اس کے تحقیقی نقایص و معایب پہ غور فرمانیکی زحمت گوارا نہیں کی۔ ملا صاحب فرماتے ہیں:-

"ہنوز سنش بہ چہل نہ رسیدہ بود کہ در لاہور در سنہ اثنی و الف عالم فانی را وداع نمود" اور چند جملوں کے بعد میرزا نظام قزوینی کا یہ بیان نقل کرتے ہیں "چوں نزدیک او شدم، دیدم کہ کار بسر دشوار شدہ و نفسش بشمار افتادہ پرسیدم چہ حال داری جواب داد "دو شش و شش و پنج" اب آپ استنباط فرماتے ہیں کہ اس سے وقت مرگ کی رباعی کی تصدیق نہیں ہوتی۔

پہلے تو آپ کے ملا صاحب کے "طوفان تحقیق" ہی پر مجھے اعتراض ہے، یہ ایک مورخ کا نقص نہیں تو اور کیا ہے کہ وہ بجائے عمر کی صحیح تعین کرنیکے، صرف یہ غیر ذمہ دارانہ جملہ "ہنوز سنش بہ چہل نہ رسیدہ بود" لکھدے، صرف اسی واقعہ کو لے لیجئے، تو ملا صاحب کے معیار تاریخ دانی، اور ذوق کاوش پہ کافی روشنی پڑتی ہے، اسکے برخلاف صاحب مآثر رحیمی کا قول دیکھئے۔

"بتاریخ شوال تسع و تسعین و تسعمأۃ ۹۹۹ در سن سی و شش سالگی در لاہور جہان فانی را وداع نمود"

ارباب تمیز بیک نظر جان لے سکتے ہیں، کہ صاحب میخانہ کی روایت ترجیح پہلو رکھتی ہے یا صاحب مآثر رحیمی کی، ابھی عمر کا چالیسواں سال بھی نہ گذرا تھا، کہ وفات پائی" قطعی فیصلہ ہے یا یہ کہ "سنہ ۹۹۹ھ میں ۳۶ سال کی عمر میں دنیا سے گذر گئے" اسکول کی جب تاریخ یاد نہیں رہتی ہے، تو بچے استادوں کو ایسا ہی مغالطہ دیا کرتے ہیں، "ہنوز سنش بہ چہل نہ رسیدہ بود" نے میرے سامنے زندگی کا وہ دلچسپ واقعہ بعینہ پیش کر دیا۔

میں نے لکھا تھا کہ عرفی نے بستر مرگ پر ایک رباعی کہی تھی، اور آپ نے اسے ساقط الاعتبار تصور کیا، کیونکہ ملا عبد النبی نے یہ لکھا ہے، کہ دم نکل جانے کے کچھ وقت قبل جب میر نظام الدین قزوینی عرفی سے ملے، تو انہوں نے "دو شش و شش پنج" کہا، اس استنباط سے تو پتہ چلتا ہے کہ آپ نے کبھی "اشکال بخاری" کا مطالعہ نہیں کیا، محدثین نے بخاری کی بعض روایتوں کو جو بظاہر متضاد معلوم

ہوتی ہیں، تطبیق دے کر نہایت باریک بینی کا ثبوت دیا ہے، میں آپ کو مشورہ دونگا کہ بخاری کی ایسی روایات ضرور مطالعہ کریں کیونکہ یہ آپکی صحت تنقید کیلئے فایدہ بخش ہوگا۔

مختصراً سن لیجئے، محدثین نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت کی مختلف حدیثیں روایت کی ہیں، جن میں دو یہ ہیں ۱ خرجوا الیھود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب، دوسری حدیث (بخاری، کتاب الجنائز) میں حضرت عائشہ صدیقہ کی روایت سے یہ ہے، کہ آپ دم واپسین کے وقت اللھم الرفیق الاعلیٰ فرمارہے تھے، دونوں حدیثیں، اصول روایت کے مطابق صحیح ہیں، اب آپ کے اصول تنقید کو پیش نظر رکھا جائے تو دونوں متضاد ثابت ہونگی، حالانکہ علماء نے انکی تطبیق دی ہے، دونوں اپنی اپنی جگہ پہ صحیح ہیں اگر عرفی نے سانس نکلتے وقت "دشمنی دشمش پنج" کہا تھا، تو اس سے بستر مرگ پر رباعی کہنے کی تردید کہاں سے ہوگئی، میں نے یہ تو لکھا ہی نہیں کہ "عرفی نے یہ رباعی کہی اور انکا دم نکل گیا" بلکہ صرف بستر مرگ کا لفظ ہے، یعنی جس بیماری سے انہوں نے قضا کی، اس بیماری مرگ میں یہ رباعی کہی تھی، آپ کو غالباً "دم نزع" کی ترکیب سے غلط فہمی ہوئی "دم نزع" سے "سانس اکھڑ جانا" مراد نہیں ہے، بلکہ "وقت آخر مراد" ہے کیونکہ سب سانس اکھڑ جاتی ہے تو ہوش کہاں، رہتا ہے کہ انسان شاعری کرے۔

ورود وقیام ہند

اس عنوان کے ماتحت بھی آپ نے نہایت پرلطف، مباحث پیدا کئے ہیں۔ مثلاً یہ آپ نے عرفی کو معشوقہ ایران تصور کرکے ہندوستان میں اس کے ورود کو بھی محض "اضمحلال حسن" ہی کی وجہ سے قرار دیا، مجھے جس قدر آپسے شکوہ ہے اس سے کہیں زیادہ خود ملا عبدالنبی صاحب کی ادائے ستمگار کا گلہ ہے، معلوم ہوتا ہے۔ وہ نہ تو اصول سیرت نگاری سے واقف تھے اور نہ انہوں نے نفسیات کا مطالعہ کیا تھا، ملا صاحب فرماتے ہیں :۔

> "در سن چہاردہ و پانزدہ سالگی حسن او قبول تمام عیاری ہم رسانده بود چوں سال عمرش به بست رسید آبلہ سرشاری برآورد، بعد از انقضائے اشتداد و استخلاص ازاں مرض تغیرے در چہرۂ او بہم رسید، چنانکہ ہر کس کہ او را دید تنفری کرد مولوی ازاں مقدمہ بغایت آزرده دور ہم بود بنا براں آں از وطن خروج کرده بہ ہندوستان کہ خانہ نشو و نمائے نکتہ سنجان و دار العیار خردمنداں است آمد"

الغرض ملا صاحب کے خیال میں عرفی یہی نہیں کہ "خواجہ حسن" دہلوی کی طرح ایک حسین شاعر تھے بلکہ انہیں "حسن فروشی" کا بھی خیال تھا، اور جب چیچک کی دستبرد سے یہ حسن ظاہر جاتا رہا، تو لوگ ان سے ایسے متنفر ہوئے، کہ انہوں نے مجبوراً ترک وطن کیا، گویا شیراز قدرداں تھا، تو عرفی کے حسن کا، اور جب اسے "آبلہ سرشار" نے غارت کر دیا تو عشاق بوالہوس نے بھی کنارہ کشی کرلی، بندہ نواز، کیا سیرت نگاری کا اس سے زیادہ کوئی بدنما پہلو دکھایا جاسکتا ہے، ؟۔

اگر ملک عرفی کے علم و فن کا قدرداں تھا، تو چیچک نکلنے اور صاحب میخانہ کی تحقیقات کے مطابق، کریہ المنظر ہونے کے بعد بھی وہ اہلیت اسمیں موجود تھی، ایک اور مزہ کی بات آپ کے ملا صاحب نے یہ لکھ دی ہے کہ "ہر کس کہ او را دید تنفری کرد" مہربان من! کیا اس پر نفسیاتی نقطۂ نظر سے بھی نگاہ ڈالی، ؟ اگر ارباب وطن کا ذوق سلیم اسقدر اعلیٰ تھا کہ انہوں نے عرفی کی صورت سے نفرت کرنی شروع کی تو تعجب ہے

دربار مغلیہ کی پستی احساس ہوا کہ اس نے اسے مقربین خاص میں شامل کر لیا۔ اور شاہی خاندان سے اسکا ایسا تعلق ہو گیا، کہ لوگوں نے شاہزادہ سلیم کا اسے عاشق ہی مشہور کر دیا۔ ریاض الشعراکی اس روایت سے کم از کم اتنا تو ضرور ثابت ہو جاتا ہے، کہ شاہزادہ سلیم کی صحبت میں اسے ایک خصوصیت حاصل تھی، بھلا ایسا بدصورت انسان جسے دیکھنے والوں کو نفرت آتی ہے، کیا جہانگیر جیسے حسن پرست انسان کے دربار میں باریاب ہو سکتا تھا نفسیاتی تحقیق اسکی تائید نہیں کرتی لہذا صاحب میخانہ کی روایت جو عرفی کے اسباب سفر ہند کے متعلق ہے، یک لخت ساقط الاعتبار، اور بالکل بے سر و پا افسانہ ہے، قرائن یہی بتاتے ہیں، کہ عرفی کی علمی نوازیوں سے احباب وطن اکتا گئے تھے، اس لئے انہوں نے اس سے تعلقات کشیدہ کر لئے تھے، یہی وجہ ہوئی کہ اسنے ہندوستان کا سفر کیا، براؤن کی یہی تحقیق ہے، جو لٹریری ہسٹری آف پرشیا کی تیسری جلد کے اندر عرفی شیرازی کے ذیل میں پائی جاتی ہے۔

آپ نے صاحب میخانہ کی تحقیقات کے مطابق عرفی شیرازی کے قیام ہند کی مدت پندرہ سولہ سال متعین کی ہے۔ میں نے صاحب مجمع النفائس کی روایت سے تاریخی استدلال کر کے صرف ایک سال کی مدت لکھی، اس معاملہ میں میرے نزدیک صاحب مجمع النفائس پر ملا عبدالنبی کی روایت کو تفوق حاصل ہے، لیکن میں صرف اسی ایک روایت کی بنا پر سراج الدین علی خاں آرزو جیسے نکتہ داں مصنف کی تکذیب نہیں کر سکتا، مجمع النفائس میں صاف لکھا ہوا ہے۔

"تقی اوحدی گوید در سن سی و شش سالگی از صفاہاں کہ مولد من است متوجہ شیراز کہ وطن اصلی آبا و اجدا است، متوجہ شدم بہ خدمت و صحبت مولانا عرفی رسیدم، پنج سال پیش از آنکہ او متوجہ ہند شود، اکثر در ملازمت در سفرہائے دیگر کہ مجمع بودند میرسیدم، و اشعار با با فغانی کہ در ایام طرح می شد تتبع می نمودم سن وے تقریباً سی سالہ بود"

اس سے صاف ظاہر ہے، کہ عرفی شیرازی جب تیس سال کے تھے، تقی اوحدی نے ان سے ملاقات کی اور اس واقعہ سے پانچ برس کے بعد، انہوں نے ہندوستان کا سفر کیا، جب مآثر رحیمی کی روایت کے مطابق ۳۶ سال کی عمر میں عرفی کی وفات تسلیم کرتا ہوں تو نتیجہ یہی نکلتا ہے، کہ وہ صرف ایک سال ہندوستان میں قیام پذیر رہے، اب اس روایت سے صرف صاحب میخانہ نے اختلاف کیا ہے تو چنداں اہم نہیں، لیکن اگر اس کے ساتھ اور تذکرے بھی متفق ہیں، تو میں، آپکی تحقیق کو مان لوں گا۔ بشرطیکہ آپ اس پر اصول درایت کے لحاظ سے روشنی ڈالیں، اور سراج الدین علیخاں آرزو کی روایت کو درایۃً پایۂ اعتبار سے گری ہوئی ثابت کر دیں۔

استخوان عرفی کا نجف اشرف پہونچنا

آپ نے اس عنوان کے ذیل میں بھی چند دل خوش کن باتیں لکھی ہیں، اس سلسلہ میں آپکو مجھ سے ترتیب واقعات کے متعلق اختلاف ہے، پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ نے میرے الفاظ سے یہ نتیجہ نکالا ہے، کہ خود میر صابر اصفہانی استخوان عرفی کو نجف اشرف لے گئے اور آپ نے اپنے خیال کی تائید میں میری سطور کا اقتباس بھی درج کر دیا ہے، لیکن مجھے افسوس ہے کہ آپکی یہ سعی بھی کامیاب نظر نہیں آتی، آپ "خود" کا لفظ کہاں سے لائے، میں نے لفظ "خود" نہیں لکھا، اب اپنے استنباط کی حقیقت دیکھئے، کیا یہ محاورہ نہیں ہے کہ ہم اپنے زیر اثر کوئی کام کریں اور اسے اپنی طرف منسوب کریں خواہ اس

عمل میں میرے ہاتھ پیر کو جنبش ہوئی ہو۔ اگر میں کہوں کہ "فلاں باغ میں نے لگایا ہے" تو کیا آپ اس سے یہ نتیجہ نکالیں گے کہ ایک مزدور کی طرح دن بھر دھوپ میں مرمر کر میں نے درخت بھی اپنے ہاتھ سے لگائے ہیں۔ ابن عباس سے ایک روایت منقول ہے جو اہلسنت اور اہل شیع کے درمیان بحث متنازعہ فیہ ہے، یہ حدیث مسلم شریف میں بھی موجود ہے، اور بخاری شریف کی کتاب المرضیٰ میں بھی پائی جاتی ہے، سرور کائنات کا آخری وقت تھا، آپ فرماتے ہیں ھلم اکتب لکم کتابا لا تضلوا بعدہٗ حدیث میں لفظ "اکتب" واحد متکلم کا صیغہ ہے جسکا ترجمہ ہے "لکھدوں" یہ ظاہر ہے کہ سرور کائنات ایک "امی" شخص تھے اس لئے اس کے معنے یہی لئے جاویں گے کہ "لکھوادوں" چونکہ آپ کی تحریک اور آپ کے زیر اثر آپ کے خیالات کی ترجمانی ہوتی، اس لئے گویا آپکا "لکھوادینا" عین "لکھنا" تھا، اسلئے آپکا یہ اعتراض بھی بالکل بے معنی ہے۔ ہاں اگر لفظ "خود" یا "بنفس نفیس" لکھا تو آپکا یہ اعتراض حق بجانب تھا۔

آپ فرماتے ہیں کہ ملا عبدالنبی نے وفات کے ۲۵ سال کے بعد استخواں عرفی کا نجف اشرف میں دفن ہونا بیان کیا ہے لیکن مجھے اصرار ہے کہ مآثر رحیمی زیادہ معتبر ہے جس میں "سی سال" موجود ہے، اور مآثر رحیمی کی تحقیق کے ساتھ اور بھی تذکرے اس خیال کی تائید کرتے ہیں، جنکا حوالہ میں اپنے مضمون میں پیش کر چکا ہوں۔

آپنے آخر میں یہ نظریہ بھی بڑی شد و مد سے پیش کیا ہے، کہ میرے ہی قول سے میرے خیال کی تردید ہوتی ہے، جب میں یہ تسلیم کرتا ہوں، کہ عرفی نے ۹۹۹ھ میں وفات پائی، اور تیس سال کے بعد انکے ریزہ ہائے استخواں کو لوگوں نے نجف اشرف میں دفن کیا، تو اس حساب سے نجف اشرف میں دفن ہونیکی تاریخ ۱۰۲۹ھ ہوتی ہے، اور میں نے ملا رونقی کا جو قطعہ پیش کیا تھا، اس سے ۱۰۳۲ھ نکلتا ہے لہذا میرے ہی قول سے میری تردید ہوگئی، اور صاحب میخانہ کی تحقیق کہ "عرفی نے ۱۰۰۲ھ میں انتقال کیا" پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی حالانکہ آپنے اپنے خیال میں ان متضاد واقعات کے متعلق جو تنقید کی ہے، وہ ناظرین نگار کیلئے اور بھی باعث دلچسپی ہوگی، جب وہ یہ غور کریں گے کہ آپنے ملا رونقی کی جس تاریخ سے استدلال کیا ہے، وہ آپ کے نزدیک مستند بھی ہے یا نہیں؟ آپ تو ملا عبدالنبی کی روایت کے مطابق ۲۵ ہی سال کے بعد عرفی کے استخواں کا نجف اشرف میں دفن ہونا تسلیم کرتے ہیں تاہم اور جب یہ بھی آپ مانتے ہیں، کہ انہوں نے ۱۰۰۲ھ میں وفات پائی، تو اب دو ہی صورتیں باقی رہ جاتی ہیں یعنی ملا رونقی کی تاریخ آپ کے نزدیک صحیح ہوگی، یا غلط، اگر تاریخ غلط نکالی گئی ہے تو بحث ہی ختم ہے، اگر صحیح ہے، تو آپ کو ماننا پڑیگا کہ عرفی کی وفات ۱۰۰۷ھ میں ہوئی نہ کہ آپ کی تحقیق "میخانہ" کے مطابق ۱۰۰۲ھ میں کیونکہ جب ۱۰۳۲ھ میں سے ۲۵ نکال لینگے تو ۱۰۰۷ھ باقی رہجاویگا، ملا رونقی کی تاریخ جس طرح آپ کے خیال میں میرے دعوی ۹۹۹ھ کو ثابت کرنے کے لئے غیر مفید ہے۔ اسی طرح آپکی تحقیق کے مطابق عرفی کی وفات ۱۰۰۲ھ کے دعوی کو باطل ٹھیرا رہی ہے۔

عبدالمالک آروی

تعزیر جرم

افسانہ

(۱)

شب تاریک اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں بہ سرعت تمام ختم کر رہی تھی۔ سوسن جو چند لوں کا مہمان سمجھا جا رہا تھا زندان کے ایک گوشہ میں مصروف الحاح و مناجات تھا دفعتاً دروازہ کھلا اور سوسن نے دیکھا کہ شمع ہاتھ میں لئے شاما اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے ایک اشارۂ مبہم پہ سوسن کی بیڑیاں کاٹ ڈالی گئیں۔

"تم میرے لئے مایوسی کے سیاہ بادلوں سے نور رحمت بن کر نمودار ہوئی ہو" سوسن نے کہا۔

"نور رحمت!" زیر لب کہتے ہوئے شاما نے ایک ایسا زور کا قہقہ لگایا جیسے گرجتے ہوئے بادل دیوانہ وار برس پڑیں۔ ہم اساں بھوتوں کے غول کے مانند اس کی صدائے بازگشت زندان کی دیواروں سے ٹکرا کر لوٹی۔

(۲)

دریائے برونا کے کنارے ناریل کے درختوں کی دھندلی قطاروں میں پو پھٹ رہی تھی۔ شاما نے کشتی میں قدم رکھتے ہوئے کہا "آؤ پیارے زمانۂ ماضی کے مصائب و آلام بھول کر اب کہیں چلے چلیں"

دریا کی افتاں و خیزاں موجوں میں کشتی سبک سیر روانہ ہوئی۔ سوسن نے شاما کے سر کو اپنے سینہ سے لگا کر کہا۔ "ہاں! یہ تو بتاؤ کہ ابھی زنجیروں میں جکڑنے کے لئے تم نے میری آزادی کس قیمت پر خریدی؟"

شاما جو اس کے سینہ سے لپٹی تھی زیادہ زور سے لپٹ گئی اور کہا۔ "ابھی نہیں"

(۳)

موجوں کے ساتھ ساتھ بہنے والی کشتی پر آفتاب پرتو فگن ہونے لگا۔ عورتیں اشنان کر کے بھیگے جسم اور لباسوں میں سروں پر پانی کے گاگر لئے گھروں کو واپس ہو چکی تھیں اور صبح کا بازار برخاست ہو چکا تھا۔ دورویہ بانس کے درختوں کی قطاروں والی سڑک پر سکوت مطلق طاری تھا۔ جنگل کے پھولوں کی نکہت سے معمور ہوا کے جھونکوں سے شاما کی نقاب الٹ گئی۔

سوسن نے رکتے رکتے پوچھا "کیا تم اپنے احسان سے مجھے کبھی آگاہ ہونے نہ دو گی؟۔ اگر میں اس بار سے سبکدوش نہ ہو سکوں تو کم از کم اس کے مایوسانہ محاسبہ سے تو پیہم لطف اندوز ہوتا رہونگا۔ شاما نے اپنی نقاب کو درست کرتے ہوئے جواب دیا "ابھی نہیں"

(۴)

رات کے تاریک ساحل پر روشنی چلی آرہی تھی کشتی اس ویران مندر کے قریب پہونچ گئی جو لب جو برگد کے زیر سایہ واقع تھا اسی چاند ابر کی ہلکی نقاب میں منہ چھپائے دریا کی لہروں پر اسی طرح رقصاں تھا جس طرح کسی ننھے بچہ کی کاغذی ناؤ۔

رات بتدریج تاریک ہونے لگی اور تاریکی کے ساتھ اس سوال کی ہولناکی اور اہمیت بھی بڑھتی گئی جو دن بھر شرمندہ جواب نہ ہوسکا تھا۔

شاما نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور کہا "میں نے جو کچھ تمہارے لئے کیا ہے وہ تکلیف اور قابل ملامت ضرور ہے اور پھر تم سے اس کا اعادہ اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے۔ مگر میں مختصراً بیان کرتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ سنتے ہی تم اس کو فراموش کردو۔ نوجوان یوتمیا نے جو میرا عاشق زار ہے تمہارے جرم کو اپنے سر محض یہ ثابت کرنے کی خاطر لے لیا ہے کہ میری خوشنودی کیلئے کس طرح اپنی جان نثار کرسکتا ہے۔

"میرے اچھے محبوب! میں نے اپنی زندگی کے اس گناہ عظیم کا ارتکاب تمہارے لئے ہاں فقط تمہارے لئے کیا ہے"

(۵)

چاند رخصت ہوچکا اور جنگل ایک سکوت تاریک میں ملفوف ہے۔ سوسن کے اس ہاتھ کی گرفت جو شاما کی کمر میں حلقہ کئے ہوئے تھا، کمزور ہوگئی اور دونوں علیحدہ ہوگئے اب انہیں ہر شئے ایک دوسرے سے معتاد دور کرنے لگی، حتیٰ کہ انکی خاموشی اور درمیانی فاصلہ بھی دونوں میں حائل ہوگیا شاما فوراً جھکی اور سوسن کے قدموں پر سر رکھدیا آنسو خشک تھے اور آواز بھرائی ہوئی، اس نے کہا "خیر خدا مجھے سزا دیگا مگر تم ہرگز نہ دینا"

سوسن اپنے کو چھڑا کر کشتی سے کود پڑا اور رات کی بے پایاں تاریکی میں غائب ہوگیا۔

(۶)

پاؤں میں روندے جانے سے بکھرے ہوئے سوکھے پتے کھڑکھڑاتے لگے۔ ہوا پھولوں میں بسی ہوئی تھی درختوں کی ٹیڑھی ترچھی شاخیں کسی خواب پریشاں کے بھوتوں کی نقالی کررہی تھیں۔ آخر کار وہ تھک کر بیٹھ گیا اور اس کو یکایک کسی کی موجودگی کا احساس ہوا جو اس کا تعاقب کررہی تھی جیسا کہ خاکستر سیاہ صحرائی آگ کے شعلوں کا کیا کرتا ہے۔ "مجھے چھوڑ دو" شاما سے اس نے کہا لیکن وہ اس سے لپٹ گئی اور لگاتار بوسوں کی بوچھار کردی۔ دم پھول رہا تھا بال پریشان تھے اور نقاب زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ "نہیں! نہیں!! ہرگز نہیں!!!" شاما نے چلا کر کہا "تم اپنے ہاتھوں سے میرا گلا گھونٹ ڈالو تاکہ ہم دونوں ایک ہوجائیں" جنگل کے سائے کانپ اٹھے اور درختوں پر ہیبت طاری ہوگئی گلا گھٹنے کی ایک چیخ کے ساتھ کسی کے گرنے کی آواز سنائی دی۔

(۷)

خورشید خاور کی سنہری کرنیں مندر کے کلس کو یوں جگمگا رہی تھیں گویا کسی دیوتا کی خشمگیں نگاہیں ہیں۔ سوسن اس

نکل کر ویران ریگستان میں بھٹکتا رہا۔ آفتاب نصف النہار نے اپنی تمازت سے اس کے خون میں بخار کی سی حرارت پیدا کردی تھی آفتاب غروب ہوگیا اور گرد و پیش تاریکی چھانے لگی۔

سوسن ایک عالم وارفتگی میں کشتی کیطرف واپس چلا۔ کشتی میں اس کو ایک طلائی کنگن ملا جو غروب ہونے والی آفتاب کی شعاع کے مانند دمک رہا تھا۔ لپک کر اسے لیا اور سینہ سے لگایا۔ اپنا چہرہ اس نیلی نرم شال سے ڈھانک لیا جو وہاں دھری تھی۔ وہ بے اختیار چاہتا تھا کہ اسکی گرنیز پا نکہت کو اپنی ہستی میں جذب کرے تا کہ اسکی خلش پیہم سے لذت اندوز ہوتا رہے۔

:(۸):

رات بڑھی گئی ہلکے ابر کی چادر دں میں ماہ منیر دھندلا نظر آنے لگا۔ سوسن کشتی میں بیٹھا تھا۔ صحرا کے دہشتناک سکوت کیطرف مخاطب ہوا۔ بے اختیار چیخ اٹھا "میری اچھی شاما! تو اب زندہ ہے یا مرچکی! آ اور مجھ سے ملجا"

ایک سایہ تھا یا واہمہ جو تاریکی کے پردہ سے ریت پر نمودار ہوا اور کشتی میں قدم رکھتے ہوئے گویا ہوا "لو میں آگئی تمہارے دست کرم نے ذرا سی لغزش کی اور مجھے موت کے منھ سے بچالیا۔" سوسن کی آنکھیں مضطربانہ اشتیاق میں اس پر جم گئیں اسنے شاما کو سینہ سے لپٹانے کے لئے ہاتھ پھیلا دئے۔ معاً کانپ اٹھا پیچھے ہٹا اور چلا کر کہا "پھر تو کیسے آگئی؟"

:(۹):

شاما ایک لمحہ تک مبہوت کھڑی رہی۔ بعد ازاں سر تسلیم خم کرکے اس خواب کی طرح بے پتہ ہوگئی جو بیداری کے قریب پہونچکر پھر شب تاریکی وسعت لامتناہی میں مفقود ہوجاتے

(ترجمہ)

ظہیر احمد بی اے۔ ایچ سی۔ ایس

ضرورت ہے

اگر آپ کو خیمے دریاں اور چرمی سامان کی ضرورت ہو تو فوراً ہی کارڈ لکھئے ہمارے یہاں ہر قسم کا سامان نہایت ارزاں ملتا ہے والی ریاست بڑے بڑے رؤسا ہمارے ہی یہاں سے منگاتے ہیں۔ فہرست اردو ہندی یا انگریزی کی منگا کر ملاحظہ فرمائیے، ہمارا کارخانہ صداقت کی وجہ سے تمام ہندوستان میں مشہور ہوگیا ہے۔

محمد حسین اینڈ گورنمنٹ مرچنٹ فتحگڑھ (یو پی)

فطرت کے حضور میں علم وحکمت کی بیچارگی

اور

کائنات میں عقول انسانی کی بے دست پائی

ایک عالم و عامی کا مکالمہ

مادیین کے مذہب میں سب سے زیادہ مہتم بالشان مسئلہ مادہ (Matter) اور جوہر فرد (Atom) کا ہے کیونکہ اسی پر انحصار تمام مظاہر علمی کا ہے۔ اور اس میں کلام نہیں کہ عقول انسانی نے کوئی دقیقہ کوشش کا ان کی حقیقت کا علم حاصل کرنے کے لئے اٹھا نہیں رکھا لیکن اگر یہ سوال کیا جائے کہ کیا کوئی قابل اطمینان نتیجہ اس وقت تک پیدا ہو چکا ہے تو اسکا جواب سوائے اس سکوت وحیرانی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا جو جہل آگاہ لینی یوم میں پائی جاتی تھی۔

نگار کی کسی گذشتہ جلد میں ہم مادیین کے مذہب پر تفصیلی بحث کر چکے ہیں اور اس کے بعد بھی اکثر و بیشتر اس قسم کے علمی مضامین شایع ہوئے ہیں، آج ہم ایک مضمون کا اقتباس پیش کرتے ہیں جس میں جوہر فرد پر مکالمہ کی صورت سے لطیف بحث کی گئی ہے۔

یہ مضمون سائنٹفک امریکن میں شایع ہوا تھا جس سے "المقتطف" نے لیا اور اس سے ہم نے۔ نیاز

عامی۔ "میں جوہر فرد کو دیکھنا چاہتا ہوں"

عالم۔ "میں خود بھی اتنا عرصہ سے دل میں لئے ہوئے ہوں"

عامی۔ "تو کیا آپ نے ابتک جوہر فرد کو نہیں دیکھا، میں تو سمجھتا تھا کہ آپ کے پاس بڑے بڑے نازک و دقیق آلات ہیں، نہایت عجیب وغریب خوردبینیں ہیں، آپ نے ضرور اسے دیکھ لیا ہوگا"

عالم۔ "نہیں یہ تمام آلات اس کی حقیقت معلوم کرنے سے عاجز ہیں۔ جواہر فردہ (Atom) کے حجم کا تعلق ان عوامل سے ہے

جو نظر نہیں آسکتے۔ ایک قوی دوربین زیادہ سے زیادہ ایک انچ کے لاکھویں حصہ کو سامنے لے آتی ہے، لیکن جب ایک انچ کے لاکھویں حصہ میں کروڑوں جواہر فردہ پائے جاتے ہوں تو دوربین کیا کام دے سکتی ہے، علاوہ اس کے یوں بھی انکی حقیقت کا پتہ نہیں چلسکتا کیونکہ وہ ہمیشہ حرکت میں رہتے ہیں اور متحرک اشیاء کی حقیقت کا ادراک اور زیادہ دشوار ہے۔"

عامی۔ "پھر یہ بتائیے کہ تمام وہ حقایق جو جواہر فردہ سے مرتبط ہیں انکا علم آپ کو کیونکر ہوا؟"

عالم۔ "جو کچھ ہمیں معلوم ہوا ہے وہ نہ معلوم ہونے کے برابر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں اسوقت تک جواہر فردہ کا تو کچھ علم ہی نہیں حاصل ہوا۔ اگر کچھ معلوم ہوا ہے تو صرف یہ کہ اس کی مختلف کیفیات کیا ہوتی ہیں۔ مثلاً طبیعی اور کیمیاوی تجربوں میں حرارت، رطوبت، برودت، مقناطیسیت، کہربائیت وغیرہ حقیقتاً جواہر فردہ کے مختلف تاثیرات ہیں نہ کہ عین جوہر فرد۔ اسلئے ہمارا علم صرف اس کی تاثیرات کے علم تک محدود ہے۔ اس کو ہمنے آجتک نہیں دیکھا۔"

عامی۔ "مجھے ایک سوال کرنے کی اجازت دیجئے۔ کیا یہ دعویٰ نہیں کیا گیا کہ جوہر فرد نظام شمسی کیطرح ہے یعنی جس طرح آفتاب کے گرد اس کے ماتحت کرے گردش کرتے ہیں، اسی طرح جوہر فرد کے اندر بھی ایک چیز اصل ہے جسے اصطلاح میں (نواۃ) کہتے ہیں اور اس کے گرد بیشمار برقپارے (Electrons) گردش کررہے ہیں؟"

عالم۔ "ہاں، ڈنمارک کے ایک عالم بوہر کی یہی رائے تھی اور ایک حد تک مفید بھی تھی۔"

عامی۔ "تھی؟ تو کیا اب نہیں ہے"

عالم۔ "بات یہ ہے کہ بوہر کی بتائی ہوئی حقیقت علوم جدیدہ کے تمام مطالب کے لئے مفید ثابت نہیں ہوتی اور پروفیسر بوہر خود بھی اس کو جانتا تھا لیکن چونکہ اس سے بہتر کوئی نظریہ اس سے قبل قایم نہیں ہوا تھا اسلئے علماء نے عارضی طور پر کام چلانے کے لئے اسکی صحت کو تسلیم کر لیا تھا۔

عامی۔ "حیرت ہے، میں تو نہیں سمجھتا تھا کہ بوہر کے اس نظریہ میں نقایص ہیں۔ مجھے تو جرائد و رسایل سے یہی معلوم ہوا کہ وہ تمام مطالب علمی کے موافق ہے اور بڑا اکتشاف ہے"

عالم۔ "اس کے اکتشاف عظیم ہونے میں شک نہیں کیونکہ بہت سے مباحث علمی میں اس سے مدد ملتی تھی اور اسلئے علماء نے اس کو تسلیم کیا لیکن بعد کو تحقیق سے معلوم ہوا کہ تمام مسایل علمیہ میں یہ نظریہ کام نہیں دے سکتا اسی لئے جوہر فردہ کے شکل کی تعیین میں ہمیشہ ارتقاء بحث کے ساتھ ساتھ تغیر ہوتا رہتا ہے۔"

عامی۔ "سب سے پہلے کس نے جوہر فرد کی شکل کے تعیین کی"

عالم۔ "قدماء کا گمان تھا کہ مادہ ذرات دقیق سے مرکب ہے، لیکن انہوں نے تجربہ کی کسوٹی پر اس خیال کو کبھی نہیں آزمایا تھا۔ بعد کو جدید علمی دنیا میں سب سے پہلے نیوٹن نے اپنی کتاب "بصریات" میں ان ذرات سے بحث کی اور بتایا کہ وہ متحرک ہیں، سخت ہیں، اور انکا تجزیہ نہیں ہوسکتا۔ اس نے ظاہر کیا کہ اجسام مادی کی نرمی و سختی کا انحصار انہیں اجزاء کی زیادتی

دلکی اور تفاعل ہے۔ اس کے ۲۰۰ سال بعد لارڈ کالون نے اس کو بالکل الٹ کر یوں ظاہر کیا کہ اجسام کی سختی کا سبب نرم ذرات ہیں جو سریع حرکت کرتے رہتے ہیں۔

عامی۔ "درست ہے، مجھے یاد آگیا کہ کالون نے جوہر فرد کو "حلقۂ دخان" سے تشبیہ دی تھی"

عالم۔ "ہاں اس نے بتایا تھا کہ جوہر فرد وہ ایتھر میں گردش کر رہے ہیں جن کے ساتھ نور شامل ہے"

عامی۔ "پھر کیا ہوا؟"

عالم۔ "پچاس سال تک کالون کا بتایا ہوا جوہر طبیعات میں کام دیتا رہا کیونکہ اس ذریعہ سے بعض ایسے امور کی تفسیر بیان ہو سکی جو اس سے قبل کے نظریہ کے ماتحت بیان نہیں ہو سکتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ اس نظریہ میں بھی ایک نقص نکل آیا، اور وہ یہ کہ اس نے جوہر فرد میں جذب کو تسلیم نہیں کیا اور مادہ کی تکوین جواہر سے ممکن نہیں جب تک انمیں باہم جذب و کشش کو نہ مانا جائے"

عامی۔ "پھر اس کمی کو کیوں پورا کیا گیا؟"

عالم۔ "اس کے بعد ایک زمانہ گذر گیا اور کوئی خاص رائے قائم نہ ہو سکی۔ گذشتہ قرن کے آخر میں پروفیسر رولینڈ نے دعویٰ کیا کہ جوہر فرد کی بنا، پیانو کی بنائی طرح پیچیدہ و گرہ دار ہے"

عامی۔ "میرے خیال میں تو ہمر کا نظریہ رولینڈ کے نظریہ سے زیادہ بسیط تھا"

عالم۔ "ہاں، رولینڈ اس وقت تک زندہ نہ رہا کہ علوم طبیعیہ کے جدید ترقی کے سلسلہ میں رانجنی شعاعوں (X - rays) اور عناصر منورہ کے انکشاف کا حال اسے معلوم ہوتا کیونکہ ان جدید انکشافات سے ایک امر نہایت عجیب و غریب یہ ثابت ہو گیا کہ جوہر فرد کا کھربائی ماننا ضروری ہے"

عامی۔ "ہمیں شاید یہ بھی ماننا پڑیگا کہ اس میں قوت جذب و کشش پائی جاتی ہے"

عالم۔ "نہیں یہ اس کی لازم صفت نہیں ہے"

عامی۔ (حیرت سے) "کشش اس کی لازم صفت نہیں ہے! حالانکہ ابھی آپ لارڈ کالون کے نظریہ کو ناقص بتا رہے تھے جس میں کشش کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ اتنے عرصہ میں وہ کونسا ایسا نیا شخص پیدا ہو گیا، جس نے جوہر کے صفت کشش کو جو لازم مانی جاتی تھی غیر لازم کر دیا"

عالم "اینشٹین"

عامی۔ "یہ کیا فرماتے ہیں"

عالم۔ "اس نے کہا کہ اجسام میں باہم کشش و جذب نہیں ہے بلکہ فضا کی شکل جسمیں اجسام حرکت کر رہے ہیں ایسی ہے کہ ایک جسم دوسرے جسم سے مل جاتا ہے"

عامی۔ "ان میں باہم کشش ہو یا نہ ہو لیکن یہ تو مسلّم ہو گیا کہ ٹوہر نے جو صورت جوہر کی پیش کی تھی وہ زیادہ بسیط ثابت ہوئی"

عالم۔ "نہیں ٹوہر کا نظریہ بھی کافی ثابت نہیں ہوا"

عامی۔ "پھر اس کے بجائے اور کیا رکھا گیا؟"

عالم۔ "شروڈنگر کا نظریہ جس کو قائم ہوئے صرف تین سال کا زمانہ گزرا ہے"

عامی۔ "کیا وہ نظریہ بھی کہربائی ہے؟"

عالم۔ "ہاں، ہے تو وہی کہربائی لیکن ٹوہر کے نظریہ سے وہ کچھ مختلف ہے ٹوہر کا نظریہ تو یہ ہے کہ جوہر کے اندر ایک پروٹن ہے جسکے گرد بر قپارے یا کہارب اجرام فلکی کی طرح گردش کر رہے ہیں یعنی پروٹن کی کہربائیت ایجابی ہے اور کہارب کی سلبی گویا اس طرح جوہر کے اندر کہربائیت معین نقطوں میں مرکوز ہے جنھیں پروٹن اور کہارب کہتے ہیں۔ دوسرے نظریہ کے موافق اسمیں کہربائیت ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے، دوسرا فرق یہ ہے کہ ٹوہر کے جوہر میں کہارب ہر وقت حرکت کرتے رہتے ہیں اور شروڈنگر کے نظریہ کے مطابق وہ ساکن ہیں مگر ان کو قدرت حاصل ہے کہ اوقات معینہ اور نقاط معینہ میں اپنی کہربائیت کی مقدار بدلتے رہیں اور یہی تغیر ہے جو فضا میں امواج نور پیدا کرتا ہے۔

عامی۔ "اب آپ یہ فرمائیے کہ یہ نظریہ آپ کے تمام مطالب کیلئے کافی ہے یا نہیں؟"

عالم۔ "ہاں یہ نظریہ نہ صرف تمام ان ظواہر کی تعلیل کے لئے کافی ہے جن کی نظریۂ ٹوہر کے مطابق ... ممکن تھی بلکہ بعض ایسے ظواہر کی بھی تعلیل اس سے ہوتی ہے جو اس قبل ناممکن التعلیل تھے"

عامی۔ "اس وقت تو آپ یہی سمجھتے ہیں، لیکن ممکن ہے ایک دن آپ اس نظریہ کو بھی ناقص کہنے لگیں"

عالم۔ "بالکل ممکن ہے، کیونکہ انسان کا شعور ... مرتبۂ کمال سے بہت دور ہے، اور کون کہہ سکتا ہے کہ آیندہ کے تجربات کیا کیا اور جدید نظریہ پیدا کرنے پر مجبور کرتے ہیں اور ہمکو اپنے قصور فہم کا اعتراف کن کن طریقوں سے کرنا پڑیگا۔

فضاءِ بسیط اور ہم

ابھی شب کے پردہ میں سورج گیا تھا　　پرند اب لیا چاہتے تھے بسیرا
شفق مل چکی تھی ابھی منھ پہ غازہ　　نکھرنے ہی والا تھا مکھڑا قمر کا

بس اب گرم ہونے کو تھی بزم انجم
اونڈیلنے کو تھے بادۂ نور کے خم

کہ اتنے میں حیرت نے آنکھوں میں چھاکر　　جہالت کی تاریکیوں کو مٹاکر
نظر کو مری سوئے گردوں اٹھاکر　　سڑک کہکشاں کی فلک پہ دکھاکر

کہا دیکھتا ہے اگر کچھ تماشا
تو اس راہ سے تجھ کو چلنا پڑے گا

خیال اتنے میں مجھ کو ہیئت کا آیا　　تخیل کی پریوں کو ساتھ اپنے لایا
مجھے اون کے تخت رواں پہ بٹھایا　　پھر اس تخت کو سوئے گردوں اڑایا

یہ اوج مقدر تو دیکھو کہ اخگر
ہوا جا کے مہمان خورشید خاور

پہونچ کر وہاں بس یہ جی میں سمائی　　کہ اب کیجئے سیر باغ خدائی
فضا کی طرف جب نظر اک اٹھائی　　تو دیکھا کہ دانائی کبریائی

طلسمات حیرت وہ دکھلا رہی ہے
کہ دیوانگی عقل پہ چھا رہی ہے

وہ فانوس حسن ثوابت کے جلوے　　وہ گردش میں پروانے سیارگاں کے
چراغ قمر نور پہ جن کے صدقے　　وہ تاروں بھرے جگمگاتے اوجالے

نہ دن رات ہے واں نہ شام و سحر ہے
تجلی مطلق فقط جلوہ گر ہے

ہر اک سمت ہے اطراف عالم سے خالی　　نہ دہنے نہ بائیں نہ اونچی نہ نیچی
نہ وقت گذشتہ کے ہیں کوئی معنی　　نہ ہے آنے والے زمانہ کی ہستی
فقط ایک موجودگی کا نشاں ہے
یہاں میں وہاں ہے وہاں میں یہاں ہے

خدایا تری رحمتوں کے سمندر　　سمائیں تصور کے قطروں میں کیونکر
یہ کچھ وسعتیں چھائی ہیں وسعتوں پر　　کہ حیرت بھی کہتی ہے اللہ اکبر
جو دل میں خیال فلک کو میں لایا
تو اک بلبلے سے زیادہ نہ پایا

گیا پھر میں ذرّوں کی مخفی تہوں میں　　اڑا میں ہواؤں میں اور بادلوں میں
جو ڈوبا سمندر کی گہرائیوں میں　　تو اچھلا پھر افلاک کی رفعتوں میں
نشاں اوس کے کوچہ کا لیکن نہ پایا
یہ عالم ہے سب جس کی ہستی کا سایہ

نہ پوچھو فضا جس کو کہتے ہیں کیا ہے　　خلا میں وہ دریا سا کچھ بہہ رہا ہے
نہ کچھ عرض اور طول کی ابتدا ہے　　نہ جس کے عمق کی کوئی انتہا ہے
کُرے تیرتے پھرتے ہیں مثل ماہی
چھڑکتے ہوئے نور فیض الٰہی

نہ پیمائشوں کی وہاں ہے سمائی　　نہ میل اور فرسنگ کی ہے رسائی
نہ کچھ علم اعداد کی واں بن آئی　　عیاں ہندسہ کی ہے بیدست و پائی
تفکر دلائل قیاس اور توہم
پہونچکر وہاں ہو گئے سب کے سب گم

اگر باغ سے توڑ لو ایک پتّا!!　　سمندر سے بھر لو اگر کوئی کوزہ!!
جو اڑ جائے صحرا میں سے ایک تنکا　　زمیں پر سے مٹ جائے گر ایک ذرّہ
تو باغ اور صحرا زمیں اور سمندر
رہیں گے یہ سب کچھ نہ کچھ اپنا کھو کر

مگر سب نظام اور یہ سورج ہمارا　　اگر آن واحد میں ہو پارہ پارہ

اگر یہ فلک اور ہر ایک تارا — فنا ہو کے اُڑ جائے سارے کا سارا

کمی شان ہستی میں ہوگی نہ اتنی

اٹر دو پر سفیدی کی مقدار جتنی

قیاس و گماں سے ہی بے شبہ باہر — کہ اک بوند میں ڈوب جائے سمندر

تعجب سے خالی ہو یہ بات کیوں کر — کہ ذرّہ میں چھپ جائے خورشید خاور

یہ ظاہر ہے جزو کا کُل سے بڑھنا

تامل مگر ماننے میں نہ ہو گا!!

جو بکری کسی شیر کو پھاڑ ڈالے — اگر مارے خرگوش تازی کے بھالے

اگر بھیڑیے کو کوئی بھیڑ کھالے — ہرن بھی کرے چیتے کے گر نوالے

یہ باتیں نہیں گو طلسمات سے کم

یقیں ان پہ لانے کو ہیں مستعد ہم

مگر حد امکان سے بالکل ہے باہر — کہ قابو ہو قدرت کی پیمائشوں پر

پٹکتا ہے سائنس ٹپکا کرے سر — بنائے بنا تا ہے منہ فلسفہ گر

ذہانت بھی زور اپنا سارا لگا دے

قلابے زمیں آسماں کے ملا دے

مہاسنکھ صدیوں کا دور اک بنالوں — مہاسنکھ پھر دور ایسے جو پاؤں

گھڑی بھر میں ان سارے دوروں کو سمجھوں — یہ گھڑیاں میں پھر آپ کو اس قدر دوں

کہ جن سے بنیں دن دنوں سے مہینے

بنیں پھر مہینوں سے سو سال پورے

کروں فرض اک دن اب ان سو برس کا — پھر ایسے دنوں کا بنالوں مہینہ

کروں جمع ایسے مہینے جو بارہ — تو اک سال بن جائے گا اک کا پورا

کروروں مہاسنکھ پھر سال ایسے

مددگار ہوں میری عمر رواں کے

پھر اک سرعت برق کا اسپ آئے — مجھے اپنی پشت رواں پر بٹھائے

گردوں سے گردوں تک وہ پھر اُڑ کے جائے — وہ بے انتہا اس میں صدیاں لگائے

مگر سب کی سب پھر بھی ہستی قریباً
رہیگی نگاہوں سے پنہاں یقیناً

مبارک ہے لیکن یہ بے انتہائی | حقایق شناسوں کی بے دست و پائی
یہ قدرت کے میداں یہ بجد خدائی | بڑے کام آئی بڑے کام آئی!!

اسی بات سے اور اسی کے بدولت
کھلا کرتی تھی نت نئی اک حقیقت

خدا ہم کو دیتا اگر عقل کامل | جو ہوتا ہمیں علم ہر شے کا حاصل
نہ طے کرنی پڑتی کبھی کوئی منزل | پڑے رہتے بستر پہ بن بن کے کاہل

یہ محنت کے باغوں کی باد بہاری
کیسے ہوتی معلوم یوں پیاری پیاری

مجنوں اگر لطف کھانے کا چاہو | تو پھر بھوک کی بھی تو سختی اٹھاؤ
کرو ہمت اے آب رحمت کے پیاسو | پسینے بہا کر کنویں کھود ڈالو

ذرا بھی پڑی جس کو محنت کی عادت
سمجھ لو کہ ہے اس کے قدموں میں راحت

غرض نوع انسان کی یہ کم علمی | ہے اک وجہ ہر چیز کے جاننے کی
سمجھ سوچ میں ہے خدا کی ہے کیسی | سبب پستی کی تہ میں چھپی کیوں بلندی

مقید نہ ہوتے جو ہم اس زمیں پر
تو اٹھتے سوالات یہ دل میں کیونکر

کہ اے چرخ کیونکر تری کل چلی ہے | تجھے شکل اے چاند یہ کس نے دی ہے
ستاروں قسم تم کو سورج ہی کی ہے | بتاؤ تو کس کی یہ جادوگری ہے

شراب کمال اپنی کس نے پلا کر
تمہیں بے خودی سے دئیے ہیں یہ چکر

یہ مانا کشش کی یہ کاریگری ہے! | کشش تم میں لیکن یہ کس نے بھری ہے
کسی نے تو تم میں یہ عادت دھری ہے | کہ شرمندہ اڑنے میں تم سے پری ہے

یہ کیا ہے یہ قانون قدرت ہی کا ہے

یہ سامان صرف اپنی حیرت ہی کا ہے

کہاں ہیں وہ جو منکران خدا ہیں — تمہیں دیکھیں، آنکھیں اگر انکی وا ہیں
وہ اپنی ہلاکت پہ کیوں مبتلا ہیں — یہ روحانی خونخواریاں کب روا ہیں

ہے علت کوئی جس کے معلول ہو تم
شجر ہے کوئی جس کے پھل پھول ہو تم

وہی ہے کہ ہر چیز جس سے بنی ہے — اوسی کی ہر اک سمت شادی رچی ہے
ہر اک دل میں اسکی لگن لگ رہی ہے — ہر اک جان کی جان بس اک ہی ہے

عناصر زمیں کے فلک کے ستارے
اسی کے تو اخگر براتی ہیں سارے

امداد حسین اخگر مرادآبادی

غزل

قفس میں آرزو جینے کی ہم صیاد کیا کرتے — نہ ٹالا اور اپنی قید کی میعاد کیا کرتے
فنا ہے اور شئے تبدیل ہیئت دوسری شئے ہے — وہ میری ایک مشت خاک کو برباد کیا کرتے
ہمارا ضبط تھا پابند آئین زباں بندی — لب خاموش کو آلودہ فریاد کیا کرتے
ہمیں تھی اُنسے امید وفا اور وہ وفا دشمن — انہیں ہم بھول کیوں جاتے ہمیں وہ یاد کیا کرتے
انہیں فرصت کہاں تھی دشت وحشت کے تماشے سے — ترے دیوانے سیر عالم ایجاد کیا کرتے
ہماری خاک کا ہر ذرہ دنیائے محبت ہے — ہمیں برباد بھی کرتے تو وہ برباد کیا کرتے
سنائی گریۂ خونیں میں انکو داستاں دل کی — بیاں ہم اس سے بہتر درد کی روداد کیا کرتے
طلسم بیخودی تھے نقش دنیائے محبت کے — ستم کش امتیاز راحت و بیداد کیا کرتے
فضا گونجی ہوئی ہے نعرۂ منصور سے اب تک — ترے دیوانے جو کچھ کر گئے آزاد کیا کرتے

مری آشفتہ حالی اک سزا تھی جرم الفت کی
وہ قید غم سے اے فرخ مجھے آزاد کیا کرتے

فرخ بنارسی

"جامِ کہن" اور "بادۂ نو"

بہلاؤں تا بکے دلِ آشفتہ سر کو میں
کب تک مٹاؤں رنج و الم کے اثر کو میں
حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
شاید کچھ اس طرح مری تسکین ہو سکے
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

حرماں نصیب دل کی تسلی کو کیا کروں
کب تک میں بزمِ ناز سے نا آشنا رہوں
چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
لیکن یہ سادگی ہے کہ از راہِ امتحاں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

بے اختیاریوں پہ نہیں کوئی اختیار
اللہ رے اضطرابِ دلِ ناتوان و زار
جانا پڑا رقیب کے در تک ہزار بار
اور ایسے حال میں کہ نہیں طاقت و سکوں
اے کاش جانتا نہ ترے رہگذر کو میں

باطل کی شوخیوں سے نہ حق آشنا ڈرے
اک سرفروش قتل کی دھمکی سے کیا ڈرے
ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے
سمجھا ہے تم نے کیا مرے وہم و قیاس کو
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

اب دورِ عاشقی کا زمانہ تمام ہے
کہتے ہیں جس کو عشق وہ سودائے خام ہے
لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
اللہ رے زر پرستیٔ دنیائے حسن و ناز
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

پروانہ جیسے جاتا ہے شعلہ کی لَو کے ساتھ
تاریکیوں کا دَور چلے جیسے ضو کے ساتھ
چلتا ہوں تھوڑی ہر اک راہرو کے ساتھ
صرف اس امید پہ کہ ملے کوئی غم گسار
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

کم بخت جانتے ہی نہیں عشق کا وقار
اہلِ ہوس سمجھ نہ سکیں گے مرا شعار
خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
یہ کم نگاہیاں ہیں تو کہنا پڑا مجھے

کیا پوچھتا ہوں اس بت بیدادگر کو میں

اب لغزش قدم پہ نہیں کوئی اختیار — جذبات ہوشیار، نہ احساس پائدار
پھر بیخودی میں بھول گیا راہ کوئے یار — اے وائے فرط شوق کی حرماں نصیبیاں
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

ملتا نہیں کوئی مجھے مجھ جیسا مبتلا — اہل نظر کو ڈھونڈھتا پھرتا ہوں جابجا
اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہل دہر کا — میرا قصور ہے کہ بہ عنوان شاعری
سمجھا ہوں دلپذیر متاع ہنر کو میں

جویا اس آستاں کا ہے اکبر سر نیاز — محمود سے جدا رہے کب تک بھلا ایاز
غالب خدا کرے کہ سوارِ سمند ناز — صمصام حیدری کو نمایاں کئے ہوئے
دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

اکبر حیدری

غزل

منتشر شیرازۂ ہستی تو کیا ہو جائیگا — صرف وہ برہم نہ ہوں نالہ رسا ہو جائیگا
التفات ناز کیا صرف وفا ہو جائیگا! — دو گھڑی کو آ ہی جاؤ گے تو کیا ہو جائیگا؟
ان کے دل کی بات میری آرزو بنجائیگی — وہ جو سوچیں گے مقدر کا لکھا ہو جائیگا
آپ تو بیمار غم کا حال سنکر رو دیئے — یہ نہ سوچا کوئی سن لیگا تو کیا ہو جائیگا
حسن ہی خود بن گیا سرمایہ دار درد عشق — اب جفا کو بھی وفا کہنا روا ہو جائیگا
وہ تاسف کیوں کریں سنکر کسی کا حال زار — اس سے تو درد دل شاید سوا ہو جائیگا
یک بیک طالب تمنائیں سی خرد پر چھا گئیں
سوچنا یہ تھا کہ کوئی اور کیا ہو جائیگا؟

طالب باغپتی

"تو ایسے سمے میں آ پیاری!"

دنیا کی فضائیں سب چپ ہیں! جنگل کی ہوائیں سب چپ ہیں!
چڑیوں کی صدائیں سب چپ ہیں! آ پریت کے گیت سنا پیاری!
تو ایسے سمے میں آ پیاری!

غم کی گھٹا ہے گھر کر آئی یاس نے دل پر چھاؤنی چھائی!
میں ہوں اور میری تنہائی اس تنہائی کو مٹا پیاری!
تو ایسے سمے میں آ پیاری!

پچھلے پہر کی خاموشی ہے فطرت غرق مدہوشی ہے
اک عالم سکر فروشی ہے آ سینے میں اترا پیاری!
تو ایسے سمے میں آ پیاری!

کلیوں پہ تتلی منڈلاتی ہے! اور پریت کے گیت سناتی ہے!
پچھلی کہانی یاد آتی ہے! آ پھر وہی رنگ دکھا پیاری!
تو ایسے سمے میں آ پیاری!

گھنگھور گھٹائیں چھاتی ہوں! سرمست ہوائیں آتی ہوں!
چڑیاں گیت سناتی ہوں! سبزے کا ہو فرش بچھا پیاری!
تو ایسے سمے میں آ پیاری!

دنیا ساری خوابیدہ ہے! اور فطرت آرامیدہ ہے!
بیدار نظر رنجیدہ ہے! سپنا بن کے سما جا پیاری!
تو ایسے سمے میں آجا پیاری!

وادی کے نظارے سامنے ہیں! دریا کے کنارے سامنے ہیں!
خوش رنگ ستارے سامنے ہیں! اک جھلک دکھلا جا پیاری!

تو ایسے سمے میں آ پیاری!

دل میں بپا محشر غم ہے! / روح پہ طاری سیل الم ہے
خستہ کی آنکھوں میں نم ہے! / سب کچھ دل سے بھلا جا پیاری!

تو ایسے سمے میں آجا پیاری!

اختر شیرانی

افکار انجم

چشم حیرت سے دیکھتے ہیں تجھے / ارے انساں! بری بلا ہے تو!
کرم بے مایہ تھا تو ہی کل تک / آج دیکھے کوئی کہ کیا ہے تو!

کونسی شئے سے تو نہ ڈرتا تھا؟ / کونسی شئے نہ تھی تری مسجود؟
عہد طفلی میں بے خبر تھا تو / کہ تری ذات کا ہے کیا مقصود؟

آج تیرے شعور کا عالم / محو حیرت کئے ہے عالم کو؟
اب ہوا کائنات کو معلوم / کیا بلا دی گئی تھی آدم کو!

تیری وسعت کے ممکنات کا ہم / رات بھر ذکر کرتے رہتے ہیں
سچ تو یہ ہے کہ دسترس سے ترے / دل میں ہم خود بھی ڈرتے رہتے ہیں

دیو فطرت تو ہو چکا بسمل / اب زمان و مکاں کی باری ہے
جسکی زد میں ہیں آسمان و زمین / تو ہی لاریب وہ شکاری ہے

امین حزیں

حسن زار کشمیر کی ایک صبح

سحر نے چاک کیا جیب کہ رات کا دامن
جہاں کا چہرۂ بے نور ہو گیا روشن

ہوا وہ پچھلا پہر شمع جھلملانے لگی
وہ دیکھو ہو گئے دھندلے کواکب روشن

عروس صبح وہ گھونگھٹ میں مسکرانے لگی
اٹھا دی بڑھ کے دھندلکے نے رات کی چلمن

وہ موج آب مچلتی ہوئی بڑھی آگے
دکھا رہی ہے زمانے کو بجلیوں کے چلن

وہ دیکھو بزم میں دریا کے اک تلاطم ہے
نہانے آئی ہے خورشید کی وہ پہلی کرن

حسین ہیرۂ آبی جو جگمگانے لگا
شعاع مہر نے خود بڑھ کے ڈال دی چلمن

سوائے نور کے اب کچھ نظر نہیں آتا
کہ بن گیا ہے ہیولائے برق کا مسکن

نقاب اٹھتے ہی خورشید کی چمک اٹھا
ہر ایک قطرۂ شبنم مثال دُرِّ عدن

بچھی ہے صحن میں سبزے کی مخملی چادر
کھڑے ہیں سب وہ قطاروں میں گلرخان چمن

وہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں وہ بھینی بھینی مہک
مشام جاں کو معطر کئے ہے بوئے چمن!

چمک سے مہر درخشاں کے صحن گلشن میں
ہر ایک قطرۂ شبنم ہے گوہر روشن

نسیم صبح کے جھونکوں کی وہ دلاویزی
وہ سبزہ زار کی لہریں وہ رنگ و بوئے چمن

وہ گدگدایا نسیم سحر نے کلیوں کو
وہ کھلکھلا پڑا ہر اک چمن کا غنچہ دہن

ہر ایک طائر خوش رنگ چہچہا اٹھا
عجیب رنگ پہ آئی ہے آج بزم چمن

ہر ایک غنچہ چٹک کر ہوا ترنم خیز
وہ دیکھو چھیڑ گیا اب ساز اہل بزم چمن

ہر ایک پنکھڑی پھولوں کی مست ہونے لگی
وہ جھومنے لگے ہر سمت مہوشان چمن

صدا وہ آنے لگی حمد کے ترانوں کی
اٹھا وہ صحن گلستاں سے نغمۂ گلشن

عجیب بجلیاں پرتو نے صبح کی بھر دیں
کسی کے روکے سے رکتا نہیں ہے جوش چمن

ہم وہ برگ شجر نے بھی مل کے چھیڑا ساز
ہر ایک شاخ ہوئی گل کی صورت معدن

صدائے بربط و چنگ و رباب آنے لگی
نوائے زمزمہ سنجی سے گونج اٹھا گلشن

ہر ایک شاخ بھی پھولی نہیں سماتی ہے　　ہے کھینچ کے آیا یہاں تک بہارِ گلشن
کہ اڑ نہ جائے کہیں پھر یہ بزمِ گلشن سے　　نسیمِ صبح ہے تھامے شمیم کا دامن
بیاں ہو کس طرح تفصیل مختصر یہ ہے　　بنا ہے تختۂ فردوس تختۂ گلشن

سحر کی ادنیٰ سی محمود یہ تجلی ہے
کہ جس نے منظرِ عالم کو کر دیا روشن

محمود الٰہ آبادی

غزل

حسن مشتاقِ وجودِ دیدۂ بینا ہوا　　عشق محوِ انتظارِ لذتِ فردا ہوا
آ رہا ہوں بزمِ فطرت کا تماشا دیکھ کر　　ہر نفس میرا ابھی ہے کیف میں ڈوبا ہوا
فطرتِ مجبورِ تعمیلِ اوامر کیا کرے　　ایک دل حصے میں آیا وہ بھی ہے سہما ہوا
ذرہ ذرہ بن گیا دل عشق کی تاثیر سے　　کوئی دیوانہ ترا جب واردِ صحرا ہوا
صبحدم اٹھے ہیں لیکر دل میں ہم داغِ جنوں　　چاہیئے خورشید کو نکلے ذرا ابھرا ہوا
اپنے سایہ سے بھی رم کرنے لگے اہلِ جنوں　　اپنی ہستی پر انہیں جب غیر کا دھوکا ہوا
اللہ اللہ ابتسامِ حسن کا حسنِ کمال　　ایک موجِ نور میں دل ہے مرا ڈوبا ہوا
وہ نگاہِ جذب اٹھی جب کبھی میری طرف　　عرصۂ ہستی میں پیدا ایک سناٹا ہوا
ارتقائے عشق ہے تمہیدِ تکمیلِ جنوں　　اس سے آگے بڑھ گیا تو قیس خود لیلیٰ ہوا

دیکھتا ہوں میں بھی حافظ حسبِ ارشادِ جگر
منظرِ فطرت کو دل تھامے ہوئے سہما ہوا

حافظ غازیپوری

باب الاستفسار

عہد اسلام اور علم نجوم و فلکیات

(جناب سید محمد ارتضا صاحب ۔ مدراس)

غالباً آپ کو معلوم ہوگا کہ دکن و جوار دکن کے بعض مقامات میں جوتش اور علم نجوم کے جاننے والے بکثرت پائے جاتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے بعض اپنے فن میں کامل بھی ہیں، ماضی کے حالات بڑی حد تک صحیح بتاتے ہیں، اس لئے لوگوں کو اپنے مستقبل کے متعلق بھی ان کی پیشین گوئی پر اعتبار آجاتا ہے۔ لیکن یہ سب غیر مسلم ہیں، مجھے بھی یہاں عرصہ تک قیام کرنے کی وجہ سے کچھ دلچسپی اس فن سے ہوگئی ہے۔ اور اردو کی ان مشہور کتابوں کا بھی مطالعہ کیا ہے جو بازار میں ملسکتی ہیں۔ میں ایک کتاب مرتب کر رہا ہوں جس میں علم نجوم اور فلکیات کی تاریخی حیثیت سے بھی بحث کرنا ضروری ہے اس لئے براہ کرم مطلع فرمائیے کہ مسلمانوں میں کب سے ان فنون کا رواج ہوا، ان کے کیا کیا خاص کارنامے ہیں، پھر یہ بھی بتائیے کہ علم نجوم کے ذریعہ سے جو احکام صادر کئے جاتے ہیں وہ کیوں اور کس حد تک قابل اعتبار ہو سکتے ہیں۔ فلکیات اور نجوم میں باہم کیا علمی ربط ہو سکتا ہے۔

(نگار) آپ کا استفسار بحث کے مختلف پہلو پیش کرتا ہے اور غالباً یہ مشکل ہے کہ باب الاستفسار کے محدود و متعین صفحات میں تمام پہلوؤں پر علیحدہ علیحدہ گفتگو کر سکوں۔ بہر حال تعمیل ارشاد کرتا ہوں اور مختصراً جتنی روشنی ان مسایل پر ڈالی جا سکتی ہے، اسکو بیک وقت پیش کرنیکی کوشش کرونگا۔

فضا اور کواکب و نجوم سے دو علم متعلق ہیں جنمیں سے ہر ایک کا موضوع بالکل جداگانہ ہے ایک وہ جسے علم نجوم یا علم احکام نجوم یا علم تنجیم کہتے ہیں اور دوسرا وہ جو ہیئت یا فلکیات کے نام سے موسوم ہے۔ پہلے کا مقصود گردش کواکب کو دیکھ کر پیشین گوئی کرنا ہے اور دوسرے کا صرف اجرام فلکی کے متعلق علمی تحقیق و جستجو۔

علم تنجیم کو ارسطو نے علوم طبیعیہ کی شاخ قرار دیا ہے لیکن فارابی اور ابن خلدون وغیرہ نے اسکو علوم ریاضیہ میں شامل کیا ہے۔ میرے نزدیک علم التنجیم کا جس حد تک تعلق ہیئت سے ہے اُسے ریاضی کی شاخ سمجھنا چاہئے

اور احکامات صادر کرنے کا حصہ اُن علوم طبیعیہ سے وابستہ ہے جنمیں علم الفراست (قیافہ) علم الکیمیا اور علم تعبیر الرؤیا وغیرہ داخل ہیں۔
علم تنجیم کی بنیاد اس اعتقاد پر قایم ہے کہ تمام تغیرات "عالم کون و فساد" کے اجرام فلکی کی گردش سے وابستہ ہیں لیکن اس سلسلہ میں جس قدر اصطلاحات مرتب ہوگئی ہیں اور جن کا علم آپ کو ہونا چاہئے، ان سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے دیگر علوم و فنون کی طرح اس طرف بھی خاص توجہ کی اور ہیئت کی بہت سی اصطلاحات کی طرح، علم نجوم کے بھی تمام اصطلاحات یورپین لٹریچر میں انہیں سے لئے گئے۔ مسلم ماہرین علم نجوم نے زیادہ تر ان تین باتوں کی طرف توجہ کی۔ اول۔ روزانہ واقعات زندگی کے متعلق سوالات کا جواب دینا۔ مثلاً یہ کہ فلاں چیز ملے گی یا نہیں، فلاں شخص کہاں غایب ہوگیا ہے، فلاں چور پکڑا جائے گا یا نہیں وغیرہ وغیرہ اس کا اصطلاحی نام "مسایل" ہے۔ دوسرے کسی کام کرنے کے لئے نیک ساعت بتانا جسے اصطلاح میں "اختیارات" کہتے ہیں۔ تیسرے زائچہ طیار کرنا جس سے کسی شخص نومولود، یا قوم کے ماضی و مستقبل کے حالات معلوم ہوسکیں جسے اصطلاح میں "تحویل سن الموالید" یا "تحویل سن العالم" کہتے ہیں۔

عرب کے علماؤں نے اس فن کو مختلف ذرایع سے حاصل کیا، یونانی ذرایع میں سے افلاطون، ویتیس ولینس (Vettius Valens) دروتھیس سڈونس (Dopatheus Sidonius) تیوسر (Jeucer)، انتیاکوس (Antiochus) مخصوص طور پر قابل ذکر ہیں۔ علاوہ یونانی ذرایعہ کے پہلوی اور ہندی کتابوں سے بھی انھوں نے مدد لی اور مصر، عراق اور شام میں جو زبانی روایات اس فن کے متعلق چلی آرہی تھیں ان سے بھی فایدہ اٹھایا۔ الغرض مسلمانوں کا علم تنجیم ان سب کا امتزاج تھا جو نہایت مکمل طریقہ سے ابومعشر کی تصانیف میں پایا جاتا ہے۔

فلاسفہ و فقہا وغیرہ نے سوائے الکندی، فخرالدین رازی اور اخوان الصفا کے ہمیشہ اس علم کی مخالفت کی، لیکن عملاً یہ مخالفت بیکار ثابت ہوئی اور تمام خلفاء و امراء کے دربار میں اہل تنجیم کا باثر ہونا تاریخ سے ثابت ہے۔

اس فن میں ابومعشر کی مشہور تصانیف کے علاوہ الکندی کے رسایل جنمیں اسلام کا زائچہ طیار کیا گیا تھا، علی بن رضوان کی شرح افلاطون کی کتاب پر، احمد بن یوسف کی شرح کتاب الثمرہ پر، ابوالحسن علی بن ابی رجال کی تصانیف، سہل بن بشر ابوبکر الحسن بن الخصیب، ابوعلی یحیٰی بن الخیاط، محمد بن عمر بن الفرخان الطبری، کی کتابیں جنکے ترجمے پہلے لاطینی زبان میں اور پھر یورپ کی دوسری زبانوں میں ہوکر مشہور ہوچکے ہیں۔ اس فن میں مسلمانوں کے مشہور علمی کارنامے یہ ہیں

علم الافلاک یا علم ہیئت میں مسلمانوں کی کاوشیں بہت زیادہ قابل قدر ہیں، یوں تو اہل عرب ظہور اسلام سے قبل ہی ہیئت کا کچھ نہ کچھ عملی علم رکھتے تھے جسے اُن کی صحرائی زندگی اور بدویانہ طرز معاشرت نے مجبور سکھا دیا تھا (کیونکہ رات کی سیاحتوں نے جنکا وہاں بہت زیادہ رواج تھا، انہیں بتا دیا تھا کہ چاند اور ستاروں کی جائے وقوع اور اوقات طلوع اور غروب سے وقت اور موسم کا حال معلوم کرلیا کریں) لیکن علمی حیثیت سے اس کا رواج دوسری صدی ہجری میں ہوا اور اس کی ابتدا سنسکرت کی ان کتابوں سے ہوئی جو ۱۵۴ھ میں دربار خلافت تک پہونچیں۔ یہ کتابیں برہما گپتا

کی تھیں اور انھیں کو پیش نظر رکھکر، ابراہیم حبیب الفزاری اور یعقوب بن طارق نے عربی میں اس فن کی کتابیں مرتب کیں اور ابوالحسن اہوازی نے گردش سیارگان کا نقشہ بنایا۔ ان کتابوں میں جس اصول پر نقشے دئے گئے تھے اسکا نام انہوں نے السندہند رکھا، جو یقیناً سنسکرت لفظ سدھانتا کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ یہ اصول تقریباً پانچویں صدی ہجری تک قایم رہا۔

اس کے بعد پہلوی کتابوں اور نقشوں سے مدد لی گئی چنانچہ عربی کا زیچ شاہ یا زیچ شہریار پہلوی نقشہ زیک شترو۔ امار ہی کا مترادف ہے جو ساسانی حکومت کے زمانے میں طیار ہوا تھا۔ تیسری صدی ہجری میں مسلمان ہئیت داں اس زیچ کے زیادہ مایل تھے لیکن اس کے بعد اسکا رواج ختم ہوگیا۔

ہئیت میں یونانی اثر کو مسلمانوں نے بہت بعد میں قبول کیا لیکن حد درجہ استحکام کے ساتھ سب سے پہلا ترجمہ (**Almagest**) کا ترجمہ المجسطی کے نام سے ہوا، جو زیادہ کامیاب چیز نہیں کہی جا سکتی لیکن اسکے بعد حجاج بن مطر اور حنین بن اسحاق نے زیادہ بہتر صورت میں اس خدمت کو انجام دیا۔ اس سلسلہ میں اور بعض مشہور یونانی ہئیت دانوں کی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔

باقاعدہ رصدگاہوں کے استعمال کی ابتدا جندیشاپور میں (جو ایران کے جنوب و مغرب کا ایک مقام ہے) ہوئی اور احمد النہاوندی نے اپنی مشہور زیچ المشتمل طیار کرنیکے زمانہ میں آلات رصدگاہ کا استعمال کیا۔

مامون الرشید عباسی کے زمانہ میں مسلمانوں کی ترقی اس فن میں اپنے عروج پر تھی۔ بغداد کی رصدگاہ میں یحییٰ بن ابی منصور کی نگرانی میں دربار خلافت کے ہئیت دانوں نے باقاعدہ گردش اجرام کا معائنہ کیا، المجسطی کے تمام اصول کی علمی تصدیق کی اور بہت سے مسایل ہئیت عملی طور پر حل کئے اور الزیج الممتحن طیار کیا جس کی تصدیق کوہ قاسیان کی رصدگاہ سے بھی کی گئی۔ عہد مامون الرشید میں تدمر اور الرقہ کے درمیان دایرہ نصف النہار کے ایک درجہ کی پیمایش ایک مشہور واقعہ ہے۔ عہد مامون میں محمد بن موسیٰ الخوارزمی بھی نہایت مشہور ہئیت داں ہوا جس کی زیچ دو صدی تک رائج رہی۔

سنہ ۸۵۰ء سے ۸۷۰ء تک موسیٰ بن شاکر کے تین بیٹوں نے خود اپنے گھر پر رصدگاہ قایم کرکے ہئیت کا مطالعہ کیا۔ اسی صدی میں شیراز، نیشاپور، سمرقند وغیرہ میں بھی رصدگاہوں سے کام لیا گیا۔ تیسری صدی ہجری میں ثابت بن قرہ البتانی، الماہانی، النائریزی وغیرہ مشہور ہئیت داں گذرے ہیں۔

سلاطین بویہ کے زمانہ میں بھی ایک رصدگاہ قایم ہوئی اور عبدالرحمان الصوفی، ابن الاعلم، ویجن بن رستم الکوہی، احمد الصاغانی اور ابوالوفا وغیرہ بڑے بڑے ہئیت داں دربار میں جمع ہوگئے۔ اسی زمانہ میں غزنہ میں البیرونی ہوا جس کے کارنامے کافی مشہور ہیں۔

مصر میں باقاعدہ مطالعہ ہئیت فاطمی خلیفہ العزیز کے زمانہ میں شروع ہوا۔ اس خلیفہ نے قاہرہ میں ایک رصدگاہ قایم کی اور جایداد اس کے متعلق وقف کی گئی۔ اسی رصدگاہ میں ابن یونس نے اپنا مشہور "الزیج الحاکمی" طیار کیا۔ اسپین میں دسویں

صدی عیسوی کے وسط سے اس طرف توجہ ہوئی اور شاہزادگان قرطبہ، اشبیلیہ، اور طلیطلہ نے بھی اس جانب اعتنا کیا یہاں جو تصانیف ہوئیں وہ پہلے اسپینی زبان میں اور پھر لاطینی میں منتقل ہوئیں۔ یہاں کے مشہور ہیئت داں مسلمۃ المجریطی، ابن السمح، جابر ابن افلح، اور الزرقالی تھے۔ شمالی افریقہ میں ہر چند کوئی باقاعدہ رصدگاہ قایم نہیں ہوئی تاہم بعض ہیئت داں وہاں ایسے پیدا ہوئے جن کا نام تاریخ میں پایا جاتا ہے اور جنمیں ابوعلی الحسن المراکشی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

شمالی ایران میں سلجوقیوں کا دربار بھی اس علم کے ماہرین سے خالی نہ تھا چنانچہ جلال الدین ملک شاہ سلجوقی کے زمانے میں بمقام نیشاپور رصدگاہ قایم ہوئی اور اسکے بعد الخزانی نے زیج سنجری طیار کی۔

الک خانی خاندان کی مشہور خونریز و خون آشام ہستی ہلاکو نے بھی مراغہ میں ایک بڑی رصدگاہ نصیرالدین طوسی کی نگرانی میں طیار کرائی۔

علامہ طوسی نے بارہ سال کے مطالعہ کے بعد زیج الکنعانی شایع کی۔ طوسی کا ایک شاگرد قطب الدین محمود شیرازی بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

قاہرہ میں ایک شخص ابن الشاطر نامی ماہر فلکیات پیدا ہوا جس کے مرتب کئے ہوئے زایچے شام، مصر، اور تمام شمالی افریقہ میں رائج ہوئے۔

تیمور کے پوتے سلطان الغ بیگ نے سمرقند میں ایک بہت بڑی رصدگاہ تعمیر کرائی جسمیں جمشید الکاشی، قاضی زادہ رومی، اور علی القوشجی ایسے مشہور ماہرین فن مامور کئے گئے اور خود سلطان الغ بیگ نے کئی سال تک رصدگاہ کی صدارت کی مگر افسوس ہے کہ الغ بیگ کے ساتھ ہی اسلامی دنیا سے ہیئت کی اصلی شان مٹ گئی اور اسکے بعد صرف جنتریاں بنانے والے، اور اوقات نماز بتانے والے لوگ رہ گئے۔

مسلمان ہیئت دانوں نے تقریباً بطلیموس کا تتبع کیا اور زمین کو ساکن مانکر، دیگر اجرام فلکی کی گردش کو دائرہ دار تسلیم کیا۔ البتہ اسپین کے بعض فلاسفہ نے نظام بطلیموسی کی مخالفت کی۔ ان میں سب سے پہلا محمد بن یحییٰ تھا جو ابن باجہ کے نام سے مشہور ہے ابن طفیل نے بطلیموس اور ابن باجہ دونوں کی مخالفت کی۔ ابن رشد نے حرکت اجرام کو نبی (Concentric) تسلیم کیا۔

الغرض مسلمانوں کے کارنامے علم ہیئت میں دیگر علوم ریاضیہ کی طرح کم نہیں ہیں اور یورپ کا بہت سا علمی ذخیرہ فلکیات کے متعلق مسلمانوں ہی کی کتابوں کا ترجمہ ہے۔

اب آپ کے سوال کا ایک جزو رہگیا، اور وہ یہ کہ آیا ہماری زندگی اور معاملات زندگی پر اجرام فلکی کا کوئی اثر ہوتا ہے یا نہیں، سو اس کا جہاں تک علمی تعلق ہے، انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ حوادث طبیعی کا تعلق زیادہ تر گردش سیارگان ہی سے ہے اور اب جبکہ فضا کی شعاعوں کے اثرات بداہتہً ثابت ہوتے جارہے ہیں۔ اس سے کون انکار

کر سکتا ہے کہ اہل زمین کی صحت و بیماری، ترقی و تنزل کا تعلق فضا اور مافی الفضا سے نہیں لیکن کسی کا خیال کر لینا کہ جو کچھ کرتے ہیں اجرام فلکی کرتے ہیں بیشک لغو جہل ہے اور اسی خیال سے مذہب نے اہل نجوم کی پیشین گوئیوں کے خلاف احتجاج کیا۔ البتہ ان کو اگر بجائے فاعل کے دلایل و ذرائع مان لیا جائے تو کوئی حرج نہیں اور بڑی حد تک حقیقت سے بھی قریب ہے

پر اسرار لوح کا انکشاف

آجکل طب یونانی کی بڑی شدو مد سے مخالفت ہو رہی ہے جو لوگ اسکے کرشمے سے ناواقف ہیں وہ ذیل کے مضمون کا مطالعہ کریں جو رسالہ الحکیم سے پبلک کے فائدہ اور اطلاع کیلئے اقتباس کیا گیا ہے۔
رنگون کے ایک صاحب ثروت سوداگر ... سباب سلوعہ کیوجہ سے ... نوذہ کا شکار ہوکر بالکل ... ہو گئے تھے۔ مدت تک مشہور معروف اطبا سے علاج کرایا مگر حسب منشا رفائدہ نہ ہوا۔ یہ قاعدہ ہے کہ مایوس العلاج مریض ذلیل سے ذلیل طریقہ علاج کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ انہوں نے بھی عطائیوں اور ناڑیوں سب سے ہی رجوع کیا اور آخر میں ناکامیاب رہنے پر یہ قصد کر لیا کہ ہندوستان کے تمام مشہور مقابر پر جاکر دعائیں مانگیں اور دوران سفر میں جو فقیر یا طبیب ملنے لگے ہاتھ اس سے بھی رجوع کریں وہ اپنے اسی دورہ پر تھے کہ اتفاقاً درگاہ حضرت محبوب الٰہی کی درگاہ میں مجھ سے شناسائی ہوئی اور یہ معلوم ہونے پر کہ میں طبیب ہوں اپنا حال مجھے سنایا اور ٹھنڈی سانس بھر کر چپ ہو رہے مجھ پر انکے طرز بیان کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ فوراً علاج کرنے کا وعدہ کر لیا چنانچہ میں نے ان کا علاج نہایت محنت و جانفشانی سے شروع کیا لیکن کوئی فائدہ مرتب نہ ہوا۔ قریب تھا کہ وہ بد دل ہوکر واپس چلے جائیں کہ حسن اتفاق سے ایک دوست کی زبانی معلوم ہوا کہ گوڑگانوہ میں کوئی نذیر احمد صاحب ہیں جن کے پاس اس مرض کا نادر نسخہ موجود ہے لیکن نہ وہ طبیب ہیں نہ صاحب غرض بلکہ گھر کے رئیس اور کھاتے پیتے ہیں۔ نسخہ کسی کو نہیں بتلاتے۔ البتہ اگر کوئی زبردست سفارش لے کر پہونچ جائے تو دوا تیار کر دیتے ہیں۔ اس قدر تعریف سن کر میں ایک تعارفی خط لے کر سید ھا گوڑگانوہ پہونچا وہ بہت اخلاق سے پیش آئے اور دوا مجھے دے دی۔ میں نے سیٹھ صاحب پر اسکا استعمال شروع کیا سیٹھ صاحب کی قوت حیرت انگیز طور پر ترقی کر گئی اور اسقدر طاقت پیدا ہوئی کہ بیان سے باہر ہے، اور میں نے اس کو متعدد مریضوں پر مختلف حالات میں آزمایا ہر بھی ہمیشہ تیر بہدف پایا یقیناً میرے علم میں ایسا پر اثر نسخہ کسی دوسرے شخص کے پاس نہیں ہے۔ مجھے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ یہ نسخہ بو علی سینا کی خاص دماغی کوششوں کا نتیجہ ہے جو کسی بادشاہ کے لئے تجویز کیا گیا تھا اور ایک معدنی لوح پر کندہ ہے وہ اس نسخہ سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے اس لئے میری یہ استدعا بیجا نہ ہوگی کہ ایسے صاحب کمال کے اس نسخہ کو الحکیم میں شایع کر کے تمام اطبا ہند کو شکریہ کا موقعہ دیں۔

خادم الاطبا مسعود الرحمٰن

اڈیٹر صاحب الحکیم کا نوٹ

یہ مکتوب کوئی دو تین ماہ ہوئے ہمارے پاس پہونچا تھا لیکن اشاعت سے قبل ہم نے ان واقعات کی مزید تحقیق کے لئے اپنے کرم فرما خان بہادر ملک ... علی صاحب کو تکلیف دی جو حسن اتفاق سے آجکل گوڑگانوہ میں قیام پذیر ہیں چنانچہ صاحب موصوف کا جو جواب ہمیں موصول ہوا ہے وہ درج ذیل ہے:۔ مکرمی جناب حکیم صاحب السلام علیکم میں کل نذیر احمد قریشی سے ملا وہ باقاعدہ حکیم نہیں ہیں۔ مولوی برکت علی صاحب وکیل لاہور کے فرزند ہیں ان کے پاس قوت باہ کا واقعی ایک عجیب نسخہ ہے۔ تابعدار سردار علی سپرنٹنڈنٹ پولیس مارچ ۲۹ء

نوٹ:۔ یہ دوا پبلک کی فرمایش سے بارہا تیار ہو چکی ہے۔ چونکہ اس نسخہ کے اجزا بہت مشکل سے فراہم ہوتے ہیں اس لئے اس دفعہ بھی صرف ۱۰۰ اشخاص کے لئے دوا تیار کی جا رہی ہے جس میں سے بہت سے نام رجسٹر ہو چکے ہیں۔ ضرورت مند اصحاب قیمت و جلد روانہ کر کے اپنا نام رجسٹر کرا لیں۔

قیمت:۔ اکسیر سینا سات روپیہ طلا رسینا تین روپیہ محصولڈاک چھ آنے (۶)

پتہ:۔ نذیر احمد قریشی صیغہ (د) برکت منزل۔ گوڑگانوہ (پنجاب)

اقتباسات علمیہ

اجرام فلکی تک پرواز کا امکان

آپ ایک انڈا لیجئے اور اس کے سرے پر ایک سوراخ کردیجئے، اسی طرح اس کے نیچے دو سوراخ چھوٹے کیجئے جنمیں ایک کچھ بڑا ہو، اندر کی سفیدی نکال کر نصف حصہ پانی سے بھر دیجئے۔ اور ایک سوراخ بند کر دیجئے۔ اس کے بعد ایک ٹکڑا لکڑی کا لیکر اس میں چار کیلیں گاڑ دیجئے اور انڈے کو اسپر اس طرح رکھئے کہ ایک انچہ لکڑی کی سطح سے بلند رہے، پھر اس کے نیچے ایک موم بتی روشن کرکے پانی کے حوض میں چھوڑ دیجئے، تھوڑی دیر نہ گذریگی کہ لکڑی کا ٹکڑا ایک کشتی کی طرح چلنے لگے گا۔ اسکی علمی توجیہ یہ ہے کہ پانی کا ایک حصہ گرمی کی وجہ سے بخار میں تبدیل ہوتا ہے اور چونکہ انڈے کا چھلکا اوپر کی طرف سے روکتا ہے اس لئے صرف چھوٹا سوراخ نکلنے کے لئے رہجاتا ہے اور جب بھاپ اس سے قوت کیساتھ نکلتی ہے تو لکڑی کو جہت مخالف کی طرف پھینکتی ہے۔

بالکل اسی اصول پر جرمنی کے ایک پروفیسر نے موٹر اور ہوائی جہاز کے اختراع کا دعویٰ کیا ہے جس کے اندر کی ہوائیاں یکے بعد دیگرے چھوٹتی ہوئی موٹر یا ہوائی جہاز کو آگے کی طرف پھینکتی جائیں گی اور یہ رفتار بندوق کی گولی کی طرح تیز ہوگی

مثلاً اگر کوئی شخص چاند پر جانا چاہے تو اسکی صرف یہی صورت ہوسکتی ہے کہ وہ توپ کے گولے کی طرح زمین سے جدا ہوکر بلند ہو اور یہ اسی طریقہ سے ممکن ہے جو جرمنی کے اس پروفیسر نے بتائی ہے۔ ہرچند اس وقت تک کوئی قابل ذکر کامیابی اس تجویز میں نہیں ہوئی، لیکن اس کو ناممکن العمل نہیں بتایا، کیونکہ اگر ۳۰ میل کی بلندی تک کوئی ہوائی جہاز پہونچ جائے تو وہ اتنی ہی قوت کے ساتھ جو سطح بحر سے قریب اسے استعمال کرنی پڑتی ہے، ایک گھنٹہ میں ۴۵۰۰ میل تک جاسکتا ہے۔ ہوا کا سمندر ۱۰۰ میل کا مانا جاتا ہے۔ اس سے عبور کرنے کے بعد ہی اگر کشش زمین ختم ہوگئی تو پھر کوئی جھگڑا ہی باقی نہ رہا، لیکن اگر وہ ختم نہ ہوئی تو بھی اس کا اس حد تک کم ہوجانا یقینی ہے کہ ہوائی جہاز کی رفتار بہت کم قوت کے ساتھ اس سے بھی دو چند ہوسکتی ہے یہانتک کہ زمین کے حدود کشش ختم ہوں۔

بہرحال ماہرین فن اس مسئلہ پر غور کر رہے ہیں اور اس امر کا امکان پیدا ہوتا جاتا ہے کہ جب کسی وقت کرۂ ارضی برباد ہوگا تو یہاں کے باشندے قبل ہلاک ہونے کے مریخ، زہرہ، یا مشتری وغیرہ جاکر اپنی نوآبادیاں قائم کرلیں اور زمین کے غیر آباد کرے کو تباہ و برباد ہونے کے لئے نیچے چھوڑ جائیں۔

ایک عجیب و غریب عمل جراحی

انسان کے تمام اعضاء میں آنکھ کی ساخت جسقدر نازک و دقیق ہے اور کسی عضو کی

اسی لئے اس عمل جراحی کرنا بھی آسان نہیں اور خاص طور سے مہارت حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹر اسکی جرات کرتے ہیں۔ حال ہی میں امریکہ کے ایک ڈاکٹر نے جو آنکھ اور کان کی بیماریوں کا ماہر ہے ایک عجیب و غریب عمل جراحی کیا

اس کے اسپتال میں ایک شخص آیا جس کی ایک آنکھ غایب تھی اور بجائے اس کے کانچ کی مصنوعی آنکھ لگی ہوئی تھی، دوسری آنکھ میں بھی موتیا بند ہو گیا تھا۔ موتیا بند میں آنکھ کا قرنیہ بیکار ہو جاتا ہے۔ اس ڈاکٹر نے کوشش کی کہ دوسرے کی آنکھ کا صحیح و سالم پردۂ قرنیہ لیکر اس کے بیکار قرنیہ کے بجائے لگا دے۔ چنانچہ وہ اس عمل جراحی میں کامیاب ہو گیا اور اسکی بینائی عود کر آئی

مریخ کی آبادی

بعد غروب آفتاب فضاء آسمانی پر ایک بڑا ستارہ سرخ رنگ کا نظر آتا ہے۔ اسی کو مریخ کہتے ہیں جس کا مدار زمین کے مدار سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ جس وقت زمین مریخ و آفتاب کے درمیان آ جاتی ہے تو اس کو اصطلاح میں استقبال کہتے ہیں کیونکہ اس وقت ہمارے سامنے سطح مریخ کا وہ حصہ سامنے ہوتا ہے جس پر آفتاب کی روشنی پڑتی ہے۔ پھر چونکہ مریخ کا مدار آفتاب کے گرد بیضاوی دایرہ کا ہے اس لئے کبھی وہ زمین سے دور ہو جاتا ہے اور کبھی نزدیک۔ چنانچہ سنہ ۲۳ء میں مریخ، زمین سے بہت زیادہ قریب آگیا تھا یعنی صرف ۳۲ ملین میل دور تھا۔ اور اس لئے علمائے ہیئت نے اس موقع کو غنیمت جانکر نہایت اہتمام کے ساتھ رصدگاہوں میں اس کا مطالعہ کیا اور سب بالاتفاق اس نتیجہ پر پہونچے کہ مریخ کی سطح پر حیات کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اب رہا یہ امر کہ یہاں کی آبادی کس قسم کی ہے اور باعتبار عقل ان کے کیا مرتبہ رکھتی ہے اس میں ضرور اختلاف ہے۔ ڈاکٹر کیرنگ کا قول ہے کہ سطح مریخ پر نہ صرف عاقل آبادی کا پایا جانا بلکہ اسکا ہم سے تخاطب کرنے کی کوشش کرنا بھی ثابت ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ایبٹ کا خیال ہے کہ مریخ میں صرف حیات نباتی پائی جاتی ہے۔ رسل، ایٹکن اور فشر کا بیان ہے کہ مریخ میں صاحب عقل اور متمدن آبادی کا پایا جانا نہ خلاف عقل ہے نہ غیر ممکن لیکن اس وقت تک کوئی علمی دلیل اس امر کی بابت نہیں ملی کہ نباتات و حیوانات سے زیادہ ترقی یافتہ آبادی وہاں موجود ہے۔

اب جدید تحقیقات سے یہ امر ثابت ہوا ہے کہ مریخ کی فضا میں اور اسکی سطح پر حرارت، پانی اور آکسیجن پائے جاتے ہیں جو حیات کے لئے لازم ہیں اور دوربین کے ذریعہ جو تصویریں مریخ کی حاصل کی گئی ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اسباب حیات جو مریخ کے لئے لازم ہیں وہی ہیں جو اہل زمین کے لئے درکار ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر کوبلنٹز نے ایک نہایت ہی نازک آلہ سے دریافت کیا ہے کہ مریخ میں دوپہر کے قریب گرمی ۶۰ درجہ کی ہوتی ہے جو ہندوستان کے موسم سرما میں دوپہر ہوتی ہے۔ اس سے پہلے خیال کیا جاتا تھا کہ وہاں درجۂ حرارت صفر سے اونچا نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کروروں میل پر واقع ہونے والے سیارے کی حرارت کا صحیح علم کیونکر ہو سکا، سو اس کے لئے ایک خاص آلہ طیار کیا گیا تھا۔ یہ شیشہ کی ایک نلی ہے جس کے اندر کی ہوا نکال لی جاتی ہے اور اندر نہایت باریک تار پلاٹینم اور بسمتھ کے مکڑی کے جالے کی طرح داخل کئے جاتے ہیں۔ جہاں یہ تار جا کر ملتے ہیں وہ نہایت ہی باریک گول تختیاں ہیں جو ان تاروں کے ساتھ آنکھ سے نظر نہیں آتے بلکہ خوردبین

کی مدد سے نظر آتے ہیں۔ اس نلکی کی ایک جانب مسطح ہے اور اس کے درمیان میں ایک چھوٹا سا شفاف ذیرہ ہے جس وقت مریخ سے آنے والی شعاعیں اس پر پڑتی ہیں اور شفاف سے گزر کر معدنی الواح تک پہونچتی ہیں تو انہیں گرم کر دیتی ہیں اور اور اس گرمی کی کیفیت سے وہاں کے درجۂ حرارت کی تعیین کیجاتی ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ ہر چند دوپہر کے وقت وہاں درجۂ حرارت ۶۰ ہوتا ہے لیکن رات کو وہ انجماد کے نقطہ تک پہونچ جاتا ہے اور اس لئے رات دن کی حرارت میں یہ فرق عظیم حیات انسانی کے لئے منافی ہے۔

بڑی دوربین سے جس وقت سطح مریخ کو دیکھا جاتا ہے تو اس کی سطح پر کچھ خطوط اور کچھ خشکی کے حصے نظر آتے ہیں اور ایام سرما میں اس کے قطبین کا حصہ سفید نظر آتا ہے جو گرمی کے زمانہ میں بہت کم ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سفید حصہ برف کا ہے جو بعد کو تحلیل ہو کر پانی ہو جاتا ہے۔ خطوط کے متعلق خیال کیا گیا تھا کہ یہ نہریں ہیں جو کاشت کے لئے بنائی گئی ہیں اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے لوگ بہت ترقی یافتہ ہیں، لیکن اب کہا جاتا ہے کہ جن خطوط کو نہر سمجھا جاتا تھا وہ حقیقتاً نباتات کا سبز حصہ ہے جو فصل خریف تک زردی مایل رنگ اختیار کر لیتا ہے۔

بہر حال یہ امر یقینی ہے کہ مریخ میں نباتات کا وجود ضرور پایا جاتا ہے اور چونکہ نباتات کے ساتھ عادتاً حیوانات کا پایا جانا بھی مسلّم ہے اس لئے بعض ماہرین فن نے یہ فیصلہ صادر کیا ہے کہ مریخ میں نہ صرف نباتات بلکہ حیوانات بھی پائے جاتے ہیں اور حرارت، پانی اور آکسیجن جو لازمۂ حیات ہیں، وہاں پائے جاتے ہیں اب رہا یہ امر کہ حیوانات کا وجود کس حد تک وہاں معلوم ہوتا ہے اور کرۂ ارضی کے انسان کی طرح وہاں کسی عاقل مخلوق کا وجود پایا جاتا ہے یا نہیں، اس کا علم ابھی تک حاصل نہیں ہو سکا، لیکن اگر موجودہ دوربین کی قوت بڑھ جائے اور فوٹو میں جزئیات آسکیں تو کہا جا سکتا ہے کہ حقیقتاً وہاں کس قسم کی مخلوق آباد ہے اور اس نے کس حد تک ترقی کر لی ہے۔

اصلاح تقویم

امریکہ کی اکاڈمی نے تجویز پیش کی ہے کہ موجودہ تقویم میں اصلاح ضروری ہے اور اس طرح کہ سال کو تیرہ مہینوں میں تقسیم کیا جائے اور مہینے کو ۲۸ دن کا۔ تیرھواں مہینہ جو بڑھایا گیا ہے جون کے آخری تیرہ دن اور جولائی کے ابتدائی پندرہ دنوں سے ملکر بنایا ہے۔ اس طرح ۳۶۴ دن پورے ہو جاتے ہیں ایک دن سال میں عید نوروز کا قرار دیا جائے اور اُسے سال میں داخل نہ کیا جائے اس طرح پورے ۳۶۵ دن ہو جائیں گے سنہ کبیسہ میں دو دن کی کمی کا حساب اس طرح کیا جائے کہ ایک دن عید نوروز کے علاوہ ایک دن کبیسہ کا بڑھا دیا جائے اور یہ دونوں سال کے شمار میں شامل نہ ہوں۔

حامد رضا خاں تسنیم نظامی کا اب نگار سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نمائندگی کا اختیار جو انہیں دیا گیا تھا منسوخ کر دیا گیا ہے۔ اسلئے آیندہ کوئی صاحب نگار کے متعلق ان کو کوئی رقم نہ دیں ورنہ ہم ذمہ دار نہ ہونگے۔ — مینیجر نگار

بسم اللہ

صفحہ و صفحہ ۲،۷ کے اعلانات غور سے پڑھئے

نگار

فہرست مضامین نومبر ۱۹۲۹ء

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد (۱۶)	نومبر ۱۹۲۹ء	شمار (۵)

ملاحظات

آہ زعمرے کہ گزشت اینچنین!

چند دن سے میں جس کیفیت میں مبتلا ہوں اس کو اگر کسی ایک فقرہ سے ظاہر کر سکتا ہوں تو عنوان کے مصرعہ کو ملاحظہ فرمائیے ــــ آہ زعمرے کہ گزشت اینچنین!

ماضی کی ہر یاد خواہ وہ کتنی ہی تلخ ہو حال کی شیرینیوں سے زیادہ پُرکیف ہوتی ہے اور مستقبل کی ہر تمنا خواہ کتنی ہی عسیر الحصول کیوں نہ ہو، حاصلات حاضرہ سے زیادہ قیمتی معلوم ہوتی ہے۔ یعنی انسان نام ہے ایک طرف خواہش استرداد کا اس کیلئے جو گزر گیا اور دوسری طرف دست امید بڑھانے کا اس کیلئے جو ہنوز عدم میں ہے۔ پھر چونکہ حیات انسانی کا ہر لمحہ حال ہی ہو کر گزرتا ہے اسلئے اُنکا کارآمد ہونا معلوم! لیکن میری حالت اس سے بالکل علیحدہ ہے، ماضی کے استرداد کی تمنا نہیں اور حال کی کیفیت یہ ہے کہ

برمن آں می رود امروز کہ گوئی فرداست

کہتے ہیں کہ جہل کا علم، علم کی پہلی منزل ہے۔ لیکن شاید یقین کی نہیں! معلوم نہیں علم کو جہل سمجھنے والے اس باب میں کیا کہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس سوال کا پیدا ہونا ہی دماغ انسانی کی پہلی بدعت ہے جسے فطرت تو برداشت کر لیتی ہے، لیکن رُوح کی

نزاکت اس کی متحمل نہیں۔ پھر کتنے ہیں جنکی روحیں اس کشمکش کی سوگوار نہیں اور کہاں ہیں وہ نفوس جو احساس کی اس بے اعتدالی سے واقف نہیں۔ جہل وعلم سے زیادہ اہم وضروری یہ دیکھنا ہے کہ ہمارا نفس اپنی تکمیل کا طلبگار ہے یا نہیں اور جو امکان کے ذرات کس مرکز کی طرف پہونچنے کیلئے بیتاب ہیں

انسان کا وجود اپنی تخلیق کے لحاظ سے سراپا جستجو ہے، روح خواہ وہ مادہ سے مجرد ہو یا وابستہ یکسر اضطراب تمنا ہے۔ صبح کا جلوۂ زریں، شام کا نقاب رنگیں، آفتاب کی زرپاشیاں، چاند کی نوربیزیاں، شاہد مقصود کے مختلف مظاہر و آثار Phenomena ہیں جو ہمکو عین ذات (Noumena) کی طرف بلاتے ہیں، خزاں کی سوگواری، بہار کا نشاط، دریا کی روانی، پہاڑ کی استقامت اوران کو بھی جانے دیجئے، خود مساعی انسانی کے تمام نتائج جو سربفلک عمارتوں، محیر العقول ایجادوں، اور زر وسیم کے انبار کی صورت میں ہر جگہ نظر آتے ہیں، یہ سب دعوتیں ہیں اصل منزل تک سعی کرنے کی، اُس آغوش رحمت تک پہونچ جانے کی، جس کا نام مذہبی کاروبار والوں نے فردوس رکھا ہے اور میں اس کو "دار الصحو والمنام" کہتا ہوں۔ جہاں روح اپنی جستجو کو ختم کر کے شیریں خواب میں محو ہو جاتی ہے، جہاں تمام تفریقات جسم و رنگ مٹ کر صرف ایک احساس امن وسکون میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

آج علم وحکمت کی ترقیاں اس حد تک پہونچ گئی ہیں کہ زمان ومکان، سمت وجہت کا مفہوم بدلگیا ہے اور تمام محالات، ایک ایک کر کے مکان ووقوعی کی صورت اختیار کرتے جاتے ہیں، لیکن کیا انسان باایں ہمہ اقتدار واختیار روح میں کوئی شائبۂ سکون محسوس کرتا ہے؟

آج زر ودولت کی فراوانی کا یہ عالم ہے کہ تمام وہ تمنائیں اور خواہشیں جو انسان کے گوشت وخون سے متعلق ہو سکتی ہیں، "شئے حاصل" کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں، لیکن، سوال یہ ہے کہ کیا رُوح کی گرسنگی میں کسی قسم کی کوئی کمی محسوس کیجاتی ہے؟

انسان آگے بڑھ کر رہا ہے۔ انسانیت پیچھے ہٹ رہی ہے —— دماغ ترقی کر رہا ہے —— روح تنزل کر رہی ہے —— اسوقت کا انسان ایک ایسا مستسقی ہے جس کے سامنے دریا جاری ہے اور وہ خود پانی پینے کیلئے آزاد۔ لیکن اس کی روح جس کیلئے بیتاب ہے اسکا یہ عالم ہے کہ

دہند شوق و سے رخصت نظر نہ دہند

دنیا کے تمام مذاہب اسی "فردوس گم گشتہ" کو ڈھونڈھ نکالنے کے لئے آئے، انبیاء ورُسل، اولیاء واکابر کی ہستیاں رُوح کی اسی فریاد کی مختلف صورتیں تھیں، جو ابراہیم واسمٰعیل، سلیمان وداؤد، یوسف وموسیٰ، عیسیٰ ومحمد، زردشت وکرشن، بودھ وکنفوشس کے نام سے ظاہر ہوئیں اور آیندہ مختلف ناموں اور صورتوں سے ظاہر ہوتی رہینگی، لیکن ان ہستیوں کے اُٹھ جانے کے بعد انسان نے جو کچھ یاد رکھا وہ صرف یہ تھا کہ فلاں آتش پرست ہے اور فلاں گوسالہ پرست، یہ صلیب کا پرستار ہے اور وہ کعبہ کا، یہ ناقوس پھونکتا ہے اور وہ اذان دیتا ہے، یہ صورت کفر کی ہے اور وہ اسلام کی، حالانکہ یہ تمام تفریقات صوری، یہ جملہ تمیزات ظاہری، نوع انسانی کی اس رُوح کا تجزیہ نہیں کر سکتے جسکا درد ودرمان ایک، جس کی راحت واذیت ایک، جس کا اوج وحضیض ایک اور جس کی فنا وبقا ایک ہے

خدا ایک ہے اور اس کا پیغام بھی ہمیشہ ایک ہی رہا ہے، وہ پیغام ہمیشہ سے ایک صدق بسیط ایک حقیقت مستدام، ایک صداقت لازوال، ایک قطعیت غیر فانی رہا ہے اور ایسا ہی رہیگا خواہ اسکے پہونچانیوالے کسی ملک و قوم اور کسی رنگ و نسل کے ہوں۔ پھر آج دنیا کی سوگواریوں کا سبب نہ خدا کی دوئی ہے، نہ اسکے پیام کا تنوع، بلکہ صرف یہ جستجو کہ پیامبر کا وطن کہاں تھا، اس کا نام کیا تھا، اسکی صورت کیسی تھی، اس کا ملبوس کس طرح کا تھا اور وہ کیا کھاتا تھا کیا پیتا تھا۔ خدا کی مرضی تو یہ تھی کہ اپنی روح ہم تک پہونچائے، مگر ہم نے اس کو تبسم سمجھکر اپنے حواس کے تلذذ کو اس کے عرفان کا معیار قرار دیا، وہ چاہتا تھا کہ اپنی نکہت سے صرف ہمارے دماغ کو متاثر کرے، لیکن ہم نے پھول کو اصل چیز سمجھکر اس کے رنگ، اس کی صورت سے اپنے ذوق و پسندیدگی کو وابستہ کیا، پھر جب وہ پھول مرجھا کر فنا ہو گیا تو نکہت سے وہ ہلکا سا تعلق بھی جاتا رہا اور ہماری روحیں پھر تڑپنے لگیں۔

آج دنیا کو امن کی جستجو ہے۔ سکون کی تلاش ہے، پھول کی چادروں سے چنگاری کی سوزش، زرکار ملبوس سے شعلوں کی تپش اور زر و سیم کے انبار سے آگ کی لپٹ آ رہی ہے۔ بنارس کا مرتاض برہمن "قشقہ بر جبین" ہات میں سمرن لئے ہوئے اٹھتا ہے اور کہتا ہے "میرے مندر میں آؤ، صدائے ناقوس سنو اور مورتی کے سامنے جھک جاؤ تاکہ یہ جلن دور ہو"۔ دیوبند اور فرنگی محل کا عبا پوش مولوی، جیب و تسبیح لئے ہوئے رونما ہوتا ہے اور کہتا ہے "میری مسجد میں آؤ، اذان کی آواز سنو، قبلہ کی طرف منہ کرکے سجدہ میں گر جاؤ تاکہ یہ سوزش دفع ہو" ―― ایک راہب کہن سال پیدا ہوتا ہے اور تلقین کرتا ہے "میرے عالیشان کلیسہ میں آؤ، گھنٹے کی صدا پر متوجہ ہو، پیمبر مصلوب کی شبیہہ سے التجا کرو، تاکہ یہ بے چینی دور ہو"۔ جاتریوں کا گروہ جوق در جوق مندروں سے نکلتا ہوا نظر آتا ہے، لیکن ان کے قشقہ کا صندل بھی خشک نہیں ہو چکتا کہ ان کے سر جنگ و جدل سے رنگین نظر آنے لگتے ہیں ―― جماعت کی جماعت مسجدوں سے باہر نکلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے مگر ان کی پیشانی سے سجدہ کا نشان خاک بھی محو نہیں ہو چکتا کہ ایک دوسرے پر کثافت اچھالتا ہوا نظر آتا ہے ―― گروہ کا گروہ کلیسہ سے باہر آتا ہے اور ابھی عود و عنبر کے بخور کی خوشبو بھی ان کے لباس سے جدا نہیں ہوتی کہ معصیت کی بد عفونت آغوش ان کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ ایک رند لاابالی، ایک مرد ژولیدہ مو، جو نہ کبھی کسی مندر میں گیا، نہ مسجد میں نہ جس نے کبھی دیر میں سر جھکایا نہ کلیسہ میں انسانی زندگی کی اس بیچارگی کا مطالعہ کرتا ہے اور اس قوت کے سامنے جس کو اسنے ہمیشہ تمام علائق مذاہب و مسالک سے بے نیاز ہو کر پہچانا، متحیرانہ و مستفسرانہ کھڑا ہو جاتا ہے ― آسمان کا ایک ستارہ ٹوٹ کر روشن لکیر بناتا ہوا غائب ہو جاتا ہے اور یہ بھی اپنی راہ لے لیتا ہے۔ صبح کو قدسیوں کی جماعت اس کو خاک بسر و گرد آلود حالت میں دیکھ کر منہ پھیر لیتی ہے کہ یہ کوئی شرابی ہے۔ یقیناً وہ شرابی ہے، وہ مست ہے۔ لیکن اس طرح کہ

مستیش را نبود نغمہ و صہبا ساماں

دوسرا گروہ آتا ہے کہتا ہے کہ یہ تو فاسق و فاجر ہے، ملحد و بیدین ہے۔ بیشک وہ سب کچھ ہے مگر اس شان کے ساتھ کہ

نازد بکفر خود کہ بہ ایمان برابر ست

اسکے مجروح جسم، اسکے داغدار سر و سینہ کو دیکھ کر لوگ نفرت کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں مگر جسوقت وہ بیتاب ہو کر چیخ اٹھتا ہے کہ

دردلیست دردلم کہ بدرماں برابرست

تو اس کا سننے والا کوئی نہیں ہوتا

میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے یہ تاثرات کب سے مجھے بیتاب بنائے ہوئے ہیں اور ٹھیک اس وقت جبکہ میں چیخ چیخ اٹھنے کیلئے مجبور تھا کس کس طرح "تاب گفتگو" مجھ سے چھین لی گئی، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ اب "اشارات" کا رخ بدل گیا ہے، "ایاء ربانی" کچھ اور ہے، ظلمت کی شدت اب اس حد تک پہونچ گئی ہے کہ اسکے بعد روشنی کا نمودار ہونا لازم ہے۔ اسلئے مجھے بلا پس وپیش اس حقیقت کا اظہار کر دینا چاہئے کہ وہ جو اپنے کو اکابر دین کہتے ہیں ان کو گروہ طاغوت سمجھو، وہ جو نقاہوں میں ہاتھوں کو رسم دست بوسی کے لئے پھیلائے ہوئے پڑے ہیں، ان کو دشمن روحانیت جانو، وہ جو اپنے آگے تمھیں جھکنے پر مجبور کرتے ہیں ان کو غول صحرائی سے زیادہ وقعت نہ دو۔ وہ وقت گزر گیا جب خدا مسجد و مندر میں ملتا تھا، کہ اب نہ وہ مسجد و مندر ہیں نہ وہ مسجد و مندر تک پہونچانے والے۔ اب خدا ملتا ہے، نفس کی آزادی میں، ترک تقلید میں، قلب کے اس انبساط میں جو صرف اپنے ہی تدبر و تفکر سے حاصل ہوتا ہے اور روح کی اس حریت میں جو اخلاق، صرف اخلاق ہی کی پاکیزگی سے میسر آتی ہے۔ مذاہب کو ترک کر دو کہ اب ان سے صرف فساد و سفک دماء کا کام لیا جاتا ہے، مدعیان مذہب کو ٹھکرا دو، کہ نوع انسانی کی تفریق کا ذمہ دار گروہ تنہا یہی ہے۔ تمام انسان ایک ہیں، اور صرف انسانیت ہی کے رشتہ کو اپنا مذہب قرار دو اگر مذہب کا لفظ تمھارے لئے ضروری ہے۔ ناموں کی تفریق مٹا دو، لباس کی تمیز اٹھا دو، رنگ و نسل کا امتیاز محو کر دو۔ آسمانی رحمت کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا، مگر اسوقت جب ہماری نگاہوں کے زاویے بدلجائیں۔ پھر اگر تم چاہتے ہو کہ دنیا میں حقیقی امن و سکون قائم ہو، تمھاری روح کی بے چینیاں دور ہوں تو اپنی نگاہوں کا مرکز ایک ہی قرار دو اور حسب و نسب کے تفاخر، دولت و جاہ کے تفوق، حسن و جمال کی تعلی، اور علم و فضل کے پندار کو کیسر محو کر دو کہ خدا کی بارگاہ میں شریف و رذیل، شاہ و گدا، عالم و جاہل سب ایک ہیں اور وہاں اگر کسی چیز کو امتیاز حاصل ہے تو تمھاری اس خوئے عجز کو جسنے بندگان خدا میں کبھی تفریق نہیں کی اور سب کو اپنی ہی ہستی کا ایک جزو قرار دیا

میں جیسا کہ میرے ایک عزیز دوست نے اندیشہ ظاہر کیا ہے، مہدویت کا دعویٰ نہیں کرتا اور نہ میں کبھی نبوت و رسالت کا مدعی ہوسکتا ہوں، کیونکہ نہ اب کسی مہدی کی ضرورت ہے نہ رسول کی لیکن یہ ضرور عرض کرونگا کہ اگر کبھی رات کی تنہائی میں، صبح کی خلوت میں طبیعت سکون کی طرف مایل ہو تو جو کچھ میں کہتا ہوں اس کو سامنے رکھئے اور پھر مجھ سے نہیں بلکہ

زخود بجوے کہ مارا چہ درد ل افتادست

دسمبر ۳۲ء کے نگار میں، میں نے اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ کو مشورہ دیا تھا کہ سالانہ تقریب میں بجائے مشاعروں کے کوئی اور سنجیدہ و مفید مشغلہ تلاش کرنا چاہئے اور میں نے اسی کے ساتھ یہ بھی ظاہر کیا تھا کہ بزم شعر خوانی کے ساتھ طلبہ کا اسقدر شغف نتیجہ،

اُس ادنیٰ قسم کی ذہنیت کا جو موجودہ نصاب تعلیم اور اصول تربیت کے ماتحت اس وقت ہندوستان کی بڑی سی بڑی درس گاہ میں پائی جاتی ہے۔ میں سمجھتا تھا اور غالباً اپنے خلوص نیت کی بنا پر صحیح سمجھتا تھا کہ میرا یہ کہنا کسی کو گراں نہ گزرا ہوگا، لیکن اُسوقت یہ امر میرے ذہن میں بھی نہ آیا کہ ہندوستان کا گروہ شعراء ہنوز جناب احسن مارہروی ایسی ذہنیت رکھنے والے شاعروں سے خالی نہیں ہے جو اپنی اہمیت کو صرف اپنی شاعری ہی سے ثابت کرنا چاہتے ہیں درآنحالیکہ سچ پوچھئے تو وہ شاعر بھی نہیں ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نے اسوقت تک جناب احسن کو ایک لمحہ کے لئے بھی صحیح معنی میں شاعر سمجھنے کی غلطی کا ارتکاب نہیں کیا تھا اور میں ہمیشہ ان کو غیر شاعر ہونے ہی کی حیثیت سے ایک اچھا انسان جانتا تھا، لیکن اب انٹر کالج میگزین کے جون تا ستمبر نمبر کے ملاحظہ سے (جو غزلوں کے ایک گلدستہ کی صورت میں جناب احسن کے مقالہ افتتاحیہ کے ساتھ شایع ہوا ہے) ثابت ہوتا ہے کہ اگر انھیں اپنے شاعر نہیں تو کم از کم شاعروں کے نقیب ہونے پر ضرور اصرار ہے اور وہ میرے اُس خیال سے اسقدر برہم ہیں کہ مجھ سے اس کا انتقام لینے کے لئے ان کو ایک سے زاید تیر اپنے ترکش طعن وتشنیع سے نکال کر استعمال کرنا پڑے

کس منہ سے شکر کیجئے اس لطف خاص کا

جناب احسن مارہروی نے میرے مصلح اردو ہونے کی حقیقت، میری اصابت رائے کی نازش، میری اعلیٰ ذہنیت کی مفروضیت اور "بادہواہی" خیالی رفعت کو بھی بے نقاب کرنے کی سعی فرمائی ہے۔ لیکن بالکل حسبۃً للہ کیونکہ مبادا طلبہ کی ناتجربہ کار طبیعتیں اس سے مرعوب ہوجائیں اور وہ شاعری کا مشغلہ ترک کرنے کے بعد فلاح دارین سے محروم ہوجاتے۔ پھر اے میرے محترم بزرگ اور طلبہ علیگڈھ کے نقطۂ نظر سے، اے آبروئے خلوت والے فخر انجمن، میرے پاس تو کافی الفاظ بھی نہیں کہ آپ کے اس خلوص نیت، اس استاذانہ شفقت وکرم، اس مصلحانہ انداز وشمایل اور اس بزرگانہ حزم وتکہداشت کی داد دے سکوں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر اس کی جزاء خیر آپ کو داور حشر کی طرف سے نہ ملی تو سب سے پہلا وہ شخص جو اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہوا، استناداً وبرہاناً آپ کے اس گلدستہ کو پیش کریگا، وہ میں ہونگا، خواہ وہ کالائے بد کہکر بجائے آپ کے میرے ہی مُنہ پر کیوں نہ پھینک دیا جائے

سچ ہے اگر کالج کے طلبہ کو شروع ہی سے یہ درس نہ دیا جائے گا کہ محبت کے رموز کیا ہیں، معشوق سے کیونکر باتیں کیجاتی ہیں، ہجر ووصل کے شدائد ولذائذ کیا ہیں، تو پھر قیس وفرہاد کی نسل کیونکر قایم رہیگی اور احسن صاحب اپنے "عشق پیرانہ سری" کے جوش میں کس پر یہ غمزۂ محبت صرف کرینگے کہ :-

قسم اپنی، ستم اپنا، مری خواہش، مرا نام ہی دو چار رہیں باتیں جو انھیں یاد نہیں

مجھے نہیں معلوم کہ ہاں جناب احسن کے سپرد کونسی خدمت ہے، لیکن میں انسے درخواست کرونگا کہ اگر کبھی اسپر بات کا موقعہ آجائے تو اپنے اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے طلبہ کو کم از کم یہ ضرور بتا دیں کہ آپ کے محبوب نے کیا قسم کھائی تھی جو یاد نہیں رہی اور آپ کی وہ کونسی خواہش تھی جو پوری نہیں کی گئی۔

یہ ہے وہ شاعری جسکو الشعراء تلامیذ الرحمان اور ان من الشعر لحکمۃ وان من البیان لسحرا کی آڑ پکڑ کر جناب احسن

کالج میں رواج دینا چاہتے ہیں۔ ملا غنیمت کا

بمکتب می رود طفل پریزاد مبارکباد مرگ نو باستاد

کہنا آجتک بدنام ہے لیکن کس کے منہ میں زبان ہے جو جناب احسن مارہروی سے یہ بازپرس کرے کہ کالج کے حدود میں کمسن طلبہ کے سامنے اپنے محبوب کی قسم اور اپنی خواہش کی داستان دہرانے کا اُن کو کیا حق حاصل ہے۔ کیا لوگ اپنے بچوں کو اسی یقین کے ساتھ وہاں بھیجتے ہیں کہ وہاں کا مہتمم مشاعرہ سال میں دو چار مرتبہ ایسے پست و دنی مشاغل ایسے ذلیل و ردی جذبات ضرور ان میں انگیخ کریگا

میں نے اسی دسمبر ۲۹ء کے رسالہ میں یہ بھی ظاہر کیا تھا کہ "غریب بسم اللہ کے گنبد میں زندگی بسر کرنے والے نوجوان (طلبہ) کیا سمجھ سکتے ہیں کہ ہندوستان کا شاعر کس قدر عجیب و غریب چیز ہے اور اس کے اخلاق، نفسیات کے کتنے ناحل شدہ مسایل اپنے اندر پنہاں رکھتے ہیں"۔ ہمارے احسن صاحب بانی محفل مشاعرہ علیگڈھ کو یہ فقرہ بھی بہت ناگوار ہوا اور وہ سمجھے کہ شاید میں نے اسی سلسلہ میں ان کے اخلاق پر بھی حملہ کیا ہے۔ حالانکہ جو شخص شوق سندیلوی کی کتاب اصلاح سخن کا مطالعہ کر چکا ہے، وہ جانتا ہے کہ جناب احسن مارہروی کے خطوط (جو اس میں درج ہیں) اتنی معمولی دستاویزی شہادتیں نہیں ہیں، جن کے ہوتے ہوئے مجھے ان کے اخلاق پر روشنی ڈالنے کی یا اُن کو اپنے اخلاق سے روشنی ہٹانے کی جرات ہو سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ جناب احسن مارہروی کی یہ عبارت اس شخص کو بھی تھوڑی دیر کے لئے حیرت میں ڈالدینے والی ہے جو "بکف چراغ دارد" کے نام سے بدنام ہے

رہا مجھے آیندہ مشاعرہ کے لئے "معہ ساز و سامان" کے شرکت کی دعوت دینا سو میں ان کے اس نوید کا ہر ممکن احترام ملحوظ رکھتے ہوئے نہایت افسوس کے ساتھ اس حقیقت کے اظہار پر مجبور ہوں کہ اگر علیگڈھ کا ہجوم مشاعرہ، فردوس ہو تو بھی میرا وہاں کیا کام جب آپ ایسے رضوان نے پہلے ہی سے وہاں کی فضا کو داغدار و آلودہ بنا رکھا ہے

معاف فرمائیے میں آپ کی لغزش مستانہ سے اپنے ارتعاش لب ناکام کا تبادلہ کرنے کے لئے کبھی آمادہ نہیں ہو سکتا

تو و طوبیٰ و ما و قامت دوست فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

جناب احسن مارہروی نے یہ بھی مشورہ مخلصانہ دیا ہے کہ جب کبھی میں علیگڈھ آؤں تو خسرو کے یہ دو شعر ضرور سن لوں کہ

نظم را علّے تصور کن بذات خود تمام کان نہ محتاج اصول و صوت خنیاگر بود
در کند مطرب بسے ہاں ہاں و ہوں ہوں سرود چون سخن نبود ہمہ بے معنی و ابتر بود

ہر چند میں شاعر نہیں لیکن چونکہ مشورہ صائب ہے اسلئے میں نگار کے ذریعہ سے تمام خنیاگر قسم کے شاعروں کو پہونچائے دیتا ہوں لیکن اسی کے ساتھ میرا بھی ایک مشورہ احسن صاحب کے حضور میں ہے اور اگر برا نہ مانیں تو عرض کروں کہ جب وہ طلبہ کو درس شاعری دینے کے بعد فارغ ہو جایا کریں تو سعدی کے یہ دو شعر وہ خود بھی ضرور پڑھ لیا کریں

کریما بہ بخشائے بر حال ما کہ ہستم اسیر کمند ہوا
نداریم غیر از تو فریاد رس توئی عاصیان را خطا بخش و بس

افسوس ہے کہ اس مہینہ مین زیادہ تفصیل کا موقعہ نہیں لیکن ماہ آیندہ میں اس گلدستہ کا پورا مطالعہ کرنے کے بعد بتاؤنگا کہ آپ حدود کالج میں تلامیذ الرحمان قسم کے شاعر پیدا کررہے ہین یا تبہم لغاون نوعیت کے اور پھر آپ کے " آبگینہ حصار " مین آپکی "ابلہانہ گریز" کا تماشہ دکھاؤنگا، مین جانتا ہون کہ یونیورسٹی کے ہر ملازم کو ارباب یونیورسٹی کی نگاہ مین اپنے تئین فرد مفید ثابت کرنے کے لئے بہت سی تدابیر اختیار کرنا پڑتی ہیں اور جناب احسن حقیقتاً اس سے زیادہ کچھ نہین کرسکتے کہ ہر سال مشاعرہ کا ایک لغو وبے معنی ہنگامہ پیدا کرکے اپنے خداوندان رزق کے سامنے اپنے وجود کی اہمیت کو ثابت کرتے رہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ اُن کی اس " کارگاہ معاش فریب " کو دنیا کیون برداشت کرے اور اُن کے مصالح ذاتی پر فرزندان ملک کے اخلاق کی قربانی کیون چڑھائی جائے۔ اگر جناب احسن سوائے مشاعرہ سازی کے کسی اور خدمت کے اہل نہیں ہیں، تو اس کے یہ معنی تو نہین ہوسکتے کہ نوخیز طلبہ مین احسن صاحب کی اہلیت کے لحاظ سے مخصوص ذہنیت پیدا کیجائے۔ اور اس طرح نسل کی نسل کو تباہ وبرباد کیا جائے

گزشتہ ماہ کے نگار میں بسلسلۂ " سیاح کی ڈائری " میرزا مظہر جانجانان کا ایک شعر درج ہوا ہے جس کے پہلے مصرعہ میں بجائے سَر کے دِل درج ہوگیا ہے۔ اصل مصرعہ یون ہے:۔

سر از زین تیغ بُردن آسان نیست

نیاز

جن حضرات کا چندہ نومبر و دسمبر ۱۹۲۹ء مین ختم ہو رہا ہے

وہ ذہن نشین کرلین کہ آیندہ نگار کی خریداری جاری رکھنے میں اُن کو کتنا فایدہ ہے:۔

۱) کتاب سائنس کے عجائب ان کو مفت ملیگی

۲) جنوری ۳۰ء کا رسالہ ۱۶۰ صفحات کا بغیر کسی اضافۂ قیمت کے حاصل ہو سکے گا۔

۳) بعض ایسے ایسے نادر و دلچسپ مضامین مطالعہ میں آئین گے جو مشکل ہی سے کہین اور نظر آسکتے ہیں

۴) شہاب کی سرگزشت قیمتی (عہ/)، فراست الید قیمتی عہ/، شاعر کا انجام قیمتی ۱۲/ جذبات بھاشہ قیمتی ۱۲/ ہر ایک کتاب نصف قیمت میں مل سکے گی۔

) تذکرۂ خندۂ گل جس کی قیمت چار روپیہ ہے معہ محصول صرف دو روپیہ میں ملسکیگا۔

نوٹ:۔ جدید خریدار بھی ان تمام رعایتوں سے فائدہ اُٹھا سکتے ہین

منیجر نگار۔ لکھنؤ

مومن وکلام مومن

(بسلسلہ سابق)

۱۲

پیدائش اور خاندان

مومن خان سنہ ۱۳۱۵ھ مطابق سنہ ۱۸۰۰ء مین، محلہ کوچہ چیلان دہلی مین پیدا ہوے، ان کے والد کا نام غلام نبی خان تھا جو مشہور طبیب تھے، حکیم غلام نبی خان کے والد نامدار خان کشمیر کے رہنے والے تھے، قسمت آزمائی کے لئے ترک وطن کر کے دہلی آئے یہ زمانہ "شاہ عالم" کی حکومت کا تھا، طالع نے یاوری کی شاہی طبیبون مین داخل ہو گئے خدمات طبابت کے صلے مین بادشاہ کی طرف سے پرگنہ نارنول کے کچھ مواضعات بطور جاگیر عطا ہوے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے جب جھجر کی ریاست نواب فیض طلب خان کو دی تو اس میں پرگنہ نارنول بھی تھا نواب صاحب نے نامدار خان کے ورثا کو ایکہزار روپیہ سالانہ پنشن دی اس مین حکیم مومن خان بھی شامل تھے، ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی مومن کو ۲۵ روپیہ ماہوار وظیفہ دیا تھا مومن کے والد حضرت شاہ عبد العزیز صاحب کے معتقد تھے اس لئے جب مومن پیدا ہوے تو شاہ صاحب نے ان کے کانون مین اذان دی، اور "مومن" نام رکھا جو نگین شہرت بنا

تعلیم و تربیت

مومن نے اول اول گھر پر تعلیم اور تربیت پائی، اس کے بعد حضرت شاہ عبد القادر، اور حضرت شاہ عبد العزیز ایسے جید علما سے فیض حاصل کیا، درسیات ختم کر کے اپنے خاندان مین طب کی تکمیل کی، وہین عرصہ تک نسخہ نویسی بھی کرتے رہے

علم طب کو شاعری سے براہ راست بہ ظاہر کوئی تعلق اور مناسبت نہین لیکن "مومن" نے ان کو دونون کا ڈانڈا ملا دیا ہے اکثر غزلون کے اشعار مین اس کے مسائل اس طرح بیان کئے ہین کہ شعر مین لطف پیدا ہو گیا ہے

جذبات شاعری کے ساتھ علم الابدان، اور تشریح اعضا و مزاج انسانی کا پیوند ایسا ملایا ہے کہ ان کی شاعری کے لئے ایک میدان نکل آیا۔

طبابت کے علاوہ نجوم، اور جفر مین بھی ایسی مہارت حاصل کی کہ اس فن کے ماہرین ان کو استاد تسلیم کرتے تھے، شطرنج مین بڑے بڑے شاطران کے کمال کے معترف تھے، "مومن" نے ان علوم کو بیکار رہنے نہ دیا بلکہ اپنی شاعری مین اس طرح ممزوج کیا کہ اگر کوئی ماہر چاہے تو ان کی شاعری سے ان علوم کے اکثر مسائل کا پتا لگا سکتا ہے۔ اس کمال اور جدت مین "مومن" نہ صرف اردو شعرا مین یگانہ و یکتا ہین بلکہ فارسی شاعری مین بھی انکی طبیعت کے شاعر مشکل سے ملین گے

لباس اور حلیہ

مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی نے رسالہ اردو اورنگ آباد مین "سنہ ۱۲۶۱ھ مین دہلی کا ایک مشاعرہ" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے اس مین حکیم مومن خان کا حلیہ اور لباس و وجاہت، خوش پوشاکی کا نقشہ

ان الفاظ مین کھینچا ہے

"حکیم مومن خان کی عمر تقریباً ۴۰ سال کی تھی، کشیدہ قامت، سرخ و سفید رنگ تھا جس مین سبزی جھلکتی تھی، بڑی بڑی روشن آنکھین، لمبی لمبی پلکین، کھینچی ہوی بھوین لمبی سوتوان ناک، پتلے پتلے ہونٹھ ان پر پان کا لاکھا جما ہوا، مسی آلودہ دانت ہلکی ہلکی مونچھین، خشخاشی داڑھی، بھرے بھرے ڈنڈ، پتلی کمر، چوڑا سینہ لمبی انگلیان، گھونگروالے بال لمبے لمبے کاکلون کی شکل مین کچھ تو پشت پر اور کچھ کندھون پر پڑے ہوے، بدن پر شربتی ململ کا نیچی چولی کا انگرکھا لیکن اس کے نیچے کرتا ندارد، جسم کا کچھ حصہ انگرکھے کے پردے سے دکھائی دیتا تھا، گلے مین سیاہ رنگ کا فیتہ، اس مین چھوٹا سا سنہرا تعویز، کاکریزی رنگ کے ڈوپٹے کو بن دیکر کمر مین لپیٹ لیا تھا اور اس کے دونون کونے سامنے پڑے ہوے تھے، ہاتھ مین پتلا سا خار پشت، پاؤن مین سرخ گلبدن کا پاجامہ مہریون سے تنگ اور پر ڈھیلا، پاجامے کا کپڑا ہمیشہ ریشمی اور قیمتی ہوتا تھا، چوڑا سرخ نیفہ، انگرکھے کی آستین آگے سے کٹی ہوئی مین، کبھی لٹکتی رہتی تھین، کبھی پلٹ کر چڑھا لیتے تھے، سر پر گلشن کی بڑی دو پلڑی ٹوپی، اس کے کنارے پر باریک لیس، ٹوپی اتنی بڑی کہ سر پر منڈھ کر آ گئی تھی، اندر سے مانگ اور ماتھے کا کچھ حصہ اور بال صاف جھلکتے تھے"

جس زمانے کی یہ وضع اور لباس تھا اسوقت اس مین تکلف اور شوقینی کی انتہا ہو گئی تھی، "مومن" کی متانت اور سنجیدگی مزاج، خودداری، تہذیب اس کے گواہ ہین کہ یہ وضع شرفا کی تھی، اب اگر اس وضع مین کوئی شخص رہے تو تماشہ بننے کے علاوہ غنڈون مین شمار ہو، ہر ملک را ہر رسمے کے سوا "ہر قرنے را ہر رنگے" بھی صحیح اور درست ہے

اسی اندازے "مومن" کی جو تصویر شایع کی ہے (اور جو نگار میں بھی نکل چکی ہے) اس سے "مومن" کی ذہانت، غور و خوض، فکر اور تعمق کا پورا پتا چلتا ہے، علم الابدان اور علم قیافہ کو جہانتک دخل ہے اس سے واضح ہے کہ مومن کے ایسے حلیہ کا آدمی کبھی معمولی اور عامی نہین ہوتا

حالات وسوانح

"مومن" رنگین مزاج ضرور تھے لیکن اوباش فطرت نہ تھے، طبیعت مین درد، سوز و گداز، عاشقانہ ادائین موجود تھین لیکن غیر محتاط نہ تھے جن تذکرہ نویسون نے ان کی ظاہری شکل و صورت، وضع و لباس پر انکی وارستہ مزاجی، آزادی (بقول بعض) اوباشی قیاس کی ہے وہ مع الفارق ہے یہ ثابت ہے کہ "مومن" نے ابتداے جوانی مین شاہ سید احمدؒ کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور آخر وقت تک اس بیعت کو نبھایا

رسالۂ "نگار" جنوری ۲۶ء صفحہ ۱۳ پر یہ عبارت ہے کہ:۔

"مومن کی شاعری پر شاہ سید احمد کی تعلیمات کا اثر تھا"

شاہ سید احمد صوفی اور درویش کامل تھے، ان کی تعلیم مقامات تصوف "ہمہ اوست، فنا و بقا، دنیا کا عالم مثال ہونا، وحدت وجود وغیرہ پر مشتمل ہوتی ہے جس کے لوازم طبیعت کا گداز، خودداری، توکل، عاشقانہ رنگ، "آہ سرد و رنگ زرد و چشم تر" ہیں

"مومن" کے کلام مین شروع سے اخیر تک تصوف موجود ہے اس کی تفصیل آتی ہے اس جگہ اصولی طور پر ایک امر ذہن نشین کرلینا چاہئے کہ عشق مجازی" کے جو لوازم ہین وہ عشق حقیقی کا عکس ہین، اگر مومن کی شاعری اور غزلیات مین عشق، درد، جذبات سوز وگداز موجود ہے تو رموزِ تصوف سے انکار نہین کیا جاسکتا، درآنحالیکہ یہ ثابت ہوچکا ہے کہ "مومن" ایک پیر طریقت کے مرید اور خمخانہ تصوف کے میکش اور سرشار تھے۔ "مومن" پر جس قسم کے اتہامات لگائے گئے ہین انکی شکل ان الزامات سے ملتی جلتی ہے جو شیخ سعدی، ایسے بزرگ پر تراشے گئے ہین

شیخ سعدی اور مومن! شیخ سعدی" کے جذبات تغزل کا بعض واقعات ہی کی بنیاد پر" امرد پرستی" سے منسوب کرنا بالکل بے اصل اور بے حقیقت ہے اس سلسلے مین اس کا اجمالی بیان نامناسب نہ ہوگا

فارسی تغزل کی بنیاد "امرد پرستی" ظاہر کی جاتی ہے شیخ سعدی فارسی "تغزل" کے امام یا مجدد تھے اس لئے ظاہر ہے کہ یہ جدت اور اس مین رنگ تغزل کی بلندی بالکل نئی چیز تھی اس لئے شیخ کا دامن امرد پرستی" کے واقعات خود ساختہ سے ملوث کیا گیا

یہ بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اس قسم کے لغو الزامات شیخ سعدی کے زمانے مین ایران کے اندر ان کے ہم منزلون اور ہمنیالون کی طرف سے عائد نہین کئے گئے بلکہ اغیار کی طرف سے ان کے وطن سے باہر ان کے زمانے کے بہت بعد لگائے گئے ہین، اس لئے حقیقت ظاہر ہے

شیخ کے متعلق ایک واقعہ گلستان کی ایک حکایت کے بیان کے مطابق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ "انھون نے ایک نوعمر، سبزہ آغاز شخص کے بوسے لئے تھے" استغفراللہ کجا شیخ سعدی کجا یہ الزام" صورت حقیقت یہ ہے کہ ایران مین یہ رواج پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے کہ رخصت ہونے یا رخصت کرنے کے وقت فریقین ایک دوسرے کے سر اور پیشانی چومتے تھے۔ کبھی ایک ہی فریق کی طرف سے یہ اظہار گرمجوشی ہوتا تھا اس مین عمر اور قد کی کوئی قید نہین، الزام دینے والون نے صرف اس رسم کو سامنے رکھ کر الزام کا پہاڑ بنا لیا

شیخ سعدی عالم متبحر، متورع، پارسا، ابو الفرح ابن جوزی ایسے سخت متشرع پیر کے مرید تھے جن کے نزدیک "سماع" تک احتیاط کے خلاف تھا شیخ سعدی ان کے پیرو تھے، تہجد گزار، متعدد حج پاپیادہ کئے تھے، ان کے نسبت اس قسم کا خیال صرف راویون کی "اپج" ہے یا تعصب اس کے سوا کچھ نہین

جذبات تغزل کی بنیاد پر اس الزام کی صورت اس لطیفے سے ملتی جلتی ہے کہ "کسی نے کسی سے پوچھا کہ مجاہد کون ہے؟ اس نے جواب دیا کہ جس کے لمبی داڑھی ہو"

"مومن" غریب پر بھی یہ الزام بالکل یہی نوعیت رکھتا ہے" جس طرح شیخ سعدی کی غزلین واقعات امرد پرستی بن گئین اسی طرح مومن کی مثنوی، واسوخت، ان کی آزادی، وراستہ مزاجی اوباشی کا خط وخال بنگئین۔ ان اتہامات پر آیندہ گفتگو ہوگی

مومن کی طرف سے جن الزامات کی تردید کی گئی ہے اس پر مزید برہان اور حجت کی ضرورت ہو تو ان کے حالات اور

خصائل پر نظر کیجئے

" مومن " طبعًا نہایت غیور اور خود دار تھے ان کا دوش احسان کے معمولی بوجھ سے بھی کبھی آشنا نہ ہوا قناعت اور توکل انکی گھٹی مین تھے ، وطن پرستی ان کے ایمان کا جز تھا انہین وجوہ سے اپنے ہی آستانے پر پڑے رہے دہلی سے باہر کبھی نہیں گئے

راجہ نیور تھلہ نے ان کو دہلی سے طلب کیا ساڑھے تین سو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کی ، خرچ سفر بھی بھیجا ، مومن کو راجہ صاحب کی قدردانی کا پورا علم تھا ، جانے پر آمادہ ہو گئے لیکن جب معلوم ہوا کہ ریاست مین ایک گانیوالے کی بھی یہی تنخواہ ہے تو اپنا ارادہ فسخ کردیا ۱۸۴۲ء مین ان کو کالج کی پروفیسری پیش کی گئی اس سے بھی انکار کیا

مومن کے پیر بھائی والئی ٹونک نے ان کو بلانے اور اپنے ساتھ قیام کرنے کی کوشش کی ، مگر معذرت کردی ورنہ گئے چار یا پانچ باران کو وطن چھوڑ کر رامپور ، بدایون ، سہسوان سہارنپور ، جہانگیرآباد جانا پڑا اور ان کے مذاق اور طبیعت کے مطابق آرام بھی تھا عزت بھی تھی لیکن قبلۂ وطن دہلی ان کے دل کا ہمیشہ قبلہ نما بنا رہا

" حب الوطن من الایمان " کو اپنے عمل سے صحیح ثابت کردیا ، مسٹر رام بابو سکسینہ اس خصوصیت کو اپنے الفاظ مین اس طرح ادا کرتے ہین " انھوں نے پانچ بار دہلی کو چھوڑا ، لیکن محبت کی وطن نے ہمیشہ ان کو اپنی طرف کھینچ لیا . . . . راجہ اجیت سنگھ رئیس پٹیالہ دہلی مین رہتے تھے ، سخاوت مین مشہور تھے ، مومن خان کو قیمتی ہودج کے ساتھ ہتھنی دی ، خانصاحب نے اظہار شکریہ مین قصیدہ کہا جسکا مطلع یہ ہے

صبح ہوئی تو کیا ہوا ہے وہی تیرہ اختری کثرت دود سے سیاہ شعلۂ شمع خاوری

پورے قصیدے کو دیکھئے اس مین مومن خان کی شان کہین کم نہین ہوئی ہے اور ممدوح کو غلط اوصاف سے متصف کرکے ، نامناسب اور ناجائز مبالغے سے متہم نہین بنایا ہے

آزاد کی رائے ہے کہ سوا اس قصیدے کے کوئی اور مدح کسی دنیادار کی صلہ کے توقع پر نہین لکھی

" مومن نے اس قصیدے کو قصیدہ کے پورے معیار پر لکھا ہے اس کی تفصیل موقع پر آتی ہے

" مومن " مین خدا نے ذہانت اور ذکاوت کے ساتھ غیر معمولی قوتِ حافظہ عطا کی تھی ، دنیا مین ایسے لوگ غیر معمولی کہے جاتے ہین جن مین یہ دونوں قوتین ہوتی ہین

ان دونوں قوتوں سے مالامال ہستیوں نے جو کچھ کیا ہے وہی " مومن " نے بھی کیا

شیخ ابن سینا نے فلسفہ اور دوسرے علوم کے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہی مومن نے ، شاعری میں جوہر دکھائے ہیں اگر ان کی شاعری کی حقیقت سمجھی نہ گئی تو مومن کا کیا قصور ہے

"مومن" خوددار ضرور تھے لیکن مغرور و متکبر نہ تھے، وہ کسی کی مدح یا ذم اپنی طبیعت کے خلاف کبھی گوارا نہ کرتے تھے لیکن اظہار حقیقت مین ان کو کبھی عار نہ تھا

جن تذکرہ نویسون نے یہ لکھا ہے کہ "وہ کسی کے کمال کا اعتراف نہ کرتے تھے" مومن پر بہتان اور ان کے وصف "اعتراف حقیقت" کی پردہ پوشی ہے

رسالہ اُردو اکتوبر ۱۹۲۸ء کے صفحہ ۵۹۲ پر مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضمون کی یہ عبارت دیکھئے "مومن نے غالب کے متعلق یہ الفاظ کہے ہین

"غالب کے رنگ مین شعر کہنا تو کیا وہ یا ان کے استاد پہلے مرزا نوشہ کے شعرون کو سمجھ تو لین"

یہ الفاظ مومن نے ہد ہد الشعرا اور ان کے استاد کے متعلق کہے تھے، "مومن نے پیشہ طبابت پر رزق کا انحصار نہین کیا تو شاعری نجوم، رمل وجفر سے کیا کسب زر کرتے

حاصل کلام یہ ہے کہ "مومن" خوددار، وطن پرست، متوکل، انصاف پسند، ذہین وذکی، قوی الحافظہ، سوز وگداز اور دردِ عشق کی تصویر تھے

خصوصیاتِ کلام

"مومن" کے تمام اصنافِ سخن پر بحث اور تبصرہ کرنے سے پہلے "غزل" پر اظہار خیال ضروری ہے کیونکہ "غزل" ہی کے میدان مین "مومن" آفتاب بنکر چمکے اور اصناف اس آفتاب کی کرنین ہین، مومن اپنے کمال اور خداداد مہارت کے اعتبار سے جو مشہور نہ ہوئے اس کی وجہ یہ ہے کہ انھون نے عام روش سے علیحدہ اپنا راستہ بنایا تھا اس راستے کو کسی نے "بدعت" کسی نے "تماشا" کسی نے "چیستان" کسی نے "معما" کہا۔ حالانکہ وہ اپنی شاعری بخصوص تغزل کے اعتبار سے جتنی بلندی پر ہین وہان تک نظر پہونچنا بھی مشکل ہے، اس لئے جو لوگ یہ سب کچھ کہتے ہین انکی خطائے نظر ہے "ہسٹری آف اُردو لٹریچر" صفحہ ۱۵۰ مین رام بابو سکسینہ نے بلیغ الفاظ مین "مومن" کے امتیاز کو نمایان کیا ہے لکھتے ہین کہ:۔

"مومن اپنے خیالات کی بلندی اور بلند پروازی کی ندرت مین سب سے الگ اور ممتاز نظر آتے ہین، ان کے تشبیہات اور استعارے معمولی سطح سے اسقدر بلند ہین کہ ان کے اشعار ان خصوصیات مین بالکل نمایان ہین

"مومن نے خیالات بلند اور الفاظ شاندار کو اپنی شاعری مین یکجا کر دیا ہے۔ وہ "عاشق تن" شاعر ہین لیکن ان کے عشق کا ذریعہ اظہار غزل ان کے کمالات کی وجہ سے غیر معمولی ہے"

تعجب ہے کہ جس فرض کو مدعیان اُردو تذکرہ نویسون نے ادا نہین کیا اس کو رام بابو نے چند الفاظ مین ادا کر دیا۔ مومن کے اوصافِ شاعری کی تفصیل کیجائے تو یہی الفاظ ہونگے جو رام بابو نے اختیار کئے ہین

یہ کیسی بوالعجبی اور افسوسناک حیرت ہے کہ "مومن" کا کمال بعض غلط بین نگاہون مین عیب اور نقص ہے

مین نے اپنے ماہانہ رسالہ "تعلیم" اور "سحبان" مین ایک لطیفہ درج کیا تھا ایک صاحب ادعا، مدعی سخن فہمی نے

مجھسے بھی شاعرون کے تذکرے پر کہا کہ "مومن" کا کلام بیشتر مہمل ہوتا ہے، مین نے تعجب سے پوچھا کہ کوئی مہمل شعر پڑھیئے، حضرت نے یہ شعر پڑھا ۔

کر علاج دردِ وحشت چارہ گر لادے اک جنگل مجھے بازار سے

مین نے پوچھا اس شعر پر کیا اعتراض ہے؟ جواب ملا کہ جنگل کہین بازار مین ملا کرتا ہے؟

مین نے کہا اس شعر مین "مومن" نے کمال بیان کی قدرت دکھائی ہے، اس شعر مین ایک طرف فصاحت دوسری طرف بلاغت ہے شاعر کہتا ہے کہ جس طرح بازار مین جنگل نہین ملتا (کیونکہ یہ کوئی سودا نہین) اسی طرح دردِ وحشت کا علاج ناممکن ہے طریقۂ بیان نے مضمون کے سونے کو سکّہ بنا کر اقلیم سخن مین جاری کیا ہے

اہل فن جانتے ہین کہ بلاغت کا یہ انداز "اعجاز" کا مرتبہ رکھتا ہے جو "مومن" کے سوا کسی کو نصیب نہین لفظی شکوہ مین معنوی طلسم کا انتظام جادو بن گیا ہے، اگر مہمل گوئی کا یہی معیار ہے تو "موضوع گوئی" کو کیا کہا جائے۔

اس کی مثال بالکل اس اعتراض سے ملتی جلتی ہے کہ "عربی۔ فارسی۔ اردو اس لئے بہتر زبان نہیں ہیں کہ سیدھی طرف سے لکھی جاتی ہین؟

یورپ کے ایک فلسفی نے اپنی ایک تقریر میں یہی دُرفشانی کی تھی جب دعویٰ اور دلیل کی یہ صورتین ہون تو اہل تحقیق کو قلم رکھدینے کے سوا چارہ نہین

اس ضمنی بحث کے بعد اصل موضوع سے پہلے حقیقت شعر اور تغزل پر نقد وبحث کی حاجت ہے

ایک شاعر جب شعر کہتا ہے تو فضا، آب وہوا، زمانہ، اپنے علم وفضل، واقعات، وحالات سے متاثر ہوتا ہے، بلکہ یون کہنا چاہئے کہ شاعر کی طبیعت اثرات مذکورہ بالا سے متاثر ہوتی ہے اور شعر اس کی طبیعت کا خاکہ ہوتا ہے، دونون بیانون کا حاصل ایک ہے شاعر کا یہ کمال ہے کہ وہ جس قسم کے خیالات ظاہر کرنا چاہتا ہے اسی اعتبار سے "الفاظ" "ترکیب" "بندش" کو پیش نظر رکھتا ہے نہ یہ کہ ہر قسم کے خیالات، مسائل فلسفہ وطبعیات، علوم وفنون کو مقررہ زبان یا ترکیب مین ادا کر سکتا ہے، کیونکہ یہ امر بغیر کسی دلیل کے مسلم ہے کہ تمام خیالات ایک زبان اور ایک لہجہ مین ادا نہین ہو سکتے

اصنافِ سخن پر نظر کیجئے قصیدہ۔ غزل۔ مثنوی۔ مرثیہ۔ واسوخت، ہجو، رباعی۔ بند علیحدہ علیحدہ اسلوب سے بیان کئے جاتے ہین غور سے دیکھیۓ تو انکی زبان اور الفاظ مین بھی بین فرق ہوتا ہے۔

اس پر یہ دلیل قائم ہوتی ہے کہ "اثر معنی کے تابع ہے، معنی الفاظ کے تابع"

جب مرثیہ کا اثر قصیدے سے علیحدہ تسلیم کیا جا سکتا ہے تو اسی دلیل سے مرثیہ کے الفاظ وطرز ادا کا قصیدے سے علیحدہ ہونا مسلم ہے، ایس جانسن، لایوز آف دی پوئٹس مین لکھتے ہین :-

"الفاظ وتراکیب کے اُس انتخاب پر بہت کم توجہ کیجاتی ہے جو نظم کو نثر سے علیحدہ کر دیتے ہیں"

اسی سلسلہ میں آگے لکھتے ہیں :-

نہ تو گل خار سے علحدہ کئے گئے اور نہ مختلف رنگ باہمدگر . . . .
اس طرح ملائے گئے کہ ہر رنگ میں جان پڑ جاتی . . . .

. . . .

. . . .

. . . .

ای۔ ایس ڈیلاس کی رائے ہے کہ :۔

"الفاظ، خیالات کے اظہار کا ذریعہ ہوتے ہیں اور ہر فن کے لئے مخصوص زبان ہوتی ہے "

اس کا مطلب یہ ہے کہ "اگر داستان غم اور مضمون رنج بیان کرنا ہے تو اسی مناسبت سے الفاظ لانا چاہئے، خوشی اور مسرت کے اظہار میں اسی قسم کے الفاظ استعمال کئے جائیں، یہی شاعر کا کمال ہے، جو شاعر اس اعتبار سے جس قدر کامیاب ہے اسی قدر باکمال سمجھا جاتا ہے

"شکسپیر" اپنے اسی کمال کی وجہ سے مشہور ہے، وہ فطرت نگار ہے طبائع پر اس کو عبور ہے، جس کا کیریکٹر بیان کرتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس پر وہ حالت خود طاری ہو رہی ہے، فارسی میں فردوسی، کا شاہنامہ اردو میں مراثی انیس و دبیر، اردو ڈراموں میں آغا حشر کے ڈرامے ان خصوصیات کی وجہ سے مشہور ہیں

خاقانی اور ذوقی نے فارسی اور اردو میں قصیدہ گوئی کا معیار قائم کیا اور اس کے مطابق الفاظ لائے، اس لئے ان کا درجہ بہت بلند ہے عربی میں یہی خصوصیات اس مرتبہ کمال پر پہونچ جاتی ہیں کہ بالآخر معجزہ بن جاتی ہیں، انسان کو اس کے مثل لینے کا یارا نہیں رہ جاتا ہے

اس کا نام قرآن ہے

ہندی (بھاشا) شاعری میں اصطلاح معین کے بموجب "رس" خاص چیز ہے، اس کے اصلی معنی ذائقہ کے ہیں؛ اصطلاح میں اظہار جذبات کا نام ہے،

اس کی نو قسمیں ہیں

۱۔ شرنگار۔ اس کے ذریعہ سے خواہش نفسانی کا اظہار ہوتا ہے اس کے مطابق الفاظ لاتے ہیں
۲۔ ہاسی۔ آواز یا حرکت کی وجہ سے تاثر
۳۔ کرونسڑا۔ ہجو وغیرہ کے جذبات
۴۔ راود۔ غصہ کے جذبات
۵۔ ویررس۔ اس میں خوشی کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے

۶- بھیانک رس - خوف کے جذبات ظاہر کئے جاتے ہین
۷- دی بھتس - اظہار توہین کے جذبات
۸- ادبھت - حیرت اور استعجاب کا اظہار ہوتا ہے
۹- شانت - خدا کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جانا یا اس قسم کی تاثیر کا اظہار

ہندی شاعری مین الفاظ کے اعتبار سے ترنم بھی ہوتا ہے اس ترنم کے لحاظ سے راگ اور راگنی وسیع علم بن گیا ہے جس کا جواب ہندوستان کے باہر نہین ملتا۔

ہندی مین ایک ایک رس کی متعدد قسمین ہین ان سب کو یکجا کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ رس کی شاعری نے انسانی جذبات کو کس طرح سمجھا ہے؟

موضوع بحث کو مسلسل کرنے اور ترتیب مقدمات کے بعد نتیجہ نکالنے کے لئے فصاحت اور بلاغت کا ذکر بھی ضروری ہے یورپ مین ایسا آکر میس علم معانی وبیان کا معلم اول ہے اس نے فصاحت کی تعریف ان الفاظ مین کی کہ "وہ فن ترغیب وتحریص ہے"

ابن سنان کے نزدیک فصاحت کا مدار ذیل کے اصولون پر ہے :-

۱- لفظ مانوس ہو، یعنی اہل زبان استعمال کرتے ہون، زبانون پر روان ہو، اس کی بناوٹ مین کوئی غرابت نہ ہو اوضاع لغوی سے خارج نہ ہو (یعنی دریا کہہ کر پہاڑ، زمین کہکر آسمان مراد نہ لین)۔
۲- لفظ آسانی سے زبان پر جاری ہو سکے، سننے مین دلکش ہو
۳- بحیثیت استعمال لفظ سہل ہو، اور معنا دل نشین ہو
۴- سختی اور نرمی مین حسب موقع کار آمد ہو غصہ کے موقع پر اظہار غصہ ہو سکے، صبر اور حلم کی جگہ اس کا اظہار ہوتا ہو

معنوی خصوصیات یا مفہوم اور مطلب کا اظہار اس طرح ہو کہ ادراک اور احساس کو اس سے لذت ہو ایک لفظ کثیر معانی پر دال ہو

مومن کا ایک شعر ہے:-

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا   جب کوئی دوسرا نہین ہوتا

لفظ "گویا" اس جگہ اسقدر بلیغ ہے کہ اس سے زیادہ کوئی لفظ اس مفہوم کو ادا کرنے والا مشکل سے ملیگا آئمہ فن نے اس پر مبسوط بحثین کی ہین اس جگہ ان کا ذکر موضوع اور مضمون کو ناگوار طویل بنا دیگا

یہان ضمنی طور پر یہ بحث پیدا ہوتی ہے کہ خوبی عبارت کو لفظ سے تعلق ہے یا معنی سے

ایک گروہ کا دعویٰ ہے کہ اس کا تعلق الفاظ سے ہے دوسرا فریق معنی کو کہتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ تنہا نہ تو لفظ ہی مقصد کو پورا کرتا ہے اور نہ تنہا معنی بلکہ دونون سے معانی مطلوب پیدا ہوتے ہین

تنہا نہ تو کوئی لفظ فصیح ہے اور نہ بلیغ۔ بعض وقت غیر فصیح الفاظ ترتیب سے آکر فصیح ہو جاتے ہیں۔ مثلاً عربی میں ضیزیٰ "کا لفظ ہے، ایک لفظ میں "ض" اور "ز" کا اس طرح جمع ہونا فصاحت کے خلاف ہے لیکن قرآن میں جہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے نہایت فصیح ہے " تلک اذا قسمۃ ضیزیٰ "

لفظ بمبوق، بچھو نچون " " ڈگڈ مبر " بہ ظاہر غیر فصیح ہیں لیکن ان سے اگر مذاق مراد ہو اور تربیت میں یہ معنی پیدا ہوں تو اپنی جگہ بہت فصیح ہیں

مومن نے اپنے اشعار میں الفاظ کی فصاحت، معانی کی بلاغت، ترتیب کی خوبی زبان کی سلاست، بندش کی بیساختگی کا کچھ اس طرح اہتمام کیا ہے کہ کہیں دوسری جگہ نظر نہیں ملتی۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ شاعری میں مومن کا مرتبہ مجتہد اور امام کا ہے ہمارے دعاوی کی دلائل بھی اس جگہ دیکھ لیجئے ؎

۱- تم مرے پاس ہوتے ہو گویا　　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

لفظ "گویا" کی " فصاحت " پر ایک طرف نظر کیجئے اور اسکی معنوی بلاغت پر دوسری طرف نگاہ رکھئے، ترکیب میں "گویا" جہاں واقع ہے اس پر بھی نظر کیجئے پھر پورے شعر کی بندش اور سلاست پیش نظر رکھئے، کیا یہ مثال دوسری جگہ مل سکتی ہے؟

لفظ "گویا" اگر دوسری جگہ رکھ دیا جائے یا شعر کے الفاظ میں کچھ تغیر کر دیا جائے تو یہ تناسب اور یہ لطافت قائم نہیں رہ سکتی یہ مومن کے کمال اور ہمارے دعویٰ کی کھلی ہوئی دلیل ہے۔

فصاحت الفاظ:- ؎

۲- پھوڑا تھا دل نہ تھا یہ موئے پر خلل گیا　　　جب ٹھیس سانس کی لگی دم بھی نکل گیا　　　(نعتیاں اور کریم اللہ)

اس شعر میں الفاظ ٹھیس، پھوڑا، سانس، دم کی فصاحت لفظی دیکھئے۔

مومن نے چونکہ پہلے مصرعہ میں لفظ پھوڑا، استعمال کیا ہے اس لئے دوسرے مصرعہ میں " ٹھیس "، لگنا کہا ہے، پھوڑے " میں ٹھیس لگتی ہے اس کے لئے اس جگہ دوسرا لفظ موزون نہیں ہو سکتا، اس طرح " ٹھیس " کے لئے پھوڑا لازم تھا، ٹھیس لگنا نازک سے نازک تر چیز کے لئے استعمال ہوتا ہے، اس جگہ اس لفظ نے بتا دیا ہے کہ پھوڑے کی حالت نازک سے نازک تر تھی

" سانس " کا لفظ چونکہ آچکا تھا اس لئے " دم " سے زیادہ کوئی لفظ موزون اور مناسب نہ تھا

اب معنوی بلاغت دیکھئے:-

دل کو پھوڑا، کہا اس لئے کہ اس کی صورت اس سے ملتی ہوئی ہوتی ہے پھوڑا مواد سے بھرا ہوتا ہے، دل کا بھرنا اور بھر آنا بھرا ہوا ہونا دہ صفتیں یا مصادر ہیں جو مستعمل ہیں۔ لہذا معنوی حیثیت سے اس کے تناسب کا اعجاز ملاحظہ فرمائیے

" دم " کے دوسرے معنی " خون " کے ہیں، اب دم نکل جانے کی خوبی بلاغت دیکھئے جس طرح پھوڑے سے مواد و خون اور ریم نکلتا ہے، اسی طرح سانس کی ٹھیس لگنے سے دم یا جان یا خونِ دل نکل گیا۔ خونِ دل بھی جان ہی ہے " اس جگہ " مومن " نے

اپنی حکمت وطبابت کو بھی ہاتھ سے جانے نہین دیا۔

چھوٹے مین ہر چیز سے ٹھیس لگتی ہے لیکن دل کی ایسی نازک چیز مین سانس کی ٹھیس کافی نہین ضروری ہے پھر دل۔ سانس۔ دم۔ کی مناسبت نے معنوی خوبیون کے نگینے شعر کی انگشتری مین مناسب اور موزون ترین مقامات پر جڑ دئے ہین۔ نزاکت، اور تلاش نے ایک طرف سلاست، زبان اور بندش نے دوسری طرف اس شعر کو بیمثال کردیا ہے

اس شعر کا کمال دیکھئے کہ اس کا کوئی لفظ بدل دیجئے یا ترکیب اور ترتیب مین ردوبدل کیجئے تو شعر بدل جائے گا اور یہ خوبی باقی نہ رہیگی "مومن" کے اعتراف کمال کے لئے یہ کافی ہے

دوسرا شعر حمد کے سلسلے مین مناجات کا ہے

۳۔ خدایا ہاتھ اُٹھا ؤن عرضِ مطلب سے بھلا کیونکر کہ ہے دستِ دعا مین گوشہ دامانِ اجابت کا

اس شعر کے اجزائے ضروری ہاتھ اُٹھانا۔ دستِ دعا۔ دامانِ اجابت ہین "مومن چونکہ دعا کر رہا ہے (مومن کی مناسبت معنوی کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے) اس لئے ہاتھ نہین اُٹھا سکتا یعنی نا امید نہین ہوسکتا۔

ہاتھ اُٹھانے کے دوسرے معنی بھی ہوتے ہین اس کو اس مضمون سے مقید کرلیا ہے کہ دست دعا مین چونکہ دامانِ اجابت کا گوشہ ہے اس لئے نہین اُٹھا سکتا مبادا وہ چھوٹ جائے جو عین مدعا ہے

پہلے مصرعہ مین ہاتھ اُٹھانا دوسرے مین دست دعا ہے بظاہر لفظاً تکرار ہے لیکن معنوی اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ مقصود دعا اور اجابت کے لئے ان الفاظ سے زیادہ اگر کوئی موزون الفاظ ہوسکتے ہین تو ان کو لاکر دیکھئے کہ شعر کی یہ خوبی باقی رہتی ہے؟

۴۔ درد ہے جان کے عوض ہر رگ دپے مین ساری چارہ گر ہم نہین ہونے کے جو درمان ہوگا

یہ شعر لفظی خصوصیات کے اعتبار سے زیادہ معنوی خصوصیات کی شان رکھتا ہے۔ الفاظ درد۔ جان۔ چارہ گر۔ درمان اس انگشتری کے نگینے ہین جو اپنی جگہ پر موزون تر ہین

معنوی بلاغت دیکھئے کہ "مومن" کہتا ہے کہ اب "درد" طبیعت اور خون بن گیا ہے جو جسم کے ہر حصہ مین موجود ہے جس طرح جان جسم مین ہر جگہ موجود ہے (یہ مسئلہ بھی مومن کے فلسفہ طب کو آشکار کرتا ہے) لہذا اس کا علاج نہین ہوسکتا علاج کے معنی یہ ہین کہ "درد" دفع ہو اور وہ جان بن گیا ہے، لہذا درمان سے درد کی جگہ "جان" کا دفعیہ ہوگا، جب جان جسم مین باقی نہ رہی تو انسان زندہ نہ رہا، اس زندہ نہ رہنے کو ان الفاظ مین بیان کیا ہے کہ "ہم نہین ہونے کے" اس سے بہتر طرز بیان ہونا خیال مین نہین آتا۔

اس ترکیب کی دوسری خوبی ملاحظہ فرمائیے، متکلمین اور علمائے فلسفہ کے نزدیک "انسان" مجموعہ جسم وجان کا نام ہے، یعنی انمین سے اک کوئی جزو نہ ہو تو انسان مکمل نہین۔ "مومن" نے اس مسئلہ کو سامنے رکھ کے بلیغ الفاظ استعمال کئے ہین "ہم نہین ہونیکے"۔ "مومن" نے "جان کے عوض" کہکر درد ہی کو جان بنا دیا ہے "جان کی طرح" اگر کہتے تو دوسرے مصرعہ مین یہ خوبیان پیدا نہ ہوسکتی تھین۔

معنوی اعجاز کے علاوہ "زبان" کی کرامت کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ "ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا" یعنے اگر درماں ہوگا تو ہم نہ ہونگے دوسرے الفاظ مین یا تو درماں ہو، یا ہم ہون، کیسا محاورہ اور کیسی زبان ہے

۵۔ چارہ گر جنت مین اس کے آستان سے لے گئے　　　ایک بھی میری نہ مانی لاکھ سر پٹکا کیا

اس شعر کے اجزاے ضروری جنت - آستان - سر پٹکا کیا - لیگئے - میری نہ مانی ہین

لفظی تناسب اور اعتبار سے پہلے مصرعہ مین چونکہ "آستان" کہا ہے اس لئے دوسرے مصرعہ مین "پٹکنا" استعمال کیا ہے "آستان معشوق پر عاشق سر پٹکتا ہے یہ مضمون عام ہے قریب قریب اکثر شاعرون نے لکھا ہے" مومن "کی تلاش اور انداز اس کا پابند کیونکر ہوتا! وہ کہتا ہے کہ:-

"چارہ گر آستان یار سے جنت مین علاج عشق کے لئے لیگئے، لیکن عاشق کو جنت سے کیا کام اس لئے آستان یار کا چھوڑنا گوارا کیونکر ہوتا اس ناگواری کو سر پٹکنے سے ظاہر کیا ہے، ایک بھی میری نہ مانی، محاورہ اور زبان کی بیساختگی ہے اس سے اور چار چاند لگا دیئے ہین۔ "لاکھ سر پٹکا کیا" بلاغت کی روح ہے"

۶۔ لاش کس کی ہے یہ عدو سے نہ پوچھ　　　مین ہون کشتہ ترے تجاہل کا

اجزاے شعر لاش - کشتہ ہین لفظی اعتبار سے لاش کے ساتھ کشتہ، کا ذکر ضروری تھا معنوی خوبی دیکھئے کہ:-

"معشوق، رقیب سے عاشق کی لاش کو دیکھ کر پوچھتا ہے کہ یہ کس کی لاش ہے، (حالانکہ وہ جانتا پہچانتا ہے) عاشق زبان حال سے کہتا ہے کہ یہ عدو یا رقیب سے پوچھنے کی بات نہین، یہ تو مجھسے پوچھو کہ مین کون ہون! مین تمھارے تا نہ تجاہل کا مارا ہوا ہون۔ یہ "تجاہل" چاہے معشوق کا عام انداز ہو یا اس وقت خاص کا مین ہون کشتہ ترے تجاہل کا "کیسا دلپذیر لہجہ ہے زبان نے اس کو چمکا کر آفتاب بنا دیا ہے"

"مومن" کے دیوان مین شروع سے آخر تک یہ کمالات اور کرامات شاعری موجود ہین، جنکا وجود ابتدا سے ابتک کہین نہین ملتا

حاصل کلام

یہ ہے کہ "مومن" نے اپنے تمام کلام بالخصوص غزلیات مین، الفاظ کی فصاحت معانی کی بلاغت، ترکیب کی خوبی ترتیب کی موزونی، زبان کی سلاست جذبات کے نشتر، بندش کی بیساختگی مضمون کی بلندی - تلاش - طرز ادا یکجا کردیئے ہین پھر کمال یہ ہے کہ اس اہتمام سے ان کا تمام دیوان شروع سے آخر تک بھرا پڑا ہے۔

سب سے زیادہ عجیب اور غریب خصوصیت "مومن" کی یہ ہے کہ آورد کے اہتمام مین انداز بیان سے "آمد" کی بیخودی اور دلیری پیدا ہوگئی ہے، مومن اپنی اس صفت مین دنیاے شاعری مین منفرد اور اکیلے ہین

یوروپ کے اہل قلم "شکسپیر" کی تعریف کرتے ہوے لکھتے ہین کہ "اس نے اپنی گرامر اور زبان علیحدہ کر لی ہے

ان لوگون کو یہ معلوم نہین کہ یہ کسی کے کمال کی تعریف نہین ہو سکتی، عام راستہ سے الگ راہ طیار کر کے ہر شخص چلنے کی مقدرت رکھتا ہے، کمال اس کا نام ہے کہ اس راہ پر اس طرح چلے کہ نظرون کے ساتھ انگلیان بھی اٹھنے لگین

"مومن" نے اپنے اسی کمال کا اظہار کیا ہے، وہ قواعد مقررہ، عام زبان یا لغات و محاورات بعینہ مین اسی انداز سے کہتا ہے کہ نئی بات معلوم ہوتی ہے۔

(باقی) کیفی چریاکوٹی

جنوری سنہ ۳۰ء سے

دارالاشاعت نگار سے ایک نئے رسالہ کا اجرار

اس رسالہ کا نام جِنّ ہوگا۔ جِنّ کے لغوی معنی ہین ہر اس چیز کے جو حواس ظاہری سے پوشیدہ ہو: اس سے اس رسالہ مین تمام ان امور و واقعات سے بحث ہوگی جن کا تعلق "ماورار عالم حواس" سے ہے اور جس مین جنّات ارواح خبیثہ مابعد الطبیعیات، روحانیات، وغیرہ سب شامل ہین۔ اس مین نہ صرف جنات وغیرہ کے معتبر واقعات وحکایات ہونگے، بلکہ ان پر تنقید بھی ہوگی، عالم ارواح و روحانیت کے متعلق جدید ترین تحقیقات و معلومات بھی ہونگی، اور "حیات بعد الممات" کے متعلق اس وقت تک جو کچھ دریافت ہو چکا ہے اور ہوتا جا رہا ہے وہ بھی درج ہوتا رہیگا۔

اس رسالہ کی تقطیع $\frac{20 \times 26}{8}$ ہوگی اور ۲۵ سطر کے مسطر پر دو کالم مین باریک خط سے لکھا جائیگا۔ حجم فی الحال دو جزو ہوگا جسمین ۸ صفحات مستقلاً علمی تحقیقات کے لئے وقف ہونگے۔ اس رسالے مین ارواح خبیثہ اور جنات کے جتنے واقعات درج ہونگے ان سب کو مصور پیش کیا جائیگا جس کے لئے ایک آرٹسٹ کی خدمات مستقلاً حاصل کی گئی ہین۔ رسالہ کی سالانہ قیمت چہار تجویز کی گئی ہے اور ایک سال سے کم مدت کے لئے چندہ قبول نہ کیا جائیگا

جن حضرات کو اس دنیا سے دلچسپی ہو وہ براہ کرم اپنا پتہ بھیجدین تاکہ بعد اشاعت رسالہ کا نمونہ اُن کے پاس روانہ کیا جائے اس کے ساتھ یہ استدعا بھی ہے کہ اگر کسی شخص پر اس کی زندگی مین کوئی واقعہ ایسا گزرا ہے جسے وہ جنات یا بھوت پریت سے منسوب کرتا ہے تو براہ کرم اس کو قلمبند کر کے روانہ کردے زبان و تحریر کی پرواہ نہ کیجئے یہان اس کو درست کر لیا جائے گا اور واقعہ کے مطابق تصاویر طیار کر لی جائین گی۔ لیکن اس کا خیال رہے کہ صرف اپنا تجربہ و مشاہدہ پیش کیا جائے، دوسرون سے نقل کی ہوئی روایت نہ ہو۔

پہلا پرچہ جنوری سنہ ۳۰ء کے نگار کے ساتھ ہی ساتھ شایع ہو جائیگا

مینیجر نگار۔ لکھنؤ

جھوٹ

"تم جھوٹی ہو، خدا کی قسم بالکل جھوٹی ہو!!"

"پھر اتنا کیون چیخ رہے ہو، کیا محلہ والون کو بھی اپنے قول کا گواہ بنانا چاہتے ہو!"

یہ بات بھی جھوٹ تھی، اس لئے کہ مین چیخ ہی نہین رہا تھا، بالکل آہستہ آہستہ باتین ہو رہی تھین، اُسکی کلائی میری گرفت مین تھی اور مین بالکل عاشقانہ لہجہ مین اُس سے مخاطب تھا۔ ہان یہ بات مینے بھی محسوس کی کہ "جھوٹ" کا لفظ بار بار سانپ کی پھنکار کی طرح میری زبان سے نکل رہا تھا

"آہ! مجھے تم سے کتنی محبت ہے؟!" اُسنے دردآمیز لہجہ مین کہا "تمھین اسکا بالکل یقین نہین آتا۔ آخر مین کس طرح باور کراؤن"

مگر جب مینے اُسے قریب کھینچ کر اپنی آغوش مین لینا چاہا تو وہ تیتری کی طرح اُڑ گئی۔ مین نے برآمدہ کے اندھیرے سے نکلکر اُس کمرے تک اُسکا تعاقب کیا جہان ابھی تک رقص و سرود کی محفل گرم تھی، مگر دروازے کے پاس پہونچکر مین ٹھٹک گیا۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے اندر بلا لیا

کئی جوڑے مصروف رقص تھے، مجھسے نہ کوئی مخاطب ہوا، نہ مجھے رقص کی دعوت دیگئی، سب کی نگاہون مین شاید ایک مین ہی ایسا شخص تھا جو اجنبی خیال کیا جا رہا تھا اس لئے مینے بھی سب سے علیحدہ ایک گوشے مین سازندون کے قریب بیٹھنا مناسب سمجھا۔ تابنے کی سماعت آزما نفیری کا منھ بالکل میرے سر کے قریب تھا۔ اُسکی آوازسے کانون کے پردے پھٹے جاتے تھے، مگر پھر بھی مین اس طرح خاموش بیٹھا رہا گویا موسیقی سے مجھے انتہائی رغبت ہے

ہر دس پانچ منٹ کے بعد ایک سفید، معطر، سایہ میرے پاس ہو کر گذرتا تھا ——— یہ وہی تھی ——— مجھے معلوم نہین کہ آیا وہ کس ترکیب سے دوسرون کی نگاہین بچا کر پروانہ وار آتی تھی اور مجھسے اظہار محبت کر جاتی تھی۔ البتہ اتنا احساس ہے کہ ایک لمحہ کیلئے، محض چشم زدن کیلئے اُسکے سڈول شانے میرے شانون سے مس ہوئے، ایک لمحہ ہی کیلئے میری نگاہین اُٹھین، اور مجھے ایک بلورین گردن، چمکدار لباس کا سا دھوکہ ہوا۔ پھر ایک بلورین چہرے کا خیال ہے ایسا بلورین چہرہ جس مین وفا و محبت بیک وقت موجود تھین، اور جسے حور شمایل سمجھکر بھی خیال مطمئن نہ تھا ——— یقین کیجئے بالکل یہ معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے زہرہ رقص کرتے کرتے تھک کر آ گری ہے

مینے اُسکی آنکھین دیکھین، وہ ہرنی کی آنکھون کی طرح بیقرار، شوخ اور کسی روشنی کی متمنی تھین۔ خوبصورتی کا مفہوم یقیناً اُنکی دلکشی کی تشریح نہین کر سکتا

دراز پلکون کے سایہ مین اُنکی گہری گہری سیاہ اور سراپا محبت پتلیان تھین ——— جسوقت میری نگاہ ملی اُنکی گہرائی سمندر کی طرح اتھاہ ہوگئی، جب مینے اُن پر غور کیا میرا قلب ساکن ہوگیا۔ اس مین مطلق مبالغہ نہین، ممکن ہے کہ یہ وقفہ لمحہ بھر یا اس سے بھی کچھ کم رہا ہو مگر وہ زندگی کا یہی لمحہ ہے جس مین مینے کائنات کی گردش کا تعلق حسین پتلیون کی لرزش سے محسوس کیا ہے صرف محسوس ہی نہین بلکہ اچھی طرح اپنی آنکھون سے دیکھا ہے!

ہراس و مجبوری کی ایک مسلسل کشمکش لئے ہوئے میری روح کشان کشان اُنکی نگاہون مین جذب ہو رہی تھی۔ یہانتک کہ مین اپنی ہستی سے بھی بیگانہ ہوگیا، ——— بے بس، بے یار و مددگار، قریب قریب مُردہ۔ زندہ تو یقیناً نہ تھا

دیکھتے دیکھتے وہ پھر فاختہ کی طرح اُڑ گئی، اس مرتبہ میری روح بھی اُسی کے ساتھ تھی

ہال مین ایک کشیدہ قامت، خوشرو نوجوان کے ساتھ وہ مصروف رقص تھی، خدا معلوم وہ کون تھا؟ مین اُسکی ایک ایک چیز کو گہری نظرون سے مطالعہ کر رہا تھا۔ اُسکے جوتون کی ساخت، شانون کی بناوٹ، بالون کے لچھے، خوفناک تبسم خوش رنگ رومال غرض ہر چیز میری نگاہون مین کھٹک رہی تھی۔ لیکن وہ ایک شانِ استغنا کے ساتھ، لاپرواہی سے ادھر اُدھر نگاہین ڈالکر مجھے پامال کئے جا رہا تھا۔ اُسکی حرکات و سکنات سے ظاہر تھا کہ ارادتاً یا دلچسپی سے اُسنے کسی چیز کو بھی نہین دیکھا

مجھے اُسکی یہ آسودہ نگاہی دیوار مین پیوست کئے دیتی تھی، مین تباہ ہو رہا تھا۔ یہانتک کہ جس دیوار کے سہارے سے بیٹھا تھا رفتہ رفتہ مجھ مین اور اُس مین کوئی فرق نہ رہا

محفل مین روشنیان گُل ہونے لگین، ساز کی آوازین آخری گونج کے بعد خاموشی کے اتھاہ سمندر مین کھو گئین، مین چپکے سے اُٹھکر اُسکے پاس گیا اور آہستہ آہستہ کہنے لگا:۔

"چلو جلسہ ختم ہوگیا، مین تمھین گھر تک پہونچا دون"

مگر اُس نے بالکل معصومانہ انداز مین جواب دیا:۔

"اور میرا چچازاد بھائی کس کے ساتھ جائیگا؟"

یہ کہکر وہ مجھے خالی کمرے مین لیگئی اور مسلسل بوسون سے میرے لب بند کر دیئے۔ جب وہ رخصت ہونے لگی تو مینے چپکے سے کہا:۔

"تم جھوٹی ہو؟"

"پھر وہی،" اُسنے مسکرا کر کہا "کل آؤنگی تم وہین ملنا"

یہ کہا اور اجنبی کے ساتھ چل دی

جسوقت مین گھر کی طرف روانہ ہوا، اچھا خاصہ صبح کا وقت ہوگیا تھا۔ بازار بند تھے اور سڑک پر صرف دو آدمیون کے علاوہ کسی کی صورت نظر نہ آتی تھی ——— ایک مین دوسرا میرا کوچبان

سرد ہوا سے بچنے کے لئے کوچبان کسی قدر پیچھے جھک گیا تھا اور اُسکے لمبے برساتی کوٹ کا دامن میری پیشانی پر لٹک رہا تھا۔ وہ علیحدہ کچھ

سوچتا جا رہا تھا میں علیحدہ اپنے خیال میں منہمک تھا۔ اور بلند دیواروں کے پیچھے تمام شہر سکون و اطمینان کی میٹھی نیند لیتے ہوئے علیحدہ اپنے خواب و خیال میں مدہوش تھا۔ اسوقت میری آنکھوں میں اُسکی بھولی بھولی صورت تھی اور خیال میں اُسکا ——— جھوٹ، حیات و ممات کا فلسفہ بھی بعض اوقات اس خیال میں جگہ نکال لیتا اور نگاہوں میں پھر اسقدر غلبہ پالیتا کہ مکانوں کی بلند اور کشیدہ قامت دیواریں جو صبح کی دھندلی روشنی میں بتدریج نمایاں ہو رہی تھیں۔ موت کی مختلف ڈراونی صورتیں معلوم ہونے لگتیں جس طرح لاش ٹھنڈی ہو کر اینٹھ جاتی ہے اسی طرح وہ بھی صرف ایک حالت میں ساکت و صامت ہو کر رہ گئیں تھیں

مجھے کوچبان کے خیالات کا اندازہ نہیں ہو سکا اور نہ یہ معلوم ہو سکا کہ بھاری دیواروں کے پیچھے سونے والے کیا خواب دیکھ رہے تھے مگر پھر انھیں کو میرے خواب و خیالات کا کیا اندازہ تھا

اس حالت میں میری گاڑی خالی سڑک پر برابر راستہ طے کرتی جا رہی تھی۔ سورج کی ابتدائی شفقی شعاعیں، مکانوں کی چھتوں اور روشندانوں کی بلند چوٹیوں کو رفتہ رفتہ نمایاں کر رہی تھیں۔ اور ماحول کی ہر شے میں ایک ایسی زندگی پیدا ہو رہی تھی جو احساس و حرکات سے مطلقاً بے نیاز ہو کوئی معطر سفید چیز سایہ کی طرح میرے برابر سے گذر گئی جسوقت وہ میرے برابر سے گذری اکسی کے بے محابہ مردانہ قہقہہ کی آواز میرے کانوں میں آئی: ——— ہا-ہا- ہا-ہا ہا- ہا

(۲)

اُسنے مجھسے جھوٹا وعدہ کیا تھا، میںنے صبح سے شام تک انتظار کیا مگر اُسے نہ آنا تھا نہ آئی

ایک دھندلی، کہر نما تاریکی۔ رفتہ رفتہ فضا پر غالب آگئی۔ میں نہیں بتا سکتا کہ دن کی روشنی شام کی سنہری شفق میں اور شفق رات کے تاریک دھندلکے میں کب اور کس طرح تبدیل ہو گئی۔ میرے لئے تو انتظار کی تمام گھڑیاں ایک طویل رات سے مشابہ تھیں ایسی طویل رات جسمیں تارے کی روشنی کا بھی نشان نہو

میں نے تمام دن متاہلانہ چہل قدمی میں گذار دیا، میں نہ اُس مکان کے قریب گیا جہاں وہ رہا کرتی تھی۔ نہ اُس خوشنما دروازے سے گذرا جو زرد بارجے کے سایہ میں میری نگاہوں کو خوش آمدید کہا کرتا تھا۔ دن بھر اپنے گھر کے سامنے والی سڑک پر جہاں سے اُسکا دروازہ اور بارجہ دونوں نظر آتے تھے ایک معینہ رفتار اور یکساں قدموں سے ٹہلتا رہا۔ اس طرح کہ جب آگے بڑھتا دروازہ پر بلا کسی خاص ارادے کے نگاہیں جمی رہتیں اور جب واپس ہوتا تو اکثر راستہ میں ٹھہر کر مُڑ مُڑ کر دروازے کو دیکھ لیتا ——— یہانتک کہ برف گرنے لگی، اور اُسکی تیز خنکی جابجا نشتر دن کی طرح میرے چہرے پر چبھنے لگی

نشتر! ——— ہاں ایسے خطرناک، ایسے تیز، ایسے سرد ایسے جان خراش نشتر جو رفتہ رفتہ میرے دل میں پیوست ہو گئے۔ اور اُسے چھید چھید کر اتنا مجروح کر دیا کہ سوائے افسردگی، انتقام اور غم و غصہ کے اُسمیں کچھ نہ رہا

انتظار کی گھڑیاں قیامت بنکر گذر رہی تھیں، مگر اُسکا کہیں پتہ نہ تھا میں برابر سرکاری لالٹین کی روشنی میں کچھ ڈھونڈھ رہا تھا کچھ عرصہ کے بعد ایسا محسوس ہونے لگا گویا میرے جسم میں بھی کوئی شے چراغ کی لو کی طرح جل رہی ہے ———!

جس راستہ پر مین ٹہل رہا تھا اُسپر آمد و رفت بہت کم تھی بعض اوقات میرے سامنے دور سڑک پر کوئی انسانی صورت نظر آتی اور جون جون قریب ہوتی جاتی اسکا قد بڑھتا ہوا معلوم ہوتا۔ یہانتک کہ وہ خاموشی سے ایک تاریک سایہ کی طرح میرے برابر سے گزر کر بتدریج گھٹنا شروع ہوتی اور سفید عمارت کی دیوارون کے نیچے پہونچ کر رفتہ رفتہ نگاہون سے غائب ہو جاتی

پھر جب مین واپس ہوتا، تو انھیں دیوارون کے پاس سے کوئی شخص برآمد ہوتا، میرے قریب سے گذرتا اور اُسی طرح گھٹتے گھٹتے کہر آلود فضا مین نگاہون سے غائب ہو جاتا

لمبے لمبے لبادون مین لپٹے ہوئے یہ غیر متشکل مجسمے ایک دوسرے سے اسقدر مشابہ تھے اور سڑک پر جابجا ٹہلتے ہوئے اس طرح نظر آتے تھے گویا کسی مخصوص گروہ کے صدہا آدمیون نے راستہ پر پہرہ لگا لیا ہے

مین اب بھی اُسکا انتظار کر رہا تھا مگر بے سود۔ انتہائے غم و افسوس سے میری آنکھون مین آنسو ڈبڈبانے لگے اور بے تحاشہ رونے کو جی چاہنے لگا۔ انگلیان از خود کسی درندے کے پنجون کی طرح اینٹھنے لگین اور یہ محسوس ہونے لگا گویا وہ کسی زہریلے سانپ کو جسکی پھنکار سے جھوٹ کے شعلے نکل رہے ہون اپنی گرفت سے کچل دینا چاہتی ہین

اُدھر یہ خیالی سانپ میرے ہاتھون پر لپٹ رہا تھا اور رسّے کی طرح انھین جکڑ کر بار بار دل پر ڈنک مار رہا تھا۔ تا آنکہ اُسکے زہریلے اثر سے میرا سر ڈھلکنے لگا ——— دُنیا کی ہر چیز جھوٹ تھی

میرے عدم و وجود کی حد فاصل جوشِ خیال مین ناپید ہو گئی، بعض اوقات یہ محسوس ہونے لگتا گویا مجھے کبھی زندگی سے کوئی واسطہ ہی نہین رہا، اور بعض مرتبہ یہ خیال ہوتا کہ زندگی در اصل نام ہی اُس کیفیت کا ہے جو مجھے حاصل ہے

اُسوقت یہ معلوم کرنا کہ در حقیقت مین معدوم تھا یا موجود میری قوت فیصلہ کے لئے ناممکن تھا ——— البتہ یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ "وہ" میرے عدم و وجود کی دونون حالتون مین ہمیشہ اور ہمہ وقت شریک رہی ہے۔ اُسے مجھپر حکومت کرنے کے لئے اور مجھے اُس کا محکوم بننے کے لئے من و تو کی بحث چھیڑنی پڑی ہے

اکثر مجھے اس خیال پر تعجب ہونے لگتا کہ اُسکا بھی مجھسے علیحدہ کوئی نام مجھ سے جدا کوئی جسم ہے۔ اُسکی ہستی بھی کسی مخصوص ابتدا یا انتہا کی رہین منت ہے - - - - - - - - - - - - اُسکا کوئی نام نہ تھا، وہ ہرگز مجھسے علیحدہ کوئی خاص شخصیت نہ تھی۔ میرے خیال مین تو وہ میری ہی شخصیت کا ایک ایسا فریب تھی جسے صرف جھوٹ بولنے تڑپانے اور کشمکش انتظار مین ڈالکر کبھی نہ آنے کے لئے قدرت نے تخلیق کیا تھا

مجھے معلوم نہین کیون اور کس بنا پر مجھے ہنسی آئی ——— مینے ایک طویل قہقہہ لگایا، کھٹکنے والے نشتر ولین اور پیوست ہو گئے۔ کچھ دیر بعد کانون مین یا تو میرے ہی قہقہہ کی بازگشت، یا کسی دوسرے کے خیالی قہقہہ کی آواز آئی ——— ہا-ہا-ہا- ہا!

مینے آنکھ اُٹھا کر سفید عمارت کی اُن کھڑکیون کو بغور دیکھا جنکے رنگین شیشون سے روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی تھی - - - - - -

وہ بھی اپنی سرخ سبز زبان مین مجھ ہی سے مخاطب تھین ۔ اور صاف کہہ رہی تھین: ——— "بیوقوف! وہ تجھے دھوکا دے رہی ہے"

مچھلی کی طرح کھلا رہی ہے، تو گھنٹوں سے اُسکے انتظار میں ٹہل رہا ہے، برف اور طوفانی ہوا کی مصیبتیں جھیل رہا ہے مگر وہ، خوبصورت حسین جفا جو و بدہ جو، سفید ناگن اپنے عاشق کے ساتھ مصروف عیش و نشاط ہے۔ ایسے میں اگر تو بہادرانہ جذبۂ انتقام کے ساتھ یکایک اندر داخل ہو جائے اور اُس بے مروت ہستی کو جسے غلطی سے تو نے راحت روح سمجھ لیا ہے، قتل کر دے تو دُنیا جھوٹ سے پاک ہو جائے۔

مینے سختی سے اُس مٹھی کو بند کر لیا جس میں چاقو تھا اور قہقہہ لگا کر زیر لب کہا۔

"ہاں، ٹھیک ہے۔ میں اُسے ضرور مارونگا، جھوٹ کا دُنیا سے خاتمہ کر دینا ہی بہتر ہے"

لیکن کھڑکیوں نے مجھے غمگین نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا:۔

"تو اُسے کیا مار سکتا ہے؛ تیرے ہاتھ میں جو چاقو ہے وہ خود ایک فریب ہے اُسکے بوسوں سے زیادہ بے معنی فریب"

سڑک پر آمد و رفت بند ہو چکی تھی اور برف کے طوفان میں صرف ایک میں ہی ایسا شخص تھا جسے خانہ بدوش کہا جا سکتا تھا ورنہ ہر جاندار کو کہیں نہ کہیں پناہ مل گئی تھی

میں اور شاہراہ کی لالٹین کا بیکس شعلہ ——— بظاہر کائنات میں یہ دو چیزیں سردی کھانے اور غم و آلام اُٹھانے کیلئے بنائی گئی تھیں

قریب کے گرجا میں گھنٹہ بجا۔ اور اُسکی تیز، سماعت شکن آواز، ماحول کے اثر سے مضمحل ہو کر کانپتی ہوئی برف کی طوفانی فضا میں کھو گئی ——— ٹھیک اس طرح جس طرح کوئی بیمار آخری ہچکیاں لیکر دم توڑ دیتا ہے

مینے گھنٹے گننا شروع کئے، اور گن کر ایک قہقہہ لگایا ——— پندرہ بجے تھے ——!

گرجا اور اُسکا گھنٹہ دونوں پُرانے تھے، ہر چند کہ گھڑی ٹھیک وقت دیتی تھی لیکن گھنٹہ ہمیشہ بے تکا بجاتا تھا، بعض اوقات تو اتنا بے تکا کہ پادری صاحب کو مینار پر چڑھ کر اپنے ہاتھ سے اُسے روکنا پڑتا تھا۔

مگر اسوقت گرجا کے گھنٹہ کی آواز کسی کے لئے جھوٹ بول رہی تھی ——— یقیناً میرا مذاق اُڑا رہی تھی۔

گھنٹہ کی آخری آواز کے ساتھ سامنے والے سفید مکان کا دروازہ کھلا اور ایک کشیدہ قامت آدمی زینہ سے اُترتا معلوم ہوا۔ میں صرف پُشت دیکھ سکا مگر فوراً پہچان گیا، اس لئے کہ مینے یہی مغرور، سراپا لعنت صورت گذشتہ شام کو دیکھی تھی۔ اُسکی مطمئن چال سے قلبی مسرت جھلک رہی تھی، وہ کل شام کی بہ نسبت یقیناً اسوقت زیادہ مسرور تھا ——— میں بھی اسی دروازہ سے اکثر اسی قسم کی مستانہ روی کے ساتھ نکلا کرتا تھا ——— اُسکے ایک ایک قدم سے اس بات کی تصدیق ہوتی تھی کہ کسی نوجوان عورت کے جھوٹے بوسوں کے نشہ آور خیال میں مدہوش ہے

(۳)

مینے اُسے دھمکایا، ڈرایا، پھر خوشامد کی ہاتھ جوڑے اور کہا: ——— "خدا کیلئے مجھسے دورنگی نہ برتو، مجھے فریب نہ دو، جتنی بات ہو سچ سچ بتا دو!"

مگر وہ ایک بے لوث اور معصومانہ انداز سے اپنی بھوین چڑھاتے ہوئے مسکرائی اور حسین پتلیوں کی اتھاہ گہرائی سے وفا و محبت کا یقین دلاتے ہوئے مجھسے کہنے لگی :۔

"بھلا تمسے اور جھوٹ !"

وہ جانتی تھی کہ میرے پاس اُسکے جھوٹ کا کوئی باقاعدہ ثبوت نہین ہے اور میرے تمام شبہات ساری روح فرسا بدگمانیون کیلئے اسکا صرف ایک نقطہ، ایک جھوٹا فقرہ کافی ہے

مین اُسی فقرہ کا منتظر تھا۔ وہ اُسکی زبان سے بظاہر وفا و محبت کے رنگ مین رنگا ہوا لیکن درحقیقت اپنے مفہوم مین جھوٹ ادا ہوا:۔

"آہ ! مجھے تمسے کتنی محبت ہے ؟ ! کیا مین تمھاری ۔ ۔ ۔ ۔ نہین ہون ۔ مگر تمھین یقین ہی نہین آتا۔ خدا جانے کیا ہو گیا ؟ "

ہم قصبہ کی آبادی کے آخری کنارے پر رہتے تھے، اور برف سے ڈھکی ہوئی سفید سفید چوٹیاں کھڑکیون سے دکھائی دیا کرتی تھین، مگر اسوقت اندھیرے مین چھپی ہوئی تھین، ماحول کی ہر چیز پر رات نے ایک سیاہ غلاف ڈال دیا تھا۔ مگر جھیل چمک رہی تھی ——— بالکل اس طرح جس طرح گہری تاریکی مین کسی مردے کی کفنائی لاش

کمرے مین صرف ایک دھیمی لیمپ کی روشنی پڑ رہی تھی، مگر اُسمین بھی مردہ جھیل کا عکس نمایان تھا

"بتادو، خدا کیلئے مجھے سچ سچ بتادو، اسکی پرواہ مت کرو کہ مجھے صدمہ ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ مین اُسے سنکر مر ہی جاؤنگا۔ کوئی ہرج نہین جھوٹی اور فریب کار زندگی سے سچی موت بہتر! مجھے صرف ایک مرتبہ تم اپنے دل کی بات بتادو، پھر مین ہمیشہ کیلئے تمھارا چھوڑ دونگا "

مین جذبات کے طوفان مین اُس سے مخاطب تھا، لیکن وہ خاموش تھی، اور اُسکی بھولی بھالی مغموم نگاہین نشتر کی طرح میرے دلمین اُتری جارہی تھین، میری روح تڑپ رہی تھی اور مین درد و کرب کی مجسم تصویر بنا ہوا اُسکے سامنے کھڑا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بالاخر مینے پھر کہا:۔

"بتادو ! ——— دیکھو خدا کا واسطہ ! ورنہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مین ۔ ۔ ۔ تمھین قتل کر دو ۔ ۔ ۔ ۔ گا "

"کر دو" اُسنے اطمینان سے جواب دیا "بعض اوقات زندگی واقعی بار ہو جاتی ہے، اور آدمی عاجز آکر موت کے بہانے ہی ڈھونڈا کرتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تمھارے ہاتھ سے، زہے نصیب ! ——— مگر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُس نے ذرا رُک کر کہا

"جس خیالی حقیقت کی تمھین تلاش ہے، جو سچ تم معلوم کرنا چاہتے ہو وہ بھی تمھین معلوم ہو جائیگا، یا میری موت بھی تمھین مطمئن نہ کرسکے گی ؟" ——— مین بلا ارادہ اُسکے قدمون مین گر پڑا، اور انتہائے عاجزی سے گڑ گڑا کر کہنے لگا:۔

"خدا کیلئے ! " ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ! " اپنی جوانی کا صدقہ، مجھپر رحم کرو اور اپنے دلکی بات بتادو، صاف صاف کہدو کہ مجھے تمسے محبت نہین ہے "

اُس نے ازراہِ محبت میرے سر پہ ہاتھ رکھ دیا اور کہنے لگی

"اللہ رحم کرے! آج تمھین ہو کیا رہا ہے؟"

"رحم!" مینے ہاتھ جوڑ کر کہا "اتنو بتا دو!"

میری نگاہین اُسکی شفاف پیشانی پر پڑین اور مجھے خیال آیا کہ صرف اس نازک سے پردے مین اصل حقیقت چھپی ہوئی ہے، کسی دیوانہ خواہش کے ماتحت دل نے کہا ——— "اسے توڑ کر حقیقت معلوم کر لینا کتنا آسان ہے؟"

پھر خیال سینہ کی طرف منتقل ہو گیا، اُسکے نظر فریب اُبھار کے پیچھے، صاف دل دھڑکتا ہوا معلوم ہو رہا تھا، وہی جھوٹا، فریبی مکار اور دغا باز دل جسنے مجھے دیوانہ بنا دیا تھا مینے چاہا کہ اپنے تیز ناخنون سے اُسکے ٹکڑے ٹکڑے کر دون تاکہ اُس میں چھپی ہوئی حقیقت، وہ چیز جسے مین دل کی بات سمجھتا تھا جون کی تون معلوم ہو جائے ——— مگر نہین"

لیمپ کا ہلکا شعلہ رفتہ رفتہ بے نور ہو رہا تھا، اُسمین بھی کوئی حرکت نہ تھی، حقیقت کو وہ بھی چھپا رہا تھا۔

دیوارین بتدریج بڑھنے والی دھندلی دھندلی تاریکی مین مٹی جا رہی تھین مگر مجھ سے اُنھین بھی کوئی ہمدردی نہ تھی،

ہر چیز پر ایک قسم کی ویرانی، خوف، دہشت اور سوگ برس رہا تھا۔

"اللہ رحم کر! میرے اچھے "........" کی حالت پر رحم کر" اُسنے زیرِ لب کہا۔ لیمپ کے زرد شعلہ مین ایک قسم کی تھرتھری پیدا ہوئی، لحہ بھر کیلئے نیلی سی چمک نمودار ہوئی ——— اور گل ہو گیا۔

گہری تاریکی نے ہمین چھپا لیا

اب مجھے نہ اُسکا چہرہ نظر آرہا تھا، نہ آنکھین، صرف ایک ہاتھ میرے سر پر رکھا ہوا تھا اور اُس سے محبت کی ایسی گرمی سی لہر جسم مین سرایت کر رہی تھی کہ مین مدہوش تھا اور جھوٹ کا خیال خواب کی طرح دماغ سے محو ہو رہا تھا۔ مینے آنکھین بند کر لین اور اور خیال کو غور و فکر، احساس و عمل سے آزاد کر کے صرف اُس روح افزا لمس کی طرف منتقل کر دیا

وہ سچی تھی! ...... مین دیکھ رہا تھا کہ اسکی محبت حقیقی اور بے داغ ہے ——— !!

اندھیرے مین ہلکی ہوئی سی آواز مین کسی نے آہستہ آہستہ کہا:۔

"ذرا اور پاس آجاؤ .... مجھے ڈر لگ رہا ہے!"

پھر خاموشی .... وہی بے معنی خاموشی، اور پھر ...... وہی ہلکی ہلکی زیرِ لب گفتگو!

"تم کونسی سچی بات پوچھتے ہو؟ .... مجھے خود معلوم نہین میرے دلمین سوائے تمھارے خیال کے اور کونسی بھی بات ہے؟ ——— آہ! خدا کرے مین پہلے سے جانتی کہ تم اتنے سخت دل نکلو گے .... بس یہین رہو ——— دیکھو تو کتنی ڈراونی رات ہے؟!"

یہ کہکر اُسنے میرے سینہ مین اپنی آنکھین چھپالین۔

مینے نگاہ اُٹھائی تو تاریکی کھڑکیون سے دور ہوکر آہستہ آہستہ دیوار کے گوشون مین مجتمع ہو رہی تھی - اور رنگین شیشون کے پیچھے کوئی تہمت ہی طویل خوفناک سفید سفید چیز کفنائے ہوئے مُردے کا سا جسم اختیار کر رہی تھی ---- !

یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی کی بے نور، پتلیان ہین تک رہی ہین

خوف کیوجہ سے بیساختہ ہمارے جسم مین تھرتھری دوڑ گئی ہم اور زیادہ ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔ اُسکے ہلکے ہلکے الفاظ نغمہ کی طرح میرے دل و دماغ مین گونج رہے تھے:-

"دیکھو تو، کتنی ڈراؤنی رات ہے ؟ !"

(۴)

مینے اُسے قتل کر دیا!

جب وہ کھڑکی کے قریب، ایک بے حس اور بے جان مجسمہ کی صورت مین پڑی تھی مینے اُسکی لاش پر اپنا پاؤن رکھ دیا اور خوب ہنسا ---- یہ دیوانگی کی ہنسی نہ تھی ---- جی نہین! مین صرف اسلئے ہنس رہا تھا کہ اب میرا دل قرار پر تھا، اُسے پورا اطمینان و سکون حاصل ہو چکا تھا اور سینہ کی وہ مستقل خلش جسنے مجھے کرب مجسم بنا دیا تھا، اب کافور تھی۔

مینے ذرا جھک کر اُسکی بے نور آنکھون کو دیکھا:-

اُف وہ دلکش، روشنی کی شمعین، نیم وا آنکھین - ! وہ نرگسی سرشار پُر اسرار آنکھین ---- !

یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی موم کی گڑیا سے مستعار لیلی گئین ہین

مین اُنھین اُنگلیون سے چھو سکتا تھا، حسب مرضی کھول سکتا تھا، بند کر سکتا تھا، مطلق خوف محسوس نہ ہوتا تھا اسلئے کہ اُنکی اتھاہ گہرائیون مین اب مکر و فریب، اشتباہ و بدگمانی کا وہ جن موجود نتھا جو ایک زمانہ سے میرے سر پر سوار تھا اور جو مدتون سے میرا خون چوس کر پرورش پا رہا تھا

مین جسوقت گرفتار ہوا اُسوقت بھی ہنسا اور یہ بات اُن لوگون کیلئے جنھون نے مجھے گرفتار کرایا تھا قطعًا ناقابل برداشت ثابت ہوئی۔ وہ مجھے درندہ کہہ رہے تھے اور نفرت و حقارت کے ساتھ میری طرف سے منہ پھیر پھیر کر گالیان دے رہے تھے، شاید کوس بھی رہے ہون۔

دوسرے لوگ جو ذرا اجنبی تھے میری بدقسمتی سے متاثر ہو کر از راہ ہمدردی میری طرف بڑھ رہے تھے اور میرے استقلال و اطمینان پر حیرت سے انگشت بدندان تھے

"کوئی دیوانہ ہے" ان الفاظ مین وہ اپنے دلکو تسلی دے رہے تھے۔ اور فی الواقع صرف یہی الفاظ اس بے معنی صورت حال کی تشریح ہو بھی سکتے تھے۔ سب متحیر تھے کہ اسقدر وفا کیش عاشق ہو کر مینے کیون اپنے معصوم و بیگناہ معشوق کو قتل کر دیا۔ پھر یہی نہین اُسے قتل کرنیکے بعد تجھ ایسی کونسی مسرت ہے کہ کسی طرح ہنسی نہین رُکتی۔ صرف ایک خوش مزاج، آزاد منش شخص نے مجھے دوسرے الفاظ مین مخاطب کیا اور وہی الفاظ میری مسرت کو پامال کر گئے، مین مبہوت ہو کر رہ گیا

وہ آہستہ آہستہ ہمدردانہ لہجہ مین کہہ رہا تھا:۔

"آہ! اس غریب کی حالت کسقدر قابلِ رحم ہے!"

"بس خبردار! ایسی الفاظ زبان سے نہ نکالنا" مینے اُسے ڈانٹ کر کہا نہین کہہ سکتا کہ کن جذبات سے متاثر ہوکر مینے ایک جست کی اور اُس شخص کے سامنے جاکھڑا ہوا

مین یقیناً نہ اُسے مارنا چاہتا تھا، نہ سزا دینا چاہتا تھا مگر پھر بھی تمام مجمع جو مجھے دیوانہ اور مجرم سمجھ رہا تھا خوف و دہشت سے کانپ اُٹھا اور چیخین مار کر اس طرح پیچھے ہٹنے لگا کہ مجھے پھر ہنسی آ گئی اور مین نے خوب قہقہے لگائے

اسکے بعد جب لوگ مجھے اُس کمرے سے باہر لے گئے جس مین لاش پڑی تھی مینے باآوازِ بلند سب سے مخاطب ہوکر کہا:۔

"دنیا میں مجھ سے زیادہ کوئی مسرور نہین ہو سکتا، میں بیحد مطمئن ہون" اور یہ واقعہ تھا

(۵)

بچپن مین مینے عجائب گھر مین ایک چیتا دیکھا تھا۔ اُسے دیکھکر مین اتنا متاثر ہوا تھا کہ مدتون خیال مین اُسکی صورت قائم رہی وہ اُن درندون کے مانند نہین تھا جو تماشائیون کو بے معنی اور مبہم نگاہون سے تکا کرتے ہین۔ وہ ہمیشہ اُقلیدس کے اُصولون کے ماتحت ایک کونے سے دوسرے کونے تک خطِ مستقیم بناتا ہوا ٹہلا کرتا اور ہر مرتبہ ٹھیک اُسی نقطہ پر مڑا کرتا جہان سے چلتا تھا۔ صرف اُسی آہنی سلاخ سے جسم رگڑتا جو پانچوان قدم اُٹھانے کے بعد اُسکے شانے کے پاس ہوتی سر ایک فلسفیانہ انداز سے جھکا ہوتا اور آنکھین ٹھیک خطِ مستقیم پر سامنے دیکھا کرتین۔ ایک مرتبہ بھی ایسا اتفاق نہین ہوا کہ اُسنے کسی برابر کی چیز کو دیکھا ہو

دن بھر تماشائیون کا ہجوم اُسکے پنجرے کے سامنے لگا رہتا مگر اُسے اسکی پرواہ بھی نہ ہوتی تھی، وہ بدستور اپنی مقررہ رفتار سے پنجرے مین چہل قدمی کرتا رہتا اور تماشائیون کی طرف نگاہ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتا

آنے جانے والون مین سے اکثر اسکی حالت پر اظہارِ افسوس کرتے اور اکثر مسکرا کر چلے جاتے۔ لیکن جسوقت وہ تمام جانورون کو دیکھ کر عجائب گھر سے نکلتے تو بالعموم مڑ کر چیتے کے پنجرے کو ایک دو مرتبہ ضرور دیکھ لیتے۔ خدا معلوم یہ کونسی کشش تھی، بہت ممکن ہے اُنمین اور اس مقید درندے مین کوئی جنسی مناسبت یا صفت مشترک موجود ہو

اسکے بعد جب مین بڑا ہوا تو کتابون مین انسان کو "حیوانِ ناطق" لکھا دیکھا مینے جسقدر اس مین تحقیق کی چیتے کی مثال میرے سامنے آتی رہی۔ انسان واقعی حیوان ہے جسے حیوانیت کا جزو چیتے کے ساتھ تقسیم کیا گیا ہے۔ مگر جنگلی چیتون کے ساتھ نہین بلکہ اُن چیتون کے ساتھ جنھین "مقید رہنے اور کڑھنے" کیلئے تخلیق کیا گیا ہے

مین بھی اسوقت جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری مین بالکل اُسی چیتے کی طرح مقید تھا، مین بھی اُسی طرح کوٹھری کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ایک خطِ مستقیم پر ٹہلا کرتا اس دوران مین خیالات کے ہجوم سے دماغ اتنا بھاری ہوجاتا کہ

تمام دنیا کے مصائب کا بار مجھے اپنے سر پر معلوم ہونے لگتا

یہ تمام خیالات، ایک لفظ، صرف ایک خوفناک لفظ پر قائم تھے اور وہ لفظ "جھوٹ" تھا۔

جیل کی ہر کوٹھری سے، کوٹھری کی ہر دیوار سے، دیوار کی ہر اینٹ سے "جھوٹ" کی آواز میرے کانون مین سانپ کی پھنکار کی طرح آ رہی تھی اور میری روح پر ایک تاریک بادل کی طرح چھائی جا رہی تھی اب وہ معمولی سانپ کی پھنکار نہین معلوم ہوتی تھی، بلکہ کسی بڑے بھاری خونخوار اژدہے کی پھنکار تھی جو ہر طرف سے میری روح کو اپنی آہنی گرفت مین کس رہا تھا۔ اور جب مین درد کی شدت سے، ایک ایسا احساس لئے ہوئے گویا میرے تمام جسم پر سانپ رینگ رہے ہین چیخ اٹھتا تو زبان سے صرف "جھوٹ" پھنکار بنکر نکلتا، جس سے مجھے خود پر بھی یہ شبہ ہونے لگتا کہ کہین مین سانپ تو نہین ہو گیا ہون

مین ان ہی خیالات مین منہمک صبح سے شام تک ٹہلا کرتا، یہانتک کہ سُرخ پتھرون کا فرش میری نگاہ مین ایک دھندلی اور بے رنگ سی تاریک خندق معلوم ہونے لگتا، پیرون سے فرش کے لمس کا احساس جاتا رہتا اور اکثر یہ محسوس ہونے لگتا گویا مین کسی کہر آلود فضا مین نہایت بلندی سے گرایا جا رہا ہوں۔

پھر میرا دل خوف سے اُچھلنے لگتا، اور اُس سے کراہنے کے لہجہ مین وہی پھنکار نکلتی جو اوپر سے، نیچے سے، آسمان سے، زمین سے، درختون سے، اینٹوں سے، غرض کائنات کی ہر چیز سے بازگشت ہوتی ——— اس طرح گویا وہ کسی دوسری دُنیا سے ہزار ہا منزلین طے کرکے کہر اور برف مین لڑکھڑاتی ہوئی مجھ تک پہونچ رہی ہے۔

مجھے یقین تھا کہ اسی مدہم پھنکار کے پردے مین ایک ایسا تیز طوفانی جھونکا ہے جو درختون کو جڑ سے اُکھاڑ کر پھینک سکتا ہے لیکن مجھ تک پہونچنے مین وہ صرف اس زیر لب کہے ہوئے آہستہ لفظ کی صورت اختیار کر لیتا ہے

"جھوٹ"

اس ذلیل لفظ نے مجھے برافروختہ کر دیا، اور مین نے زور سے فرش پر اپنا پاؤن مارتے ہوئے کہا ———

"کوئی جھوٹ نہین ہے! .... مینے جھوٹ کا خاتمہ کر دیا ہے!"

یہ کہکر مین قصداً دوسری طرف مخاطب ہو گیا مگر بیکار، جس جواب سے ڈرتا تھا وہی جواب خاموشی کے ساتھ فرش کی خوفناک خندق سے برآمد ہوا:-

"جھوٹ!"

آہ!...... اب مجھے احساس ہوتا ہے مینے بڑی سخت غلطی کی کہ جھوٹی عورت کو قتل کر دیا لیکن اُسکے جھوٹ کو بنا دیا-!

پس عوام کو میری یہ نصیحت ہے کہ ہرگز کسی جھوٹ یا فریب کار عورت کو قتل نہ کیا جائے تاوقتیکہ استدعا و التجا سے جبر و تشدد سے جس طرح بن پڑے اُسکی دلی کیفیت نہ معلوم کر لیجائے۔

کوٹھری مین مسلسل ۲۷ گھنٹہ چہل قدمی کرنے کے بعد مین اس نتیجہ پر پہونچا ہون

(۶)

وہ جگہ جہان اُسنے ہر بات کے ساتھ اپنا جھوٹ بھی چھپا لیا ہے نہایت اندھیری، اور خوفناک ہے ——— مگر مینے ارادہ کر لیا ہے کہ وہان بھی اُسکا پیچھا نہ چھوڑون، خدا کے سامنے اُسے پیش کرونگا اور اُسکے قدمون پر گر کر روؤنگا، وہان تو کوئی بات نہین چھپ سکتی۔

خدا میرا انصاف کریگا!

لیکن خدا!؟ اوہو........ خدا ——— یہ بھی جھوٹ، محض فریب، وہان بھی صرف یہی بے پایان تاریکی ہے اور صدہا صدیون، ہزارہا قرنون کا ایک لامحدود خلا! لیکن "وہ" وہان بھی نہین ہے ——— کہین بھی نہین ہے!

صرف جھوٹ اُسکی یادگار رہ گیا ہے، بالکل غیر فانی یادگار!!

فضا کے ذرات مین، دُنیا کی گردش مین، عقبیٰ کی تاریکی مین، وقت کی رفتار مین ہر جگہ جھوٹ ہی جھوٹ ہے فریب ہی فریب بھرا ہوا ہے۔ اور جب مین سانس لیتا ہون وہ ہوا کے ساتھ میرے پھیپھڑے مین داخل ہو کر سانپ کی طرح پھنکارتا ہے اور دلکو ڈس کر سارے جسم مین زہر ہی زہر پھیلائے دیتا ہے ——— نہایت ہی قاتل زہر!

آہ! حقیقت کی تلاش بھی انسان کی کتنی زبردست دیوانگی ہے؟ انسان کیون مجبور ہے؟!

کوئی نہین بتاتا ———!!

"سب فریب........ خدا کیلئے ——— مین مرا ——— لوگو مجھے بچاؤ!!"

طالب باغپتی

تصوف اسلام پر ایک مورخانہ نظر

(سلسلۂ سابق)

حصول علم کے دو طریقے وحی اور الہام کے امتیازی پہلو

امام غزالی فرماتے ہین، حصول علم کے دو طریقے ہین، ایک وہ جو مطالعہ اور غور و فکر سے حاصل ہوتا ہے، اور یہ علما کا طریقہ ہے، دوسرا وہ ہے، جو اچانک قلب مین داخل ہوتا ہے، مخلوق کو خبر بھی نہین ہوتی کہ یہ علم اسے کیونکر حاصل ہوا، کہان سے آیا۔ اور اسے کیون موقوف ہوا، یہ صرف عالم ملکوت کا تصور ہوتا ہے، جسے وہ اپنے قلب مین پاتا ہے، جب اس قسم کا علم اولیا، اللہ کو عطا کیا جاتا ہے، تو اسے "الہام" کہتے ہین، الہام کے لفظی معنی ہین "جذب کرنا" میکڈونلڈ کہتا ہے یہ لفظ صرف ایک جگہ قرآن مین، استعمال ہوا ہے، فالھمہا فجورھا وتقوٰیھا ہ (والشمس) لیکن نہین کہا جا سکتا ہے کہ اسکا استعمال قدیم معنی مین ہوا ہے، یا دینی اصطلاحی معنی مین۔ وحی اس علم اعلیٰ کو کہتے ہین جو انبیا کو عطا ہوتا ہے، وحی کے لفظی معنی "ترسیل" اور "ترقیم پیام" کے ہین الہام اور وحی مین فرق یہ ہے، کہ جو فرشتہ پیام علم لیکر آتا ہے، ملہم کی نظرون کے سامنے ظاہر نہین ہوتا، اسکے برخلاف وحی جب انبیا پر آتی ہے تو وہ فرشتہ کو دیکھتے ہین

قلب و نفس کے اسرار

میکڈونلڈ نے "رہروطریق کی تربیت" کے عنوان سے ایک مفصل باب ہی لکھا ہے۔ اس مین ایک جگہ لکھتا ہے ملاب مین امام غزالی کی تعلیم قلب کو پیش کرنا چاہتا ہون، مینے قلب کا ترجمہ انگریزی مین "دل" (Heart) کیا ہے، حالانکہ قلب و دل کے معانی مین خاص فرق ہے، انگریزی لفظ Heart کہنے سے مغاجذبات، تاثرات، خواہشات اور وجدان کے خیالات سامنے آجاتے ہین، اسمین بنیادی حیثیت سے عموماً جذبی خصوصیت پائی جاتی ہے، ذہنی یا عقلی خصوصیت کا اسمین کم حصہ ہوتا ہے، لیکن عربی لفظ قلب کے یہ معنی نہین، یہ زیادہ تر دماغ کا مستقر ہے، ایک مسلم شارح اسے "لطیفہ ربانیہ" سے نامزد کرتا ہے، . . . . . . جو ایک غیر مادی عنصر ہے اور عالم غائب سے متعلق ہے، امام غزالی ماہیت قلب کی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہین کہ اب قلب کے متعلق مزید مباحث نہین پیش کئے جا سکتے قلب کے متعلق مزید سوالات عملی سائنس کے بجائے تخئیلی سائنس سے علاقہ رکھتے ہین، حیات عملی کا مقصد صفات قلب کا جان لینا ہے، اسکی ذاتی اور طبعی ماہیت کی شرح غیر متعلق بحث ہے، اسمین بھی روح کا سا سوال پایا جاتا ہے، جس پر آن حضرتؐ نے سکوت کیا ہے تاہم شارح لکھتا ہے، کہ قلب ایک "روح عقلیہ" ہے روح اسکا داخلی حصہ ہے، اور روح حیوانیہ اسکا مرکب ہے، صرفی حیثیت سے "نفس" کے معنی سانس کے ہین، اور عبرانی مین لفظ "نفش" اسکا مترادف ہے، جسکا ترجمہ بائبل مین روح اور بعض اوقات

سانس، زندگی اور خواہش (معاندانہ ماہر) کیا گیا ہے، میکڈونلڈ کے نظریہ "نفس" کے متعلق میڈیم بلاوٹسکی کی بھی یہی تحقیق ہے، جو اسکی قابل قدر کتاب (Isis unveiled) "خدائے مکشوف" مین پائی جاتی ہے، اسکے بعد میکڈونلڈ نے امام غزالی کے وہ مباحث پیش کئے ہین، جو انہون نے قرآن کے مختلف مقامات مین لفظ نفس کے مختلف استعمال کے متعلق لکھا ہے قرآن مجید مین اسکے تین خصوصیات بتائے گئے ہین، مطمئنہ، لوامہ اور امارہ (فجر، قیامہ، یوسف)

"صوفی کی وجہ تسمیہ اور تاریخ تصوف پر مشرقی و مغربی علما کے نظریات"

قبل اسکے کہ شریعت اسلامیہ کے صوفیانہ عناصر پر روشنی ڈالی جائے، یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تصوف کے متعلق اس عالمانہ اور محققانہ بحث کی تلخیص کر لیجائے جو لفظ "صوفی" کے ماتحت انسائیکلوپیڈیا آف رلجن اینڈ اتھکس[۵۱] مین پائی جاتی ہے، ہر چند تاریخ تصوف کے متعلق گزشتہ اوراق مین ایک حد تک بحث ہو چکی ہے، لیکن انسائیکلوپیڈیا کے مفصلہ ذیل مقالہ مین بعض اہم معلومات پائے جاتے ہیں

بعضون کا خیال ہے، کہ یہ صف سے مشتق ہے، جسکا مفہوم یہ ہے کہ صوفیہ تعلقات الٰہیہ مین شریک اول صف ہین، بعضون نے اسے "اہل صفہ"[۵۲] سے منسوب کیا ہے، القشیری اور دوسرے صوفیہ ان تمام تعبیرات مین کسی کو تسلیم نہین کرتے، ابو نصر السراج نے تسلیم کیا ہے کہ یہ لفظ صوف سے مشتق ہے (بحوالہ کتاب اللمع مرتبہ نکلسن) جاسف وان ہیمر کی تحقیق ہے کہ صوفیہ ہندوستان کے (Gymnosophists) سے متعلق ہین اور یہ کہ "صوفی" اور "صفا" دونو یونانی الفاظ (σοφός اور σοφία) کی طرح ایک ہی مادہ سے ہین نالڈک نے اسکی تردید کی ہے لیکن عہد جدید کے ایک عالم اڈلبرٹ مرکس نے وان ہیمر کے نظریہ کی تائید کی ہے، نالڈک نے جو اسٹراسبرگ یونیورسٹی ..... مین عربی کا پروفیسر تھا، ۱۸۹۴ء مین مسئلہ کو حل کر دیا، اسنے دکھایا کہ لفظ σοφός آرمی Aramaic

---

[۵۱] انسائیکلوپیڈیا مین جو طویل مقالہ ہے، وہ مشرق اور مغرب کے مشاہیر کی علمی تصنیفات سے مستفاد ہے، چنانچہ مقالہ نگار نے ماخذ کا تذکرہ کرتے ہوئے، عبد القادر جیلانی، حلاج، ابن طفیل، رومی، ابن عربی، شعرانی اور سہروردی کے اسمائے گرامی لکھے ہین، مقالہ نگار نے جرمنی، انگلستان، فرانس کے مشہور مستشرقین کی تصنیفات سے بھی استفادہ کیا ہے، اس سلسلہ مین اسنے پروفیسر گولڈزہر، ڈی ایس مارگولیتھ، ایچ فرنیک، آر ہارٹمین وغیرہ کی کتابونکا بھی گہرا مطالعہ کیا،

[۵۲] اہل صفہ عہد نبوت کی وہ جماعت صحابہ تھی جو غربت اور افلاس کے باعث مسجد نبوی کے نزدیک ایک چبوترہ پر اقامت گزین رہتی، اور دنیوی سے انہین کوئی تعلق نہ تھا وہ ہمیشہ تلاوت قرآن، اور عبادت مین مشغول رہتے

[۵۳] "انسائیکلوپیڈیا آف رلجن اینڈ اتھکس" مین لفظ تھیا سفی کے ماتحت مقالہ نگار نے عالمانہ اور محققانہ بحث کرتے ہوئے ہندوستانی تصوف کے چار ماخذ قرار دیتے ہین، اپنشید، ویدانت، سانکھیہ (فلسفہ) یوگا (فلسفہ) اور اسکے بعد جین اور بدھ مذہب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کس طرح تھیاسفی (ہندی) مذہب کی شکل مین رونما ہوئی،

میں بھی نہیں پایا جاتا۔ اسلئے عربی زبان میں پایا جانا قرین قیاس نہیں، دوسری بات یہ ہے کہ آریائی اور عربی دونوں زبانوں (θεοσοφος اور σοφος) پائے جاتے ہیں، عربی میں یونانی حرف "σ" کی جگہ پر حرف سین استعمال ہوتا ہے اگر وان ہیمر کا نظریہ صحیح ہوتا تو لفظ صوفی میں پہلا حرف "صاد" کی بجائے "سین" ہوتا، نالڈیک نے یہ بھی دکھایا کہ لباس "صوف" ادب کی ابتدائی کتابوں میں پایا جاتا ہے، جسکے متعلق یہ بھی ہے، کہ اسے وہ شخص پہنتا تھا، جو تارک الدنیا ہوتا، فارسی زبان میں تارک الدنیا درویشوں کے متعلق "پشمینہ پوش" کا لقب پایا جاتا ہے، یہ مسیحی راہبوں سے لیا گیا، جب حماد بن سلمی (۱۶۷ھ) بصرہ میں آئے تو انھوں نے فرقد السنجی سے جو پشمینہ (صوف) کا لباس پہنے ہوئے تھا کہا کہ یہ لباس اتار دو، چونکہ اسے نصاری پہنتے ہیں۔ قشیری کا بیان ہے، کہ اسکا رواج ۲۰۰ھ (۸۱۵ء) میں ہوا السراج کا خیال ہے۔ کہ اہل بغداد نے اسے ایجاد کیا، ہر چند "صوفی" کی وجہ تسمیہ کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ موجود نہیں، لیکن یہ بھی محض فضول گوئی ہے، کہ یہ اصطلاح آن حضرت کے زمانہ سے متعلق ہے، یا بعثت اسلام سے قبل پائی جاتی تھی لیکن اسکا رواج دوسری صدی ہجری کے اخیر میں ہوا، جبکہ زاہدانہ زندگی سے صوفیانہ زندگی کی طرف رجحان ہو رہا تھا، تیسری اور چوتھی صدی کے صوفیہ خود کو آن حضرت صلعم کے سچے متبعین میں شمار کرتے تھے، سب سے پہلا مصنف جس نے عربی زبان میں لفظ "صوفی" استعمال کیا جاحظ بصری (۸۶۹ء) ہے

اسلام میں تصوف کی ابتدا، ہملوگوں کے سامنے اس عہد کی یاد تازہ کر دیتی ہے، جبکہ زہد کی تحریک شروع ہوئی، جو عموماً ساتویں صدی میں مسیحی اثرات کے ماتحت تھی، اس تحریک میں بہتیرے زاہدوں کا نام پایا جاتا ہے، یہ تحریک مذہبی (اسلامی) پہلو رکھتی تھی اس میں مذہبی عنصر کا گہرا رنگ غالب ہے جسکی بنا مفصلہ ذیل افکار و عقاید پر تھی، ضعف انسانی، بے انتہا خوف خدا، اور اسکے ارادہ کی تسلیم کامل اس زمانہ میں صوفیہ کا کوئی منظم شیرازہ نہ تھا، اہل بصرہ نے تصوف کے تعلیمی عقاید کی بنیاد ڈالی، اہل شام نے اسکے ظاہری رنگ و روپ میں حصہ لیا حسن بصری فرماتے تھے کہ تصوف عاجزی کا نام ہے، نہ کہ لباس و غذا کا دوسری صدی کے صوفیہ پر مذہبی رنگ کا غلبہ تھا اور وہ مذہبی قانون کے پابند تھے، انہیں لوگوں نے غربت و افلاس فروتنی و انکساری اور ترک لذذات کا رواج دیا، اگر وہ خدا کی محبت رکھتے تھے تو اس سے زیادہ انہیں اسکا خوف تھا، وہ زہد یا تھیاسفی کے درمیانی مقام میں تھے، ان پر صحیح معنی میں رضا (Quietism) کی اصطلاح منطبق ہوتی ہے، اس ضمن میں مفصلہ ذیل اشخاص کا تذکرہ خاص اہمیت رکھتا ہے

"ابراہیم ابن ادہم جو بلخ کے شہزادہ تھے، جنکے واقعات زندگی گوتم بدھ سے ملتے جلتے ہیں شفیق بلخی جنھوں نے عقیدہ توکل کو ترقی دی، رابعہ جو بصرہ میں پیدا ہوئیں اور بیت المقدس میں وفات کی، معروف الکرخی بغدادی، وہ شخص ہیں جنکی پہلی تاریخی تعریف تصوف یہ ہے، کہ الٰہیات قبول کرنا، اور جو خدا کے مخلوقات کے ہاتھ میں ہے، اسے ترک کر دینا"

تیسری صدی ہجری میں تصوف قطعی طور پر ایک عہد جدید سے روشناس ہوتا ہے، ہر چند رضا (Quietism) و ریاضت (Asceticism) کے عقاید اب بھی محکم طور سے متداول تھے لیکن انکے مقابلہ میں تخئیل اور وحدت فی الکثرت کی تاریک ...

زیادہ زور پکڑ رہی تھی، لیکن موخر الذکر عقاید کو جو تصوف کی روح رواں ہین اس فتح کے باعث زہد و رضا کے ابتدائی صوفیانہ عقاید کا تفوق زمانی دنیا یا القین کو تصوف کا سبب آفرینش بنانا تاریخی غلطی ہے، لیکن اسکا پتہ لگانے مین کہ صوفیہ نے رضا سے وحدت فی الکثرت کا عقیدہ کیون اختیار کیا، ہملوگ نہین کہہ سکتے کہ صوفیہ نے غیر اسلامی عقاید سے جلب منفعت نہین کیا، مسیحیت فلاطونیت جدید اور بدھ مذہب کی اثر آفرینی، ناقابل انکار حقیقت ہے، ہرچند اس مسئلہ پر موضحانہ بحث کرنیکا موقعہ نہین لیکن اس نظریہ کو ثابت کرنے کیلئے کافی مواد موجود ہے، تیسری صدی کا تصوف تاریخ کے تمام صوفیانہ مسالک کی طرح مختلف اثرات کی پیداوار تھا، مثلاً، مسلمانون کے مسئلۂ توحید کی تخئیلی ترقی، مسیحی زہد و تصوف، عارفیہ، یونانی اور ہندی فلسفہ، بعضون نے غلطی کی ہے کہ انھون نے تصوف کو صرف ایک مسلک ویدانت یا فلسفہ اشراقی کا نتیجہ تصور کیا، انکا خیال ہے کہ تصوف، ایک سامی مذہب کے مقابلہ مین جو زبردستی منوایا گیا تھا آریہ قوم کے ذہنی ردعمل کا نتیجہ ہے

موجودہ دور کے علما نے کسی ایک مسلک کو ماخذ تصوف قرار دینے کے بجائے، مختلف اثرات کا مطالعہ کیا اور تشریح کی کہ کس مسلک نے کونسا عقیدہ تصوف مین داخل کیا، یہ اس ماحول کے اثرات ہین جسمین تصوف نے نشوونما پائی، اور اسمین وہ تمام سیاسی تمدنی، اور ذہنی حالات شامل ہین جو ارتقائے تصوف کی ممد ہوئین، مثلاً عہد امویہ کی تباہ کن خانہ جنگیان، ابتداء عہد عباسیہ کی ملحدانہ اور عقلی امواج، علما کی فرقہ دارانہ، اور فقیہانہ شورش پسندیان، تیسری صدی مین ارتقاء تصوف کے مفصلہ ذیل اسباب تھے۔

قدیم صوفیہ اپنی زندگی کا ہر قول، ہر فعل، اور ہر خیال مرضی الٰہیہ کے مطابق بنانے کی کوشش کرتے تھے اس اصول نے فطرتاً محبت الٰہی (جو رضا کی سب سے بڑی صورت ہے) اور "حال" (جو بالقصد یا بلا قصد زاہدانہ ریاضت کا نتیجہ ہے) کے عقاید پیدا کئے، ہرچند قدیم صوفیہ متشرع تھے، اسلام سے انکا تعلق ایساہی تھا جس طرح دور وسطی مین ہسپانوی صوفیہ کا تعلق رومن کیتھلک چرچ سے، جلد یا بدیر عشق و حال کے ایک مذہب کا مذہب اسلام کے مخالف ہونا ناگزیر تھا، حضرت رابعہ بصریہؓ نے ظاہر کیا کہ مجھے نہ تو جہنم کا خوف باقی ہے نہ بہشت کی طلب و امید، میرے دل مین محبت نبوی بھی نہین چونکہ مین خدا کی محبت مین اسقدر جذب ہون کہ کسی دوسری ذات سے محبت یا نفرت کیلئے میرے دل مین جگہ ہی نہین[۵۱] بتدریج خالق و مخلوق کے حجابات دور کر دئے گئے، توحید کی تعریف وحدت فی الکثرت قرار پائی، خدا کی ذات یکتا و بے مثل جو انسانی رسائی سے بالاتر تھی، "الحق" کی صورت مین تبدیل ہوگئی جسکی شان تجلی ہر مخلوق مین موجود ہے؛ یہانتک کہ صوفیہ کی وہ ہستی جو عالم حال مین "خودی" کے فنا اور شعور انفرادی کے اضمحلال کا نتیجہ ہے، ذات حق کا پرتو قرار پاگئی، اس تعلیم کو جسقدر بھی دوسرے معانی اور مجازی رنگ مین کیون نہ پیش کیا جائے

---

۵۱ اسی طرح کا ایک واقعہ تاریخ فرشتہ مین حضرت ابوالحسن خرقانیؒ کے متعلق بھی پایا جاتا ہے، محمود غزنوی نے آپ کو لکھ بھیجا تھا (اطیعوا اللہ واطیعو الرسول واولی الامر منکم (قرآن) اور اپنے حضور مین طلب کیا تھا، حضرت ابوالحسن خرقانیؒ نے جواب دیا کہ — اطیعو اللہ مین ایسا مستغرق ہون، کہ اطیعو الرسول سے شرم آتی ہے، (یعنی حق اطاعت رسول ادا نہ کرسکنے کے باعث شرمندہ ہون) اولی الامر مین کیون کر مشغول ہو سکتا ہون

لیکن یہ تصوف کی روح رواں ہے، اور خصوصیت کیساتھ غیر اسلامی مبادی سے حاصل کی گئی ہے، مرکس نے یقیناً زیادتی کی کہ اسنے اسے بالکل یونانی کہدیا، اور تخصیص بھی کردی کہ یہ تعلیم دیا نیسیوس کی تحریرون سے لیگئی ہے، ہرچند ممکن ہے کہ یہ تعلیم دیامیوس کی تحریرون اور ارسطو کی الہیات سے بھی اثر پذیر ہوئی ہو

ذوالنون مصری فرماتے تھے کہ سچا مرید وہ ہے، جو خدا سے بھی بڑھکر اپنے شیخ کی اطاعت کرے، (تذکرۃ الاولیا) امام غزالی وحدت فی الکثرت کا عقیدہ نہین رکھتے تھے، وہ کہتے تھے کہ خدا کی ذات جداگانہ ہے، وہ یکتا ہے بے نظیر ہے، صوفیہ نے قطب، نقبا اوتاد، ابرار ابدال کا عقیدہ اسمعیلیہ فرقے سے لیا ہے

صوفیانہ شاعری صوفیہ نے مذہبی جذبہ پیدا کرنیکا جو ظاہری عمل وضع کیا، اسمین سب سے زیادہ قوی اور اثر آفرین سماع ہے یعنی موسیقی اور غنا کی سماعت، بہت سی روایتین ایسی پائی جاتی ہین کہ کسی لڑکی نے یا صوفیہ ہی مین سے کسی نے ایک نظم کے چند اشعار پڑھ دیے، اور صوفیہ بیخود ہوگئے، انھین وجد آگیا، ایسے اشعار ظاہری معنی پر مبنی ہوتے تھے، صوفیانہ نشاط کا نتیجہ نہ تھے شاعر خود اشعار کو تاویلات پر مبنی نہین رکھتا تھا بلکہ صوفیہ اپنے ذوق مین اشعار کی صوفیانہ تاویلین کرتے تھے، "صوفیانہ شاعری" کا یہ حال نہین یہان شاعر اپنے کلام مین خود صوفیانہ رنگ پیدا کردیتا ہے، ہرچند ظاہری معنی کے اعتبار سے اشعار سرمایۂ تشبیب ہی کیون نہون؟ اور اکثر ایسا ہوتا ہے، کہ مجاز و حقیقت مین امتیاز کرنا مشکل ہوجاتا ہے، اور جب تک ہملوگ شاعر کے رجحان اور ارادہ سے واقف نہون، یہ بتانا دقت طلب امر ہے کہ عشق و محبت کے جو جذبات اسنے ادا کئے ہین وہ کسی انسانی محبت کا نتیجہ ہین یا حب الٰہی کا اگر یہ سوال کیا جائے کہ شعرا نے ایسا انداز کلام کیون اختیار کیا تو کہا جاسکتا ہے کہ انھون نے ولولہ اور وجد پیدا کرنیکی اس سے بہتر صورت نہین دیکھی کہ باطنی محبت کے انوار اطراف کو ظاہری محبت کے رنگ مین ادا کیا جائے

اس قسم کی صوفیانہ شاعری فارسی ادب کی شان مخصوص ہے، یہ رنگ سخن ابوسعید بن ابی الخیر کی رباعیات فریدالدین عطار، جلال الدین رومی، جامی کی شاعری اور گلشن راز محمود شبستانی مین پایا جاتا ہے، مغربی علما کیلئے عربی شاعری کا ایسا مذاق دلکش نہین، لیکن ابن الفرید کا کلام بہت عمدہ ہے، اور ابن عربی کے کلام مین ہرچند گہرے معانی پنہان ہوتے ہین لیکن بعض نظمین نفاست اداکے اعتبار سے بہت اچھی ہین، ترکی شعرا مین صوفیانہ رنگ سخن کے اعتبار سے نسیمی بہت اچھا شاعر ہے، ہرچند صوفیانہ شاعری مین نفاست بیان، و طرز اعلی پایا جاتا ہے لیکن اسے علمی صنعت کی پیداوار نہین کہہ سکتے، جلال الدین رومی، ابن الفرید اور ابن عربی کی بہترین غزلین عالم بیخودی مین کہی ہوئی ہین، جنھین ہملوگ (Automatic writing[a]) "تحریر غیر اختیاری" سے تعبیر کرسکتے ہین، ابن عربی کی شرح ترجمان الاشواق سے پتہ چلتا ہے کہ خود شاعر اپنے بعض کلام کے معنی نہین بتاسکتا،

---

[a] موجودہ علم روحانیات (Spiritualism) کی استقراء و ترقی مین یہ ایک نہایت حیرت انگیز مشاہدہ ہے۔

شریعت اسلامیہ کے صوفیانہ عناصر اور طریقت کی افراط و تفریط

ابھی تک جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ تصوف کے خارجی و داخلی مباحث سے متعلق تھا، اب یہاں دو بحثیں پیدا ہوتی ہیں، ایک یہ کہ آیا قرآن مجید میں مبادی تصوف کے متعلق مواد پائے جاتے ہیں یا نہیں؟ سرور کائنات اور صحابہ کی زندگی میں صوفیانہ ذوق کا پتہ ملتا ہے یا نہیں؟ علمائے مغرب کی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے، کہ لفظ صوفی اسلام کی پیداوار نہیں، انسائیکلوپیڈیا میں "صوفی" کی وجہ تسمیہ کے متعلق ایک رائے یہ بھی پائی جاتی ہے، کہ یہ "صفہ" سے لیا گیا ہے، یہ ایک قرین قیاس امر تھا کیونکہ ترک دنیا، غربت، رضائے الٰہی، عبادت، تعلقات ازدواجی سے انقطاع، یہ تمام باتیں عہد نبوت کے اصحاب صفہ میں پائی جاتی ہیں، لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی نظر انداز نہیں کیجا سکتی، کہ ابتدائے اسلام کی پریشان حالی کے باعث صحابہ کی ایسی جماعت تھی، وہ اسلامی قانون سمجھکر یا باوجود وسعت ایسی زندگی نہیں گزارتے تھے علاوہ بریں علامہ قشیری وغیرہ صوفی کی نسبت صفہ کو تسلیم نہیں کرتے، الغرض صوفیانہ ادبیات کا مطالعہ کرنیکے بعد قول راجح یہی معلوم ہوتا ہے، کہ یہ دوسری صدی کی پیداوار ہے، عہد نبوت و صحابہ میں اسکا وجود نہ تھا، اور پر لطف یہ ہے کہ مسیحی راہبوں کی دیکھا دیکھی اسلام میں اس بدعت نے رواج پایا، جیسا کہ میکڈونلڈ، نکلسن اور ابن خلدون وغیرہ نے لکھا ہے، خود قرآن مجید میں نہ کہیں صوف کا لفظ آیا ہے، نہ صوفی کا البتہ امام بخاریؒ نے القارعہ کی تفسیر میں حضرت عبد اللہ ابن مسعود کی یہ قرآۃ بھی نقل کی ہے کہ وہ کالعھن المنفوش کو کالصوف المنفوش پڑھا کرتے تھے، مگر صحیفہ میں یہ لفظ نہیں، صف اور صفا کا لفظ قرآن مجید میں پایا جاتا ہے، لیکن علما نے انکی طرف صوفی کی نسبت ہی نہیں دی، لہذا ایک متشرع لفظ "صوفی" ہی پر اعتراض رکھتا ہے، اور ایک غیر جانبدار محقق کے سامنے تو اسے اسلام کی طرف منسوب کرنا ایک تاویل بیجا سے زیادہ نہیں۔

اب میں اپنے عنوان بحث کو دو حیثیت سے واضح کرنا چاہتا ہوں، قرآن کی تعلیم، اور آنحضرت و صحابہؓ کے واقعات زندگی، موخر الذکر بحث کیلئے میںنے صرف احادیث کو ماخذ قرار دیا ہے، ورنہ تاریخی اور کلامیہ مباحث سے جو اوپر گزر چکے یہ بات ثابت ہو چکی ہے، کہ صوفیانہ تخیلات محض اسلام ہی سے نہیں لئے گئے، ہرچند میکڈونلڈ کی کتاب "ریلیجس ایٹیٹیوڈ اینڈ لائف ان اسلام"، میں صحابہ کرام کے زاہدانہ رجحان، (Asceticism) اور انسائیکلوپیڈیا آف ریلجن میں قرن اولی میں مسلمانوں کے مسلک رضا (Submission) کے متعلق فلسفیانہ مباحث پائے جاتے ہیں

نکلسن نے تو "صوفیائے اسلام" میں یہ بھی لکھا ہے، کہ اگر پیروان اسلام دنیا کے اور مسالک بدھ، مسیحی اشراقی وغیرہ سے الگ بھی رہتے، تو بھی اسلام کے اندر قرآنی تعلیم کی بنا پر تصوف کی کوئی نہ کوئی صورت ضرور رونما ہوتی، لہذا جب ایک محقق قرآن مجید پر اس نقطہ نظر سے غور کرتا ہے، تو وہ مفصلہ ذیل آیات کی اہمیت نظر انداز نہیں کرسکتا

(۱) زندگی کی بے ثباتی، موت کا ناگزیر ہونا، دنیا میں انہماک سے پرہیز،

کل نفس ذائقۃ الموت وانما توفون اجورکم یوم القیامہ فمن زحزح عن النار وادخل الجنۃ

فقد فاز ط وما الحیوۃ الدنیا الا متاع الغرور (آل عمران)

ہر نفس کیلیے موت ناگزیر ہے، اور تھیں قیامت کے دن تمھاری مزدوری ملیگی، اور وہ جو آتش دوزخ سے کنارے رہیگا اور جنت مین داخل ہوگا، خوش ہوگا، اور دنیا کی زندگی ایک دھوکا کی ٹٹی ہے

وانفقوا مما رزقنکم من قبل ان یاتی احدکم الموت فیقول رب لولا اخرتنی الی اجل قریب فاصدق واکن من الصالحین ہ ولن یؤخر اللہ نفسًا اذا جاء اجلہا (منافقون)

اور جوکچھ ہمنے تھیں روزی دی ہے اس مین سے خرچ کرو، اسکے قبل کہ تم مین سے کسی ایک کو موت آئے اور کہے خدا، اگر مجھے ایک مختصر میعاد زندگی اعطا کرے تو مین صدقہ دون، اور مین نکوکارون مین سے ہوجاؤن، اور جسوقت جس نفس کی قضا آگئی اسمین تاخیر نہوگی

ان اجل اللہ اذا جاء لا یوخر (نوح)

جب خدا کی میعاد مقررہ آتی ہے، تو اسمین فرق نہین ہوتا

وما کان لنفس ان تموت الا باذن اللہ کتابا مؤجلا ومن یرد ثواب الدنیا نوتہ منہا ومن یرد ثواب الآخرۃ نوتہ منہا وسنجزی الشاکرین (آل عمران)

کوئی نفس خدا کی اجازت کے بغیر نہین مرسکتا جسکی تعیین ہوچکی ہے اور جو اجر دنیوی کا خواہشمند ہے، اسے وہی ملیگا، اور اور جو اجر آخرت کا طالب ہے، اسے ثواب اخروی نصیب ہوگا اور قریب ہے کہ ہم شکر کرنے والونکو بدلہ دین،

یا ایہا الذین امنوا لا تلہکم اموالکم ولا اولادکم عن ذکر اللہ (منافقون)

اے ایمان والو ایسا نہو کہ تمھاری دولت، اور تمھاری اولاد تمھین ذکر الٰہی سے اپنی طرف پھنسالیں

یا ایہا الذین امنوا ان من ازواجکم واولادکم عدوًا لکم فاحذروہم وان تعفوا وتصفحوا وتغفروا فان اللہ غفور الرحیم۔ انما اموالکم واولادکم فتنۃ ط واللہ عندہ اجرٌ عظیم (تغابن)

اے ایمان والو! تمھاری بیویان اور تمھاری اولاد تمھارے دشمن ہین، ان سے واقف رہو اور اگر تم ان سے درگذر کرو اور انکے قصور معاف کردو، پس اسے بخشش کرنے والا، رحم کرنے والا ہے، تمھاری دولت اور تمھاری اولاد فتنہ ہین، اور اللہ کے پاس اجر عظیم ہے

زین للذین کفروا الحیوۃ الدنیا (بقرہ)

کافرون کو حیات دنیوی کی زینت ملی

زین للناس حب الشہوت من النساء والبنین والقناطیر المقنطرۃ من الذہب والفضۃ والخیل المسومۃ والانعام والحرث ط ذلک متاع الحیوۃ الدنیا واللہ عندہ حسن المآب ہ قل اؤنبئکم

بخیر من ذلکم　　(آل عمران)

(۲) ذکر و تسبیح کے متعلق قرآن مجید مین کثرت سے آیات پائی جاتی ہین، مثلاً

والذاکر واللہ قیاماً و قعوداً و علی جنوبھم　　(آل عمران)

اور کھڑے بیٹھے، اور پہلو پر اللہ کا ذکر کرتے ہین

فاذکرونی اذکرکم　(بقرہ)

پس تم میرا ذکر کرو مین تمھین یاد کرونگا

قرآن نے ذکر و تسبیح کی تعلیم دی ہے، لیکن اصطلاحات صوفیہ مین ذکر و تسبیح کے یہ معنی نہین، جو قرآن سے ثابت ہوتا ہے، اور جس پر خود سرور کائنات اور صحابہؓ کا عمل رہا، صوفیانہ "ذکر" سے متعلق خلوت، خاص تعداد وغیرہ ضروری ہین، جس کی ایک مثال اس سے قبل لین کی کتاب سے لکھی جا چکی ہے، ایسی جفاکشی نہ قرآن کی تعلیم تھی، نہ صحابہ کا دستور العمل، غالباً اسی غلو عبادت سے قرآن مین سرور کائنات کو منع کیا گیا ہے۔

قم اللیل الا قلیلاً نصفہ اوانقص منہ قلیلا۔ "مراقبہ ذات" ہندوستان کی چیز ہے، جو "دھیانہ" کے نام سے ہندی فلسفہ مین پائی جاتی ہے، دانہ تسبیح کا استعمال بدھ مذہب کے راہبون سے لیا گیا ہے، اسلام کو ان سے تعلق نہین خصوصاً مراقبہ ذات تو ایک قسم کی بت پرستی ہے، اور اگر صوفیائے کرام نے اسے جائز رکھا ہے تو پھر "پرستاران صنم" سے گلہ کیسا؟ اور "رد کفر" کے کیا معنی؟ بدھ مذہب کے بعض صوفیانہ پہلوؤن کے متعلق میڈیم بلیوٹسکی نے اپنی کتاب "تعلیم باطنی Secret Doctrine) مین روشنی ڈالی ہے، وہ لکھتی ہین

> "بودھی، ایک قسم کی وجد انگیزانہ کیفیت کا نام ہے، جس مین صوفی علم روحانیہ کے بلند نشیمن پر پہونچ جاتا ہے (غالباً صوفیانہ "معرفت" کا تخیل بھی ہندی فلسفہ کا منت کش ہے) گوتم بدھ کی تعلیم کے دو پہلو تھے، ظاہری اور باطنی بدھ، باطنی تعلیم اپنے مسترشدین کو ایک غار مین بمقام راجگیر دیا کرتا، جو گدھ کا قدیم پایہ تخت تھا، اور بعض علمائے آثار کا بیان ہے کہ فاہین (چینی سیاح) اسی کو "چیتا غار" لکھا ہے بدھ اس خاک اوڑھا تھا، جو آریہ قوم کا مسکن تھی۔ وہ ایک ہندو اور قومیت کے اعتبار سے چھتری تھا، اسلئے اسکی باطنی تعلیم یقیناً قدیم برہمنون سے مختلف نہ تھی، اسکا مذہب: بیسے ممالک چین، جاپان، سیام برما وغیرہ مین پہونچا جو ہندوستان کی مابعد الطبعی تخیلات قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے، اسلئے بدھ کی تعلیم کے متعلق ان ممالک مین غلط فہمیان پائی جاتی ہین"

اسی طرح اتحاد، وصل وغیرہ کی جو صوفیانہ تعبیرات ہین وہ بھی بڑی حد تک دنیا کے دوسرے ممالک سے اسلام مین داخل ہوئی ہین، میڈیم بلیوٹسکی جو عہد جدید مین صوفیانہ معلومات، بالخصوص ہندوستانی فلسفہ و تصوف کی ایک مستند محققہ مانی جاتی ہین اپنی دوسری کتاب "خدائے مکشوف" (Isis Unveiled) مین لکھتی ہین

"مذاہب عالم، مسیحی، یہودی، بت پرست اور بدھ مذہب کے پیرؤن مین ایک مستقل جنگ علم حقیقت کے فقدان کا نتیجہ ہے، حقیقت کا علم کم افراد کو ہے، بقیہ حضرات خواہش ہی نہین کرتے کہ قلب سے حجاب دور کرین، ہر ظاہری مذہب کا کرشمہ ایک بت ہے، ایک افسانہ ہے، اسکے سوا دوسری چیز ہو ہی نہین سکتا، کپیلہ برہمن یوگیون کو صرف اس بنا پر نشانہ طعن وتشنیع بنا تا ہے کہ وہ اپنے "شہود صوفیانہ" مین واحد واعلی کی دیدار کے مدعی تھے اسی اظہار خیال نے گوتم بدھ کو آیندہ نسلون سے ایک دہریہ کا خطاب دلادیا، فیثاغورث اپنے تصوف تاویلی اور مسئلہ تناسخ کی بدولت ایک چالباز کاذب متصور ہوا دوسرے فلاسفرا پولونیوس، اور فلاطینوس کا بھی یہی حال ہوا، جنھین لوگون نے "محویان خواب" کے نام سے یاد کیا، افلاطون پر اسکے معترضین نے بھی بیوقوفی کا الزام لگایا، اور یہانتک کہہ ڈالا کہ وہ اپنی زبان سے بھی ناواقف تھا، یہ کیون؟ اسلئے کہ اسنے "قوی العزیز" کے متعلق یہ کہا کہ اسکا علم دوسرے علوم کی طرف الفاظ کے ذریعہ حاصل نہین ہوسکتا، مین ایک جلد ان حضرات کے نام سے بھر سکتی ہون، جنکی تحریرون کو لوگون نے اس "حجاب" کو دور کرنیکے عدم استعداد مین صوفیانہ احماقت سے تعبیر کیا ہے"

تعلیم تصوف جہانتک حب الہی، اخلاق حسنہ، اعمال صالحہ، تزکیہ نفس، اور تصفیہ قلب سے متعلق ہے قرآن مجید سے کی گئی ہے، بقیہ اصول وقواعد رہبانیت، اعتزال، فنا وغیرہ اسلام کی چیزین نہین، اور نہ قرآن مین انکی تعلیم ہے،

صحابہ کرامؓ مین ایسے لوگ تھے، جو تیسری صدی کے صوفیہ کی طرح تارک الدنیا اور فانی ہونیکی تمنا رکھتے تھے، چنانچہ بخاری کی کتاب النکاح مین کثرت سے ایسے واقعات ملتے ہین، حضرت ابوہریرہؓ تعلق ازدواجی کو ہمیشہ کیلیے خیرباد کہنے کیلیے خصی ہونا چاہتے تھے، حضرت عبداللہ ابن عمرو بن العاص تمام دن روزے رکھتے اور ساری رات عبادت کرتے بیوی سے بھی کنارہ کش تھے جسکی شکایت دربار رسالت تک پہونچی، حضرت ابوذر غفاریؓ شام سے اس بنا پر بگڑ کر چلے آئے کہ انکے عقیدہ مین مال رکھنا جائز نہین تھا، اور امیر معاویہ اس عقیدہ کے مخالف تھے، حضرت ابوذر غفاریؓ بھی قرآن کی آیت سے استدلال کرتے تھے، مدینہ مین بھی آتے تو آبادی سے جدا رہے، بخاری کی کتاب النکاح مین پہلی طویل حدیث ہے جسمین مذکور ہے، کہ چند اشخاص آپس مین آنحضرتؐ کی عبادت وغیرہ کا تذکرہ کر رہے تھے ایک نے کہا مین مدت العمر روزے رکھونگا، دوسرے نے کہا نمازین پڑہتا رہونگا، تیسرے نے کہا شادی نہین کرونگا آنحضرتؐ یہ تمام باتین سن رہے تھے، باہر تشریف لائے اور انہین ایسی راہبانہ زندگی سے منع کیا اور فرمایا فمن رغب عن سنتی فلیس منی، البتہ کتاب الرقاق مین ایسی حدیثین پائی جاتی ہین جنھین دیکھکر ایک سطحی معلومات رکھنے والا شخص صوفیانہ عقاید کو سراپا اسلام کے مطابق سمجھ لیگا، لیکن جب اسکی نظر کتاب البیوع اور کتاب النکاح کی حدیثون پر جاویگی تو اسے معلوم ہوگا کہ دنیا اور آخرت کے متعلق اسلام کا صحیح معیار کیا ہے؟

معزز ناظرین:- یہ مضمون جب مین روانہ کرچکا تو اثنائے تلاوت مین سورۂ نحل کی اس آیت پر غور وفکر کا موقعہ ملا"

والله جعل لكم من بيوتكم سكنا وجعل لكم من جلود الانعام بيوتا تستخفونها يوم ظعنكم ويوم اقامتكم ومن اصوافها واوبارها واشعارها اثاثا ومتاعا الى حين ۵

ترجمہ۔ اور اللہ نے تمھارے واسطے تمھارے گھرون مین رہنے کی جگہ بنائی اور تمھارے واسطے تمھارے جانورون کی کھال کے گھر بنائے، جنکو تم اپنے کوچ کے دن اور مقام کے دن ہلکا پاتے ہو اور انکے اون اور انکے رؤن اور انکے بالون سے گھر کا سامان اور فائدہ کی چیزین ایک مدت تک کیلیے بنائین۔

اس آیت سے صرف یہی نہین کہ عہد نبوت مین تمدن عرب کے متعلق لطایف تاریخی پر روشنی پڑتی ہے، بلکہ اس سے میرے اس سرسری تحقیق کا بھی رد ہوجاتا ہے جسمین مین نے لکھدیا ہے، کہ قرآن مجید مین کہین "صوف" کا لفظ استعمال نہین ہوا، اس سے بھی بڑھکر لطف یہ ہے کہ اکثر محققین یورپ کے اس بیان پر بھی تنقیدی روشنی پڑتی ہے جنھون نے لکھا ہے، کہ لباس "صوف" کا استعمال شام کے مسیحی راہبون سے لیا گیا ہے، حالانکہ استشہاد قرآنی سے یہ ثابت ہے، کہ لباس صوف کا استعمال نزول قرآن کے وقت بھی عربون مین مروج تھا مبادی تصوف پر تاریخی روشنی ڈالنے مین علمائے مغرب نے "لباس الصوف" کو بڑی اہمیت دی ہے، چنانچہ تصوف کے متعلق پروفیسر نالڈک کی تاریخی تحقیقات کا مدار زیادہ تر اس نظریہ پر بحث وتحیص سے متعلق ہے، کہ لباس صوف کا استعمال شام کے مسیحی راہبون سے لیا گیا ہے، (انسائیکلوآف ریجن اینڈ اتھکس) غضب تو یہ ہے کہ علامہ ابن خلدون نے بھی یہی لکھا ہے، اور غالبًا ابن خلدون ہی سے پروفیسر نالڈک نے استفادہ کیا، (رجسل اپیچپوڈ اینڈ لائف ان اسلام) نکلسن نے مقدمہ "صوفیائے اسلام" مین اپنی نظریہ پر زور دیا ہے، کہ صوفی کا لقب مسیحیت کا منت کش ہے، اور یہ کہ قدیم زہاد اسلام ترک دنیا کے خیال مین مسیحی راہبون کی دیکھا دیکھی موٹا بدنما اونی لباس پہنا کرتے تھے، (مسٹکس آف اسلام) ابھی تک میرے پاس ایسے مواد تاریخی موجود نہین جنکی بناپر علمائے مغرب کے اس نظریہ کی تردید کیجائے کہ لفظ صوفی کا وجود عہد نبوت مین نہ تھا، یا یہ کہ یہ اسلام کی پیداوار نہین ہے، لیکن محققین مغرب کے طوفان تحقیق پر قرآن مجید کی اس آیت سے توکم ازکم تنقیحی روشنی پڑتی ہے کہ صوفیہ نے لباس الصوف کا استعمال مسیحی راہبون کی دیکھا دیکھی نہین شروع کیا، بلکہ اس مشابہت لباس کی جو تاریخی تعیین کی جاتی ہے اس سے قبل بھی عرب مین اسکا رواج تھا، ممکن ہے، اپنے ملکی لباس ہی کے دائمی استعمال کے باعث ایک جماعت زہاد "صوفیہ" کے لقب سے موسوم کر دیگئی ہو، بہرحال　　قرآنی آیت کی بناپر مغربی علما کی وہ تحقیق جو لفظ صوفی کی وجہ تسمیہ کے متعلق ہے، ایک تاریخی نقص، اور ایک ظن لاطائل ہے، جسے ایک جویائے حق صحیح تسلیم کرنے کیلئے تیار نہین مجھے بڑی مسرت ہوگی اگر ناظرین نگار مین سے کوئی صاحب جنھون نے "واقعۃً" تصوف کے متعلق تحقیق و کاوش کی ہو، میرے مضمون کے "صوفیانہ حصہ" پر تنقیدی روشنی ڈالینگے، تاکہ عوام کے معلومات مین اضافہ ہو، اور مجھے تصوف کے متعلق اپنے خیالات مین ایک معتدل راہ اختیار کرنی پڑے۔

عبد المالک آروی

سیاح کی ڈائری

(تیسری قسط)

لکھنوی شاعری اور اس کا ہیولیٰ

قبل اس کے کہ مین لکھنؤ کے موجودہ شاعرون کی شاعری اور ان کے حالات سے بحث کرون، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصرًا یہان کی شاعری کی ہیئت وضعی، وضع ترکیبی، اور ترکیب عنصری پر اپنے خیالات کا اظہار کردون۔

اس وقت تک عام طور پر دہلی لکھنؤ کی شاعری کے متعلق بحث کا جو پہلو اختیار کیا گیا ہے، وہ بہت سطحی ہے اور سوائے اس کے کہ چند پیش پا افتادہ باتین دونون جگہ کی شاعری کی تمیز و تفریق کے لئے بیان کردیجائین، کوئی ایسی عمیق اور اصولی بحث اختیار نہین کی گئی جو اس تفریق و امتیاز کے اسباب کو بھی سامنے لے آئے اور ہر شخص ان کو دیکھکر از خود فیصلہ کرسکے کہ ان دونون مین حقیقتًا وجہ امتیاز کیا ہے اور کن وجوہ کی بنا پر ایک کو دوسرے سے مرجح قرار دیا جاسکتا ہے

ظاہر ہے کہ لکھنؤ کوئی قدیم آبادی نہین ہے بلکہ لکھنؤ کا وجود اپنی تمام "لکھنویت" کے ساتھ ایک استعارہ ہے، فیض آباد سے جو نوابان اودھ کا اولین مہبط تھا۔ اب اسی کے ساتھ آپ حکومت اودھ کی تاریخ پر بھی غور کیجئے کہ اس کی بنیاد کیونکر قائم ہوئی، یہ امر شاید کسی سے مخفی نہین کہ شاہان دہلی سے بغاوت و انحراف کا نام حکومت اودھ ہے اور برطانیہ کی بساط سیاست پر ایک شاطرانہ چال بنیاد ہے شاہان اودھ کے وجود کی۔ جس طرح سلطنت مغلیہ کے دوسرے وفادار اور نمک حلال عمال دیگر اکناف ہند مین اپنی اپنی حکومتین قایم کرکے داد وفا دیچکے تھے، اسی طرح نواب سعادت علی خان بانی حکومت اودھ نے اپنی قابل ستایش ذہنیت کا ثبوت دیا اور چونکہ حکومت برطانیہ کلیتہً دہلی کا اقتدار مٹا دینا چاہتی تھی اس لئے آخرکار "غازی الدین حیدر" کو شاہ کا لقب دیکر گویا یہ خصوصیت بھی دہلی کی چھین لی۔ اس لئے اگر فرمانروایان اودھ کے دلون مین شروع ہی سے دہلی اور دہلویت سے تنفر رہا ہو اور یہان کی فضا مین اس جذبہ کے ماتحت لوگون نے پرورش پائی ہو تو جائے حیرت نہین پھر اگر آپ دونون جگہ کے اخلاق و معاشرت تہذیب و تمدن، وضع و ملبوس، خیال و زبان پر غایر نگاہ ڈالین گے تو معلوم ہوگا کہ لکھنؤ نے قصد کرکے دہلی کی ہر بات کو محو کرنا چاہا حتی کہ اگر دہلی والے کسی لفظ کو مذکر بولتے تھے تو اہل لکھنؤ نے اسے مونث بنا کر چھوڑا اس مغایرت کا ایک سبب تو یہ تھا اور دوسرا بڑا سبب مذہب تھا جو حقیقتًا تاریخ اودھ کی داستان کا نہایت ہی دردناک ٹکڑا ہے مین اس کی تفصیل سے لطیف طبائع کو منغص کرنا نہین چاہتا، جن حضرات کو اس کے جزئیات کا علم حاصل کرنا مقصود ہو وہ تاریخ کی کتابون مین جستجو کرین۔ لیکن مختصرًا یہ ظاہر کردینا ضروری ہے کہ حکومت اودھ کی ساری تاریخ گویا ایران کے عہد صفوی کی

تاریخ ہے۔ اور مذہبی تنگ نظری کی وہ تمام صورتیں جو ایک انسان کو مذہب کا بھی دشمن بنا دیتی ہیں پوری قوت کے ساتھ لکھنؤ میں ہر جگہ پائی جاتی تھیں۔ ایران کے دور صفوی میں تو صرف اسیقدر ہوا کہ شاعری صرف مرثیہ گوئی ہو کر رہ گئی، لیکن لکھنؤ کی شاعری نام تھا ان عفونتوں اور گندگیوں کا جو اوباشانہ اخلاق کا جزو لازم ہیں اور تمام اُن رکیک و سخیف اور رذیل و دنی جذبات کا جو صرف ایک گناہگار اور سیاہ کار دل ہی سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے کہ ماحول کا اثر شاعری پر ہونا لازم ہے، تو ایک ملک و قوم کی شاعری کو دیکھ کر اس کے ماحول کا اندازہ کرنا بھی لازمی منطقی نتیجہ ہے۔ پھر خواہ آپ سلطنت اودھ کے سیاسی، اخلاقی، مذہبی، معاشری حالات کے ساتھ ساتھ اُس وقت کی شاعری کا مطالعہ کیجئے یا اُس عہد کی شاعری سے آپ اُس زمانہ کے اخلاق پر حکم لگائیے نتیجہ ایک ہے اور اس یقین تک پہونچنا لازم کہ لکھنؤ کا وہ دور جسے یہاں کا عہد زرین کہا جاتا ہے اپنے ذہنی و دماغی انحطاط، اخلاقی و معاشری زوال، مذہبی گندگی و تنگ نظری، بلکہ میں تو یہ کہونگا کہ اپنی حیوانیت و درندگی اور وحشت و سبعیت کے لحاظ سے ایک ایسا عبرتناک دور حضیض تھا کہ شاید ہی اس کی کوئی دوسری مثال دنیا کی تاریخ میں پیش کیجا سکے۔ خواجہ عبد الرؤف عشرت خواہ کتنی ہی حسرت کے ساتھ قیصر باغ کی رنگ رلیوں کا ذکر کیوں نہ کریں، عیدین کے موقعہ پر شاہانہ جلوس اور اس کے تزک و احتشام کا فسانہ خواہ کسی زبان و انشاء میں کیوں نہ تحریر فرمائیں، لیکن دنیا اس واقعہ کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی کہ اسی قیصر باغ میں شہر کے اکابر و امراء کی حسین حسین لڑکیاں محرم کی روضہ خوانیوں، عزاداریوں اور تمثیل سازیوں میں ائمۂ اطہار کی بیویاں بنا بنا کر پیش کیجاتی تھیں اور واجد علی شاہ وہ عظیم المرتبت انسان وہ شوکت و جبروت والا بادشاہ، اچھوتیوں کے ساتھ خود بھی دردِ زہ میں مبتلا رہنے کے بعد کسی نہ کسی امام زادہ کو (مومی شبیہ، چینی کی مورت، یا گڑیا کی صورت میں) جنا کرتا تھا، اور جب "مبارک سلامت" کے ترانے گائے جاتے تھے تو وہ ایک نو عروس کی طرح گھونگٹ کر کے بیٹھ جاتا تھا اور جب عالم نشاط کی فراوانی سے مجبور ہو جاتا تو خود بھی کنچنیوں، پاتروں اور کسبیوں کے ساتھ ملکر اپنی بھدی کمر میں "لرزش رقصانہ" اور عفریتی جسم میں جنبش رامشگرانہ پیدا کرنے کی کوشش کرتا تھا

ظاہر ہے کہ جس ملک کا فرمانروا اس رنگ کا رہا ہو، جس کی نفس پرست زندگی نے حلال و حرام کا پردہ تمیز اٹھا دیا ہو، جس نے اپنی زندگی کا "اسوۂ حسنہ" یہ پیش کیا ہو، وہاں کی رعایا کی اخلاقی حالت کا کیا عالم ہوگا اور ان کی حیوانیت "ارتقا" کے کس دور میں رہی ہوگی۔ پھر یہ برکات صرف واجد علی شاہ کے عہد سے مخصوص نہ تھے بلکہ اودھ کا ہر حکمران کم و بیش یہی ذہنیت لیکر آیا تھا اور کسی نہ کسی اخلاقی پستی کا مظہر اتم ہونے کی خصوصیت کبریٰ اسے حاصل تھی

اگر شاعری نام ہے جذبات کے اظہار کا اور جذبات پیدا ہوتے ہیں خود اپنے اور ماحول کے معاشری و اخلاقی حالات سے تو ہر شخص بہ آسانی حکم لگا سکتا ہے کہ لکھنوی شاعری کو کیسا ہونا چاہئے اور اس کی حقیقت کیا ہو سکتی ہے۔ مثلاً ناسخ کے ایک مشہور شاگرد شیخ امان علی سحر کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

استخارہ جو سحر وصل پہ واجب آیا   مسکرا کر وہی کنٹھا مرے منہ پر مارا

استعارہ ایک مذہبی عمل ہے لیکن اس کو اخلاق کی پستی کہئے یا مذہبی اندگی کا علو کہ معشوق خود " بے اختیاری شوق " کے عالم مین وصل کے لئے استعارہ کرتا ہے (گویا وہ بڑا عمل خیر ہے) اور شاعر " واجب آیا " کہکر اُسے ایک اور درجۂ ترقی پر پہونچا دیتا ہے البتہ دوسرے مصرعہ مین جس معشوقانہ ادا کا اظہار ہے، وہ بجائے خود ایسی چیز ہے کہ کنگھا کیے یا نہ کیے، وصل کا واجب کیا، فریضۂ سحر کی صورت اختیار کرلینا یقینی ہے

میرے نزدیک شاعری کے تمام اصناف مین " غزلگوئی " جسقدر بلند چیز ہے کوئی نہین، روح کی گہرائیون، اور قلب کے اعماق سے خبردار کرنے والی چیز اگر کوئی ہوسکتی ہے تو صرف غزل ہے) وراسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ غزل کا ارتقاء تصوف ہے (تصوف سے مراد عہد حاضر کی قبر پرست، مرید ساز خرقہ کدہ ساوس والی درویشی نہین ہے، بلکہ میری مراد وہ علوئے فطرت وہ عروج روح، اور وہ استعلاء تصور ہے جہان انسان مادیت سے گزر کر اپنے حیّز اصلی، نور ربانی اور جلوۂ حقیقی سے ہم آغوش ہوجاتا ہے اور تمام امتیازات دنیاوی کو جن مین امتیاز مذہبی بھی شامل ہے محو کر دیتا ہے)۔ پھر جو شخص فطرتاً شاعر ہوتا ہے وہ اپنی اول منزل مین بھی جو یقیناً " منزلِ لب بام " ہی ہوا کرتی ہے، شاہد اصلی کے جلوہ کو سامنے رکھتا ہے، انتہائی منزل کے حصول سے غافل نہین ہوتا اور دنیاوی زیر وبم مین بھی اس نغمۂ سرمدی کو سنتا رہتا ہے جو ہر ساعت، ہر لحظہ، ہردم اس کو اپنی لذت سے بیخود رکھتا ہے،

یہ صحیح ہے کہ ہر شاعر اختلاف استعداد کے لحاظ سے ایک مخصوص درجہ سے آگے نہین بڑھتا، اور بہت کم ایسے ہوتے ہین جو بیدل کے مرتبہ تک پہونچنے مین کامیاب ہون۔ لیکن ایک فطری و وہبی شاعری خواہ وہ کتنی ہی ابتدائی منزل مین کیون نہ ہو، اُس سوز وگداز، اُس درد و تاثیر، اُس عذوبت بیان، اس حلاوت زبان، اور اُس حقیقت وصداقت سے خالی نہین ہوسکتی جو فطرت کی طرف سے صرف ودیعت ہوتی ہے اور کوشش سے حاصل نہین کیجاسکتی

پھر غور کیجئے کہ اُس دور حکومت کی شاعری جو غداری کو رنگی، اور جذبۂ نفرت واستکراہ پر قایم ہوئی ہو اور اُس عہد معصیت کی شاعری جس مین ادنیٰ وذلیل درجہ کے حیوانی جذبات کے سوا کسی جذبۂ عالی کی پرورش کی فضا نہ پیدا ہوئی ہو اور اُس زمانۂ فسق وفجور، کی شاعری جب مذہبی استخفاف اور بے حیائی وبے غیرتی اس حدتک پہونچ جائے کہ وصل کیلئے استخارہ کا کنگھا سینھالنا بھی معیوب نہ رہے، یعنی انیسوین صدی کے نصف اول کی وہ لکھنؤی شاعری جس نے اسی ماحول، اسی ذہنی پستی، اسی اخلاقی فرومایگی، اسی مذہبی تنگ نظری اور اسی ہیجان بدمستی مین آنکھ کھولی ہو، وہ ناسخ و وزیر ہی پیدا کرسکتی تھی نہ کہ مومن وتمیر، اس مین سحر وصبا ہی کے تخلیق کی اہلیت تھی نہ کہ درد و قایم کے

لکھنؤ کی شاعری مین الفاظ کی طلسم بندی، کنگھی چوٹی انگیا، آنچل، آرسی سرمہ، بے معنی ضائع وبدائع اور اسی قسم کے بہت سی سطحی وغیر سنجیدہ خصوصیات کے پیدا ہونے کا سبب یہی تھا کہ اُس وقت کی زندگی ہی ایک جھوٹی زندگی تھی اک غیر حقیقی ہستی تھی اور رات دن ان کو انھین چیزون سے واسطہ تھا اور انھین پر اُن کے نشاط کی بنیاد

قائم تھی۔ ان کی شاعری کا موضوع عہد وحشت کی وہ عورت تھی جب اس سے صرف ہوس رانی کا کام لیا جاتا تھا اور جس کو اسباب آرائش وزیبائش کی دوسری کم مایہ جنسوں کی طرح قابل بیع وشری جنس قرار دیا گیا تھا۔ لکھنؤ کی سرزمین میں قصر شاہی سے لیکر فقیر کے جھونپڑے تک یکساں طور پر جذبۂ شہوت پرستی کارفرما تھا نہ فرمانرواکو اپنی ذمہ داریوں کا احساس رہ گیا تھا اور نہ رعایا کو تحسین تمدن کا، ہر شخص اپنی اپنی جگہ عیش کوشی ونشاط اندوزی میں مصروف ومنہمک تھا اور نسائیت جو بُر معصیت زندگی کا لازمی نتیجہ ہے بلا تفریق ہر طبقہ کے مردوں میں پیدا ہوتی جا رہی تھی سرکار انگریزی نے عملاً تمام اقتدار شاہانہ سے محروم کرکے شاہ ورعایا سب سے عسکری روح چھین لی تھی اور ان کے جذبات حماست وشجاعت کو صرف بٹیر بازی، کنکوے بازی اور تیتر بازی میں تبدیل کر دیا تھا اور وہ بالکل غیر معلوم وغیر محسوس طور پر انسانیت کی اُس نیچی سطح پر آرہے تھے جو حیوانیت تک پہونچنے کے لئے حد فاصل درمیاں نہیں رکھتی۔ اسی لئے لکھنؤ کا شاعر کبھی ایک یاوہ گو ناظم، ایک ہرزہ سرا متشاعر ایک بوالہوس حسن پرست ایک بازاری فقرہ باز، ایک عامی پھبتی گو، ایک سوقی عیاش کی حیثیت سے آگے نہیں بڑھا اور نہ بڑھ سکتا تھا کیونکہ ماحول اور فضا کا اقتضاء یہی تھا

اہل لکھنؤ کا دعویٰ ہے کہ زبان کو جو ترقی یہاں ہوئی کسی جگہ نہیں ہوئی یہانتک کہ شعراء دہلی نے بھی یہیں آکر یا یہاں کی زبان کو سامنے رکھ کر اپنی زبان کی صحت نکالی۔ اول تو مجھے اسی میں گفتگو ہے کہ یہاں زبان کو ترقی ہوئی۔ کیونکہ زبان کی ترقی کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ وہ بلند سے بلند جذبہ وخیال کے اظہار پر قادر ہو جائے اور اس کی ایک مثال بھی یہاں کے بڑے سے بڑے شاعر کے کلام میں نہیں ملتی۔ البتہ عیاشانہ اور بازاری زبان نے یہاں ضرور ترقی کی اور عامیانہ خیالات کے اظہار کے لئے بیشک بہت سے جدید اسلوب پیدا کر دئے، چنانچہ آج بھی یہاں کا سنجیدہ سے سنجیدہ نقاد ایک شعر کی داد دیتے وقت کبھی اس کو زہر ہلاہل بنا دیتا ہے، کبھی، اس کے دھوئیں کو ماوراء سرحد مخفل بل کھاتا ہوا پاتا ہے، کہیں اس کے "کس، بل" کو نمایاں کرتا ہے اور کہیں "اے توبہ، اُوئی اللہ" کہکر خدا معلوم اپنی یا شاعر کی نسائیت کو ظاہر کرتا ہے ——— اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ لکھنؤ نے زبان اور محاوروں کو درست کیا تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ شاعری اور وہ بھی خصوصیت کے ساتھ غزل کو اس سے کیا فایدہ پہونچا جو قطعاً ان دونوں چیزوں سے بے نیاز ہے، غزل کی زبان کبھی پہلے نہیں بنتی، بلکہ غزلگو کے خیال کے ساتھ ساتھ پیدا ہوتی ہے وہ زبان کا پابند نہیں ہے بلکہ خود زبان اس کی محتاج ہے۔ اگر ناسخ نے جو لکھنوی شاعری کی دنیا کا ابو الآباء سمجھا جاتا ہے، بہت سے محاورات اپنے دیوان میں نظم کر دئے، صحت الفاظ کا بہت خیال رکھا، تو نتیجہ کیا ہوا یہی ناکہ وقت ضرورت اس سے ایک لغت یا فرہنگ کا کام لے لیں۔ غزلگوئی کو اس سے کیا فائدہ پہونچا محاورے اس نے جتنے بھی لکھے ہوں لیکن غزل اس کی ان حدود سے آگے نہیں بڑھتی کہ

سخت دل جو ہیں انھیں محروم رکھتا ہے فلک　　بیضۂ فولاد سے بچہ کہاں پیدا ہوا

نہین آتا نظر مرہم لگائے کس جگہ کوئی
دہان یار گویا منہ ہے میرے زخم پنہان کا

جب وہ مسجد مین ادا کرتے ہین
سب نماز اپنی قضا کرتے ہین

میرے نزدیک لکھنوی شاعری عبارت ہے۔ ناسخ، آتش، مصحفی اور ان کے شاگردونکے کلام سے۔ ناسخ کے کلام کی بے نمکی اور اس کا "دو شعر" کی تعریف سے یکسر علیحدہ ہونا کسی سے مخفی نہین ناسخ کے جتنے مشہور شاگرد ہوئے وہ بھی اس باب مین اپنے استاد سے کسی طرح کم نہ تھے، چنانچہ امداد علی بحر، شیخ امانعلی سحر خواجہ وزیر کا کلام اٹھا کر دیکھئے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان غریبون مین کبھی جھوٹی محبت کا بھی جذبہ پیدا نہین ہوا

بحر کے بعض اشعار ملاحظہ ہون :۔

خوشبو مین کیا ہین داغ مودت کے اجزے
سر ہے کہ دوش پر ہے قرابہ گلاب کا

افسوس ہم نے خط غلامی دیا اُسے
لکھوا لیا نہ اس سے مچلکا رقیب کا

اے بحر نہ لے عارض محبوب کا بوسہ
شبہ ہے مجھے کان کی بجلی پہ مگر کا

بیمار ہون خوبصورتون کا
حُسن یوسف مری دوا ہے

سحر کی شاعری مین ایک تو وہی کنٹھے والا شعر ہے، دو چار نوادر اور ملاحظہ ہوں

طایر روح کو دانے پہ لگایا قاتل
دل پہ ہم نے تری بندوق کا چھرا کھایا

دوڑ کر ابرو قاتل کی بلائین سے لین
بیٹھے بٹھلائے اوٹھے ہات مین چرکا کھایا

مسکرا کر وصل مین جب دانت پیسے یار نے
موج خندہ بن گئی زنجیر موتی چور کی

وزیر کی لفظ پیمائیان بھی عجیب وغریب ہین :۔

گرمیان کیں اسقدر ہر عضو شعلہ ہو گیا
شب کو روشن یار کے بازو کا اکا ہو گیا

بدن مین میرے جتنے زخم ہین آنکھین چراتے ہین
نہ پوچھو کسقدر پیاسا ہون آب تیغ قاتل کا

گر دم مشق خیال خط جانان ہوگا
پھر تو جو خط مین لکھونگا خط ریحان ہوگا

شاعری کا جہان تک تعلق ہے آتش یقیناً ناسخ سے بدرجہا بہتر ہے لیکن "لکھنوی خصوصیت" اس کے کلام مین بھی کثرت سے پائی جاتی ہے:۔

دیدۂ یار کہین کیا اسے کیفیت سے مین
بھونکر روز گزک کرتے ہین بادام کو ہم

چلے تو سیر کو ہین آپ مستی ملکے گلشن مین
اشارے کیسے کیسے ہونگے نافرمان وسوسن مین

یادِ رخسار کتابی جو رہا کرتی ہے
دل سمجھتا ہے مرا حافظ قرآن مجھ کو

ان کے شاگردون مین رند و صبا کا خاص مرتبہ سمجھا جاتا ہے، لیکن ان کی یہ خصوصیت بھی صرف اسی رنگ کی بنا پر ہے، رند کے چند شعر ملاحظہ ہون

بادۂ گلگون مین افیون کا اثر ہو جائے گا — دوڑے یا رب دوران سر ہو جائے گا
خال رُخ کے عشق مین مرتے ہین عاشق سیکڑون — سنکھیا کا عالم اس حب شفا کا ہو گیا
تلوار دکھاؤ مجھے گولی سے نہ مارو — تل ڈھانک لو اور ابروئے خمدار دکھاؤ

صبا کا مرتبۂ شاعری یہ ہے:-

سرکشی پر جو وہ سرو ستم ایجاد آیا — پاس اترے کے گھسٹتا ہوا شمشاد آیا
یار گل اندام سے پہلو جو خالی ہو گیا — سوکھ کر مین شکل تصویر نہالی ہو گیا

مصحفی چونکہ لکھنؤ کے نہ تھے اس لئے ان کے سلسلہ سے یہان بحث کرنا فضول ہے، لیکن اسقدر اظہار ضروری ہے کہ دور ناسخ کی لغو و مہمل شاعری سے انحراف کرکے سہل و شستہ زبان مین کچھ کچھ جذبات کو لئے ہوئے غزل کہنے کی بنیاد ڈالنے والے دو ہی شخص تھے ایک ضامن علی جلال جو رشک کے شاگرد تھے اور دوسرے منشی امیر احمد مینائی جو اپنے علم و فضل، اخلاق و عادات کے لحاظ سے بہت زیادہ بلند انسان تھے اور جنکو شاعر کہنا میرے نزدیک ان کی توہین ہے، چونکہ اُس وقت کی فضا مین سوائے شاعری کے کوئی دوسرا نغمہ مقبول ہی نہ تھا، اس لئے منشی امیر احمد مینائی پر بھی اس کا اثر ہوا اور شاعری کی طرف متوجہ ہو گئے ورنہ قدرت نے انکو اس سے بہت زیادہ اہم خدمات کیلئے پیدا کیا تھا، مگر چونکہ فطرت مین لوچ تھا جو ہر ہر کمال کے حصول کا ان مین موجود تھا، اس لئے اساتذۂ شعر مین بھی انکا شمار ہونے لگا اور حقیقت یہ ہے کہ یہ امتیاز ان سے کبھی نہین چھینا جا سکتا کہ انھون نے باوجود لکھنؤ مین رہنے کے جہان ناسخ کی شاعری کے جراثیم ایک مرض متعدی کی طرح پھیلے ہوئے تھے ایک الگ راہ شاعری کی قایم کی اور اپنی فطری صلاحیت کی بنا پر وہ شعر کہگئے کہ ہمین کسی ایک لکھنوی شاعر کے کلام مین نہین ملسکتے، لیکن دنیا شاید یہ سنکر تعجب کریگی کہ اہل لکھنؤ، امیر مینائی سے کچھ خوش نہین ہین اور ان کے مستند استاد ہونے سے بھی انکار کرتے ہیں

امیر مینائی کے دو دیوان مرآۃ الغیب اور صنم خانہ دو علاحدہ رنگ کے دیوان ہین اور اس سے انکار نہین ہو سکتا کہ ان دونون مین کثیر اشعار اُس رنگ کے ہین جن پر صحیح تغزل کا اطلاق نہین ہو سکتا، لیکن ناسخ کی شاعری کو دیکھتے ہوئے امیر کا برے سے برا شعر بھی ایک درجہ رکھتا ہے اور اگر پورا تفحص کیا جائے تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ذہنیت یکسر دہلوی تھی لیکن ماحول کے اثر سے مجبور ہو کر انھون نے لکھنوی شاعری کو اختیار کیا

ان کے چند اشعار جن سے ان کا صحیح ذوق شعری نمایان ہوتا ہے ذیل مین درج کئے جاتے ہیں:-

کہتے تھے دل کسی سے لگاؤ نہ اے امیر — دیکھو تو چار روز مین کیا حال ہو گیا
وہ آئے کھینچ کے تلوار سب کو شاد کیا — امیر آج بہت ہم نے تم کو یاد کیا
کچھ آج نہین رنگ یہ افسردہ دلی کا — مدت سے یہی حال ہے یارو مرے جی کا

کیا پھر تو نے اس کا نام اے دل ارے ظالم ابھی سمجھا چکا ہون
کرتے ہین جو لوگ ذکر اُن کا ایک ایک کا منہ میں دیکھتا ہون
دم لے نہ ابھی پوچھ مرے درد کو ہمدم رونے سے جو دل ٹھیرے تو کچھ بات کرو مین
کھاتے ہو قسم نہین میں عاشق صورت تو امیر اپنی دیکھو
اک ذرا پردۂ محمل کو اُٹھا دے لیلی پھر کوئی حالت بیتابی مجنون دیکھے
تم دُکھاتے تو ہو امیر کا دل اور جو وہ کوئی آہ کر بیٹھے
ہات ڈالا مین نے دامن پر تو بولے ناز سے میرا دامن چھوڑیے اپنا گریبان پھاڑیے
اک کنارے پڑا ہوا ہے امیر کچھ تمھارا غریب لیتا ہے
کوئی امیر ترا درد دل سنے کیونکر تو ایک بات کہے اور دو گھڑی روئے

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ اشعار کسی لکھنوی شاعر کے ہین؟ مین تو سمجھتا ہون کہ یہ تصرف ہے ان کے دادا استاد مُصحفیؔ کا جو غیر لکھنوی تھے اور خود اُن کی فطری صلاحیت کا جس مین دہلویت بڑی حد تک مرکوز تھی

امیر اللہ تسلیم بھی لکھنؤ سے نسبت رکھتے ہین لیکن یہ نسبت ہر لحاظ سے غلط ہے، کیونکہ نہ انکا اصلی وطن لکھنؤ تھا اور نہ وہ لکھنوی ذوق کے متبع تھے۔ چنانچہ خود وہ ایک جگہ لکھتے ہین

مین ہوں اے تسلیمؔ شاگرد نسیم دہلوی مجھکو طرز شاعران لکھنؤ سے کیا غرض

متاخرین مین مرزا تعشق کا وجود بیشک ایسا ہوا ہے جو خاندان ناسخ کی شاعری مین علحدہ رنگ رکھتا تھا اور ان کے مختصر دیوان مین تلاش کرنے سے بعض ایسے شعر ملسکتے ہین جن کو شعر کہا جاسکتا ہے، لیکن چونکہ خالص لکھنوی لوگ تھے اور تلمذ بھی ناسخ سے تھا اس لئے مہملات کی بھی کمی نہین ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

سوئے دریا خندہ زن وہ یار جانی پھر گیا موتیون کی آبرو پر آج پانی پھر گیا
کیا معاذ اللہ مری وحشت نے پھیلائے ہین پاؤن راہ برسون کی مرا چاک گریبان ہو گیا
عشق دندان کی رعایت مرہجان لازم ہے آبروے دل بے تاب و توان لازم ہے
کیا کنوین مجھ کو جھنکائیگی مری کاہیدگی چاہ میرے واسطے ہر نقش پا ہو جائے گا
کیون کبوتر کے عوض ہدہد نہ لایا خط شوق اس خطا پر مجھ سے وہ بلقیس[1] ثانی پھر گیا

ہر چند لکھنوی شاعری کا یہ رنگ برابر انحطاط پذیر ہے اور اب شاید ہی کوئی صحیح مقلد و متبع اس شاعری کا ہو، لیکن وہ سمیت جو فضا مین اس طرح پھیل گئی ہو دفعۃً دور بھی نہین ہو سکتی اور "زمانۂ قریب" مین بھی بعض خدا کے بندے ایسے گزرے ہین

[1] اگر تعشق کو کسی عورت سے محبت نہ تھی، تو پھر بلقیس کا مرد ہونا یقینی ہے۔

جو استاد ناسخ کی رُوح کو خوش کرنے کے لئے کافی سامان اپنے بعد چھوڑ گئے ہیں، چنانچہ زیادہ زمانہ نہیں گزرا جب فرنگی محل کی علم خیز سرزمین سے مولانا حافظ محمد برکت اللہ رضا کا ایک دیوان مطبع یوسفی سے شائع ہوا تھا جس میں یقیناً تمام وہ خصوصیات پائی جاتی ہیں جو ایک "اعجوبۂ ادب" میں ہونا چاہئے۔ مولانا رضا فرنگی محلی یوں تو امیر کے شاگرد تھے؛ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی رُوح روزِ الست ہی میں ناسخ کے سامنے زانوے ادب تہ کر چکی تھی ملاحظہ ہو:-

خیال سبزۂ خط میں زمرد کا پیا پانی • تصور میں ترے دانتوں کے ہیرا کوٹ کر پھانکا

مولانا نے یہ شعر نعت میں فرمایا ہے (رسول کے سبزۂ خط اور حسن دندان کا ذکر ان الفاظ میں کرنا حقیقت یہ ہے کہ فرنگی محلی ہی) ذہنیت کا کام ہو سکتا تھا کسی اور کے بس کی بات نہیں ہے۔ مولانا نے ایک بار محبوب کا بوسہ مانگا تھا اس کا حال ان الفاظ میں بیان ہوتا ہے:-

بوسہ مانگا کالیاں کھا میں رضا   زہر پایا ہم نے شکر کا جواب

مولانا کی بوالہوسی ملاحظہ ہو:-

حیرت سے ہم نہ ہوتے جو مبہوت وصل میں   نیند آتی اے رضا انھیں کیونکر تمام رات

دوسرے مصرعہ کو پڑھکر غور فرمایئے کہ "اُن" کے رات بھر نہ سو سکنے کا کیا سبب ہو سکتا تھا اور مولانا کے "تہیۂ پیرافشانی" کی داد دیجئے۔ ایک صاحب نے یہ شعر سنکر فرمایا کہ ممکن ہے مولانا نے کوئی جائز و حلال صورت پیدا کر کے یہ اشعار کہے ہوں میں نے کہا بالکل درست ہے کیونکہ مولانا نے یہ شعر کہکر اس حسن ظن کی بھی گنجائش نہیں رکھی

لپٹا یا رضا ہم نے تو جھنجلا کے وہ بولے   اب آپ کے گھر ہم کبھی آیا نہ کرینگے

یہ ہے شاعری ایک عالم متبحر، ایک فقیہ مستند، ایک محدث جیّد کی جس کے خاندان میں ہمیشہ سے تورع و تقدس چلا آرہا ہے اور جس کے اخلاق و سیرت کو لوگ نمونہ و مثال کی صورت سے پیش کرتے ہیں

اس سے آپ کو اندازہ ہو سکیگا کہ لکھنوی شاعری کے مذموم اثرات کن کن صورتوں سے کن کن طبقوں میں سرایت کر چکے ہیں اور جن کے دور ہونے کے لئے میری رائے میں کم از کم ابھی نصف صدی کی ضرورت اور ہے

الغرض لکھنؤ میں تغزل کی جتنی مٹی پلید ہوئی وہ ناقابلِ عفو حد تک عفونت و گندگی سے لبریز ہے یہ ماننا پڑیگا کہ شاعری کی اُس صنعت نے جسے مرثیہ کہتے ہیں، یہاں غیر معمولی ترقی کی اور شاہان اودھ کے اخلاقی مظالم کی تلافی اگر فطرت کی طرف سے کوئی ہوئی تو صرف یہ کہ اس نے انیس و دبیر کو یہاں پیدا کر دیا، مرثیہ گوئی کم و بیش ہر زبان اور ملک میں پائی جاتی ہے، لیکن مذہبی و قومی اہمیت کے لحاظ سے جو مرتبہ لکھنؤ کے مرثیہ گوئی کا ہے اس کی نظیر دنیا میں کہیں نہیں ملسکتی

لکھنؤ کے موجودہ شعراء کی شاعری کا کیا رنگ ہے، اس کے متعلق میرا سرسری فیصلہ یہی ہے کہ فی الحال وہ دہلی اسکول کی ایک ناکام تقلید سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اور ہنوز وہ غلو پیدا نہیں ہوا جو شاعری کو الہام کے حدود سے ملا دیتا ہے

آیندہ قسط میں، اس مسئلہ پر زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کا موقعہ ہے اگر کوئی اور بحث نہ چھڑ گئی ————

حکومت برطانیہ کی وسعت کا راز

(بہ سلسلۂ سابق)

انگلینڈ اور ہندوستان کا باہمی اثر

گذشتہ دو لکچروں میں تعیین بتلایا گیا تھا کہ ہندوستان کی فتح، اور اسپر انگریزوں کی حکومت میں ایک خاص مفہوم تک کوئی امر قابل حیرت نہیں ہے۔ ہمکو بجا طور پر فخر ہو سکتا ہے کہ ہمارے ہم قوموں نے ہندوستان میں بہت بڑے بڑے کارہائے نمایاں کئے، ہمکو اُن انگریزوں پر ناز ہو سکتا ہے جنھوں نے حکمرانی کی عدیم المثال استعداد و لیاقت دکھلائی۔ لیکن یہ سمجھنا سراسر غلط ہے کہ سلطنت ہذا بذات خود ایک زندہ ثبوت ہے ہندوستانی اقوام کے مقابلہ میں انگریزی اقوام کی بے پایاں برتری کا۔ اس برتری کا خیال اپنے دماغ سے نکالنے کے بعد ہم اپنی سلطنت کے ارتقا اور قیام کے اسباب دریافت کر سکتے ہیں اور اگر حیرت انگیز سے محض معجزنما، مراد ہے یا یہ کہ معمولی اسباب پر اسکے وجود کو معلول کرنا مشکل ہے تو یہ سلطنت قطعی حیرت انگیز نہیں ہے

تاہم ایک مفہوم میں یہ سلطنت اُن تمام عام مفہوموں سے بہت زیادہ حیرت انگیز ہے۔ یعنی یہ اپنے اسباب کی بہ نسبت اپنے انجام میں زیادہ حیرت انگیز ہے۔ بالفاظ دیگر اسکی عظمت مخصوص تاریخی مفہوم مین ہے۔ کیونکہ بقول میرے واقعات کی نتیجہ خیزی ہی نے اِسکو تاریخ کا درجہ دیا۔ اسی معیار سے ہم نے تاریخ انگلینڈ کے بہت سے واقعات کا درجہ بلند کر دیا خصوصًا انقلاب امریکہ کا جو بوجہ غیر دلچسپ اور بے چاشنی ہونے کے بہت کم مطالعہ کیا جاتا تھا۔ اس لئے میں کہونگا کہ سلطنت ہند اگرچہ نظر غائر کو کتنی ہی کم حیرت انگیز معلوم ہو لیکن جوں جوں بحیثیت افسانہ اسکا لطف کم ہوتا جائیگا، اسکی تاریخی دلچسپی بڑھتی جائیگی

یہ کوئی ضروری بات نہیں ہے کہ ایک بڑی مشرقی سلطنت خاص طور سے اہم ہو۔ ایشیا میں بہت سی ایسی بڑی بڑی سلطنتیں گزری ہیں جو تاریخی اعتبار سے یونانی اور شکن (ممه مال) شہری جمہوریتوں سے بھی کم اہم تھیں، صرف اسوجہ سے کہ اُنکے حدود بہت زیادہ اور مدت قیام طویل تھی ایسی سلطنتیں لائق دلچسپی نہیں ہو سکتیں۔ جب ہم انکی جزئیات کی تحقیق کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انکا نظام ادنی تھا، اسکے بار سے تمام افراد دب کر چور چور ہو رہے تھے، نہ تو انکو اطمینان و خوش نصیبی حاصل تھی نہ وہ ترقی کر سکتے تھے اور نہ کوئی قابل یادگار ایجاد کر سکتے تھے۔ پہلی نظر میں بظاہر ہماری سلطنت ہند بھی اس درجہ لائق توجہ نہیں نظر آتی جس قدر عام خود رَو ایشیائی مستبد حکومتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ہم انگریزی رائے عامہ کے مرہون منت ہیں جس کے ہاتھ میں ہندوستانی معاملات کا انصرام ہے، کیونکہ صرف اسی کی بدولت آج ہندوستان دماغی، اخلاقی اور انسانی ہمدردی کے اوصاف میں سلطنت مغلیہ کے زمانہ سے ارفع مقام پر کھڑا ہے۔ لیکن زیادہ سے زیادہ اس سلطنت کو ہم خراب سیاسی نظام کا ایک بہتر نمونہ کہہ سکتے ہیں۔ ہم کو اسکا فخر نہیں ہے کہ ہم شاہان مغلیہ کے جانشین ہیں۔ ہمیں شبہہ ہے کہ آیا باوجود ہماری تمام انتظامی

خوبیوں کے رعایا خوش ہے یا نہیں۔ تاہم اسمیں بھی شبہ ہے کہ آیا ہماری سلطنت ہندوستانیوں کو بہتر حالت کیلئے تیار کر رہی ہے یا اور زیادہ مصیبت کی طرف ڈھکیلتی جا رہی ہے۔ تاہم اس بات کا بھی اندیشہ ہے کہ شاید وہاں صحیح معنوں میں کوئی ایشیائی حکومت یا خود ہندؤں کی ایک قومی حکومت قائم ہو جائے۔ اور انجام کار ہماری سلطنت سے زیادہ مفید ہو۔ اگرچہ یہ حکومت ہماری اجنبی اور غیر ہمدرد حکومت سے کم متمدن بھی ہو لیکن بوجہ باشندگان کی طبائع کے موافق ہونے کے اس سے زیادہ مفید ہوگی

لیکن ان وجوہ سے ہر سلطنت میرے نزدیک غیر لائق توجہ نہیں ہو سکتی۔ مثلاً سلطنت رومہ کو لے لو۔ مجھے یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کوئی اندیشہ نہیں ہے کیونکہ حال میں تاریخ کے متعلق ہمارے خیالات میں بہت زیادہ تبدیلی ہو گئی ہے۔ یقیناً ایک زمانہ تھا جب رومن سلطنت بھی غیر قابل توجہ سمجھی جاتی تھی کیونکہ مستبد اور بعض اوقات باعث تکلیف اور نیم وحشی تھی۔ ایک نسل پہلے عام خیال یہی تھا کہ سیاست میں سوائے آزادی کے کوئی اچھائی نہیں ہے، اس لئے تاریخ کے ان تمام عہدوں کو نظر انداز بلکہ منسوخ کر دینا چاہئے جنمیں آزادی معدوم ہو۔ اسی خیال کے ساتھ ساتھ مطالعہ تاریخ کی عادت بھی بالکل نظم کے مطالعہ کی سی تھی یعنی تاریخ کا مطالعہ صرف بخیال انبساط کیا جاتا تھا۔ چنانچہ اس عادت کی وجہ سے جب ہم ایسے عہد کی تاریخ پر پہونچتے تھے جو شاندار اور قابل تحسین واقعات سے معرا ہو تو ہم کتاب بند کر کے رکھ دیتے تھے۔ بلا شبہہ اس زمانہ میں رومن سلطنت کی بھی مذمت کی جاتی تھی۔ جمہوریت رومہ کو صرف اس لئے عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے کہ اوسمیں آزادی تھی۔ اور رومن سلطنت کا ابتدائی عہد بھی محض اس خیال سے مطالعہ کیا جاتا تھا کہ اُسکے اندر حُریت کے نشانات ملتے ہیں۔ لیکن جہاں دوسری صدی عیسوی شروع ہوئی ہمنے کتاب بند کر دی، گویا دسویں صدی تک جو کچھ ہوا، تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہ تھا اور پھر کتاب اُسوقت تک ہمارے ہاتھ میں نہ ہوتی جب تک انگلینڈ اور اطالوی جمہوریت میں حُریت کا نشان پھر نہ ملنے لگتا۔ میرے خیال میں تاریخ کیساتھ یہ سلوک اب متروک ہو گیا اب تاریخ محض تفریح کی خاطر نہیں پڑھی جاتی بلکہ سیاسی نشو و نما اور انقلابات کے اصول دریافت کرنے کے لئے۔ نظر بر ان ہمکو اس سے بحث نہیں ہوتی کہ فلاں عہد شاندار ہے یا تاریک اگر وہ عہد بصیرت افروز ہے اور اُس سے ایسے سبق حاصل ہوتے ہیں جو دوسرے عہدوں سے حاصل نہیں ہوتے تو بس کافی ہے۔ ہم نے سیکھا ہے کہ علاوہ حریت و آزادی کے سیاست میں اور بھی خوبیاں ہیں۔ مثلاً تو بیت اور تمدن۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک سلطنت میں آزادی تو نہیں ہے لیکن جہاں تک ان دو مقاصد کے حصول کا تعلق ہے وہ بڑی رحمت ہے۔ اس لئے رومن سلطنت نہ صرف اپنے ابتدائی عہد میں بلکہ تیرھویں صدی تک باوجود اپنی غیر شائستگی، اوہام پرستی اور تکالیف کے تمام تاریخی واقعات سے دلچسپ ہے کیونکہ محسوس کیا جاتا ہے کہ یہ سلطنت ہرگز اندرونی ترقی، ابداعی قابلیت یا قابل یادگار نتائج سے معرا نہیں تھی۔ اسلئے کہ اسی کے بطن سے وہ بچہ پیدا ہوا جو موجودہ 'اخوت' اور متمدن اقوام کے 'باہمی رشتہ' کی شکل میں آج دکھائی دیتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ سلطنت اگرچہ مستبد تھی لیکن اُسکی تاریخ کا مطالعہ نہایت توجہ اور کمال شوق سے کیا جاتا ہے

سلطنت رومہ اور اُن دیگر سلطنتوں میں جنکا قیام فتح پر تھا یہ فرق اسوجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ فاتح قومیں مفتوح

قوموں سے تہذیب میں فائق تھیں۔ ایک بڑی جنگجو اور فتحمند قوم کیلئے ضروری نہیں ہے کہ وہ متمدن بھی ہو۔ چنگیز خاں حقیقی معنوں میں فاتح تھا لیکن وہ کون تھا؟ ایک ایسے جفاکش قبیلہ کا سردار جو افلاس سے عاجز آ کر قتل و غارتگری پر اُتر آیا تھا۔ ایسے حملہ آوروں کے سامنے یقینی طور پر تمدن مغلوب ہو جائیگا۔ چنانچہ تاریخ میں ہم اکثر تمدن کو مفتوح دیکھتے ہیں۔ بعض اوقات اگر کسی وجہ سے تمدن اپنی جگہ قائم بھی رہ گیا تو ترقی نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ موجودہ زمانہ میں ایجادات کی ترقی نے تمدن کے ہاتھ کو قوی کر دیا ہے۔ تاریخ کی سب سے بڑی فاتح اقوام میں ترکمانوں کی قوم تھی لیکن باعتبار ترقی سب سے پیچھے تھی۔ ایشیا کے تقریباً تمام اولوالعزم بادشاہوں کو زیادہ تر اسی قوم سے کرایہ کی فوجیں دستیاب ہوئیں۔ بابر اور اکبر نے بھی اسی قبیلہ کی امداد سے ہندوستان فتح کیا، یہ تو عام اصول تھا لیکن جب کوئی خاص صورت پیدا ہو جائے اور ایک اعلیٰ درجہ کی متمدن قوم کسی ادنیٰ درجہ کی ترقی یافتہ آبادی میں بذریعہ فتح تہذیب کی نشر و اشاعت کرے تو ایسی سلطنت نہایت ہی خصوصیت دلچسپی رکھتی ہے۔ اس قسم کی مثال سکندر اعظم کی فتح مشرق میں ملتی ہے۔ چونکہ اہل مقدونیہ یونانیوں سے بہت قریبی تعلق رکھتے تھے اس لئے وہ اپنے ساتھ تمام یونانی روایات و عادات مشرق میں لیتے آئے۔ چنانچہ ڈایاڈوچی (Hellenistic) [illegible] کہلاتی ہیں، اگرچہ محض ادنیٰ درجہ کی فوجی طاقتیں تھیں لیکن یونانی اور مشرقی خیالات کے اختلاط نے نہایت ہی عجیب اور قابل یادگار نتائج پیدا کئے۔ اس سے زیادہ قابل ذکر اثر سلطنت رومہ نے اقوام یورپ میں پیدا کیا کیونکہ اسکی مدت حیات طویل تھی اور سب اسکو اچھی طرح جانتے تھے۔ درحقیقت یہ واقعہ بنی نوع انسان کی تاریخ میں بہت نمایاں اور مرکزی خصوصیت رکھتا ہے، اگر اسکو موجودہ انسانی تہذیب کا سنگ بنیاد کہا جائے تو عین مناسب ہوگا

اب اگر انگریزوں کی فتح ہندوستان کا مقابلہ بجائے ترکوں اور مغلوں کی فتوحات سے اہل یونان کی فتح مشرق اور اہل رومہ کی فتح (Romanization) گال اور اسپین سے کیا جائے تو دونوں میں زمین آسمان کا فرق نظر آئیگا۔ اگر اسکا شمار اول الذکر فتوحات میں کیا جائے تو بغیر اسکی عظمت سے فریب کھائے ہوئے ہم اسے عہد جاہلیت کی تاریخ کا ایک معمولی ثانوی حیثیت کا واقعہ قرار دینگے۔ لیکن اگر اس فتح کا موازنہ آخر الذکر فتوحات سے کیا جائے تو پھر ہم اسکو دنیا کے افضل ترین واقعات کی صف اول میں جگہ دینگے، ایسے واقعات میں جو تمدن اقوام کی تاریخ میں اُسی قدر عالی مرتبت ہیں جسقدر ادنیٰ درجہ مشرق کی معمولی فتوحات ہیں

یہاں پر اس عام حقیقت سے بحث کرنیکی ضرورت نہیں ہے کہ برطانوی ہند کی حکمران قوم کا تمدن دیسی اقوام سے زیادہ قوی اور اعلیٰ ہے۔ ایسا دعوی کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ انگریزوں کی قوم دماغی اور ذہنی خصوصیات کے لحاظ سے یونانی قوم نہیں ہے، لیکن جس تمدن کی وہ وارث ہے وہ اسکا ذاتی نہیں ہے، بلکہ یورپ کا تمدن ہے جو یورپ کی تمام اقوام کی متحدہ کوشش سے پیدا ہوا جس میں دنیائے قدیم کی زندہ دلی نے روح پھونکی۔ اب ہم ہندوستانی تہذیب کے متعلق کیا اندازہ قائم کریں

میں نے بار بار کہا ہے کہ ہندوستان ایک ملک نہیں ہے، اسلئے اسکا تمدن بھی ایک نہیں ہے۔ اس تمدن میں اتنی بھی یگانگت نہیں ہے جتنی بظاہر معلوم ہوتی ہے کیونکہ برہمنیت نے اپنے مخصوص انداز جذب و ہضم سے اپنے اندر ایسے تمدنوں کو جمع کر لیا ہے جو واقعی متضاد ہیں۔ اگر ہم سطح کے نیچے بغور دیکھیں تو یہاں پر دو صاف مختلف قسم کی آبادیاں نظر آئینگی۔ ایک سفید فام اور دوسری سیاہ فام۔ دونوں قسمیں قریب قریب ہر جگہ نمایاں ہیں۔ سیاہ فام آبادی جنوب میں غالب ہے۔ بنگال میں اگرچہ اسکی تعداد سفید فام آبادی سے کم ہے لیکن تاہم اسکی ہستی نمایاں ہے۔ گنگا کی بالائی وادی میں البتہ یہ آبادی بالکل غائب ہو جاتی ہے۔ یہ امر کہ دونوں آبادیاں قریب قریب تمام ہندوستان میں آپس میں مل جل گئی ہیں اس سے ثابت ہے کہ یہاں کی کوئی مروجہ زبان سنسکرت کی بگڑی ہوئی صورت نہیں ہے جسطرح کہ فرانسیسی اور اطالوی زبانیں لاطینی کی شاخیں ہیں۔ ہر ہندی زبان اگرچہ اُسکے لغات بیشتر سنسکرت ہی ہوں، اشتقاق و شکل میں غیر آرین ہے۔ لہذا ہندوستانی تمدن کے متعلق اندازہ قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہاں کے نسلی امتیاز کو بنیاد قرار دیا جائے سیاہ فام قومیں اکثر حصوں میں متمدن نہیں ہیں بلکہ وحشی ہیں۔ مسٹر بی۔ ایچ۔ ہڈسن کہتا ہے "ہندوستان کے وسیع براعظم میں تقریباً ہر جنگلی اور کوہستانی علاقہ میں لاکھوں انسان بستے ہیں جنکی حالت مادی طور پر ان جرمنوں سے مختلف نہیں ہے جنکا حال ٹیسی ٹس (Tacitus) نے بیان کیا ہے"

اب پھر ہمکو خاص ہندو اقوام اور مسلمان تارکان وطن میں امتیاز کرنا ہے۔ ہندوستان میں پانچ کروڑ سے کم مسلمان نہیں ہیں۔ اُن میں سے زیادہ تر افغانی ہیں یا پٹھان، عربی، ایرانی اور ترکمان یا تاتاری جو مختلف اوقات ہندوستان میں داخل ہوئے یا مسلمان فاتحین کیساتھ اُنکی فوجوں میں آئے۔ یہاں بھی مثل دیگر اسلامی ممالک کے انمیں ایک قسم کا نیم تمدن اور خاص خاص منتخب خوبیاں پائی جاتی ہیں، لیکن ان سے قدامت کی بو آتی ہے، الغرض انکے خیالات و عقائد سوسائٹی کی موجودہ حالت کے مناسب نہیں ہیں

اب ہم آخر میں ہندوستان کی مخصوص آبادی کی طرف آتے ہیں۔ یہ آرین قوم ہے جو پنجاب سے سنسکرت بولتی ہوئی آئی اور خاصکر گنگا کی وادی میں پھیلی۔ لیکن سارے ہندوستان میں اپنا مخصوص ویدیائی آئین جاری کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ شاید کسی دوسری قوم نے اس سے زیادہ تمدن کی اہلیت نہیں ظاہر کی، اسکے عہد جاہلیت سے بھی جیسا کہ ویدک لٹریچر سے منعکس ہوتا ہے، رحمدلی اور فراست ظاہر ہوتی ہے۔ ہندوستان میں آباد ہونیکے بعد بتدریج اس نے تمدن میں ترقی کی۔ اسکے عادات و رسوم قانون بن گئے اور پھر ان قوانین کو ایک جگہ منضبط کر دیا گیا۔ اسنے تقسیم کار کا اصول منضبط کیا، اسنے نظم، فلسفہ اور مبادیات سائنس ایجاد کئے۔ اسی کے سینہ سے وہ عظیم مذہبی اصلاح پیدا ہوئی جو بدھ مت کے نام سے موسوم ہوئی اور جو آج بھی دنیا کے ممتاز مذاہب میں شمار ہوتی ہے۔ اس حد تک یہ قوم اُن برگزیدہ اقوام سے مشابہ ہے جنکی پیدا کردہ ہماری تہذیب ہے

لیکن آرین قوم نے جتنی ترقی یورپ میں کی اتنی ہندوستان میں نہیں کی۔ ہندوستان میں اُسنے تاریخ نگاری میں حددرجہ اپنی نااہلی کا ثبوت دیا۔ چنانچہ اسکے تمام حالات بالکل گمنامی میں ہیں بجز ان مواقع کے جب یونانی اور مسلمان حملہ آوروں سے اسکا مقابلہ ہوا۔ محض قیاسات کی بناپر ہم اُن اسباب کو دریافت کرسکتے ہیں جو اسکی ترقی میں حارج ہوے۔ وہ مذہبی اصلاح چند صدیوں کے بعد نامعلوم اسباب کی بناپر ناکام رہی، بدھ مذہب ملک سے خارج کردیا گیا۔ اور پجاری قوم (برہمنوں) کا ظلم استوار بنیادوں پر قائم ہوگیا۔ کوئی بڑا اور ٹھوس سیاسی نظام نہیں پیدا ہوا اور نہ شہری تمدن کا کہیں براے نام وجود تھا۔ یہاں تک کہ غیر ملکی فتوحات کا تازیانہ لگ گیا

عرصہ تک غیر ملکی محکومیت میں رہنا قومیت کی بربادی کے نہایت زبردست اسباب میں سے ہے۔ جو کچھ تھوڑے بہت واقعات ہمیں قدیم ہندوؤں کی بابتہ معلوم ہیں اُن سے ہمارے اس قیاس کی تصدیق ہوتی ہے کہ کیا اثرات اُنکی شومی قسمت نے اُنکے اخلاق پر پیدا کئے۔ یونانی مصنف ارین (Arrian) ہندوستانیوں کی عادات کے متعلق لکھتا ہے" وہ نہایت بہادر ہیں شجاعت میں تمام ایشیا والوں سے بڑھے ہیں، وہ اپنی سادگی اور دیانت کیلئے مشہور ہیں، اسقدر معقول پسند ہیں کہ کبھی مقدمہ بازی کی نوبت نہیں آتی۔ وہ اتنے ایماندار ہیں کہ نہ تو اپنے دروازوں میں قفل بند کرتے ہیں اور نہ باہمی معاہدات کو درطہ تحریر میں لاتے ہیں اس میں شک نہیں کہ اس تعریف میں مبالغہ کی بو آتی ہے لیکن بقول الفنسٹن اس سے پتہ چلتا ہے کہ اُس زمانہ سے ہندوں کے خصائل میں غیر معمولی تبدیلی ہوگئی ہے حقیقی خصائص کو واقعیت سے بڑھا چڑھا کر ظاہر کرنے کا نام مبالغہ ہے۔ لیکن آج ٹھیک یہی خصائص ہندوؤں میں غیر فطری پیمانہ پر مفقود ہیں۔ چنانچہ زمانہ حال کے سیاح ٹھیک ان کے متضاد خصائص کے بیان کرنے میں مبالغہ کرتے ہیں۔ وہ ہندوؤں کو جھوٹا، بزدل اور انتہا درجہ کا مقدمہ باز بتاتے ہیں۔ لیکن یہ اختلاف واقعی ایسا ہی ہے جو عرصہ تک غیر ملکیوں کی محکومی میں رہنے کے باعث قدرتاً پیدا ہوتا ہے

فی الجملہ ہندوستان میں ہم تہذیب کے تین دور پاتے ہیں۔ پہلا کوہستانی قبائل کا دور جسے عہد جاہلیت کہہ سکتے ہیں اسکے بعد اسلامی تہذیب کا دور آیا۔ تیسرا دور اس برگزیدہ قوم کی نیم مردہ اور مغلوب تہذیب کا دور تھا جو ابتدا سے دنیا کے حکمران اور ترقی کرنے والے تمدن سے حیرت انگیز طریقہ پر علیحدہ رہی۔ جو کچھ اس قوم نے حاصل کیا مدت ہوئی کہ حاصل کیا، اُسکی رفیع الشان رزمیہ نظمیں جنکا مقابلہ مغرب کی سب سے بڑی نظموں سے کیا جاسکتا ہے، قدیم ہیں، اگرچہ جتنا خیال کیا جاتا ہے اس سے بہت ہی کم قدیم ہیں۔ یہی حال اُسکے فلسفہ اور قواعد کا ہے۔ ملک نے زمانہ حال میں کچھ نہیں حاصل کیا اس کا مقابلہ یورپ سے کیا جاسکتا تھا اگر یورپ بھی وحشی اقوام کی یورش اور تمدن قدیم کے زوال کے بعد نشاۃ ثانیہ سے محروم رہتا اور دسویں اور تیرھویں صدی میں تاتاری حملوں سے اپنے کو محفوظ نہ رکھ سکا ہوتا، بالفرض یورپ بھی آج تک اُسی حالت میں رہتا جو دسویں صدی میں تھی، ہر وقت ایشیای حملوں کی آماجگاہ بنا رہتا، زبردست قوموں اور طاقتور ریاستوں سے محروم رہتا، اُسکی زبانیں محض روزمرہ (ورناکیولر) ہوتیں جو ادبیات کے لئے غیر مفید ہوتیں، اُسکی تمام عقل و دانش ایک مردہ زبان میں محفوظ ہوتی، جسکو صرف ایک مغرور مذہبی اجارہ

طبقہ بقیہ لوگوں میں تقسیم کرتا، اُسکے تمام علوم صدیوں کے پرانے ارسطو، ورجل (Virgil) اور فاورس (Horace) کے مقدس صحیفے ہوتے جن میں کچھ اضافہ کرنا بغیر توضیح و تشریح ناممکن ہوتا۔ یہ حالت ہندوستان کے آرین کی عہد جاہلیت سے تو اسکو کوئی مشابہت نہیں ہے البتہ مغرب کی تہذیب کے دور وسطی سے اسے حیرت انگیز مشابہت ہے

مغربی اقوام پر رومہ کی حکومت کی مثال ایسی تھی جیسے جاہلیت پر تمدن کی حکومت ہو۔ اہل گال اور عبرانیون کے درمیان رومہ کی حیثیت ایک چراغ ہدایت کی تھی، جسکی درخشندگی کو وہ تسلیم کرتے اور اس سے اکتساب نور کرکے ممنون ہوتے۔ ہندوستان پر انگلینڈ کی حکومت گویا عہد وسطی پر عہد حاضر کی حکومت ہے۔ وہ تنویر جو ہم لاتے ہیں کم حقیقی نہیں ہے البتہ شاید کم کشش رکھتی ہے اور کم احسانمندی کے ساتھ لی جاتی ہے۔ یہ روشنی تاریکی میں چمکنے والی درخشاں روشنی نہیں ہے بلکہ اسکی مثال ایسی ہے جیسے شام کی گرم، ارپر شکوہ روشنی شفق میں دن کی قدرے ٹھنڈی روشنی داخل ہو جاے

بہت سے سیاحوں کا بیان ہے کہ ایک تعلیم یافتہ ہندو باوجودیکہ وہ ہماری طاقت کو تسلیم کرتا ہے، ہماری بنائی ہوی ریلوں کو استعمال بھی کرتا ہے پھر بھی ہماری عزت و تعظیم کرنا تو درکنار ہم سے نہایت ہی سچے دل سے نفرت کرتا ہے یہ بالکل قدرتی ہے ہم ہندوؤں سے زیادہ عقلمند نہیں ہیں، ہمارا دماغ اُن سے زیادہ گرانبہا اور اعلی نہیں ہے۔ ہم اُسکے سامنے، وحشیوں کی مانند، ایسے خیالات پیش کرکے جسکا اُسے وہم و گمان نہ ہو، اسکو حیرت زدہ نہیں کر سکتے۔ وہ اپنی نظموں میں سے ایسے خیالات پیش کرسکتا ہے جو ہمارے اعلی ترین خیالات کی ہمسری کرسکتے ہیں۔ ہمارے علوم میں بھی شاید بہت کم ایسے خیالات ہونگے جو اُسکے لئے بالکل جدید ہوں۔ ہم اسبات پر فخر نہیں کرسکتے کہ ہمارے پاس خیالات کا کافی ذخیرہ ہے یا ہمارے خیالات زیادہ اعلی ہیں البتہ ہمکو فخر ہے کہ ہمارے خیالات زیادہ پختہ اور کسوٹی پر کسے ہوے ہیں۔ زمانہ وسطی یا زمانہ قدیم کے تمدن کے مقابلہ میں موجودہ تمدن کو اس وجہ سے فوقیت حاصل ہے کہ اسمیں صداقت مبرہن کا زیادہ ذخیرہ ہے اور اس لئے اسکی عملی طاقت بہت ہی زیادہ ہے لیکن ایک شاعر مزاج یا معرفت کوش فلسفی ہرگز صداقت مبرہن کی عظمت کا قائل نہیں ہوسکتا۔ بلکہ وہ اسکو سطحی تصور کریگا، اسکی عملی کامیابیوں پر ناک بھوں چڑھائیگا اور اپنے غیر محدود دور از کار قیاسات و تخیلات کی فراوانی پر وجد کریگا

ہم اہل یورپ اس امر پر بالکل متفق ہیں کہ وہ گنجینۂ صداقت جس پر مغربی تہذیب کی بنیاد ہے نہ صرف برہمنی تصوف سے بلکہ اُس روشن خیالی سے بھی جسکو قدیم سلطنت رومہ نے یورپین اقوام میں منتقل کیا، بہت زیادہ قیمتی ہے۔ لہذا ہمارا فیصلہ ہے کہ وہ صورت حالات جو اس وقت ہندوستان میں ایک فاتح قوم کے تمدن کی اشاعت سے پیدا ہے اپنی اہمیت اور دلچسپی میں اُس صورت حالات کے مساوی ہے جو رومن ایمپائر نے پیدا کی تھی۔ علاوہ ازین یہ تجربہ مساوی طور پر وسیع پیمانہ پر ہو رہا ہے۔ بالعموم اس سلطنت کا اندازہ اس امر سے کیا جاتا ہے کہ باشندوں کی بہبودی پر اسکے فوری اثرات کیا ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ اس نے قدیم الایام کی خرابیان رفع کردی ہیں، دوسرا کہتا ہے اسنے نئی نئی خرابیاں پیدا کردی ہیں اس تمام بحث سے اُس مخصوص نوعیت کے کام کا پتہ چلتا ہے جو ہماری سلطنت کو کرنا پڑا ہے یعنی برہمنیت کے اندر یورپ کے تخیلات متعلق بہ کائنات کا

اختلال - اسوقت اسقدر دلچسپ تجربہ کرۂ ارض کے کسی حصہ میں نہیں ہو رہا ہوگا - جب ہم خیال کرینگے کہ کسی قوم کو کوئی قابل یادگار، کام انجام دینے کا موقع بہت شاذ ملتا ہے تو اس تجربہ کی ترقی سے ہماری دلچسپی بہت زیادہ بڑھ جائیگی اور ہم اُن مایوسی پر غالب آجائینگے جو قدرتاً ہم سے مطالبہ کرتی ہے کہ اس تمام پھیلے ہوئے ملک میں، کھلے ہوئے سورج کے نیچے اس قدر دقت شفقت سے ہمکو کیا نفع ملتا ہے

یہاں پر یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ہمکو اس کام میں ایک بڑی سہولت کا فائدہ حاصل ہے - یہ اسوقت واضح ہوتی ہے جب ہم اپنی سلطنت کا مقابلہ سلطنت روما سے کرتے ہیں - روما اپنی سلطنت کے قلب میں واقع تھا اسلئے ہر وقت ہمکو چاروں طرف سے رد فعل کا اندیشہ لگا رہتا تھا - علاوہ بریں روما جملہ خطرات کیلئے کھلا ہوا تھا - برخلاف اسکے انگلینڈ اپنی سلطنت سے بالکل الگ تھلگ ہے اُسے رد فعل کا مطلق اندیشہ نہیں ہے

تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ وہ سلطنت ہی کا بھوت تھا جس نے روما کی آزادی کو تباہ کیا - وہ تمام شہری جمعیتیں جنھوں نے روما کی عظمت کی آبیاری کی تھی اور جنکا رہون منت روما اپنی اُس ساری تہذیب کیلئے تھا جسے اُسنے بلاد مغرب کو منتقل کیا، چھوڑ دینا پڑیں اور روما کو اپنے لئے نسبتاً ایک ادنیٰ نظام اختیار کرنا پڑا جب اُسنے اپنی تہذیب منتقل کی تو یہ اختلاط نتیجہ تھی - سلطنت کے ایک بڑے حصہ میں خود روما کی زبان یونانی سے مغلوب تھی، یہاں تک کہ شہنشاہ ایم اوریلیس نے (Marcus Aurelius) خود اپنا Meditations (تخیلات) یونانی زبان میں تصنیف کیا - رومن مذہب بجائے اپنے متبعین پیدا کرنے کے آخر میں ایک دوسرے مذہب سے مغلوب ہو گیا جو سلطنت روما کے ایک دور افتادہ صوبہ میں پیدا ہوا تھا - ایک زمانہ ایسا آیا جب تمام رومن خیالات و جذبات مردہ ہوگئے اور شہنشاہان روما شاہان مشرق کی طرح صرف تاج شاہی پہننے کے لئے رہ گئے ہمکو اب علم ہوا ہے کہ درحقیقت یہ صورت نہیں تھی بلکہ رومن روایات و اثرات صدیوں تک یورپ کے دماغ پر مستولی رہے - لیکن یہ استیلا کچھ عرصہ تک پوشیدہ طریقہ سے قانون اور کیتھولک اصول کی شکل میں کارفرما رہا اور پھر آگے چلکر ادب و فنون کی تعمیر میں - خیال کرو وہ شہر جو یورپین تہذیب کی ماں ہے اگر بجائے اپنی شاگرد اقوام کے درمیان واقع ہونے اُنکی باہمی نزاع و ہنگامہ آرائیوں سے پریشان ہونے اور انکو تہذیب سکھا کر انکے ہاتھوں غیر شائستگی مول لینے کے بالکل الگ تھلگ واقع ہوتا، آزادی کے ساتھ اپنی خوشحالی سے بہرہ ور ہوتا اور خود اپنی تہذیب کو زیادہ انہماک و مستعدی سے ترقی دیتا، اپنی محکوم اقوام کی ہدایت میں پھنس نہ جاتا، تو آج یورپ کی تاریخ جدید کس قدر مختلف ہوتی

اس لحاظ سے رومن سلطنت ایک مخصوص حیثیت رکھتی تھی کیونکہ بمقابلہ مفتوحہ سلطنت کے فاتح قوت نہایت ہی حقیر تھی - گویا روشنی بجائے ایک ملک سے خارج ہونے کے ایک شہر سے خارج ہوتی تھی جو ایسی روشن قندیل نہیں تھی جس میں کافی مقدار میں روشنی جمع ہو - جمہوریت روما کے اندر خاصکر شہری جمعیتیں تھیں چنانچہ جب اٹلی ہی کے اندر اس جمہوریت کو وسعت دیگئی تو اسکی شکست شروع ہو گئی - لیکن جہاں فاتح قوت وسیع بنیاد پر ہوتی ہے تو فتح کی کشمکش سے اُسکی صورت

عام طور سے بدل جاتی ہے۔ فتح کیلئے جنگ لازمی ہوتی ہے اور پھر اُسکے قیام کیلئے انتظام کی۔ اور ان دونوں باتوں کے لئے جدید طرز حکومت اور مستحکم مالی حالت لازمی ہیں۔ ہندوستان میں سلطنت انگلینڈ کی سب سے بے نظیر خصوصیت یہ ہے کہ ہندوستان اور انگلینڈ کا رشتہ اتحاد بالکل ہی بے حقیقت ہے۔ بالفاظ دیگر انگلینڈ ہندوستان کے ردعمل کی زد سے باہر ہے۔ میں بیان کر چکا ہوں یہ صورت کیونکر پیدا ہوئی۔ میں نے واضح کیا ہے کہ ہم نے ہندوستان کو اس طرح حاصل کیا کہ ہمکو کوئی قیمت اسکی نہیں دینا پڑی۔ انگلینڈ اگر ایک ریاست کی حیثیت سے سلطنت مغلیہ کو تہ وبالا کرنے پر کمربستہ ہوتا تو خود اسکا نظام اسی طرح تباہ ہوجاتا جسطرح روؔمہ کا فتح یورپ کی سعی میں ہوگیا۔ کیونکہ اس صورت میں انگلینڈ کیلئے از بس ضروری ہوتا کہ وہ اپنے کو ایک اعلیٰ درجہ کی فوجی سلطنت میں تبدیل کرے لیکن چونکہ سلطنت ہند چند انگریزوں نے بدامنی کے زمانہ میں وہاں کے حالات پر قابو حاصل کرکے قائم کی اور اُنسے انگلینڈ کو ورثہ میں ملی اسوجہ سے اُس کے خانگی معاملات میں زیادہ گڑبڑ نہیں ہوئی۔ اسمیں شک نہیں کہ اسکی بدولت انگلینڈ کی خارجی حکمت عملی میں ایک حد تک تبدیلی پیدا ہوگئی ہے لیکن خود انگلینڈ کی اندرونی حالت میں کوئی تغیر نہیں پیدا ہوا۔ اس معنی میں ہندوستان، انگلینڈ پر اتنا ہی کم اثر انداز ہوتا ہے جتنا وہ نئی سلطنتیں جنکا سال ہی میں الحاق ہوا ہے۔ مثلاً ہنوور (Hanover) اور ہالینڈ (Holland)۔ اس مثال میں تمدن اعلیٰ کا اثر تمدن ادنیٰ پر زوردار اور مسلسل پڑتا ہے لیکن یہ بات رومن یا یونانی سلطنت کو مشرق میں نہیں حاصل تھی۔ اُن صورتوں میں تمدن ادنیٰ نے تمدن اعلیٰ کو جوں ہی اسنے اول الذکر کو اپنی سطح پر لانا چاہا فنا کردیا۔ یونانیت نے مشرق کو ڈھک لیا لیکن خود یونان کی عظمت ہمیشہ کیلیے رخصت ہوگئی۔ تمام قومیں رومن شہریت میں جوق درجوق شامل ہوئیں لیکن اصلی رومنوں کا کیا حشر ہوا۔ برخلاف اسکے انگلینڈ اس جوہر کی کمی سے جو اِس سے نکل جاتا ہے مطلق ضعیف نہیں ہوتا۔ وہ ہندوستان کو عہد وسطی سے نکال کر عہد جدید میں لانا چاہتا ہے۔ اس کام میں اُسکو دقتوں اور خطروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن انگلینڈ کو اس بات کا مطلق اندیشہ نہیں ہے کہ ہندوستان اسکو نیچی سطح پر کھینچ لائیگا یا ایک لمحہ کیلئے اُسکی ذاتی ترقی میں حارج ہوگا۔

یہ ہے انجام لیکن ایک عرصہ تک کسی کو یقین نہیں تھا کہ اس انجام کی نوعیت یہ ہوگی۔ برطانوی ہند کی تاریخ میں دو باب نہایت دلچسپ ہیں بلکہ میرا تو خیال ہے کہ ساری دنیا کی تاریخ میں ان سے زیادہ سبق آموز کوئی باب نہیں ہوسکتا۔ پہلا باب ہمکو بتاتا ہے کہ کس طرح ہندوستان کی طرف سے انگلینڈ کو مضرت رسان ردعمل سے محفوظ رکھا گیا اور دوسرا یہ کہ کس طرح بہت پس وپیش کے بعد قصداً یورپین تہذیب کا بار ہندوستان کے سینہ پر ڈالا گیا۔ پہلا باب جارج سوم کے عہد نصف اول پر حاوی ہے۔ یہ زمانہ تاریخ انگلینڈ میں نہایت ہی پرآشوب اور غیر مستقل تھا کیونکہ اُسی وقت ایک طرف امریکہ ہاتھ سے گیا اور دوسری طرف ہندوستان ہاتھ آیا۔ اسمیں کلایو اور ہسٹنگز کا عہد داخل ہے، اسکے آخر میں لارڈ کارنوالس کا عہد حکومت ممتاز ہے جو ۱۷۸۵ء سے شروع ہوا۔ دوسرا باب موجودہ صدی کے ابتدائی چالیس سالوں پر حاوی ہے اور

اس عہد کا ممتاز اور آخری نقطہ لارڈ ولیم بنٹنگ کی گورنر جنرلی ہے۔ کیونکہ ہندوستان میں لارڈ کارنواس اور لارڈ ولیم بنٹنگ دو ہی اعلیٰ درجہ کی قانون ساز ہستیاں گذری ہیں جس طرح کہ کلایو کے بعد لارڈ ولزلی۔ لارڈ ہسٹنگز۔ اور لارڈ لہوزی تین بڑے بڑے فاتح گذرے۔ چونکہ ہندوستان میں ہم تمدن کی رفتار ترقی پر غور کرتے ہیں یہ دو بڑی قانون ساز ہستیاں ہماری کمال توجہ کی مستحق ہیں

پہلے ہمکو دیکھنا چاہئے کہ شروع میں کس طرح ہندوستان کی جانب سے ردعمل کا خطرہ پیدا ہوا اور پھر کس طرح اسکا دفعیہ کیا گیا۔ اٹھارھویں صدی کے نصف دوم کی تمام تحریروں میں وہ خوف نہایت ہی دہشتناک ہے جسکا اظہار برک نے وارن ہسٹنگز کے خلاف اپنی تقریروں میں کیا تھا۔ اسوقت انگلینڈ ہندوسیاست کے غار عمیق میں کود پڑا تھا۔ اُسوقت انگریز مسلمان نوابوں کے وزیر مال یا نوابی فوجوں کے سپہ سالار مقرر ہوتے تھے اور انگلینڈ میں سلطنت مغلیہ کا مال غنیمت لالاکر بھر رہے تھے۔ اُسوقت ہمارے لئے دو خطرات تھے ایک تو یہ کہ مبادا انگریزی عادات خراب ہو جائیں کیونکہ وہ لوگ بھی جو ہندو عادات کے مداح ہیں یہ تسلیم کرینگے کہ گذشتہ صدی میں ہندوسیاست نہایت ہی ناگفتہ بہ اور مذموم تھی۔ اور دوسرا خطرہ یہ تھا کہ وہ مالدار اولوالعزم اشخاص جو ہندوستان سے لوٹ کر ایشیائی خیالات ساتھ لیکر انگریزی سیاسی زندگی میں داخل ہوتے تھے، مبادا اُسکے نظام ترکیبی کو درہم برہم کردیں۔ یہ خطرہ اسوقت خاص طور سے تھا کیونکہ اس زمانہ میں پارلیمنٹ کی بہت سی نشستیں ایک طور سے فروخت ہوتی تھیں۔ علاوہ ازیں اس وقت حکومت کی سب سے بڑی طاقت کا ذریعہ سیادت تھی۔ لہذا یہ اندیشہ رہتا تھا کہ ممکن ہے کوئی فریق ہندوستان کی سیادت پر نہ چھاپا مار بیٹھے اور یہ دولت ایسی تھی کہ چاہے بادشاہ کو ملتی یا وِگ پارٹی (Whig) کو اسکا پانے والا قوت اعلیٰ کا مالک ہو جاتا

اس خطرہ کا ایک نمونہ دینے کے خیال سے جو اُسوقت کے سربرآوردہ اشخاص کو لاحق تھا میں تمھارے سامنے ایک پارہ ولیم پٹ (W. Pitt) کی اس تحریک سے پڑھکر سناؤنگا جو اُسنے اصلاح پارلیمنٹ کی غرض سے ۱۷۸۵ء میں پیش کی تھی۔ وہ کہتا ہے "ہمارے قوانین میں بلحاظ رقابت یہ قاعدہ ہے کہ کوئی غیر ملکی شخص پارلیمنٹ کے نمایندہ کو ایک ووٹ نہ دے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ غیر ملکی والیان ریاست نہ صرف ووٹ دیتے ہیں بلکہ پارلیمنٹ کی نشستیں خریدتے ہیں، اور اپنے ایجنٹوں کو بحیثیت نمائندہ قوم ہمارے برابر بیٹھنے کیلئے بھیجتے ہیں۔ میں جس امر کی طرف اشارہ کر رہا ہوں اُسکے سمجھنے میں کسی کو دقت نہیں ہوگی۔ ہمارے درمیان راجہ تنجور اور نواب ارکاٹ کے ممبران بیٹھے ہوئے ہیں جو چھوٹے چھوٹے مشرقی مستبد حکمرانوں کے نمائندے ہیں۔ یہ بات اب عام طور سے مشہور ہے لوگ کھلے میدان اسکا تذکرہ کرتے ہیں لیکن لاپرواہی سے کوئی انکی طرف توجہ نہیں کرتا۔ ہماری بے عزتی روز روشن کی طرح نمایاں ہے۔ اب تو یہ اسقدر عام بات ہو گئی ہے کہ کسی کو اسپر مطلق حیرت نہیں ہوتی۔ اب یہ ایک معمولی بات سمجھی جاتی ہے کہ چند برطانوی رائے دہندگان نے اپنے ووٹ بے ایمانی سے رشوت لیکر غیر ملکی حکومتوں کے ہاتھ فروخت کر دئے یا یہ کہ ہمارے سنڈیکٹ کے بعض ممبران کسی غیر ملکی مستبد کے اختیار میں ہیں، اور یہ کہ ہمارے مبعوثین طانوی

اوصاف حمیدہ کے نہیں بلکہ مشرق کے ذمائم اور بدکاریوں کے نمائندے ہیں

اس کشاکش کے قابل ذکر واقعات یہ ہیں۔ فاکس ([illegible]) کے انڈیا بل پر کولیشن منسٹری coalition ministry کی شکست، اور پٹ ([illegible]) کے انڈیا بل کا منظور ہونا، وارن ہسٹنگز پر مقدمہ چلایا جانا، لارڈ کارنوالس کا اسکی جگہ گورنر جنرل ہونا اور ہندوستان میں اسکا انتظامی اصلاح جاری کرنا۔ میں صرف ان واقعات کی طرف اشارہ کر رہا ہوں تاکہ انکی اہمیت کا اندازہ ہوجائے اور معلوم ہوجائے کہ اُن سے کیسے کیسے نتائج رونما ہوئے۔ اگر میں تفصیل میں جاتا تو تمکو دکھا سکتا تھا کہ فاکس کے انڈیا بل پر جو اسقدر شور شغب مچایا گیا اور ہیسٹنگز کے خلاف جو اسقدر شدید حملے کئے گئے ان میں کس حد تک نامعقولیت تھی۔ میں اُس دوگانہ حکمت عملی پر بھی اعتراض کر سکتا تھا جو پٹ کے انڈیا بل نے ہندوستان میں جاری کی لیکن اگر وسعت نظر سے دیکھا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ خاص خاص خطرات سے کامیابی کیساتھ نجات مل گئی اور لارڈ کارنوالس نے خراج احسانمندی اور اڈمنڈ برک نے عزت و آرام حاصل کیا۔ کیونکہ لارڈ کارنوالس کے عہد حکومت میں کمپنی کے دامن سے بداخلاقی کا دھبہ جادو کی طرح دور ہوگیا۔ گورنر جنرلون کو ایک کبھی نہ فراموش کرنے والا سبق سکھا دیا گیا اور ساتھ ہی ساتھ ہندوستان کے تعلق سے جو سیاسی خطرہ تھا وہ گذر گیا

انگلینڈ نے ان زنجیروں کو جنسے اُسے مقید ہونے کا خطرہ تھا توڑ دیا۔ یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انگلینڈ جس نے اس سختی کیساتھ ہندوستان کا اثر قبول کرنے سے انکار کردیا، ہندوستان پر اپنا اثر ڈالنے میں کہاں تک حق بجانب تھا۔ ہم اچھی طرح سے محسوس کرتے تھے کہ ہماری اور ہندوستان کی تہذیب میں زمین آسمان کا فرق تھا، ہماری تہذیب کو بحیثیت مجموعی ترجیح حاصل تھی، لیکن کیا ہمکو ہندوستانیوں سے اپنے خیالات منوانے کا کوئی حق تھا۔ ہمارا مذہب، فلسفہ، تاریخ اور سب کچھ مختلف تھا۔ کیا۔ کیا ہندوستانیوں کے ساتھ ہمارا صریح معاہدہ نہیں تھا کہ یہ تمام چیزیں ہم سرکاری طور سے اُن سے علٰحدہ رکھینگے۔ شروع شروع میں لوگوں کا یہی خیال تھا۔ یہ عام طور سے مسلمہ تھا کہ انگلینڈ اپنی سلطنت کیساتھ وہ کھیل نہیں کھیلیگا جو رومہ نے کھیلا تھا۔ نہیں بلکہ اسے اپنی تہذیب ایک طرف رکھکر ہندوستان پر ہندوستانی نقطۂ خیال ہی سے حکومت کرنا چاہئے تھا۔ جون جون پہلی نسل کے اینگلو انڈینون پر علم سنسکرت کی جدید اور موہوم دنیا کھلتی جاتی تھی ان کے اندر یہ خیال تقویت حاصل کرتا جاتا تھا۔ وہ ایک قدیم فلسفہ اور خیالی تاریخ سے مسحور ہوگئے تھے، گویا ایک طرح وہ برہمنیت میں داخل ہوگئے تھے، اور نہیں چاہتے تھے کہ اپنی مسحور مشرقی چاردیواری کے اندر عیسائیت یا کسی اور مغربی علوم کو داخل ہونے دیں

اس لکچر میں اب اتنی گنجائش نہیں کہ اجمال سے بڑھکر میں تفصیل میں پڑوں۔ صرف اتنا اشارہ کرنا کافی ہوگا کہ کیونکر بتدریج ہم اس خیال کو چھوڑتے گئے اور بلاخوف اپنے کو بحیثیت "اوستادان تہذیب" اور "متمدن گر" پیش کردیا۔ یہ تبدیلی ۱۸۱۳ء میں شروع ہوی جب کمپنی کے عہدنامہ کی تجدید کیوقت ایک رقم قدیم علوم کے احیاء اور کارآمد فنون و علوم جدیدہ کے اجراء کے لئے منظور ہوی۔ اس قانون پر ایک تعلیمی کمیٹی ۲۰ برس تک بحث کرتی رہی کہ آیا علوم و فنون کو مشرقی نقطۂ خیال سے ہمیں سمجھنا چاہئے تھا یا اپنے معتقدات کی روشنی میں

آیا ہمکو سنسکرت اور عربی کی تعلیم دینا چاہئے تھی یا انگریزی کی

روے زمین پر اس سے زیادہ اہم مسئلہ پر کبھی بحث نہیں ہوی ہوگی۔ ۱۸۳۵ء میں لارڈ ولیم بنٹنگ کے عہد حکومت میں یہ بحث زوروں پر تھی، اُس وقت حسن اتفاق سے ایک ایسا مشہور شخص موجود تھا جسکی وجہ سے اس قابل یادگار بحث کو بڑی آب وتاب حاصل ہوی۔ یہ لارڈ میکولے کی رائے تھی جس نے کہ اس بحث کا انگریزی کے حق میں فیصلہ کیا۔ میکولے کی اس یادداشت میں یا سر سی۔ ٹرے ویلین ([illegible]) کی کتاب "ہندوستان میں مسئلہ تعلیم" میں تم اس بحث کو بخوبی دیکھ سکتے ہو۔ تم دیکھوگے کہ اس بحث میں ایک عجیب غلطی سرزد ہوی۔ اس مسئلہ پر اس نقطہ نظر سے بحث ہوئی گویا ایک طرف عربی اور سنسکرت اور دوسری طرف انگریزی میں انتخاب کرنا تھا یہ تمام زبانیں عام آبادی کیلئے یکسان غیر مانوس ہیں۔ عربی اور انگریزی تو غیر ملکی ہی تھیں لیکن سنسکرت بھی ہندؤن کیلئے وہی حیثیت رکھتی تھی جو یورپ کے باشندون کے لئے لاطینی۔ اسی سے تمام خاص خاص مروجہ زبانیں نکلی ہیں لیکن خود یہ مردہ ہے، اور لاطینی سے زیادہ عرصہ سے مردہ ہے کیونکہ تیسری صدی قبل مسیح میں اسکا شمار مستعمل زبانوں میں نہیں تھا۔ سنسکرت کی نظمون، فلسفیانہ اور مذہبی کتب کے بیشتر حصہ سے بڑی ہی تصنع اور آورد کی بو آتی ہے۔ ٹھیک اس طرح لاطینی زبان کی ([illegible]) اور ([illegible]) کی منظومات ہے۔ میکولے کو سنسکرت پر آسانی سے فتح حاصل ہوگئی کیونکہ یہان پر اسکو محض یہ ثابت کرنا تھا کہ انگریزی کی نظمین سنسکرت کی نظمون سے کسی طرح ادنیٰ نہیں ہیں اور اول الذکر کا فلسفہ، تاریخ اور سائنس تو سنسکرت سے کہیں ترقی یافتہ ہے۔ لیکن سوال یہ ہوتا ہے کہ انتخاب صرف مردہ زبانون سے کیوں کیا گیا۔ کیا لارڈ میکولے کا خیال تھا کہ ۲۵ کروڑ اہل ایشیا کو انگریزی سکھانا آسان کام ہے؟ غالباً نہیں بلکہ قوی گمان یہ ہے کہ اُسنے سوچا کہ محض ایک مختصر سی تعلیم یافتہ جماعت پیدا کیجاے۔ میرا بھی خیال ہے کہ میکولے کی کلاسکل زبانون کی تعلیم نے اُسکے اندر یقین پیدا کر دیا تھا کہ مردہ زبان تعلیم کے لئے ضروری ہے لیکن واقعی اگر ہندوستان کو روشن دماغ بنانا ہے تو یہ مقصد نہ تو سنسکرت سے حاصل ہو سکتا ہے اور نہ انگریزی سے، بلکہ اُسکی دیسی زبانوں سے جیسے ہندستانی ہندی، بنگالی وغیرہ۔ میکولے نے کسی مبہم خیال کی وجہ سے اِن زبانون کو اس قدر نا ملائم سمجھا کہ اُنکو فلسفہ اور علوم کا ذریعہ بنانا مناسب نہین سمجھا، اگر وہ انگریزی کے مقابلہ میں اِن زبانوں کے خلاف اپنے دلائل پیش کرتا تو یقیناً ناکام رہتا اگرچہ یہ عظیم غلطی ہوگی۔ البتہ ۱۸۵۴ء میں سر چارلس وُڈ کی تعلیمی کمیشن کی سفارشات کے بعد سے قدرے اسکی تلافی ہو چکی ہے، لیکن جس فیصلہ کی طرف لارڈ میکولے کی یادداشت نے رہنمائی کی وہ ہماری سلطنت کی تاریخ کا درخشان واقعہ ہے خصوصاً اس لحاظ سے کہ ہماری سلطنت ایک انجمن تہذیب ہے۔ یہ واقعہ اس زمانہ کی یاد دلاتا ہے جب ہم نے قصداً اپنے تئیں مکلف کر لیا کہ ایشیا میں ہمارے اوپر ایک ایسا فرض عائد ہوگیا جیسا روما نے یورپ میں اپنے ذمہ لیا تھا، اور یہ فرض ان تمام فرائض سے جنکی انجام دہی کسی حکومت کے سر پڑ سکتی ہے زیادہ اہم ہے

(ترجمہ) عبدالقیوم رسا

ازدواج مکرر

(افسانہ)

(بہ سلسلۂ ما سبق)

(۴)

صفیہ کو آئے ہوئے تقریباً ایک ماہ کا زمانہ گزر چکا ہے اور اس دوران میں کوئی ایسا واقعہ ذکی اور صفیہ کی زندگی میں پیش نہیں آیا، جسے کوئی خاص اہمیت دیجائے۔ صفیہ کو گھر کے انتظام، اور اُن نسوانی مصروفیتوں سے جو شادی کے بعد ایک عورت کا محبوب ترین مشغلہ ہوجاتے ہیں، اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ ذکی کے ادبی و علمی انہماک پر غور کرکے اپنے آپ کو اس میں حصہ لینے کے قابل بنائے اور نہ ذکی کو تحریر و مطالعہ اس امر کی اجازت دیتے ہیں کہ بیوی سے اس موضوع پر کوئی گفتگو کر سکے

گھر کی فضا اس وقت یہ ہے کہ ذکی بظاہر اپنی جگہ مطمئن ہے کہ صفیہ تعلیم یافتہ ہو یا نہ ہو لیکن بیوی ضرور ہے اور صفیہ بھی اپنی جگہ اس خیال سے خوش ہے کہ ذکی لاکھ آزاد خیال سہی لیکن صحیح معنی میں شوہر و انسان ہے

جب صفیہ میکہ سے واپس آئی تو اُسے خیال تھا کہ شاید ذکی پھر اُس بحث کو چھیڑے گا اور ممکن ہے کہ اس کا جہل یا غیر تعلیم یافتہ ہونا پھر کس وقت ذکی کی کبیدگی کا باعث ہو، لیکن اس ایک مہینے میں ایک بار بھی ذکی نے اس کا ذکر نہیں کیا اور تمام وہ التفات جسکی توقع ایک مرد کی طرف سے عورت کو ہوسکتی ہے اسپر صرف کئے گئے، ہرچند وہ اس کو ضرور محسوس کرتی تھی کہ ذکی جب گھر میں آتا ہے تو کوئی خاص موضوع گفتگو کا اُسکے پاس نہیں ہوتا اور زیادہ حصہ یا تو خاموشی میں بسر ہوتا ہے یا پھر کتابوں کے مطالعہ میں لیکن چونکہ اس انداز میں وہ کسی نوع کی نفرت نہیں پاتی تھی اس لئے اُسے کوئی شکایت بھی نہ تھی۔ فرصت کے اوقات میں وہ اس امر کی کوشش کرتی تھی کہ اپنے اندر ادبی ذوق پیدا کرے، لیکن جہاں اُسنے کسی نظم کی کتاب یا کوئی دیوان اُٹھا کر دیکھا اور اس کو وحشت ہوئی وہ ایک مصرعہ بھی موزون نہ پڑھ سکتی تھی اور قطعاً اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ایک شریف مرد یا عورت ایک غزل کا مطالعہ کیونکر کر سکتا ہے جبکہ اس میں اسقدر بے حجابانہ اور شرم انگیز طور پر محبت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اسنے بارہا الماری سے داغ وغیرہ کا دیوان نکال کر دیکھنے کی کوشش کی اور باوجود تنافر کے اسنے جبر کرکے اس کو سمجھنا بھی چاہا لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اسنے کسی شعر پر غور کیا ہو اور آخرکار اسنے منفعلانہ انداز سے اُسے بند کرکے نہ رکھدیا ہو۔ اس لئے بظاہر اس کو کوئی امید نہ تھی کہ وہ اب یہ کسی وقت اپنے ادیب و شاعر شوہر کے ذوق ادب کی ہم آہنگ ہوسکے گی بلکہ بعض اوقات وہ ذکی کے جانب سے بھی یکسر استفسار و استفہام ہوجاتی تھی کہ وہ شخص جو شاعری کا اسقدر دلدادہ ہو کیونکر اس کے چال چلن کی طرف سے اطمینان ہوسکتا ہے

ذکی کی زندگی ہر چند گھر کے اندر نہایت ہی سادہ معلوم ہوتی تھی لیکن اس کی یہی سادگی باہر جاکر "پُرکاری" میں تبدیل ہوجاتی اور اس کے وقت کا اکثر حصہ اپنے احباب کو اس امر کے یقین دلانے میں بسر ہوجاتا تھا کہ اس کی بیوی بے مثل ادیب وشاعرہ ہے۔ وہ پہلے ہی فیصلہ کرچکا تھا کہ اگر وہ خود براہ راست اپنی بیوی کی تعلیم یافتہ ہونے کے برکات ونعایم حاصل نہیں کرسکتا تو کم از کم وہ دنیا کو ضرور اس کا یقین دلاکر اپنی زندگی کو دوسروں کے نزدیک قابل رشک ثابت کریگا۔ چنانچہ وہ اب اپنے مضامین سے زیادہ اپنی بیوی ہی کے افکار نظم ونثر لوگون کو سنایا کرتا تھا اور جس وقت داد ملتی تھی تو وہ پھولا نہیں سماتا تھا۔ انسان جب اول اول اپنے آپ کو فریب میں مبتلا کرتا ہے تو کچھ عرصہ تک اس کو اس فریب کا احساس رہتا ہے۔ لیکن جب طبیعت اس کے عادی ہوجاتی ہے تو پھر یہ احساس بھی محو ہوجاتا ہے اور اس کو جھوٹی مسرت و لذت بھی اصلی و واقعی سی معلوم ہونے لگتی ہے۔

بالکل یہی حال ذکی کا تھا کہ وہ اپنی بیوی کے نام سے مضامین لکھ کر لوگون کو سناتا، رسایل میں شایع کراتا اور اُن کی داد ملتی تو وہ خود بھی یہ سمجھکر کہ واقعی اس کی بیوی کے یہ کارنامے ہیں، بہت خوش ہوتا اور ایسا محسوس کرتا کہ اس وقت ساری دنیا اس کے خوش بختی پر رشک کر رہی ہے۔

صفیہ ان حالات سے ابتک بالکل بے خبر تھی کیونکہ ڈاک باہر ہی آتی تھی اور ذکی نے انتظام کردیا تھا کہ کوئی رسالہ خط یا اخبار اندر نہ جانے پائے۔ وہ چاہتا تھا کہ خود کسی وقت بیوی سے ذکر کرکے اس خلش کو بھی دور کردے لیکن چونکہ اس کا ضمیر اس باب میں گناہگار تھا اور صفیہ کے مزاج سے وہ خایف تھا کہ مبادا اس کو پسند نہ کرے اسلئے اس کو ہمت نہ ہوتی تھی

ایک دن صبح اسنے آرٹ پر ایک مضمون صفیہ کی طرف سے لکھا اور اس کو تمام اُن نزاکتون اور لطافتوں سے بھر دیا جنکی اس موضوع پر ایک عورت کی طرف سے توقع کیجاتی ہے۔ وہ بہت خوش تھا۔ اتنا خوش کہ بے اختیارانہ اس کو لئے ہوئے اندر چلا آیا اور اس عزم کے ساتھ کہ آج وہ صفیہ سے ذکر کرکے اس پردہ کو بھی اوٹھا دیگا۔ صفیہ تمام کامون سے فارغ ہوکر ایک رسالہ کے مطالعہ میں مصروف تھی اور ایک غزل کو موزوں پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ذکی کو آتا دیکھ کر اسنے رسالہ الٹ کر رکھدیا، لیکن ذکی نے آتے ہی فوراً رسالہ اُٹھا لیا اور اپنی بیوی کے ذوق میں یہ تبدیلی دیکھ کر اس کے ارادہ میں اور تقویت پیدا ہوگئی اسنے بیٹھتے ہی پورے لطف و انبساط کے ساتھ مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔ "کہئے اس رسالہ میں آپ کو کوئی مضمون پسند آیا یا نہیں؟"

صفیہ نے جو بہت زیادہ بے تکلف ہوگئی تھی ہنستے ہوئے جواب دیا کہ "میں تو ایک غزل کو پڑھ رہی تھی اور غور کر رہی تھی کہ شاعری میں وہ کیا بات ہے جس پر آپ لوگ اس قدر سر دھنتے ہیں میں تو اس مشغلہ کو نہایت ہی شرمناک بات سمجھتی ہوں"

اس عجیب وغریب تنقید کو سنکر ذکی ہنس پڑا اور بولا کہ "بتائیے وہ کونسی غزل ہے اور اسمیں کیا شرمناک بات ہے"

صفیہ۔ کسی ایک غزل پر کیا موقوف ہے، میں تو جب کسی شعر کو پڑھتی ہوں، یا تو وہ بالکل جھوٹ نظر آتا ہے یا بالکل فحش۔ کل میں نے کسی کتاب میں یہ شعر پڑھا:۔

چھوڑ دوں گا میں نہ بات چلے آؤ ساتھ ساتھ نازک کلائی دُکھتی ہے تو آستین سہی

میں سچ کہتی ہوں کہ شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ لاحول ولا قوۃ۔ آپ لوگ کیونکر ایسی بیہودہ باتوں کو پسند کرتے ہیں"
ذکی بے اختیار ہنس پڑا اور بولا کہ " بالکل صحیح ہے، میں خود بھی اس شاعری کو پسند نہیں کرتا، لیکن سب شعرا ایسے تھوڑے ہی ہوتے ہیں"۔ اور صفیہ نے رسالہ لیکر ورق گردانی کی اور کہا کہ اچھا بتاؤ اس شعر میں کیا خرابی ہے:۔

مرے صیاد سر گرداں سے اتنا کوئی کہدیتا جہاں رُک جائے بجلی ہے وہ شاخ آشیاں میری

صفیہ " ماشاءاللہ، کیا کہنا ہے۔ بجلی بھی کہیں کسی سے رُک سکی ہے اور فرض کرد اگر وہ چٹیل میدان میں کسی جگہ رُک جائے تو وہاں شاخ آشیاں کہاں سے آئے گی۔ اس کے علاوہ صیاد سے کہنے کا کیا سبب ہے کیا شاعر کوئی چڑیا ہے جس کو صیاد گرفتار کرنا چاہتا ہے اور ایسا ہو بھی تو چڑیا کہیں خود اپنا پتہ بتا سکتی ہے۔ الغرض مجھے تو اس میں جھوٹ ہی جھوٹ نظر آتا ہے۔ آپ بتلائے اگر کوئی خاص بات اس میں ہو"
ذکی " میں خود تو کچھ نہیں بتا سکتا، مگر کوشش کرونگا کہ تم کو خود ایسی جگہ لے آؤں جہاں تم اس قسم کا کوئی اعتراض نہ کر سکو۔ اچھا یہ شعر کیسا ہے:۔

دل نے دنیا نئی بنا ڈالی اور تمھیں آجتک خبر نہ ہوئی

صفیہ " اس شعر کا پہلا حصہ بالکل جھوٹ ہے۔ دل کوئی نئی دنیا نہیں بنا سکتا۔ اس دنیا کے اندر جو دنیا بن سکتی ہے وہ اسی دُنیا کی ہوگی "
ذکی " اچھا یہ شعر کیسا ہے:۔

ہے کوئی بات آج ہونے کو جی بہت چاہتا ہے رونے کو

یہ شعر سنکر صفیہ کے جسم میں بے اختیار اک جھرجھری سی پیدا ہو گئی اور خاموش سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ چونکہ اس کے پہلے مصرعہ میں ایک نسائی اعتقاد کی جھلک موجود ہے اور دوسرے مصرعہ کی کیفیت اسپر ایک آدھ مرتبہ گزر چکی تھی اس لئے اسپر بہت اثر ہوا اور تھوڑی دیر بعد بولی کہ " وہ شعر جو انسان کو افسردہ کردے کس کام کا۔ رونے کے لئے آدمی کے پاس یونہی کیا کم اسباب موجود ہیں کہ اس میں شعر کا اضافہ کیا جائے۔ مہربانی کرکے اب کوئی شعر میرے سامنے اس طرح کا نہ پڑھیئے۔ خدا جانے مجھے کیا کیا وہم پیدا ہونے لگتے ہیں " اُس کی آنکھوں میں تری جھلک آئی تھی اور اس کا چہرہ مضمحل سا معلوم ہوتا تھا "
ذکی دیر تک غور کرتا رہا اور اندر ہی اندر اس تجربہ سے بہت مسرور ہوا کیونکہ آج اسنے صفیہ کے حقیقی ذوق شعری کو معلوم کرلیا تھا اور اس کی مُردہ امیدوں میں از سر نو آثار حیات پیدا ہونے لگے تھے۔ وہ اس وقت تک یہی سمجھ رہا تھا کہ صفیہ بالکل بے حس ہے، لیکن آج اسے معلوم ہوا کہ اس کے اندر شاعری کی نہایت لطیف و پاکیزہ حس موجود ہے اور اگر اس میں کوئی تحریک پیدا ہوجائے تو پوری قوت کے ساتھ بروئے کار آسکتی ہے اسنے جرأت کرکے پھر اس مسئلہ کو اُٹھایا اور بولا " میں نے آجتک

تم سے ایک بات چھپائی ہے، لیکن اب اس کا پوشیدہ رکھنا بیکار ہے۔ خفا نہ ہو تو کہوں"

صفیہ ۔ یہ آپ نے کیا کہا میں آپ سے خفا ہو سکتی ہوں، عورت خفا ہونے کے لئے نہیں پیدا ہوئی بلکہ منانے کے لئے دنیا میں آئی ہے؟ ذکی اُس کے اس عاشقانہ کیفیت رکھنے والے فقرہ سے بیتاب ہوگیا اور بولا" تم کو غالبًا وہ وقت یاد ہوگا جب تم نے مجھے خط لکھا تھا اور میں نے تمھیں تار دیکر فورًا طلب کیا تھا۔ تمھیں حیرت ہوگی کہ میں نے پھر کوئی ذکر تم سے نہیں کیا اور نہایت خاموشی کے ساتھ اتنا زمانہ بسر کر دیا

واقعہ یہ ہے کہ میری انتہائی مسرت کی صورت صرف یہی ہو سکتی تھی کہ تم شاعر ہوتیں، ادیب ہوتیں، تمھارے مضامین رسایل میں شایع ہوتے اور میں ان کی تعریف دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا: لیکن جب میں اس طرف سے مایوس ہوا تو میں نے ایک نمایشی اور غیر حقیقی مسرت پر قناعت کرنا مناسب سمجھا اور تمھاری طرف سے میں نے غزلیں، نظمیں، مضامین اور فسانے وغیرہ لکھ کر شایع کرائے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج ہندوستان کے ہر گوشہ میں تمھاری قابلیت و ذہانت کا ذکر ہو رہا ہے اور اس کثرت سے تمھارے نام تعریف کے خطوط آرہے ہیں کہ ایک بکس اُن سے بھر گیا ہے، تمھارا ادبی نام اپنے نام کی رعایت سے میں نے صفیہ ذکی رکھا ہے اور تمھیں نہیں معلوم کہ آج صفیہ ذکی کتنی شہرت و عزت کی مالک ہے"

صفیہ یہ سنکر سکتہ میں رہگئی اور ذکی کو اس طرح دیکھنے لگی گویا وہ کوئی اجنبی شخص ہے، غصہ و انفعال سے اس کا چہرہ پر نم آلود سرخی دوڑ گئی تھی اور وہ ایسا محسوس کر رہی تھی کہ کسی بازار میں برہنہ کھڑی ہے اور لوگ اس کو دیکھ دیکھ کر قہقہہ لگا رہے ہیں۔ فرطِ تاثر سے اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور وہ ایسے غم و غصہ کے عالم میں جو کبھی انتہائی مایوسی کے عالم میں پیدا ہو جاتا ہے اس سے زیادہ نہ کہہ سکی کہ " آپ نے بڑا غضب کیا"

اب اس کا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا، آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور ذکی جو کبھی اس نتیجہ کی توقع نہ کر سکتا تھا، حیرت و افسوس سے صفیہ کی اس حالت کا مطالعہ کر رہا تھا۔ جب کچھ دیر کے بعد صفیہ کا وہ اضطراب کم ہوا تو ذکی نے کہا کہ " یہ بات ایسی اہم تو نہ تھی کہ تمھیں اسقدر تکلیف ہوتی"

صفیہ ۔" میں پوچھتی ہوں کہ آپ کو اس سے کیا فایدہ ہوا۔ اگر واقعی میں ویسی ہوتی جیسی آپ چاہتے ہیں تو بھی اسکا اعلان بیکار سی بات تھی چہ جائیکہ بالکل خلاف واقعہ و حقیقت لوگوں کو اس کا یقین دلائیں۔ میں نہیں سمجھتی کہ اس سے زیادہ توہین میری اور کیا ہو سکتی ہے اور اس سے زیادہ رسوائی میری اور کیا ہوگی

میں حیران ہوں کہ وہ لوگ جو اپنی بیویوں کی قابلیت و ذہانت، خوش سلیقگی و تہذیب کا اعلان کرنا پسند کرتے ہیں وہ کس نتیجہ کو سامنے رکھ کر خوش ہونا چاہتے ہیں۔ اس جذبہ کا مدعا سوائے اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ دنیا اُن کی بیویوں کی طرف سے ایک خیال پسندیدگی و ستایش پیدا کرکے غائبانہ ان سے محبت کرے بے تکلف صحبتوں میں انکا ذکر کرکے غیر مہذب و ناشایستہ الفاظ سے یاد کرے اور موقعہ ہو تو خط و کتابت سے ان پر اپنی محبت کا اظہار کرکے اپنی طرف مایل کرلے آپ اگر اپنی

کسی چیز پر دنیا کو مبتلائے رشک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ آپ جانتے ہیں دنیا اس کے حصول کی خواہش کریگی یا کر سکتی ہے۔ پھر جو آپ نے مجھ کو اس صورت سے دنیا پر ظاہر کیا تو کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ لوگ مجھ سے محبت کریں اظہار عشق کریں، میرے حصول کی خواہش اُن کے دلوں میں پیدا ہو اور آپ اُن کی ناکامی، نامرادی اور مایوسی کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوں۔ اگر میں واقعی ایسی ہوتی تو بھی ایک صورت تاویل کی پیدا ہو سکتی تھی، لیکن موجودہ حالت میں، آپ کا یہ جذبہ میرے نزدیک ایک غیر شریفانہ حرکت سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ (صفیہ کا غصہ بڑھتا جاتا تھا) ۔ میں صرف اس وقت تک آپ کی بیوی رہ سکتی ہوں جب تک آپ اس تعلق کا احترام کریں، لیکن جب آپ مجھ سے کسی ایسے امر کی توقع کرینگے جو میرے اس تعلق کی توہین کرنے والا ہے تو میں انتہائی افسوس کے ساتھ آپ سے نافرمانی کرنے کی معصیت کو تو گوارا کر لونگی، لیکن آپ کو خوش کرنے کا ثواب حاصل کرنے کی ہمت مجھ میں کبھی نہ ہو گی۔ جسوقت میں اپنی اس رسوائی کا خیال کرتی ہوں تو شرم و غیرت سے زمین میں گڑ جانا چاہتی ہوں۔ خدا جانے لوگ کیا سمجھتے ہونگے میری غزلوں کو دیکھ کر جن میں یقیناً آپ نے نہایت ناروا جذبات کا اظہار کیا ہوگا، میرے چال چلن کی طرف سے کسقدر مشتبہ ہو گئے ہونگے اور یقیناً ایسے خطوط بھی آپ کو ملے ہونگے جو کبھی آپ مجھے نہیں دکھا سکتے اور کسے خبر ہے کہ آپ نے میری طرف سے اُن کو کیا جواب دیا ہوگا اور ان کی جسارتیں کس حد تک بڑھ گئی ہونگی

میں نے آپ کو پہلے ہی لکھ دیا تھا کہ میں قطعاً آپ کے ادبی ذوق کو پورا نہیں کر سکتی اور میں آج کہتی ہوں کہ وہ عورتیں جو اپنے شوہروں کے اس ذوق کو پورا کرنے والی ہیں وہ سب کچھ ہو سکتی ہیں لیکن بیوی نہیں بن سکتیں اور اس لئے مجھے ایک لمحہ کے لئے اس امر کے اعتراف میں شرم نہ کرنا چاہئے کہ میں جاہل ہوں، غیر تعلیم یافتہ ہوں اور جس تہذیب و تعلیم کی جستجو آپ لوگ عورتوں میں کرتے ہیں اس کو میں اپنی انتہائی توہین خیال کرتی ہوں

خدا کے لئے بتائیے کہ اب آپ نے کیا سوچا ہے اور مجھے اس عذاب سے کیونکر نجات دلا سکتے ہیں" ذکی اس میں شک نہیں کہ نہایت سنجیدہ انسان تھا اور مشکل ہی سے اس کو غصہ آتا تھا لیکن اس وقت صفیہ کی اس برہمی اور سخت تنقید سے وہ اس حد تک نادم ہو گیا تھا کہ چارہ کار بغیر اس کے نہ رہگیا تھا کہ وہ اپنی شوہریت کے اقتدار سے کام لے اور غصہ کا جواب غصہ سے دے اس نے صفیہ کی گفتگو کو دفعۃً روک دیا اور بولا کہ "مہربانی کرکے مجھے درس نہ دیجئے اور خاموش رہئے۔ جو کچھ ہو چکا ہے اس کی تلافی امکان میں نہیں ہے اور نہ اس کی ضرورت، آیندہ بھی یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہیگا۔ آپ کی اگر اس میں توہین ہے تو ہو مجھے پرواہ نہیں کیونکہ صفیہ ذکی جس کے مضامین شایع ہو رہے ہیں وہ میری دوسری بیوی کا نام ہے اور اس کے متعلق آپ کو بولنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے

. . . .

. . . .

گزشتہ واقعہ کو پندرہ روز ہو چکے ہیں اور اس دوران میں ذکی ایک مرتبہ بھی اندر نہیں آیا۔ سولھویں دن دوپہر کی

ڈاک سے بعض اخبار و رسایل آئے تو ان سب میں یہ اعلان اس کو نظر پڑا۔

"نہ میں شاعر ہوں نہ ادیب"

مجھے معلوم ہوا ہے کہ کچھ عرصہ سے بعض مضامین نظم و نثر میرے نام سے نکل رہے ہیں، اور دنیا کو غلط طور پر یہ یقین دلایا جا رہا ہے کہ میں بڑی قابل و فاضل عورت ہوں۔ حالانکہ اس میں مطلق صحت کا شائبہ نہیں ہے۔ میں اس کو اپنی سخت توہین جانتی ہوں کہ کسی قسم کی کوئی تحریر میرے نام سے منسوب کی جائے اس حال میں کہ وہ میری نہیں ہے۔ نہ میں نے اس وقت تک کبھی کچھ لکھا اور نہ آیندہ اس کی توقع ہو سکتی ہے۔ میں بہت کم سواد معمولی پڑھی لکھی عورت ہوں اور شعر موزوں بھی نہیں پڑھ سکتی چہ جائیکہ خود تصنیف کروں۔ اس لئے میں اس تحریر کے ذریعہ سے پبلک کو آگاہ کرتی ہوں کہ آیندہ اس نام سے شایع ہونے والی تحریروں کو نہ مجھ سے منسوب کرے اور نہ مجھ سے خط و کتابت کرے۔ صفیہ (اہلیہ مسٹر ذکی ......)

اس کے بعد ذکی اور صفیہ کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس کی تفصیل بیکار ہے، مختصراً یوں سمجھیے کہ صفیہ کو اپنے گھر آ جانا پڑا اور ذکی مجبور ہو گیا کہ اپنا غم و غصہ دور کرنے کے لئے کہیں باہر چلا جائے۔ ہر چند اس نے صفیہ کو طلاق نہیں دی تھی، لیکن جدائی بظاہر ہمیشہ کے لئے ہو گئی تھی اور دونوں اپنے مستقبل سے بے خبر حد درجہ غمزدہ زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔

(باقی) نیاز

آرٹ

روح کی پرواز ترقی کی طرف ہے لہذا اپنے تجربات کو کبھی دُہراتی نہیں بلکہ ہمیشہ کوشاں رہتی ہے کہ نئے اور زیادہ حسین وجمیل نقوش پیدا کرے۔ اگر عامۃ الناس کی طرح کاموں کی تقسیم اُنکے مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے مفید اور خوش آیند میں کیجائے تو اس قول کا اطلاق دونوں اقسام پر ہوگا۔ فنون لطیفہ کا منشا تخلیق ہے نہ کہ نقالی۔ کسی منظر کی مصوری میں صناع کی یہ کوشش ہونا چاہئے کہ اُس سے خوبصورت مرقع کھینچے جسکا ہمکو علم ہے۔ تفصیل یعنی فطرت کے تلوّن کو دبانا اور صرف روح اور اُسکی رعنائیاں دکھانا چاہئے

ہر صناع کو یاد رکھنا چاہئے کہ کوئی خاص منظر اُسکی نگاہ کے لئے سامان نشاط اس لئے مہیا کرتا ہے کہ ایسے خیال کا ترجمان ہے جسکی وہ صناع قدر کرتا ہے۔ اور قدر اس لئے کرتا ہے کہ وہی طاقت جو اُسکی آنکھوں کے ذریعہ سے دیکھ رہی ہے اُس منظر میں بھی کارفرما ہے۔ ایسا ملکہ پیدا ہوجانے پر وہ بجائے فطرت کے فطرت کے انکشافات کا دلدادہ ہوجائیگا اور اپنی تیار کردہ فرد میں صرف وہی خیال وخط نمایاں اور مرتفع کریگا جنھوں نے اُسکے دل میں خوشی کی لہر دوڑائی۔ ایک یہی صورت ہے کہ وہ نور سے کسب نور اور ظلمت سے اُسکے راز چھین سکتا ہے۔ کسی شخص کی تصویر بنانے میں اُسکے ناک نقشہ سے زیادہ اُسکی سیرت کی طرف توجہ کرنا چاہئے کیونکہ جو شخص سامنے بیٹھا ہے ایک ناقص تمثال اور دور کی شبیہہ ہے اُس حوصلہ مند اصل کی جو پس پردہ ہے

تمام روحانی مصروفیت میں جو شان اختصاص وانتخاب پائی جاتی ہے وہ اسی جذبۂ تخلیق کا کرشمہ ہے۔ ایک پرتو ہے اُس الہام کا جو گہرے معانی کو سادہ الفاظ میں بیان کرنا سکھاتا ہے

انسان کیا ہے؟ خود نمائی میں فطرت کی شاندار کامیابی! انسان کیا ہے؟ ایک منظر جو زیادہ خوشنما اور زیادہ بلیغ ہے اُن مظاہر سے جو افق کی زینت ہیں۔ وہ فطرت کا نقطۂ انتخاب ہے! اُسکی تقریر، اُسکا جذبۂ مصوری، اُسکی شیفتگی فطرت کیا ہے؟ ایک بلند تر کامیابی!

تھکانے والے کالے کوس، فاصلہ اور ابعاد ثلثہ کا بار گراں دور ہوگیا اور اُنکا جوہر یار کی موسیقی سے لبریز ایک لفظ یا پنسل کی ایک پُرکار جنبش میں مقید کرلیا گیا!

لیکن صناع مجبور ہے کہ وہی نشانیاں استعمال کرے جو اُسکے عہد اور اُسکی قوم میں رائج ہیں تاکہ اُسکے ہم جنس اُسکا پیغام سمجھیں۔ یہی وجہ ہے کہ آرٹ میں جو کچھ جدید ہے اُسکا ماخذ قدیم ہے البتہ دور حاضر کی فطانت اپنی کبھی نہ مٹنے والی مُہر کردیتی ہے اور ایسی دلکشی بھرتی ہے جو ناقابل اظہار ہے اور جس سے صرف متخیلہ لذت اندوز ہوتا ہے۔ صناع جسقدر اپنے عصر کے روحانی خصوصیات سے مغلوب ہوگا اور اُنھیں اپنے مخلوقات میں نمایاں کریگا اُسی قدر اُسکے کارناموں کی عظمت دیرپا ہوگی اور آنے والے نقاد دل سے

سامنے نامعلوم و ناگزیر در باتی قوتوں کے مظاہر پیش کریگا۔ کوئی شخص اس عنصر احتیاج کو اپنی محنت سے علیحدہ نہیں کر سکتا۔ اپنے دَور اور اپنے ملک کے قیود سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ نہ کوئی ایسا نمونہ پیش کر سکتا ہے جس میں اُس عہد کی تعلیم، مذہب، اقتصادیات، روایات اور علوم و فنون کا حصہ نہ ہو۔ چاہے اُس میں کتنی ہی اُپج ہو، چاہے کتنا ہی خود مختار و آزادہ رَو ہو اُن خیالات کے نقش و نگار نہیں دھو سکتا جن میں نشو و نما پائی۔ ایسا احتراز ہی اُس رواج کی چغلی کھائیگا جس سے بچنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی مرضی کے خلاف اور بلا ارادہ اُس فضا سے مجبور ہے جس میں سانس لیتا ہے اُن تخیلات سے متاثر ہونا لابد ہے جو اُسکے اور اُسکے معاصرین کے مایۂ حیات و حاصل سعی ہیں۔ وہ اپنے زمانہ کے خصوصیات کا علمبردار ہوتا ہے اگرچہ واقف نہیں ہوتا کہ وہ خصوصیات کیا ہیں۔ کسی عمل کا وہ حصہ جو فطرتاً ترتیب پاتا ہے ہمیشہ اور ہر حال میں اُس حصہ سے زیادہ دلکش ہوتا ہے جس میں انفرادی ذہانت گل کھلا رہی ہو کیونکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک دیو کا ہاتھ صناع کے قلم یا چھینی کو تاریخ نسل انسانی میں ایک سطر کے اضافہ کی رہبری کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصری و ہندی و چینی مورتیں خواہ کیسی ہی بھدی اور بدشکل ہوں اہمیت رکھتی ہیں۔ اُن سے پتہ چلتا ہے کہ اُس دور خاص میں روح انسانی کی اعلیٰ ترین تحریک کیا تھی۔ وہ خیالی تصویریں نہیں ہیں بلکہ وہی گہری ضرورت جو تکوین عالم کا موجب ہوئی اُنکی بھی موجد ہے

شاید اسکے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تمام فنون لطیفہ کی اہمیت کا راز اس میں مضمر ہے کہ وہ مکمل تا بہ تکمین اور خوبصورت ہوگا۔ یہاں ہیں نقاش ازل کے ساختہ مرقع قضا و قدر کی جس کے اشارہ پر ہر شئے اپنی قسمت کی تکمیل کو منزل کی طرف قدم بڑھا رہی ہے

تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو فنون لطیفہ کا منصب ادراک حسن ہے۔ ہم بحر حسن میں غرق ہیں لیکن آنکھوں کو اُسکا جلوہ صاف نظر نہیں آتا۔ ضرورت ہے کہ اُسکے خصوصیات کو فرداً فرداً نمایاں کیا جائے تاکہ ہمارا سویا ہوا وجدان جاگ اُٹھے اور صحیح راستے پر لگایا جائے۔ جب ہم بت تراشی یا مصوری کرتے یا ان فنون کے نمونے دیکھتے ہیں تو ہماری حالت ایسے طالبعلم کی ہوتی ہے جو محض ترتیب و ساخت کی لطافتوں کا مطالعہ کرتا ہو۔ حالانکہ کمال فن تحلیل میں ہے کسی شئی کو اُسکے پریشان کُن ملحقات سے علیحدہ کرنا۔ جب تک ایک چیز دوسری چیزوں کے استعمال سے پاک نہ کیجائے ہم اُس سے لطف اُٹھا سکتے ہیں اُسکا تصور کر سکتے ہیں لیکن اُسکا صحیح اندازہ نہیں ہوتا نہ اس نہج سے ہماری شادمانی و الم کا کچھ ماحصل ہوتا ہے۔ شیرخوار بچہ اطمینان سے خاموش پڑا رہتا ہے لیکن اُسکے ذاتی کردار اور اُسکی عملی قوت کا انحصار اس طرح روزانہ ترقی کرنے میں ہے کہ ایک شئی کو دوسری شئی سے جدا کرے اور ایک وقت میں ایک ہی شئی سے سروکار رکھے۔ محبت اور دیگر جذبات کا تقاضا ہوتا ہے کہ تمام زندگی ایک ہی ذات سے وابستہ کر دیجائے۔ بعض طبائع کا خاصہ ہے کہ اپنی پوری توجہ بغیر کسی استثنا کے ایک وقت میں ایک ہی شئی یا ایک ہی خیال یا ایک ہی لفظ کے لئے وقف کرکے اُسی کو دنیا بھر کا وکیل یا مشیر بنا دیتے ہیں۔ یہی لوگ صناع یا مقرر یا سوسائٹی کے پیشوا ہیں علیحدہ کرنا اور علیحدہ کرکے توسیع کی قدرت اُس طاقت لسانی کا جوہر ہے مقرر یا شاعر جسکا مالک ہوتا ہے۔ یہی طاقت یا کسی شئی کی

عارضی شوکت کو قائم کر دینے کی مہارت مصور یا بت تراش رنگ یا پتھر میں منتقل کر دیتا ہے۔ اس قدرت کا دارومدار اس امر پر ہے کہ صناع نے زیر غور شئی کو کتنی گہری نظر سے دیکھا۔ ہر شئی کا سلسلہ فطرت مرکزی پر مختتم ہوتا ہے اور اسکی شرح اس طرح کیجا سکتی ہے کہ وہی دنیا بن جائے لہذا طباعی کا ہر عمل ایک خاص وقت میں تنہا بلا شرکت غیرے حکمران ہوتا اور پوری توجہ اپنی طرف پھیر لیتا ہے۔ اُسوقت وہی ایک کام ہے جو قابل ذکر ہے غزل ہو یا راگ، یا کسی منظر کی تصویر یا کوئی مجسمہ یا خطبہ، یا کسی مندر یا میدان جنگ کا نقشہ، یا کسی نئے خطۂ ارض کی تلاش میں بحری سفر۔ زیادہ وقت نہیں گزرتا کہ پہلی شئی کی طرح ایک دوسری شئی پیش پیش ہو کر مطمح نظر بنتی اور جاذب توجہ ہوتی ہے۔ مثلاً ایک باغ جو خوش سلیقگی سے لگایا گیا ہو۔ اُس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باغ کے سوا کوئی اور کام کرنے ہی کا نہیں۔ میں آگ کو دنیا کی بہترین چیز سمجھوں اگر آب، خاک، باد سے واقف نہوں۔ ہر قدرتی شئی، حقیقی ذہانت، اور ودیعت شدہ اوصاف کو یہ حق حاصل ہے اور اُنکی سرشت ایسی ہے کہ ایک خاص وقت میں وہی دنیا کی چوٹی پر ہوں۔ ایک گلہری جو ایک شاخ سے دوسری شاخ پر کودتی اور پورے جنگل کو اپنی اُمنگ میں درخت واحد سمجھتی ہے ایک شیر سے کم جاذب نظر نہیں ہوتی۔ وہ بھی خوبصورت مکمل اور فطرت کی نائب ہے۔ ایک اچھا گیت سامعہ نواز ہو کر میرے دل کو اُسی طرح کھینچتا ہے جس طرح ایک رزمیہ نظم۔ کسی کامل فن کی بنائی ہوئی کتے کی تصویر اُسی طرح میرے ذوق کی تشنگی بجھاتی ہے جس طرح انجلو کے تیار کردہ مرقع۔ دلپذیر اشیا کے اسی تواتر سے آخرکار دنیا کی عظمت اور فطرت انسانی کے مالا مال ہونے کا سبق ملتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ علم بھی ہوتا ہے کہ جس بات نے مجھے پہلی چیز میں متحیر کیا اور دل کو موہ لیا وہی کیفیت دوسری چیز کے مشاہدہ سے بھی پیدا ہوئی لہذا خوبی تمام اشیا میں مشترک ہے

مصوری اور بت تراشی کا درجہ محض ابتدائی ہے۔ بہترین تصویریں اپنا آخری راز بتا دیتی ہیں۔ وہ بھدے نمونے ہیں ان معدودے چند نقطوں لکیروں اور رنگوں کے جو مجتمع ہو کر ہمیشہ متغیر ہونے والے منظر حیات کا سماں دکھاتے رہتے ہیں اور جن کے درمیان ہم زندگی بسر کرتے ہیں۔ مصوری آنکھ کیلئے وہی کرتی ہے جو رقص اعضا کے لئے۔ جہاں بدن کا سادھنا آ گیا، جسم میں پھرتی اور حرکات میں تناسب پیدا ہوا رقاص جانچ جانچ کر قدم رکھنا بھول جاتا ہے۔ اسی طرح مصوری رنگوں کی خوشنمائی اور خال و خط کی مناسبت کی تعلیم دیتی ہے۔ جتنی زیادہ تصویریں اور کمال فن کے نمونے دیکھنے میں آتے ہیں اُس قدر اتنا ہی ذخیرہ کا اندازہ ہوتا جاتا ہے جو مصور کے موقلم میں پنہاں ہے۔ اُسے اختیار ہے کہ بیشمار تمثالوں میں جسے چاہے اپنا موضوع بنائے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ ہر شئی کی شبیہ بنا سکتا ہے تو پھر کسی شئی کی شبیہ کیوں بنائے؟ اب میری آنکھیں کھلتی ہیں۔ اور آنکھوں میں وہ تصویریں پھرنے لگتی ہیں جو نقاش فطرت ہر رہگزر میں بنایا کرتا ہے۔ مرد اور بچے فقیر اپنی گدڑی میں اور خوبصورت عورتیں زرق برق لباس پہنے ہوئے متحرک نظر آتے ہیں۔ کسی کے بال لمبے ہیں کسی کے گھونگھر والے کوئی سرخ و سفید ہے کوئی سیاہ فام، کسی کے چہرہ پر جھریاں ہیں کوئی بلند بالا ہے، کوئی پست قد کسی کا سینہ فراخ ہے، کسی کا تنگ؛ کوئی فربہ ہے کوئی لاغر، کوئی متین کوئی شوخ...

پتھر کی مورتیں بھی یہی تعلیم دیتی ہیں مگر ذرا سادگی کے ساتھ۔ تصویر سے رنگوں کا پتہ چلتا ہے اور مجسمہ سے اوضاع

واطوار کا۔ جب میں کوئی عمدہ مجسمہ دیکھکر کسی مجمع عام میں داخل ہوتا ہوں تو اُس شخص کے قول کی تصدیق ہوتی ہے جو کہتا تھا کہ ہومر کی قراءت کے بعد ہر فردِ بشر دیو معلوم ہوتا ہے۔ میں بھی محسوس کرتا ہوں کہ تصویر کشی و بت سازی تحفہائے عشق ہیں تاکہ آنکھ اپنے فرائض کی باریکیاں اور سحرکاریاں دیکھے

کوئی مجسمہ چلتی پھرتی تصویروں کا مقابلہ نہیں کرسکتا، انکو پیہم تغیر کی وجہ سے اصنام خیالی پر بدرجہا شرف حاصل ہے۔ کیسا عمدہ مجموعہ فن کے شاہکاروں کا ہے! کس جدت پسند صناع نے اتنی مختلف جماعتیں اور ایسی نئی نویلی تمثالیں بنائی ہیں! اب لو: صناع اپنے دل سے باتیں گڑھتا اور چیزیں تراش رہا ہے! بہت مصروف ہے اور بہت خوش۔ ابھی ایک خیال آیا، ابھی دوسرا، اور ہر لحظہ پوری فضا، پورا منظر، پورا اسلوب بدلتا رہتا ہے حالانکہ وہی مٹی ہے اور وہی خمیر!

لے جاؤ روغن اور تختہ، قرمز کو، سنگ مرمر اور چھینیوں کو، سب خرافات ہے! اگر اِن سے دائمی آرٹ کی جادو طرازیوں کے مشاہدہ کے لئے ہماری آنکھیں نہیں کھُلتیں تو محض فیلسوفی و شعبدہ بازی ہے!

فن کے ہر نمونے کو آخر کار ایک طاقت اولیٰ سے منسوب کرنے سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ ان میں جو مشترکہ خوبی ہے یہ ہے کہ دنیا بھر اُن سے محفوظ ہوتی ہے اور اُن میں یہ استعداد ہے کہ ہماری سادگی ہمکو واپس دیں علاوہ بریں انہیں مذہبی شان پائی جاتی ہے کیونکہ وہ حسن کمال کا آئینہ ہیں روحِ مطلق کا ظہورِ ثانی ہے۔ اُسی چشمۂ نور کی ایک دھار ہے۔ اُنکے مشاہدہ سے دل پر وہی نقوش مرتسم ہونا چاہئے جو مناظرِ قدرت کے مشاہدہ سے ہوتے ہیں۔ مبارک اوقات میں فطرت ہمارے سامنے صرف ایک صورت میں ظاہر ہوتی ہے یعنی فن کمال کو پہونچا ہوا۔ یہی شان ایک صناع کے اختراعات فائقہ کی ہوتی ہے۔ وہی شخص آرٹ کا بہترین ناقد ہے جس میں سادہ جذبات اور عظیم حادثات انسانی سے متاثر ہونے کی صلاحیت مقامی واقعات اور مخصوص رجحانات پر جو تربیت کا نتیجہ ہیں فائق رہے۔ حسن دستیاب نہیں ہوسکتا چاہے اُسکی تلاش میں ہم دنیا بھر چھان ڈالیں تاوقتیکہ ہم اُسکو اپنے ساتھ لئے نہ پھریں۔ حقیقی حسن سطح کی دلکشی، خطوط کی ترتیب یا قواعدِ فن سے ماورا ہے۔ وہ صناع کی تخلیق میں انسانی کردار کی جلوہ گری ہے، حیرت انگیز اظہار ہے پتھر یا قرمز یا سُریلی آواز کے ذریعہ سے ہماری فطرت کے عمیق و سادہ ترین خصوصیات کا۔ لہذا حسن کو وہی افراد سمجھ سکتے ہیں جنکی روح میں وہ خصوصیات موجود ہیں۔

یونان کے سنگین مجسموں، روما کی عمارتوں اور اُستادانِ فن کی تیار کردہ تصویروں میں سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ تمام دنیا اُنکا پیغام سمجھ سکتی ہے۔ تہذیب نفس، خلوص محبت، امید اُنکے پردے میں سانس لیتے ہیں۔ ہم اُنکے پاس جو کچھ لے کر جاتے ہیں وہی واپس لاتے ہیں البتہ حافظہ کے لئے خوبصورت مثالوں کا اضافہ ہوجاتا ہے۔ جو سیاح وٹیکن جاتا اور مختلف کمروں سے سلسلہ در سلسلہ گزرتا ہے جن میں مجسمے، ظروف، کتبے، جھاڑ فانوس اور ہر قسم کی حسین و قیمتی اشیا آراستہ ہیں اُسکو یہ خطرہ رہتا ہے کہ اُن اصول کی سادگی کو نہ بھول جائے جن کی بدولت یہ اشیا معرضِ وجود میں آئیں اور یہ کہ اُنکا سرچشمہ وہی

خیالات و قوانین ہیں جو خود اُسکے سینہ میں جوش زن ہیں۔ وہ اُن یادگاروں میں ترتیبی قواعد کا مطالعہ کرتا ہے یہ نہیں یاد رہتا کہ یہ اشیا متفقہ مساعی کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں کے عطیے ہیں۔ ہر فرد کسی ایک صناع کی تخلیق ہے اور محنت کرتے وقت اُسے کسی دوسرے نمونہ کا شاید علم ہی نہ تھا۔ حیات اور تاہل کی زندگی شیریں و تلخ ذاتی تعلقات، دھڑکتے ہوئے دلوں، لڑتے والی آنکھوں، افلاس و احتیاج و امید و بیم کے علاوہ کوئی شاہیہ پیش نظر نہ تھی۔ یہی اُس کے ملہمات ہیں اور وہی تاثرات آپکے اور میرے دل و دماغ پر طاری کرتا ہے جسقدر شدت کے ساتھ اُسنے کسی جذبہ کو خود محسوس کیا اُسی شدت کے ساتھ اُسکا کردار اُسکے کارنامہ سے ظاہر ہوگا صناع کو سازو سامان و آلات کی بنا پر مجبور یا محدود نہ ہونا چاہئے بلکہ جہاں یہ نکتہ سمجھا کہ اپنے عمل میں اپنی روح منتقل کردے سنگ خارا بھی موم ہو جائیگا اور پورے اقتدار و رعنائی کے ساتھ ایک معقول حد تک اُسکے محسوسات کی ترجمانی کریگا۔ اُسکو حاجت نہیں کہ مروجہ و مسلمہ طرز کی پیروی کرے یا یہ دریافت کرے کہ روما و پیرس میں کیا دستور ہے اُسکا مکان، موسم، طرز معاشرت جسکو افلاس اور غیر معروف خاندان میں پیدائش نے بیک وقت ناگوار اور پیارا بنا دیا ہے وہ لکڑی کو میلا اور بے رنگ و روغن کاشانہ جو گمنامی کے ایک گوشہ میں کسی گاؤں یا جنگل کے قریب ہے یا تنگ و تاریک مسکن جو شہر کے مفلوک الحال باشندوں کے لئے مخصوص ہے کسی روشن طاق کی طرح اُس خیال کی جنبش کو کافی ہیں جو ہر شئے سے بلا امتیاز اُبل پڑتا ہے سہ

اُس روح کو غرض نہیں پست و بلند سے ‌‌ جو آپ کارساز ہے اور گرم کار ہے
جس جا ہے ایسی روح وہاں ہے سب اُوس کچھ ‌‌ ہر جا ہے ایسی رُوح اُسی کی بہار ہے

فنون لطیفہ کی ثنا و صفت میں جو کچھ بھی کہا جائے یہ ماننا پڑیگا کہ ابھی ابتدائی منزل میں ہیں۔ ہم اُس مقصد کی تعریف کرتے ہیں جو پیش نظر تھا نہ کہ نتیجہ کی وہ شخص انسانی امکانات کی تحقیر کرتا ہے جو سمجھتا ہے کہ فنون لطیفہ کی تخلیق کا بہترین زمانہ ختم ہو گیا حالانکہ جو کچھ ہوا چند لہروں سے زیادہ وقیع نہیں جو دریائے فطرت کے سطح پر اٹکھیلیاں کرتی ہوئی گزر گئیں وہ صرف اُس طوفان کا پتہ دیتی ہیں جو قعر دریا میں کروٹیں لے رہا ہے اور جسکا میلان تخلیق کی طرف ہے۔ آرٹ ابھی تکمیل کو نہیں پہونچا، اُسکو چاہئے کہ دنیا کی قوی ترین تحریکات کے دوش بدوش بڑھے اُسکا پہلو علمی و اخلاقی ہو، ضمیر سے وابستہ ہو، غریبوں اور عدم تربیت یافتہ لوگوں کو بآواز بلند دعوت صلح و امن دے۔ آرٹ کا ایک ماحصل اور ہے جو فنون لطیفہ سے بلند تر ہے، یہ فنون تو ایک ناتمام یا ضایع شدہ تحریک نفس کے ایسے بچے ہیں جو میعاد معینہ سے قبل پیدا ہوں۔ آرٹ تخلیق کی ضرورت کا نام ہے لیکن اسکی اصل عمیم و عالمگیر ہے۔ اپاہج اور بندھے ہوئے ہاتھوں سے کام کرنا اسکو شاق ہے اور تصویروں اور مجسموں کے مماثل لولے لنگڑے کا داک عفریت پیدا کرنا باعث ننگ سمجھتا ہے۔ اسکا کوئی مقصد ایسا نہیں جو انسان اور فطرت کی تخلیق سے پست ہو، آرٹ کچھ نہیں اگر انسان کے پورے مقدور کا مظہر نہیں، آرٹ کو چاہئے کہ دلوں میں خوشی کی ترنگ پیدا کردے اور تمام امتیازات و افتراقات کو مٹا دے تاکہ دیکھنے والا کل کائنات میں وہی قدرت و تناسب و ہم رشتگی دیکھلے

جسکا پتہ کسی صناع کی ذات میں اُسکا صنعتی عمل دیتا ہے۔ اسکا یہ اثر ہوگا کہ ویسے ہی دوسرے صنعت گر پیدا ہونگے۔

اس معنی میں ہر قابل قدر ہستی مع اپنے اقوال و افعال و اوضاع کے ایک مجسمہ ہے۔ ہر خوبصورت عورت جو اہل نظر کو اپنے حسن و جمال سے شریفانہ و غیر ملوثانہ طریقہ پر والہ و دیوانہ کردے ایک تصویر ہے۔ اور زندگی ایک نغمۂ شیریں و افسانۂ رنگیں۔

(ماخوذ) از ایمرسن

آثر لکھنوی

جنوری سنہ ۳۰ء کا نگار

جو ظفر شاہ کیلئے مخصوص ہے، مرتب ہو رہا ہے اور مضامین کی کتابت بھی شروع ہو گئی ہے لیکن اس وقت تک بہت کم مضامین موصول ہوئے ہیں اور جو آئے ہیں وہ بھی قابل ذکر نہیں اسلئے ہم نے وصولی مضامین کی تاریخ ۳۰ نومبر سنہ ۲۹ء تک بڑھا دی ہے۔ امید ہے کہ ارباب علم و قلم ادھر توجہ فرما کر تاریخ مقررہ تک اپنے مضامین بھیجدینگے۔

اگر اب بھی کافی مضامین موصول نہ ہوئے تو جو مضمون آجائیں گے انھیں شایع کر دیا جائیگا اور انعامی مقابلہ کی میعاد آیندہ ۶ ماہ تک اور بڑھا دیجائیگی لیکن جنوری سنہ ۳۰ء کا نگار بہر حال کم از کم ۱۶۰ صفحات پر شایع ہوگا خواہ سب کا سب ظفر کیلئے مخصوص نہ ہو۔ منیجر نگار

رسالہ جن کا نمونہ نمبر

اخیر نومبر سنہ ۲۹ء تک طیار ہو جائیگا۔ اسلئے جن حضرات نے ابھی تک نمونہ کی درخواست نہیں بھیجی وہ فوراً روانہ کردیں ورنہ پرچہ ختم ہونیکے بعد پھر نمونہ مفت نہیں ملیگا۔

رسالہ جن اردو زبان میں بالکل نئی چیز ہوگا اور عالم ارواح، عالم خواب، مابعد الطبیعیات، قرأت افکار، مقناطیسیت، حاضرات، مسمریزم، اور تمام اُن امور و مباحث پر جو انسانی روح و دماغی ارتقا سے تعلق رکھتے ہیں، تاریخی، علمی، تحقیق بحث کریگا اور اُن تجربات و واقعات کو بھی درج کریگا جو عالم روح کی عجوبہ زار دنیا سے واسطہ رکھتے ہیں ضخامت فی الحال ڈھائی جزو ہوگی اور قیمت ۴ سالانہ۔

۶ ماہ کیلئے خریداری منظور نہ کیجائیگی۔ منیجر رسالہ نگار لکھنؤ

باب المراسلۃ والمناظرہ

مکرمی۔ السلام علیکم۔ آپکا والانامہ لکھنؤ سے میرے پاس آیا۔ آپکی یاد آوری کا ممنون۔ آپ کا نگار بن عرصہ دو سال سے دیکھتا ہوں۔ آپکے ادبی مقالات کی میں بہت قدر کرتا ہوں۔ لیکن افسوس ہے کہ آپکی مذہبی تحقیقات میری سمجھ سے باہر ہیں۔ شروع میں تاویلات کر لیا کرتا تھا لیکن رفتہ رفتہ تاویلات کا دائرہ تنگ ہوتا گیا اور اب باوجود کوشش میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ پچھلے دو مہینہ کے پرچہ دیکھنے سے مجھے اطمینان ہوگیا کہ میری طرح اور اصحاب کو بھی آپکی مذہبی تحقیقات میں اعتراض ہے۔ اگر میرا خیال صحیح ہے تو یقیناً آپکی تصریحات مذہبی ایمانیات کی جڑ ونکو مضبوط کرنیکے بجائے متزلزل کر دینگی۔ اسلئے میں مجبور ہو گیا کہ آپکی توجہ دلاؤں امید ہے کہ آپ میری جسارت کو معاف فرما دینگے اور اپنی تحریرات کو ہر ایک مرتبہ نظر غور سے ملاحظہ فرما دینگے افسوس ہے کہ اس زمانہ میں ایسی ہستیوں کی امید رکھنا جو اپنی غلطیوں پر مطلع ہو کر تسلیم کریں بیسود ہے۔ جبکہ تاویلات کا دروازہ کھلا ہوا ہے ہر معاملہ کی تاویل کیجا سکتی ہے۔ بلکہ جو لوگ اہل قلم ہیں وہ الفاظ اور لغات کا پردہ ڈال دیا کرتے ہیں آپ نے اپنے خط میں پرچہ ماہ اگست کے مطالعہ کی طرف ہدایت فرمائی ہے۔ میں نے اوسکو دیکھا لیکن افسوس ہے کہ اسکی تصریحات اب بھی تشفی بخش نہیں ہیں اسلئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپکے مقالات مذہبی پر ایک سرسری تبصرہ کرکے میں نے جو نتیجہ نکالا ہے پیش کردں

"تو خواہ از سخنم پند گیر یا کہ ملال"

قرآن۔ قرآن کے نسبت آپکا نظریہ یہ ہے کہ "قرآن کو اصول فطرت ہی کے مطابق سمجھنے دیجئے اور غیر متعلق باتوں کو اوس میں شامل کرکے مذہب کی سادگی کو تباہ نکیجیے"

اصول فطرت سے آپکا کیا مطلب ہے اسکی تصریح کرنا چاہیئے۔ غیر متعلق باتوں سے آپ نے کون باتیں مراد لیں ہیں وضاحت کی ضرورت ہے۔ کیا اصول فطرت وہی ہیں جنکے پابند ہو کر آپنے قرآنی آیتوں کی تفسیر کی ہے۔ جسکے چند نظائر ذیل میں درج کرتا ہوں۔

مثلاً حضرت عیسی علیہ السلام کی پیدائش کے بارے میں قرآن فرماتا ہے:۔

مثل عیسی کمثل آدم خلقہ من تراب ثم قال لہ کن فیکون۔ آپ یوسف نجار کو اونکا باپ بتاتے ہیں۔ کیونکہ آپکے اصول فطرت میں بغیر باپ کے لڑکا پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن معلوم نہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کے ! بارہمیں جناب کیا ارشاد فرما دینگے۔ پھر افسوس ہے کہ الفاظ قرآنی اور سیاق عبارت بھی آپکا ساتھ نہیں دیتے کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کی تمثیل اور لفظ کن فیکون کا ہونا۔ جگہ جگہ حضرت عیسی علیہ السلام کے نام کے ساتھ ابن مریم فرمانا سب بیکار ہو جاتا ہے۔ پھر انہیں حضرت عیسی علیہ السلام کے بارے میں بطور خرق عادت کے استحسانا ارشاد ہوتا ہے۔

واذ تخلق من الطین کھیئۃ الطیر باذنی فتنفخ فیھا فیکون طیراً باذن اللہ وتبری الاکمہ والابرص باذنی

واذ تخرج الموتی باذنی۔ لیکن جناب کے نزدیک یہ خرقِ عادت نہیں ہے۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا یا ید بیضا صرف ایک تعبیر کامیابی تھی۔ اس موقع کے الفاظ قرآنی ملاحظہ فرمائیے

فالقیٰ عصاہ فاذا ھی ثعبان مبین۔ ونزع یدہ فاذا ھی بیضاء للناظرین۔ دوسری جگہ بجای ثعبان مبین کے حیتہ تسعی ارشاد ہوا ہے اور واضمم یدک الی جناحک تخرج بیضاء من غیر سوء اٰیۃ اخریٰ اب ثعبان اور حیۃ تسعی کے کیا معنی ہیں۔ تخرج بیضاء من غیر سوء سے کیا مراد ہے یہ سب نظربندی ہے یا تعبیر کامیابی۔ اسی طرح دریا کا پھٹ جانا اور پانی کا مثل دیوار کے قائم ہو جانا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارہ میں قرآن زنان مصر کی زبان سے جو رعب حسن سے مرعوب ہو گئیں تھیں۔ ما ھذا بشرا ان ھذا الا ملک کریم فرماتا ہے لیکن آپ اوسکو افسانہ سمجھتے ہیں۔ یہ وہی افسانہ ہے جسکو خدا احسن القصص فرماتا ہے

نماز کے بارے میں خدا نے ہر جگہ سے زیادہ قرآن میں مختلف عنوان سے ہدایت فرماتا ہے اور اوسکو مسلمانوں پر ان الصلوٰۃ کانت علی المومنین کتابا موقوتا سے فرض عین کرتا ہے۔ حتیٰ کہ خوف جان کی حالت میں بھی وقت سے بیوقت پڑھنے کی اجازت نہیں دیتا بلکہ نماز پڑھنے کا جنگ کی حالت میں طریقہ بتاتا ہے اسی آیت سے پہلی آیتیں قرآن کھول کر پڑھیئے۔ اور آپکا یہ فرمانا کہ خدا کی بتائی ہوئی عبادت، رسم ورواج یا ظاہری نقوش وحرکات کی پابند نہیں ہو سکتی، اب آپ فرماتے ہیں کہ عبادت کی غرض اتقیاد امر اور اجتناب از معاصی ہے صرف الفاظ کا پردہ ڈالنا ہے۔ اس سے کس کو انکار ہے لیکن یہی ظاہری حرکات وارکان مقصود تک پہونچنے کا ذریعہ ہیں۔ اور ذریعہ مقصود سے مقدم ہوتا ہے۔ تمام دنیا جانتی ہے کہ طہارت سے مراد ظاہری پانی بہا کر اعضا کو صاف کرنا نہیں ہے۔ بلکہ اعضا کو گناہوں اور دل کو خیالات فاسدہ سے پاک کرنا مراد ہے۔ قرآن نے بھی اسی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ قد افلح من تزکیٰ لیکن باوجود اسکے ارشاد ہوتا ہے۔ اذا قمتم الی الصلوٰۃ فاغسلوا وجوھکم وایدیکم الی المرافق وامسحوا برؤسکم وارجلکم الی الکعبین۔ یہ صرف پانی بہاکر اعضا کو پاک کرنا ہی۔ چونکہ وسیلہ ہے مقصود تک پہونچنے کا اسلئے ہدایت فرمائی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام آپسے زیادہ جانتے تھے کہ کعبہ سے مقصود توجہ الی اللہ ہے لیکن پھر بھی خود خدا سے ارکان حج کی تعلیم چاہتے ہیں۔ وارنا مناسکنا۔ اسپر احرام باندھنا۔ طواف کرنا۔ سعی کرنا وغیرہ وغیرہ تعلیم فرمایا جاتا ہے جو بجنسہ ابتک رائج ہے، اب آپکا یہ فرمانا کہ قرآن مین نماز موجودہ کی تصریح نہیں ہے یہ بھی تائید لفظی ہے۔ اور بے معنی ہے۔ بلکہ آپ جانتے ہیں کہ قرآن ایک متن متین ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا آپنے قرآن کو ایک ضابطہ کی شکل میں پیش کیا۔ اجمال کی تفصیل کی۔ یا خدا کی طرف سے خود تفصیل بتائی گئی۔ چنانچہ نماز کے بارے میں بھی حضرت جبرئیل کا آنا اور نماز کا طریقہ تعلیم فرمانا صحیح حدیثوں سے ثابت ہے۔ لیکن چونکہ آپ کے نزدیک کوئی صحیح حدیث موجود نہین ہے ہم استدلال میں پیش نہیں کرتے صرف معقولات سے جو آپ کے نزدیک ذریعہ رشد وہدایت کا ہے، گفتگو کرتے ہیں۔ ہر صورت میں نماز کی فرضیت نہین جاتی۔ مثلاً وضو کے بارہ مین صرف یہ آیت سے

اذا قمتم الی الصلوٰۃ الخ - لیکن کس طریقہ سے عمل کیا جاوے قرآن ساکت ہے۔ نماز میں صرف اوقات نماز اور ارکان کے الفاظ مثلاً رکوع وسجود قیام وقعود بتایا ہے لیکن نہ کوئی خاص تعیین وقت کی ہے نہ تعداد رکعت کی نہ طریقہ ادا کی۔ اسی طرح حج کو فرض کرتے ہوئے کوئی خاص طریقہ حج کا بیان نہیں کیا صرف ارکان مثلاً احرام - طواف سعی وغیرہ بتائی ہیں روزہ میں صرف ایکماہ کا روزہ اور تعیین وقت ہے زکوٰۃ میں صرف مصرف زکوٰۃ - کیا اس مجمل بیان کی وجہ سے آپ اُن سب باتوں کی فرضیت سے انکار کرینگے - اور اسکو نظام قومی اور سوسائٹی کا فرض بتاکے ختم کر دینگے، ظاہر ہے کہ اگر قرآن میں ہر ایک بات کی تصریح اور تفصیل کیجاتی تو معلوم نہیں کتنے دفتر طیار ہوجاتے - اسلئے کہیں تفصیل کر دی کہیں اشارہ کر دیا - اسکے ساتھ مسلمانوں کو رسول کی اطاعت فرض کردی - چنانچہ ملاحظہ ہو آیات قرآنی - وما اٰتاکم الرسول فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتہوا و من یطع الرسول فقد اطاع اللہ - و قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ - ولکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ - اس صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو قرآن کے اجمال کی تفصیل کی ہے وہ بھی دراصل قرآنی ہے۔ کیا اس صورت میں آپ احادیث میں جو قرآنی تفسیر یا تشریح ہے اوسکو غیر متعلق باتونمیں شامل کرکے اوسکی اہمیت کو کم کر دینگے میرے نزدیک قرآن کی تفسیر کے بارے میں یہ نظریہ ہونا چاہئے کہ

۱ - قرآن کے مطالعہ وفہم کا وہ طریقہ ہو جو تمام تر قرآن پر مبنی ہو ۲ - قرآن میں باہر کے اثرات کو دخل نہو مثلاً منطق فلسفہ سائنس - بنی اسرائیلیات ۳ - عربی لغتہ کے صاف اور معروف معانی - ۴ - عربی بول چال کے بے تکلف اور سادہ محاورات ۵ - صدر اول کا بے لاگ ذوق فہم - ۶ - اور رسول اللہ کا فطری اور غیر صناعی اسلوب بیان کیونکہ انبیاء کرام کی تعلیم کا مقصود بحث ونظر نہیں ہوتا بلکہ تلقین اور یقین پیدا کرنا ہوتا ہے - قرآن نے خود جا بجا اپنے نام گنائے ہیں وہ کہتا ہے کہ میں موعظتہ ہوں - ذی الذکر ہوں - تبیانا لکل شئے ہوں - تذکرہ ہوں - ھدی ورحمۃ ہوں اور یہ ظاہر ہے کہ جو بات موعظت ہو تذکیر ہو - نصیحت ہو ہدایت ہو - روح ودل کے روگوں کی شفا ہو وہ تاویلات کا بے پایاں دفتر نہیں ہو سکتا - نہ منطق وفلسفہ کا اکھاڑہ - خود امام رازی جنھوں نے تفسیر اسی رنگ میں لکھی تسلیم کرتے ہیں کہ لقد تاملت الطرق الکلامیہ و المناھج الفلسفیہ فما رایتھا تشفی علیلا - ورایت اقرب الطرق طریقۃ القرآن کیا مصیبت ہے کہ قرآن عربی زبان میں عرب میں نازل ہوتا ہے - تمام فصحا، قریش اوسکی فصاحت کے آگے سربسجود ہوجاتے ہیں - لیکن آج تیرہ سو برس کے بعد ایک شخص فتحپور میں پیدا ہوتے ہیں جو قرآن کو مجموعہ تاویلات اور معقولات کا ظاہر کرتے ہیں -

حدیث - کے متعلق آپکا نظریہ یہ ہے کہ بخاری جو اصح کتاب بعد قرآن ہے گیارہ سو برس سے مانی جاتی ہے آپ اوسکو ترک اسلام کا مرادف بتلاتے ہیں استدلال یہ پیش کرتے ہیں کہ دو سو برس کے بعد حدیث کی کتابیں تصنیف ہوئیں جب تحقیق کے دروازہ مسدود ہوچکے تھے اسلئے ناقابل اعتبار ہیں - گویا امام بخاری کی سولہ برس کی جانکاہی آپنے نوک قلم سے عبث اور بیکار ثابت کر دی - بلکہ جناب علامہ سید مقبول احمد صاحب تو کسی حدیث کی کتاب کو ہضم نکر سکے مجبوراً اونکو قے کرنا پڑی - شاید

انکو معلوم نہیں کہ غذا معدہ کی قوت، صلاحیت اور مناسبت سے ہضم ہوتی ہے۔ قرآن کا تو خود دعوی ہے کہ بعض قلوب جن کی
میں روگ ہے اس سے گمراہ ہوجاتے ہیں۔ کا کلمہ تو لوگ ہضم نکر سکے قتل اور جلا وطن ہونا منظور کیا۔ آفتاب کی روشنی
بھی کمزور آنکھوں کو پسند نہیں آتی۔ پانی کی خاصیت طبعی سبزہ کو اوگاتی ہے لیکن بعض زمینوں مین روئیدگی بھی پیدا نہیں
ہوتی پھر اونکو اگر حدیث کی کتابیں ہضم نہ ہوسکیں تو کیا تعجب ہے معلوم نہیں کہ امام ابو حنیفہ رح جو پہلی صدی میں ہوئے تھے
اونکی مسانید کیوں ناقابل قبول ہیں۔ اکثر احادیث مختلف طریق سے روایت کی گئیں ہیں تو کیا قدر مشترک بھی صحیح نہیں ہوسکتا
اب جبکہ تمام احادیث کی کتابیں بقول سید مقبول احمد صاحب مجموعہ اکاذیب اور بقول آپکے ترک اسلام کے مرادف ثابت
ہوگئیں اور اوسپر جناب نے ایک کلیہ بھی ارشاد فرمادیا کہ یہ کہنا "حدیث میں یہ آیا ہے بے معنی طریقہ رشد و ہدایت کا ہے"
پھر اگست کے پرچہ میں ارشاد فرمایا کہ وحی کی دو قسمیں ہیں ایک متلو دوسری غیر متلو ایک بے معنی جملہ ہے یا مغالطہ اسواسطے کہ جب
غیر متلو کا وجود ہی نہیں ہے تو اوسپر بحث کرنا بیفایدہ یا حوالہ دیا ہوتا کہ فلاں کتاب کی حدیث یا کم ازکم فلاں فلاں حدیث
قابل استدلال اور صحیح ہے۔ معلوم نہیں کہ خدا کے اس حکم کی تعمیل کہ لکم فی رسول اللہ اسوۃ الحسنہ کیسے ہوسکتی ہے جبکہ اسوہ
حسنہ کا پتا نہیں۔

فقہ - فقہ کی نسبت آپ فرماتے ہیں کہ دفتر بے پایاں ہے۔ اور بغیر سوچے سمجھے عرب میں بیٹھکر تمام دنیا کی قسمت کا فیصلہ ہمیشہ ہمیشہ
کے لئے کردیا گیا کیسے ممکن ہے کہ تمام دنیا کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کافی ہو جبکہ تمام دنیا کا تمدن اور تہذیب طرز معاشرت رسم و رواج میں
مختلف ہونا یقینی ہے۔ یہ نکتہ ہے جناب کا معلوم نہیں کہ قرآن کو اس کلیہ سے کیوں مستثنیٰ فرماتے ہیں۔ حالانکہ دیکھے بارے میں جناب
ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ کافر مومن ہر شخص کے لئے ہر ملک کے لئے قیامت تک کے لئے کافی ہے آپ جانتے ہیں کہ ان محدثین اور
فقہانے اخلاص اور محبت کے ساتھ نہایت جانفشانی سے اپنی تمام عمر صرف اسکے لئے وقف کردی تھی۔ محض حدیث کی صحت
کے لئے ایک خاص فن معرفت الرجال کا نکالا۔ ہر راوی کی تحقیق نہایت غیر طرفداری سے کی۔ کھرے کھوٹے کو علیحدہ کردیا۔
اسی اعتبار سے احادیث کی قسمیں کیں ان قسموں کے اعتبار سے احکام کی تفریق کی۔ یہ ممکن اور بہت ممکن ہے کہ باوجود ان
کوششوں کے کہیں غلطی واقع ہوگئی ہو۔ پھر اگر باقتضاء البشریت کہیں غلطی واقع ہوگئی ہو اور میں کہتا ہوں کہ ضرور
ہوئی پھر بھی وہ اصحاب اور اونکے کارنامے موجب تحسین ہیں نہ سبب نفریں لیکن اگر یہ کوششیں بھی جناب کے نزدیک
قابل اعتبار نہیں ہیں تو پھر دنیا کی تاریخ سب بیکار ہوجائیگی جس نے محض خیالی بنیاد قائم کی ہے۔ پھر تمام دنیا جانتی ہے کہ
ایک معمولی گھر کا انتظام بھی بغیر قاعدہ اور قانون اور اجتماعی حالت کے چل نہیں سکتا۔ سلطنت کے کاروبار چلانے کیلئے
بھی ایک قانون اور اوسپر اجتماعی طور سے پابند ہونیکی ضرورت ہے لیکن آپ تمام دنیا کے مسلمانونکو دعوت دیتے ہیں کہ
انفرادی حالت میں ہر شخص کو چاہئے کہ جسکی جو سمجھ میں آوے کرے۔ حالانکہ جب تمام دفتر فقہ کا بیکار ہوگیا تو انفرادی
حالت میں سب کا ایک مرکز پر جمع ہوجانا کیسے ممکن ہے۔ بہرحال جنکی تعداد فی ہزار نو سو ننانوے ہے کس قانون کے مطابق چلیں

کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ہندوستان میں آپ جیسے علامہ کتنے ہیں جنھوں نے چھ برس کی عمر میں فارسی درسیات سے فراغت حاصل کی ہو۔ کتنے ہیں جو چودہ برس کی عمر میں فضیلت کی دستار کے مالک بنگئے ہوں۔ ان بیچاروں کے لئے کیا ہدایت ہے۔

تقلید۔ اسکو آپ لعنت فرماتے ہیں۔ اسواسطے کہ ہر شخص کا پیدائشی حق آزادی ہے کوئی وجہ نہیں کہ اسکو پابند بنایا جاوے بیشک ہر شخص محکوم ہونا لعنت سمجھتا ہے۔ غلامی کی زندگی کو موت سے بدتر سب سمجھتے ہیں۔ ذلیل رہنا کس کو گوارا ہے۔ لیکن مجبوراً سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک جوان عقل وسمجھ کا انسان ایک طفل صغیر ناسمجھ کی تقلید پر مجبور ہے۔ مریض ایک غیر مہذب ڈاکٹر کے آگے سر تسلیم خم کردیتا ہے۔ محض اسوجہ سے کہ نابینا یہ سمجھتا ہے کہ راستہ کا علم اسکو ہے اسی طرح مریض سمجھتا ہے کہ اسنے پانچ سال اس فن کو لاہور یا لکھنؤ کالج میں حاصل کیا ہے۔ اعلیٰ ادنیٰ کو جذب کرلیتا ہے۔

گر تو سلطان نہ رعیت باشی تو نہ ہستی زرامت باشی

جو جواب اسکے بارے میں آپ دین وہی ہماری طرف سے قبول فرمائیے۔ اور پھر جاہلوں کے بارے میں آپ کیا ہدایت فرماوینگے۔ کیا اونکو بھی اجازت ہے کہ ہر کہ آید درولت بے نوف کن۔ ضیاءالدین احمد خاں صاحب کی طرح کسکو کسکو نگار کے مطالعہ کی ہدایت فرمادینگے

ہم بھی چاہتے ہیں کہ یہ قلادہ گردن سے اوتار کے پھینکدیں لیکن ہماری سمجھ میں ابتک کوئی صورت نہیں آئی۔ میں آپکا بڑا ممنون ہونگا اگر آپ تقلید سے میری گردن چھوڑادیں۔ سب سے پہلی بات جو اسمیں سنگ راہ ہے وہ حدیثوں کی تحقیق اور اونکے رواۃ کی جانچ ہے۔ فقہا اور محدثین کے اجتہاد کو علیحدہ کرکے کوئی صورت بتائیے۔ جبتک براہ راست حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیثیں نہ ملیں تقلید کرنا پڑیگی۔ آج تیرہ سو برس کے بعد اسبات کے یقین کرنیکی کون صورت ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے یہ حسن ہے۔ یہ مرفوع ہے یہ مرسل ہے

آپ فرماتے ہیں کہ یہ ایسا زبردست ترقی کا زمانہ آیا ہے کہ اب منقولات کی سیر کام نہیں دیسکتی اور حفاظت کی صورت اگر کوئی ہے

تصرف معقولات

اسکے متعلق مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ زبردست ترقی کے زمانہ سے آپکی کیا مراد ہے۔ کس چیز میں زبردست ترقی ہے۔ علم وحکمت میں۔ الحاد و زندقہ میں دولت وثروت میں بے دینی اور لامذہبی میں۔ اگر علم وحکمت مقصود ہے تو کس علم کی طرف جنابنے اشارہ فرمایا ہے۔ فلسفہ۔ حکمت سائنس۔ منطق۔ انگریزی۔ فارسی۔ عربی۔ ظاہر ہے کہ چونکہ قرآن فصیح زبان عربی میں نازل ہوا ہے اس لئے قرآن کا سمجھنا بغیر عربی کے ممکن نہیں اور ابتک کوئی آلہ ایسا ایجاد نہیں ہوا جسکے ذریعہ سے ایک علم کے پڑھنے سے تمام دوسرے علوم پر دستگاہ اور عبور ہو جاوے۔ کیا آپ اسبات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہر شخص طب کی کتابوں کا ترجمہ دیکھکر ایک طبیب حاذق ہوسکتا ہے۔ یا قانونی کتابوں کے ترجمہ سے دفعات کے مطالب حل کرسکتا ہے اگر نہیں ہوسکتا تو پھر کیسے ممکن ہے کہ بغیر عربی کی دستگاہ کامل رکھے ہوے قرآن کے مطالب حل کرسکے۔ اور قرآن کے مطالب حل کرنیکے لئے کن کن علوم کی ضرورت ہے اور اون علوم سے ہندوستان کے کالجوں میں کتنے طالب علم ماہر ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس زبردست ترقی کے زمانہ میں کتنے ابوحنیفہ ہیں کتنے شافعی ہیں کتنے بخاری

یا مسلم ہیں کتنے بایزید اور جنید و شبلی ہیں کتنے غزالی اور رازی ہیں - بریلی اور دیوبند کی بارگاہیں تو بند ہوگئیں کسی کالج ہی کی بارگاہ کا پتہ بتا دیجئے جہاں ان علوم کی تعلیم ہوتی ہو - اگر نہیں ہے کچھ نہیں ہے تو بے معنی الفاظ سے جملہ مرکب کرنا سوائے مغالطہ دینے کے اور کیا فائدہ ہے

اب ہی سائنس سو اسکا تمام تر مدار تجربہ اور مشاہدہ پر ہونیکے باوجود کیا آپکو معلوم نہیں کہ روزانہ اسکے اصول بدلتے رہتے ہیں کیا سائنس کی مطابقت قرآن سے کرنا چاہتے ہیں - تاکہ جب سائنس کا اصول بدلجائے تو قرآن کے احکام پھر غلط ہو جائیں - افسوس طوالت مانع ہے ورنہ علمائے سائنس کے اصول ہم آپکے سامنے رکھتے اور دریافت کرتے کہ اب اُنکی کیا حالت ہے - رہگیا فلسفہ و حکمت اسکے اصول خود ظنی ہیں پھر ظن کو یقین سے بدلنا آپ جیسے علامہ کا نظریہ ہو سکتا ہے علاوہ اسکے کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ انبیاء کرام فلسفہ اور حکمت کی تعلیم دینے کے لئے آئے تھے - اگر انبیاء کرام اپنے طریق تعلیم میں فلسفہ اور حکمت کا طریقہ اختیار کرتے تو ظاہر ہے کہ انکا خطاب عام نوع بشر سے نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ بجز چند افراد کے جنھوں نے علوم وضعیہ کا طریقہ سیکھا ہے نہ سمجھ سکتے ہیں نہ مکلف ہو سکتے ہیں - یا وہ ایمان کی براہ راست دعوت دینے کے بجائے مدرسوں میں تعلیم دلواتے پھر ان سے بحث و جدل کرکے قایل کرکے ماننے کے لئے مجبور کرتے - لیکن پھر بھی اس تمام تر ہنگامہ فتح و شکست سے سچائی کا فیصلہ کس طرح ہو سکتا تھا - قرآن اور سنت پر تدبر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اور اس قسم کے تمام طریق حصول مقصد کے لئے سودمند نہیں ہیں بلکہ ہدایت اور یقین کی راہوں سے دور کر دینے والے ہیں -

اب یہ بات کہ خلاف عقل باتوں کو اس طرح باور کرانا کہ حدیث میں ایسا آیا ہے بے معنی صورت رشد و ہدایت کی ہے معلوم نہیں کہ جناب نے عقل کا معیار کیا قرار دیا ہے علم کی کمی بیشی کا اثر عقل پر پڑ سکتا ہے یا نہیں اگر پڑ سکتا ہے تو سب لوگونکا ایک مرکز پر جمع ہو جانا کیسے ممکن ہے ہیئت اجتماعی کیسے پیدا ہو سکتی ہے - بڑے بڑے عقلمندوں نے عقل دوڑائی اور عجائب و غرائب قدرت کے کارخانونکو دیکھ دیکھ کر اور سوچ سوچ کر جان لڑائی اور کچھ نہ جانا اور جو جانا غلط جانا کیونکہ اگر عقل کی رو سے جاننا چاہئے تو ہزارہا امور ایسے ہیں جو دھوکا دیتے ہیں اور صحیح راستہ اور منزل حق تک نہیں پہونچنے دیتے - جب مشاہدہ اور تجربہ ہمیشہ دھوکا دیتے ہیں تو عقل کیسے رہنمائی کر سکتی ہے - جو صرف ایک ظنی علم ہے - مجبوراً بڑے بڑے سائنس دانونکو ماننا پڑا کہ وہ دھوکہ میں ہیں چنانچہ اڈورڈ کلاڈ کہتا ہے کہ "بیسویں صدی کے انکشافات گزشتہ صدی کی تحقیقات سے بازی لیجائینگے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ہم جسقدر عقل میں ترقی کر رہے ہیں اوسیقدر اسرار کائنات پیچیدہ ہوتے جاتے ہیں" - مسٹر ہربرٹ اسپنسر جسکو مسائل سائنس کو فلسفیانہ رنگ میں بیان کرنے میں ید طولی حاصل تھا اپنی مشہور کتاب اصول اولیہ میں بیان کرتا ہے کہ "عقل انسانی علم حقیقی کے حصول سے عاجز ہے" یوشین صاحب لکھتے ہیں کہ "خدا تعالی نے بے شک اس بات کے دکھانیکو کہ انسان اگر مطلق اپنی عقل پر چھوڑ دیا جاوے تو اوسکا ہی روپ ہو جاتا ہے جو اہل مصر کا تھا جنھوں نے عقل انسانی کو اعلی درجہ پر پہونچا دیا تھا اور پھر بھی نفرت انگیز بیہودہ بت پرستی میں پھنسے کہ لوگونکا تماشہ گاہ بنے - یونان کی بھی یہی حالت ہوئی - افلاطون

جسنے صحیفہ قدرت سے بعد غور کامل چند اصول لکھے تھے افسوس ہے کہ وہ خود بھی نہیں قائم رہ سکا۔ اسلئے ایسی فطرت عالیہ کا وجود ہدایت کے لئے ضرور ہے جو حق کو باطل سے تمیز کرکے بتا سکے اور تمام خلق کو اصلی راہ دکھا سکے جو آیندہ نسلوں کے لئے مشعل ہدایت ہو" یوروپین علماء کے نتائج تحقیقات چونکہ اسلئے پیش کئے کہ آپنے انھیں سے مرعوب ہوکر عقل کو معیار الٰہیات کے حاصل کرنے کا قرار دیا ہے۔ حالانکہ یہ وہی آواز بازگشت ہے جسکو معمولی درجہ کے اسلامی شعرانے کئی سو برس پہلے ملک کے سامنے پیش کیا تھا۔ چنانچہ حافظ شیرازی اپنی مستانہ ادا میں فرماتے ہیں کہ

حدیث مطرب ومی گو و راز دہر کمتر جو　　که کس نکشود و نکشاید بحکمت این معما را

نظامی گنجوی فرماتے ہیں

مہندس بسے جوید از راز شاں　　نداند که چوں بود آغاز شاں

خرد تا بدو ہر نتابد ترا　　کہ تاب خرد بر نتابد ترا

وغیرہ وغیرہ حیرت اور سخت حیرت ہے کہ جو لوگ علم الادیان میں دریدہ دہن نظر آتے ہیں وہی علم الابدان میں دہن بستہ ہوجاتے ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ایک بزرگ کا کہنا جسنے اوس علم کے حاصل کرنے میں اپنی تمام عمر صرف کی ہو۔ بدترین صورت رشد وہدایت کی سمجھی جاوے اور دوسرا شخص جسنے صرف چار پانچ سال ایک فن کو حاصل کیا ہو بڑے بڑے عقلا کی زبان بند کردے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ مذہب کی باتیں عقل وسمجھ سے باہر ہیں لیکن ہر شخص کی سمجھ ایک مرکز پر جمع ہو جاوے اور ایک ہی قسم کا نتیجہ نکالے اصولاً غلط ہے۔ یہ سچ ہے کہ قانون قدرت پر غور وفکر کرنے سے ایسی باتوں کو جو انسان کی طبیعت کو دھوکا دیں دریافت کرسکتے ہیں مگر کب جبکہ انسان کے معلومات کو ایک کافی ترقی اور قوانین قدرت پر اور اُن مختلف قوی کے اسرار پر جو اوسکے بانی نے اوسمیں رکھیں ہیں ایک معتدبہ آگاہی بھی حاصل ہو پھر تمام انسان اون دقایق پر نہیں پہونچ سکتے اور بالفرض جو پہونچ بھی سکتے ہیں وہ معدودے چند کے سوا نہیں ہوسکتے اور وہ بھی نہ اپنی عمر میں بلکہ پشتوں در پشتوں اور صدیوں در صدیوں میں۔ پس اسلئے کہ اوس قادر مطلق کی حکمت بیکار نرہے ضرور ہوا کہ وقتاً فوقتاً ملک اور زمانہ کے لحاظ سے ایسے ہادی پیدا کئے جائیں جو باعتبار اپنی فطرت کے سچے اخلاق کے بیان کا مخزن ہوں اور لوگوں کو دھوکا کھانے سے بچاویں اور اس راہ کی تکمیل فرماویں۔ انھیں کو اصطلاح شرع میں نبی رسول اور پیغمبر کہتے ہیں اور چونکہ ہر وقت اور ہر زمانہ میں ایسے ہادی نہیں رہ سکتے اسلئے یہ بھی ضرور ہوا کہ وہ اصول زریں اور سچے اخلاق جو نبی اور رسول نے بتائے ہیں اپنی اصلی حالت پر قائم رہیں اور ایک ایسی قوم انکی جانشین ہو جو دوسروں کو پہونچا دے۔ نبی کی کامیابی اور اوس کی سرگرمی صرف اسبات میں ہے کہ اوسکے افعال اور احکام مدلبقا ہوں نہ ممد فنا۔ اور اپنی اصلی حالت پر باقی رہیں۔ لیکن اگر آپکے نظریہ کے مطابق دیکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ نبی سے جو سنا اوسکو غلط کرکے دوسرونکو پہونچایا اور جنکو پہونچایا انھوں نے غلط نتیجہ نکالکر ایک مجموعہ اغلاط ملک کے سامنے پیش کیا۔

کیف یجوز لاحد من المسلمین ان یتکلم بمثل ھذا ویبدل کلام اللہ من تلقاء نفسه ویحرفه عن مواضعه سبحانک ھذا بہتان عظیم۔ کیا حضرت امام ابوحنیفہ یا امام شافعی رحمہ اس قسم کے لوگ تھے۔ ذرا مولانا شبلی کی

سیرۃ النعمان اوٹھا کر دیکھئے تو آپکو معلوم ہوگا کہ حدیث میں انکی نظر کسقدر وسیع تھی اصول روایت جسپر آپ بہت زور دیتے ہیں وہ انھیں کی ایجاد ہیں پھر تدوین فقہ کے لئے انھوں نے اپنے خاص شاگردوں میں چالیس آدمی منتخب کئے تھے مسائل کا استنباط زیادہ تر قرآن سے کرتے تھے بمجبوری صحیح حدیثوں سے مدد لیتے ہیں حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ تمام خلق امام ابو حنیفہ کی فقہ میں عیال ہیں۔ تقلید کو آپ لعنت کہتے ہیں۔ حالانکہ اجلہ علما مثلاً امام غزالی جنکے آگے آج بھی مشاہیر یورپ سر جھکانے کو تیار ہیں امام شافعی کی تقلید پر فخر کرتے تھے۔ صوفیائے کرام بھی تقلید کرنیکے لئے مجبور ہوئے خود حضرت سیدنا و مولانا عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ حضرت امام حنبلؒ کے مقلد تھے۔ علما کے نسبت جناب کا نظریہ یہ ہے کہ اس جماعت کے اکثر افراد اپنے علم کے لحاظ سے اس قدر جاہل۔ مذہب کی حیثیت سے اس درجہ نامسلمان اور اخلاق کے لحاظ سے اتنے منافق ہوتے ہیں کہ اگر اسلام کا معیار صرف انکی ذات کو قرار دیا جاوے تو پھر معیار کفر و نامسلمانی قائم کرنے کیلئے کوئی اور ہستی نہیں مل سکتی" جزاک اللہ۔ اسکے بارہ میں ہمکو زیادہ لکھنا نہیں کیونکہ ہم علما کی طرف سے وکالت کرنا نہیں چاہتے اسکے متعلق صرف اسقدر عرض کرنا ہے کہ چونکہ آپنے اکثر کا لفظ استعمال کیا ہے اوس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اب بھی کچھ علما ہیں جنکو صحیح معنوں میں عالم اور انکی ذات کو معیار کفر و نامسلمانی قائم کرنیکے لئے پیش کیا جا سکتا ہے کیا براہ مہربانی جناب مطلع فرما دینگے کہ یہ کس علم کے حاصل کرنے سے آپکے نزدیک بھی مسلم الثبوت مانے گئے۔ وہی بخاری کی حدیث جو ترک اسلام کے مرادف ہے اور وہی فقہا کا دفتر پارینہ جو غلط اصول پر مرتب کیا گیا ہے یا کوئی نئی کتاب حدیث کی جمع کی ہے اور اوس سے نیا دفتر فقہ کا مرتب کیا گیا ہے

اب آخر میں نہایت ادب سے عرض کرتا ہوں کہ شکست و ریخت بہت آسان ہے لیکن تعمیر مشکل ہے۔ نکتہ چینی سہل ہے لیکن انتظامی قابلیت کی جلوہ آرائی مشکل۔ ہنگامہ آفرینی سب کر سکتے ہیں مگر سکون اور امن قائم کرنیکے واسطے تدبر کی ضرورت ہے۔ آگرہ کا تاج محل یا آصف الدولہ کا امام باڑہ گرانیکے لئے ہر جگہ مزدور مل سکتے ہیں لیکن شاہجہاں کی معجز نما عمارت بنانیوالا کوئی ایک کاریگر نہیں مل سکتا۔ زباں سے جو چاہنا بک دینا قلم سے جو چاہنا لکھ دینا ہر شخص کر سکتا ہے۔ آپکو اوس وقت تک فقہا یا محدثین کے کارناموں پر پانی پھیرنیکا حق حاصل نہیں ہے جبتک اوسکی جگہ دوسرا مجموعہ نہ تیار کرلیں۔ نصاب نظامیہ کو آپ بدترین نصاب فرماتے ہیں براہ مہربانی بہترین نصاب سے مطلع فرمائیے

من انچہ شرط بلاغ است با تو میگویم — تو خواہ از سخنم پند گیر یا کہ ملال
اندکے پیش تو گفتم غم دل ترسیدم — کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

ربنا اغفر لنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین امنوا ربنا انک رؤف الرحیم۔

بدیع الزمان از فتحپور

نگار: میرے محترم دوست جناب مولوی بدیع الزماں صاحب فتحپوری نے (جن کے ہم وطن ہونے اور ایک ہی استاد کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کا فخر مجھے بھی حاصل ہے) اپنے مکتوب میں جس محبت و خلوص اور جس تاثر و دردمندی کے ساتھ میری کجروی

بیدینی، ناحق کوشی، اور زندقہ والحاد کا ذکر فرمایا ہے، اس کے اعتراف میں جی تو یہی چاہتا ہے کہ کسی طرح میں بھی وہی "چیز" بنجاؤں جو ان کے نزدیک قابل عزت ہے اور اپنے اندر وہی تغیر پیدا کروں جس کے دیکھنے کے وہ متمنی ہیں۔ لیکن

گریباں عاملے وارد کہ در دامن نمی گنجد

اور باوجود سعی وکوشش کے بھی میں ایک لمحہ کے لئے بقول عرفی اس میں کامیاب ہوتا نظر نہیں آتا کہ

محبت تو کنم جمع با مسلمانی

یہ اور بات ہے کہ آپ میری اس کیفیت کو جسے میں مسلمانی یا اسلام سے تعبیر کرتا ہوں کفر و بیدینی کا مترادف قرار دیں اور میں آپ کے اسلام کو صرف "بہ جوے نمی ارزد" کہکر ٹال جاؤں۔ بہر حال میں اپنے فاضل دوست کے تمام جذبات خلوص کی قدر کرتے ہوئے یہ بتادینا چاہتا ہوں کہ جو دلایل انھوں نے میرے خلاف ضبط فرمائے ہیں وہ جدید نہیں اور اس سے قبل بارہا میرے سامنے پیش ہو چکے ہیں اور میں نے کبھی اُن کو "نسیج عنکبوت" سے زیادہ نہیں سمجھا

آپ ضمناً بعض ایسے مسایل کا بھی ذکر کر گئے ہیں کہ اگر میں ہر ایک پر تفصیل کے ساتھ بحث کروں تو دفتر کے دفتر طیار ہو جائیں، لیکن اجمال کے ساتھ بھی ان پر بحث نہیں کرونگا۔ اس لئے نہیں کہ نتیجہ معلوم ہے، بلکہ اس لئے بھی کہ یہ طریق بحث اُس طریق کار سے بالکل جدا ہے جس کو میں نے اسلام کا مفہوم جاننے کے لئے متعین کیا ہے۔ آپ اسلام کو سمجھنا چاہتے ہیں شافعی وابوحنیفہ کو سمجھنے کے بعد اور میں اسلام سمجھنے کے بعد شافعی وابوحنیفہ کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں —— تو از آتش دخاں بینی من آتش از دخاں بینم —— آپ کا اصول سفر یہ ہے کہ آنکھ پر پٹی باندھ کر رہبر کے ہات میں ہات دیدینا چاہئے اور میں اپنی بصارت کو زایل کرنے کے بعد کسی بصیرت کے حاصل کرنے پر آمادہ نہیں۔ اس لئے ممکن ہے کہ آپ منزل تک پہونچ جائیں اور میں ایک قدم بھی آگے نہ چل سکوں مگر جس حد تک اطمینان ضمیر کا تعلق ہے، میں کبھی آپ کے "قطع منازل" اور "اپنی لغزش پا" کو متوازی نہیں سمجھ سکتا۔

آپ نے سلسلۂ گفتگو میں "حضرت آدم علیہ السلام" کے متعلق بھی اپنے پندار میں نہایت ہی مُسکت دلیل کے طور پر اک طعن آمیز استفسار کیا ہے حالانکہ آپ جن کو حضرت ادم علیہ السلام کہتے ہیں وہ کوئی مخصوص شخص نہ تھا اور نہ کلام مجید سے اس کو ثابت کیا جا سکتا ہے، موسیٰ کے عصا اور ید بیضا کا بھی ذکر کر کے مجھے مرعوب ومغلوب کرنے کی سعی فرمائی ہے، دریا کے پھٹ جانے اور دیوار کی طرح اس کے قایم ہو جانے کی روایت کو بھی اک حتمی واذعانی دلیل کی صورت میں پیش کیا ہے درانحالیکہ یہ سب ایک طرف ادب وانشاء کے استعارات وتشبیہات ہیں اور دوسری طرف تعبیرات اخلاقی جن سے ہر زمانہ کے نبی کا کلام لبریز نظر آتا ہے۔ اسی طرح آپ نے نماز، روزہ، حج وغیرہ کے متعلق بعض آیات قرآنی کے اشارہ سے میرے دعادی کو باطل کرنا چاہا ہے لیکن اس انداز سے کہ شاید آپ نے میرے مدعا کو بھی اس وقت تک نہیں سمجھا، بہر حال میں ان کے جواب میں اسوقت بغیر کسی ادنیٰ تفصیل کے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ میرا مذہب ان "اصنامی خرافیات" سے بہت بلند ہے اور اگر اسلام کے نزدیک

بغرض محال ان تمام مسایل کو اسی روشنی میں دیکھنا ضروری ہے جس میں آپ مطالعہ کر رہے ہیں تو معاف فرمائیے اس سے آپ کا مقصود سوائے اس کے کچھ نہیں کہ لوگ شافعی و ابوحنیفہ سے ہٹ کر خود بانی اسلام کے مقصد کو مشتبہ قرار دیں اور فقہ وحدیث سے ہٹ کر خود قرآن کو ریب و شک کی نگاہ سے دیکھنے لگیں۔ ممکن ہے آپ اس کے جواب میں فی قلوبہم مرض کہکر اپنی تسکین کر لیں، لیکن آپ کی تسکین دوسروں کے اضطراب کا علاج نہیں اور اسلام کا دعوائے حقیقت وحقانیت غالباً مسلمانوں سے زیادہ غیر مسلموں سے کیا گیا ہے

بھلا آپ نے احادیث کا بھی ذکر کیا ہے اور مجھ پر تعریض کی ہے کہ جب میں احادیث کی صحت کا قایل نہیں تو ان کو "وحی غیر متلو" کیوں کہتا ہوں۔ معاف فرمائیگا۔ اس باب میں بھی آپ نے میرے مقصود و مفہوم کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ میں یقیناً اقوال رسول اور افعال رسول کو سب سے زیادہ قابل تقلید و تمسک چیز قرار دیتا ہوں، لیکن آج صحیح احادیث کہاں ہیں اور کتنی۔ بعد ام الکتاب سب سے زیادہ معتبر بخاری کو سمجھا جاتا ہے حالانکہ تضاد و تناقض، رکاکت وسخافت، بے عقلی و اوہام پرستی، جن سے ایک نبی کے افعال و اقوال کو آپ بھی منزہ مانتے ہیں، بخاری کے حجم وضخامت کے خاص عناصر ہیں۔ اسی پنجوقتہ نماز کے باب میں دیکھئے کہ کتنی حدیثیں بخاری میں ایسی موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے تین وقت کی نماز کو کافی بتایا ہے۔ اس لئے میں یہ کہتا ہوں کہ جب کتب احادیث کی یہ حالت ہو تو ان کی تصحیح وتنقید کی طرف توجہ کرنا بیکار ہے کیونکہ اس میں ہمیشہ اختلاف رہیگا اور کسی ایک مرکز پر ہم کافۂ انام کو نہ لاسکیں گے، چنانچہ آج حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی کی تفریق انھیں کتب احادیث کی بدولت ہے اور وہ مذہب جس سے زیادہ وحدت فی الاعتقاد، وحدت فی العمل اور وحدت فی الحیات کا درس کسی نے نہیں دیا، اس وقت احادیث کے اسی تناقض و تخالف کی وجہ سے اک طرفہ تماشہ نظر آرہا ہے۔ اور شخص ثالث ان تمام مسالک کے انبوہ دلایل میں گم ہو کر رہجاتا ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کس جماعت کو واقعی مسلمان سمجھے اور کس کو غیر مسلم۔ اور اگر آپ یہ کہیں کہ یہ اختلاف حقیقتاً رحمت ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس اصول کو پیش نظر رکھ کر ایک شخص ہات چھوڑ کر یا ہات باندھ کر نماز پڑھنے آمین بالجہر و آمین بالخفا کے جھگڑے کو دیکھنے کے بعد کیوں نہ تیسری صورت اختیار کرے جو ان دونوں سے مختلف ہو۔ علی الخصوص اسوقت جبکہ "اذا تعارضا تساقطا" کے منطقی استدلال سے آپ کو بھی انکار نہ ہوگا۔

اسلام کے تمام منازل عروج و انحطاط کو تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھنے والا شخص اس نتیجہ تک پہونچنے پر مجبور ہے کہ اسلام میں تشتت وافتراق پیدا کرنے والا صرف احادیث کا عنصر ہے حتی کہ فقہ میں اختلاف کا سبب بھی اختلاف احادیث ہے اور اس سے زیادہ شرمناک بات ایک مذہب کے لئے کیا ہو سکتی ہے کہ وہ مختلف خیال کی مختلف جماعتوں کا مجموعہ ہو اور جن کے قانون میں بھی، رات دن، سیاہ وسپید اور ہاں، نہیں کا سا فرق پایا جائے۔

اس حال میں ظاہر ہے کہ آپ ایک غیر مسلم کو جب اسلام کی دعوت دینگے تو فروع سے ہٹا کر سب سے پہلے اصول ہی کی طرف لائیں گے اور اصول سمجھنے کا ذریعہ غالباً سوائے قرآن کے اور کوئی نہیں۔ پھر ایک شخص جب اصولاً مسلمان ہو جائے

تو کوئی وجہ نہیں کہ فروع کے انتخاب یا اجتہاد میں اسے آزاد نہ چھوڑ دیا جائے جب کہ آپ کے یہاں پہلے ہی سے اس میں کبھی نہ ختم ہونے والی نزاع قایم ہے۔ آپ ایک شخص کو تعلیم قرآنی کے تسلیم کرنے پر تو مجبور کرسکتے ہیں کیونکہ ان کی صداقت خود کسی دلیل کی محتاج نہیں لیکن امام بخاری اور امام ابوحنیفہ کی تقلید کو تو اصل مذہب قرار نہیں دے سکتے۔ آپ کو کیا حق حاصل ہے کہ ایک شخص کی آزادی تنقید کو اس سے چھین لیں۔ فرض کیجئے ایک شخص توحید و رسالت کو ماننے کے بعد مسلمان ہوجاتا ہے، لیکن وہ کہتا ہے کہ فروع کے باب میں مجھے آزاد چھوڑ دیجئے میں خود تحقیق و مطالعہ کے بعد فیصلہ کرونگا کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا، تو کیا آپ اسے اپنی جماعت سے اس بنا پر نکال دینگے۔ کیا آپ اس سے یہ کہینگے کہ نہیں اسلام کی ضروری شرط یہ بھی ہے کہ ابوحنیفہ اور امام شافعی کی تحقیقات پر آنکھ بند کرکے عمل کیا جائے۔ یقیناً کوئی ذی عقل انسان ایسا نہیں کہہ سکتا اور ہمارے یہاں کے علماء کرام کا یہی ظلم تھا اور ہے جس نے اسلام کو سخت نقصان پہونچایا!

یہ بالکل صحیح ہے کہ قرآن کی تعلیمات حکمت و فلسفہ سے بالکل علحدہ ہیں، کیونکہ اخلاق کی تعلیم دیگر دنیاوی علوم و فنون سے بالکل متمایز چیز ہے، لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں کہ مذہب کی تعلیمات عقول انسانی کو سلب کرلیتی ہیں۔ جب تک کوئی بات کسی کی سمجھ میں نہ آئے گی، کیونکر اطمینان نفس اس کو پیدا ہوگا اور یقین و اعتقاد کی صورت کیونکر رُونما ہوگی۔ آپ مجھے تو یہ کہکر ساکت کرسکتے ہیں کہ تو جاہل ہے، بیوقوف ہے تیرے دماغ میں قبولِ صلاح کی اہلیت نہیں ہے کیونکہ میں واقعی ایسا ہوں، لیکن ہر شخص سے تو آپ ایسا نہیں کہہ سکتے اور اگر ایسا کہہ سکتے ہیں تو اس کے یہی معنی ہیں کہ آپ اسلام کو حد درجہ تنگ نظر اور مستبد مذہب ثابت کرنا چاہتے ہیں جو بالکل حقیقت و واقعہ کے خلاف ہے۔

اب فرض کیجئے کہ ایک شخص قرآن کو کلام الٰہی اور نبی کو خدا کا پیامبر سمجھ کر مسلمان ہوتا ہے اور کلام مجید پر غور کرنے کے بعد کہتا ہے کہ۔ ید بیضا، عصائے موسوی، خرق دریائے نیل، قصۂ آدم، ولادت عیسیٰ وغیرہ کے متعلق جو باتیں عام مفسرین بتاتے ہیں ان کو میری عقل قبول نہیں کرتی، اس لئے میں خود کلام مجید سے اُن کو سمجھنا چاہتا ہوں، تو کیا آپ اس کو روکدینگے کیا کلام مجید پر غور کرنے اور کسی نتیجہ تک پہونچنے سے اُسے باز رکھیں گے۔ کیا آپ یہ کہدینگے کہ کلام مجید کو صرف ایک عرب ہی سمجھ سکتا ہے اور چونکہ تم عرب نہیں ہو اس لئے اس کو نہیں سمجھ سکتے۔ اگر اسلام واقعی اس تحدید و امتناع کا نام ہے تو پھر عہد وحشت کی لامذہبیت کیا بُری چیز تھی جب کم از کم معصیت کی آزادی تو انسان سے سلب نہ ہوئی تھی

مذہب کو دلایل منطقی، استنتاج فلسفہ، اصول حدیث و فقہ وغیرہ کی الجھنوں سے آزاد کرکے محض اخلاق کے سادہ اصول سے دیکھنا چاہیئے اور ان سے تجاوز کرکے فضول مباحث میں نہ پڑنا چاہیئے، کیونکہ جب تک یہ نہ کیا جائے گا ایک مذہب کبھی وسیع نہیں ہوسکتا اور نہ اس کی تبلیغ کیجا سکتی ہے۔ صرف اخلاق ہی ایک ایسی چیز ہے جس پر ہر ملک و عہد کا انسان متحد الخیال ہوسکتا ہے اور جس کو نوع انسانی مرتبۂ مرکزیت دے سکتی ہے، لیکن ایک مولوی یہ کہتا ہے کہ پہلے مجھے مولوی مانو، اس کے بعد ابوحنیفہ کو امام سمجھو، اور پھر قرآن پر غور کردیا نہ کرو مسلمان ہو۔

میرا عقیدہ ہے کہ دنیا میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جسپر تمام نوع بشری کا اجتماع ہو سکتا ہے اور اس خیال کو بنیاد قرار دیکر میں نے اسلام کا مطالعہ کیا ہے۔ میں اسلام کو جس صورت میں پیش کرنا چاہتا ہوں وہ ایک ایسی حقیقی صورت ہے جس کی وسیع آغوش سے دنیا کا کوئی ذی فہم انسان باہر نہیں نکل سکتا اور آپ حضرات یہ چاہتے ہیں کہ جو چند افراد مسلمان کے پائے جاتے ہیں وہ بھی اسلام سے خارج کر دئے جائیں اور اسلام کو ایک لایعنی معمہ، اک مہمل چیستاں، ایک عجوبہ زار بنا کر پیش کیا جائے جس میں سوائے خرافیات کے کچھ نہ نظر آئے اور جس کو ایک سنجیدہ انسان دیکھتے ہی ہماری عقلوں کے انحطاط پر بلا پس وپیش حکم لگا دے۔ نیز میں نہیں سمجھ سکتا کہ ان معتقدات سے اخلاق کو کیا فائدہ پہونچتا ہے اور انسان کی کس ترقی کا راز اس میں مضمر ہے

آپ فرماتے ہیں کہ شکست و ریخت آسان ہے، تعمیر مشکل ہے، بالکل میرا بھی یہی جواب ہے اور انصاف ہر ذی فہم کے ہات میں کہ علماء دین مذہب کی تعمیر کو مسمار کر رہے ہیں یا مستحکم

نیاز

نوٹس

ہندوستانی ایکاڈمی صوبہ متحدہ آلہ آباد کے مطبوعات

ازمنۂ وسطیٰ میں ہندوستان کے معاشرتی اور اقتصادی حالات ——

از علامہ عبداللہ یوسف علی۔ ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ ایم۔ سی۔ جی۔ ای ——

مجلد	عہ ۱۲
غیر مجلد	عہ

زیر طبع

(۱) مغلوں سے پہلے عرب ہندوستان کے تعلقات (از مولانا سید سلیمان صاحب ندوی)

(۲) مسلمانوں کے تمدن پر ہندوؤں کا اثر (از مولانا محمد امین صاحب عباسی)

(۳) ازمنۂ وسطیٰ کا ہندوستانی تمدن (از رائے بہادر مہامہو پادھیا گوری شنکر ہیرا چند صاحب اوجھا)

(۴) ہندی شاعری (از ڈاکٹر اعظم صاحب کریوی)

جنرل سیکرٹری ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد

باب الاستفسار

ہندو مسلم اتحاد

(جناب عبدالباقی صاحب۔ نوتنواں بازار۔ گورکھپور)

۲۴ تاریخ ماہ گزشتہ کی مختصر صحبت میں منجملہ دیگر تذکار کے ایک "ہندو مسلم اتحاد" بھی تھا جو موجودہ صورت میں "غیر تسلی بخش اور لایعنی" ثابت ہونے تک گفتگو ختم ہو چکی تھی

سوال یہ ہے کہ ہمیں من حیث القوم سیاسی حقوق حاصل کرنے کے لئے اب کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے۔ میرے خیال میں یہی ایک سوال ہے جس کے حل ہونے پر ہندوستان کی نجات کا انحصار ہے۔

(نگار) آپ کے استفسار میں دو باتیں درج ہیں "ہندو مسلم اتحاد" اور "من حیث القوم" سیاسی حقوق کا حاصل کرنا میں ان دونوں میں ایک نوع کا تضاد محسوس کرتا ہوں۔ خیال و منطق کا تضاد نہیں بلکہ "روداد عمل" کا تضاد۔ جس وقت تک کسی مخصوص قوم یعنی مخصوص مذہب کی حیثیت سے کوئی مطالبہ ہوتا رہیگا، اس وقت تک اتحاد کا خیال اک واہمہ و خواب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، لیکن اگر تفریق قومی یا تمیز مذہب سے قطع نظر کرکے صرف وطنیت کو پیش نظر رکھا جائیگا تو پھر ہندو مسلم اتحاد بھی حاصل ہو جائیگا اور "من حیث القوم" کا بھی سوال نہ پیدا ہوگا

چونکہ اس وقت تک ہمارے ہاں کے قایدین نے (خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان) مذہبیت کو علیحدہ رکھ کر اس مسئلہ پر غور نہیں کیا اس لئے تمام موجودہ دشواریاں پیدا ہو رہی ہیں اور اس وقت تک رونما ہوتی رہینگی جب تک ایک دوسرے کو عملاً فنا نہ کردے۔ اس باب میں ہندو مسلمان دونوں برابر کے مجرم ہیں اور مذہبی تنگ نظری دونوں فریق میں ایک ہی انداز کی پائی جاتی ہے نہ اُن کی سمجھ میں آئیگا کہ چھوت چھات اور گائے کے عنصر کو کس طرح ہندو دھرم سے علیحدہ کیا جا سکتا ہے اور نہ یہ قربانی اور باجہ وغیرہ کو جزو ایمان سمجھنے سے باز آئیں گے۔ اگر آج ہندو مسلمان دونوں اپنے اپنے مذہب سے حشو و زواید کو علیحدہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں یعنی دونوں بجائے مذہب کے صرف فلسفۂ مذہب کو سامنے رکھیں تو آج عصبیت دور ہو سکتی ہے اور عصبیت کا دُور ہو جانا ہی اصل اتحاد و اتفاق ہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ ممکن العمل نہیں ہے اور اس لئے یہ پیشین گوئی کرنا نہایت آسان ہے کہ ہندو مسلمان کبھی آپس میں نہیں ملسکتے اور ان کی جنگ اس وقت تک ختم نہ ہوگی جب تک ان میں موجودہ مذہبیت قایم ہے۔ یہ تو ہو گیا نظریہ۔ اب واقعات و حالات کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اب سوال ہندوستان کے سوراج ملنے یا نہ ملنے کا نہیں ہے بلکہ انتظار ہے صرف وقت کا

یہ امر روز روشن کی طرح متحقق ہو چکا ہے کہ ہندوستان آزاد ہوئے بغیر نہیں ہو سکتا، لیکن کب؟ اس کی تعیین بھی چنداں دشوار نہیں اور اگر لوگ میری پیشین گوئی پر خندہ زن نہ ہوں، تو میں کہونگا کہ دس سال کی مدت بھی اس کے لئے بہت زیادہ ہے

پھر ہندوستان کا آزاد ہونا چونکہ صرف ایک ہی معنی رکھتا ہے اور وہ یہ کہ ہندو جماعت اپنی کثرت آبادی، فراوانی دولت اور اشاعت علم کی مدد سے تمام دوسری قوموں پر حاوی ہو جائے اس لئے مسلمانوں کا قلت آبادی، کثرت افلاس، اور جہل کے اعتبار سے اک عنصر ضعیف کی حیثیت اختیار کرنا ناگزیر ہے۔ یہ بالکل ریاضی کی طرح کھلا ہوا نتیجہ ہے جس پر نہ شور و واویلا کی ضرورت ہے، نہ نالہ و شیون کی۔ ہندوستان ہندو قوم کا مُلک ہے، انھیں کی سرزمین ہے، اک وقت غیر معلوم سے لیکر اس وقت تک خدا جانے کیسے کیسے دورِ حیات اِن پر یہاں گزر چکے ہیں، اس لئے کسی کو کیا حق حاصل ہے کہ اُن سے اُن کے مُلک کو چھین لے یا اُن کے مقابلہ میں اپنے تفوق و برتری کو ثابت کرے، ترکی، ایران، افغانستان، مصر و حجاز میں مسلم حکومتیں موجود ہیں اس لئے اگر ہندوؤں کے دل میں بھی یہ ولولہ پیدا ہو کہ وہ ہندوستان میں اپنی اکثریت سے فایدہ اُٹھا کر اقتدار حکومت قایم کریں تو بالکل فطری امر ہے اور اس پر کسی کو بُرا ماننا میرے نزدیک سخت ناانصافی ہے

تاریخ کا یہ کوئی نیا واقعہ نہیں ہے۔ بارہا اس سے قبل تجربہ ہو چکا ہے کہ جب کسی ملک کی قومیں بیدار ہوئیں تو غیر ملکیوں کو وہاں سے نکلنا پڑا یا محکومیت اختیار کرنا پڑی۔ اگر مسلمان اس کو اپنی توہین سمجھتے ہیں کہ وہ ہندی کہلائیں تو پھر غیر ملکیوں کے ساتھ انکا بھی حشر ہونے والا ہے اور اگر وہ اپنے آپ کو یہیں کا فرزند جانتے ہیں تو پھر ان کو اپنی موجودہ مذہبیت کی تنگ نظری چھوڑنا چاہئے اور سمجھنا چاہئے کہ جس چیز کو آج وہ ایثار و قربانی کے نام سے ترک کر سکتے ہیں، کل اُن کو بہ جبر چھوڑنا پڑیگی اور پھر اُس وقت کسی معاوضہ کا سوال بھی نہیں اُٹھایا جا سکیگا۔

نہرو رپورٹ سے مخالفت کرنے والے وہی لوگ ہیں جو سمجھتے ہیں کہ برطانیہ کا اقتدار ہندوستان میں ہمیشہ قایم رہیگا لیکن جن کی نگاہیں زیادہ دُور رس ہیں وہ جانتے ہیں کہ نہرو رپورٹ کے نظام کو بھی ایک دن بدلنا ہے اور وہ نظامِ حکومت جو اس کے بعد آنے والا ہے، مسلمانوں کے لئے اور زیادہ سخت ثابت ہوگا اگر اس وقت انھوں نے رواداری سے کام لیکر ہندوؤں کا ساتھ نہ دیا

میں اس منطق کا قایل نہیں ہوں کہ اگر ہندو رواداری سے کام نہیں لیتے تو ہم کیوں لیں۔ رواداری خود آپ اپنی جگہ پیدا کر لیتی ہے اور اگر ہم پہلے سے سیلاب کے گزر جانے کے لئے جگہ بنا دیں تو دیوار کے گرنے کا اندیشہ باقی نہیں رہتا۔ اس لئے میرے نزدیک ہندو مسلم اتحاد سے زیادہ یہ مسئلہ غور طلب ہے کہ مسلمان کس حد تک ایثار سے کام لے سکتے ہیں اور اپنی اقلیت کو اہم بنانے کے لئے وہ کس حد تک تعلیم و اقتصاد میں ترقی کرنے کے لئے آمادہ ہیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی سوال اس وقت غور طلب نہیں ہے لیکن مجھے معلوم ہے کہ جب تک یہ کم سواد علما اور کوتہ اندیش لیڈروں کا گروہ موجود ہے وہ اذان باجہ، ناقوس، قربانی، تبلیغ، شدھی وغیرہ کے جھگڑوں ہی میں مبتلا رکھیگا اور کبھی اس کا موقعہ نہ دیگا کہ مسلمان سنجیدگی سے اپنے مستقبل پر غور کر کے

ان مہملات کو ترک کریں اور بحیثیت مسلمان ہونے کے نہیں بلکہ بلحاظ انسان ہونے کے دوسروں سے اتحاد کرنا سیکھیں حقیقت یہ ہے کہ ان حالات کو دیکھتے ہوئے مجھے مسلمانوں کا مستقبل بہت تاریک نظر آتا ہے اور یہ سیاسی یا مذہبی حقوق طلبی بالکل بے نتیجہ سی بات ہے۔ جس وقت تک اسپین کی قومیں بیدار نہ ہوئی تھیں مسلمانوں نے پوری داد حکومت دی، لیکن جب ان کو ہوش آیا اور انھوں نے آزادی حاصل کی تو مسلمانوں کو آخر کار ہسپانیہ کی سرزمین کو خیرباد کہنا ہی پڑا۔ بالکل یہی حال ہندوستان کا ہے کہ جب تک یہاں کی قوموں میں احساس ذلت و محکومیت پیدا نہ ہوا تھا مسلمانوں نے بھی حکومت کی، انگریزوں نے بھی شاہنشاہی کر لی، لیکن اب جبکہ سارے ملک میں بیداری پیدا ہو گئی ہے نہ انگریزوں کی حکومت یہاں رہ سکتی ہے اور نہ مسلمانوں کو کوئی ایسا خاص حق مل سکتا ہے جس کے وہ کسی طرح سے مستحق نہیں ہیں

نیاز

مرغ شب آہنگ

گرچہ میں ظاہر میں ہوں اک طائر یک مشت پر
قدر میری جانتے ہیں کچھ مگر با اہل نظر

ہوں نوا سنج فغاں بھی زمزمہ پرداز بھی
میرے نغموں کی صدا میں سوز بھی ہے ساز بھی

غیرت صحن چمن ہے تنگ دامانی مری
نغمہ پردازی بھی ہے، گویا گل افشانی مری

کھینچ لیتی ہے دلوں کو، زمزمہ سازی مری
وجد میں لاتی ہے طرز نغمہ پردازی مری

سحر پنہاں ہے مری آواز میں ڈوبا ہوا
میری طرز نغمہ میں جادو ہے اک چلتا ہوا

ہے مرا حسن ترنم جلوہ آرائے چمن
میرے ہر ذرہ میں پوشیدہ ہے سورج کی کرن

میں نے پرتولے ادہر اور اُس طرف آئی بہار
ہے مری جنبش میں راز گردش لیل و نہار

میرے نغمے اور بہار جلوۂ حسن چمن
تازہ کر دیتے ہیں دلمیں یاد ایام کہن

"عشرت دیرینہ" کا خواب پریشان، دیکھنا
اس طرف بھی اک ذرا او چشم گریان دیکھنا

شب کو جب ہوتی ہے ہر سو خامشی چھائی ہوی
صحن گلشن میں صبا پھرتی ہے اترائی ہوی

ذرہ ذرہ خواب سے لبریز ہوجاتا ہے جب
جلوۂ انجم، تبسم ریز ہوجاتا ہے جب

وسعت عالم پہ چھا جاتا ہے ہر جانب سکوت
ہر نفس دیتا ہے ذوق استراحت کا ثبوت

جب ترنم آفریں ہوتی ہے، موج آبشار
ہر طرف ہوتی ہے، عطر افشاں ہوا ئے خوشگوار

نخل جھک جاتے ہیں، ذوق خواہش آرام سے
روح ہوجاتی ہے غافل تلخی ایام سے

ہلکی ہلکی ابر کے ٹکڑوں سے، پڑتی ہے پھوار
بھینی بھینی بوئے گل دیتی ہے پیغام بہار

شوق پنہاں چٹکیاں لیکر جگاتا ہے مجھے
چپکے چپکے داستان گل سناتا ہے مجھے

بیخودی میں آشیانے سے نکل آتا ہوں میں
ساز گلشن میں نئی اک روح دوڑاتا ہوں میں

پھول کھل جاتے ہیں پھر میرے ہنسانے کے لئے
باد نرم آتی ہے مجھکو گدگدانے کے لئے

جھومتے ہیں غنچۂ نورس، مری آواز پر
رقص یا کرتی ہیں، کچھ پریاں صدائے ساز پر

وجد کرتے ہیں شجر، چلتی ہے رک رک کر ہوا
بربطِ موج رواں سے اب نہیں آتی صدا

محفلِ انجم میں رُک جاتا ہے سازِ سرمدی　　میرے نغمے ہیں نوا پرداز رازِ سرمدی
چاندنی لینا چاہتا ہے مجھ کو، پھر آغوش میں
میں سراپا شوق ہوتا ہوں وفورِ جوش میں
میں اسی عالم میں ہوتا ہوں نوا پرداز شوق　　نغمۂ الفت سے پُر ہوتا ہے میرا سازِ شوق
یک بیک برباد ہو جاتا ہے، سامانِ طرب　　آہ، وہ کیفیتِ سرشار، وہ شانِ طرب

وہ شباب آرزو آشوب پیری بن گیا　　میرا نغمہ ہی مری وجہ اسیری بن گیا
کیا خبر تھی قصرِ دل ہو جائے گا برباد بھی　　دام پھیلائے ہوئے ہے تاک میں صیاد بھی
اب نہ وہ میں ہوں، نہ وہ عیشِ بہارِ فصلِ گل　　میری آنکھیں ہیں مگر نوحہ گزارِ فصلِ گل
اب نہ وہ جوش ترنم ہے نہ وہ آزادیاں　　بن گیا ہوں میں سراپا سازِ آہنگِ فغاں
ماتمِ حسرت ہے، میرا شغل بیکاری سبھی　　بند رکھتی ہے قفس کی چار دیواری مجھے
ہوں سراپا غم قفس میں آشیانے کے لئے　　فکر ہوتی ہے مجھے کب آب و دانے کے لئے
اضطراب زندگی سے برسرِ پیکار ہوں
کنجِ ہستی سے نکلنے کے لئے تیار ہوں
ہم اگر سمجھیں تو ہے ایسا ہی اس دنیا کا حال　　ابتدا سے چاہئے انسان کو احساسِ مآل
کام زائد، وقت کم، سرگرم، بیدادِ اجل　　تاک میں آٹھوں پہر رہتا ہے، صیادِ اجل

جسم پابندِ فنا ہے، اور لازم ہے فنا　　یاد رکھ ہے روح کو حاصل مگر دائم بقا
"روح بھی، لیکن وہ مُردہ ہے جو بے احساس ہے"　　تجھ کو اس آئینِ فطرت کا اگر کچھ پاس ہے
یادگاریں چھوڑ جا، اس دارِ فانی کے لئے
کام کچھ کر جا، حیاتِ جاودانی کے لئے

علی اختر۔ اختر

اسرار

(۱)

رو بخوابیدۂ الفت ہے تو بیدار نہ کر
قلب سرشار محبت ہے تو ہشیار نہ کر
لذت درد کو ——— ہم معنی آزار نہ کر
عشق رکھتا ہے اگر دل میں تو ——— اظہار نہ کر

(۲)

نغمۂ عشق نہیں ——— دہر میں گا نیکے لئے
یہ فسانہ نہیں ——— دنیا کو سنانے کے لئے
نہ جلانے کے لئے ہے ——— نہ بجھانے کے لئے
عشق کی آگ ہے سینے میں دبانے کے لئے

(۳)

"حسن" تو لاکھ حجابوں میں رہے یوں مستور
اور بے پردگئ عشق ہو تجھ کو ——— منظور
کیا ملے گا تجھے ——— ؟ یہ راز ہو اگر مشہور
سامنے ہے ترے افسانۂ "دار و منصور"!

(۴)

اشک بنکر بھی نہ عریاں ہو ترا ذوق گداز
ترے جذبات کا گہوارہ ہو ——— خلوتگہ راز
آرزوؤں کو نہ دینا کبھی ——— اذن پرواز
ورنہ ہستی تری ہو جائیگی مجبور نیاز

(۵)

جس طرح نکہت گل ہو گل رنگیں میں نہاں
جس طرح نشۂ مے ہو مئے زریں میں نہاں
جیسے ——— گوہر ہو تہ چشمۂ تیریں میں نہاں
یونہی الفت بھی ہو تیرے دل غمگیں میں نہاں

(۶)

شام میں ہو کوئی دھندلا سا ستارہ ——— روپوش
قلب صحرا میں ہو کوئی گل صحرا ——— روپوش
جیسے ——— فانوس میں ہو شمع تجلی روپوش
ترے دل میں ہو یونہی داغ تمنا روپوش

(۷)

مشتعل شمع اگر ہو تو ——— بجھانا اچھا!
درد بنجائے اذیت تو ——— مٹانا اچھا
جس طرح خواب پریشاں کا بھلانا اچھا!
ہے یونہی جوش محبت کا دبانا اچھا!

(۸)

مصحف عشق کی ——— تفسیر نہیں کرتے ہیں
معنئ عشق کو ——— "تصویر" نہیں کرتے ہیں
عصمت عشق کی ——— تشہیر نہیں کرتے ہیں
یعنی اس خواب کی ——— تعبیر نہیں کرتے ہیں

(۹)

جو سراپردۂ الفت کے مکیں ——— ہوتے ہیں
خاتم راز محبت کے نگیں ——— ہوتے ہیں
جو کبھی عشق میں ——— "بیصبر" نہیں ہوتے ہیں
وہ خداوند محبت کے "امیں" ہوتے ہیں

روش صدیقی

غزلیات

باسط بسوانی

کونسا جور و ستم تم نے اٹھا رکھا ہے
یاد سب کچھ ہے مگر دل نے بھلا رکھا ہے

گر یہی رنگ جفا ہے تو خدا خیر کرے
آج تک دل کو تو پابند وفا رکھا ہے

سر جھکا لیتے ہیں وہ سن کے ہماری باتیں
اس تغافل کا مگر نام حیا رکھا ہے

آپ ہی در پہ ترے کرتا ہوں پھروں فریاد
آپ ہی کہتا ہوں فریاد میں کیا رکھا ہے

بزم عشاق میں منہ پھیر کے ہنسنے والے
یہ بھی تو دیکھ لے کس کس کو رلا رکھا ہے

وہ سنیں یا نہ سنیں آہ سحر اے باسطؔ
ہم نے تو اپنا یہی وقت دعا رکھا ہے

ثاقب جالندھری

کوئی نہ جب اٹھا سکا بار گران زندگی
خاک میں ساری مل گئی عزت و شان زندگی

دل کی مرے اک آرزو آپ جسے مٹا چکے
تھی وہی روح زندگی تھی وہی جان زندگی

زیست ہے آجکل مگر فتنہ و شر کی زیست ہے
دور فلک سے مٹ گیا امن و امان زندگی

وحشت نورد دشت کے ذروں کو خوب چھان لے
شاید انھیں میں مل سکے کوئی نشان زندگی

برسوں سے زندگی پہ ہے ہم کو گمان موت کا
برسوں رہے گا موت پر ہم کو گمان زندگی

. . . .

وہ کہ نہیں اٹھا سکے ہاتھ میں اپنے تیغ بھی
ہم کہ اٹھائے پھرتے ہیں بار گران زندگی

. . . .

. . . .

. . . .

ثاقبؔ زار تھا کہاں زندہ دلی سے آشنا
دل کی تڑپ نے کر دیا سحر بیان زندگی

حافظ غازی پوری

کھُل گیا جب حسن کے رخسار سے بندِ نقاب — عشق کے مطلع پہ چمکا پھر نیا اک آفتاب
جب نگاہ "شوخ" اُسکی بنگئی برقِ سحاب — حسن کی دنیا ہوئی "آسودۂ "عہدِ شباب
عشق کی کیفیتوں میں لغزش مستانہ ہے — حسن کی تاثیر میں ہے نشۂ جام شراب
عشق اپنی سادگی میں فطرت آسودہ تھا — کر دیا اُس میں بھی پیدا حسن نے اک انقلاب
ہر شکست "آرزو" میں ہے نمود امید کی — قطرہ قطرہ بحرِ ہستی کا بنا رشکِ حباب
ذرہ ذرہ زندگی کا ہے تلاطم آشنا — ہے یہ "احساس" سکون بھی ایک کیفِ اضطراب
جلوہ گر ہونے کو ہے اب آفتابِ روزِ حشر — لو اُٹھو حافظ بہت تم رہ چکے مصروفِ خواب

فرخ بنارسی

وجد آفرین جو نغمۂ سازِ الست تھا — ایک ایک ذرہ کیف ترنم سے مست تھا
کم روز حشر بھی نہوا کیف بیخودی — دل سرخوشِ سرورِ شراب الست تھا
حدِ تعینات سے جب مین گزر گیا — یکسان مری نگاہ مین بالا و پست تھا
روز ازل تھا دونوں طرف رنگ اتحاد — بیخود ادہر تھا عشق اُدہر حسن مست تھا
آزاد ہوکے اور بھی مجبور ہو گئے — پوشیدہ فتحِ نفس مین رازِ شکست تھا
وحشت میں بھی رہا وہی سودائے جستجو — دیوانۂ مجاز حقیقت پرست تھا
کیفیت بہار کی اللہ رے مستیان — جو پھول تھا چمن مین وہ ساغر بدست تھا
مجموعۂ حوادث پیہم تھی زندگی — تھا جو نفس وہ نغمۂ سازِ شکست تھا
فرخ کا سر جھکا نہ کسی کی جناب مین — وہ بندگی کے جوش میں بھی حق پرست تھا

نظیر لودھیانوی

ترستا ہے تماشائی کو جلوہ اے خدا میرا — عدم میں کب تلک پنہاں رہیگا آشنا میرا
دیارِ عاشقی میں تذکرہ ہے جا بجا میرا — مگر منکر ہے میری دوستی سے بیوفا میرا
چمن والوں نے اندازِ ترنم مجھ سے سیکھا ہے — تعجب ہے کہ نامحرم ہے اب تک ہم نوا میرا
یہی عالم ہے گر احباب کی بے التفاتی کا — درو دیوار سے پوچھیں گے اکدن مدعا میرا
سکوتِ صبحِ ہستی میں ابھی مثلِ نوا گم ہوں — ابھی حرف و زباں سے بے خبر ہے ماجرا میرا
سمجھتے ہیں مجھے ادنیٰ مسافر ہم سفر میرے — چراغِ رہگذر آخر بنے گا نقشِ پا میرا
تحیر عشق کی قوت سے ہوگا ایک دنیا کو — شبِ فرقت ابھی اُٹھا نہیں دستِ دعا میرا
سنا ہوگا فسانہ قیس کی صحرا نوردی کا — محبت کے جنوں میں وہ بھی اک انداز تھا میرا
وفورِ دردِ فرقت سے سراپا سازِ حسرت ہوں — زباں ہے غم فزا میری سخن ہے جانگزا میرا
ملے گر بادشاہی بے مشقت میں نہ لوں ہرگز — مجھے اورنگِ کسریٰ سے ہے بہتر بوریا میرا
کسی نااہل کے اعزاز سے مجھکو حسد کیوں ہو — مجھے آخر دلا ہی دیگا میرا حق خدا میرا
کہا واعظ کے ارشادات سن کر زاہدِ دنیا نے — ابھی نکلا ہے میخانہ سے چھپ کر پارسا میرا
نظیر اقبال کے اس قول پر ایمان رکھتا ہوں — میں وہ بندہ ہوں جس پر ناز کرتا ہے خدا میرا

معلومات

نشو و نما میں جگہ کا اثر!

الوانِ حیوان کی علمی تعلیل

جنگل اور میدان، باغ اور گلشن میں ہمیشہ رہنے والے قادر اعظم کی اس حکیمانہ اور بصیرت افروز قدرت کا علانیہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ درندے اور چرندے بہایم اور وحوش، پرندے اور طیور، ہوام اور حشرات سب کے اجسام کا رنگ مقام مسکونہ سے ماخذ ہوتا ہے چنانچہ شمالی شہروں میں جہاں کثرت سے برف باری ہوتی ہے۔حیوانات اکثر سفید رنگ کے ہوتے ہیں۔ اور جن جنگلوں اور میدانوں میں ریت زیادہ ہوتی ہے، وہاں کے حیوانات کا رنگ بیشتر ریتیلا ہوتا ہے۔جن چمنوں میں کلیاں زیادہ کھلتی ہیں۔ وہاں کے حشرات اور طیور رنگین ہوتے ہیں۔جن نیستانوں میں نے کے سائے مستوی خط میں زمین پر پڑتے ہیں۔ وہاں اکثر مخطط (چیتا، ہتا) بہتیرے پتنگے جن کلیوں پر رہتے ہیں، انھی کے مشابہ ہوتے ہیں۔ اکثر چھوٹے چھوٹے کیڑے جن شاخوں پر رینگا کرتے ہیں انھی کے مانند ہوتے ہیں۔ الغرض حشرات و حیوان کی جتنی قسمیں ہیں خواہ چھوٹی ہوں یا بڑی، ان تمام کا رنگ اپنے مکان مسکونہ کے رنگ سے ملتا جلتا ہوتا ہے۔ حتی کہ موسم کے بدلنے پر جب کبھی جگہ کا رنگ بدل جاتا ہے تو اس تبدیلی سے بھی حیوانات کے رنگ متغیر ہو جاتے ہیں۔ اور یہ تمام باتیں وہ عینی مشاہدے ہیں جن میں شاید دنیا کے دو انسان کبھی مختلف نہ ہونگے

لیکن پھر اس تلون کے کیا اسباب ہیں؟ ماہرین فن نے پہلے پہل اس مسئلہ کی یہ تعلیل بیان کی کہ عنایت الٰہیہ حیوانات کو ان الوان کے ساتھ محض انکی حفاظت کیلئے رنگتی ہے تاکہ دشمن کی متجسس نگاہیں انپر نہ پڑ سکیں، اور وہ ان کی زندگی کا فیصلہ کر دینے والے حملوں سے محفوظ رہیں۔ لیکن حقیقت میں مسئلہ کا یہ حل کوئی شافی حل نہیں ہے

اسپر اعتراضًا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر اس سے عنایت الٰہی کا منشا حیوانات کی محض حفاظت اور نگہداشت ہوتی تو بہت ممکن تھا کہ وہ کسی دوسرے سہل اور عمدہ اسلوب پر انکی حفاظت کرتی یعنی ایسا ہوتا کہ وہ تمام حیوانات کو نبات خور بنا دیتی اور خود ان درندوں میں شکار کا کوئی طبعی میلان ہی پیدا نہ کرتی، اس لئے کہ مثلاً شیر کو طبعًا شکار حیوان کی طرف مائل کرنا اور شیر کی خوراک صرف حیوانات کا گوشت بنانا پھر شیر کے حملوں سے حیوانات کی حمایت کر کے شیر کو بھوکوں مارنے کی سعی کرنی یہ کوئی حکیمانہ بات نہیں ہے۔ اور مشاہدہ بھی اس حمایت کی تائید نہیں کرتا ہم دیکھتے ہیں کہ شیر ہمیشہ حیوانات کا شکار کرتا ہے اور اسکی خوراک انھی حیوانات کا لذیذ گوشت ہوتی ہے

علماء فن نے الوان حیوان میں پھر مزید غور و فکر کے بعد ایک دوسری عقل سے زیادہ قریب یہ تعلیل بیان کی کہ :-

اگر کسی ہرنی کے دو بچے پیدا ہوں اور ایک کا رنگ مکان پیدائش کے ہمرنگ ہو اور دوسرے کا اس کے خلاف، تو راجح یہی ہے کہ شیر اسی بچے کو دیکھ سکیگا اور اسی پر حملہ بھی کرے گا جس کا رنگ اس زمین کے رنگ کے خلاف ہوگا، دوسرا بچہ اس قسم کے خطرات سے بالکل محفوظ رہیگا۔ یہیں سے اس قول کی تصدیق کیجاتی ہے کہ حیوان کا رنگ جو مکان کے مشابہ ہوتا ہے وہ دراصل اسکی حفاظت کا ایک طبیعی سلاح ہے لیکن اسکا یہ منشا نہیں ہے کہ جو حیوانات اون مکان کے ہمرنگ ہوتے ہیں وہ کلیتۂ اپنے اعدا کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ بلکہ اس سے یہ مراد ہے کہ اس قسم کے حیوانات ان حیوانات کے مقابلہ میں جن کا رنگ مکان کے مخالف ہوتا ہے البتہ خطرات سے مامون ہوتے ہیں، ماہرین فن کے نزدیک اس سلاح کو انتخاب طبیعی سے تعبیر کیا جاتا ہے؟

مگر حقیقت میں یہ تعلیل بھی مسئلہ کے تمام حقایق و معارف کی پردہ کشائی نہیں کرتی، ابھی تک نفس مسئلہ کی یہ پہلی گرہ بھی نہ کھل سکی کہ حیوانات کا رنگ شروع میں کیونکر متغیر ہوتا ہے؟ اور پھر کن کن تبدیلیوں کے بعد کیونکر وہ مکان کے ہمرنگ ہوجاتا ہے؟ اگر اصل میں اسکی کوئی طبیعی علت ہے تو ضروری ہے کہ وہ علت اس کے نسل میں بھی کارفرما ہو،

علامہ ونٹس ماہر طبیعیات نے اس موضوع پر ایک استقرائی بحث کی تو انکو معلوم ہوا کہ جن پرندوں میں اوقات معلومہ کے اندر قوۃ حیاۃ بڑھتی رہتی ہے وہ دوسرے پرندون کے مقابلہ میں زیادہ رنگین اور خوبصورت ہوتے ہیں، عرصہ دراز سے ہمکو یہ معلوم ہے کہ بعض حیوانات کے رنگ جاڑونیں زائل ہوجاتے ہیں تو اسکی بھی بڑی وجہ ان حیوانات میں قوۃ حیات کا ضعف ہے

بعض محققین خرگوش کو ایسے پہاڑوں پر لیگئے جو ساحل بحر سے تقریبا ۹۵۰۰ قدم اونچے تھے۔ اور وہان ان کے بچونکی سات سال تک مسلسل پرورش کی تو انکو ثابت ہوا کہ ان بچوں کے اجسام کچھ چھوٹے ہوگئے اوران کا رنگ سفید اور خونمین ایک کیمیاوی تغیر پیدا ہوگیا یعنی خونمین لوہے کا عنصر زیادہ بڑھگیا، اور جذب آکسیجن کی طاقت بھی زیادہ ہوگئی اگر ان خرگوشون کی یہ نسل زیادہ دونون تک وہاں رہتی تو یہ تغیر اور زیادہ نمایاں ہوجاتا اور خرگوش کی ایک نئی صنعت پیدا ہوجاتی لیکن یہ عظیم الشان انقلاب محض فعل مکان کیوجہ سے ہوتا کسی دوسرے سبب سے نہیں، مختصر یہ کہ قوۃ حیاۃ کی زیادتی الوان کو زیادہ اور اس کا نقص الوان کو کم کر دیتا ہے۔ اور شاید مرغ کی رنگینی و خوبصورتی کا اصلی راز بھی قوۃ حیاۃ کی فراوانی ہے

بعض لوگون نے ثابت کیا ہے کہ حیوان کا رنگ، غذا کے رنگ پر موقوف ہوتا ہے وہ اپنے دعوی پر یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ بعض دریاؤنمیں جو گھاس مینڈک اور گھونگھے کثرت سے کھاتے ہیں، وہ قرمزی رنگ کے ہوتے ہیں، اور بعض لوگ جو کیڑون کو رنگین غذائیں کھلاتے ہیں اس کا منشا صرف انکو رنگین بنانا ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ انھی رنگونمین رنگ بھی اٹھتے ہیں، لیکن اس ترکیب کا اثر صرف حیوانات صغیرہ تک محدود ہے۔ حیوانات کبیرہ میں اس کا کوئی اثر نہیں ظاہر ہوتا یا بڑے حیوانات مین اسکی تاثیر دوسرے موثرات کے فعل کے ساتھ مختلط ہوجاتی ہے، اس لئے اس کا نتیجہ ظاہر نہیں ہوتا

بہتیروں نے اس حقیقت کا بھی سراغ لگایا کہ جو مچھلیاں کچھ دنوں کسی دریا میں رہی ہوں اور کچھ دنوں کسی نہر میں تو ان کا رنگ محض اختلاف نور کیوجہ سے بدلجاتا ہے۔ جب پانی کم اور صاف ہوتا ہے اور اسمیں روشنی بخوبی پہونچتی ہے تو مچھلی کا رنگ سفید

ہوتا ہے پھر جب وہ زیادہ گہرے اور سیاہ پانی میں چلی جاتی ہے تو اسکا رنگ مکدر ہوجاتا ہے، اس مقام پر دیکھو انتخاب طبیعی کا کوئی محل نہیں ہے۔ بلکہ مچھلی کے رنگ میں محض اختلاف نور کی وجہ سے تبدیلی آگئی ہے

ماہرین فن کو یہ حقیقت معلوم ہوچکی ہے کہ جو چھوٹی مینڈک کی نبات اور اشجار کی ڈالیوں پر رہتی ہے، وہ سبز پتیوں میں سبز ہوتی ہے، اور جب اسکو زمین پر یا گندم گون پتیوں پر رکھدیا جائے تو اس کا رنگ گندمی ہوجاتا ہے۔ نیز اس قسم کا تغیر گرگٹ وغیرہ میں زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ بعض علماء نے مینڈک کے رنگ کے تغیر کے اسباب سے بحث کی تو انکو معلوم ہوا کہ مینڈک کے جسم میں جو جلد کے تین طبقے ہیں۔ طبقہ اسفل میں سیاہ، طبقۂ متوسط میں اصفر اور طبقہ اعلیٰ میں ارزق رنگ ہوتا ہے اور ان تینوں طبقات سے اوپر ایک رقیق اور شفاف پردہ منڈھا ہوتا ہے۔ جب مینڈک اشجار و نباتات کی پتیوں پر ہوتا ہے تو اصفر اور ارزق کے امتزاج سے اخضر رنگ پیدا ہوتا ہے۔ اور جب وہ زمین یا کسی تاریک چیز پر رکھدیا جاتا ہے تو طبقۂ اسفل کا سیاہ رنگ ظاہر ہوتا ہے۔ اسی طرح گرگٹ کے جسم میں بھی مختلف حویصلات ہوتے ہیں وہ بھی جب نبات سبز پر ہوتا ہے تو اس کا رنگ سبز ہوجاتا ہے۔ اور جب سرخ رنگ کی شاخوں پر چلتا ہے تو اس کا رنگ سرخ ہوجاتا ہے اور جب اسکو کسی برتن کے نیچے سطح بند کردیا جائے کہ وہاں کسی ذریعہ سے روشنی نہ پہونچ سکے تو اس کا رنگ سیاہ ہوجاتا ہے، اس تغیر کا سبب یا تو کوئی عصبی فعل ہے جو مختلف رنگ کے حویصلات پر موثر ہوتا ہے یا اس کا سبب محض نور ہے۔ ماہرین فن کے نزدیک دوسرا سبب زیادہ مرجح ہے

بعضوں نے ثابت کیا ہے کہ جس مچھلی کا رنگ پانی کے تغیر کے ساتھ متغیر ہوگیا ہو اگر وہ اندھی ہوجائے تو پھر پانی کا رنگ بدلنے پر بھی کبھی اس مچھلی کا رنگ نہ بدلے گا، یہ حقیقت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ نور اپنے عصب بصر پر موثر ہوتا ہے، پھر اسکی تاثیر ان اعصاب کی طرف منتقل ہوتی ہے جن کے ذریعہ حویصلات ملونہ میں انبساط یا انقباض پیدا ہوتا ہے۔ بعض محققین کی یہ تحقیقات ہے کہ نور بلا کسی واسطے کے مباشرۃً بھی حویصلات پر موثر ہوتا ہے چنانچہ انھوں نے تجربتاً ایک مینڈک کو تاریکی میں رکھا اور جب وہ سیاہ ہوگئی تو اس کے بدن پر مختلف جگہوں میں سیاہ کاغذ کے ٹکڑے لپٹا دئے اور روشنی میں انکو رکھا تو کاغذ کی جگہوں کے سوا پوری جلد سبز ہوگئی، بعض علماء نے مزید تجربہ کیلئے ستر مینڈکوں کی آنکھیں نکال لیں، اور انکو ایک تاریک مکان میں رکھا تو ان کا رنگ فوراً سیاہ ہوگیا پھر جب سبز شاخیں ان کے پاس لائی گئیں تو ان کا رنگ سبز ہوگیا۔ اس تجربہ سے یہ ثابت ہوا کہ جو اخضر نور اوراق سبز سے منعکس ہوتا ہے وہ ایک مخصوص تاثیر کے ساتھ اعصاب جلد میں موثر ہوتا ہے۔ چاہے اسکو مینڈک دیکھے یا نہ دیکھے

اس کے علاوہ علماء کے اور بہت سے مباحث ہیں جو اس حقیقت پر دلالت کرتے ہیں کہ طعام و مکان یہ دونوں حیوانات کے رنگوں میں بہت زیادہ موثر ہیں۔ نیز مزید تحقیقات کا سلسلہ ابتک برابر جاری ہے۔ امید ہے کہ عنقریب وہ اس مسئلہ کے بہت سے غوامض و مشکلات اسرار و رموز کا انکشاف کریں گے۔

بدر اصلاحی

رسالہ عصمت دہلی

شریف بیگمات کے لئے ہندوستان بھر کا بہترین رسالہ ہے

اسی لئے

ہندوستان بھر کے تمام زنانہ رسائل و اخبارات میں سب سے زیادہ اشاعت رکھتا ہے

عصمت ۔ اکیس سال سے کامیابی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور امراء، رؤساء، و شرفاء کے طبقہ میں قابل رشک مقبولیت و وقعت حاصل کر چکا ہے اور شریف کنواری بچیوں کو آنکھ بند کر کے دیا جاتا ہے۔

ہندوستان کے سینکڑوں رسالوں میں صرف عصمت کو یہ فخر حاصل ہے کہ **علامہ راشد الخیری** مدظلہ کے گراں بہا مضامین اور افسانے قریب قریب ہر ماہ شائع کرتا ہے۔

ہندوستان بھر میں صرف عصمت وہ رسالہ ہے جس کی مضمون نگار خواتین ہندوستان کے ہر حصہ میں کافی تعداد میں موجود ہیں۔

عصمت کے دستکاری و خانہ داری پر مفید مضامین، تمدنی معاشرتی، تعلیمی بحثیں عصمت کے سبق آموز و نتیجہ خیز افسانے۔ موثر و دلآویز نظمیں ادب اردو میں امتیازی شان رکھتی ہیں۔

عصمت مضمون نگار خواتین کو نہایت معقول انعامات ہر سال تقسیم کرتا ہے۔

عصمت ۔ اردو کے متعدد رسالوں میں سب سے زیادہ تصاویر شائع کرتا ہے۔

اردو کے تمام رسالوں میں صرف **عصمت** کا ٹائٹل پیج سہ رنگین بلاکوں کا نہایت خوبصورت چھپتا ہے۔

عصمت کی اشاعت میں کبھی ایک دن کی بھی دیر نہیں ہوتی۔ نہایت پابند وقت رسالہ ہے۔ ہمیشہ ۳۰ تاریخ کو شائع ہو جاتا ہے۔

عصمت اردو کے تمام زنانہ رسالوں سے زیادہ مضامین ہر ماہ شائع کرتا ہے۔ بھرتی کے مضامین اس میں درج نہیں کئے جاتے۔

سالانہ چندہ مع محصول ڈاک پیشگی صرف پانچ روپے (صہ)

قسم دوم بے تصویر معمولی ٹائٹل اوسط درجہ کا کاغذ۔ صرف تین روپے چھ آنہ (سہ۶)

قسم خاص تمام رسالہ آرٹ کاغذ پر چھپتا ہے سالانہ چندہ دس روپے (عـہ) فی پرچہ عہ ر

سالانہ خریداروں کے ساتھ رعایت

اگر اس وقت آپ عصمت کے سالانہ خریدار بن جائیں تو آپ کو یہ فائدہ ہوگا کہ عصمت کا مشہور سالنامہ جوبلی نمبر جس کی قیمت ۲ ہے آپ صرف ۱ میں علاوہ محصول ڈاک حاصل کر سکتے ہیں اور سالگرہ نمبر سنہ ۲۹ء جس کی قیمت ۱ ہے صرف عہ ر میں۔ مگر بہت کم پرچے باقی ہیں اس لئے جلدی کیجئے۔

اردو رسائل کے خاص نمبروں میں عصمت کے خاص نمبر امتیازی شان رکھتے ہیں

مینیجر عصمت کوچہ چیلان دہلی

الزہرا

از علامہ راشد الخیری مدظلہٗ

بنت الرسول خاتون جنت حضرت بی بی فاطمہ کی اردو زبان میں بہترین سوانح عمری تاریخ میں جس میں خاندان کے علاوہ الزہرا بتاتی ہے کہ میاں بیوی کس طرح رہتے ہیں مائیں بچوں کو کس طرح پالتی ہیں دنیا کے ساتھ دین کیونکر میسر آتا ہے واقعات ایسے درد انگیز کہ پڑھتے پڑھتے ہچکی بندھ جاتی ہے خاتمہ پر واقعہ کربلا پر بحث۔ آٹھواں ایڈیشن قیمت عمر

اُمت کی مائیں

از علامہ راشد الخیری مدظلہٗ

رسول اکرم صلعم کے ازواج مطہرات کے مختصر مگر مکمل حالات جو مسلمان مردوں عورتوں کو دین و دنیا میں کامیابی کا صحیح رستہ بتاتی ہے کثرت ازدواج پر اس قدر معقول بحث ہے کہ غیر مسلم بھی تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہر مسلمان گھر کی لائبریری میں یہ کتاب ہونی ضروری ہے

قیمت صرف عمر

منازل السائرہ

از علامہ راشد الخیری مدظلہٗ

یہ وہ مشہور تصنیف ہے جو ہندوستان کے گھروں میں داخل ہے۔ جس میں مشہور ہاجرات جس کے شاندار ریویو کئے تھے ایک لڑکی کی پیدائش سے موت تک کے تمام واقعات اس قدر دلچسپ پیرایہ میں لکھے گئے ہیں کہ بار بار پڑھنے پر بھی لطف مجسم ہوتا ہے۔ حصہ اول عہ دوم عمر

قیمت مکمل۔ دو روپیہ ایک آنہ

بنت الوقت

از علامہ راشد الخیری مدظلہٗ

ہماری مستورات کی موجودہ تعلیم و تہذیب کا مثیل مرقع آجکل کی مہذب بیبیوں کی لاثانی تصویر وقت کی اندھا دھند تقلید کرنیوالی ایک ناعاقبت اندیش لڑکی کا عبرت انگیز انجام تعلیم نسواں کے سلسلہ میں ہر کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ چھ دفعہ چھپ چکی ہے۔ قیمت صرف ۸؍ (آٹھ آنہ)

سراب مغرب

از علامہ راشد الخیری مدظلہٗ

تعلیم نسواں کا مسئلہ میں غیر مسلم ذرائع سے مستفید ہونا کہاں تک جائز ہے اس موضوع پر علامہ محترم کی معرکۃ الآرا تصنیف تقلید مغرب کے دردناک نتائج پاشیرہ کا عشق خیر جدید کا عبرت ناک انجام ماں باپ کی ناعاقبت اندیشی کیونکر خاندان سادات کی تباہی کا باعث ہوئی ایسے ایسے باب ہیں کہ آنسو نکل پڑتے ہیں قیمت ۸؍

سات روحوں کے اعمالنامہ

از علامہ راشد الخیری مدظلہٗ

فنی لحاظ سے بہترین کتاب انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر بحث، اس قدر دلچسپ قصہ کہ کئی بار پڑھئے کہیں رونے کی ہچکی بندھ جائے کہیں ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جائیں۔ ہندوستان میں اسلام کا انجام اور مسلمانوں کی درد ناک حالت کے دل ہلا دینے والی تصویریں۔ چھ دفعہ چھپ چکی ہے۔ قیمت ۸؍

فسانۂ سعید

از علامہ راشد الخیری مدظلہٗ

بیوہ کا نکاح ثانی اسلام کا حکم ہے مگر سعید کا دوسرا نکاح مولانا نے جس قابلیت سے ناجائز ثابت کیا ہے وہ حق رکھتا ہے کہ ہر مسلمان اس کتاب کو پڑھے سعید کی مجبوریاں خواہش و داستان دل ہلا دیگی، سنگدل باپ بچی بیوہ پر ستم توڑتے ہیں کلیجہ منہ کو آتا ہے سوتیلے بچوں پر نہایت سبق آموز کتاب

قیمت صرف ۸؍ (آٹھ آنہ)

نوحۂ زندگی

از علامہ راشد الخیری مدظلہٗ

بیوہ کے نکاح ثانی پر علامہ محترم کی مشہور تصنیف رسم و رواج میں پھنسکر مسلمان کس طرح تباہ ہوئے اس کتاب سے معلوم ہوگا یہاں ایسا قبرستان ملیگا جہاں عصمت کی لاج رکھنے والی بیوی اور عزت پر قربان ہونیوالی مائیں اپنے معصوم بچوں کو لئے گہری نیند سو رہی ہیں۔ نہایت موثر کتاب ہے۔

ساتواں ایڈیشن قیمت صرف ۱۲؍

اندلس کی شہزادی

از علامہ راشد الخیری مدظلہٗ

جس کا دوسرا نام تائید غیبی بھی ہے مسلمانوں کی تباہی ہے سرزمین اندلس پر وہ کیا کر چکے ہیں انہوں نے ترقی کی اور کیونکر اپنے اعمال سے تباہ ہوئے تعصب اتحاد و لڑائیاں کبھی آنکھ سے آنسو نکل پڑتے کبھی بے ساختہ ہنسی آجاتی بڑی عمر کی عورتوں اور مردوں کے لئے ہے۔

قیمت صرف ۸؍

محصول ڈاک بذمہ خریدار

ملنے کا پتہ: منیجر عصمت دہلی

تفسیر عصمت

از علامہ راشد الخیری مدظلہ

خلع اور ارتداد پر معرکۃ الآرا افسانہ
...ن عجیب قصہ کہ بار بار پڑھئے، اس قدر درد انگیز
...ا ہے کہ آنسو نکل پڑیں اس کے ساتھ اس قدر پرلطف
...ر ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جائیں ہر مسلمان مرد
...ر ہر مسلمان عورت کو مطالعہ کرنا چاہئے اسلوب بیان
...اس شان کے اعلیٰ درجہ کی افسانہ بہت کم ہیں

قیمت صرف ۶ ر

ستونتی

از علامہ راشد الخیری مدظلہ

شوہر پرستی پر نہایت دلچسپ اور سبق آموز افسانہ
وفا ایثار، مذہبی تعلیم کے اثرات کا عالی کتاب
ستونتی اس ملاحظہ فرمائیے جو اپنے اعلیٰ کیریکٹر سے ہر
مجبوعیت ... کی مقبولیت کی یہ کیفیت ہے کہ ہاتھوں
ہاتھ تین ایڈیشن نکل گئے نہ صرف کنواری لڑکیوں اور
شادی شدہ عورتوں کے لئے بلکہ مردوں کے لئے بھی
بہت مفید ہے قیمت صرف ۸ ر

امین کا دم واپسیں

از علامہ راشد الخیری

شہنشاہ ہارون الرشید کے لخت جگر اور ملکہ
زبیدہ خاتون کے لعل شہزادہ امین الرشید کا
دردناک قتل اسلامی تاریخ کا ایک ایسا ہی درد انگیز
واقعہ ہے اس پر مصنف مرحوم نے قیامت توڑ دی ہے
قصہ کے پیرایہ میں ہارون الرشید اور زبیدہ
کے حالات لکھے ہیں۔ لکھائی چھپائی نہایت
عمدہ دیدہ زیب ہے۔ قیمت ۶ ر

محصول ڈاک بذمہ خریدار

قلب حزیں

از علامہ راشد الخیری مدظلہ

حضرت علامہ راشد الخیری مدظلہ کے نہایت لطیف چھوٹے چھوٹے
...لو نیز ادبی مضامین۔ محبت کا تاج، تو، چڑیا کا جوڑا، شوہر کی قبر،
...ستان ستم، ابدی زندگی، فلسفۂ موت، جذبہ نسوانی، بہار شب کا
خاتمہ، ماں کا سجدہ، دم واپسیں، عالم خیال وغیرہ۔ طرز تحریر اتنا پیارا اور
دلکش کہ ایک ایک فقرہ اور ایک ایک جملہ حفظ کرنے کو جی چاہے۔
...ت نسوانی کی ترجمانی اس کمال کے ساتھ کی گئی ہے کہ ہر فقرہ دل کے
...ہو جاتا ہے۔ ان مضامین میں شاعری کی گئی ہے قیمت ۸ ر

گلدستۂ عید

از علامہ راشد الخیری مدظلہ

عید کی دعا، عید کا کرتہ، عید کی خوشی، ام جعفر کی عید، بہار عالم، ترکی ملا
بچاس برس کے مسلمانوں کے تہوار، کنواری بچی کی عید، دلہن کی عید وغیرہ وہ
سبق آموز افسانے اور مضامین جن کی ہندوستان بھر میں دھوم مچ چکی ہے ...
آشنا اگر تمہارے پہلو میں ہے تو یہ مضامین پڑھو جن میں عید کے روز مسلمان ...
نے عبرت کا درد انگیز پیام پہنچایا ہے، سچی محبت کسے کہتے ہیں دنیا کی ...
کس طرح طے کی جاتی ہیں۔ گلدستۂ عید میں دیکھو جو ہر وقت پڑھنے سمجھنے
اور غور کرنے کی چیز ہے۔ قیمت ۱۲ ر

ویڈیا کی سرگذشت

از علامہ راشد الخیری مدظلہ

گمراہ ... جدت کی ...
ایک انگریزی خاتون کی زندگی کے حالات خود اسی کی بات...
مغربی معاشرت کا نہایت کامیاب مرقع۔ یورپین
میاں بیوی کے تعلقات کا ہو بہو فوٹو نہایت دلچسپ
اور پرلطف قصہ قیمت صرف ۴ ر

بچہ کا کرتہ

از علامہ راشد الخیری مدظلہ

ایک عاشق زار بد نصیب ماں دل کی لگی کے کارن
جوان بچے کے لئے کیسی مصیبتیں اٹھاتی ہے اور
اس محبت کا دنیا کیسا عبرت انگیز جواب دیتی
ہے۔ اس درد انگیز افسانہ سے معلوم ہوگا۔
قیمت صرف ۴ ر

منازل ترقی

از علامہ راشد الخیری مدظلہ

انسان ترقی کی دھن لیڈری کے شوق اور دولت
کے نشہ میں اخلاق انسانیت اور مذہب کو تج کر
غریب لاوارثوں پر کیسے کیسے ظلم ڈھاتا ہے۔
دل الشیرین دونوں میاں بیوی کے کیرکٹر نہایت
دلچسپ ہیں۔ قیمت ۴ ر

ملنے کا پتہ:- منیجر عصمت کوچہ چیلان دہلی

مظلوم عورتوں کی جگر خراش صدائیں

جن سے دل صد صد مرتبہ تڑپ اٹھیں گے اور درد انگیز کلمے جو بلند ہوئی جو علامہ راشد الخیری مدظلہ نے حقوق نسواں کی حمایت و حفاظت میں وقتاً فوقتاً تحریر فرمائیں، مظلوم سکینہ، روضۂ اقدس پر سر خاب کا دم واپسیں، اسلام کا خط فخر بیگم کے نام، التجائے قیصر، بیٹیوں کی فریاد، بچپن کی یاد، عید کا کرتہ، یتیم بچی کا تخیل وغیرہ معمولی نظمیں نہیں ہیں بلکہ مظلوم عورتوں کے دل سوز نالے ہیں

اس کتاب کا نام

رودادِ قفس ہے

اور اب پانچویں مرتبہ چھپی ہے قیمت ١٢/

تمغۂ شیطانی

از علامہ راشد الخیری مدظلہٗ

وہ بے مثل مشہور افسانہ جو جنوری ۱۹۲۸ء سے عصمت میں مسلسل نکل رہا تھا اور اب کتابی صورت میں چھپا پایا گیا ہے حضرت علامہ محترم نے اسلام کو جن سائنٹفک اصولوں پر پیش کیا ہے اور دلنشیں پیرائے میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی جن مسلمانوں نے سمجھ کر علامہ محترم کی کتابوں کو پڑھا ان کے ذہن نشین ہو گیا اور ہزاروں گھر تباہی اور بربادی سے بچ گئے۔ تمغۂ شیطانی میں اسی شیطانی کے آئینے عکس کیرکٹر ہیں۔ اور بہر کیف کثیر ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرت کا ہو بہو فوٹو ہے افسانہ کی دلچسپی کی یہ کیفیت ہے کہ شروع کرکے ختم کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا، ناکثر والی بہری خانصاحب، ملاجی وغیرہ کے حالات پڑھ کر مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں اور روداد اخیر ہر باب میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا۔ ناممکن ہے کہ آنکھ سے آنسو نہ نکل پڑیں۔ تمغۂ شیطانی بے انتہا دلچسپ اور بے حد سبق آموز اور عبرت انگیز افسانہ ہے کاغذ چھپائی لکھائی اعلیٰ درجہ کی۔ قیمت صرف ١٢/

مینیجر عصمت دہلی

نانی عشو

از علامہ راشد الخیری مدظلہ

علامہ محترم کا نہایت پر لطف [illegible] جس کی قسطیں ابھی رسالہ عصمت میں چھپی ہی تھیں کہ تمام ملک میں [illegible] گیا۔ اس قدر پر لطف قصہ کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں اور بار بار پڑھنے پر بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ نانی عشو کا کیرکٹر نہایت دلفریب ہے نانی عشو کے ساتھ ایسے ہی ظرافت آمیز مگر نتیجہ خیز ۲۳ اور قصے ہیں۔ ہاتھوں ہاتھ ۳ ایڈیشن ڈیڑھ سال میں نکل چکے ہیں۔ قیمت ١٠/

شہیدِ مغرب

از علامہ راشد الخیری مدظلہ

وہ درد انگیز مضامین افسانے لکھے جو مسلمانوں پر یورپ کے مظالم اگر سیاسیات سے آپ کو دلچسپی ہے اگر جوش ایمانی اور حب [illegible] کو دریا آپ کے سینے میں موجزن اگر آپ اردو کی چاشنی کا لطف اٹھانا چاہتے ہیں تو

شہیدِ مغرب

کا مطالعہ کیجئے۔ کاغذ چھپائی عمدہ

قیمت صرف ١٢/

وداعِ خاتون

جنت مکانی محترمہ خاتون اکرم اگر ایک طرف تمام ملک کی مایہ ناز انشا پرداز تھیں جنکی ادبی قابلیت پر بڑے بڑے مرد رشک کرتے تھے۔ تو دوسری طرف بہ حیثیت عورت کے اس قدر اعلیٰ کیرکٹر کی بی بی تھیں کہ ان کے اعزا آج بھی ان کی یاد میں خون کے آنسو گرا رہے ہیں حضرت علامہ راشد الخیری مدظلہ نے مرحومہ کے انتقال پر جو قیامت انگیز مضامین تحریر فرمائے ہیں **وداع خاتون** کے نام سے شائع ہوئے ہیں جو بتائیں گے کہ ہو کیسے [illegible] اور لڑکی شادی کے بعد کس طرح سسرال والوں کے دل فتح کر سکتی ہے۔ وداع خاتون کا ایک ایک فقرہ درد و اثر میں ڈوبا ہوا ہے۔ ناممکن ہے کہ اسے پڑھ کر آنسوؤں کی جھڑیاں نہ شروع ہو جائیں

قیمت صرف ٦/ محصول ڈاک بذمہ خریدار

ملنے کا پتہ: مینیجر عصمت کوچہ چیلان دہلی

فخر نسوان ہند محترمہ خاتون اکرم جنت مکانی کی بے مثل تصانیف

جن سے اُردو لٹریچر میں گرانبہا اضافہ ہوا ہے

جمالِ ہمنشیں

یہ اس محترم خاتون کے دلاویز مضامین ہیں جنکی مضمون نگاری کا ہندوستان بھر میں شہرہ ہو چکا ہے جو تعلیم یافتہ خواتین کے محبوب ترین انشا پرداز تھیں، جن کے فلسفیانہ خیالات نے جن کے سیدو اثر میں ڈوبے ہوئے طرز تحریر نے بڑے بڑے قابل ہر دو سے خراج تحسین وصول کیا تھا۔

جمالِ ہمنشیں مندرجہ ذیل مضامین کا مجموعہ ہے

فانی زندگی	تغیرات زندگی	نیرنگیٔ زمانہ	اجل
عالم نزع	عبرت گاہ دنیا	غم	موسم بہار
ساون	پھول	رمضان	عید
زندگی کی زندہ ہستی	شمع ہدایت	کسی کی یاد	وعدہ وفائی
ملکی مذاق	خوشی کا دن	خدا کی مصلحت	تعزیت نامہ

انڈین ڈیلی میل کی رائے: جمالِ ہمنشیں کی اردو صاف اور رواں ہے اور کتاب نہایت دلچسپ ہے

اخبار ہمدرد کی رائے: جمالِ ہمنشیں کے مضامین کی عبارت بہت پختہ اور فصیح ہے۔

علیگڈھ میگزین کی رائے: خاتون اکرم مرحومہ فخر نسوان ہند کا طرز بیان پُر اثر اور دلنشین ہوتا تھا۔ جمالِ ہمنشیں قابل قدر کتاب ہے۔

مضامین کے اعتبار سے جمالِ ہمنشیں اردو کی چوٹی کی کتابوں میں ہے اور خوبصورتی کے اعتبار سے بہت کم اردو کتابیں ایسی دلکش نکلینگی تمام کتاب آرٹ کاغذ پر رنگین چھپی ہے۔ مقبولیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ڈیڑھ سال میں تین دفعہ چھپ چکی ہے۔

قیمت صرف عہ/ علاوہ محصولڈاک

پیکرِ وفا

ایک نہایت دلچسپ سبق آموز افسانہ مع دیباچہ از اڈیٹر عصمت

خاتون اکرم جنت مکانی کی کامیاب افسانہ نگاری کا بہترین نمونہ۔

رسالہ ہمایوں کی رائے ہے پیکرِ وفا ایک کامیاب و مفید افسانہ ہے جس میں عورتوں کے اس احترام کو واضح کیا گیا ہے جس کی تعلیم مذہب اسلام نے ہمیں دی ہے، انداز بیان دردانگیز عبارت سادہ و شگفتہ۔

اخبار ریاست لکھتا ہے "پیکرِ وفا ایک نتیجہ خیز دلآویز افسانہ ہے۔ طرز بیان اس قدر صاف و دلکش کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔

رسالہ حرم کی رائے ہے، پیکرِ وفا میں عورتوں کی وفاداری و قربانی کا بے مثل نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ آرٹ کاغذ پر رنگین چھپی ہے

قیمت صرف آٹھ آنہ (۸/)

بچھڑی بیٹی

ایک نہایت دلچسپ افسانہ

ایک لڑکی ماں باپ سے بچھڑ جاتی ہے اس کی جدائی میں ماں کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ صرف پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ برسوں کے بعد وہ لڑکی اس طرح ملتی ہے کہ بے ساختہ جنت مکانی کی کامیاب افسانہ نگاری کا معترف ہونا پڑتا ہے، پلاٹ بے انتہا دلاویز طرز تحریر پُر اثر و دلنشین۔

یہ افسانہ اردو کے کئی رسالوں میں شائع ہو کر مقبول ہوا ہے

قیمت صرف چھ آنہ ۶/   علاوہ محصولڈاک

ملنے کا پتہ: مینیجر عصمت کوچہ چیلان دہلی

ناشر مرحوم

سید بغدادی
ملکہ زنوبیہ
قرۃ العین
...نذرات
...پاسے حق
...بت چین
فتح مفتوح
...ب خرمی
...نا لسو
...م عرب
...س ولینی
یوسف و نجمہ
والی بغداد
...ا بازار
مقدس نازنین
روستہ الکبری
قلوپطرا
خوتین ملکہ
منصور موہنا
حسن انجیلینا
ملک العزیز ورجنا
فردوس بریں
حسن کا ڈاکو
دربار حرام پور
عقیب وان ولسن
بدر النساء کی مصیبت

بیوہ کا...
نیکی کا پھل

شوق قدوائی مرحوم

ترانۂ شوق
قاسم و زہرہ
نیرنگ جمال

میر ولی اللہ بی اے

بندگی
کاس الکرام
لسان الغیب جلد اول
" دوم
" سوم
" چہارم
نگہبان فصاحت
بادۂ ناب

ظفر عمر بی اے

چوروں کا کلب
نیلی چھتری
بہرام کی گرفتاری

مولانا نیاز فتحپوری

گلستان جلی
گہوارۂ تمدن
نگارستان
صحابیات
تاریخ الدولتین

سید سجاد حیدر بی اے

زہرا
جلال الدین خوارزم شاہ
خیالستان
ثالث بخیر

حکایات و احتسابات

دلچسپ تاریخی جاسوسی ناول

مربط فیلقون
بالشوک شہزادی
شہید وفا
ممتاز بیگم
شہزادہ رنگین
محاصرۂ پیرس
شیخ چلی
بہادر ترک
بہرام کی واپسی
انقلاب فرانس
حسن بنارس
فطرتی جاسوس
ترکی حرم سرا
جنگ طرابلس
بہرام چور
زر پرست
گنجی کا راز
عبدالرحمن ناصر
عروس مصر
سیلاب خون
کرشمہ
وفادار دلہن
طوفان زمین

سیاحت زمین
سیاحت
نازنین مراکش
سمندر کا اسیر
اسرار بالشویزم
سوانح لیلی
امین بیگ
حجاج بن یوسف
یوسف پاشا
انقلاب عثمانی
نیلی چھتری
بہرام کی آزادی
بہرام کی گرفتاری
بہرام کی سرگزشت
براہ راست

ادبی کتابیں

مکمل شرح دیوان غالب
بزم خیال
مشاطۂ سخن
انشاء النسوان
مکاتیب حسن الملک
لیلیٰ مجنون ڈراما

مراثی

مراثی دبیر
مراثی انیس
مراثی ضمیر

مراثی مونس
مراثی دلگیر

تذکرۃ الشعرا

تذکرہ حسینی
گلشن
سراپائے سخن
سوانح نظیر اکبرآبادی

دواوین فارسی

دیوان شمس تبریز
کلیات عراقی
دیوان حافظ
دیوان نعمت خان عالی
کلیات انوری
دیوان بیدل
کلیات سعدی
دیوان عرفی
کلیات جامی
کلیات غالب
کلیات صائب
کلیات حزین
دیوان خسرو
دیوان ظہیر فاریابی
دیوان غنی کشمیری
دیوان ناصر علی
دیوان ہلالی
کلیات جلال اسیر

دواوین اردو

دیوان حسن دہلوی
کلیات ظفر

کلیات مومن
دیوان ناسخ
کلیات میر
کلیات سودا
کلیات انشا
کلیات نظیر اکبرآبادی
گلزار داغ
دیوان رند
دیوان ذوق
کلیات اسمٰعیل
مراۃ الغیب
صنمخانۂ عشق
فریاد داغ
دیوان کامل
دیوان شہیدی

عجائب و غرائب

عجائب المخلوقات تصویر رنگین
" با تصویر سادہ
مجمع الفنون
طلسم فرنگ
کارخانۂ عالم

ناول ڈرامے ناولوں کے ترجمے

الہ دین و لیلی
فریب حسن
سوزش عشق
روز الیبرٹ
ناول اسرار
شام جوانی
طلسمی فانوس

تصانیف مولٰنا نیاز فتحپوری

صحابیات

جس میں عہد رسالت کے ۵۸ خواتین کے مستند حالات درج ہیں۔ اس کا مقدمہ مولانا کی خاص زبان و انشا میں ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے
قیمت فی جلد [illegible]

نگارستان

زیر طبع ہے

شاعر کا انجام

نیاز فتحپوری کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا فسانہ بوزور انشا و حسن بیان کے لحاظ سے عجیب و غریب چیز ہے
قیمت مع محصول ۱۲؍

شہاب کی سرگزشت

اردو میں پہلا فسانہ ہے جس میں نفسیاتی تحلیل کے لحاظ سے سیرت نگاری کی گئی ہے۔ یہ امر مسلم ہو چکا ہے کہ اردو میں اس سے بہتر تخییل اور بلند انشا کا فسانہ کوئی شائع نہیں ہوا۔
قیمت فی جلد عہ؍

جذبات بھاشا

ہندی شاعری میں جو لطیف جذباتی کیفیت ہے اس کا علم انھیں کو ہو سکتا ہے۔ جنھوں نے اس زبان کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کتاب کو دیکھئے اور جذبات و خیال کی پاکیزگی کی داد دیجئے
قیمت فی جلد ۱۲؍

تاریخ الدولتین

جرجی زیدان مصری مشہور مورخ اسے تاریخ تمدن اسلامی کے ایک حصہ جس میں عہد بنی امیہ و بنی عباس کی تاریخ پر بے مثل تبصرہ کیا گیا ہے
قیمت فی جلد عہ؍

علم فراست الید

یعنی ہاتھ کی لکیروں کو دیکھکر ایک شخص کی سیرت اور اس کے ماضی و مستقبل کے حالات معلوم کرنے کا علم۔ اس فن پر ایک سلسلۂ مضامین نگار میں شائع ہوا تھا۔ اب اسے خوبصورت جیبی سائز میں مرتب کیا جا رہا ہے اور آخیر دسمبر ۱۹۲۳ء تک شائع ہو جائیگا۔ اس کتاب میں اس فن کے تمام مشکلات اسقدر آسان زبان میں حل کئے گئے ہیں کہ ہر شخص مطالعہ کرنے کے بعد نہایت معمولی مشق سے ہاتھ دیکھکر صحیح احکام صادر کر سکتا ہے
قیمت فی جلد عہ؍

ظریف شاعروں کا تذکرہ

یا

تذکرۂ خندۂ گل

اردو فارسی کے جتنے ظریف شاعر گزر چکے ہیں یا اب موجود ہیں ان سب کے مع ان کے لطائف و ظرائف اور نمونۂ کلام کے یکجا کر دیئے گئے ہیں۔ یہ موضوع اور دلچسپی کے لحاظ سے اردو میں پہلی کتاب ہے حجم [illegible] صفحات قیمت مع محصول للعہ؍

فلسفۂ مذہب

جو سلسلہ وار نگار میں شایع ہو چکا ہے زیر طبع ہے

(منیجر رسالہ "نگار" نظیر آباد لکھنؤ)